تاریخِ اسلام

دولتِ مروانیہ

حکیم محمود احمد ظفر

نشریات

Marfat.com

دولتِ مروانیہ

حکیم محمود احمد ظفر

نشریات

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔فون: 0321-4589419

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ
۲۰۱۶ء

نام کتاب:	دولتِ مروانیہ
مصنف:	حکیم محمود احمد ظفر
اہتمام:	نشریات
مطبع:	عمیر عثمان شفیق پریس
حروف خوانی:	محمد شبیر قمر
صفحات:	۶۰۴
جلد ساز:	بنیامین
سرورق:	ضیاء الرحمٰن
کمپوزنگ:	دُعا

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 37320318 فیکس: 37239884
ای میل: Kitabsaray@hotmail.com

فضلی بک
فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

Marfat.com

ترتیب

◆	عبدالملک بن مروان سنہ ۶۵ھ تا سنہ ۸۶ھ	۱۱
◆	توابین کا خروج	۱۲
◆	توابین کون تھے؟	۱۳
◆	مختار بن ابی عبیدہ	۱۴
◆	محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی قید اور رہائی	۲۱
◆	قاتلانِ حسین سے انتقام	۲۱
◆	مختار کی عرب دشمنی	۲۲
◆	سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی کرسی	۲۴
◆	مصعب بن زبیر اور مختار کا مقابلہ	۲۵
◆	مختار ثقفی کا حدود اربعہ	۲۷
◆	ابراہیم بن مالک الاشتر کا حدود اربعہ	۳۰
◆	مختار کے قتل کے بعد	۳۲
◆	خوارج کا ہنگامہ	۳۲
◆	عبدالملک بن مروان کی جنگی تیاریاں	۳۴
◆	زفر بن حارث سے معاملہ	۳۷
◆	کوفہ اور اہل کوفہ	۳۹
◆	عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالملک	۴۰
◆	حرم مکہ کا محاصرہ	۴۱
◆	عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شخصیت	۴۴
◆	خوارج کی شورش	۴۶
◆	ابن جارود کی بغاوت	۴۹
◆	پُرشورش ماحول	۵۰
◆	ازارقہ کا استیصال	۵۴
◆	حجاج اور مہلب کی عزت افزائی	۵۶
◆	مہلب کی وفات	۵۹
◆	آل مہلب کا زوال	۶۰
◆	رتبیل کی بغاوت	۶۱
◆	شہر واسط کی آبادکاری	۶۸
◆	موسیٰ بن عبداللہ بن حازم	۶۹
◆	حجاج کے خلاف الزامات کا تحقیقی جائزہ	۷۲
◆	ابن الاشعث کی بغاوت	۷۵
◆	سعید بن جبیر کے قتل کی اصل وجوہات	۷۸
◆	بغیر کسی تحقیق کے حجاج کو ظالم اور اموی خلفاء کو ستمگر کہنا اسلامی تاریخ پر ظلم ہے	۸۰
◆	حجاج کی عظیم القدر خدمات	۸۲
◆	حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا معاملہ	۸۵
◆	تصادم کی ابتداء	۸۹
◆	حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت	۹۲
◆	سبائی سازش	۱۰۳
◆	حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور دو اموی خلفاء کے درمیان جنگ کے اسباب	۱۰۴
◆	اصل واقعہ	۱۰۷

Marfat.com

♦	خلافت امویہ کی اسلامیت کے بارے میں جمہور متقدمین علماء کرام وفقہاء کی شہادت	۱۰۹
♦	خلافت اسلامیہ کے مبارک ادوار	۱۱۴
♦	تنبیہ	۱۱۷
♦	حاصل کلام	۱۱۹
♦	فتوحات	۱۲۰
♦	حسان کی شکست	۱۲۲
♦	علمی ماحول	۱۲۴
♦	شیعیت	۱۲۵
♦	خوارج	۱۲۶
♦	فقہائے سبعہ کے معاشرہ پر اثرات	۱۲۷
♦	سعید بن المسیب	۱۲۹
♦	ابوبکر بن عبدالرحمٰن	۱۳۳
♦	ولید اور سلیمان کی ولایت عہد	۱۳۵
♦	عبدالملک کی وفات	۱۳۶
♦	عبدالملک کا خاندان	۱۳۷
♦	کارہائے نمایاں	۱۳۸
♦	تعمیر کعبہ	۱۴۴
♦	اسلامی سکہ کا اجراء	۱۴۴
♦	عربی کا دفتری زبان بنانا	۱۴۵
♦	رفاہ عامہ کے کام	۱۴۶
♦	دینی خدمات	۱۴۶
♦	ولید بن عبدالملک سنہ ۸۶ھ ...... تا ...... ۹۶ھ مطابق سنہ ۷۰۵ء ...... تا ۷۱۳ء	۱۴۸
♦	محمد بن قاسم	۱۴۹
♦	قتیبہ بن مسلم	۱۶۰
♦	نیزک کی بغاوت اور اس کا قتل	۱۶۳
♦	سمرقند کی فتح	۱۶۵
♦	چین پر فوج کشی	۱۶۷
♦	فتوحات اندلس اور طارق بن زیاد	۱۶۸
♦	اندلس اور مسلمان	۱۷۲
♦	اندلس پر تیسرا حملہ	۱۷۶
♦	جولین نے مسلمانوں کو حملہ کی کیوں ترغیب دی؟	۱۷۸
♦	فاتح اندلس طارق بن زیاد کا حملہ	۱۸۱
♦	چند افسانے	۱۸۲
♦	ڈیوک تھیوڈومیر کی شکست	۱۸۴
♦	جنوبی اندلس کے چند اور شہروں پر قبضہ	۱۹۶
♦	کاؤنٹ جولین کا ایک مشورہ	۱۹۷
♦	موسیٰ بن نصیر کا اختلاف	۱۹۸
♦	طلیطلہ کی طرف پیش قدمی	۱۹۸
♦	قرطبہ کی فتح	۱۹۹
♦	مالقہ اور تدمیر وغیرہ کی فتح	۲۰۱
♦	طلیطلہ کی فتح	۲۰۴
♦	وادی الحجاز کی فتح	۲۰۶
♦	مدینہ مائدہ کی فتح	۲۰۶
♦	شمالی اندلس کی فتح	۲۰۶
♦	مفتوحہ علاقوں کا انتظام وانصرام	۲۰۷
♦	گاتھ شہزادے اور ان کا انجام	۲۱۲
♦	ولید بن عبدالملک کے دور خلافت کے کارنامے	۲۱۴
♦	گاتھ شہزادہ المند اور اس کی اولاد	۲۲۰
♦	سارہ کا اموی دربار میں اہم مقام	۲۲۱
♦	سارہ کا چچا ارطباس اور اوپاس	۲۲۲

Marfat.com

♦ ارطباس شاہی عتاب میں	۲۲۳
♦ موسیٰ بن نصیر کا اندلس میں ورود	۲۲۷
♦ موسیٰ بن نصیر کون تھے؟	۲۲۸
♦ قرمونہ کی فتح	۲۳۱
♦ اشبیلیہ کی فتح	۲۳۲
♦ ماردہ کی فتح	۲۳۳
♦ اشبیلیہ کی بغاوت	۲۳۴
♦ لبلہ اور باجہ کی فتح	۲۳۴
♦ طارق اور موسیٰ بن نصیر کی ملاقات	۲۳۵
♦ شمالی اندلس کی فتوحات	۲۳۶
♦ شمال مشرق اندلس پر قبضہ	۲۳۸
♦ جنوبی فرانس کے شہروں پر قبضہ	۲۳۸
♦ یورپی حکمرانوں کی مجلس مشاورت	۲۴۰
♦ موسیٰ بن نصیر کی تجویز کا ردھونا	۲۴۲
♦ ایک عجیب نکتہ کی دریافت	۲۴۲
♦ مغربی صوبوں کی فتوحات	۲۴۳
♦ دمشق سے ایک اور قاصد کا ورود	۲۴۴
♦ موسیٰ کا جانشین عبدالعزیز	۲۵۰
♦ موسیٰ اور طارق کے کارنامے	۲۵۰
♦ مال غنیمت کی واپسی	۲۵۱
♦ قیروان میں جشن مسرت	۲۶۱
♦ کاؤنٹ جولین کو اس کی خدمات کا صلہ	۲۶۲
♦ موسیٰ بن نصیر ایک دوراہے پر	۲۷۰
♦ مسلمہ بن عبدالملک کی فتوحات	۲۷۳
♦ حجاج بن یوسف کی دفات	۲۷۴
♦ ولید کا انتقال	۲۷۵
♦ اولاد	۲۷۵
♦ ولید کی عہد پر تبصرہ	۲۷۶

♦ فتوحات پر تبصرہ	۲۷۶
♦ اسپین کی عام حالت	۲۷۶
♦ حکومت کی حالت	۲۷۷
♦ دربار شاہی میں تعیش کا دور	۲۷۷
♦ مذہبی پیشواؤں کی حالت	۲۷۷
♦ کسانوں، مزدوروں، غلاموں، رعایا کے دوسرے طبقوں کی حالت	۲۷۸
♦ یہودیوں کی حالت	۲۷۸
♦ فوجی نظام میں وسعت وترقی	۲۸۰
♦ جہاز سازی کے کارخانے	۲۸۰
♦ رفاہ عام کے کام	۲۸۰
♦ سڑکوں کی تعمیر	۲۸۰
♦ نہروں اور کنوؤں کی تعمیر	۲۸۱
♦ مہمان خانے	۲۸۱
♦ شفاخانے	۲۸۱
♦ معذروں کی کفالت کا انتظام	۲۸۱
♦ یتیموں کی پرورش وپرواخت	۲۸۱
♦ بازار کے نرخ کی نگرانی	۲۸۱
♦ روزہ داروں کے لیے کھانا	۲۸۱
♦ علمی وتعلیمی خدمات	۲۸۲
♦ تعمیرات	۲۸۲
♦ مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر	۲۸۲
♦ جامع دمشق کی تعمیر	۲۸۳
♦ دوسری مسجدیں	۲۸۴
♦ روضہ نبوی ﷺ کی مرمت	۲۸۴
♦ ایک ناگوار واقعہ	۲۸۵

Marfat.com

◆	سلیمان بن عبدالملک سنہ ۹۶ھ تا سنہ ۹۹ھ	۲۸۶
◆	قتیبہ بن مسلم کا قتل	۲۸۷
◆	محمد بن قاسم کی گرفتاری اور اس کا قتل	۲۹۰
◆	موسیٰ بن نصیر سلیمانی عتاب کی زد میں	۲۹۲
◆	موسیٰ کی زندگی کا تنزل	۲۹۹
◆	یزید بن مہلب کون تھا؟	۳۰۰
◆	موسیٰ بن نصیر کی اولاد سے انتقام	۳۰۱
◆	عبدالعزیز بن موسیٰ کے خلاف پراپیگنڈہ	۳۰۲
◆	موسیٰ بن نصیر کی وفات	۳۰۶
◆	طارق بن زیاد کی گمنامی	۳۰۶
◆	موسیٰ بن نصیر کے بعد اندلس	۳۰۸
◆	حر بن عبدالرحمٰن کی ناکامی اور عیسائیوں کا متحدہ محاذ	۳۰۹
◆	فتوحات	۳۱۴
◆	قسطنطنیہ پر حملہ	۳۱۶
◆	لیون کون تھا؟	۳۱۸
◆	ولی عہدی	۳۲۰
◆	وفات	۳۲۲
◆	اولاد	۳۲۲
◆	سلیمانی دور خلافت پر تبصرہ	۳۲۳
◆	نماز اول وقت میں	۳۲۵
◆	مکہ مکرمہ میں چشمہ کا اجراء	۳۲۵
◆	سب سے بڑا کارنامہ	۳۲۶
◆	عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ	۳۲۷
◆	ابتدائی حالات	۳۲۷
◆	پیدائش	۳۲۷
◆	فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خواب کی تعبیر	۳۲۹
◆	تحصیل علم	۳۳۱
◆	مدینہ طیبہ کی گورنری	۳۳۴
◆	مسجد نبوی کی تعمیر نو	۳۳۷
◆	روضہ نبوی کی مرمت	۳۴۰
◆	دیگر مساجد کی تعمیر	۳۴۰
◆	کنوؤں اور راستوں کی تعمیر	۳۴۱
◆	ولید بن عبدالملک کا حج کے لیے آنا	۳۴۱
◆	گورنری سے معزولی	۳۴۵
◆	عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ دمشق کی راہ پر	۳۴۶
◆	ایک مہینہ میں دو گورنروں کی موت	۳۵۱
◆	ولید کی موت	۳۵۱
◆	سلیمان بن عبدالملک کے مزاج میں اثر ورسوخ	۳۵۲
◆	خلافت	۳۵۵
◆	سلیمان کی تجہیز و تکفین	۳۶۱
◆	خلافت علیٰ منہاج النبوت کا احیاء	۳۶۲
◆	خلافت کا احیاء	۳۶۲
◆	اموی خلافت کی کوتاہیاں	۳۶۳
◆	غصب شدہ اموال کی واپسی	۳۶۴
◆	فدک کا فیصلہ	۳۶۷
◆	فدک کیا ہے؟	۳۶۷
◆	خاندان کی برہمی	۳۷۰
◆	ظالم افسروں کا تدارک	۳۷۸
◆	ظلم وجور کا انسداد	۳۷۹
◆	بیت المال کی اصلاح	۳۸۱
◆	قومی خزانہ کی حفاظت	۳۸۵
◆	بیت المال کے مصارف	۳۸۶
◆	غیر مسلموں سے برتاؤ	۳۹۶

Marfat.com

♦	بیت المال کے محاصل میں اضافہ	۴۰۰
♦	عوامی خدمات	۴۰۲
♦	رفاہ عام کے کام	۴۰۴
♦	دینی خدمات	۴۰۶
♦	مسجد دمشق، الجامع الاموی	۴۰۷
♦	اشاعت اسلام	۴۱۱
♦	آپ خلافت کو شورائی بنانا چاہتے تھے	۴۱۳
♦	جمہوریت ایک خلاف اسلام نظریہ ہے	۴۱۴
♦	شورائیت کے اقدامات اور بے بسی	۴۱۷
♦	ملوکیت کے امتیازات کا خاتمہ	۴۱۷
♦	عدالت اور قضاء	۴۲۲
♦	عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ قاضیوں کو خود چنتے تھے	۴۲۴
♦	قاضیوں کی رشوت سے حفاظت	۴۳۱
♦	فتوحات	۴۳۷
♦	فاروقی خلافت کا احیاء	۴۴۰
♦	علالت و وفات	۴۴۴
♦	ازواج واولاد	۴۴۹
♦	صورت وسیرت	۵۴۵
♦	فضل وکمال	۴۵۷
♦	تفسیر وحدیث	۴۵۸
♦	تدوین حدیث	۴۵۹
♦	تدوین حدیث کی ابتدائی صورت	۴۶۰
♦	فقہ	۴۶۲
♦	شاعری	۴۶۲
♦	خطابت	۴۶۳
♦	علماء کی قدر افزائی	۴۶۴
♦	ذاتی حالات	۴۶۹
♦	خوف آخرت	۴۷۰
♦	موت اور قبر	۴۷۲
♦	توکل	۴۷۶
♦	دیانت وامانت	۴۷۷
♦	تکبر	۴۷۸
♦	یزید بن عبدالملک سنہ ۱۰۱ھ تا سنہ ۱۰۵ھ مطابق سنہ ۷۱۹ء تا سنہ ۷۲۳ء	۴۸۰
♦	یزید بن مہلب کی بغاوت	۴۸۰
♦	قصر باہلی پر ترکوں کا قبضہ	۴۸۳
♦	صغد کی سرزنش	۴۸۴
♦	سعید بن ہبیرہ کا تقرر	۴۸۴
♦	کش اور نسف کی اطاعت	۴۸۵
♦	خزر کی سرکوبی	۴۸۶
♦	خوارج کی سرکوبی	۴۸۷
♦	عراق کا بندوبست	۴۸۷
♦	اہل بیت نبوت کا احترام	۴۸۷
♦	ولی عہدی	۴۸۸
♦	وفات	۴۸۸
♦	ہشام بن عبدالملک سنہ ۱۰۵ھ تا سنہ ۱۲۵ھ مطابق سنہ ۷۲۳ء تا سنہ ۷۴۴ء	۴۸۹
♦	ترکستان کی مہمات	۴۸۹
♦	آرمینیہ اور آذربائیجان	۴۹۶

Marfat.com

ایشیائے کوچک کی فتوحات	۴۹۹
سندھ کی مہمات	۵۰۰
اندلس کی مہمات	۵۰۲
افریقہ میں بربروں کی بغاوت	۵۰۸
اندلس میں بغاوت	۵۰۹
خوارج کا استیصال	۵۱۳
زید بن علی رضی اللہ عنہ کی شہادت	۵۱۴
دعوت عباسیہ	۵۱۷
ولی عہدی	۵۲۰
ہشام کے عہد حکومت پر ایک نظر	۵۲۱
ولید بن یزید بن عبدالملک سنہ ۱۲۵ھ تا سنہ ۱۲۶ھ مطابق سنہ ۷۴۳ء تا سنہ ۷۴۴ء	۵۲۶
فسق و فجور کی زندگی	۵۲۷
یحییٰ بن زید کا خروج	۵۲۸
یزید بن ولید سنہ ۱۲۶ھ مطابق سنہ ۷۴۴ء	۵۳۳
یزید کی مخالفت	۵۳۳
عراق اور خراسان کی شورش	۵۳۵
وفات	۵۳۶
ابراہیم بن ولید بن عبدالملک سنہ ۱۲۶ھ تا سنہ ۱۲۷ھ مطابق سنہ ۷۴۴ء تا سنہ ۷۴۵ء	۵۳۷
مروان بن محمد بن مروان سنہ ۱۲۷ھ تا سنہ ۱۳۲ھ مطابق سنہ ۷۴۵ء تا سنہ ۷۴۹ء	۵۳۹
شام کی بغاوت	۵۳۹
سلیمان بن ہشام کی مخالفت	۵۴۱
خوارج عراق	۵۴۳
خوارج یمن و حجاز	۵۴۴
قبائلی عصبیت	۵۴۶
ابو مسلم خراسانی	۵۴۶
عربوں کی خانہ جنگی	۵۵۰
امام ابراہیم کا قتل	۵۵۳
عباسیوں کا خروج	۵۵۳
ابو مسلم خراسانی کی چالاکی	۵۵۴
خراسان پر قبضہ	۵۵۵
عراق عجم پر قبضہ	۵۵۶
ابوالعباس عبداللہ بن علی کی بیعت	۵۵۸
مروان کا قتل	۵۵۸
اموی دور پر ایک نظر	۵۶۱
امور حکومت کے زوال کے اسباب	۵۶۲
اموی دور میں علمی ترقی	۵۶۷
تفسیر	۵۶۷
حدیث	۵۶۸
فقہ	۵۷۰
سیرت و مغازی	۵۷۰
لغت	۵۷۱
تراجم	۵۷۲
نظام تعلیم	۵۷۳
خلفائے بنو امیہ اور دمشق	۵۷۵
اموی حکومت کا امتیاز	۵۸۳
دمشق	۵۹۳
الجامع	۵۹۷

Marfat.com

عبدالملک بن مروان

سنہ ۶۵ھ تا سنہ ۸۶ھ

مروان بن الحکم رضی اللہ عنہ نے ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی اور انھیں صرف نو ماہ کاروبار خلافت چلانے کا موقع ملا۔ اس مختصر عرصہ میں حکومت کے نظم ونسق کے قیام کا کیا موقع مل سکتا تھا جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ایک متوازی حکومت بھی قائم تھی۔ مروان کے انتقال کے بعد رمضان المبارک ۶۵ھ میں عبدالملک بن مروان مسند خلافت پر بیٹھا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۹ سال تھی جبکہ وہ ۲۶ھ میں پیدا ہوا۔

عبدالملک کو اللہ تعالیٰ نے بہت خوبیوں سے نوازا تھا۔ مدینہ طیبہ میں رہ کر اس نے یہاں کے ارباب علم وکمال سے پورا پورا استفادہ کیا۔ اپنے زمانہ کے تمام اکابر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان کے زمانہ کے بڑے بڑے ارباب کمال ان کے علمی کمالات کے معترف تھے۔ اگر وہ مسند خلافت پر نہ بیٹھتے تو مدینہ طیبہ کے فقہائے سبعہ میں سے آٹھویں فقیہ ہوتے۔ عبدالملک اکثر ام الدرداء رضی اللہ عنہا صحابیہ کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ نافع کہتے ہیں کہ مدینہ میں کوئی جوان عبدالملک کی مانند چست وچالاک اور قرآن وحدیث کا واقف اور عابد وزاہد نہ تھا۔ ابوالزناد کا بیان ہے کہ سعید بن المسیب، عبدالملک بن مروان، عروہ بن زبیر اور قبیصہ بن ذویب مدینہ منورہ کے فقہاء ہیں ایک مرتبہ عبادہ بن مثنیٰ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ لوگوں کے بعد ہم دین کے مسائل کس سے دریافت کریں۔ انھوں نے فرمایا: ''مروان کا بیٹا فقیہ ہے، اس سے دریافت کرنا۔

امام شعبی فرماتے ہیں کہ ''میں نے جس کسی سے بھی گفتگو کی اپنے آپ کو اس سے برتر پایا سوائے عبدالملک بن مروان کے، اس سے جب کسی شعر یا حدیث پر گفتگو کی تو اس نے میرے علم میں اضافہ کیا۔ سیدہ ام الدرداء رضی اللہ عنہا نے بعد از خلافت ایک روز عبدالملک سے کہا کہ میں پہلے ہی سمجھتی تھی کہ تو ایک روز خلیفہ ہو جائے گا۔ عبدالملک نے پوچھا: ''آپ کو کیسے پتہ تھا؟ انھوں نے فرمایا کہ میں نے تجھ سے بہتر نہ کوئی بات کرنے والا دیکھا اور نہ بات سننے والا۔ ذہبی کہتے ہیں کہ عبدالملک نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ، سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا، سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی

Marfat.com

اور ان سے عروہ بن زبیر، خالد بن سعدان، رجاء بن حیوہ زہری، یونس بن میسرہ، ربیعہ بن یزید، اسماعیل بن عبیداللہ اور جریر بن عثمان وغیرہ نے روایت کی۔

ایک روز عبدالملک کے پاس ایک عورت آئی اور کہا کہ میرا بھائی چھ سو دینار چھوڑ کر مرا ہے۔ تقسیم میراث میں مجھ کو صرف ایک دینار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ تیرا یہی حق بنتا ہے۔ عبدالملک نے اسی وقت امام شعبی کو بلایا اور دریافت کیا۔ انھوں نے کہا: ''یہ تقسیم بالکل درست ہے۔ متوفی دو بیٹیاں چھوڑ کر مرا۔ ان دونوں کو چار سو دینار ملیں گے، اور ماں کا چھٹا حصہ یعنی ایک سو دینار، بیوی کا آٹھواں حصہ یعنی ۷۵ دینار اور بارہ بھائیوں کو چوبیس دینار اور بہن کو ایک دینار چنانچہ اس کے حصہ میں ایک ہی دینار آتا ہے۔

علم کی دولت کے ساتھ ساتھ عبدالملک بہت بڑا حوصلہ مند، شجاع، مستقل مزاج، بہادر، دانشور اور مدبر شخص تھا۔ بنوامیہ کی تاریخ میں اس کا دور بڑا پر آشوب تھا۔ جس وقت اس نے تخت خلافت پر قدم رکھا ملک کے تمام اہم حصوں میں ایک قسم کا انقلاب برپا تھا۔ بیک وقت مختلف طاقتیں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، شیعان علی، خوارج، توابین اور مختار ثقفی وغیرہ بنوامیہ کے خلاف بلکہ ان سے برسر پیکار تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی اندرونی اور بیرونی شورشوں کے طوفان ہر طرف اٹھے ہوئے تھے عبدالملک کے پاس صرف مصر اور شام کے علاقے تھے۔ باقی دنیائے اسلام کے شہر اور صوبے یا تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس تھے یا پھر ان میں طوائف الملوکی تھی۔ ان تمام حالات کا مقابلہ کر کے عبدالملک نے ان پر قابو حاصل کیا۔ اس میں خصوصی خوبی یہ تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک موقع پر بھی گھبراہٹ کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا اور مشکلات اور مصائب کے ہجوم میں بجائے گھبراہٹ کے اس کی ہمت واستقلال کے جواہر اور زیادہ چمکتے تھے۔

توابین کا خروج:

عبدالملک بن مروان کے مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد توابین جو مروان کے زمانہ میں بڑے زور شور سے اٹھے تھے، عبدالملک نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ مروان نے اپنے انتقال سے قبل ابن زیاد کو جزیرہ پر لشکر کشی اور قرقیسیا میں زفر بن حارث کے مقابلہ کے لیے بھیجا تھا کیونکہ ان لوگوں نے ان کی خلافت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، اور اسے یہ ہدایت کی تھی کہ یہاں سے فارغ ہو کر عراق کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ بعض روایات میں ہے کہ مروان نے عبیداللہ بن زیاد سے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ عراق کا جس قدر علاقہ وہ فتح کرے گا وہ اس کی ولایت میں دے دیا جائے گا۔ ابن زیاد ابھی جزیرہ ہی میں تھا کہ مروان کی وفات کی خبر پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے عبدالملک بن مروان کا یہ فرمان بھی ملا کہ مروان نے اسے جس کام پر متعین کیا تھا اس کو جاری رکھا جائے۔ چنانچہ ابن زیاد جزیرہ اور قرقیسیا کی مہمات سے فراغت کے بعد عراق کی طرف بڑھا اور ''عین'' اور ''زہ'' میں اس کا مقابلہ ''توابین'' سے ہوا۔

Marfat.com

توابین کون تھے؟

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد جب گورنر مدینہ ولید نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کی بیعت کے لیے کہا تو ملا باقر مجلسی کی روایت کے مطابق آپ مدینہ طیبہ سے مکہ تشریف لے آئے۔ یہاں اہل کوفہ سلیمان بن صرد خزاعی کے گھر میں جمع ہوئے۔ سلیمان نے کہا: ''جب کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا ہے اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ یزید کی بیعت کا انکار کر کے مکہ چلے گئے ہیں، اور تم لوگ ان کے ساتھی اور ان کے والد بزرگوار کے ساتھی ہو، ایک عریضہ لکھ کر انھیں یہاں بلا لو اور اگر ان کی نصرت اور مدد میں پہلے کی طرح سستی اور کاہلی کرو گے تو پھر ان کو فریب نہ دو اور ہلاکت میں نہ ڈالو۔ کوفیوں نے کہا کہ ہم ان کی ہر طرح نصرت اور مدد کریں گے۔ چنانچہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک خط لکھا گیا۔ (جلاء العیون: ص ۴۳۰، ناسخ التواریخ: جلد ۶، کتاب ۲، ص ۱۴۳)

اس طرح بارہ ہزار خطوط سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کیے گئے۔ لیکن جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو تمام اہل کوفہ اپنے قول و اقرار سے سرتابی کر چکے تھے۔ اسی ہزار کوفیوں نے سیدنا مسلم کے ہاتھ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بیعت کی لیکن ابن زیاد کی ایک دھمکی سے (لیس له بالکوفة ناصر و لا شیعة) آپ کا کوفہ میں کوئی مددگار اور ساتھی نہ رہا۔ بالآخر میدان کربلا میں انہی کوفیوں نے آپ کو شہید کر دیا، نہ صرف آپ کو بلکہ آپ کے تمام ساتھیوں کو شہید کر دیا گیا۔ کوفہ کے تمام باسی ان کی شہادت میں شریک تھے، اور شمر ذی الجوشن اور عبیداللہ بن زیاد کا اس میں قائدانہ ہاتھ تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد اہل کوفہ کو اپنی بے وفائی اور غداری کا احساس ہوا کہ انھوں نے خود ہی بارہ ہزار خط لکھ کر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ بلایا اور پھر عبیداللہ بن زیاد سے مل کر خود ہی ان کے قتل کے درپے ہو گئے یہاں تک کہ انھیں شہید کر دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے اس بات کا احساس سلیمان بن صرد الخزاعی کو ہوا جن کو تاریخ میں ''امیر التوابین'' کہا جاتا ہے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی تھی اس وقت بھی انھوں نے ڈنکے کی چوٹ پر صدائے احتجاج بلند کی تھی، اور پھر جب شیعان کوفہ نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ بلانے پر اتفاق کیا تو سب سے پہلے کوفی انہی کے گھر پر جمع ہوئے تھے اور ان کے بالاتفاق پختہ یقین دلانے پر انھوں نے ہی دوسرے چار افراد کے علاوہ اپنا نام عریضہ کے عنوان سے تحریر کیا تھا تاکہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو یقین ہو جائے کہ کوفیوں کی دعوت آپ کے جانثاروں کی دعوت ہے نہ کہ کسی غدار اور اغیار فریق کی، لیکن افسوس کہ امتحان کے وقت کوفی اپنی پرانی منافقانہ عادت کے تحت اپنے عہد پر قائم نہ رہے اور اسی ہزار کے قریب کوفی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بیعت سے انحراف کر کے ابن زیاد کی ریشہ دوانیوں کا شکار بلکہ کمال بے حیائی سے پیاسے حسین رضی اللہ عنہ کے خون کے پیاسے بن کر میدان کربلا میں آمادۂ پیکار ہو گئے اور صرف چند لوگ ایسے تھے جو کربلا کے ابتلا میں اپنی جانوں کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ عزیز جان کر بالکل خاموش اور گوشۂ گمنامی میں روپوش ہو کر بیٹھ گئے، گویا انھوں

Marfat.com

نے کچھ سنا ہی نہیں، یا وہ اس صفحۂ ہستی پر موجود ہی نہیں تھے۔ لیکن جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ان کی جلد بازی، بے وفائی اور بزدلی کا شکار ہو گئے تو وہ اس وقت خواب غفلت اور غداری کی نیند سے بیدار ہوئے اور اس وقت ان کے ہوش کی آنکھیں کھلیں اور وہ اپنے ناقابل عفو قصور پر سخت نادم اور تائب ہوئے لیکن ؎

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جو لوگ نادم اور تائب ہوئے ان لوگوں کے رئیس وسردار پانچ آدمی تھے جنھوں نے پہلے عریضہ میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ بلانے میں اپنے نام عنوان میں تحریر کیے تھے یعنی سلیمان بن صرد خزاعی، مسیّب، عبداللہ ازدی، عبداللہ بن وال اور رفاعہ بن شداد۔ ان میں سے مسیّب تو عمر بن سعد کے ہمراہ کربلا کی ہوا بھی کھا آئے تھے، ان سب حضرات نے باہم مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اب اس داغ ندامت کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ قاتلان حسین سے انتقام لیا جائے، شاید اللہ تعالیٰ یوں ہی ہماری توبہ کو قبول فرمالے۔

جب سب کا اس پر اتفاق ہو گیا تو سلیمان بن صرد خزاعی کو ہی انھوں نے اپنا سردار اور امیر تجویز کر کے ان کو ''امیر التوابین'' کے لقب سے ملقب کیا گیا اور پھر یہ قرارداد پاس ہوئی کہ دشمنان آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب کرنے اور نیچا دکھانے کے بعد سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ کو مسند خلافت پر بٹھایا جائے۔ یزید کی زندگی تک تو کسی کو خروج کی جرأت نہ ہوئی تاہم اس تحریک کو تمام ملک میں اندر ہی اندر پھیلایا گیا۔ جب یزید انتقال کر گیا تو ابن زیاد عراق سے شام چلا گیا، اس وقت بھی خروج کرنا خلاف مصلحت سمجھا گیا۔

مختار بن ابی عبیدہ:

آخر رمضان ۶۴ھ میں جب یہ تحریک بخوبی عام ہو گئی اور سلیمان بن صرد خزاعی کی اعانت میں ہر طرف سے لوگ کثیر تعداد میں جمع ہو گئے تو مختار بن ابی عبیدہ بھی کوفہ آدھمکا اور لوگوں کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خون کا انتقام لینے پر اکسانے لگا۔ کوفیوں نے اس سے کہا کہ ہم نے سلیمان بن صرد کو اپنا امیر تجویز کر لیا ہے اور ہم تو پہلے سے ہی اس مقصد پر متفق ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر مختار نے سلیمان سے جا کر ملاقات کی اور کہا کہ یزید مر چکا ہے اور اس کا بیٹا معاویہ مسند خلافت پر متمکن ہونے سے بیزار ہے، اور کوئی اور شخص بھی تا حال حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ اب تقیہ کو ترک کر کے علانیہ خروج کرنا ضروری اور لازمی ہے۔ پھر ایسا موقع کہاں میسر آئے گا، لہٰذا فوراً اس مہم کو شروع کر دینا چاہیے، لیکن سلیمان نے کہا کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ جس پر مختار بددل ہو کر سلیمان کے پاس سے چلا گیا اور کہا کہ سلیمان بہت بزدل ہیں۔ ایسے عجیب اور نادر موقع کو ہاتھ سے کھو رہے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جنگ کرنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ مختار ثقفی بڑا چالاک اور مکار شخص تھا۔ شہادت حسین کے زمانہ میں ابن زیاد نے مختار کو قید کر دیا تھا لیکن سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی

Marfat.com

سفارش پر بعد میں اسے رہا کر دیا مگر کوفہ میں رہنے کی اسے ممانعت کر دی۔ مختار کوفہ سے نکل کر حجاز چلا گیا اور مکہ معظمہ میں پہنچ کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں آمد و رفت شروع کر دی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خفیہ طور پر اپنی بیعت لے رہے تھے۔ مختار نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میں آپ کی بیعت اس شرط پر کرتا ہوں کہ آپ کوئی کام میرے مشورہ کے بعد نہیں کریں گے، اور جب آپ کامیاب ہو جائیں تو مجھے کوئی اہم ترین خدمت سپرد فرمائیں گے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کسی قدر تامل کے بعد اس کی یہ شرط قبول کر لی۔ مختار، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا اور حصین بن نمیر کی مکہ مکرمہ کے محاصرہ کے زمانہ میں ان کی طرف سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جب یزید بن معاویہ کا انتقال ہوا اور اہل حجاز، عراق اور مصر کے باشندوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تو وہ ان کے پاس پانچ ماہ اور مقیم رہا، لیکن وہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بد دل ہو گیا کیونکہ ابن زبیر سے اس نے جو توقعات اور امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، وہ پوری ہوتی نظر نہ آئیں۔

سرزمین عراق ہمیشہ سے شورش اور ہنگاموں کی آماجگاہ رہی ہے، اس وجہ سے مختار کی نگاہیں پھر اسی طرف اٹھیں اور وہ ہر آتے جاتے سے وہاں کے حالات کی کھود کرید کرتا رہا۔ ایک مرتبہ ہانی بن حجۃ الوداعی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو مختار بھی اس سے ملا اور اس سے کوفہ کے حالات کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ ہانی نے کہا کہ اہل کوفہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی اطاعت پر ثابت قدم ہیں مگر وہاں ایک بڑی جماعت ایسی بھی ہے کہ کوئی اگر اس کو ایک نظام میں منسلک کر دے تو ساری دنیا کو اپنے جھنڈے تلے لا سکتا ہے۔ مختار نے کہا کہ واللہ میں انھیں حق پر جمع کروں گا اور انھیں اپنے ساتھ لے کر حامیان باطل سے مقابلہ کروں گا اور ہر ظالم اور دشمن حق کو ہلاک کر دوں گا۔ اب مختار کوفہ آیا تو دیکھا کہ وہاں تحریک توابین اپنے عروج پر ہے اور خون حسین رضی اللہ عنہ کے انتقام کی آوازیں کوفہ کے در و دیوار سے گونج رہی ہیں۔ مختار نے موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہی نعرہ بلند کیا لیکن اس نے سلیمان بن صرد کو اپنی کارروائیوں کے خلاف سمجھا لہٰذا اس نے سلیمان کے خلاف پراپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا اور اپنی گروہ بندی علیحدہ کرنی شروع کر دی۔ اس نے اہل کوفہ سے کہنا شروع کر دیا کہ سلمان ایک بزدل اور ناتجربہ کار آدمی ہے۔ وہ جنگ کے رنگ ڈھنگ سے ناآشنا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ خود بھی قتل ہو اور تم لوگوں کو بھی قتل کرائے۔ میں ایک نہایت منظم طریقے اور طے شدہ اسکیم کے مطابق کام کرنا چاہتا ہوں اس نے ایک جعلی خط محمد بن حنیفہ کی جانب سے لکھ کر لوگوں کو دکھایا کہ امام وقت محمد بن حنیفہ ہیں نہ کہ امام زین العابدین، کیونکہ وہ علم میں بھی زیادہ ہیں اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے ہونے کی حیثیت سے کتاب وسنت سے واقف تر اور آشنا تر اور وصی پیغمبر بھی ہیں نہ کہ علی بن حسین (سیدنا زین العابدین) اور پھر وہ خط بھی پڑھ کر لوگوں کو سنا دیا جس پر بہت سے لوگوں نے مختار کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مضمون اس خط کا یہ تھا جو وہ لوگوں کو پڑھ کر سناتا تھا۔

''سلیمان بن صرد جو خروج میں دیر کر رہا ہے یہ اس کی غلطی ہے۔ اے مختار! تم مکہ سے روانہ ہو کر کوفہ

Marfat.com

جاؤ اور ہمارے شیعوں سے کہو کہ باہر نکلیں اور حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کریں، اور ہماری بیعت کوفیوں سے لے لو۔"

اس خط کے مضمون کو سن کر اکثر کوفی سلیمان سے برگشتہ ہو گئے۔ مختار سے اہل کوفہ نے کہا: "اگر سلیمان خروج کر کے شہر پر قابض ہو جاتے تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ہرگز مجال نہ تھی کہ اپنے کارفرماؤں کو کوفہ روانہ کرتا۔ مختار نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جہاں موقع دیکھا اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے بھی پیش کیا اور کہا کہ جبرائیل اس کے پاس وحی لے کر آتے ہیں اور اسے غیب کی خبریں بتاتے ہیں۔ (مروج الذہب مسعودی: ۷۹/۳)

اس پراپیگنڈے کے نتیجہ میں مختار ثقفی کی سلیمان بن صرد سے الگ جماعت بن گئی بعض لوگوں نے عبداللہ بن یزید اور ابراہیم بن محمد بن طلحہ سے کہا کہ مختار بہت خطرناک، چالاک اور مکار آدمی ہے۔ اس کے ارادے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ چنانچہ عبداللہ بن یزید نے مختار کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ مختار کچھ عرصہ پس دیوار زنداں رہا لیکن اس نے پھر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سفارشی خط لکھوا کر اس وعدہ اور حلف پر رہائی حاصل کر لی کہ وہ حکومت کے خلاف بغاوت نہ کرے گا، اور اگر وہ بدعہدی کرے تو اس کے سب غلام اور باندیاں آزاد ہو جائیں گی اور اسے خانہ کعبہ پہنچ کر ایک ہزار اونٹ قربان کرنا پڑیں گے۔ یہ وعدہ اور حلف دے کر مختار اپنے گھر آ گیا اور اپنے اعزاء و اقرباء سے کہا:

"ان لوگوں کا خیال ہے کہ میں اپنے وعدہ اور قسم کو پورا کروں گا۔ خدا کی قسم! میں ان پر خروج کر کے قسم اور نذر کا کفارہ دے دوں گا، اور میں چاہتا ہوں کہ مہم جاری کی جائے خواہ کوئی لونڈی اور غلام نہ رہے۔ بخدا! میرے نزدیک ایک ہزار اونٹ قربان ہو جائے تو بہتر ہے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ نہ لینے سے۔"

مختار کہتا تھا کہ محمد بن حنیفہ مہدی ہیں، اور سلیمان نے تو سارا کام ہی خراب کر دیا۔ اب میں اپنے امام کو خط لکھتا ہوں، دیکھوں کہ وہ کیا امر فرماتے ہیں۔

صاحب اخبار الطوال ابو حنیفہ الدینوری نے لکھا ہے کہ ۶۶ھ میں ایک شخص مختار بن ابو عبید ثقفی خون حسین کی دعوت لے کر اٹھا اور عراق پر قابض ہو گیا۔ یہ ایک معمولی اور بے دین لیکن عالی دماغ اور حوصلہ مند شخص تھا۔ اس دور کی بدنظمی اور طوائف الملوکی کو دیکھ کر اسے بھی قسمت آزمائی کا حوصلہ ہوا۔ اس زمانہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا زور تھا، اس لیے وہ حصول مقصد کے لیے ان سے جا ملا۔ اپنے مقصد کے حصول کی صورت یہاں نظر نہ آئی تو وہ توابین کی تحریک میں جو اسی زمانہ میں اٹھی تھی، شامل ہو گیا۔ یہ تحریک اس کے مقصد کے لیے بہت مفید تھی، اس لیے توابین کے خاتمہ کے بعد خود اس کا راہ نما بن گیا، لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بھی تعلق قائم رکھا، اور ان پر اس کو ظاہر نہ ہونے دیا اس تحریک کو موثر اور کامیاب بنانے کے لیے سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ سے اس کی سرپرستی قبول کرنے کی درخواست کی۔ اس تحریک کے ساتھ ہی اس نے بہت سے گمراہ کن عقائد اختراع

Marfat.com

کر لیے جن سے سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ واقف تھے، لہٰذا انھوں نے اس کی درخواست رد کر دی اور مسجد نبوی میں تقریر کر کے اس کے مکر وفریب اور جھوٹ کا پردہ فاش کر دیا اور فرمایا: ''اس شخص نے محض لوگوں کو دھوکا اور فریب دینے کے لیے اہل بیت کی محبت اور دعوت کو آڑ بنایا ہے ورنہ اس کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

سیدنا زین العابدین سے مایوس ہونے کے بعد ان کے سوتیلے چچا سیدنا محمد بن حنفیہ سے سرپرست بننے کی درخواست کی کیونکہ اسے کسی بڑی شخصیت کی سرپرستی کی بہت ضرورت تھی۔ سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ مختار نے محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ سے سرپرستی کی درخواست کی ہے تو انھوں نے ان کو بھی روک دیا اور انھیں بتایا کہ اس مکار شخص نے محض لوگوں کو اپنے دام فریب میں پھنسانے کے لیے محبت اہل بیت کا روپ دھارا ہوا ہے، حقیقت میں اس کو ان سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے بلکہ وہ ان کا دشمن ہے۔ میری طرح آپ کو بھی اس کا پردہ چاک کرنا چاہیے۔ محمد بن حنفیہ نے اس بارے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے رائے لی۔ اس زمانہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ان دونوں بزرگوں کو اپنی بیعت کے لیے مجبور کر رہے تھے اور یہ بیعت سے برابر انکار کر رہے تھے، اور ان کو ان کی جانب سے بڑا خطرہ تھا، اس لیے مختار کی حمایت حاصل کرنے کے لیے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے محمد بن حنفیہ کو سرپرستی قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ (مروج الذہب: ۸۰/۲)

محبان اہل بیت کا مرکز عراق تھا۔ وہاں یہ تحریک زیادہ کامیاب ہو سکتی تھی علاوہ ازیں قسم کی انقلابی تحریکوں کے لیے وہاں کی آب وہوا اور ماحول بڑا سازگار تھا، اس لیے محمد بن حنفیہ کو سرپرست بنانے کے بعد مختار نے ان سے عراق میں کام کرنے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خطرہ سے بچنے کے لیے اس کی سرپرستی تو قبول کر لی تھی لیکن ان کو خود اس پر اعتماد اور بھروسہ نہ تھا، اس لیے اجازت تو دے دی لیکن اس کی نگرانی کے لیے ایک شخص عبداللہ بن کامل ہمدانی کو ساتھ کر دیا اور اس کو مختار سے ہوشیار رہنے کی ہدایت بھی کر دی۔ (طبقات ابن سعد: ۷۱/۵)

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ مختار بڑا چالاک اور ہوشیار آدمی تھا اور اس قسم کا آدمی نہایت دور اندیش اور عاقبت اندیش ہوتا ہے، اس لیے اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بھی اپنا تعلق منقطع نہ کیا تاکہ اگر اس تحریک میں کامیابی نہ ہو تو کم از کم ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا دروازہ تو اس کے لیے کھلا رہے۔ انھیں اس نے یہ دھوکا دیا کہ عراق میں اس کا قیام ان کے لیے زیادہ مفید ہوگا، اور وہ وہاں جا کر بنی ہاشم کے بہی خواہوں کو بنو امیہ کے مقابلہ میں انکی مدد کے لیے آمادہ کرے گا، اس لیے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی اجازت مرحمت فرما دی۔

(مروج الذہب: ۸۰/۲)

ان دونوں حضرات سے اجازت لے کر مختار عراق پہنچا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے حقیقی جانشین تو سیدنا زین العابدین تھے، لیکن وہ مختار کے حق میں نہ تھے، اس لیے اس نے نہایت چالاکی سے اہل بیت کی تحریک کا رخ آل فاطمہ سے محمد بن حنفیہ کی طرف پھیر دیا اور انھیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا صحیح جانشین ظاہر کر کے ان کی دعوت

Marfat.com

شروع کر دی۔ (فرق الشیعہ، نوبختی: ص۲۳۔۲۶) اپنے بارے میں اس نے نزول وحی کا دعویٰ کر دیا۔ بداء یعنی اللہ تعالیٰ سے غلطی کے امکان کا عقیدہ ایجاد کیا، اور ایک کرسی کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب کر کے اسے بنی اسرائیل کے تابوت سکینہ کی طرح مقدس اور وسیلہ فتح وظفر قرار دیا۔ (الملل والنحل، شہرستانی: ۱/۱۹۹)

سلیمان بن صرد خزاعی مختار ثقفی کی کارروائیوں سے آگاہ تھے، لیکن سلیمان نے جب دیکھا کہ باہمی مخالفت بڑھانے سے دشمنان اہل بیت مطلع ہو کر آج تک کا تانا بانا سب درہم برہم کر دیں گے اور جو مروان رضی اللہ عنہ شام پر حکمران ہے وہ ابن زیاد کو شام سے کوفہ فوراً روانہ کر دیں گے، اس لیے انھوں نے اپنے بیعت کرنے والوں کو جمع کر کے کہہ دیا کہ اگر مختار اپنے امام محمد بن حنفیہ کی طرف سے دعوت دیتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ ہمارے امام تو علی بن حسین رضی اللہ عنہ ہیں، اور جب تک میرا اپنا مقرر کردہ وقت نہ آ جائے میں حکومت کے خلاف خروج نہیں کروں گا۔ آخر کار رفتہ رفتہ سنہ ۶۷ھ میں سلیمان بن صرد کوفہ سے نکل کھڑے ہوئے اور مقام نخلیہ پر قیام کر کے ہر طرف قاصد بھیجے اور محبان اہل بیت کو طلب کیا، لیکن افسوس کہ اس موقع ضرورت پر ایک لاکھ مبایعین میں سے صرف دس ہزار آئے۔ یہاں سلیمان بن صرد نے ایک پر جوش تقریر کی:

''لوگو! جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور روز قیامت کی بہتری مطلوب ہو وہ ہمارے ساتھ چلے اور جس شخص کو دنیا درکار ہو وہ ہمارا ساتھ چھوڑ دے۔''

ہر طرف سے آوازیں آئیں کہ ہمارا مقصد صرف اپنے گناہ کی توبہ اور خون حسین کا انتقام ہے، اور کچھ ہمارا مقصد نہیں۔ عبداللہ بن سعد نفیل نے کہا:

''بھائیو! قاتلان حسین کی اکثریت تو کوفہ میں موجود ہے انھیں چھوڑ کر کسی اور طرف جانے کے کیا معنی؟''

لوگوں نے کہا: ''بات تو ٹھیک ہے مگر سلیمان نے جواب دیا: ''قاتلانِ حسین کا سرگروہ عبیداللہ بن زیاد ہے، پہلے اسے کیفر کردار تک پہنچانا چاہیے، اہل کوفہ سے بعد میں نمٹ لیں گے۔''

مختصر یہ کہ یہ لشکر نخیلہ سے کوچ کر کے عازم شام ہوا۔ جب یہ لوگ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی قبر کے پاس سے گزرے تو آپس میں کہنے لگے کہ مناسب یہ ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی زیارت سے مشرف ہوں اور سچے دل سے ان کے حضور توبہ کریں اور معافی کے خواستگار ہونے کے بعد اپنے مقصد پر متوجہ ہوں۔ جونہی ان لوگوں کی نظر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی قبر پر پڑی تو سب کے سب سواری سے اتر کر آہ وفغاں کرتے کرتے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی قبر پر انھوں نے یہ دعا مانگی:

''اے اللہ! حسین شہید پر رحمت نازل فرما۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہم ان کے دین اور ان کے طریقہ پر ہیں۔ ان کے قاتلین کے دشمن اور ان کے محبین کے دوست ہیں۔ اے اللہ! ہم نے جگر گوشۂ رسول سے بے وفائی کی تو ہمارے اس گناہ کو معاف کر دے اور ہماری توبہ قبول فرما۔''

Marfat.com

کربلا سے چل کر یہ لوگ قرقیسیا پہنچے۔ وہاں زفر بن حارث کی مدد حاصل کر کے عین الوردہ کی طرف بڑھے۔ عین الوردہ بلاد جزیرہ میں سب سے بڑا شہر تھا۔ یہاں آ کر ان کو معلوم ہوا کہ عبدالملک بن مروان شام پر حکمران ہو گیا ہے۔ اس نے توابین کے لشکر کی آمد کا حال سن کر پہلے ہی سے پانچ امرائے عالی قدر کی معیت میں لشکر مقابلہ کے لیے روانہ کر دیا۔ یہاں سلیمان نے ایک خطبہ پڑھا جس میں اپنے لشکر کو بہت کچھ وعظ و نصیحت کی اور کہا کہ اگر میں مارا گیا تو میرے بعد مسیّب تمھارے امیر ہوں گے اور ان کے بعد عبداللہ بن سعد اور پھر عبداللہ بن وال اور ان کے بعد رفاعہ بن شداد ہوں گے۔ ابن زیاد کے ایک افسر شرحبیل بن کلاع سے توابین کے لشکر کا مقابلہ ہوا۔ توابین نے شرحبیل کے لشکر کو شکست دی۔ ابن زیاد نے پھر حصین بن نمیر کو دوسرا لشکر دے کر بھیجا۔ توابین نے انھیں بھی شکست دی۔ توابین بڑی بے جگری کے ساتھ لڑتے اور اپنے دشمنوں کو شکست دیتے رہے لیکن ابن زیاد ان کے مقابلہ میں تازہ دم فوج بھیجتا رہا۔ مسیّب نے کہا کہ شامی لشکر بہت زیادہ ہے ان پر شب خون مارنا بہتر ہو گا۔ چنانچہ شب خون مارا گیا لیکن نتیجہ حسب دل خواہ نہ نکلا کیونکہ دوسرے روز غروب آفتاب تک سلمان بن صرد اور بعد دیگرے ان کے تین ساتھی شامیوں کے مقابلہ میں مارے گئے۔ اب صاحب طبل و علم رفاعہ بن شداد ہوا لیکن رفاعہ چند قدم آگے بڑھ کر پھر لوٹ آیا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ ہمارے آدمی زیادہ مارے گئے ہیں۔ اگر ہم اسی طرح ثابت قدم رہ کر لڑتے رہیں تو جو باقی ہیں وہ بھی مارے جائیں گے اور ہمارا مذہب دنیا سے نابود ہو جائے گا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ کوفہ لوٹ چلیں۔ چنانچہ رفاعہ نے راتوں رات دریا عبور کر کے پل کو توڑ دیا۔ جب صبح نمودار ہوئی تو حصین بن نمیر نے رفاعہ کے تعاقب میں لشکر دوڑائے تو موقع جنگ پر ان کا نام و نشان تک نہ تھا۔

(یہ سب حالات ہم نے ابن اثیر اور قاضی نور اللہ شوستری کی کتاب ''مجالس المومنین'' سے لیے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مجالس المومنین: ص ۳۰۵)

تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ کوفہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں اور شیعوں کا مرکز تھا۔ یہیں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور یہیں سے توابین کی تحریک چلی تھی۔ اس لیے مختار ثقفی کی تحریک کو بھی یہاں بہت پذیرائی اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہزاروں آدمی اس کے ساتھ ہو گئے اور اس کا گھر شیعان علی کا مرکز بن گیا۔

عبداللہ بن مطیع نے جو سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جانب سے کوفہ کے گورنر تھے، اور ایاس بن نضر کمشنر پولیس نے مختار کی حکومت مخالفانہ سرگرمیاں دیکھ کر روک ٹوک شروع کی۔ اس وقت مختار کی دعوت میں زیادہ تر عوام شریک ہوئے تھے، کوئی ممتاز اور مقتدر آدمی اس کا معاون اور مددگار نہ تھا، اس لیے اس وقت وہ خاموش رہا اور کوفہ کے ایک مقتدر رئیس ابراہیم بن اشتر کو جو پرانے شیعان علی میں سے تھا، لیکن مختار کی تحریک میں شامل نہ تھا، محمد بن حنفیہ کی جانب سے ایک فرضی خط دے کر اس کو اپنا مددگار اور معاون بنا لیا۔ اس کی حمایت

Marfat.com

حاصل ہو جانے کے بعد مختار کا بازو بہت قوی اور مضبوط ہو گیا۔ اور ابراہیم کے ساتھ مل کر مختار نے بے خوف و خطر کام شروع کر دیا۔ (اخبار الطوال: ص ۲۸۹)

بعض روایات میں ہے کہ بعض شیعان علی نے مشورہ کیا کہ مختار نے یہ تحریک محمد بن حنفیہ کے نام پر شروع کر رکھی ہے، ہمیں خود محمد بن حنفیہ کے پاس جا کر اس معاملہ کی تحقیق کر لینی چاہیے۔ چنانچہ عراق سے ایک وفد مدینہ طیبہ پہنچ کر محمد بن حنفیہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور انھیں تمام واقعات سنا کر ان کی رائے معلوم کی۔ محمد بن حنفیہ نے اول اہل بیت کے مناقب بیان کیے، پھر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی حسرت ناک شہادت کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ مجھ سے ایک شخص کے بارے میں پوچھتے ہو جو اہل بیت کے خون کا قصاص لینا چاہتا ہے، تو سنو میری دلی آرزو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دشمنوں سے ان کے مظالم کا انتقام لے خواہ کسی شخص کے ذریعہ سے لے۔

اہل کوفہ کے اس وفد کے مدینہ منورہ تحقیق حال کے لیے جانے سے مختار کو بڑی تشویش ہو گئی تھی کیونکہ معلوم نہیں محمد بن حنفیہ کیا جواب دیتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ چنانچہ جیسے ہی یہ لوگ واپس آئے مختار نے گھبرا کر اور پریشانی کے عالم میں ان سے پوچھا کہ محمد بن حنفیہ نے کیا جواب آپ لوگوں کو دیا۔ مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ تم لوگ شک میں مبتلا ہو گئے ہو۔ جب ان لوگوں نے محمد بن حنفیہ کے جواب کو نقل کیا تو مختار نے بے اختیار نعرہ تکبیر بلند کیا اور فوراً ایک جلسہ منعقد کیا حالانکہ ابن حنفیہ کا یہ جواب نہ اس کی تائید میں تھا اور تردید میں، لیکن اس نے اس جواب کو اپنی حمایت میں سمجھا۔ اس وجہ سے اس نے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''یہ لوگ امام مہدی کے پاس گئے تھے۔ انھوں نے ان کو بتایا ہے کہ میں ان کا وزیر، مددگار اور پیغام بر ہوں اور تمھیں حکم دیتا ہوں کہ بدعہدوں سے جنگ اور اہل بیت کے خون کے قصاص کے معاملہ میں تم میرا ساتھ دو۔''

اسی دوران میں عبداللہ بن مطیع کوفہ کے گورنر مقرر ہوئے اور انھوں نے مختار کی اس تحریک کو دبانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مختار نے اب کھل کر میدان میں آنے اور کوفہ پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعض مشیروں نے اس کو مشورہ دیا کہ کوفہ پر قبضہ کرنے سے قبل کوفہ کے با اثر رئیس اور اہل بیت نبوت کے محبّ ابراہیم بن اشتر کی حمایت حاصل کرنی نہایت ضروری ہے۔ مختار نے محمد بن حنیفہ کی جانب سے ایک جعلی خط بنا کر ابراہیم کے سامنے پیش کیا جس میں لکھا تھا:

> ''محمد مہدی کی طرف سے ابراہیم بن اشتر کے نام۔ اما بعد!
> میں تمھارے پاس اپنا وزیر اور معتمد بھیج رہا ہوں۔ میں نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ میرے دشمنوں سے جنگ کرے اور اہل بیت کے خون کا انتقام لے۔ جہاں تک ممکن ہو تم ان کی مدد کرو۔ کوفہ سے شام تک جس قدر علاقہ فتح ہو گا تم اس کے حاکم بنا دیئے جاؤ گے۔''

Marfat.com

ابراہیم نے خط کا مضمون دیکھ کر کہا کہ میرے پاس بھی محمد بن حنیفہ کے خط رہتے ہیں، انھوں نے کبھی اپنے آپ کو مہدی نہیں لکھا۔ مختار نے کہا: ''اب نیا زمانہ ہے اور نئے حالات ہیں'' ابراہیم کے چند ساتھیوں نے گواہی دی کہ یہ خط ہمارے سامنے محمد بن حنفیہ نے لکھا ہے۔ ابراہیم بن اشتر نے مختار کو تعظیم کے صدر میں بٹھایا اور مختار کے ہاتھ پر بیعت کر لی جس سے مختار کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اب ابراہیم بن اشتر کا مختار کے پاس آنا شروع ہو گیا اور دونوں نے کوفہ پر قبضہ کرنے کی پلاننگ شروع کر دی۔ ایک روز ابراہیم اپنے ایک سو مسلح ساتھیوں کے ساتھ بازار میں سے گزر کر مختار کے پاس جا رہا تھا کہ کوتوال شہر ایاس نے اسے راستہ میں روک لیا اور اسے دھمکی دی کہ اگر تم نے مختار کے یہاں آمد و رفت نہ چھوڑی تو تم کو قتل کر دیا جائے گا۔ ابراہیم بااثر آدمی تھا، اس نے اس دھمکی کے جواب میں ایاس کو قتل کر دیا۔ عبداللہ بن مطیع گورنر کوفہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ پولیس کمشنر ایاس کو قتل کر دیا گیا ہے تو انھوں نے ابراہیم کی گرفتاری کے لیے آدمی بھیج دیے۔ ابراہیم نے ان سپاہیوں کو شکست دے کر خود عبداللہ بن مطیع کا محاصرہ کر لیا۔ ابراہیم اور مختار کی طاقت اب اس قدر بڑھ چکی تھی کہ عبداللہ بن مطیع ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور انھیں جان بخشی کرا کر اپنی جان بچانی پڑی۔ عبداللہ بن مطیع کی شکست کے بعد کوفہ اور اس کے ساتھ سارے عراق پر مختار کا قبضہ ہو گیا۔ صرف بصرہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس رہ گیا۔ (اخبار الطوال: ص ۳۰۰)

محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی قید اور رہائی:

حجاز میں محمد بن حنفیہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے مسلسل انکار کر رہے تھے۔ ان کے بیعت نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ امت آپ پر متفق نہیں ہے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کافی عرصہ سے ان دونوں سے بیعت لینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ دونوں حضرات ان کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دے رہے تھے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے اب تک جبر سے کام نہیں لیا تھا۔ عراق پر مختار کے قبضہ کے بعد جب ان پر اس کی حقیقت واضح ہوئی اور محمد بن حنفیہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا تعلق معلوم ہوا، اس وقت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے ابن حنفیہ پر دباؤ ڈالا اور ان کو اور بعض روایات کے مطابق ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بھی زمزم کی چار دیواری میں قید کر کے دھمکی دی کہ اگر وہ بیعت نہیں کریں گے تو انہیں جلا دیا جائے گا۔ محمد بن حنفیہ نے مختار کو اس کی اطلاع دی۔ اس نے فوراً ان کو چھڑانے کے لیے تھوڑی سی فوج اور چار لاکھ نذر بھیجی۔ اس فوج نے مکہ پہنچ کر محمد بن حنفیہ کو قید سے نکالا۔ (ابن اثیر: ۲۰۶/۴)

قاتلانِ حسین سے انتقام:

مختار کی قوت جم چکی تھی۔ اس نے اب کوفہ کے ان تمام لوگوں کا پتہ لگا کر جنھوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ

Marfat.com

کی شہادت میں کسی قسم کا حصہ لیا تھا، ان کو قتل کیا اور ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا۔ (ابن اثیر: ۲۰۶/۴) پھر واقعہ کربلا کی شامی فوج کے افسروں کے قتل کے لیے فوجیں روانہ کیں اور چند دنوں میں شمر ذی الجوشن، عمر بن سعد، خولی، عبداللہ بن سعد جہنی، مالک بن بدی، حمل بن مالک محاربی، اصجی، زیاد بن مالک ضبعی، عثمان بن خالد جہنی، عمران بن خالد، تشیری، عبدالرحمٰن بن فشارو بجلی، عبداللہ بن قیس خولانی، بشیر بن شمیط اور عبیداللہ بن زیاد وغیرہ کو قتل کر دیا، اور بعض کی لاشوں کو آگ میں جلا دیا۔ شمر ذی الجوشن کی لاش کو کتوں سے پھڑوایا گیا۔ غرض کہ قاتلانِ حسین کو چن چن کر قتل کیا۔ (ابوالفداء: ۱۹۴/۱، اخبار الطوال: ص ۳۰۲)

ابن زیاد موصل میں مقیم تھا اور عراق کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کر رہا تھا مختار نے کوفہ پر قابض ہوتے ہی یزید بن انس اسدی کی سپہ سالاری میں اس کے مقابلہ کے لیے ایک فوج بھیجی۔ ابن زیاد کو معلوم ہوا تو اس نے یزید بن انس کو روکنے کے لیے ربیعہ بن مخارق اور عبداللہ بن جملہ کو تین تین ہزار کے دو لشکروں کے ساتھ بھیجا۔ مقام باقلی میں دونوں فریقوں کا مقابلہ ہوا۔ یزید بن انس نے شامیوں کو شکست فاش دی اور ان کے بہت سے آدمی قتل ہوئے۔ لیکن یزید بن انس سخت بیمار تھا۔ فتح کے فوراً بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا جانشین ورقاء بن عازب اسدی مقرر ہوا۔ ورقاء کو معلوم ہوا کہ ابن زیاد اسی ہزار کا لشکر لے کر خود مقابلہ کے لیے آ رہا ہے۔ ورقاء نے مقابلہ کچھ مناسب نہ سمجھا اور واپس لوٹ آیا۔ مختار نے چند روز بعد ابراہیم بن اشتر کی سپہ سالاری میں ابن زیاد کے مقابلہ کے لیے دوسری فوج بھیجی۔ اس فوج میں مختار کے بہترین اور آزمودہ کار افسر شامل تھے۔ ابن زیاد کو جب اس لشکر کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو وہ بھی ایک عظیم اور زبردست فوج ساتھ لے کر بڑھا۔ مہر خاذر پہ دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ شامی لشکر سے قبیلہ قیس کے لوگ ابراہیم بن اشتر سے مل گئے۔ ابن زیاد کو شکست فاش ہوئی اور وہ ابن اشتر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ابن زیاد کے علاوہ دوسرا مشہور شامی سردار حصین بن نمیر بھی قتل ہوا۔ ابراہیم نے ابن زیاد کا سر کاٹ کر جسم جلا دیا اور سر مختار کے پاس کوفہ بھیج دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ مختار نے یہ سر مدینہ منورہ میں سیدنا زین العابدین کے پاس بھیجا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ابن زیاد اور دوسرے شامی افسروں کے سر قصر کوفہ کے ایک گوشہ میں پڑے ہوئے تھے کہ ایک پتلا سا سانپ آیا اور اس نے ان سروں کے بیچ میں چکر لگایا اور پھر ابن زیاد کے منہ میں داخل ہو کر ناک میں سے اور پھر ناک میں داخل ہو کر منہ میں سے نکل گیا۔ (ابن اثیر: ۱۰۳/۴)

اس قسم کی روایات جو تاریخ میں لکھی گئی ہیں اگر آپ کرید کر دیکھیں تو ان کے راوی اکثر و بیشتر سبائی اور رافضی ہوں گے۔

مختار کی عرب دشمنی:

مختار کے حامی اور قوت بازو زیادہ تر عجمی تھے۔ انہی کے بل پر اس کی یہ تحریک چل رہی تھی۔ عرب اس

۱۴۳۴۵۹
Marfat.com

میں کم شریک تھے، اس لیے حصول اقتدار کے بعد اس نے ان عجمیوں کے مراتب اور مناصب بڑھائے، انھیں انعام و اکرام سے نوازا اور ان کے مقابلہ میں عربوں کے ساتھ اس کا رویہ نہایت حقارت آمیز تھا۔ اس لیے اشراف عرب اس سے بگڑ گئے۔ ان موالی نے اپنے آقاؤں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے سیکڑوں عربوں کو قتل حسین کے الزام میں قتل کروا دیا اور ان کا مال و دولت خود حاصل کر لیا۔ عربوں کو قدرتی طور پر مختار کا یہ طرز عمل نہایت ناگوار گزرا۔ جب مختار نے ابن زیاد کے مقابلہ میں پہلی مرتبہ فوج بھیجی تو عربوں نے اس کے خلاف سخت بغاوت کی لیکن ابراہیم ابن اشتر نے یہ بغاوت فرو کر دی۔ اس کے بعد مختار نے عربوں کے خلاف سخت بغاوت کا رویہ اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیکڑوں اشراف کوفہ سے بھاگ کر بصرہ چلے گئے جہاں عبداللہ بن زبیر کی حکومت تھی۔

مختار کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے عجمیوں سے کہا کہ عرب صرف تمھاری وجہ سے میرے خلاف ہو گئے ہیں اور ان میں سے کئی علاقہ چھوڑ کر بصرہ چلے گئے ہیں۔ اس لیے تم کو وفاداری اور وفا شعاری کا ثبوت دینا چاہیے۔ چنانچہ وہ انھیں لے کر عربوں کے مقابلہ کے لیے نکلا اور عین موقع پر اس نے بعض عرب قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس لیے عرب شکست کھا گئے، اور ان کی بڑی تعداد قتل اور گرفتار ہوئی۔ مختار نے سب قیدیوں کے سر قلم کرا دیے۔ انھیں شکست دینے کے بعد کوفہ کے عرب عمائد اور شرفاء کو قتل کرنا شروع کیا، یہ بھی ان کے بصرہ کی طرف بھاگنے کی ایک وجہ تھی۔

قاضی نور اللہ شوستری نے لکھا ہے کہ جب مختار نے عبداللہ بن مطیع کو کوفہ کے گورنر ہاؤس میں محصور کر لیا تو تین روز گزرنے کے بعد خوراک کی قلت کے باعث وہ مختار سے امن کا خواستگار ہوا۔ مختار نے اس کی استدعا کو منظور کر لیا اور جونہی گورنر ہاؤس (دار الامارۃ) خالی ہوا، وہ اس میں اتر پڑا۔ بارہ ہزار درہم جو بیت المال میں موجود پائے سب کے سب اپنے دوست احباب میں تقسیم کر دیے۔ اس پر جھٹ کوفیوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے نام پر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے کے لیے محمد بن حنفیہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مختار ولایت کوفہ پر قابض ہو گیا تو عبدالرحمٰن بن قیس ہمدانی کو موصل پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا۔ اس کے بعد روز بروز فتوحات کا سلسلہ وسیع ہونے لگا اور ہر جگہ مختار کے عمال مقرر ہوتے گئے۔ ابن مروان نے یہ حالات سن کر عبیداللہ بن زیاد کو پھر عراق اور مختار کو مسخر کرنے کے لیے مقرر کیا اور موصل سے کوئی پانچ فرسنگ کے فاصلہ پر دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ سورج نکلنے سے لے کر غروب آفتاب تک میدان جنگ گرم رہا۔ اس اثناء ابن زیاد کے لشکر نے بھاگنے کی ٹھان لی اور عراقیوں کی تیغ یمانی نے سرفشانی شروع کر دی۔ ابن زیاد مع ستر ہزار ساتھیوں کے مارا گیا۔ ابراہیم بن مالک الاشتر سپہ سالار لشکر کوفہ نے دشمنوں پر فتح پا کر ابن زیاد، حصین بن نمیر، شرحبیل بن ذی الکلاع، ربیعہ بن مخارق وغیرہ رؤسائے شام کے سر کاٹ کر مختار کے پاس بھیج دیے۔

مختار نے امرائے شام کے سروں کو مع فتح نامہ اور تیس ہزار دینار مکہ مکرمہ میں محمد بن حنفیہ کے پاس

Marfat.com

روانہ کر دیے۔ انھوں نے خوشی کے شکرانے میں دو رکعت نماز ادا کی اور حکم دیا کہ شامیوں کے سروں کو لٹکایا جائے لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مانع ہوئے، چنانچہ ان کو دفن کر دیا گیا۔

جب مختار مذکورہ بالا علاقوں پر قابض ہو گیا تو اس کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے انتقام کا خیال چنداں مرکوز خاطر نہ رہا۔ اس پر محمد بن حنفیہ اور دوسرے شیعان علی اس کو ملامت کرتے اور کہتے تھے:

''یہ مردود شخص اہل بیت نبوت کی دوستی کا دم تو بھرتا ہے لیکن اپنے قول میں سچا نہیں ہے کیونکہ ابھی تک بہت سے لوگ اس جماعت کے کوفہ میں نہایت آسائش و آرام سے اپنی زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں اور مختار نرا غفلت شعار اور کاہل ہو گیا ہے۔''

مختار نے جب یہ شکایت سنی تو اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور حکم دیا کہ عبداللہ بن کامل کوتوال شہر ان تمام لوگوں کی فہرست مرتب کر کے پیش کرے جو کربلا میں گئے تھے۔ جس پر مختار نے ہر ایک کو اس طرح قتل کیا کہ شاید و باید ع

کہ خیرہ ماند در او دیدۂ اولی الابصار

تمام مقتولین کی تعداد جو مختار کے ہاتھ سے قتل ہوئے ۸۰ ہزار تین سو تین تک ہو گئی۔

(ماخوذ از مجالس المومنین، مجلس ہشتم: ص ۳۵۶-۳۵۹)

ملا باقر مجلسی نے جلاء العیون میں لکھا ہے کہ مختار نے ۴۰ ہزار دینار سیدنا زین العابدین کی خدمت میں بھیجے لیکن آپ نے اس کا یہ ہدیہ قبول نہ فرمایا بلکہ مسترد کر دیا کیونکہ اس نے مذہب باطل اختیار کر لیا تھا۔

(جلاء العیون: ص ۵۲۶)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی کرسی:

عوام میں اپنی تحریک کو مقبول بنانے کے لیے مختار نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی کرسی کا ڈھونگ رچایا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوفہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ایک بھانجے جعدہ بن ہبیرہ رہا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مختار نے ان کے بیٹے طفیل بن جعدہ سے کہا کہ تمھارے ہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جو کرسی ہے وہ مجھے دے دو۔ جعدہ نے انکار کیا لیکن جب مختار نے بہت اصرار کیا تو انھوں نے ایک روغن فروش پڑوسی کے ہاں سے ایک پرانی کرسی لا کر مختار کے حوالے کر دی۔ مختار نے اس کرسی پر ریشمی غلاف چڑھا کر اور ایک خوبصورت صندوق میں رکھ کر عام زیارت کے لیے جامع مسجد میں رکھا اور اعلان کیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے تابوت سکینہ فتح و نصرت کی نشانی کے طور پر بھیجا تھا اسی طرح اس امت کے لیے یہ کرسی بھیجی ہے۔ ابن زیاد کے مقابلہ کے لیے جو فوج گئی تھی اس کے ساتھ بھی برکت کے لیے ایک خچر پر لاد کر اور اوپر پردے ڈال کر یہ کرسی بھیجی گئی۔ جب میدان جنگ میں اہل کوفہ کو فتح ہوئی تو اسے اس کرسی ہی کی کرامت قرار دیا گیا۔ اب کیا تھا

Marfat.com

سادہ لوح عوام اس کے ہتھ کنڈوں کا بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کرسی کے بارے میں بھی عوام میں مشرکانہ عقیدے پھیل گئے اور خانہ کعبہ کی طرح اب اس کرسی کا طواف بھی ہونے لگا۔ صحیح العقیدہ مسلمان جب ان لوگوں کو ایسا کرتے دیکھتے تو مختار کی ان بیہودہ حرکتوں پر کڑھتے اور بیزاری کا اظہار کرتے۔ چنانچہ اعشیٰ ہمدانی کہتے ہیں:

''میں گواہی دیتا ہوں کہ تم (اے مختار) سبائی مذہب کے ہو، اور شرک کے پاسبانو! میں تم لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ تمھاری کرسی تابوت سکینہ نہیں خواہ تم اس پر کتنے ہی غلاف چڑھا دو اور نہ یہ تابوت سکینہ کی مانند ہے خواہ شیام اور نہد اور خارف اس کے گرد چکر لگائیں۔ میں تو محبّ آل محمد ہوں اور صرف اسی وحی کو مانتا ہوں جو کلام پاک میں محفوظ ہے۔''

(ابن اثیر: ۴/۱۰۰، البدایہ والنہایہ: ۸/۲۷۹)

اس کی تفصیل تاریخ کی اور کتابوں میں بھی ہے۔

معصب بن زبیر اور مختار کا مقابلہ:

کوفہ میں قتل عام کے باعث سیکڑوں لوگ وہاں سے بھاگ کر بصرہ پہنچے اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بھائی مصعب بن زبیر سے جو بصرہ کے گورنر تھے، فریاد کی کہ اس کذاب اور مکار نے ہمارے اچھے لوگوں کو قتل کیا، ہمارے گھروں کو منہدم کر دیا اور ہمارا شیرازہ درہم برہم کر دیا۔ عجمیوں کو ہمارے سروں پر مسلط کر دیا، ہمارا مال ان میں لٹایا۔ آپ اس کے مقابلہ کے لیے نکلیں، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔

مختار مصعب کا حریف تھا ہی، عربوں کا سہارا پا کر وہ اس کے مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور دنیا کے نامور سپہ سالار مہلب بن ابی صفرہ کو جو خارجیوں سے برسر پیکار تھے، واپس بلا کر جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مختار کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے ایک بہادر افسر احمد بن سلیط کو ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ دوسری طرف مصعب خود فوجیں لے کر نکلے۔ مذار کے مقام پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ ایک خونریز معرکہ بعد احمد بن سلیط نے شکست کھائی۔ اس کی فوج کا بڑا حصہ تباہ و برباد ہو گیا۔ باقی حصہ کوفہ لوٹ گیا۔ مصعب اس بھاگتی ہوئی فوج کا تعاقب کرتے ہوئے کوفہ تک پہنچ گئے۔

احمد بن سلیط کی شکست فاش کے بعد مختار کوفہ ہی میں موجود تھا۔ اب وہ خود مقابلہ میں آیا لیکن اس نے بھی مصعب کے ہاتھوں شکست فاش کھائی اور اس کی فوج بری طرح مقتول ہوئی اور وہ پسپا ہو کر کوفہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ مصعب نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ پورے چار ماہ تک محاصرہ رہا۔ مختار نے جب اپنی رہائی کی کوئی صورت نہ دیکھی تو وہ جان پر کھیل کر باہر نکل آیا اور اپنے معتمد علیہ امیر سائب بن مالک کلبی سے کہا: ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم دین کے لیے نہیں بلکہ حسب کے لیے آخری مقابلہ کر لیں۔ اس وقت سائب پر اس کی اصل

Marfat.com

حقیقت ظاہر ہوئی۔ اس نے کہا کہ دنیا تو اب تک یہی سمجھتی تھی کہ تم دین کے لیے یہ جان بازی دکھا رہے ہو۔ مختار نے جواب دیا: ''نہیں، میری عمر کی قسم! یہ سب محض حصول دنیا کے لیے تھا۔ میں نے دیکھا کہ شام عبدالملک کے پاس ہے، حجاز عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس، بصرہ مصعب بن زبیر کے قبضہ میں، عروض پر نجدہ حروری قابض ہے اور خراسان پر عبداللہ بن حازم کا تسلط ہے، اور میرے حصہ میں کچھ بھی نہیں، اس لیے میں نے بھی قسمت آزمائی کی، لیکن خون حسین کے انتقام کی دعوت کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے میں نے اس کو حصول مقصد کا آلہ بنایا۔ (اخبار الطوال: ص ۳۱۵)

اس کے بعد وہ اپنا خاص دستہ لے کر باہر نکلا جس میں ایک روایت کے مطابق ۱۹ جانثار تھے۔ اب کوفہ کا رنگ بھی بدل چکا تھا۔ جب مختار اور اس کے ساتھی کوفہ کے بازاروں میں سے گزرتے تو مکانوں کی چھتوں پر سے ان پر تیر برسائے جاتے اور غلاظت پھینکی جاتی۔ ان سب چیزوں کے باوجود اس نے بڑی شجاعت اور بہادری سے مصعب کا مقابلہ کیا، لیکن اب اس کی قوت ختم ہو چکی تھی اس لیے اس کو شکست فاش ہوئی اور اس کا حفاظتی دستہ پسپا ہو کر گورنر ہاؤس میں داخل ہو گیا لیکن مصعب کے فوجیوں نے مختار کو داخل نہ ہونے دیا اور وہ چند آدمیوں کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا اور لڑتے لڑتے مارا گیا۔ مصعب نے اس کا سر قلم کر کے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔ مختار کے قتل کے بعد اس کے قوت بازو اشتر بن مالک ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو گئے اور عراق پھر ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں آ گیا۔ (اخبار الطوال: ص ۳۱۴)

ایک روایت میں ہے کہ مصعب بن زبیر نے مختار کا سر کاٹ کر عبداللہ بن زبیر کے پاس مکہ بھیج دیا اور اس کے ہاتھ کٹوا کر کوفہ کی جامع مسجد میں آویزاں کر دیئے۔ ہاتھ شاید اس لیے آویزاں کیے کہ لوگ دیکھ لیں کہ یہ وہ ہاتھ ہیں جو لوگوں پر تشدد اور ظلم کیا کرتے تھے۔ یہ واقعہ سنہ ۶۷ھ کا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ مصعب بن زبیر کی فوج میں ایک دستہ ان لوگوں کا بھی تھا جو کوفہ سے بھاگ کر بصرہ پہنچے تھے۔ اس دستہ فوج کی کمان محمد بن الاشعث کو دی گئی تھی۔ مختار کی شکست کے بعد جب لشکر سے کچھ لوگوں نے فرار کیا تو محمد بن الاشعث نے ان کا تعاقب کیا اور بھاگتے ہوئے لوگوں کو دور تک قتل کرتا چلا گیا۔ مختار بھاگ کر کوفہ کے قصر امارت میں محصور ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک ہزار آدمی قصر کے اندر محصور تھے۔ آخر کار مختار نے سر میں خوشبودار تیل ڈالا، کپڑوں کو عطر ملا اور ہتھیار لگا کر قصر کوفہ سے نکلا مختار نے باہر نکل کر حملہ کیا اور عبداللہ بن دجاجہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ مختار کے ساتھیوں میں عبیداللہ بن علی بن ابی طالب بھی مقتول ہوئے۔ جو لوگ قصر امارت میں محصور تھے، مصعب نے ان کو گرفتار کیا۔ تمام وہ لوگ بھی جو میدان جنگ میں گرفتار ہوئے تھے کوفہ لائے گئے۔ ایک وسیع میدان میں تمام قیدیوں کو اکٹھا کر کے ان کے بارے مشورہ کیا گیا۔ مہلب بن ابی صفرہ نے کہا کہ ان سب کو چھوڑ دیا جائے لیکن محمد بن الاشعث نے مصعب بن زبیر کو اس رائے پر عمل کرنے سے منع کیا۔ اب مصعب حیران تھے کہ کیا کروں۔ کوئی کہتے تھے کہ ان لوگوں نے مختار کے ساتھ مل کر کوفہ میں کوئی گھر

Marfat.com

ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی قتل نہ کیا ہو۔ اگر یہ لوگ اب چھوڑ دیئے گئے تو اسی وقت تمام کوفہ باغی ہو جائے گا۔ ان لوگوں کی کل تعداد چھ ہزار تھی جن میں عرب صرف سات سو تھے اور باقی سب ایرانی تھے۔ مصعب بن زبیر نے آخر سوچ کر یہی فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ سب قتل کر دیئے گئے۔

مختار ثقفی کا حدود اربعہ:

مختار ثقفی ایک بڑی عجیب وغریب شخصیت کا حامل تھا۔ اس کا تعلق بنوثقیف سے تھا۔ حجاج بن یوسف کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے تھا، اس لیے ان دونوں کے نام کے ساتھ ثقفی آتا ہے۔ مختار ایک خاص طبیعت کا انسان تھا۔ کتب شیعہ میں اس کے بڑے بڑے محامد ومحاسن مذکور ہیں۔ ائمہ اہل بیت کی زبانی اس کی گراں مایہ خدمات کا اعتراف خاص طور پر کیا گیا ہے۔ کتب مقاتل میں اکثر اس کا ذکر خیر آتا ہے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خون کے انتقام کے باعث شیعان حسین مختار کے زیر بار احسان ہیں۔

شیعوں کے سب سے قدیم فرقہ کا نام ''کیسانیہ'' ہے، اس کا بانی یہی مختار ہے۔ چنانچہ فرقہ کیسانیہ کی وجہ تسمیہ کتب معتبرہ شیعہ میں مذکور ہے کہ یہ لوگ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سیدنا محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی امامت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ جبل رضوی میں غائب ہیں اور زندہ ہیں، اور ہم نے سنا ہے کہ اکثر و بیشتر وہ شب جمعہ کو جبل مذکور پر جمع ہوتے ہیں اور عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ لوگ مختار بن ابی عبید کے پیرو ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ اسی کا لقب کیسان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکپن میں اس کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی گود میں لے کر از راہ محبت فرمایا تھا: ''یا کیس! یا کیس!'' اور بعض کے نزدیک یوں ہے کہ کیسان سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ایک غلام کا نام تھا اور اسی نے مختار کو سیدنا حسین کے خون کا انتقام لینے پر آمادہ کیا تھا۔

(توضیح المقال فی علم الرجال، بیان المذاہب الفاسدۃ ودسائسھا من فرق الشیعہ: ص ۴۵، الملل والنحل، شہرستانی: ۱/۱۹۶)

بحوالہ کتاب رجال الکشی سدیر نے امام محمد باقر رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مختار کو برا مت کہو کیونکہ اس نے ہمارے قاتلوں کو قتل کیا اور ہمارے شہداء کا انتقام لیا، اور ہماری رانڈوں کو سہاگن کیا اور تنگ دستی میں مال ہمارے درمیان تقسیم کیا۔ مختار وہ ہے جو لوگوں کو محمد بن علی بن ابی طالب یعنی ابن الحنفیہ کی امامت کی دعوت دیتا تھا، اور دشمنان حسین میں سے جس کی نسبت اس کو خبر ملتی کہ وہ گھر میں ہے یا فلاں مکان میں موجود ہے، یہ فوراً اس کا قصد کرتا اور اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا، اور جو کوئی اس کے اندر ہوتا اس کو زندہ نہ چھوڑتا۔ پس کوفہ کا کوئی گھر ایسا نہیں جو مسمار نہ ہوا ہو، اور یہ اسی کے برباد کیے ہوئے ہیں، اور اہل کوفہ میں تو یہ ضرب المثل ہے۔ (توضیح المقال: ص ۲۹۸)

قاضی نور اللہ شوستری لکھتے ہیں کہ

''ومنقول است کہ حضرت امام جعفر صادق براو رحمت فرستاد۔'' (مجالس المومنین: ص ۳۵۶)

Marfat.com

اور منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اس پر رحمت بھیجا کرتے تھے۔

مختار کا باپ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں دامن اسلام سے وابستہ تو ہو گیا لیکن سرکار دو عالم ﷺ کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ چنانچہ اکثر لوگوں نے اس کو صحابہ میں شمار نہیں کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں سنہ ۱۳ھ میں ایرانیوں کے مقابلہ میں لڑنے کے لیے ایک لشکر میں بھیجا چنانچہ وہ اس جنگ میں شہید ہو گیا اور اس جنگ جسر میں چار ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اس کی اولاد میں ایک لڑکی صفیہ بنت ابی عبید تھی جو بڑی صالحہ اور عابدہ تھی اور وہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس کی عزت و تکریم بھی فرماتے اور اس کی نیکی کے باعث اس سے محبت بھی فرماتے تھے۔ وہ ان کی زندگی ہی میں انتقال کر گئیں۔

مختار اس کا بھائی تھا۔ یہ پہلے ناصبی تھا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے شدید بغض رکھتا تھا۔ یہ مدائن میں اپنے چچا کے پاس رہا کرتا تھا اور اس کا چچا وہاں کا نائب تھا۔ جب سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو اہل عراق نے رسوا کرنے کی کوشش کی اور انھوں نے ان میں غداری کے آثار دیکھے تو وہ تھوڑے سے لشکر کے ساتھ مدائن چلے آئے مختار اس وقت مدائن میں تھا۔ مختار نے اپنے چچا سے کہا کہ اگر آپ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیں تو آپ کو بہت انعام واکرام سے نوازا جائے گا۔ چچا نے یہ الفاظ سن کر مختار کو ڈانٹا اور کہا کہ تم نے نہایت بری بات کی۔ شیعان علی اس کو ناپسند کرتے تھے حتیٰ کہ مسلم بن عقیل کوفہ آئے اور وہ مختار کے ہاں ٹھہرے۔ مختار امرائے کوفہ میں سے تھا۔ یہ کہتا تھا کہ میں مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کی مدد کروں گا۔ اس پر ابن زیاد نے اس کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور سو (۱۰۰) کوڑے بھی اس کو مارے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اس کی رہائی کی سفارش کی اور یزید کے کہنے پر ابن زیاد نے اس کو رہا کر دیا۔ اب یہ کوفہ چھوڑ کر حجاز آ گیا اور مکہ میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل گیا اور ان کے محاصرہ کے دوران ان کی بڑی مدد کی۔ پھر یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر عراق آ گیا۔ اب یہ علانیہ ابن زبیر کی تعریف کرتا لیکن اندر سے ان کا مخالف تھا۔ اب اس نے محمد بن الحنفیہ کی تعریف کرنی شروع کی اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خون کا انتقام لینے کا دعویٰ کیا جس کی وجہ سے کئی لوگ اس کے ساتھ مل گئے۔ پھر ایک موقع پر اس نے اپنے اوپر نزول وحی کا دعویٰ بھی کر دیا۔ اس نے ایک کرسی کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی کرسی ظاہر کر کے اس کو قرآن حکیم کے تابوت سکینہ سے تشبیہ دی۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود بھی گمراہ تھا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا تھا۔ اس کی موت سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو راحت عطا فرمائی۔ مصعب بن زبیر نے اس گمراہ کو ۱۴ رمضان المبارک سنہ ۶۷ھ میں قتل کیا اس وقت اس کی عمر ۶۷ سال تھی۔ (البدایہ والنہایہ: ۸/۲۹۰۔۲۹۲)

قاضی نور اللہ شوستری نے لکھا ہے کہ مختار اپنے باپ کے قتل کے بعد اپنے چچا کے پاس رہنے سہنے لگا۔ اس نے ایک روز اپنے چچا کو ترغیب دی کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیں۔ چچا نے کہا: تجھ کو خدا کی مار، تو مجھے ترغیب دیتا ہے کہ میں فرزند رسول کو دشمنوں کے حوالے کر دوں۔ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو جو

Marfat.com

زخم پہنچا، شیعہ کا خیال ہے کہ وہ بھی مختار کے اکسانے پر پہنچا ہے۔ چاہتے تھے کہ اس کو قتل کر دیں لیکن مختار مارے ڈر کے کوفہ چلا گیا اور شیعہ ہر نماز کے بعد اس پر لعنت کرتے تھے۔ (مجالس مومنین: ص ۳۵۶)

جب سیدنا مسلم بن عقیل نائب حسین رضی اللہ عنہ کی حیثیت سے بیعت لینے کوفہ گئے تو مختار نے انھیں اپنے مکان میں اتارا اور بڑے اخلاص کے ساتھ ان کی خدمت گزاری میں مصروف رہتا تا کہ اگلی بدنامی اس سے دور ہو جائے۔ جب شیعان علی نے اس کی یہ خدمت گزاری سنی تو بہت خوش ہوئے اور اس سے معذرت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہمارا گمان تمھاری نسبت غلط تھا۔ پھر جب مسلم مختار کے ہاں سے نکل کر ہانی بن عروہ کے ہاں تشریف لے گئے تو مختار نواح کوفہ کے کسی گاؤں میں چلا گیا وراس کے بعد محبّ اہل بیت ہونے کے باعث ابن زیاد کے حکم سے قید خانہ میں بھیج دیا گیا۔ ایک مدت کے بعد ایک شیعہ جو اولاد یزید کا معلم تھا اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی سفارش سے جیل سے رہا ہوا، اس وقت اس نے قسم کھائی تھی کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کے اتنے خیر خواہوں کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خون کے انتقام میں قتل کروں گا کہ ان کی تعداد ان مقتولوں کے برابر ہو جائے جو یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے خون کے بدلہ میں قتل کیے گئے تھے۔

لیکن اس کام کے لیے مختار کو مددگاروں کی ضرورت تھی۔ جب اس نے سنا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ میں یزید کی علانیہ مخالفت کرتے ہیں اور لوگوں سے خفیہ بیعت لیتے ہیں، تو وہ کوفہ سے مکہ چلا آیا اور بہت سوچ و بچار کر کے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ان کے مقصد کے انجام دینے میں جو کہ اس کے حصول مطلب کا بھی پیش خیمہ تھا، بہت کوشش کی یہاں تک کہ یزید کا انتقال ہو گیا اور حجاز سے لشکر شام نے مراجعت کی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا بول بالا ہو گیا۔ اب حجاز، بصرہ اور کوفہ ان کے تصرف میں تھا۔ لیکن جو قول واقرار انھوں نے مختار کے ساتھ کیے تھے، ان کو نظر انداز کر دیا۔ مختار نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بددل اور بیزار ہو کر دل میں عہد کیا کہ ابن زبیر پر ضرور خروج کرے گا۔ اسی اثناء میں ہانی بن عروہ ہمدانی کوفہ سے مکہ مکرمہ عمرہ کے لیے گیا۔ مختار نے اس سے پوچھا کہ امیر التوابین سلیمان بن صرد اور شیعان حسین نے خروج کیا ہے؟ ہانی نے کہا کہ ان کا ارادہ تھا کہ جب لشکر جمع ہو تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لیا جائے۔ مختار اس کی کیفیت سے واقف ہو کر رات کے وقت مکہ مکرمہ سے نکل گیا اور کوفہ کی راہ لی۔ اثنائے سفر میں، ایک کوفی مسلمہ بن کرب نامی سے ملاقات ہوئی۔ اس سے مختار نے پوچھا کہ اہل کوفہ کو کس حال میں چھوڑا تھا؟ اس نے کہا ''ریوڑ ہو اور اس کا گڈریا نہ ہو۔'' مختار نے مسکرا کر کہا کہ ان کا گڈریا میں ہوں اور میں ان کی حفاظت و رعایت میں کوتاہی نہ کروں گا۔ مسلمہ کو خدا حافظ کہہ کر رخصت کیا اور خود رات دن بے تکان سفر کر کے قادسیہ میں جو بلاد کوفہ میں ہے، پہنچ گیا۔ وہاں سے اصل راستہ چھوڑ کر کربلا گیا اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے مزار کو سلامی دی اور اسے بوسہ دے کر بغل میں لیا اور زار و قطار رویا اور عرض کیا:

''یا سیدی! بحق جد و پدر و مادر تو و بحق شیعہ و اہل بیت تو کہ طعام طیب نخورم و آب خوش گوار نیا شام

Marfat.com

وبر بستر نرم تکیہ نہ کنم تا انتقام تو نہ کشم یا کشتہ شوم۔''

''اے میرے آقا اور سردار! قسم ہے آپ کے جد امجد اور والدین ماجدین اور قسم ہے، آپ کے شیعہ اور اہل بیت کی کہ اچھی غذا کھاؤں گا نہ اچھا پانی پیوں گا اور نہ نرم بستر پر آرام کروں گا جب تک کہ آپ کے خون کا بدلہ نہ لے لوں یا پھر خود قتل نہ ہو جاؤں۔''

اس کے بعد آپ کی قبر کو الوداع کہہ کر کوفہ کی راہ لی۔ آخر کار رات کے وقت کوفہ جا پہنچا اور جھوٹ موٹ خطوط جو اس نے مصلحتاً محمد بن حنفیہ کی زبانی لکھے ہوئے تھے، لوگوں کو پہنچائے۔

یہی وہ وقت تھا کہ سلیمان بن صرد خزاعی خروج کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ مختار نے سلیمان سے ملاقات کی اور کہا کہ پھر ایسا موقع ہرگز ہاتھ آنے کا نہیں ہے۔ جہاں تک ہو سکے خروج جلدی کرنا چاہیے، لیکن سلیمان نے کہا کہ ابھی میرے نزدیک خروج مناسب نہیں ہے۔ سلیمان کی اس بات سے مختار بہت کبیدہ خاطر ہوا اور کہا کہ سلیمان ڈرپوک، بزدل اور پیر فرتوت ہو گیا ہے۔ جنگ وجدال کے قابل نہیں رہا۔ (مجالس المومنین: ص ۳۵۸)

علامہ شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں مختار کے بارے میں لکھا ہے کہ پہلے وہ خارجی تھا، پھر زبیری ہو گیا، پھر شیعہ ہوا اور شیعہ سے کیسانیہ، اور اس بات کا معتقد تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد محمد بن حنفیہ امام برحق ہیں اور اس کی شعبدہ بازیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے پاس ایک پرانی کرسی تھی جس پر اس نے ریشمی غلاف چڑھا کر اسے ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ کر دیا تھا اور ظاہر یہ کیا کہ یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے توشہ خانے میں سے ہے اور وہ ہمارے پاس تابوت سکینہ کی مانند ہے، اور جب وہ کسی دشمن سے جنگ کرتا تو کرسی کو اگلی صف میں رکھوا دیتا اور لشکریوں سے کہتا کہ بڑھو قتل کرو۔ فتح و نصرت تمہارے شامل حال ہے، اور یہ کرسی تمہارے درمیان ایسی ہے جیسے کہ بنی اسرائیل میں تابوت سکینہ ہوتا تھا اور ملائکہ تمہاری مدد کے لیے نازل ہو رہے ہیں۔ (الملل والنحل، شہرستانی: ص ۳۵۷)

سیدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا والدہ ماجدہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حجاج بن یوسف کے سامنے فرمایا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''بنو ثقیف میں ایک کذاب ہوگا اور ایک مبیر (ہلاکو) کذاب تو ہم نے دیکھ لیا اور مبیر (ہلاکو) کے مصداق تم ہو۔'' (البدایہ والنہایہ: ۲۹۲/۸)

اسی طرح رجال الکشی میں سیدنا جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تم شیعوں میں تو کذاب ہو اور غیر شیعوں میں مکذب ہیں۔'' (رجال الکشی: ص ۳۲۵)

ابراہیم بن مالک الاشتر کا حدود اربعہ:

مالک الاشتر نخعی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں سے تھا۔ یہ بڑا پکا سبائی تھا، اور یہی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ طبری نے شعبی سے ایک روایت نقل کی ہے کہ

Marfat.com

شہادت عثمان کے تیسرے روز باغی (سبائی) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ آپ اس وقت مدینہ طیبہ کے ایک بازار میں تھے۔ آتے ہی کہنے لگے: "ہاتھ بڑھایئے، ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔" سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جلدی نہ کرو، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بڑے مبارک آدمی تھے۔ انھوں نے شوریٰ کی وصیت فرمائی تھی، للہذا تم بھی لوگوں کو سوچنے کا موقع دو، وہ باہم مشورہ کریں کہ کس کو خلیفہ بنایا جائے۔"

یہ بات سن کر وہ واپس چلے گئے۔ پھر ان میں سے بعض نے کہا کہ اگر یہ (بلوائی) اس معاملہ کو سلجھائے بغیر واپس چلے گئے تو فساد امت اور لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے ہم محفوظ نہیں رہیں گے۔ چنانچہ پھر وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آئے۔ اس وقت مالک الاشتر بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس نے آتے ہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور بیعت کر لی۔ اس کے بعد اس کے سارے ساتھیوں نے آپ کی بیعت کر لی۔ (طبری: ۴۵۵/۳) بعد میں اہل کوفہ اور دوسرے سبائی فخر سے یہ کہا کرتے تھے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سب سے پہلے اشتر نے کی۔

(البدایہ والنہایہ: ۲۲۷/۷، طبری: ۴۵۵/۳)

ابراہیم اسی مالک الاشتر کا بیٹا تھا۔ اس لحاظ سے یہ بھی پکا سبائی تھا۔ یہ مختار کا سپہ سالار تھا۔ قاضی نور اللہ شوستری نے اس کا ذکر فاتح اعظم اور بطل محتشم کے الفاظ لکھ کر بڑی آب و تاب سے کیا ہے۔ چنانچہ بکمال جوش ارادت فصیح و بلیغ اور بڑی مقفیٰ عبارت میں کیا ہے۔ (مجالس المومنین: ص ۴۴۱) ابن زیاد کے مقابلہ میں جس طرح ابراہیم کو جو فتح نصیب ہوئی اس کی کیفیت بھی قابل دید اور لائق شنید ہے۔ وہ یہ کہ ابراہیم نے اپنے لشکر کی ہمت بڑھانے کے لیے یہ ترکیب سوچی کہ پہلے ہی سے کچھ سفید رنگ کے کبوتر پال رکھے تھے، اور ایک محرم راز کو فہمائش کر دی تھی کہ جب لشکری کمزور اور بددل نظر آئیں تو ادھر میں لشکریوں کو خوش خبری سناؤں گا کہ آج ملائکہ عصاب (پرندے) سفید کبوتروں کی شکل میں ہماری نصرت کے لیے آسمان سے نازل ہوں گے اور ادھر سے تم کبوتروں کو چپکے سے ہوا میں چھوڑ دینا۔ چنانچہ اس نے کہا:

"میں نے آسمانی کتابوں میں پڑھا ہے کہ اس جنگ میں اڑنے والے ملائکہ سفید کبوتروں کی شکل میں ہماری امداد کو آئیں گے۔"

فوجیوں کے دل اس خوش خبری سے قوی ہو گئے۔ جب ابراہیم کی فوج نے یہ صورت دیکھی، دفعۃً اللہ اکبر کہہ کر بڑی بہادری اور جرأت سے حملہ آور ہوئے۔ ابراہیم نے کہا: "ہاں، اے دوستو! کوشش کرو، لو وہ ملائکہ عصاب کی مدد آ پہنچی۔ اس نے پہلے ہی حملہ میں کمر ہمت باندھ کر دشمنوں کے لشکر میں ہلچل ڈال دی، اور ابن زیاد کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔

واقعی مختار جیسے امیر اور سرداروں کے لیے سپہ سالار بھی ایسے ہی چالاک اور ہوشیار ہونے چاہئیں تھے جیسے کہ ابراہیم الاشتر کہ اپنی مطلب برآری کے لیے ہر قسم کی حیلہ پردازی کو جائز جانتے تھے یعنی ع

چوں ضرورت بود روا باشد

Marfat.com

مختار کے قتل کے بعد:

مختار کوفہ میں مصعب کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور ابراہیم بن مالک الاشتر مختار کی طرف سے موصل پر قابض تھا۔ مصعب نے اسے خط لکھا کہ اگر تم میری اطاعت کر لو تو میں تمھیں ملک شام کی سند دے دوں گا اور شام سے مغرب کی جانب جس قدر شہر تم فتح کرتے چلے جاؤ گے ان کی ولایت بھی تمھیں مل جائے گی۔ کچھ اسی قسم کا خط عبدالملک بن مروان نے بھی اسے لکھا لیکن ابراہیم الاشتر نے مصعب کو ترجیح دی اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت تسلیم کر کے مصعب کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ مصعب نے موصل اور جزیرہ کی حکومت پر مہلب بن ابی صفرہ کو مامور کر کے بھیج دیا اور ابراہیم کو اپنے پاس مہلب کی جگہ پر سپہ سالار بنا دیا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو جب مختار کے مارے جانے اور مصعب کے کوفہ پر قبضہ کرنے کا پتہ چلا تو انھوں نے مصعب کو کوفہ کی گورنری پر مامور کر دیا اور بصرہ پر اپنے بیٹے حمزہ بن عبداللہ کو والی بنا کر بھیج دیا۔ حمزہ گورنری کے منصب کو صحیح طور پر ادا نہ کر سکے لہٰذا انھوں نے اہل بصرہ کو ناراض کر دیا۔ ابن زبیر کو جب ان کی ناراضگی کا علم ہوا تو انھوں نے سنہ ۶۸ھ میں بصرہ کی حکومت بھی مصعب بن زبیر کے سپرد کر دی۔

خوارج کا ہنگامہ:

خوارج کا فرقہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے اختلاف کے زمانہ میں وجود میں آیا۔ وہ بنو امیہ کے دشمن تھے۔ چنانچہ وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید دونوں کے زمانہ میں اٹھے۔ ابن زیاد نے کوفہ میں جب خوارج پر سختی کی تو خوارج نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مکہ جا کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حکومت کا رنگ بھی دیکھنا چاہیے۔ اگر وہ ہم سے متفق ہوئے تو ان کے ساتھ مل کر بنو امیہ کا مقابلہ کرنا چاہیے، اور اگر انھوں نے ہم سے اختلاف کیا تو انھیں مکہ سے نکال باہر کریں گے۔ چنانچہ وہ مکہ پہنچ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یزید نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کے لیے فوجیں روانہ کی تھیں۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس وقت مدد کی ضرورت تھی اور خارجیوں کو بھی اپنے لیے ایک پناہ گاہ کی ضرورت تھی، لہٰذا دونوں میں سے کسی نے عقائد کی بحث نہ چھیڑی۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خوارج سے یزید کی فوجوں کے مقابلہ میں کام لیا۔ لیکن جب یزید کے انتقال کی خبر آئی اور حصین بن نمیر مکہ کا محاصرہ اٹھا کر واپس شام کے لیے روانہ ہو گیا تو اس وقت خوارج نے آپس میں کہا کہ ہم نے ایک ایسے شخص کی حمایت اور امداد کی ہے جس کے عقیدے کا حال ہمیں معلوم نہیں، لہٰذا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر معلوم کر لیا جائے۔ چنانچہ نافع بن ازرق اور عبیدہ بن بلال وغیرہ اپنی ساتھیوں کے ساتھ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان کے سامنے اصحاب ثلاثہ کی برائیاں بیان کرنے لگے۔ اس وقت تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے انھیں ٹال دیا لیکن دوسرے روز خوارج کے شرانگیزیوں اور شرارتوں

Marfat.com

سے محفوظ رہنے کا انتظام کر کے ایک زبردست تقریر کی جس میں اصحاب ثلاثہ کے بارے میں ان کے ایک ایک اعتراض کا کافی اور شافی جواب دیا۔ آپ نے فرمایا:

''میں اس اجتماع عام میں گواہی دیتا ہوں کہ میں سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا دوست اور ان کے دشمنوں کا دشمن ہوں۔''

اس جملہ سے خوارج سخت پریشان ہوئے اور اسی پریشانی میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ آخر مکہ سے نامراد آئے۔ ان میں سے کچھ اہواز چلے گئے اور کچھ نے یمامہ کی راہ کی۔ اہواز جانے والی جماعت کا سردار نافع بن ارزق تھا۔ اس نے اہواز پہنچ کر خلیفہ کے عامل کو نکال باہر کیا اور لوگوں سے خراج وصول کرنا شروع کر دیا۔ اب تک یہ فرقہ متحد تھا لیکن اب اس میں اختلاف کی دراڑ پڑ گئی اور یہ چار فرقوں میں تقسیم ہو گیا اور ان چاروں نے بھی آپس میں ایک دوسرے کی تکفیر کرنی شروع کر دی۔ ان میں نافع بن ارزق کا فرقہ اپنے مسلک میں سب سے زیادہ سخت تھا۔ اس نے اہواز میں مسلمانوں کے کشت وخون کا بازار گرم کیا۔ اب یہ بصرہ کی طرف بڑھا جہاں عبداللہ بن زبیر کی طرف سے عبداللہ بن حارث عامل تھا۔ اس نے مسلم بن عبیس کو نافع بن ارزق کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ اس جنگ میں نافع اور مسلم دونوں کام آئے۔ نافع مارا تو گیا لیکن خوارج کا زور نہ ٹوٹا اور ان کی شورش کے باعث بصرہ کی آبادی کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔ اہل بصرہ نے ابن زبیر سے فریاد کی۔ انھوں نے اب مہلب بن ابی صفرہ کو خارجیوں سے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ انھوں نے بہت خون ریز لڑائی کے بعد جن میں دونوں طرف سے بہت سے آدمی کام آئے، بصرہ سے خارجیوں کو دفع کیا۔ یہاں سے ہٹنے کے بعد وہ فارس کی طرف نکل گئے۔ مہلب برابر خوارج کے استیصال میں مصروف رہے۔ اسی دوران میں نافع بن ارزق کا ایک ساتھی نجدہ بن عامر حروری اپنا علیحدہ جماعت بنا کر بحرین میں اٹھا اور یہاں کے حاکم کو شکست دے کر یمامہ، صنعاء اور عمان وغیرہ پر قابض ہو گیا، لیکن آخر کار اس کی جماعت میں بھی پھوٹ پڑ گئی۔ جو لوگ اس کے خلاف ہوئے انھوں نے عبداللہ بن فدیک کو اپنا سردار بنا لیا اور ابن فدیک کے آدمیوں نے نجدہ کو پکڑ کر قتل کر دیا۔

خوارج کے فتنہ نے مسلمانوں کو بہت تنگ کیا۔ یہ لوگ بڑے بہادر اور جانباز تھے، ان کی طاقت عارضی طور پر دب جاتی لیکن پھر موقع پاتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔ اس لیے مہلب ایک نہایت اعلیٰ سپہ سالار ہونے کے باوجود ان کا استیصال نہ کر سکے۔ خوارج بصرہ میں مہلب سے شکست کھانے کے بعد کرمان اور اصفہان کی طرف بھاگ گئے۔ اصفہان پہنچ کر انھوں نے اپنی قوت کو پھر جمع کیا اور سابور آ گئے۔ اب مصعب بن زبیر نے مہلب کو ہٹا کر عمر بن عبیداللہ بن معمر کو ان کی جگہ مامور کیا۔ انھوں نے سابور اور اصطخر میں انھیں شکست دی۔ خارجیوں نے اب پھر عراق کا رخ لیا لیکن عمر بن عبیداللہ بھی ان کے تعاقب میں نکلے۔ دوسری طرف سے مصعب ان کو روکنے کے لیے بڑھے۔ خوارج اپنے کو دو سمتوں سے محصور دیکھ کر مدائن چلے گئے اور یہاں کے باشندوں پر بڑے مظالم کیے۔ عورتوں اور بچوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ

Marfat.com

چاک کر ڈالے، ساباط وغیرہ میں اسی قسم کے مظالم کرتے ہوئے کوفہ کی طرف بڑھے۔ ابراہیم بن اشتر اہل کوفہ کو لے کر مقابلہ کے لیے نکلے۔ انھیں دیکھ کر خوارج مدائن سے ہوتے ہوئے رے کی طرف چلے گئے۔ رے کے بعد اصفہان کا رخ کیا۔ یہاں کا والی کئی ماہ تک مدافعت کرتا رہا۔ جب اس کا کل سامان ختم ہو گیا اس وقت نے شہر سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کیا اور خارجیوں کے سردار زبیر بن ماموز کو قتل کیا اور اس کا کل سامان ان کے قبضہ میں آ گیا۔ زبیر کے قتل کے بعد خوارج نے قطری بن فجاۃ کو اپنا سردار بنایا اور مختلف شہروں اور مقامات میں تاخت و تاراج کا آغاز کر دیا۔ ان کی اس شورش کو دیکھ کر مصعب بن زبیر نے پھر مہلب کو ان کے مقابلہ پر مامور کیا۔ انھوں نے آٹھ مہینوں تک پوری کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ اس زمانہ میں مصعب بن زبیر شہید ہو گئے اور عراق پر عبدالملک بن مروان کا قبضہ ہو گیا۔ مہلب خوارج کا مقابلہ کر رہا تھا کہ عبداللہ بن زبیر کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور خوارج کا رخ عبدالملک بن مروان کی طرف مڑ گیا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

عبدالملک بن مروان کی جنگی تیاریاں:

عبدالملک بن مروان نے خالد بن عبیداللہ بن خالد بن اسید کو خفیہ طور پر بصرہ بھیجا کہ وہاں جا کر ابن زبیر کے خلاف اور بنو امیہ کے حق میں لوگوں کو ہم خیال بنائیں۔ چنانچہ خالد نے بصرہ آ کر ابو بکر بن وائل اور قبیلہ ازد میں اپنا خفیہ کام شروع کر دیا اور ایک اچھی خاصی جماعت اپنے ہم خیال بنالی۔ جب ان حالات سے عمر بن عبیداللہ بن معمر کو آگاہی ہوئی تو اس نے خالد کو فوج کے ذریعہ بصرہ سے نکال دیا۔ بصرہ کی یہ پریشان کن خبریں جب کوفہ پہنچیں تو اس تشویش ناک حالت کے پیش نظر مصعب کوفہ سے بصرہ آئے اور وہاں خالد کے ساتھیوں اور ہم خیال لوگوں کو سزائیں دیں، جرمانے کیے بلکہ بعض مکانات مسمار کر دیئے۔ اسی طرح کوفہ میں بھی عبدالملک کے لوگ اندر ہی اندر اپنا کام کر رہے تھے بلکہ فوجی جرنیل عتاب بن ورقاء وغیرہ بھی اندرونی طور پر عبدالملک سے سازباز کر رہے تھے، سوائے ابراہیم بن اشتر کے باقی سب جرنیل بغاوت پر تلے ہوئے تھے۔ ابراہیم بن اشتر کو جب پتہ چلا کہ یہ تمام فوجی جرنیل غداری پر تلے ہوئے ہیں تو اس نے مصعب کو یہ مشورہ دیا کہ ان تمام سرداروں کو قصر ابیض میں نظر بند کر دیا جائے لیکن مصعب نے اس تجویز کو قبول نہ کیا اور افسوس کے ساتھ کہا:

"اللہ تعالیٰ احنف بن قیس پر رحم فرمائے وہ مجھے اہل عراق کی غداری سے محفوظ رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اہل عراق فاحشہ عورتوں کی طرح ہیں۔ جس طرح انھیں ہر روز ایک نیا خاوند درکار ہوتا ہے اسی طرح انھیں ہر روز ایک نئے امیر کی ضرورت ہوتی ہے۔"

آخر کار عبدالملک شام سے عراق کی طرف فوج لے کر چلا۔ عبدالملک دمشق سے اس وقت روانہ ہوا جب اس کو رؤسائے کوفہ کے بہت سے خطوط مل چکے تھے کہ آپ کو فوری طور پر عراق پر حملہ آور ہونا چاہیے۔ عبدالملک کے مشیروں نے دمشق سے روانہ ہونے سے قبل اسے روکا کہ عراق اور اہل کوفہ کے یہ خطوط اسی قسم

Marfat.com

کے نہ ہوں جیسے انھوں نے حسین بن علی رضی اللہ عنہ کو لکھے تھے۔ عبدالملک نے کہا کہ حسین رضی اللہ عنہ تو صرف کوفیوں کے بھروسہ پر مکہ سے چل پڑے تھے اور میں ایک زبردست فوج کے ساتھ جا رہا ہوں۔ مجھ کو ان کی بدعہدی اور بے وفائی سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جب مجھ کو ایک طاقتور اور زبردست فوج کے ساتھ دیکھیں گے تو ہرگز اپنے خطوط میں کیے گئے وعدوں سے منحرف نہ ہوں گے۔

عبدالملک کے آنے کی خبر مصعب بن زبیر کو جب ہوئی تو وہ بھی مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے، اپنے روانہ ہونے سے قبل مصعب عمر بن عبیداللہ بن معمر کو خوارج کے مقابلہ کے لیے بصرہ سے فارس کی طرف بھیج چکے تھے۔ لہٰذا وہ مصعب کے ساتھ اس لڑائی میں شریک نہ ہو سکے۔ دیر جاثلیق کے قریب دونوں لشکر خیمہ زن ہوئے۔ مصعب کی فوج بہت تھوڑی تھی۔ جو لوگ ان کے ساتھ آئے تھے ان میں بھی زیادہ تر لوگ حریف سے ملے ہوئے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ کب لڑائی شروع ہو تو ہم حریف کے کیمپ میں چلے جائیں۔ لڑائی شروع ہوئی تو عبدالملک نے پوری طاقت سے پہلے اسی حصہ فوج پر حملہ کیا جو ابراہیم بن مالک الاشتر کی ماتحتی میں لڑ رہا تھا۔ یہ حملہ عبدالملک کے بھائی محمد بن مروان نے کیا۔ طرفین میں خوب جنگ ہوئی، آخر ابراہیم نے محمد بن مروان کو پسپا کر دیا محمد بن مروان کو شکست ہوتے دیکھ کر عبدالملک نے عبیداللہ بن یزید کو تازہ دم فوج کے ساتھ محمد کی مدد کے لیے بھیجا۔ اب خوب جم کر مقابلہ ہونے لگا۔ اس معرکہ میں قتیبہ بن مسلم کا باپ مسلم بن عمرو باہلی بھی کام آیا۔

ابراہیم الاشتر پر دشمنوں کا ہجوم دیکھ کر مصعب نے عتاب بن ورقاء کو ابراہیم کی مدد کے لیے بھیجا۔ عتاب بن ورقاء پہلے ہی در پردہ عبدالملک سے ملا ہوا تھا۔ وہ بجائے ابراہیم کی مدد کرنے کے فوری طور پر میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ ابراہیم دشمنوں کے نرغے میں گھر گیا اور بڑی بہادری سے لڑتا ہوا، مارا گیا۔ ابراہیم کا مارا جانا تھا کہ اہل شام کو اپنی فتح کا یقین ہو گیا۔ عتاب بن ورقاء کے میدان سے بھاگنے اور ابراہیم کے قتل ہونے کے بعد مصعب نے دوسرے سرداروں کو آگے بڑھنے کے لیے کہا لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اب صرف چند آدمی تھے جو میدان میں لڑ رہے تھے باقی تمام فوج کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ کوفیوں کی یہ غداری اس غداری سے بڑھی ہوئی تھی جو انھوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے کی تھی کیونکہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دینے پر ان کو ابن زیاد نے مجبور کیا تھا اور اس کی دھمکیوں کا خوف و ہراس ان پر طاری ہو گیا تھا، لیکن مصعب بن زبیر کا ساتھ نہ دینا ان کی ایک کھلی غداری تھی جس میں کسی کی کوئی دھمکی شامل نہ تھی۔

عبدالملک نہیں چاہتا تھا کہ مصعب بن زبیر قتل ہوں، اس لیے اس نے اپنے بھائی محمد بن مروان کو مصعب کے پاس بھیجا کہ آپ کی طرف سے لڑائی کی شکل بگڑ چکی ہے لہٰذا میں آپ کو امان دیتا ہوں۔ آپ میری امان قبول کر لیں۔ مصعب نے اس کا جواب انکار میں دیا۔ اس کے بعد مصعب رضی اللہ عنہ کے بیٹے عیسیٰ سے محمد بن مروان نے کہا کہ تم کو اور تمھارے باپ دونوں کو عبدالملک نے امان دی ہے۔ عیسیٰ نے اس بات کا تذکرہ باپ سے کیا۔ باپ نے کہا کہ ہاں یہ تو مجھ کو یقین ہے کہ اہل شام تمھارے ساتھ اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ اگر جی چاہے تو ان

Marfat.com

کی امان میں چلے جاؤ۔ عیسیٰ نے باپ کا یہ جواب سن کر کہا میں قریش کی عورتوں کو یہ کہنے کا موقع ہرگز نہ دوں گا کہ عیسیٰ اپنی جان بچانے کے لیے باپ سے الگ ہو گیا۔ مصعب رضی اللہ عنہ نے عیسیٰ سے کہا کہ تم اپنے چچا عبداللہ ابن زبیر کے پاس مکہ چلے جاؤ اور ان کو اہل عراق کی غداری اور بے وفائی کا حال سناؤ۔ مجھ کو یہیں چھوڑ جاؤ میں نے اپنے آپ کو مقتول سمجھ لیا ہے۔ عیسیٰ نے کہا کہ میں مکہ نہیں جاؤں گا اور نہ چچا کو جا کر یہ خبر سناؤں گا، البتہ آپ میدان سے واپس آئیں اور سیدھا بصرہ چلیں۔ آپ کے لوگ آپ سے بہت خوش ہیں، وہاں جا کر کچھ تدارک کریں یا پھر مکہ مکرمہ چلیں۔ باپ نے جواب دیا: یہ ممکن نہیں کیونکہ تمام قریش میں میرے میدان جنگ سے بھاگنے کا چرچا ہو جائے گا۔ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ تم ہر ایک خیال کو دل سے نکال کر اپنی پوری طاقت سے حریف پر حملہ کرو۔ عیسیٰ نے باپ کی یہ بات سنتے ہی اپنے ساتھیوں سمیت دشمن پر حملہ کر دیا اور کئی لوگوں کو خاک و خون میں تڑپا کر اپنے باپ کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ اس کے بعد عبدالملک خود آگے بڑھ آیا اور مصعب بن زبیر سے بڑی منت اور اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ اب میدان سے چلے جائیں یا پھر امان قبول کر لیں یہاں تک کہ اس نے اس اصرار میں الحاح و زاری سے کام لیا، لیکن مصعب رضی اللہ عنہ نے اس کی کسی بات کی طرف توجہ نہ کی۔ کوفیوں کا لشکر میدان میں موجود تھا لیکن اپنے امیر کا ساتھ نہیں دے رہا تھا بلکہ دور سے تماشا دیکھ رہا تھا۔ مصعب رضی اللہ عنہ اپنی جگہ کوفیوں کی غداری سے پریشان حال تھے۔ کوفیوں نے مصعب رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ دونوں کے قتل میں ایک ہی درجہ کا ظلم اور غداری کی ہے، لیکن یہ دونوں دو مختلف شکلوں اور صورتوں میں ظاہر ہوئے۔ کربلا میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اپنے دشمنوں سے چاہتے تھے کہ وہ ان کو میدان جنگ سے مکہ یا دمشق یا کسی طرف کوچ کر جانے دیں لیکن یہاں مصعب رضی اللہ عنہ کے حریف خود چاہتے تھے کہ یہ میدان سے نکل جائیں۔ وہاں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے دشمنوں نے ان کی بات قبول نہیں کی اور یہاں مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے دشمنوں کی بات ماننے سے یک قلم انکار کر دیا، لیکن نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوا۔ روایات میں ہے کہ مصعب رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے عیسیٰ کے قتل ہونے کے بعد اپنے خیمہ میں گئے، سر میں تیل ڈالا، خوشبو لگائی اور باہر آ کر دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ اس حملہ میں ان کے ساتھ صرف سات آدمی تھے، جو ان کے ساتھ ہی شہید ہو گئے، اور سنہ ۷۱ھ میں یعنی دس برس کے بعد کربلا کا سانحہ دیر جاثلیق میں دہرایا گیا۔

عبدالملک بن مروان نے اسی میدان میں کوفہ کے تمام لشکر سے اپنی خلافت کی بیعت لی اور وہاں سے آ کر کوفہ کے قریب نخیلہ کے مقام پر چالیس روز قیام کیا۔ جب کوفیوں کی طرف سے پورے طور پر اطمینان ہو گیا تو شہر میں داخل ہو کر جامع مسجد میں خطبہ دیا۔ لوگوں سے حسن سلوک کا وعدہ کیا۔ پھر فارس، خراسان، بصرہ اور اہواز وغیرہ کے گورنروں کو خط لکھا کہ رعایا سے ہماری طرف سے خلافت کی بیعت لو۔ مہلب بن ابی صفرہ کو بھی اس کی جگہ بدستور قائم رکھا۔ ان تمام شہروں کے لوگوں نے عبدالملک کی خلافت کو تسلیم کیا، صرف عبداللہ بن حازم نے جو خراسان کے ایک حصہ کے عامل تھے، بیعت سے انکار کیا، لیکن چند روز کے بعد مارے گئے۔ بصرہ

Marfat.com

کی گورنری عبدالملک نے خالد بن اسید کے سپرد کی جب کہ کوفہ کی گورنری اپنے بھائی بشیر بن مروان کو دی۔

ایک روایت میں ہے کہ مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کا سر عبدالملک کے سپہ سالار نے کوفہ سے دمشق کی طرف بھیج دیا تھا۔ یہ سر جب دمشق میں پہنچا تو لوگوں نے اس کی تشہیر کا ارادہ کیا لیکن عبدالملک کی بیوی عاتکہ بنت یزید بن معاویہ نے لوگوں کو تشہیر سے روک دیا اور اس سر کو غسل دینے کے بعد دفن کر دیا گیا۔ یہ روایت درست نہیں ہے کیونکہ عبدالملک نے تو میدان جنگ میں بہت کوشش کی کہ مصعب رضی اللہ عنہ کو امان دے دی جائے یا وہ میدان جنگ سے چلے جائیں، اس لیے کہ وہ ان کو قتل نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن مصعب رضی اللہ عنہ نے نہ میدان چھوڑنا چاہا اور نہ امان کو قبول کیا۔ اب یہ کہنا کہ عبدالملک کے سپہ سالار نے ان کے سر کو کاٹ کر دمشق میں تشہیر کے لیے بھیجا درایۃً درست معلوم نہیں ہوتا اور روایت کے لحاظ سے یہ کسی رافضی کی وضع کردہ روایت ہے۔ معلوم نہیں ہمارے اردو کے مؤرخین ایسی روایات لکھ کر لوگوں کے ذہنوں کو کیوں پریشان کرتے ہیں؟ روایات میں ہے کہ عبدالملک اور مصعب رضی اللہ عنہ کے تعلقات بہت پرانے تھے۔ بس سیاست نے ایک کو دوسرے کا حریف بنا دیا تھا۔ ان قدیم تعلقات کی بنا پر عبدالملک ہر ممکن طریقہ سے ان کے خون سے بچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے مشیروں کی مخالفت کے باوجود ان کے پاس جان بخشی کا پروانہ بھیج دیا کہ وہ جہاں چاہیں نکل جائیں بلکہ خود بھی میدان جنگ میں ان کو سمجھانے کے لیے گیا، لیکن عین اس وقت ایک شامی عبیداللہ بن ظبیان نے ان کو قتل کر دیا۔ (مروج الذہب: ۵۲۲/۲) اور اس نے ان کا سر قلم کر کے عبدالملک کے سامنے پیش کیا۔ اس سر کو دیکھ کر عبدالملک کی زبان سے بے ساختہ نکلا: ''اب قریش میں ایسے آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں۔'' (اخبار الطوال: ص ۳۰۹) عبدالملک کے اس جملہ سے اس کا مصعب رضی اللہ عنہ کے قتل پر افسوس کا اظہار ہوتا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ اس نے ان کے سر کی تشہیر کرنا چاہی، کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتا۔

عبدالملک بن عمیر کہتے ہیں کہ میں قصر کوفہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ کا سر عبیداللہ بن زیاد کے سامنے پڑا تھا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد میں قصر کوفہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ عبیداللہ بن زیاد کا سر مختار کے سامنے پڑا ہے۔ پھر ایک مرتبہ میں قصر کوفہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مختار کا سر مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سامنے پڑا ہوا ہے۔ پھر جب میں قصر کوفہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کا سر عبدالملک بن مروان کے سامنے پڑا ہوا ہے۔ (البدایہ والنہایہ: ۳۲۲/۸)

زفر بن حارث سے معاملہ:

عراق کی فتح سے قبل عبدالملک نے بہت کوشش کی کہ عبیداللہ بن زیاد اور زفر بن حارث کو مغلوب کر سکے لیکن ہر حملہ میں شامیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب جب کہ عبدالملک خود عراق کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے عراق کی طرف اپنی روانگی سے ابان بن عقبہ بن ابی معیط گورنر حمص کو فوج دے کر قرقیسیا کی طرف پیش قدمی

Marfat.com

کے لیے کہا تھا تا کہ وہ زفر بن حارث کو مغلوب کرے۔ لیکن ابان نے قرقیسیا پہنچ کر لڑائی کا آغاز تو کر دیا لیکن ابھی اس جنگ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ عبدالملک خود بھی ایک فوج گراں کے ساتھ قرقیسیا پہنچ گیا اور بڑی سختی سے قرقیسیا کا محاصرہ شروع کر دیا۔ زفر بن حارث بھی کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھا۔ وہ بھی نہایت جرأت مند، بہادر اور جنگ جو انسان تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے ہذیل کو حکم دیا کہ اہل شام پر اس زور سے حملہ کرو کہ جب تک عبدالملک کے خیمے کو نہ گرالو اس وقت تک واپس نہ آنا۔ ہذیل نے باپ کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور اس زور اور جرأت سے حملہ کیا کہ وہ عبدالملک کے خیمہ کو گرا کر واپس آیا۔ عبدالملک کی سمجھ میں آ گیا کہ قرقیسیا کو فتح کرنا آسان نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے زفر کو پیغام بھجوایا کہ تمھیں اور تمھارے لڑکے ہذیل کو امان دی جاتی ہے اور جو علاقہ تم پسند کرتے ہو وہ لے لو۔

زفر بن حارث نے کہلا بھیجا کہ میں اس شرط پر صلح کرنے کو تیار ہوں کہ ایک سال تک مجھ سے بیعت کرنے کی خواہش نہ کی جائے اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف کسی قسم کی اعانت مجھ سے طلب نہ کی جائے۔ عبدالملک ان باتوں پر راضی ہو گیا اور قریب تھا کہ صلح نامہ تحریر ہو جاتا کہ اچانک عبدالملک کو یہ اطلاع ملی کہ شہر پناہ کے چار برج منہدم ہو گئے ہیں۔ یہ خبر عبدالملک کے لیے نہایت خوش آئندہ تھی، لہٰذا اس نے فوراً صلح سے انکار کر کے شہر پر حملہ کر دیا، لیکن زفر بن حارث کی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور عبدالملک کا حملہ ناکام رہا اور زفر کی فوج نے حریف کی فوج کو ان کے کیمپ پر پسپا کر دیا۔ اب عبدالملک نے پھر صلح کا پیغام بھیجا اور کہلا بھیجا کہ ہم آپ کی تمام شرطوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ زفر بن حارث نے کہلا بھیجا کہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں کسی دوسرے کے ہاتھ پر بیعت نہیں کروں گا۔ نیز یہ وعدہ بھی لوں گا کہ میرے ساتھیوں سے کسی قسم کا کوئی مواخذہ، انتقام اور قصاص طلب نہیں کیا جائے گا۔ عبدالملک نے اس کی ہر شرط کو منظور کر لیا اور اس پر ایک عہد نامہ برائے منظوری لکھ کر بھیج دیا۔ پھر بھی زفر بن حارث عبدالملک کے پاس نہیں آیا۔ آخر عبدالملک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا جو اس کے پاس تھا، زفر بن حارث کے پاس ضمانت کے طور پر بھیج دیا۔ اس عصا کی ضمانت کو کافی سمجھ کر زفر فوراً عبدالملک کے پاس آ گیا عبدالملک نے زفر کو اپنے برابر تخت پر بٹھایا اور بڑی عزت و تکریم کی اور اپنے بیٹے مسلمہ بن عبدالملک سے زفر کی بیٹی کا عقد کر کے سمدھیانہ قائم کیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر عبدالملک مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف گیا تھا اور مصعب رضی اللہ عنہ میدان جنگ میں کام آئے۔

مصعب رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر جب مکہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پہنچی کہ ان کا بھائی عراقیوں کی غداری اور بے وفائی سے قتل ہو گیا ہے اور تمام عراق پر عبدالملک کا قبضہ ہو گیا ہے تو انھوں نے اہل مکہ کو اکٹھا کر کے ایک تقریر فرمائی کہ ”آپ حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو ذلیل نہیں کرتا جو حق پر ہو چاہے وہ تنہا ہی کیوں نہ ہو، اور اس کو عزت عطا نہیں کرتا جس کا ولی شیطان ہو، چاہے اس کے ساتھ کتنے ہی آدمی کیوں نہ ہوں۔ آپ حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے پاس ملک عراق سے غمگین اور خوش کرنے والی خبر آئی ہے

Marfat.com

یعنی ہمارے پاس مصعب رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر آئی ہے۔ ہم خوش اس لیے ہوئے ہیں کہ اس کا قتل ہونا شہادت ہے۔ ہم غم زدہ اور رنجیدہ اس لیے ہیں کہ بھائی اور دوست کی جدائی مصیبت کے وقت ایک سوزش اور جلن ہوتی ہے جس کا دوست کو احساس ہوتا ہے۔ صاحب عقل سلیم نہایت صبر و استقامت سے کام لیتا ہے۔ مصعب رضی اللہ عنہ کیا تھا؟ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ تھا اور میرے ساتھیوں اور مددگاروں میں سے ایک ساتھی اور مددگار تھا۔ آپ حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ اہل عراق بڑے بے وفا اور منافق ہیں۔ انھوں نے اس منافع کو جو مصعب رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ان کو حاصل تھا نہایت ہی کم قیمت پر فروخت کر ڈالا۔ مصعب اگر قتل ہوا تو اس کے باپ بھائی بھی تو قتل ہی ہوئے تھے جو نہایت نیک اور صالح لوگ تھے۔ خدا کی قسم! ہم اپنے بستروں پر اس طرح نہ مریں گے جیسا کہ ابو العاص کی اولاد اپنے بستروں پر مر رہی ہے۔ اللہ کی قسم! ان لوگوں میں کوئی شخص نہ کبھی جاہلیت میں مارا گیا اور نہ اسلام میں، اور ہم نیزوں کے زخم کھا کر تلوار کے نیچے دم دیا کرتے ہیں۔ اور حضرات! یہ بات آپ کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ دنیا اس عظیم الشان شہنشاہ سے ادھار لی گئی ہے جس کی حکومت ہمیشہ رہے گی اور جس کا ملک کبھی زائل نہ ہوگا۔ پس اگر دنیا ہمارے پاس آئے گی تو ہم اس کو رذیل لوگوں کی طرح نہیں لیں گے۔ اور اگر وہ ہم سے پشت پھیر کر بھاگے گی تو ہم اس پر کمزور و ناتواں لوگوں کی طرح نہ روئیں گے۔ میں اپنے لیے اور تمھارے لیے مغفرت کا طلب گار ہوں۔''

کوفہ اور اہل کوفہ:

کوفہ اور اہل کوفہ کے بارے میں ان کا رویہ اور وطیرہ دیکھ کر قلب و ذہن میں عجیب و غریب خیالات پیدا ہوتے ہیں اور کوفہ کا شہر ایک عجیب اور محیر العقول شہر نظر آنے لگتا ہے کہ کوفہ کے لوگ کس قدر متلون مزاج تھے۔ اسی شہر میں عبداللہ بن سباء کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی شہر کے باشندے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں پیش پیش تھے۔ اسی شہر کے باشندوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مدینہ چھڑوایا اور کوفہ کو مدینہ کے مقابلہ میں دارالخلافہ بنوایا۔ پھر اسی شہر میں وہ شہید بھی ہوئے اور کوفہ کا کوئی باسی ان کے جنازہ میں شریک نہ ہوا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جتنا عرصہ کوفہ میں رہے اہل کوفہ نے انھیں پریشان رکھا۔ ان کی شہادت کے بعد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو یہ لوگ ان کے مخالف بھی ہو گئے اور ان پر کئی مرتبہ قاتلانہ حملے کیے۔ آخر کار انھوں نے ان کی شرارتوں سے تنگ آ کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے اور اہل و عیال کو لے کر ہمیشہ کے لیے سرزمین کوفہ کو خیر باد کہہ دیا۔ پھر اہل کوفہ ہی خون علی رضی اللہ عنہ کے مطالبہ اور خلافت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے آمادہ ہوئے۔ بارہ ہزار خط لکھ کر ان کو کوفہ بلایا اور پھر میدان کربلا میں نہایت بے دردی کے ساتھ انھیں اور ان کے خاندان اور ساتھیوں کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد اہل کوفہ ہی نے خون حسین رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے کے لیے سب سے زیادہ آمادگی اختیار کی اور حیرت انگیز طریقہ پر اپنی محبت کا ثبوت پیش کیا۔ پھر یہ اہل کوفہ ہی تھے جنھوں نے اہل

Marfat.com

بیت کے بظاہر سب سے بڑے حامی کو قتل کروانے کے لیے مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ مختار کو مصعب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل کروایا پھر مصعب رضی اللہ عنہ کو شامیوں کے ہاتھوں شہید کروایا۔ کبھی ان لوگوں نیز اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور کبھی انتہائی بزدلی اور نامردی کا ثبوت دیا۔ ایسا کیوں تھا؟ ہماری نظر میں اس کا سبب یہی تھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مجوسی حکومت کے مقابلے کے لیے یہاں چھاؤنی قائم کی تھی اور یہاں فوج رکھی گئی۔ ان فوجیوں میں اکثر حجاز، یمن اور حضر موت وغیرہ کے باشندے تھے۔ کچھ لوگ وہ تھے جو عرب کے ان صوبوں کے رہنے والے تھے جو عراق کی سرحد پر واقع اور مدینہ کے مقابلہ میں بصرہ یا کوفہ سے قریب تر تھے۔ یہ لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں پر ایمان لا کر حلقہ اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے اور اسلامی لشکر میں شریک بھی ہو گئے تھے لیکن مدینہ طیبہ سے ان کو خصوصی تعلق قائم نہ ہو سکا تھا اور نہ انھوں نے کبھی مدینہ دیکھا تھا۔ کچھ لوگ ایسے تھے کہ ان کی زبان تو عربی تھی لیکن وہ مجوسی سلطنت کی رعایا رہے تھے اور پیدائشی طور پر وہی عادات ان میں تھیں۔ جب کوفہ اس قسم کے لوگوں پر مشتمل لشکر کی چھاؤنی قرار پایا اور عراقی لشکر کا سپہ سالار کوفہ میں رہنے لگا تو ایرانی شہر کے بہت سے شہری اپنی ضرورتوں کے تحت کوفہ سے اپنے تعلقات رکھنے پر مجبور ہوئے اور ایرانیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کوفہ میں رہنے لگی۔ عرب کے ریگستانوں کی زاہدانہ زندگی کے مقابلہ میں کسریٰ اور کیکاؤس کے ملکوں کو فتح کرنے والے لشکریوں کی حاکمانہ زندگی جو کوفہ میں بسر ہوئی تھی، وہ بہت خوش گوار تھی، لہٰذا مجموعہ لشکر کا اکثر و بیشتر حصہ کوفہ ہی میں زمین گیر ہو کر رہ گیا بلکہ کوفہ چھاؤنی کے بجائے ایک عظیم الشان شہر بن گیا اور آخر کار اس نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے دار الخلافہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس شہر کی آبادی میں بڑا عنصر فوجیوں کا تھا اور درس و تدریس، تہذیب و اخلاق اور تہذیب نفس کا سامان بہت کم تھا، لہٰذا مجموعی طور پر اس شہر کے باشندوں کا مزاج متلون اور اخلاقی حالت متغیر رہی۔ ان کے ہوش کم اور جذبات زیادہ تھے لہٰذا یہ لوگ ہمیشہ جذبات سے مغلوب رہے۔ کہنے والوں نے کہا ہے کہ اہل کوفہ کے اندر جذبات تھے دماغ نہ تھا، جوش تھا مگر عقل نہ تھی، خروش تھا لیکن غور و فکر کا سکون نہ تھا۔ ایسی حالت میں جو کچھ انھوں نے کیا وہی کچھ کرنا چاہیے تھا۔ چند نسلوں کے بعد حوادث زمانہ نے اس مختلف الاجزاء مجموعے کو کیمیاوی امتزاج سے ایک خاص مزاج دے دیا تو پھر کوفہ کی یہ متلون مزاجی بھی رفتہ رفتہ ختم ہو گئی اور یہ علم و عمل کا گہوارہ بن گیا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالملک:

مصعب رضی اللہ عنہ بن زبیر کے قتل کے بعد اب سارا عراق عبدالملک کے قبضہ میں تھا، لیکن سرزمین حجاز ابھی بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زیر حکومت تھی۔ اب سوائے عبداللہ بن زبیر کے عبدالملک کا اور کوئی حریف نہ تھا۔ لہٰذا اب عبدالملک نے حجاز پر قبضہ کرنا چاہا۔ اس کے لیے اس نے عروہ بن انیف کو چھ ہزار فوجیوں کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف روانہ کیا اور حکم دیا کہ مدینہ میں داخل نہ ہوں بلکہ مدینہ کے باہر اس وقت تک قیام

Marfat.com

کریں جب تک کہ میرا دوسرا حکم نہ پہنچے۔ مدینہ طیبہ میں حرث بن حاطب بن حرث بن معمر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے گورنر تھے۔ عروہ کے مدینہ کے قریب پہنچنے کی خبرسن کر حرث مدینہ سے چل دیئے۔ عروہ ایک ماہ تک مدینہ سے باہر مقیم رہا۔ اس نے اہل مدینہ اوراس کی حکومت کے خلاف کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی بلکہ عبدالملک کے حکم کا انتظار کرتا رہا۔ عبدالملک نے اسے دمشق واپس آنے کے لیے کہا چنانچہ وہ دمشق واپس چلا گیا۔ اس کے دمشق واپس جانے کے بعد حرث پھر مدینہ واپس آ گئے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے سلیمان بن خالد کو خیبر اور فدک کا حاکم مقرر کر کے روانہ کیا۔ عبدالملک نے عبدالملک بن حرث بن حکم کو چار ہزار فوج دے کر روانہ کیا کہ حجاز پر تصرف کرتا ہوا چلا جائے۔ اس وادی القریٰ میں پہنچ کر قیام کیا اور وہاں سے ابن قمقام کو فوج کے ایک دستہ کے ساتھ خیبر کی طرف روانہ کیا کہ سلیمان پر شب خون مارو۔ سلیمان گرفتار ہو کر قتل ہوا اور ابن قمقام نے خیبر میں قیام کیا۔ ابن زبیر نے حجاز میں عبدالملک کے حملہ کی خبرسن کر حرث بن حاطب کو مدینہ منورہ کی گورنری سے معزول کر کے جابر بن اسود بن عوف زہری کو مدینہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ جابر نے مدینہ منورہ پہنچ کر ابوبکر بن ابو قیس کو چھ سو آدمیوں کے لشکر کے ساتھ خیبر کی طرف روانہ کیا۔ ابن قمقام اور ابوبکر کی جنگ ہوئی۔ ابن قمقام شکست کھا کر بھاگا۔ اس کے سپاہی کچھ تو بھاگ گئے اور کچھ میدان میں کام آئے

عبدالملک کو جب اس بات کی خبر پہنچی تو اس کے طارق بن عمر کو حجاز کی فوجوں کا کمانڈر بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ وادی القریٰ اور ایلہ کے مابین قیام کر کے ابن زبیر کے عاملوں کو تصرف سے روکو۔ اور اہل حجاز کے دلوں میں ہمارے خلاف جذبات نہ پیدا ہونے دو، اور اگر کچھ دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں تو انھیں مٹانے کی کوشش کرو۔ طارق نے عبدالملک کی ہدایات کے مطابق کام کیا اور فوج کا ایک زبردست دستہ خیبر کی طرف روانہ کیا۔ وہاں ابوبکر بن ابوقیس کے ساتھ جنگ ہوئی جس میں ابوبکر اپنے دو سو ہمراہیوں اور ساتھیوں سمیت کام آیا۔ طارق نے خیبر میں جا کر ڈیرے لگا لیے۔ جابر بن اسود کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے دو ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک لشکر خیبر کی طرف روانہ کیا۔ خیبر کے قریب دونوں لشکروں میں شدید لڑائی ہوئی۔ طارق نے کئی لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ عبداللہ بن زبیر نے جابر بن اسود کو مدینہ کی گورنری سے معزول کر کے سنہ ۷۰ھ میں طلحہ بن عبداللہ بن عبداللہ بن عوف معروف بہ طلحۃ النداء کو مدینہ منورہ کا گورنر مقرر فرمایا اس کے بعد خیبر کا علاقہ عبدالملک بن مروان کی حکومت میں شامل رہا اور طلحہ بن عبداللہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدینہ منورہ پر حکومت کرتا رہا۔ اب عبدالملک کی توجہ زیادہ تر عراق اور ایران کی طرف مبذول رہی، اس لیے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ عبدالملک کی کوئی قابل ذکر معرکہ آرائی نہیں ہوئی۔

حرم مکہ کا محاصرہ:

مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے قتل اور پورے عراق پر عبدالملک کا قبضہ ہونے کے بعد دونوں طرف کا فوجی

Marfat.com

اور مالی توازن بگڑ گیا۔ عبدالملک کی فوجی اور مالی حالت مضبوط ہوگئی جب کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی فوجی قوت اور مالی حالت کمزور ہوگئی۔ ان غیر متوازن حالات میں سنہ ۷۲ھ میں عبدالملک نے حجاج بن یوسف ثقفی کو ایک بڑی فوج کے ساتھ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس کے ساتھ تین ہزار فوج تھی۔ وہ عبدالملک کی ہدایت کے مطابق طائف میں قیام پذیر ہوا۔ یہاں سے وہ اپنے سواروں کو عرفات کی طرف روانہ کرتا۔ وہ ابن زبیر کے فوجیوں سے لڑ بھڑ کر واپس آ جاتے۔ اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ حجاج نے عبدالملک کو لکھا کہ کچھ اور فوج بھیجی جائے اور مجھے مکہ کا محاصرہ کرنے کی اجازت دی جائے۔

روایات میں ہے کہ عبدالملک نے پانچ ہزار آدمی حجاج کی امداد کے لیے بھیجے اور طارق کو بھی لکھا کہ حجاج کی مدد کے لیے مکہ جاؤ۔ حجاج نے رمضان المبارک میں مکہ کا محاصرہ کر لیا اور جبل بوقبیس سے منجنیق لگا کر خانہ کعبہ پر سنگ باری شروع کر دی۔ اہل مکہ کے لیے رمضان المبارک کا یہ مہینہ بڑی مصیبت کا مہینہ تھا۔ لوگوں نے مکہ سے نکل نکل کر ارد گرد کے علاقوں میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ذی قعدہ بھی آ گیا لیکن محاصرہ کی شدت میں میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ روز مقابلہ کے لیے جاتے لیکن ہر روز ان کے ساتھیوں کی تعداد کم ہو رہی تھی، لہٰذا انھیں اپنی کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔

ہر روز عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مالی اور فوجی طاقت کم ہو رہی تھی۔ اسی حالت میں ذوالحجہ آ گیا اور دور دور سے لوگ حج کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ اتنے ماہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نہایت بہادری، شجاعت اور استقلال سے مدافعت کرتے رہے، لیکن باہر سے ان کی مدد کے تمام ذرائع بند تھے۔ کسی قسم کی کوئی امداد باہر سے نہیں آ سکتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد سامان رسد بھی ختم ہو گیا اور مکہ میں قحط کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ہر شے سونے کے بھاؤ بکنے لگی۔ طلب و رسد کا توازن نہایت بری طرح بگڑ گیا۔ ان حالات میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دس ہزار آدمی حجاج بن یوسف کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ آخر میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے لڑکوں تک نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

حج کے ایام تھے۔ دور دور سے حجاج کرام آئے ہوئے تھے لیکن وہ ارکان حج ادا نہ کر سکے۔ خود عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے نہ طواف کیا اور نہ سعی بین صفا و مروہ کی۔ عرفات میں جانا چاہا لیکن حجاج بن یوسف نے نہ جانے دیا۔ اس سال عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی حج کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہ کعبہ پر سنگ باری کو دیکھ کر سخت پریشان ہوئے کیونکہ اس حالت میں طواف کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ آخر ایک روز انھوں نے حجاج کو پیغام بھیجا: ''اللہ کے بندے! اتنا تو خیال کر کہ لوگ دور دور سے حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ تیری سنگ باری کے باعث وہ طواف اور سعی نہیں کر سکتے۔ اس سنگ باری کو بند کر و تا کہ لوگوں کو طواف کرنے اور صفا و مروہ کے مابین سعی کا موقع مل جائے۔ اس سنگ باری کو حج ختم ہونے تک بند کر دیا جائے۔ آپ کے اس پیغام پر سنگ باری تو بند ہوگئی لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو وقوف عرفات سے روک دیا

Marfat.com

گیا۔ حج کے ختم ہوتے ہی باہر سے آنے والے لوگوں میں اعلان کر دیا گیا کہ وہ جلد از جلد اپنے شہروں کو روانہ ہو جائیں کیونکہ پھر سنگ باری شروع ہونے والی ہے۔ اس اعلان کے سنتے ہی لوگ اپنے اپنے شہروں کو روانہ ہو گئے اور ان کے ساتھ مکہ کے لوگ جو ابھی تک باہر نہیں گئے تھے، وہ بھی دوسرے شہروں میں پناہ لینے کی لیے چلے گئے۔

حاجیوں کے جانے کے بعد حجاج ابن یوسف نے پھر سنگ باری شروع کر دی۔ ایک بڑا پتھر منجنیق سے خانہ کعبہ کی چھت پر گرا اور چھت ٹوٹ کر گر گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک سخت کڑک کی آواز آئی، بجلی چمکی اور زمین و آسمان کے درمیان کئی روز تاریکی چھائی رہی۔ حجاج کی فوج کے لوگ ڈر گئے اور سنگ باری بند کر دی۔ ایک روایت میں ہے کہ دو روز تک تاریکی چھائی رہی اور کڑک کی آواز سے حجاج کی فوج کے کئی آدمی مر گئے۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو محاصرہ کی شدت کے باعث ان کے سب ساتھی چھوڑ گئے۔ صرف چند ساتھی ان کے ساتھ رہ گئے لیکن ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ اس حالت میں بھی برابر لڑتے رہے اور آخر میں ان کے لڑکوں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ عبدالملک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہر قسم کی رعایت کرنے کے لیے تیار تھا۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ مقابلہ جاری رکھنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تو اپنی والدہ ماجدہ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''اماں! میرے تمام ساتھی ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں یہاں تک کہ میرے لڑکوں نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ جو چند جانثار اور جانباز باقی رہ گئے ہیں، ان میں مقابلہ کی تاب نہیں۔ ہمارا حریف ہمارے ساتھ رعایت کرنے کے لیے آمادہ ہے، ایسی حالت میں آپ کا کیا فرمان ہے۔ وہ بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی تھیں، انھوں نے اس وقت بیٹے کو جو جواب دیا وہ عورتوں کی تاریخ کے لیے باعث فخر ہے۔ جواب میں سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''بیٹا! تم کو اپنی حالت کا اندازہ خود ہوگا، اگر تم حق پر ہو اور حق کے لیے لڑتے ہو تو اب بھی اس کے لیے لڑو کیونکہ تمھارے بہت سے ساتھیوں نے اس کے لیے اپنی جان قربان کی ہے، اور اگر دنیا طلبی کے لیے لڑتے تھے تو تم سے زیادہ برا اور کون خدا کا بندہ ہوگا کہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالا اور اپنے ساتھ اور کتنوں کو ہلاک کیا۔ اگر یہ عذر ہے کہ تم خود تو حق پر ہو لیکن اپنے ساتھیوں اور مددگاروں کی وجہ سے مجبور ہو گئے ہو تو یاد رکھو، شریفوں کا یہ شیوہ نہیں ہے۔ تم کو کب تک دنیا میں رہنا ہے، جاؤ حق پر جان دینا اس دنیا کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔''

ماں کے منہ سے یہ جواب سن کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اماں! مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ قتل کرنے کے بعد میرا مثلہ کریں گے صلیب پر لٹکائیں گے۔'' سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''بیٹا! جب بکری کو ذبح کر دیا جائے تو پھر اسے اس کی کیا پروا کہ اس کی کھال کھینچی جاتی ہے۔ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ نیک دلی اور بصیرت سے کرتے جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے رہو۔

سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے والدہ کے سر کو بوسہ دیا اور عرض کی کہ جب تک میرے دم میں دم ہے

Marfat.com

میں حق کے لیے لڑتا رہوں گا۔ آپ کی باتوں سے مجھے بہت بصیرت حاصل ہوئی ہے۔ اماں! میں آج ضرور مارا جاؤں گا، تم زیادہ مغموم نہ ہونا، میں نے حتیٰ الامکان اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ اے اللہ! میں نے یہ باتیں فخر سے نہیں کہیں بلکہ اپنی ماں کو تسلی دینے کے لیے کی ہیں۔

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کی عمر اس وقت سو سال تھی اور ان کی یہ باتیں جوانوں کی ڈھارس بندھا رہی تھیں۔ فرمایا: ''بیٹا! اللہ کا نام لے کر دشمنوں پر حملہ کرو۔'' سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا جب بیٹے کو رخصت کر رہی تھیں، تو جب گلے سے لگایا تو ہاتھ زرہ پر پڑا۔ ماں نے فرمایا: ''بیٹا! یہ زرہ کیسی؟ عرض کی صرف اطمینان اور مضبوطی کی غرض سے پہن رکھی ہے۔'' سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اس کو اتار دو اور معمولی کپڑوں میں دشمن کا مقابلہ کرو۔'' عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ماں کے حکم کی تعمیل میں اسی وقت اسے اتار دیا۔ قمیص کے دامن اٹھا کر کمر سے باندھے۔ دونوں آستینیں اوپر چڑھائیں تاکہ تلوار چلانے میں رکاوٹ نہ ہو، اور گھر سے نکل کر ساتھیوں سے فرمایا:

''اے آل زبیر! تلوار کی جھنکار سے خوف زدہ نہ ہونا کیونکہ زخم میں دوا لگانے کی تکلیف اس سے زیادہ ہوتی ہے جو زخم پیدا ہونے سے ہوتی ہے۔ تم لوگ اپنی اپنی تلواریں تول لو ان کو خون ناحق سے اس طرح بچاؤ جس طرح اپنے چہروں کو بچاتے ہو۔ ہر شخص اپنے مدمقابل پر حملہ آور ہو، اور تم مجھے تلاش نہ کرتے پھرنا، میں سب سے آگے دشمنوں سے لڑتا ہوا ملوں گا۔''

ساتھیوں سے یہ کہہ کر دشمن پر ایک ایسا حملہ کیا کہ صفوں کو چیرتے اور انھیں مارتے گراتے دشمن کی پچھلی صفوں تک پہنچ گئے اور پھر اسی طرح واپس آئے۔ آخر ایک عظیم بہادر تھے۔ واپس آئے مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر باب صفا کی طرف سے آپ نے حملہ کیا۔ کوہ صفا کے اوپر سے ایک شخص نے تیر مارا جو پیشانی پر لگا۔ خون بہنے لگا۔ آپ اسی حالت میں برابر لڑتے رہے۔ مختصر یہ کہ آپ اور آپ کے چند ساتھیوں نے ظہر تک دشمن کے قتل کرنے میں وہ چابک دستی دکھائی کہ چشم فلک نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ آخر ایک ایک کر کے تمام ساتھی کام آئے آخر کار سہ شنبہ (منگل) جمادی الآخر سنہ ۷۳ھ کو دنیا کا ایک عظیم الشان بہادر، متقی اور عبادت گزار انسان داد شجاعت دیتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ سر کاٹ کر لاش مقام حجون میں اوپر لٹکا دی گئی اور سر خانہ کعبہ کی دیوار سے لٹکا دیا گیا۔ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کو لاش کو دفن کرنے کی اجازت حجاج نے نہ دی۔ عبدالملک کو جب یہ پتہ چلا تو اس نے حجاج کو ملامت کی اور لاش دفن کرنے کی اجازت دی۔ چند روز کے بعد سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو گیا۔ (مستدرک حاکم: جلد ۳، تذکرہ عبداللہ بن زبیر، ابن اثیر: ۲۸۲/۴)

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شخصیت:

سیدنا عبداللہ بن زبیر بن عوام بن خویلد مہاجرین کے مدینہ سے ہجرت کر کے آنے کے بعد ان کے ہاں یہ سب سے پہلا بچہ پیدا ہوا۔ ان کی والدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھیں جو کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن

Marfat.com

تھیں۔ ان کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ انھیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آئیں اور ان کو آپ ﷺ کی جھولی میں ڈالا۔ آپ نے ان کے لیے دعا فرمائی اور ان کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈالا۔ چنانچہ ان کے پیٹ میں سب سے پہلی چیز جو داخل ہوئی وہ رسول اللہ ﷺ کا لعاب دہن تھا۔ اس لحاظ سے یہ جلیل القدر صحابی تھے۔

(البدایہ والنہایہ: ۳۴۲/۸)

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی خالہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی آغوش میں پرورش پائی، اس لیے فضل و کمال میں وہ اپنے ہم عصروں میں ایک امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ قرآن حکیم کے نہایت اچھے قاری، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی آپ کی قرأت کے معترف تھے۔ احادیث میں رسول اللہ ﷺ، سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے جلیل القدر اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خوشہ چینی کی۔ ان سے ۳۳ روایات حدیث کی کتابوں میں ہیں۔ (تہذیب الکمال، ترجمہ عبداللہ بن زبیر) فقہ میں اتنا درک تھا کہ مدینہ طیبہ کے صاحب علم و افتا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ (اعلام الموقعین: ۱۳/۱) آپ کئی زبانوں سے بخوبی واقف تھے بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ آپ کے مختلف علاقوں کے سو غلام تھے اور آپ ان سو غلاموں سے انہی کی زبان میں گفتگو فرماتے تھے۔

(مستدرک حاکم: ۵۴۹/۳)

تقریر میں ان کا جواب نہیں تھا۔ بڑے فصیح و بلیغ انداز میں تقریر کرتے تھے۔ عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فصاحت و بلاغت میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ چنانچہ اس بات کی تصدیق ان کے ان خطبات سے ہوتی ہے جو کتابوں میں موجود ہیں۔

اخلاق حسنہ کے لحاظ سے ان کی زندگی ایک نمونہ تھی۔ زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت ان کی بے مثال تھی۔ نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بالکل مشابہ تھی۔ (الاصابہ: ۷۰/۴) نماز میں اس قدر سکون اور استغراق ہوتا تھا کہ قیام کی حالت میں بے جان ستون نظر آتے تھے اور رکوع اتنا لمبا فرماتے کہ دوسرے لوگ اتنے وقت میں سورۃ بقرہ ختم کر دیتے۔ (اسد الغابہ: ۱۶۲/۳) اور سجدہ کی طوالت کے بارے میں کتابوں میں مرقوم ہے کہ چڑیاں اڑ اڑ کر پیٹھ پر بیٹھتی تھیں۔ (ابن اثیر: ۳۹۲/۴) محاصرہ کے زمانہ میں جب کہ سنگ باری ہو رہی تھی، وہ نہایت سکون و اطمینان سے حطیم میں نماز پڑھتے تھے۔ (تاریخ الخلفاء: ۲۱۳) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جو خود زہد و ورع کے پیکر تھے وہ بھی ان کی دینی زندگی کا نہایت کھلے لفظوں میں اعتراف کرتے تھے۔ (مستدرک حاکم: ۵۵۲/۳)

سنت نبوی کا دل و جان سے اتباع کرتے۔ اگر کوئی طریقہ سنت کے خلاف ہوتا تو اس کی سخت مخالفت کرتے۔ (تاریخ الخلفاء: ص ۲۱۶) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی خالہ تھیں اور امہات المومنین میں سے تھیں۔ انھوں نے انہی کی آغوش میں پرورش پائی تھی، اس لیے ان کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھتے۔ سیدہ رضی اللہ عنہا بڑی فیاض تھیں۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ جو کچھ دیتے اسے فوری طور پر خرچ کر ڈالتیں۔ ایک مرتبہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی زبان سے اس کی شکایت نکل گئی۔ سیدہ رضی اللہ عنہا نے جب سنا تو ذہنی اور قلبی طور پر بڑی تکلیف محسوس

Marfat.com

فرمائی۔ اس وجہ سے انھوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے کلام نہ کرنے کی قسم کھا لی۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس سے بڑی پریشانی ہوئی اور مختلف طریقوں سے اپنے اس جرم کی معافی کی درخواست کی لیکن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی یہ قسم توڑنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ آخر کار بڑی سفارشوں سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان یاد دلانے کے بعد کہ کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان سے تین روز سے زیادہ ترک کلام جائز نہیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی قسم توڑی اور اس کے کفارہ میں چالیس غلام آزاد کیے اور خالہ اور بھانجے میں پھر محبت وشفقت کے تعلقات قائم ہوئے۔

(بخاری)

ان کے والد زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ دولت مند لوگوں میں سے تھے۔ ان کا کاروبار اور تجارت بڑی وسیع تھی۔ پانچ کروڑ سے زیادہ کا ترکہ چھوڑا، اور ایک تہائی کی وصیت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے کر گئے تھے۔ نقد کے علاوہ جاگیر اور مکانوں کی شکل میں الگ سرمایہ تھا، اس لیے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی زندگی آخر تک بڑی خوش حال رہی۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ قریش کے شجاع ترین لوگوں میں سے تھے۔ ان کی پوری زندگی جرأت اور شجاعانہ کارناموں میں گزری۔ بنوامیہ کی حکومت کا سات سال تک مقابلہ کرتے رہے ایک روز بھی اطمینان کا نہیں گزرا۔ بات کرنے میں بڑے جری اور حق گو تھے۔

سات سال حکومت کی لیکن پوری زندگی جنگ وجدل میں گزاری۔ اس زمانہ میں انھوں نے خانہ کعبہ کی عمارت کو از سر نو تعمیر کیا اور حطیم کو بھی خانہ کعبہ کی عمارت میں داخل کر دیا۔

خوارج کی شورش:

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ خوارج کا شورش برپا کرنے کا ایک عجیب انداز تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد یہ مرکز عبدالملک کے قبضہ میں آ گیا، اس لیے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے بعد اب خوارج کا رخ عبدالملک کی طرف پھر گیا۔ جونہی پوری اسلامی دنیا کی حکومت عبدالملک کے ہاتھ میں آئی تو خوارج بڑے زور شور سے اٹھے۔ عبدالملک نے ان کے استیصال کے لیے پوری قوت صرف کر دی، لیکن وہ مدتوں حکومت کا نہایت شجاعت، بہادری اور جانبازی سے مقابلہ کرتے رہے۔ آخر کار بڑی مشکل سے ان کا زور ٹوٹا۔

پہلے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مہلب بن ابی صفرہ خوارج کا مقابلہ کرتے رہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بعد وہ عبدالملک کے ساتھ ہو گئے تھے۔ ۷۲ھ میں خالد بن عبداللہ گورنر کوفہ نے مہلب کو خوارج کے مقابلہ سے ہٹا کر محکمہ مال کا سربراہ لگا دیا اور ان کی جگہ اپنے بھائی عبدالعزیز کو مقرر کر دیا۔ مہلب بڑے بہادر، جرأت مند اور تجربہ کار سپہ سالار تھے۔ جونہی یہ ہٹے خوارج نے پھر زور پکڑنا شروع کر دیا اور ایک معرکہ میں انھوں نے عبدالعزیز کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ عبدالملک کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے خالد بن

Marfat.com

عبداللہ کو ایک تہدید آمیز خط لکھا اور کہا کہ تم نے مہلب جیسے تجربہ کار شخص کو اتنے اہم عہدہ سے ہٹا کر اپنے بھائی کو مقرر کر دیا جو کہ ایک ناتجربہ کار آدمی تھا، اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا جو ہوا۔ اب میں تمھیں تاکید کرتا ہوں کہ مہلب کو فوری طور پر اس کے سابقہ عہدہ پر بھیجو اور خوارج کے بارے میں مہلب کے مشورہ کے بغیر کوئی کارروائی نہ کرو۔ اس حکم کے ساتھ اپنے بھائی بشر بن مروان کو جو کہ بصرہ اور کوفہ کا گورنر تھا، کو علیحدہ خوارج کے مقابلہ میں پانچ ہزار فوج بھیجنے کی تاکید کی۔ عبدالملک کے اس حکم کی تعمیل میں خالد نے مہلب کو خوارج کے مقابلہ میں بھیج دیا اور خود اہل بصرہ کے ساتھ ان کی مدد کے لیے اہواز پہنچا۔ بشر نے الگ عبدالرحمٰن بن اشعث کو پانچ ہزار کی جمعیت کے بھیجا۔ تینوں نے مل کر مورچہ بندی کی۔ چنانچہ خوارج مقابلہ کی طاقت نہ پا کر اہواز سے منتشر ہو گئے۔ بحرین پر ایک خارجی ابوفدیک نے قبضہ کر لیا تھا، اس لیے ۷۳ھ میں عبدالملک کے حکم سے عمر بن عبیداللہ دس ہزار فوجیوں کے ساتھ بحرین پہنچا۔ ابوفدیک نے نہایت جرأت اور بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخر کار مارا گیا۔ اس کے بہت سے آدمی قتل ہوئے اور بہت سے زندہ گرفتار ہوئے۔ ۷۴ھ میں عبدالملک نے براہ راست مہلب کو خوارج کے استیصال کے لیے تقرر کیا اور اپنے بھائی بشر بن مروان گورنر کوفہ کو اس کی مدد کے لیے لکھا۔ بشر کو مہلب کا یہ براہ راست تقرر ناگوار گزرا۔ وہ عبدالملک کے اس حکم کی خلاف ورزی تو نہیں کر سکتا تھا لیکن عبدالرحمٰن بن مخنف کو پانچ ہزار کوفی اور بصری سپاہ کے ساتھ مہلب کی مدد کے لیے بھیجا لیکن روانگی کے وقت اسے کہا کہ میں تمھیں مہلب سے زیادہ سرداری کے قابل سمجھتا ہوں۔ تم اپنے آپ کو مہلب کا ماتحت ہی بنا کر نہ رکھنا بلکہ اپنی ذاتی رائے سے بھی کام لینا۔ عبدالرحمٰن بن مخنف دار ہرمز میں مہلب سے جا کر ملا لیکن اپنی فوج کو الگ خیمہ زن ہونے کے لیے کہا اور اپنی خود مختاری کی علامات ظاہر کرنے لگا۔ ابھی خوارج سے لڑائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ یہ خبر پہنچ گئی کہ بشر بن مروان فوت ہو گیا ہے اور مرتے وقت خالد بن عبداللہ کو اپنا قائم مقام بنا گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی بصرہ اور کوفہ کے فوجی اپنے اپنے شہروں کو واپس چل دیئے۔ خالد بن عبداللہ نے ان کو بہت سمجھایا اور پھر ڈرایا اور دھمکایا لیکن کوئی بھی مہلب کی طرف واپس جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ دار ہرمز میں مہلب بن ابی صفرہ اور عبدالرحمٰن بن مخنف بہت تھوڑی جمعیت کے ساتھ خوارج سے برسر پیکار تھے، اور بصرہ اور کوفہ کے فوجیوں کے واپس چلے جانے کے بعد ان کی حالت نہایت کمزور اور نازک ہو گئی تھی۔

ان حالات نے عبدالملک کو مجبور کر دیا کہ وہ حجاج بن یوسف ثقفی کو کوفہ اور بصرہ کا گورنر مقرر کرے کیونکہ اہل عراق اور خصوصی طور پر اہل کوفہ نہایت سرکش، شورش پسند اور اپنے والیوں کا حکم نہ ماننے والے واقع ہوئے۔ یہ نرم دل حاکم کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرتے تھے۔ اس وجہ سے عبدالملک نے حجاج کو جو بڑا سخت گیر تھا، عراق کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اس کی اس منصب پر تقرری رمضان ۷۵ھ میں ہوئی۔ یہ کل بارہ سو سپاہیوں کے ساتھ کوفہ میں داخل ہوا اور سیدھا کوفہ کی جامع مسجد میں گیا، شہر میں تقریر کے لیے منادی کرا دی۔ اہل کوفہ نئے گورنر کی تقریر سننے کے لیے کوفہ کی جامع مسجد میں آئے۔ ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا کہ حجاج بن یوسف

Marfat.com

گورنر عراق بن کر آیا ہے۔ یہ لوگ والیوں کی توہین وتحقیر کرنے کے عادی تھے اور دوران تقریر ان پر پتھر پھینکتے تھے جیسا کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ انھوں نے کیا۔ اب بھی وہ اپنی مٹھیوں میں سنگ ریزے اور پتھر لے کر آئے تھے۔ حجاج منہ پر نقاب ڈالے ہوئے تھے، اس لیے کسی نے اسے نہیں پہچانا۔ جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو حجاج منبر پر چڑھا اور اس نے اپنے منہ سے نقاب ہٹائی اور اپنا تعارف کرایا، اس وقت اہل کوفہ اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ ان کی مٹھیوں سے سنگ ریزے اور کنکر نیچے گر پڑے۔ حجاج نے انھیں مخاطب کر کے ایک شعلہ بار تقریر کی۔ تقریر کیا تھی؟ اہل کوفہ کے لیے گویا کہ ایک آتش فشاں پھٹا۔ حجاج نے کہا:

''لوگو! بخدا! میں برائی اور شر کو اس کی جگہ پر رکھتا ہوں اور اس کا پورا پورا بدلہ دیتا ہوں۔ میں بہت سے سروں کو دیکھ رہا ہوں کہ پکی ہوئی کھیتی کی طرح کٹنے والے اور پکے ہوئے پھل کی طرح جھڑنے والے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے عماموں اور داڑھیوں کے درمیان خون کی موجیں اٹھ رہی ہیں۔ اب معاملہ آخری حد تک پہنچ چکا ہے۔ واللہ! مجھے آسانی سے نہیں دبایا جا سکتا۔ میں حوادث سے نہیں ڈرتا، میں زمانہ کے گرم وسرد چشیدہ ہوں۔ امیر المؤمنین عبدالملک نے اپنے ترکش کے تمام تیروں کو جانچا، ان میں جو سب سے زیادہ کڑوا، سخت اور جگر دوز تھا وہ تمھارے سینہ کی طرف چلایا ہے۔ تم نے مدتوں سے فساد، سرکشی، بغاوت، بے وفائی، نفاق اور شقاق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ اب تم خود بخود سیدھے ہو جاؤ اور سر اطاعت خم کر دو وگرنہ میں تمھارے تمام کس بل نکال دوں گا، تمھاری کجروی کو درست کر دوں گا، تمھیں لکڑی کی طرح چھیل اور ببول کے پتوں کی طرح جھاڑ ڈالوں گا، تمھیں سرکش اونٹ کی طرح ماروں گا کہ تم اپنی تمام سرکشی اور شورش پسندی بھول کر مطیع و اطاعت گزار ہو جاؤ گے، تم پر اتنے مصائب نازل کروں گا کہ تم پست ہو جاؤ گے اور تمھاری ساری شوخی جاتی رہے گی۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ کر دکھاتا ہوں، اور جو اندازہ کرتا ہوں وہ بالکل درست اور صحیح ہوتا ہے، خدا کی قسم! اگر تم لوگ راہ راست اور حق پر نہ آئے تو میری تلوار عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر دے گی اس وقت تم لوگ ہوا و ہوس چھوڑ دو گے۔ نافرمانوں کی نافرمانی سے اغماض اور چشم پوشی کے معنی یہ ہیں کہ دشمنوں سے نہ لڑا جائے اور سرحدوں کو بے کار کر دیا جائے۔ اگر لوگوں کو جنگ میں شرکت پر مجبور نہ کیا جائے تو وہ خوشی سے لڑنے کے لیے نہ جائیں گے۔ جس بغاوت اور سرکشی سے تم نے مہلب کا ساتھ چھوڑا ہے اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ خدا کی قسم! آج کے تیسرے دن بعد جو شخص واپس نہ گیا اور یہاں نظر آیا اس کا سر تن سے جدا کر دوں گا اور اس کا گھر لٹوا دوں گا۔''

حجاج نے کہا:

''تمھاری حالت اس بستی والوں کی سی ہے جس کا قرآن حکیم میں ذکر ہے: ''وہاں ہر قسم کے امن واطمینان

Marfat.com

کی فراوانی تھی، ہر قسم کی نعمتیں بکثرت ہر طرف سے چلی آتی تھیں، مگر اس بستی والوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط کر دیا۔ امیر المومنین نے حکم دیا کہ تمھاری تنخواہیں تقسیم کر دی جائیں اور تم مہلب بن ابی صفرہ کے ساتھ خوارج کے مقابلہ کے لیے نکل جاؤ۔ تنخواہ وصول کرنے کے تین روز بعد اگر کوئی شخص مجھے کوفہ میں نظر آیا تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔''

اس آتش بار تقریر کے بعد حجاج نے عبدالملک کا فرمان پڑھنے کا حکم دیا ابھی صرف اتنا ہی پڑھا گیا تھا: "امـا بعد! السلام علیکم" کہ حجاج نے پڑھنے والے کو روک دیا اور اہل کوفہ کو مخاطب کر کے غضبناک آواز میں بولا: ''امیر المومنین تم لوگوں کو سلام کہتے ہیں اور تم ان کے سلام کا جواب نہیں دیتے۔ خدا کی قسم! میں تم لوگوں کو ادب سکھا کر رہوں گا، تمھاری عادتیں بگڑ چکی ہیں جن کو درست کرنا ضروری ہے۔ اس تہدید اور تادیب پر حاضرین نے "سلام الله علی امیر المومنین ورحمة الله وبرکاته" کہا۔ اس کے بعد پھر فرمان پڑھنے کا حکم دیا۔

حجاج کی اس آتش فشاں اور شعلہ ریز تقریر نے اہل کوفہ کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ اپنی ساری سرکشی اور شورش پسندی ایک ہی تقریر سے بھول گئے یا تو یہ حالت تھی گورنر نے ان کو روکنا چاہا اور مہلب کے پاس واپس جانے کا حکم دیا اور انھوں نے اس حکم سے سرکشی اور سرتابی کی اور وہ مہلب کا ساتھ چھوڑ کر آ گئے تھے یا پھر اب یہ حالت بھی کہ ہر شخص مہلب کے پاس جانے کے لیے بے تاب ہو گیا اور توشہ لیے بغیر مہلب کے پاس روانہ ہو گئے۔ اور اژدہام کے باعث کوفہ کے پل پر چلنے کے لیے راستہ نہ رہا۔

کوفہ سے فراغت کے بعد حجاج بصرہ گیا اور وہاں بھی اسی قسم کی تہدید آمیز اور آتش بار تقریر کی۔ ایک ہی تقریر سے یہاں کے شورش پسند لوگوں کے دماغ بھی درست ہو گئے اور لوگ جوق در جوق فوج میں شریک ہو کر مہلب بن ابی صفرہ کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

ابن جارود کی بغاوت:

مہلب کی امداد کے لیے حجاج استقاباز آیا۔ یہاں سے مہلب کی لشکر گاہ صرف اٹھارہ فرسخ تھی۔ حجاج کا ارادہ یہ تھا کہ یہاں رہ کر وہ مہلب کی امداد کرتا رہے۔ حجاج کے یہاں قیام کے دوران اس کے خلاف ایک فتنہ اٹھا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی گورنری کے زمانہ میں عراقی فوج کی تنخواہ میں سو درہم کا اضافہ کیا۔ مصعب کے بعد عبدالملک نے بھی اس اضافہ کو برقرار رکھا۔ حجاج نے ایک روز تقریر کرتے ہوئے کہا: ''مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تنخواہوں میں جو اضافہ ہوا تھا میں اسے منسوخ کرتا ہوں۔'' اس پر ایک بااثر شخص عبداللہ بن جارود نے فوراً کھڑے ہو کر اس پر احتجاج کرتے ہوئے کہا: ''یہ مصعب بن زبیر کا

Marfat.com

اضافہ نہیں بلکہ عبدالملک نے بھی اسے قبول کیا اور برقرار رکھا۔'' یہ تردد حجاج کی طبیعت کے سخت خلاف تھی لہٰذا اس نے عبداللہ بن جارود کو قتل کی دھمکی دی، یہ مسئلہ چونکہ فوج کے مفاد کا تھا اس وجہ سے فوج کا اکثر و بیشتر حصہ ابن جارود کے ساتھ ہو گیا اور حجاج کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ حجاج کے پاس اس وقت اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا۔ ابن جارود نے اس کا خیمہ لوٹ لیا، لیکن حجاج کی خوش قسمتی تھی کہ حجاج کا خیمہ لوٹنے کے بعد ابن جارود نے اور کوئی کارروائی نہ کی حجاج کے مشیروں نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر اسے بصرہ چھوڑ دینے کا مشورہ دیا لیکن حجاج نے ہمت سے کام لیتے ہوئے ان کے مشورہ کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔ دو چار روز کے بعد حجاج کے محافظ جمع ہو گئے۔ اس وقت عبداللہ بن جارود پھر مقابلہ کے لیے اٹھا۔ اب حجاج کو تھوڑی سی فوجی قوت حاصل ہو گئی تھی، لہٰذا اس نے مقابلہ کیا، لیکن ابن جارود کے ساتھ قریباً پوری فوج تھی، اس لیے لڑائی میں اسی کا پلہ بھاری رہا، لیکن سوء اتفاق سے عبداللہ بن جارود کو ایک تیر آ کر لگا جس سے اس کا انتقال ہو گیا۔ اس بغاوت کا سرغنہ چونکہ یہی تھا حالانکہ مفاد ساری فوج کا تھا۔ اس لیے اس کے انتقال کے بعد فوج کی ہمت جواب دے گئی اور عراقیوں کی ہمتیں ایسی ہی تھیں۔ حجاج نے موقع کی مناسبت اور وقت کی مصلحت دیکھ کر عام معافی کی منادی کرا دی۔ اس منادی پر باغی فوج نے سپر ڈال دی۔ جنگ تو ختم ہو گئی لیکن حجاج کے دل میں ابن جارود اور اس کے باغی ساتھیوں کے خلاف غصہ تھا، لہٰذا جنگ کے بعد حجاج نے عبداللہ بن جارود کے تمام بڑے بڑے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ اس طرح عراق میں ایک بڑا انقلاب برپا ہوتے ہوتے رہ گیا۔

پُرشورش ماحول:

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ کوفہ اور بصرہ سے حجاج کی تہدید آمیز تقریر کے باعث لوگ خارجیوں کے استیصال کے لیے مہلب کی امداد کے لیے گئے اور رامہرمز سے خارجیوں کو ہٹا دیا۔ یہاں سے تو وہ ہٹ گئے لیکن وہ گازوروں میں اکٹھے ہو گئے۔ مہلب بھی ان کے تعاقب میں گیا۔ دونوں عرصہ تک معرکہ آرائی ہوتی رہی اور دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۷۶ھ میں جزیرہ میں ایک عابد و زاہد شخص صالح بن مسرح تمیمی مظالم کے استیصال کی دعوت لے کر اٹھے۔ لوگ بھی مظالم سے تنگ آ چکے تھے لہٰذا بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ایک اور خارجی شبیب بن نعیم شیبانی بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ چونکہ صالح کی دعوت بھی درحقیقت بنوامیہ کے خلاف تھی، اس لیے شبیب بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ جزیرہ کے حاکم محمد بن مروان نے عدی بن عدی کندی کو صالح کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ عدی ایک نیک فطرت شخص تھا۔ اسے خون ریزی پسند نہ تھی اس لیے اس نے صالح کو کہلا بھیجا کہ میں جنگ نہیں کرنا چاہتا لہٰذا بہتر یہ ہے کہ تم ان اطراف سے چلے جاؤ، لیکن اس نے جانے سے انکار کیا۔ اس کے انکار پر عدی کو بامر مجبور مقابلہ کرنا پڑا لیکن شکست کھائی۔ عدی کی شکست کا محمد بن مروان کو بڑا صدمہ ہوا لہٰذا اس نے خالد بن جزر کو مقابلہ کے لیے بھیجا۔ آمد میں اس کا صالح اور شبیب سے مقابلہ

Marfat.com

ہوا۔ بڑے زور کے رن کے بعد صالح اور شبیب دسکرہ کی طرف نکل گئے۔ حجاج کو جب ان حالات کا پتہ چلا تو اس نے حارث بن عمیرہ کو کئی ہزار فوج دے کر روانہ کیا۔ اس نے صالح کو قتل کر دیا اور شبیب نے ایک قلعہ میں پناہ لی۔ شام ہو چکی تھی اس لیے حارث قلعہ کے پھاٹک پر آگ کا ایک بڑا سا الاؤ لگا کر لشکر گاہ میں چلا آیا کہ صبح محصورین کو گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن خارجی بڑے جانباز تھے۔ وہ حسن تدبیر سے آگ سے بچ کر نکل آئے اور حارث کی فوج پر یک بارگی اور اچانک حملہ کر دیا۔ حارث سخت زخمی ہوا اور اس کے کل سامان پر شبیب نے قبضہ کر لیا۔ گویا معاملہ الٹ ہو گیا۔ حارث کو شکست دینے کے بعد شبیب نے عام تاخت و تاراج شروع کر دی۔ حجاج کو جب اس شکست کا پتہ چلا تو اس نے سفیان بن ابی العالیہ کو بھیجا۔ شبیب کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور اس کے ساتھ بڑے جانباز اور جرأت مند تھے لہٰذا شبیب نے اسے بھی شکست دی۔ اس کے بعد سورہ بن ابجر آیا۔ اس نے بھی بری شکست کھائی۔ ان لگا تار اور پیہم شکستوں کو دیکھ کر حجاج نے جنرل بن سعید کندی کو چار ہزار منتخب بہادروں کے ساتھ بھیجا۔ دونوں نے مل کر شبیب کا تعاقب کیا۔ مقام قطیطیا میں دونوں کا مقابلہ ہوا جس میں سعید قتل ہو گیا جنرل سخت زخمی ہو کر کوفہ لوٹ آیا۔ ان پیہم کامیابیوں نے شبیب کے حوصلہ کو بہت بڑھا دیا لہٰذا اب اس نے عراق کے پایۂ تخت کوفہ پر حملہ اور قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ حجاج نے سوید بن عبدالرحمٰن اور عثمان بن قطن کو دو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ دو سمتوں سے شبیب کو روکنے کے لیے بھیجا۔ شبیب کوفہ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا سوید اور عثمان سے سامنا ہو گیا۔ شبیب بہادری سے لڑتا ہوا حیرہ کی طرف نکل گیا۔ پھر کچھ دور آگے جا کر چکر کاٹتا ہوا کوفہ لوٹ آیا اور بڑی جرأت و بہادری سے کوفہ میں گھس کر بہت سے آدمیوں کو قتل کر کے تیزی سے باہر نکل آیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ شبیب جب کوفہ میں داخل ہوا تو وہ بے باکانہ قصر امارت کی طرف بڑھا اور اپنے گرز سے قصر کے دروازے پر ضربیں لگائیں۔ پھر جامع مسجد پہنچا اور وہاں کچھ لوگوں کو قتل کیا پھر شہر کے مختلف حصوں میں قتل و غارت کرتا ہوا کوفہ سے باہر نکل گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ شبیب کے ہمراہ صرف ایک ہزار آدمی تھے۔ ایک مرتبہ وہ انھیں ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ کوفہ میں مقیم رہ کر چلا گیا۔ انھیں ایک ہزار کے مقابلہ میں حجاج نے پچاس ہزار کوفیوں کی فوج بھیجی اور خارجیوں نے ان پچاس ہزار کو شکست دے کر بھگا دیا۔

اب حجاج نے زائدہ بن قدامہ اور اس کے ساتھ متعدد بہادر افسر و کو دس ہزار پیدل فوج اور زحر بن قیس کو سوار دستے کے ساتھ شبیب کے تعاقب میں بھیجا۔ پیدل سپاہ تو پیچھے رہ گئے۔ زحر بن قیس نے تعاقب کیا۔ کچھ دور جا کر شبیب نے پلٹ کر حملہ کیا اور زحر بن قیس کو شکست دی۔ زحر کو شکست دینے کے بعد شبیب پیدل فوج کے مقابلہ کے لیے جو زائد کی ماتحتی میں پیچھے آ رہی تھی، بڑھا۔ کوفہ کے قریب مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں عام فوج کے علاوہ عراقی فوج کے کئی افسر قتل ہوئے۔ خارجیوں کو کافی نقصان پہنچا، اس لیے وہ مقابلہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل گئے۔ حجاج کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے ایک تجربہ کار افسر عبدالرحمٰن بن اشعث کو چھ ہزار

Marfat.com

منتخب بہادروں کے ساتھ بھیجا اور سخت تاکید کی کہ خارجی جہاں کہیں بھی ملیں ان کا تعاقب کر کے ان کا استیصال کیا جائے، اور جو شخص شکست کھا کر واپس آئے اس کو قتل کر دیا جائے گا۔

شبیب کی ان کامیابیوں سے متاثر ہو کر بہت سے شورش پسند عوام بھی اس سے مل گئے اس کی بڑھتی ہوئی قوت اور عراقی فوجوں کی بے بسی سے عراق میں حالات بہت خطرناک اور تشویش ناک ہو گئے۔ اس وقت حجاج نے اہل کوفہ کو اکٹھا کر کے انھیں غیرت دلائی کہ اگر تم لوگ دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اپنے ملک کی حفاظت سے معذور ہو تو میں تم سے زیادہ بہادر لوگوں کو یہ کام سپرد کرتا ہوں۔'' یہ طعنہ سن کر ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں کہ ہم خود لڑیں گے اور ہر طرح امیر کی مدد کریں گے۔ اسی دوران بابل مہروز کے ایک زمیندار نے حجاج کو شبیب کی نقل و حرکت کی اطلاع دی۔ حجاج نے فوراً اہل کوفہ کو جمع کر کے ایک تقریر کی اور کہا:

''اے اہل کوفہ! تم لوگ اپنے مال و دولت کی حفاظت اور ملک کی مدافعت کی خاطر لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، ورنہ یہ کام ایک ایسی قوم کے سپرد کر دوں گا جو تم سے زیادہ صبر آزما اور اطاعت گزار ہو گی۔ وہ تمھارے دشمن سے مقابلہ کرے گی اور تمھارے حصے کا مال غنیمت بھی حاصل کرے گی۔''

حجاج کی اس تقریر سے اہل کوفہ میں ایک جوش پھیل گیا اور عراقیوں کی ایک بہت تعداد نے شبیب سے جنگ کرنے کے لیے اپنے نام پیش کیے لیکن حجاج نے عراقیوں پر بھروسہ نہ کیا اور عبدالملک کو تمام حالات سے مطلع کر کے فوج کی مدد طلب کی۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک کہن سال اور تجربہ کار بہادر زہرہ بن حویہ نے حجاج کو مشورہ دیا کہ اس مہم کے لیے جانباز اور سرفروش بہادروں کو منتخب کیجیے جو میدان جنگ سے منہ موڑنا نہ جانتے ہوں اور انھیں ایسے آزمودہ کار بہادر افسر کی ماتحتی میں بھیجیے جو صبر و ثبات کو عزو شرف سمجھتا ہو۔ حجاج نے کہا: ''میری نظر میں تمھی اس کے لیے زیادہ موزوں ہو۔'' زہرہ نے کہا: ''میں اس کام کے لیے معذور ہوں کیونکہ میری بصارت جواب دے چکی ہے۔ ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں رہے۔ اس کے لیے ایسا شخص ہونا چاہیے جو تلوار اور نیزہ دونوں چلا سکے۔ البتہ میں ایک مشیر کی حیثیت سے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ حجاج نے اس بات کو منظور کر لیا۔

اس کے ساتھ ہی حجاج نے عبدالملک کو علیحدہ لکھا کہ شبیب کی نظر اب کوفہ پر ہے اور عراقی فوج پیہم اور مسلسل شکستوں سے ہمت ہار چکی ہے، اس لیے شام سے فوج بھیجیں۔ حجاج کے اس خط پر عبدالملک نے سفیان بن ابرد کلبی اور حبیب بن عبدالرحمٰن حکمی کو چھ ہزار منتخب شامی فوج کے ساتھ بھیجا ہے۔ حجاج نے یہ فوج خاص کوفہ کی حفاظت کے لیے منگوائی تھی۔ ابھی شامی فوج راستہ ہی میں تھی کہ حجاج نے پچاس ہزار عراقیوں کا لشکر عظیم عتاب بن ورقاء کی زیر قیادت شبیب کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ حجاج نے اس فوج کو رخصت کرتے وقت کہا:

''اگر تم لوگوں نے پہلے کی طرح بزدلی کا مظاہرہ کیا تو تمھیں ظالم حاکموں کے حوالے کر دوں گا اور لشکر گراں سے پیس ڈالوں گا۔''

ساماپا کے قریب شبیب اور عتاب کی فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ عراقی بہادری کے ساتھ لڑے لیکن خوارج

Marfat.com

کی جانبازی نے پچاس ہزار عراقیوں کو شکست دے دی۔ عتاب بن ورقاء اور اس کا دوسرا سردار ساتھی زہرہ بن حویہ میدان جنگ میں قتل ہوئے۔ ایک ہزار اور پچاس ہزار کا مقابلہ تھا۔ اتنے فرق کے باوجود خوارج نے عراقی فوج کو بری طرح شکست دی۔ اس شکست فاش نے حجاج کو بہت برہم کیا۔

اس دوران میں حجاج کے پاس شامی افواج پہنچ چکی تھیں اور وہ عراقیوں کی امداد سے مستغنی ہو گیا تھا۔ اس نے اہل کوفہ کو اکٹھا کر کے ایک تقریر کی اور کہا:

''اے اہل کوفہ! جو شخص تمھارے ذریعے غلبہ حاصل کرنا چاہے، اللہ کرے وہ کبھی غالب نہ ہو، اور جو تمھاری مدد سے کامیابی حاصل کرنا چاہے، اللہ کرے وہ کبھی کامیاب نہ ہو۔ تم ہمارے سامنے سے دفع ہو جاؤ اور کسی لڑائی میں ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا۔ جاؤ، حیرہ میں جا کر یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بودوباش اختیار کرو۔''

شبیب ساباما سے سور آیا اور وہاں سے مقام اعین میں آ کر مقیم ہو گیا۔ حجاج نے حارث بن معاویہ ثقفی کو ایک ہزار فوجیوں کے ساتھ جو عتاب کے لشکر میں شامل نہ تھے، اسے روکنے کے لیے روانہ کیا۔ شبیب نے حارث کو قتل کر دیا اور کوفہ کے کنارے آ کر مقیم ہو گیا۔ اس مرتبہ حجاج خود شامی افواج کو اپنے ساتھ لے کر کوفہ سے نکلا۔ جب دونوں فوجیں صف آرا ہو چکیں تو حجاج نے شامیوں کا دل بڑھانے کے لیے ایک پر جوش تقریر کی اور کہا:

''اے اہل شام! تم مطیع و فرمان بردار اور بہادر و جانثار لوگ ہو۔ دیکھو، ان ناپاک دشمنوں کا باطل تمھارے حق کو مغلوب نہ کر دے۔ اپنی آنکھیں بند کر لو، گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ اور اپنے نیزوں کی انیاں دشمنوں کی طرف بڑھا دو۔''

آخر کار دونوں فوجوں میں مقابلہ شروع ہوا۔ شامی پتھریلی زمین کے سنگ ریزوں کی طرح زمین سے چمٹ گئے اور خارجیوں کو اپنے نیزوں پر لے لیا۔ خارجی بھی اپنی روایتی بہادری کے ساتھ لڑے۔ سارا دن ایک ہولناک جنگ جاری رہی اور فریقین ایک دوسرے کی بہادری کا لوہا مان گئے۔ آخر خالد بن عتاب نے شبیب پر عقب سے حملہ کیا اور اس کے بھائی مصاد اور اس کی بیوی غزار کو قتل کر دیا اور اس کے خیمہ کو آگ لگا دی۔ شبیب نے جب یہ حالت دیکھی تو اپنے ساتھیوں کو لے کر پیچھے ہٹ آیا۔ حجاج نے مقابلہ بند کر دیا اور شبیب کو نکل جانے کا موقع دے دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شبیب نے شکست کا منہ دیکھا۔ حجاج نے کہا: ''اللہ کی قسم! آج سے پہلے کبھی شبیب کا مقابلہ ہی نہیں کیا گیا۔''

شبیب پہلے انبار گیا۔ پھر دریائے دجلہ کو عبور کر کے اہواز پہنچا۔ پھر فارس سے ہوتا ہوا کرمان آیا اور ستانے کے ارادہ سے مقیم ہو گیا۔ شبیب جہاں کہیں بھی پہنچا شامی فوجیں اس کے تعاقب میں وہاں پہنچیں اور فریقین میں ہولناک معرکے ہوئے۔ شبیب آرام سے فارغ ہو کر کرمان سے لوٹا تو اہواز میں دریائے دجیل

Marfat.com

کے پل پر سفیان بن ابرو سے اس کی آخری معرکہ آرائی ہوئی۔

لڑائی میں شبیب کا بھائی مصاد اور اس کی بیوی غزار اگرچہ کام آئی۔ خیمہ جل گیا لیکن شبیب کے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی شجاعت اور بہادری سے ہر محاذ پر لڑتا، لیکن آخر میں شامی فوج کے پیہم حملوں کی تاب نہ لا سکے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ شبیب تو بھاگ گیا اور حجاج نے اعلان عام کر دیا کہ جو شخص شبیب کا ساتھ چھوڑ کر چلا جائے گا وہ مامون ہے۔ حجاج کے اس اعلان پر وہ عوام جو محض شبیب کی بہادری اور شجاعت کے باعث اس کے ساتھی بن گئے تھے، فوری طور پر منتشر ہو گئے اور شبیب کی قوت کمزور ہو گئی، اور اب حجاج کے لیے اس کو زیر کرنا آسان ہو گیا۔

شبیب اب پیہم لڑائیوں سے تھک کر چور ہو چکا تھا۔ وہ کچھ عرصہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ کرمان میں ستانے کے لیے مقیم ہوا لیکن یہاں بھی شامی فوجوں نے اس کا تعاقب کیا۔ فریقین میں یہاں بھی ہولناک جنگ ہوئی۔ شبیب جب کرمان سے لوٹا تو اہواز میں دجیل کے پل پر سفیان بن ابرو سے اس کی آخری جنگ ہوئی۔ دریا کے ایک کنارے پر سفیان شامی فوجوں کو لیے پڑا تھا اور دوسرے کنارے پر شبیب۔ شبیب اپنی عادت کے مطابق دریا کو عبور کر کے حریف پر حملہ آور ہوا۔ دونوں فوجیں بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے سارا دن لڑتی رہیں اور شام ہوتے ہی خارجیوں نے شامیوں پر تلواروں اور نیزوں سے زبردست حملہ کیا اور انھیں چور چور کر دیا۔ سفیان نے شامیوں کے قدم ڈگمگاتے دیکھے تو انھیں تیر اندازی کا حکم دیا۔ خوارج نے پوری طاقت سے شامیوں سے حملہ کر دیا اور ان کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا۔ شبیب چاہتا تھا کہ سفیان پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دے، لیکن تاریکی اس قدر چھا گئی تھی کہ ایک دوسرے کی صورت نظر نہ آتی تھی، اس لیے شبیب نے لڑائی کو ختم کر دیا اور رات گزارنے کے لیے اپنی قیام گاہ کو واپس ہوا۔ شبیب دریا کا پل عبور کر رہا تھا کہ ایک گھوڑی کو دیکھ کر اس کا گھوڑا ابدکا اور وہ دریا میں غرق ہو گیا۔ گرتے وقت شبیب نے کہا: "لیقضی الله امراً کان مفعولاً" اور جب وہ غوطہ کھا کر ابھرا تو اس کی زبان سے نکلا "ذالك تقدير العزيز العليم" اس طرح اس بہادر خارجی کی شمع حیات دریائے دجیل کے پانی کی لہروں میں گل ہو گئی۔ اس طرح اس جانباز بہادر کا جس نے مٹھی بھر جماعت کے ساتھ بنو امیہ کی فوج کے جم غفیر کو ایسا زچ کیا تھا کہ وہ اس کے نام سے ڈرتی تھی، خاتمہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ۷۷ھ کا ہے۔ دریا سے اس کی لاش نکلوا کر اس کا دل دیکھا گیا تو وہ غیر معمولی جسامت کا اور نہایت سخت تھا۔

ازارقہ کا استیصال:

شبیب اور اس کے ساتھیوں کا تو کافی حد تک خاتمہ ہو گیا، لہٰذا حجاج کو اس جماعت کی طرف سے بڑی حد تک اطمینان ہو گیا، لیکن کرمان میں خوارج کی ایک اور جماعت جو نافع بن ارزق کی نسبت سے ازارقہ کہلاتی تھی، بڑا زور تھا۔ مہلب اٹھارہ ماہ سے ان کے مقابلہ میں تھے لیکن شبیب کی طرح ان کا زور نہیں ٹوٹتا تھا۔ اہل

Marfat.com

کوفہ اور اہل بصرہ جب مہلب اور ابن مخنف کے پاس دوبارہ پہنچے تو اس وقت کرمان پر خوارج کا قبضہ تھا جب فارس مصعب کے ہاتھ میں تھا۔ خوارج کے لیے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ فارس سے انھیں رسد وغیرہ کی کوئی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ خوارج کرمان آکر مقیم ہو گئے گویا یہ خوارج کا ایک گڑھ ہو گیا۔ مہلب اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا برابر تعاقب کر رہا تھا اور کرمان کے نزدیک ایک شہر جیرفت میں آکر قیام کیا۔ یہاں خوارج سے کئی بار لڑائی ہوئی۔ آخر تمام فارس پر مہلب کا قبضہ ہو گیا۔ حجاج نے یہاں اموی حکام کا تقرر کیا اور دارابجرد اور اصطخر کی آمدن خوارج سے جنگ کے لیے وقف کر دی۔

خوارج سے معرکہ آرائی کا سلسلہ کچھ زیادہ طویل ہو گیا تھا۔ حجاج بن یوسف نے براء بن قبیصہ کو مہلب کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ خوارج کا سخت مقابلہ ہونا چاہیے اور اس سلسلہ میں کوئی عذر قبول نہ کیا جائے۔ جونہی حجاج کا پیغام پہنچا مہلب نے تمام لشکر کو صف آرائی کا حکم دیا۔ مہلب کے سب بیٹے اپنے اپنے دستوں کو لے کر میدان جنگ کی طرف بڑھے اور فوجیں فوجوں سے بھڑیں اور ہتھیار ہتھیاروں سے ٹکرائے اور ایک ہولناک جنگ کا آغاز ہوا جو دوپہر تک جاری رہی۔ دوپہر سے عصر تک فریقین نے آرام کے لیے جنگ روک دی۔ عصر کے بعد میدان جنگ پھر گرم ہو گیا اور دونوں طرف خوف ناک طریقے سے ایک دوسرے پر حملے شروع ہو گئے یہاں تک کہ رات کی تاریکی دونوں فوجوں کے درمیان حائل ہو گئی۔

براء بن قبیصہ جو حجاج کا پیغام لے کر گیا تھا، وہ ایک ٹیلے پر بیٹھا جنگ کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مہلب سے کہا کہ میں تمھارے بیٹوں سے زیادہ جنگ جو اور تمھارے سپاہیوں سے زیادہ جری اور بہادر کسی کو نہیں دیکھا، اور تمھارے حریفوں سے زیادہ ثابت قدم اور جری کسی کو نہیں پایا۔ خدا کی قسم! تمھاری طرف سے خارجیوں کے استیصال میں کوئی کوتاہی نہیں ہو رہی۔ مہلب براء بن قبیصہ کے ان تاثرات سے خوش ہو گیا اور براء کو انعام واکرام دے کر رخصت کیا۔ براء نے واپس آکر حجاج کے سامنے اپنی چشم دید شہادت بیان کر دی۔ اس کے بعد مہلب اٹھارہ ماہ مسلسل خوارج سے لڑتا رہا اور خارجی تھے کہ ان کا زور کسی طرح نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ جس شبیب کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی تھی اسی طرح یہاں بھی خوارج کے لشکر میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے مسلمانوں کی بہت مدد کی۔

ہوا یہ کہ قطری کی فوج کے ایک افسر مقعطر ضبی نے ایک دوسرے خارجی کو قتل کر دیا۔ یہ دوسرا خارجی بھی اپنی جماعت کا ایک معزز اور بڑا آدمی تھا۔ مقتول کے حامیوں نے قطری سے مقعطر کو قصاص میں قتل کرنے کا مطالبہ کیا۔ قطری نے کہا کہ قاتل سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے۔ وہ عالم اور دین دار آدمی ہے میں اسے کسی صورت قتل نہیں کروں گا۔ اس بات نے طول کھینچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خارجیوں کے ایک بڑے گروہ نے قطری کی بیعت توڑ کر عبدربہ الکبیر کو اپنا سردار بنا لیا۔ اس طرح قطری اور عبدربہ الکبیر کے حامیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور خوارج آپس ہی میں ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ اس صورت حال کے پیش نظر حجاج کی رائے یہ تھی کہ

Marfat.com

اس وقت ان پر حملہ کر دیا جائے لیکن مہلب کی رائے یہ تھی کہ جب تک یہ خود ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے ہیں ہمیں اپنی قوت ضائع نہیں کرنی چاہیے۔ خوارج پورے ایک ماہ آپس میں گتھے رہے۔ آخر قطری اپنے ساتھیوں کو لے کر طبرستان کی طرف چلا گیا اور کرمان پر عبدربہ الکبیر قابض ہو گیا۔

مہلب نے اب عبدربہ الکبیر پر فوج کشی کی اور انھیں جیرفت میں محصور کر دیا۔ کچھ دنوں تک تو وہ محصور ہونے کے باوجود بڑی بہادری سے مقابلہ کرتا رہا، لیکن جیرفت میں وہ کھل کر لڑ نہ سکتا تھا۔ خوارج نے بھاگنے کا ارادہ کیا مہلب نے انھیں راستہ دے دیا لیکن کچھ دور جا کر انھیں پھر گھیر لیا۔ خوارج نے یہاں اس بہادری سے مقابلہ کیا کہ مہلب جیسے تجربہ کار جرنیل کے بھی چھکے چھوٹ گئے۔ بڑی ہولناک جنگ ہوئی، لیکن مہلب جان پر کھیل کر ثابت قدم رہا۔ آخر کار ایک پرزور اور خوفناک معرکہ کے بعد عبدربہ الکبیر مارا گیا۔ اس کی فوج کے بہت کم آدمی زندہ بچے۔ مہلب کو بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا۔ خوارج کی عورتیں باندیاں بنا لی گئیں کیونکہ خوارج بھی عام مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے تھے۔

عبدربہ الکبیر کی شکست کے بعد حجاج نے سفیان بن ابرو کو شامی فوج کے ساتھ قطری کے مقابلہ کے لیے طبرستان بھیجا کیونکہ وہ طبرستان میں اپنی قوت جمع کر رہا تھا۔ کوفہ کی فوج کو اس کی مدد پر مامور کیا۔ طبرستان کی ایک پہاڑی میں سفیان اور قطری کا زبردست مقابلہ ہوا جس میں عین اس وقت قطری کے بہت سے آدمیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ قطری نے جب اپنی قوت کمزور ہوتے دیکھی تو اس نے بھاگنا چاہا لیکن اب اس کا آخری وقت آ چکا تھا۔ وہ گھوڑے سے گر کر سخت زخمی ہوا۔ اتفاق سے اس طرف ایک گبر کا گزر ہوا۔ قطری نے اس سے پانی مانگا۔ قطری کا لباس اور ساز و سامان بہت قیمتی تھا۔ گبر نے اس کی طمع میں اس کو مار ڈالنا چاہا۔ اس نے شور مچا دیا۔ شور سن کر شامی سپاہی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے قطری کو پہچان لیا اور اسے قتل کر دیا۔ قطری کے قتل کے بعد اس کا ایک ساتھی عبیدہ بن بلال اپنی مختصر جماعت کے ساتھ اٹھا، لیکن اس کے پاس چونکہ کوئی قوت نہ تھی، اس لیے سفیان نے اس کو نہایت آسانی کے ساتھ ختم کر دیا۔ عبیدہ مارا گیا اس کے قتل کے بعد خوارج کی قوت قریباً بالکل ختم ہو گئی اور ان کے خطرات سے کئی سالوں کے بعد خلافت کو نجات مل گئی۔ یہ لوگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ ہی مسلمانوں کا قتل عام کر رہے اور حکومت کے لیے دردسر بنے ہوئے تھے۔ قطری کے قتل کا واقعہ سنہ ۷۷ھ کا ہے۔ قطری کے قتل سے اور خوارج کے فرقہ ازراقیہ کی سرگرمیاں جو گزشتہ بیس سال سے ملک کے امن و امان کو برباد اور ملت اسلامیہ کو عروج اور ترقی کی شاہراہ سے روکے ہوئے تھیں، ختم ہو گئیں۔

حجاج اور مہلب کی عزت افزائی:

خوراج کے خلاف اس عظیم فتح کی خبر مہلب نے ایک قاصد کے ذریعہ حجاج بن یوسف کو بھیجی۔ حجاج نے قاصد سے مہلب کے بیٹوں کے اوصاف پوچھے۔ اس نے نہایت بلیغ انداز میں ہر ایک کی خصوصیات بیان

Marfat.com

کیں۔ حجاج نے پوچھا: ان میں سے سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟ قاصد نے جواب دیا کہ "یہ سب ایک چوڑی زرہ کی مانند ہیں جن کا کنارہ نہیں ملتا۔ حجاج نے مہلب کو لکھا کہ جن لوگوں نے میدان جنگ میں اعلیٰ اور عمدہ خدمات انجام دیں ان کو ان کی خدمات کا صلہ دو۔ جو لوگ ان خدمات میں ممتاز رہے، ان کو انعام واکرام سے سرفراز کرو۔ جسے اہل اور لائق سمجھو اسے کرمان کا حاکم اور فوج کا سپہ سالار مقرر کر دو اور خود مجھے کوفہ آ کر ملو۔ مہلب نے اپنے بیٹے یزید کو کرمان کا حاکم مقرر فرمایا اور خود کوفہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مہلب جب کوفہ پہنچا تو حجاج بن یوسف نے اس کی بڑی عزت و تکریم کی۔ دربار منعقد کر کے اس کو اپنے برابر تخت پر بٹھایا۔ مہلب کی بہت تعریف و تحسین کی اور اہل مجلس سے کہا:

"اے اہل عراق! مہلب تمہارا آقا ہے اور تم اس کے غلام ہو۔"

پھر لقیط کا مشہور قصیدہ پڑھا جس کے پہلے شعر کا ترجمہ یہ ہے

"خدا تمہارا بھلا کرے انھوں نے تمہارا سردار اس شخص کو بنایا ہے جو بہادر اور جنگی فنون کا ماہر ہے۔"

پھر کہا: "اے مہلب! تمھارے اوصاف اس قصیدہ کے مضمون کے مطابق ہیں۔"

یہ تو وہ عزت و تکریم تھی جو حجاج بن یوسف نے مہلب بن ابی صفرہ کی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ عبدالملک بن مروان کے لیے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے زیادہ خطرناک خوارج کا فتنہ تھا۔ اگر عبدالملک خوارج کی طرف سے چند روز اور توجہ نہ دیتا اور ان کے استیصال کے لیے مختلف تدابیر اختیار نہ کرتا تو پھر یقیناً خراسان، فارس اور عراق وغیرہ صوبے اس کے قبضہ سے نکل گئے ہوتے۔ یہ فتنہ سب سے زیادہ خطرناک تھے کیونکہ اس کے ماننے والے بڑے جانباز، جری اور بہادر تھے۔ چنانچہ شبیب کے ایک ہزار جوانوں نے کوفہ کے پچاس ہزار فوجیوں کو شکست فاش دے دی۔ اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے عبدالملک نے حجاج کو جو منتخب کیا، وہ نہایت موزوں اور درست انتخاب تھا۔ کیونکہ عراقی کسی گورنر کے زیر نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے ہر حکومت کے ساتھ غداری کی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے لے کر مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ تک انہی کی دھوکہ دہی اور غداری و بے وفائی کے شکار ہوئے۔ اسی وجہ سے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ ہمیشہ کے لیے کوفہ کو چھوڑ دیا، اور پھر انھیں کوفیوں نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے غداری اور بے وفائی کر کے ان کو ان کے خانوادہ اور ساتھیوں سمیت میدان کربلا میں شہید کر دیا۔ حجاج کی جب عراق میں گورنر کی حیثیت سے تعیناتی ہوئی تو اس نے عراق میں اپنے فرائض کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ خوارج کی سرکوبی کے لیے مہلب بن ابی صفرہ کا انتخاب بھی نہایت موزوں اور درست انتخاب تھا۔ اب جب کہ کئی برس کی کوششوں کے بعد خوارج کی طرف سے اطمینان حاصل ہوا تو عبدالملک نے کوفہ اور بصرہ یعنی عراق کے سوا خراسان اور سجستان بھی براہِ راست حجاج کی حکومت و انتظام میں دے دیا۔ اس طرح حجاج کو تمام مشرقی ممالک اسلامیہ کا منتظم اور حاکم بنا دیا۔ حجاج نے اسی سال مہلب بن ابی صفرہ کو خراسان کا حاکم اور عبیداللہ بن ابی بکرہ کو سجستان کا امیر مقرر کر دیا۔ مہلب اب تک ایک مشہور سپہ سالار تھے لیکن اب وہ امیر خراسان بھی ہو گئے۔

Marfat.com

مہلب سنہ ۸۰ھ تک خود بصرہ ہی میں مقیم رہا اور اپنی طرف سے اپنے بیٹے حبیب کو خراسان کا امیر بنا کر بھیجا۔ حبیب نے باپ کی ہدایات کے مطابق خراسان میں جا کر امیہ بن عبداللہ اور اس کے اہل کاروں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ نہ ہی ان کی تعظیم و تکریم میں کسی قسم کا کوئی فرق آنے دیا۔ مہلب کی بیٹی ہند سے حجاج نے شادی کر لی۔ اس طرح مہلب اور حجاج کے مابین رشتہ داری کا تعلق بھی قائم ہو گیا۔

سنہ ۸۰ھ میں مہلب نے خود خراسان میں آ کر ملک کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پانچ ہزار کی ایک جمعیت لے کر ماوراء النہر کی طرف بڑھے اور مقام کش کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں بادشاہ ختن کے چچا زاد بھائی نے آ کر مدد کی درخواست کی۔ مہلب نے اپنے بیٹے یزید کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ یزید نے ختن کے بادشاہ کو قتل کیا اور ختن کا انتظام اس کے بھتیجے کے سپرد کر کے حسب منشاء عہد نامہ لکھوا کر واپس آیا۔ انھیں ایام میں مہلب نے اپنے بیٹے حبیب کو چار کی جمعیت دے کر بخارا پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ بخارا کے والی نے چالیس ہزار فوج سے حبیب کا مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ حبیب بہت سا مال غنیمت لے کر مہلب کی خدمت میں واپس آیا۔ کش کا محاصرہ دو برس تک جاری رہا۔ آخر کار اہل کش نے جزیہ دینا منظور کر لیا اور ایک صلح نامہ کر کے واپس آیا۔

مہلب جب خراسان کے دارالسلطنت مرو میں آ کر وہاں سے ماوراء النہر یعنی شہر کش کی طرف روانہ ہوا تو مغیرہ کو اپنا نائب مقرر کر گیا۔ ابھی کش کا محاصرہ جاری تھا کہ مہلب کے پاس مغیرہ کے انتقال کی خبر پہنچی۔ مہلب نے اپنے بیٹے یزید کو مرو کا حاکم مقرر کر کے تیس آدمیوں کے ساتھ مرو روانہ کیا۔ یزید جب بست کے ایک درے میں پہنچا تو وہاں پانچ سو ترکوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان ترکوں نے یزید سے وہ تمام مال و اسباب جو اس وقت اس کے پاس تھا لینا چاہا لیکن یزید نے انکار کیا۔ آخر یزید کے کسی ساتھی نے تھوڑا سا مال دے کر ان ترکوں کو راستہ چھوڑنے کے لیے رضا مند کر لیا۔ لیکن وہ ترک یہ مال لے کر کچھ دور چلے گئے اور پھر لوٹ کر پورے مال و اسباب کا مطالبہ کرنے لگے۔ یزید کسی صورت ان کو مال و اسباب دینے کے لیے راضی نہ تھا چنانچہ اس نے تیس آدمیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ ان کا سردار مارا گیا اور باقی سب بھاگ گئے۔ مرو پہنچ کر یزید اپنے بھائی مغیرہ کی جگہ حکومت کرنے لگا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد مہلب بھی اہل کش سے صلح کر کے واپس لوٹا۔ اس صلح نامہ میں یہ بات بھی تھی کہ اہل کش اپنے بادشاہ کے لڑکوں کو مسلمانوں کے پاس بطور ضمانت رکھیں گے اور یہ لڑکے اس وقت تک مسلمانوں کے پاس رہیں گے جب تک اہل کش جزیہ کی پوری رقم مسلمانوں کو ادا نہ کر دیں۔ مہلب اپنی طرف سے حریث بن قطنہ کو وہاں زر جزیہ وصول کرنے اور لڑکوں کو واپس دینے کی غرض سے چھوڑ آیا تھا۔ مہلب جب کش سے روانہ ہوا تو اس نے حریث کو ایک قاصد کے ذریعہ اطلاع دی کہ تم زر جزیہ لے کر لڑکوں کو اس وقت تک ان کے سپرد نہ کرنا جب تک تم بلخ نہ پہنچ جاؤ۔ اس سے مہلب کا مقصد یہ تھا کہ راستہ میں جو مصیبت یزید کو پیش آئی تھی وہ حریث کو پیش نہ آئی۔ حریث نے یہ خط اہل کش کو دکھا دیا اور کہا کہ اگر تم فوراً زر جزیہ مجھ کو دے دو تو میں تمھارے لڑکوں کو یہیں تمھارے سپرد کر دوں گا اور امیر مہلب سے کہہ دوں گا

Marfat.com

کہ آپ کا خط پہنچنے سے قبل میں لڑکوں کو واپس دے چکا تھا۔ چنانچہ اہل کش نے فوراً زر جزیہ ادا کر دیا اور بادشاہ کے لڑکے واپس لے لیے۔

حریث جب واپس لوٹا تو ترکوں نے حریث کے ساتھ بھی وہی کچھ کیا جو یزید کے ساتھ کیا تھا اور مہلب کو اسی کا خطرہ تھا۔ چنانچہ ترکوں اور حریث کے مابین لڑائی جس میں حریث کے بہت سے ساتھی کام آئے۔ بہت سے ساتھیوں کو ترکوں نے گرفتار کر لیا اور پھر ان گرفتار شدگان کو زرِ فدیہ لے کر واپس کیا۔ جب مہلب کے پاس حریث پہنچا تو اس نے اپنے حکم کی خلاف ورزی کی سزا میں بیس کوڑے لگوائے۔ اس سزا کے بعد حریث نے لوگوں کے سامنے مہلب کو مار ڈالنے کی قسم کھائی۔ مہلب کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے حریث کے بھائی ثابت بن قطنہ کو بلا کر نرمی سے سمجھایا اور حریث کو اپنے سامنے بلوایا۔ حریث نے مہلب کے سامنے بھی اپنی اس قسم کا اعادہ کیا۔ مہلب نے چشم پوشی کی راہ سے رخصت کر دیا۔ حریث اور ثابت اب اپنے دل میں خوف زدہ ہو گئے اور اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر وہاں سے بھاگ گئے اور سیدھے موسیٰ بن عبداللہ بن حازم کے پاس ترمذ پہنچے۔ موسیٰ نے اپنی ایک الگ خود مختار حکومت قائم کر لی ہوئی تھی اور وہ خراسان کے امیروں سے برسرِ پرخاش رہتا تھا۔ یہ واقعہ سنہ ۸۲ھ کا ہے۔

مہلب کی وفات:

مہلب کو اپنے بیٹے مغیرہ کی وفات کا بہت صدمہ تھا۔ مرو میں واپس آ کر وہ کئی روز تک پریشان رہا اور پھر زیادہ دیر زندہ نہیں رہا۔ سنہ ۸۲ھ کے آخری دنوں میں وہ کچھ عرصہ بیمار رہا پھر مرو ہی میں وفات پائی۔ مہلب کی شجاعت و بہادری، نیک طینتی اور وفاداری خاص طور پر مشہور ہے۔ مہلب کے کیریکٹر اور چال چلن میں بدعہدی، بے وفائی اور غدر و بغاوت کے مطلق جراثیم نہیں تھے۔ اس نے ہمیشہ خلیفہ وقت کی اطاعت و تابعداری اور اس کے ہر ایک حکم کی تعمیل کو اپنے لیے ضروری سمجھا۔ مرتے وقت اس نے اپنے بیٹے یزید کو خراسان کا امیر اور دوسرے بیٹے حبیب کو نمازوں کا امام مقرر کیا اور تمام بیٹوں کو جمع کر کے انھیں وصیت کی کہ

”اے بیٹو! میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے اور صلہ رحمی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ اس سے عمر کی درازی، مال کی زیادتی اور نفوس کی کثرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف اور صلہ رحمی کے ترک سے میں تم لوگوں کو سختی سے منع کرتا ہوں کیونکہ ان کا ترک دوزخ میں جانے کا باعث ہوتا ہے، ذلت حاصل ہوتی ہے، نفوس کی کمی ہو جاتی ہے۔ تم پر امراء کی اطاعت اور مسلمانوں کی جماعت سے اتفاق واتحاد کرنا نہایت ضروری ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تمھارے اعمال تمھارے اقوال سے بہتر ہوں۔ کسی بات کا جلد جواب دینے سے اجتناب کرو اور زبان کو لغزش سے بچاؤ، کیونکہ آدمی پاؤں کی لغزش سے تو سنبھل جاتا لیکن زبان کی لغزش سے مارا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے تم پر حقوق ہوں ان کو بہر صورت

Marfat.com

ادا کرو کیونکہ لوگوں کے حقوق ادا کرنا صبح و شام بیٹھ کر باتیں بنانا اور فضول بکنے سے بہت بہتر ہے۔ خوشامدیوں کی خوشامد میں ہرگز نہ آنا۔ سخاوت کو کنجوسی پر ترجیح دینا، نیکی کو زندہ رکھنا اور ہمیشہ نیک کام کرنے کی کوشش کرنا۔ لڑائی میں چوکس اور ہوشیار رہنے کا زیادہ خیال رکھنا کیونکہ یہ شجاعت سے زیادہ مفید ہے۔ جس وقت مقابلہ ہوتا ہے اس وقت آسمان سے قضا نازل ہوتی ہے۔ اگر آدمی نے ہمت باندھ لی اور نہایت ہوشیاری سے کام لیا تو کامیاب ہو گیا اور اگر اس پر بدحواسی چھا گئی تو ناکام رہا، لیکن سب پر حکم الٰہی غالب۔ قرأت قرآن، تعلیم سنن اور آداب صالحین اپنے اوپر فرض کر لو۔ اپنی مجلسوں میں زیادہ گفتگو سے اجتناب کرو۔"

مہلب بن ابی صفرہ کی یہ وصیتیں ہر نوجوان کے لیے زندگی کی کٹھن شاہراہ پر مشعل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔ مہلب کا انتقال ذیقعدہ سنہ ۸۲ھ میں ہوا۔ عبدالملک نے اس کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے یزید کو خراسان کا حاکم برقرار رکھا۔ یزید نے اپنے زمانہ حکومت میں قلعہ بادغیس کو فتح کیا۔ یہ قلعہ نہایت مضبوط اور مستحکم تھا۔ نیزک اس قلعہ پر حکمران تھا۔ وہ جب اس میں داخل ہوتا تو تعظیماً اس کے سامنے سجدہ کرتا تھا۔ یزید نے جب اس پر قبضہ کر لیا تو نیزک نے درخواست کی کہ اسے اپنے اہل و عیال کے ساتھ یہاں سے نکل جانے کا موقع دیا جائے۔ یزید نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔ اس قلعہ میں نہایت قیمتی خزانے اور سامان کے ذخیرے تھے۔ یہ سب مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

آل مہلب کا زوال:

مہلب کی اولاد بہادر بھی تھی اور جرأت مند بھی۔ داد و دہش اور سخاوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ لوگوں کو دے کر خوش ہوتے تھے۔ اسی سخاوت، داد و دہش اور جرأت و بہادری کے عظیم الشان کارناموں کے باعث ان کا اثر و اقتدار دن بدن بڑھ رہا تھا۔ حجاج اپنے سامنے کسی کو شان و شوکت اور اثر و اقتدار کو پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کو خطرے کی نظر سے دیکھا، لہٰذا اس نے عبدالملک سے کہا کہ یہ "خاندان زبیریہ" ہے، یزید کو خراسان جیسے ملک کی حکومت پر قبضہ جاری رکھنا خلاف مصلحت ہے۔ چنانچہ سنہ ۵۸ھ میں یزید کو خراسان کی امارت سے معزول کر دیا گیا اور اس کے بھائی مفضل کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا۔ یزید جب خراسان سے خوارزم کو فتح کرتا ہوا عراق لوٹا تو وہ جس شہر سے گزرتا تھا، وہاں اس کے اعزاز میں راستہ میں پھولوں کا فرش بچھایا جاتا تھا۔

ایک روایت یہ ہے کہ حجاج نے کئی مرتبہ یزید بن مہلب کو اپنے پاس کوفہ میں طلب کیا لیکن ہر مرتبہ خراسان میں ایسی مصروفیتیں یزید کے لیے موجود ہوتیں کہ وہ آنے کی معذرت کر دیتا اور کوفہ نہ آیا۔ حجاج نہایت شکی مزاج آدمی تھا۔ اس نے یزید کی نسبت بدگمانی کو اپنے دل میں جگہ دی اور اس کو خراسان کی گورنری سے بے دخل

Marfat.com

کرنے کے درپے ہوا۔ چنانچہ اس نے عبدالملک کو یزید کی شکایتیں لکھنی شروع کر دیں، عبدالملک نے ہر مرتبہ حجاج کو لکھا کہ مہلب اور اس کی اولاد ہمیشہ ہمارے خیر خواہ اور نمک حلال رہے ہیں۔ وہ ہر قسم کی رعایت کے مستحق ہیں لیکن حجاج بار بار اور باصرار شکایتیں لکھتا رہا۔ آخر عبدالملک نے مجبور ہو کر حجاج کو لکھا کہ تم کو چونکہ اپنی بات پر اصرار ہے لہٰذا میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ جس کو مناسب سمجھو خراسان کا حاکم مقرر کر دو۔ حجاج نے اس اندیشہ سے کہ خراسان کا مسئلہ پیچیدگی اختیار نہ کر لے اور اس پر دوسرے عامل کا قبضہ نہ ہو سکے، اول یہ حکم یزید کے پاس بھیجا کہ تم اپنے بھائی مفضل کو حکومت کا چارج سپرد کر کے میرے پاس آؤ۔ یزید ابھی سامان سفر درست ہی کر رہا تھا کہ حجاج کا دوسرا حکم آگیا جس میں مفضل کے نام خراسان کی گورنری کی سند تھی۔ یزید نے اپنے بھائی سے کہا کہ تم اس سند گورنری سے دھوکا نہ کھانا، حجاج نے صرف میری وجہ سے کہ کہیں خراسان کی حکومت کا چارج دینے سے انکار نہ کر دے، تم کو خراسان کا گورنر بنایا ہے۔ چنانچہ یزید کی یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی اور صرف نو ماہ کے بعد مفضل کو بھی خراسان کی گورنری سے معزول کر دیا گیا۔

مفضل نے اپنے مختصر زمانہ میں بادغیس پر فوج کشی کر کے اسے فتح کیا۔ پھر اس نے آخرون اور شومان پر حملہ کیا۔ یہاں مسلمانوں کو بہت سامال غنیمت ہاتھ آیا۔ مفضل بیت المال میں روپیہ جمع نہ کرتا تھا بلکہ جو کچھ ہاتھ لگتا اسے فوراً لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ حجاج نے جب یزید کو معزول کر کے اس کے بھائی مفضل کو اس کا جانشین منتخب کیا تو یزید نے مفضل کو کہہ دیا تھا کہ حجاج نے میری مخالفت کے ڈر سے تمھیں میرا جانشین بنایا ہے، لیکن تم اپنی اس تقرری کے فرمان کو نقش بر آب سمجھو۔ چنانچہ یزید کی یہ رائے بالکل درست نکلی۔ ابھی مفضل کو مسند حکومت پر فائز ہوئے صرف نو ماہ گزرے تھے کہ اس کی معزولی کا فرمان آگیا اور اس کی جگہ قتیبہ بن مسلم باہلی کو اس کا جانشین مقرر کر دیا گیا۔ یہ مستقبل کا ایک جلیل القدر فاتح ثابت ہوا۔

رتبیل کی بغاوت:

جس زمانہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے معرکہ آرائی ہو رہی تھی اس زمانے میں سیستان کا ایک ترک فرمان روا رتبیل نے بغاوت کر دی۔ رتبیل کے قبضہ میں بدخشاں، کافرستان اور افغانستان وغیرہ کا علاقہ تبت تک تھا سنہ ۷۹ھ میں امیہ بن عبداللہ والی خراسان نے اپنے لڑکے عبداللہ کو اس کی تادیب کے لیے بھیجا۔ عبداللہ جب بست پہنچا تو رتبیل اطاعت قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا اور بہت سا نقد و جنس پیش کر کے صلح پر آمادگی کا اظہار کیا لیکن عبداللہ نے منظور نہ کیا اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ رتبیل نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ عبداللہ کو راستہ آگے بڑھنے کے لیے دیتا گیا۔ یہ ناعاقبت اندیش اور انجام سے بے خبر آگے بڑھتے گئے اور واپسی کے راستوں کی حفاظت کا کوئی سامان نہ کیا۔ سیستان (سجستان) کا علاقہ پیچ در پیچ اور پہاڑی ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے واپس آنا مشکل ہوتا ہے۔ عبداللہ جب درمیان میں پہنچ گئے۔ اس وقت رتبیل نے ان کی ناکہ بندی کر کے انھیں ہر طرف سے محصور کر لیا۔

Marfat.com

اس وقت عبداللہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اب ہر طرف سے گھر چکے تھے۔ واپس آنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ انھوں نے آئندہ فوج کشی نہ کرنے کا تحریری وعدہ لے کر راستہ دے دیا اور عبداللہ جان بچا کر واپس ہوئے۔ عبدالملک کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے عبداللہ کی ناعاقبت اندیشی کے باعث اسے معزول کر دیا۔

کچھ دنوں تک تو رتبیل کا رویہ مسلمانوں سے درست رہا لیکن پھر اس نے سرکشی اور بغاوت شروع کر دی۔ اس لیے سنہ ۷۸ھ میں حجاج نے دوبارہ عبیداللہ بن بکرہ کو اس کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ وہ سنہ ۷۹ھ میں سیستان پہنچے اور رتبیل کے علاقہ میں گھس کر اس کے بہت سے قلعوں کو منہدم اور کئی مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اس کے خزانوں کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا لیکن عبیداللہ نے بھی وہی غلطی کی جو ان کے پیش رو عبداللہ بن امیہ نے کی تھی کہ بغیر واپسی کا سامان کیے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ رتبیل پسپا ہوتا ہوا جب دارالحکومت کے قریب پہنچا تو اس نے ترکوں کو حکم دیا کہ وہ پلٹ کر مسلمانوں کی واپسی کے راستوں کو بند کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بھی محصور ہو کر رہ گئے۔ آخر کار عبیداللہ کو سات لاکھ درہم تاوان دے کر اپنی جان چھڑانی پڑی۔ عبیداللہ کی فوج میں ایک پرجوش مجاہد شریح بن ہانی کو یہ شرم ناک بات پسند نہ آئی کہ ہم تاوان دے کر اپنے آپ کو دشمن سے چھڑائیں۔ لہٰذا انھوں نے عبیداللہ سے کہا کہ اگر تم نے یہ شرط منظور کر لی تو اس نواح میں اسلام اور مسلمان ہمیشہ کے لیے کمزور ہو جائیں گے۔ تم ایک مسلمان مجاہد ہو، تم موت سے جس کا آنا ایک نہ ایک دن یقینی امر ہے، بھاگنا چاہتے ہو۔ یہ بات ہم سب کے لیے باعث ننگ ہے۔ لیکن عبیداللہ نے شریح کی اس بات کو نہ مانا۔ بالآخر شریح نے ایک بہادر اور جانباز جماعت کے ساتھ ترکوں کے ساتھ لڑ کر مردانہ وار اپنی جانیں جان آفرین کے سپرد کیں۔ باقی ماندہ لوگ کسی نہ کسی طرح مرتے کھپتے واپس ہوئے بہت سے لوگ راستہ کی دشواریوں کا شکار ہوئے جن میں خود عبیداللہ بن بکرہ بھی تھے۔ اس معرکہ میں مسلمانوں کا جانی اور مالی بہت نقصان ہوا اور ذلت الگ اٹھانی پڑی۔

حجاج کو جب اس ہزیمت کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ چنانچہ اس نے سنہ ۸۰ھ میں ایک نہایت تجربہ کار اور آزمودہ کار بہادر جرنیل عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کو ایک لشکر جرار دے کر رتبیل کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ حجاج نے فوج بھیجنے سے قبل عبدالملک کو بھی اطلاع دی۔ حجاج نے بیس ہزار سوار کوفہ سے اور بیس ہزار پیدل بصرہ سے مرتب کر کے اس آزمودہ کار لشکر پر نہایت تجربہ کار جرنیل عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کو سردار بنایا۔ اسی دوران میں یہ اطلاع بھی ملی کہ عبیداللہ بن ابی بکرہ نے سیستان میں وفات پائی ہے۔ اب چونکہ سیستان کا کوئی امیر نہیں رہا تھا اس وجہ سے حجاج نے عبدالرحمٰن بن محمد کو سیستان کی گورنری کی سند بھی عطا کی اور اسے رتبیل کے ملک پر چڑھائی کے لیے روانہ کیا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن محمد عساکر اسلام کے ساتھ سیستان پہنچا اور رتبیل کو معلوم ہو گیا کہ اب مجھ پر حملہ ہونے والا ہے تو وہ پریشان ہوا لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔ عبدالرحمٰن نے رتبیل کے ملک کو فتح کرنا شروع کر دیا لیکن چونکہ یہ ایک آزمودہ کار جرنیل تھا لہٰذا اس نے اس بات کا لحاظ رکھا کہ جوں جوں آگے بڑھے اور رتبیل کے ملک کے اندرون پیش قدمی کرے بڑھے تو پہاڑوں کے درے اور گھاٹیوں

Marfat.com

میں چوکی پہرے قائم کرتا جائے۔ مختصر یہ کہ رتبیل کے ملک کا آدھے سے زیادہ حصہ فتح کر کے پیش قدمی کو آئندہ سال کے لیے روک دیا اور حجاج کو فتح نامہ کے ساتھ اس کی اطلاع دی کہ باقی حصہ ہم نے آئندہ سال کے لیے چھوڑ دیا تاکہ جو پہاڑوں اور دروں میں جنگ کر کے تھک چکی ہے، تازہ دم ہو جائے۔ اور ہمارے آدمی یہاں کے راستوں سے بخوبی واقف بھی ہو جائیں۔ انھوں نے حجاج کو بھی اپنے اس فیصلہ کی اطلاع دی۔

حجاج اس خط کو پڑھ کر سخت ناراض ہوا اور اس نے حکم بھیجا کہ تم اپنی پیش قدمی کو جاری رکھو۔ رتبیل کی فوج کے لوگوں کو جو تمھاری قید میں ہیں قتل کر دو اور قلعوں کو منہدم اور مسمار کر دو۔ اس حکم کے پہنچنے سے پہلے ہی فوراً دوسرا اور تیسرا حکم بھی اسی مضمون کا روانہ کیا بلکہ تیسرے حکم میں یہ بھی لکھا کہ اگر تم نے ہمارے اس حکم کی تعمیل کی تو بہتر ورنہ تو اپنے آپ کو معزول سمجھ اور تیری جگہ تیرا بھائی اسحاق بن محمد اشعث امیر لشکر ہے۔ یہ تینوں حکم عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کے پاس یکے بعد دیگرے پہنچے۔ عبدالرحمٰن نے حجاج کے احکام کو پڑھ کر تمام لشکر کو اکٹھا کر کے سنایا اور پھر ایک تقریر کی اور کہا کہ میں نے تم سب لوگوں کے مشورے سے یہ بات قرار دی تھی کہ ہم ترکوں کے مفتوحہ ملک کا انتظام کریں اور اس سال اپنی مضبوطی اور تیاری مکمل کر کے آئندہ سال بقیہ ملک کو فتح کریں، لیکن حجاج ترکوں سے لڑنے اور بلا توقف حملہ آور ہونے کو لکھتا ہے۔ تمھارے تھک جانے اور آرام کرنے کا بھی اسے خیال نہیں ہے۔ یہ وہی ملک ہے جہاں تمھارے بھائی پچھلے سال تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ میں بھی تمہارا بھائی اور تم جیسا ایک شخص ہوں۔ اگر آپ سب لوگ آگے بڑھنے اور دشمن سے لڑنے پر آمادہ ہیں تو میں سب کے ساتھ ہوں۔

عبدالرحمٰن بن محمد کی تقریر کو سن کر کوفی اور بصری یک لخت برافروختہ ہو گئے اور یک زبان ہو کر کہنے لگے: ''ہم حجاج بن یوسف کی اطاعت ہرگز نہ کریں گے اور ہرگز اس کا حکم نہیں مانیں گے۔ عامل بن وائلہ کنعانی کہنے لگا کہ حجاج تو اللہ کا دشمن ہے اس کو امارت سے معزول کر کے عبدالرحمٰن بن محمد کے ہاتھ پر امارت کی بیعت کر لو۔ تمام لوگوں نے اس کی اس بات کا ہاں میں جواب دیا اور نہایت زور شور سے کہا کہ ہمیں یہ بات دل و جان سے قبول ہے۔ عبدالرحمٰن بن شیث ربعی نے اٹھ کر کہا: ''چلو اللہ کے دشمن حجاج کو اپنے شہر سے نکال دو۔ یہ بات سنتے ہی تمام لشکری عبدالرحمٰن کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے ٹوٹ پڑے اور انھوں نے یہ عہد کیا کہ ہم حجاج کو عراق سے نکال باہر کریں گے۔ ابوطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ صحابی نے فرمایا:

''حجاج اس مثل پر عمل کر رہا ہے کہ اپنے غلام کو لڑائی پر بھیجو، اگر مر گیا تو بھی تمہارا ہی فائدہ ہے اور اگر زندہ رہا تو بھی اسے تمھاری ذرہ برابر پروا نہیں ہے۔ بس اپنے اعزاز و اکرام میں اضافہ مطلوب ہے۔''

اس کے بعد سب نے باہم مشورہ کر کے حجاج سے قطع تعلق کر لیا اور عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کو اپنا امیر منتخب کر لیا۔ عبدالرحمٰن بیعت امارت لے لینے کے بعد رتبیل سے اس شرط پر مصالحت کر لی کہ اگر وہ حجاج کو عراق سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو رتبیل کے ملک کا تمام خراج معاف کر دیا جائے گا، اور اگر شکست کھائی تو رتبیل اس کی مدد کرے گا۔ ادھر سے مطمئن ہو کر عبدالرحمٰن حجاج کے مقابلہ کے لیے عراق کی طرف روانہ

Marfat.com

ہوا۔ فارس پہنچ کر عبدالرحمٰن کے ساتھیوں نے مشورہ کیا کہ حجاج کو گورنر عراق مقرر کرنے والے عبدالملک کی بیعت بھی فسخ کر دینی چاہیے۔ چنانچہ یہاں عبدالملک کی بیعت توڑنے کا اعلان ہوا اور عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی گئی۔

حجاج کو جب یہ خبریں موصول ہوئیں تو اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اس نے فوراً عبدالملک کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور اس سے فوجی مدد طلب کی اور خود کوفہ سے بصرہ چلا آیا۔ عبدالملک نے حجاج کی مدد کے لیے پے در پے فوجی دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔ مہلب کو جب ان باتوں کی اطلاع ہوئی تو اس نے حجاج کو ہمدردانہ اور خیر خواہانہ مشورہ دیا کہ تم اہل عراق کو واپس لا کر اپنے گھروں میں پہنچ لینے دو اور ان سے ابھی بالکل تعرض نہ کرو۔ لیکن حجاج نے مہلب کے اس مشورہ کی کوئی پروانہ کی بلکہ وہ عراقیوں سے یک قلم بدظن ہو گیا۔ اس نے مہلب کے بارے میں بھی اپنے دل میں بدگمانی کو راہ دی اور یہ خیال کیا کہ مہلب گورنر خراسان ہونے کے ناطے ضرور ان لوگوں کا ہم خیال ہوگا۔

عبدالملک کی بھیجی ہوئی افواج جب آ گئیں تو حجاج ان کو لے کر بصرہ سے اس طرف آگے بڑھا اور تستر کے مقام پر پہنچ کر اپنے سواروں کے ایک دستہ کو مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھا۔ عبدالرحمٰن بن محمد بھی قریب پہنچ چکا تھا۔ ایک معمولی معرکہ میں عبدالرحمٰن کے سواروں نے حجاج کے سواروں کو شکست دے کر بھگا دیا اور ایک بڑے حصے کو قتل کر ڈالا۔ اب حجاج تسر سے مجبوراً بصرہ کی طرف لوٹا مگر عبدالرحمٰن نے اس کا تعاقب کیا۔ حجاج مقابلہ کی طاقت نہ پا کر بصرہ کو چھوڑ کر زاویہ چلا گیا۔ عبدالرحمٰن نے بصرہ کو خالی دیکھ کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اہل بصرہ پہلے ہی حجاج سے سخت نالاں تھے، اس لیے سب بخوشی عبدالرحمٰن کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو گئے اور بصرہ کے علماء اور قراء نے بھی اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ واقعہ اواخر ذی الحجہ سنہ ۸۱ھ کا ہے۔

ایک ماہ بعد محرم سنہ ۸۲ھ میں زاویہ کے مقام پر حجاج اور عبدالرحمٰن کی فوجوں نہایت خون ریز جنگیں ہوئیں جن میں کبھی حجاج غالب ہوتا اور کبھی عبدالرحمٰن لیکن ۲۹ محرم سنہ ۸۲ھ کو جو لڑائی ہوئی اس سے ایک روز پہلے حجاج نے مایوس ہو کر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر کہا: ''اللہ تعالیٰ مصعب بن زبیر کو جزائے خیر دے اس نے مصیبت کے وقت فرار کے عار کو گوارا نہ کیا۔'' پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسی طرح وہ بھی جان دے دے گا لیکن میدان سے فرار نہ کرے گا۔'' حجاج کی اس ہمت سے اس کے ساتھیوں کو بڑھاوا ملا اور انھوں نے لڑائی میں پوری طاقت سے عبدالرحمٰن کے میمنہ پر حملہ کر کے اسے شکست دے دی۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور علماء اور قراء کی ایک بہت بڑی تعداد میدان جنگ میں کام آئی۔ اب بصرہ پر پھر حجاج کا قبضہ ہو گیا اور عبدالرحمٰن کوفہ میں داخل ہو کر وہاں کے دارالامارۃ پر قابض ہو گیا۔ عبدالرحمٰن کے بہت سے ساتھی بصرہ سے کوفہ آ کر اکٹھے ہو گئے۔ اہل بصرہ نے عبدالرحمٰن بن محمد کی شکست کے بعد عبدالرحمٰن بن عباس بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور حجاج کے ساتھ مقابلہ اور مقاتلہ کا سلسلہ جاری و ساری رکھا۔

Marfat.com

پانچ چھ روز تک عبدالرحمٰن بن عباس نے حجاج کا خوب سختی سے مقابلہ کیا۔ اس فرصت سے عبدالرحمٰن بن محمد نہایت آسانی سے کوفہ پر قابض اور متصرف ہو گیا۔ آخر عبدالرحمٰن بن عباس بھی بہت سے اہل بصرہ کے ساتھ کوفہ کی طرف روانہ ہوا اور عبدالرحمٰن بن محمد سے کوفہ میں جا کر ملا۔ حجاج بصرہ میں داخل ہوا اور حکیم بن ایوب ثقفی کو بصرہ میں حاکم مقرر کر کے خود کوفہ کی طرف روانہ ہوا۔ مقام دیر قرہ میں ڈیرے ڈالے۔ ادھر کوفہ سے عبدالرحمٰن بن محمد دو لاکھ سپاہیوں کو لے کر کوفہ سے نکلا اور دیر جم پر مورچے باندھے۔ فریقین نے خندقیں کھود کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا اور پھر لڑائی کا ایک طویل سلسلہ جاری ہو گیا۔ یہ لڑائی عرصہ تک جاری رہی۔ ہر روز دونوں طرف کی فوجیں میدان میں نکلتیں اور ایک دوسرے کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کرتیں لیکن جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

عبدالملک ان طویل اور بے نتیجہ خانہ جنگیوں سے تنگ آ گیا۔ اس نے اپنے مشیروں کو جمع کر کے کہا:

''اہل عراق کی یہ شورش اور بغاوت حجاج سے ناراضگی کی وجہ سے ہے اگر ہم اس کو معزول کر کے اہل عراق کو راضی کر سکیں تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ عبدالملک کے مشیروں نے اس کی رائے کی تائید کی۔ چنانچہ عبدالملک کی طرف سے ایک شاہی کمیشن اس کے بھائی محمد بن مروان اور اس کے بیٹے عبداللہ بن عبدالملک کی سرکردگی میں عراق آیا اور ان دونوں نے اہل عراق کو یہ شاہی پیغام پہنچایا۔

''امیر المومنین حجاج بن یوسف کو عراق کی حکومت سے معزول کرنے کے لیے تیار ہیں اور یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ اہل عراق کے وہی حقوق ہوں گے جو اہل شام کے ہیں اور عراقی فوج کو شامی فوج کے برابر تنخواہیں دی جائیں گی، اور ابن اشعث جس مقام کی حکومت پسند کرے گا، اسے زندگی بھر کے لیے وہاں کا حاکم بنا دیا جائے گا۔ اور اگر اہل عراق ان شرائط پر صلح کر لیں تو امیر المومنین محمد بن مروان کو عراق کا نیا امیر مقرر کرتے ہیں۔ اور اگر انھیں یہ شرائط منظور نہ ہوں تو پھر حجاج بن یوسف بدستور عراق کا امیر رہے گا اور اسے اختیار ہے کہ جس طرح مناسب سمجھے اہل عراق سے نمٹے۔''

عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث اور اس کے ساتھیوں نے عبدالملک کے بارے میں باہم مشورہ کیا۔ عبدالرحمٰن کی رائے یہ تھی کہ اس پیش کش کو جو ''آبرومندانہ'' صلح کی حیثیت رکھتی ہے، قبول کر لیا جائے۔ لیکن ان کے ساتھی ان کی رائے سے متفق نہ ہوئے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جب ہم اہل شام کو ہر طرح سے شکست دے سکتے ہیں تو پھر صلح کیوں کریں۔ چنانچہ یہ پیش کش مسترد کر دی گئی اور پھر جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس پیشکش کے مسترد کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عراقی فطرۃً شورش پسند واقع ہوئے تھے، اس لیے اس پیشکش کو اپنی ناعاقبت اندیشی سے رد کر کے حجاج کو اپنے اوپر مسلط رہنے کا موقع دیا۔ ان کے انکار پر اب حجاج کو انتقام لینے کا موقع مل گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حجاج کو جب اس پیغام شاہی کا حال معلوم ہوا تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ اس نے عبداللہ بن عبدالملک اور محمد بن مروان کو اس پیغام کو پہنچانے سے روک کر عبدالملک کو خط لکھا کہ آپ کے اس طرزِ عمل سے اہل عراق کبھی بھی محکوم نہ ہوں گے بلکہ ان کی سرکشی میں اضافہ ہو گا، لیکن عبدالملک نے حجاج کی اس بات کو ناپسند

Marfat.com

کیا اور عبداللہ اور محمد نے عبدالملک کا پیغام اہل عراق تک پہنچایا۔ اہل عراق کے اس پیشکش کو رد کرنے کے بعد عبداللہ اور محمد یہ صورت حال دیکھ کر اپنی فوج حجاج کے پاس چھوڑ کر خود عبدالملک کے پاس واپس چلے گئے۔

اب طرفین میں زیادہ تیاریوں اور زیادہ جوش و جذبہ کے ساتھ بڑی زور دار لڑائیاں شروع ہوئیں، اور ایک سال تک برابر لڑائیوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ دونوں فریق ہر روز اپنے اپنے مورچوں سے نکل کر نبرد آزما ہوتے اور شام اپنے مورچوں میں واپس چلے جاتے۔ ان لڑائیوں میں عبدالرحمٰن بن محمد کا پلہ بھاری نظر آتا تھا اور حجاج کا نقصان زیادہ ہوتا تھا، لیکن حجاج کے پاس شام سے برابر تازہ دم فوج پہنچ رہی تھی۔ آخر ۱۵ جمادی الآخرہ سنہ ۸۳ھ ایک بڑی خوفناک جنگ ہوئی۔ حجاج کو بعض اتفاقی واقعات کی بنا پر اس جنگ میں فتح ہوئی اور وہ فوراً کوفہ میں داخل ہو کر قابض ہو گیا۔ عبدالرحمٰن نے وہاں سے بصرہ کا رخ کیا اور حجاج کے عامل کو نکال کر فوری طور پر بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ حجاج نے کوفہ والوں سے بیعت لینی شروع کی۔ جس نے ذرا سا بھی تامل کیا اس کو بے دریغ قتل کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حجاج نے ان الفاظ میں مفتوحین سے بیعت لی: "میں نے امیر المومنین سے بغاوت کر کے کفر کا ارتکاب کیا ہے، لہٰذا میں اس کفر سے توبہ کرتا ہوں۔ جس کسی نے ان الفاظ کی ادائیگی میں تامل کیا اسے بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔" (ابن اثیر: ۱۸۵/۴)

عبدالرحمٰن بن محمد کے پاس بصرہ میں ایک بہت بڑا لشکر جمع ہو گیا اور اس نے حجاج پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ حجاج کو جب اس حملہ کرنے کی اطلاع ملی تو وہ کوفہ سے ایک زبردست شامی لشکر لے کر بصرہ کی طرف چلا۔ یکم شعبان سنہ ۸۳ھ سے لڑائی شروع ہوئی اور ۱۵ شعبان تک بڑے زور شور کے ساتھ یہ جنگ جاری رہی۔ حجاج کو کئی مرتبہ شکست ہوئی لیکن وہ سنبھل گیا۔ حجاج کے لشکر میں عبدالملک بن مہلب بھی موجود تھا۔ ۱۵ شعبان کو جب عبدالرحمٰن نے حجاج کو شکست فاش دے دی تھی، عبدالملک بن مہلب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ عبدالرحمٰن کی فوج پر حملہ کر دیا جب کہ وہ حجاج کے کیمپ کو لوٹ کر اور میدان جنگ سے اسے بھگا کر اپنے لشکر گاہ میں فتح مند واپس آیا تھا۔ اس اچانک حملہ نے عبدالرحمٰن کے فوجیوں کو حیران اور سراسیمہ کر دیا اور وہ بھاگ پڑے۔ بہت سے خندقوں میں گھر کر ہلاک ہوئے اور بہت سے اپنی جان سلامت لے گئے۔

حجاج جو شکست کھا چکا تھا، واپس آ کر عبدالرحمٰن بن محمد کی لشکر گاہ پر قابض ہوا۔ اس شکست کے بعد عبدالرحمٰن بصرہ سے سوس سابود، کرمان، زرنج اور بست ہوتا ہوا رتبیل شاہ ترکستان کے پاس چلا گیا۔ عبدالرحمٰن کے ساتھیوں نے سیستان کے قریب اکٹھے ہو کر عبدالرحمٰن بن عباس بن ربیعہ کو اپنی نمازوں کا امام بنا دیا اور اپنے ساتھیوں کو اطراف و جوانب سے بلایا اور عبدالرحمٰن بن محمد کے پاس پیغام بھیجا کہ تم واپس چلے آؤ اور خراسان پر قبضہ کر لو۔ عبدالرحمٰن نے جواب میں کہلا بھیجا کہ خراسان پر یزید بن مہلب حکمران ہے، اس وجہ سے خراسان کا اس سے چھین لینا کوئی آسان کام نہیں، لیکن ان لوگوں نے بہت اصرار کے ساتھ عبدالرحمٰن بن محمد کو بلوایا۔ وہ رتبیل کے ہاں سے رخصت لے کر آیا۔ ان لوگوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔ ان کو لے کر ہرات کی طرف گیا۔ ہرات پر

Marfat.com

قبضہ کیا۔ یزید بن مہلب فوج لے کر مقابلہ پر آیا۔ دونوں ایک دوسرے سے مقابل ہوئے تو جنگ شروع ہونے سے پیشتر ہی عبدالرحمٰن بن محمد کے لشکری میدان سے بھاگنے لگے۔ مجبوراً عبدالرحمٰن بن محمد نے اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ مقابلہ کیا۔ بہت سے مقتول اور گرفتار ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن محمد وہاں سے سندھ کی طرف بھاگا۔ یزید نے اپنی فوج کو اس کا تعاقب کرنے سے روک دیا۔ عبدالرحمٰن سندھ پہنچ گیا۔ یزید نے ہرات کی جنگ میں جن لوگوں کو قید کیا تھا، انھیں مروا کر وہاں سے حجاج کے پاس بھیج دیا۔ انھیں قیدیوں میں محمد بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے جو حجاج کے حکم سے قتل ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن محمد سندھ سے رتبیل کے پاس چلا گیا اور وہاں جا کر سل کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حجاج نے رتبیل کو لکھا کہ عبدالرحمٰن بن محمد کا سر کاٹ کر بھیج دو تو دس سال کا خراج تم کو معاف کر دیا جائے گا۔ رتبیل نے اس بیمار کا سر کاٹ کر حجاج کے پاس بھیج دیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ حجاج کو جب اس کی خبر ہوئی کہ ابن اشعث نے رتبیل کے دامن میں پناہ لی ہے تو اس نے رتبیل کو لکھا کہ ابن اشعث کو میرے پاس بھجوا دو، ورنہ تمہارا ملک تاخت و تاراج کر ڈالوں گا۔ رتبیل کی غیرت نے اسے گوارا نہ کیا، لیکن ابن اشعث کے ایک دشمن عبید بن ربیع نے رتبیل کو حجاج کے انتقام میں ڈرا کر اس شرط پر آمادہ کر لیا کہ اگر وہ ابن اشعث کو حوالہ کر دے تو دس یا سات برس تک اس سے خراج نہ لیا جائے۔ چنانچہ باختلاف روایت رتبیل نے اس کا سر قلم کر کے بھجوا دیا، یا زندہ حوالے کر دیا، یا راستہ میں محمد بن اشعث نے خودکشی کر لی۔ یہ واقعہ سنہ ۸۵ھ کا ہے۔ عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کے خاتمہ کے بعد عراق میں امن و سکون ہو گیا۔ حجاج نے ائمہ تابعین میں سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ باقی بزرگوں کو معاف کر دیا اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کو کئی برسوں کے بعد ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں شہید کر دیا۔

عبدالرحمٰن بن محمد کی حمایت میں بہت سے اہل علم و قلم نے بھی تلوار اٹھائی ان میں فقیہ عراق عامر شعبی بھی تھے۔ فتح کے بعد حجاج نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص قتیبہ بن مسلم کے پاس ''رے'' چلا جائے گا اس سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ عامر شعبی بھی قتیبہ بن مسلم کے پاس چلے گئے۔ حجاج نے قتیبہ کے پاس حکم بھیج کر شعبی کو طلب کر لیا۔

شعبی بیان کرتے ہیں کہ جب وہ کوفہ پہنچے تو ان کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ جہاں تک ممکن ہو حجاج کے سامنے عذر معذرت سے کام لینا، لیکن ان کی علمی جرأت نے اس مشورہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ جب حجاج کے دربار میں پیشی ہوئی اور جواب طلب کیا گیا تو امام شعبی نے فرمایا:

''اے امیر! ہم نے آپ کے خلاف سرکشی کی اور دوسروں کو سرکشی پر آمادہ کیا اور اس سلسلہ میں ہر قسم کی کوشش عمل میں لائے لیکن وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح عنایت فرمائی اور کامیابی سے ہم کنار کیا۔ اب آپ ہم پر ظلم کریں تو ہم آپ کے مستحق ہیں اور اگر درگزر کریں تو یہ آپ کے حلم کا تقاضا ہے۔''

Marfat.com

حجاج شعبی کی صاف بیانی پر حیران رہ گیا، اور کہنے لگا:

''اے شعبی! تمھاری یہ صاف بیانی مجھے اس شخص کی معذرت سے زیادہ پسند ہے جس کی تلوار سے تو خون کے قطرے ٹپک رہے ہوں اور وہ یہ کہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا، اور مجھے کچھ خبر نہیں، جاؤ تم مامون ہو۔''

عربی کا شیریں بیان شاعر اعشیٰ ہمدانی بھی اس معرکہ میں عبدالرحمٰن بن محمد کے ساتھ تھا اور اپنی شعلہ بیانی سے اہل لشکر کے دل گرما رہا تھا۔ جب عبدالرحمٰن بجستان سے عراق کی طرف روانہ ہوا تو اعشیٰ کا ایک قصیدہ زبان زد عام و خاص تھا جس کے ایک شعر کا مطلب یہ تھا

''بنو ثقیف میں دو کذاب ہوئے ہیں۔ کذاب سابق (مختار) اور کذاب ثانی (حجاج بن یوسف) کاش اللہ تعالیٰ مجھے بنو ثقیف ہمدان سے بدلہ لینے کی قوت دے۔''

حجاج نے اعشیٰ کو بھی طلب کر لیا اور کہا کہ ذرا اپنا قصیدہ تو سنایئے۔ اعشیٰ نے کہا: ''اسے چھوڑیئے میں اپنا تازہ کلام آپ کو سناتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اپنا ایک طویل قصیدہ حجاج کی مدح و تحسین میں سنانا شروع کیا، جس کا مطلع یہ تھا:

ابی اللہ الا ان یتمم نورہ ویطفی نور الفاسقین فتخمدا

''یعنی اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ وہ نور حق کو مکمل کر دے اور فاسقوں کی روشنی کو بجھا دے کہ وہ ٹھنڈی ہو کر رہ جائے۔''

اعشیٰ کا یہ وجد آفرین قصیدہ سن کر تمام درباری اش اش کر اٹھے مگر حجاج نے اسے نہ بخشا اور اسے قتل کروا دیا۔ (ابن اثیر: ۱۸۸/۴)

یہ ہے فرق ایک عالم دین اور شاعر کے کیریکٹر کا۔

شہر واسط کی آبادکاری:

جس زمانہ میں عبدالرحمٰن بن محمد سے معرکہ آرائی ہو رہی تھی اس زمانہ میں حجاج کو عبدالملک سے بار بار فوجی امداد طلب کرنا پڑی۔ جب عبدالرحمٰن عراق سے بے دخل ہو کر عثان کی طرف واپس آیا اس وقت حجاج کے پاس شامی لشکر بہت زیادہ تعداد میں موجود تھا۔ اہل کوفہ اور اہل بصرہ کی طرف سے حجاج کو بالکل اطمینان تھا کیونکہ یہ لوگ شروع ہی سے بے وفا، دھوکہ باز اور شورش پسند تھے۔ اب بھی عبدالرحمٰن بن محمد کے ساتھ شریک ہو کر لڑنے والے کوفی اور بصری ہی تھے، لہٰذا شامی لشکر کو ایک عرصہ تک کوفہ اور بصرہ میں رکھنا جنگی نقطہ نگاہ سے نہایت ضروری تھا۔ پہلے تو حجاج نے یہ حکم دیا کہ شامی فوجی کوفیوں کے گھروں میں قیام کریں لیکن چند ہی روز کے بعد شامی مردوں کے کوفی عورتوں کے ساتھ اسکینڈلز شروع ہو گئے۔ جب حجاج کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے شامی لشکر کے لیے ایک چھاؤنی قائم کرنے کا عزم کیا۔ چنانچہ اس کام کے لیے اس نے تجربہ کار لوگوں کی

Marfat.com

ایک جماعت کو مامور کیا کہ وہ ایک مقام کو گندگی اور نجاست سے پاک وصاف کر رہا ہے۔ راہب سے جب اس صفائی کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے جواب دیا کہ ہم نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہے کہ اس مقام پر عبادت کے لیے ایک مسجد بنائی جائے گی لہٰذا میں اس جگہ کو پاک اور صاف کر رہا ہوں۔ ان لوگوں نے حجاج کو آ کر یہ تمام بات بتائی۔ حجاج نے اس خاص مقام پر ایک مسجد بنا کر اسی کے اردگرد فوجی چھاؤنی قائم کر دی اور شامیوں کو وہاں قیام کرنے کا حکم دیا۔ یہی شہر واسط کی وجہ ابتداء تھی۔ (البدایہ والنہایہ:۹/۵۶)

موسیٰ بن عبداللہ بن حازم:

موسیٰ بن عبداللہ بن حازم نے ترمذ میں اپنی ایک خودمختار ریاست قائم کر لی ہوئی تھی۔ حریث اور ثابت پسران قطنہ خزاعی مہلب کے پاس سے فرار ہو کر موسیٰ بن عبداللہ کے پاس ترمذ میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ مہلب جب خراسان کا گورنر ہوا تو اس نے اپنے عہد حکومت میں موسیٰ بن عبداللہ سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور اپنی اولاد کو بھی یہی کہا کہ تم لوگ موسیٰ کی حکومت سے کوئی تعرض نہ کرنا کیونکہ اگر موسیٰ بن عبداللہ نہ ہو تو پھر خراسان کی گورنری پر بنو قیس سے کوئی شخص آئے گا۔ جب عبدالرحمٰن بن محمد کا سر کاٹ کر رتبیل نے حجاج کے پاس بھیجا تو عبدالرحمٰن کے ساتھی رتبیل کے ہاں سے بھاگ کر ترمذ میں موسیٰ بن عبداللہ کے ہاں آ گئے۔ اس طرح موسیٰ کے پاس عربوں کی آٹھ ہزار کی جمعیت اکٹھی ہو گئی۔ حریث اور ثابت دونوں بھائی وزارت اور سپہ سالاری کی خدمات انجام دیتے تھے اور موسیٰ بن عبداللہ خودمختار حاکم تھے۔ ایک روز ثابت نے موسیٰ سے کہا کہ اہل بخارا اور ترک سرداروں کو ساتھ ملا کر یزید بن مہلب کو خراسان سے بے دخل کر دیں لیکن موسیٰ نے اس تجویز سے سختی سے اختلاف کیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یزید کو اگر خراسان سے بے دخل کر دیا گیا تو خراسان پر عبدالملک کا کوئی دوسرا گورنر آ کر قابض ہو جائے گا اور ہم خراسان کو بچا نہ سکیں گے۔ البتہ انھوں نے ترکستان کے علاقوں سے عبدالملک کے تمام عاملوں کو نکال دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موسیٰ کی ترمذ کی حکومت مضبوط ہو گئی۔ چند روز کے بعد ترکوں، مغلوں اور تبتیوں نے مل کر موسیٰ کے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ ترک سردار دس ہزار فوج لیے ہوئے تھا۔ موسیٰ کے سپہ سالار حریث نے قطنہ میں ترک سردار پر اس شدت سے حملہ کیا کہ ترکوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی ہنگامہ دار و گیر میں ایک تیر حریث بن قطنہ کی پیشانی پر آ کر لگا۔ زخم کاری تھا کہ دو روز کے بعد حریث کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے روز موسیٰ نے حملہ کر کے ترکوں کو شکست فاش دی، اور بہت سا مال غنیمت لے کر ترمذ میں واپس آیا۔ حریث کے مرنے کے بعد اس کا بھائی ثابت موسیٰ کے بارے میں متوہم ہو گیا اور موسیٰ سے بھاگ کر مقام حوشرا میں قیام پذیر ہو کر فوجی قوت اکٹھی کرنے لگا۔ موسیٰ بن عبداللہ اس کے مقابلہ کے لیے فوج لے کر ترمذ سے چلا تو بخارا، کش اور نسف کے باشندے ثابت کی مدد کے لیے حرکت میں آ گئے۔ اب موسیٰ نے یہی مناسب سمجھا کہ واپس ترمذ میں آ جائے۔ پھر چند روز کے بعد ترک اکٹھے ہوئے اور ثابت ابن قطنہ کو اپنے ساتھ لے کر اسی ہزار

Marfat.com

کے عظیم لشکر کے ساتھ ترمذ کا محاصرہ کر لیا۔ موسیٰ نے نہایت صبر و استقلال اور جرأت و ہمت کے ساتھ اس لشکر کا مقابلہ کیا۔ ثابت بن قطنہ مارا گیا اور ترک بھی پریشان ہو کر محاصرہ اٹھا کر واپس چلے گئے۔

اس معرکہ کے چند روز بعد یزید بن مہلب کو خراسان کی گورنری سے معزول کر کے اس کے بھائی مفضل کو وہاں کا گورنر بنا دیا گیا۔ مفضل نے خراسان کی حکومت کا چارج لیتے ہی عثمان بن مسعود کو ایک لشکر دے کر موسیٰ پر حملہ کے لیے مرو سے روانہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی رتبیل اور ترکی کے بادشاہوں کو عثمان بن مسعود کی مدد کے لیے لکھ دیا۔ ترک بادشاہ پہلے ہی موسیٰ کے سخت خلاف تھے لہٰذا انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ اپنی فوجیں لے کر چاروں طرف سے ترمذ پر حملہ آور ہو گئے۔ موسیٰ مجبور ہو کر ترمذ کے قلعہ میں بند ہو گیا۔ ان لشکروں کا محاصرہ دو ماہ تک رہا۔ جب فتح کی کوئی امید نظر نہ آئی تو موسیٰ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم باہر نکل کر دشمن پر حملہ آور ہو جائیں۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔

قلعہ سے باہر نکلنے سے پہلے موسیٰ نے اپنے بھتیجے نصر بن سلیمان کو شہر اور قلعہ ترمذ میں اپنا قائم مقام بنایا اور اسے وصیت کی کہ اگر میں مارا جاؤں تو شہر اور قلعہ عثمان بن مسعود کے سپرد نہ کرنا بلکہ مدرک بن مہلب کے حوالہ کرنا۔ پھر موسیٰ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ حریف پر نہایت زور سے حملہ کیا لیکن موسیٰ داد شجاعت دیتا ہوا مقتول ہوا۔ اس طرح ۱۵ سال تک ترمذ میں خود مختارانہ حکومت کرنے کے بعد سنہ ۸۵ھ میں موسیٰ بن عبداللہ بن حازم جو بنو قیس سے تعلق رکھتا تھا، اس دنیا سے رخصت ہوا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے حجاج بن یوسف کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ ان روایات کی روشنی میں لکھا جو ہمارے عام مؤرخین نے سبائیت زدہ لوگوں کی روایات سے اخذ کر کے لکھا ہے۔ حجاج بن یوسف ایسا ظالم و جابر نہیں تھا جیسا اس کو ان غلط اور وضعی روایات کی روشنی میں بنایا جاتا ہے۔ حجاج بن یوسف بنو امیہ کے دور کا نہ صرف ایک بڑا سیاست دان اور مدبر تھا بلکہ وہ بنو امیہ کے لائق اور قابل ترین گورنر تھا۔ وہ طائف میں سنہ ۴۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوا اور سنہ ۹۵ھ میں اس دنیا سے انتقال کیا۔ خارجیوں کی مسلسل سازشوں اور شورشوں کے باعث عراق کی گورنری اسلامی ریاست کا سب سے اہم اور ذمہ دارانہ انتظامی عہدہ تھا۔ حجاج کو ۳۳ برس کی عمر میں عبدالملک کے عہد خلافت میں اس اہم عہدہ پر فائز ہونے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے وہ دو سال تک حجاز کا گورنر رہ چکا تھا۔ اسلامی ریاست کے مشرق میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے کی شاندار فتوحات بھی حجاج کی مساعی اور انقلابی جنگی تدبیروں کے مرہون منت تھیں ماوراء النہر (قدیم ترکستان کا علاقہ) کو قتیبہ بن مسلم، عمان کو مجاعہ بن مسعر اور برصغیر پاک و ہند کو محمد بن قاسم نے فتح کیا۔ اسلامی فتوحات کے اس عہد زریں کے ان تین سپہ سالاروں کو حجاج بن یوسف کی عقابی نظروں نے مذکورہ مہمات کے لیے منتخب کیا اور ان کی صلاحیتوں اور قابلیت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جس کی بدولت اس عہد کی اسلامی حکومت کو خوب تقویت ملی۔ حجاج بن یوسف ایک مستعد اور ذوفہم حکمران تھا۔ وہ ملک کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتا تھا، اور خلیفہ

Marfat.com

عبدالملک اور ولید بن عبدالملک کے عہد میں انھوں نے اسلامی ریاست کی فلاح و بہبود اور استحکام کے لیے مثالی خدمات انجام دیں۔ ہمارے ہاں حجاج کے بارے میں ظلم وجور کی جو داستانیں مشہور ہیں وہ بے اصل، وضعی اور سبائیوں کی بنائی ہوئی ہیں۔

علماء نے لکھا ہے کہ حجاج کے دو احسانات پوری امت مسلمہ پر ایسے ہیں جن کے بار دوش سے سبک دوش ہونا اس کے لیے ممکن نہیں۔ ان میں سے ایک قرآن حکیم پر اعراب لگوا کر اس کی حفاظت اور اس کی اشاعت کرنا ہے۔ دوسرا سرزمین پاک و ہند تک اسلام پہنچانا ہے۔ آج برصغیر پاک و ہند میں ہمارا کلمہ گو ہونا حجاج ہی کی مساعی کا مرہون منت ہے۔ یہ حجاج کے ایسے احسانات عظیمہ ہیں جن کی وجہ سے دشمنان اسلام ان کے سخت دشمن بن گئے اور انھیں غلط اور لغو اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ قرآن حکیم پر اعراب لگوانے کے سلسلہ میں علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ

"خدا کی قسم! یہ اسلام کے حق میں اتنی بڑی بھلائی ہے کہ کوئی بھلائی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور دین پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اس احسان کے برابر کوئی احسان نہیں ہو سکتا۔" (الانتقاد عربی، شبلی نعمانی: ص ۱۸)

حضرت مولانا محمد اسحاق سندیلوی ندوی قدس سرہ سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء، لکھنؤ نے حجاج کے بارے میں ظلم وجور کی ان داستانوں کی نقاب کشائی کر کے ان کو عقلی اور نقلی طور پر غلط ثابت کیا ہے۔ انھوں نے حجاج کے بارے میں بدگمانیوں کے ازالہ کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے، لیکن صدیوں کے پراپیگنڈے کا ازالہ چند سالوں میں ہونا کچھ ممکن نظر نہیں آتا لیکن پھر بھی حضرت مولانا اسحاق صاحب رحمہ اللہ نے عقلی اور نقلی دلائل سے ان کا غلط ہونا ثابت کیا ہے۔ ہم نے کتاب میں مشہور روایات کو بیان کیا ہے لیکن اصل واقعات وہی ہیں جو مولانا محمد اسحاق صدیقی ندوی رحمہ اللہ نے بیان کیے ہیں۔ ہمارے مؤرخین مکھی پر مکھی مارتے ہوئے انھیں روایات کا تکرار کرتے چلے آئے ہیں جو طبری، مسعودی اور دوسرے سبائی ذہنیت رکھنے والے مؤرخین نے بیان کی ہیں، اور روایت و درایت کے اصولوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے ان سبائی روایات کو قاری کے ذہن میں ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔

Marfat.com

حجاج کے خلاف الزامات کا تحقیقی جائزہ

سبائیوں نے حجاج بن یوسف پر ظلم وستم کا الزام لگایا اور اس کی اس قدر تشہیر کی کہ عام مسلمان بھی انھیں ظالم کہنے لگے اور ان کا نام ظلم وستم کی علامت بنا دیا گیا۔ اس تشہیر اور بہتان کو سبائیوں اور سبائی نوازوں نے خلافت بنوامیہ کے خلاف عوام وخواص کو مشتعل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ نے اپنی اولاد کو جو وصیت حجاج کی قدر شناسی اور ان سے حسن سلوک کے متعلق کی تھی اس کا تذکرہ کر کے مودودی صاحب اپنی کتاب ''خلافت وملوکیت'' میں لکھتے ہیں:

''یہ وصیت اس ذہنیت کی پوری نمائندگی کرتی ہے جس کے ساتھ یہ لوگ حکومت کر رہے تھے۔''

(خلافت وملوکیت: ص ۱۸۶)

مگر یہ عبارت ظلم کے غلط پروپیگنڈے اور جھوٹ کی ریت پر قائم کی گئی ہے، جس کا ڈھیر سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے لگایا ہے۔ اس لیے حقیقت ظاہر ہونے کے بعد یہ پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ غلط بیانی اور اس میں مبالغہ آرائی کا ایک نمونہ مودودی صاحب کا مندرجہ ذیل قول ہے:

''اس زمانہ میں جو لوگ قیدی کی حالت میں کسی عدالتی فیصلے کے بغیر قتل کیے گئے صرف ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ جب وہ مرا ہے تو اس کے قید خانوں میں ۸۰ ہزار بے قصور انسان کسی مقدمے اور عدالتی فیصلے کے بغیر سڑ رہے تھے۔'' (ایضاً)

اس کے لیے ''الاستیعاب، ج ۱'' کا حوالہ دیا گیا ہے۔ الاستیعاب کے متعلق علما کا بیان ہے کہ یہ قابل اعتماد کتاب نہیں۔ اکابر علماء قدیم نے بھی اسے قابل اعتماد نہیں سمجھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے مصنف حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے ذہن پر شیعیت کا خاصا اثر تھا اور وہ بنوامیہ سے دلی پرخاش رکھتے تھے، اس لیے ان کے خلاف روافض کی روایتیں بلا تکلف قبول کر کے نقل کر دیتے تھے۔ اس معاملے میں نہ تو وہ خود قابل اعتماد ہیں اور نہ ان کی کتاب۔ مجہول کے صیغوں ''قیل''، ''یقال'' اور ''بتائی جاتی ہے'' کہہ کر جھوٹ نقل کیا جا سکتا ہے۔ مگر اہل بصیرت ایسی کہانیوں اور افواہوں کا کوئی اعتبار نہیں کرتے۔ خصوصاً جو بعید از قیاس ہوں، ان کی صحت کا شبہ اور احتمال بھی کسی فہیم انسان کو نہیں پیدا ہوتا۔ زیر بحث روایت تو اگر ثقات کی سند متصل کے ساتھ بھی ذکر کی جاتی تو

Marfat.com

بھی قابل قبول نہ ہوتی بلکہ فہم سلیم کے نزدیک مردود اور جھوٹی قرار پاتی۔

اس سوال کا جواب کیا ہے کہ یہ مقتول شماری کس نے کی؟ اس زمانہ میں کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں تھی، نہ اخبارات تھے، ڈاک، تار، فون وغیرہ ذرائع خبر رسانی بھی مفقود تھے۔ سفر بھی آج کی طرح آسان نہیں تھا۔ پھر اس سبائی روایت کے راوی کذاب نے مقتولین کی تعداد کیسے معلوم کر لی؟ اور یہ کیسے معلوم کر لیا کہ یہ سب مقتولین ناحق، بغیر کسی عدالتی فیصلے کے قتل کیے گئے تھے؟ موجودہ زمانہ میں جبکہ رسل و رسائل اور حمل و نقل کے ذرائع بکثرت ہیں، مشرق کی خبر مغرب تک منٹوں میں پہنچ سکتی ہے اور بعض اوقات نہیں بھی پہنچتی ہے۔ اگر کسی چھوٹے سے ملک میں، بلکہ کسی بڑے شہر میں بھی سو دو سو آدمی قتل کیے جائیں تو خود اس شہر میں رہنے والوں کے لیے ان کی صحیح تعداد معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پھر اگر بالفرض یہ مقتولین پہلے سے قید ہوں تو یہ معلوم کرنا کہ انھیں عدالتی فیصلے کے بغیر قتل کیا گیا ہے یا اس کے فیصلے کے بعد اور بھی مشکل ہوتا ہے۔

آج کل مختلف ممالک کے بڑے شہروں میں مختلف قسم کے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں حکومت گولی چلاتی ہے۔ مقتولین و مجروحین کی صحیح تعداد مدت دراز تک نہیں معلوم ہوتی بلکہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ صحیح تعداد کبھی نہیں معلوم ہوتی۔ پھر حجاج کے دور میں ایک وسیع و عریض صوبے میں ان مفروضہ مقتولین کی یہ تعداد، اور ان کا بغیر عدالتی فیصلے کے قتل ہونا کیسے معلوم ہو گیا؟ اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب یہ مصنفین نہیں دے سکتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ روایت بالکل جھوٹی، موضوع اور جعلی ہے۔ کسی رافضی دشمن خلافت کی گھڑی ہوئی ہے، جس نے جھوٹ اور مبالغہ آرائی کو جمع کر کے حجاج مرحوم پر بہتان و افتراء کیا ہے۔ ۸۰ ہزار قیدیوں کی روایت کو بھی اسی پر قیاس کر لیجیے۔ یہ بھی جھوٹ کی پوٹ ہے۔ یہ قیدی شماری کس نے کی؟ اور کس کے بس کی بات تھی؟ اگر حجاج ظالم تھے تو انھوں نے اس مقتول شماری اور قیدی شماری کرنے والے کی گردن کیوں نہ ماردی اور انھیں جیتا کیسے چھوڑ دیا؟ یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اموی خلافت کے زمانہ میں جیل خانوں کی تعداد بہت کم تھی اور اتنی وسیع و عریض جیل جیسی موجودہ زمانہ میں ہوتی ہے، شاید ایک بھی نہ تھی۔ سزائے قید کا رواج بہت کم تھا۔ اگر یہ سزا دی جاتی تھی تو زیادہ تر مجرم کو خانہ قید کر دیا جاتا تھا۔ جسے ہمارے زمانہ میں نظر بندی کہتے ہیں یعنی ملزم اپنے گھر میں آزادی کے ساتھ رہتا۔ صرف گھر سے باہر جانے پر پابندی ہوتی تھی۔ پھر یہ ۸۰ ہزار قیدی آخر قید کہاں تھے؟ اور ان کی گنجائش کہاں نکالی گئی تھی؟

ان دروغ باف راویوں کی سمجھ میں یہ بھی نہ آیا کہ ایک لاکھ بیس ہزار مقتولین اور اسی (۸۰) ہزار قیدیوں کا تذکرہ سن کر اس دور کی تاریخ اور عام انتظامی و سیاسی حالات سے معمولی واقفیت رکھنے والے کے دل میں بھی مندرجہ بالا سوالات پیدا ہوں گے۔ ان کا جواب تو ہونا چاہیے۔ لیکن عداوت بنی امیہ کے زہر کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے ان کا ذہن بھی ماؤف ہو گیا اور سوالات تک نہ پہنچ سکا۔ ورنہ کوئی اور روایت گھڑ دیتے اور جھوٹ کی تعداد میں اضافہ کر دیتے۔

Marfat.com

سبائیوں اور سبائیت نواز تاریخ نگاروں اور راویوں نے جھوٹ کیوں بولا؟ اور مبالغہ آمیز کذب و دروغ کا اتنا بڑا ڈھیر کتب تاریخ میں کیوں لگایا؟ اس کا علم بھی مفید ہے۔ جو لوگ تحریک سبائیت، اس کے مقاصد اور اس کے طریق کار سے واقف ہیں ان کے لیے اسے سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ ابن سبا کی تعلیم یہ تھی کہ اگر سبائیوں کی مفسدہ پردازی پر حکومت کوئی گرفت کرے تو اپنی مظلومیت کا رونا اونچی آواز میں رویا جائے اور معمولی سی بات کو سیکڑوں گنا کر دکھانے کے ساتھ اپنی معصومیت و بے گناہی کی جھوٹی تشہیر خوب کی جائے۔ یہ یہود کا بہت اصولی عمل ہے وہی انھوں نے سبائیوں کو سکھایا، سبائی ہمیشہ اسی پر کاربند رہے اور اب بھی اسی پر کاربند ہیں۔

اموی خلافت کے مبارک دور میں خلافت اسلامیہ کے خلاف سبائیوں کی خفیہ سازشیں جاری تھیں۔ یہ مفسدین فی الارض ''تقیہ'' کا لبادہ اوڑھ کر اسلام اور خلافت اسلامیہ کے خلاف طرح طرح کے دینی و دنیاوی فتنے برپا کرنے میں مصروف تھے۔ ایسے فتنہ پرداز منافق دشمنان اسلام، جب گرفت میں آجاتے تھے تو حجاج مرحوم انھیں سزا دیتے تھے۔ اور یہ سزا شرعاً و اخلاقاً ہر طرح بالکل بجا اور درست ہوتی تھی۔ ایسے واقعات چند ہی ہیں۔ انھیں سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے جھوٹ اور مبالغے کی آمیزش کر کے رائی کا پہاڑ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان مفسدوں کو جب سزا دی گئی تو قانون شرعی کے مطابق دی گئی۔ حجاج مرحوم کی گورنری کے پورے زمانہ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جس میں انھوں نے کسی شخص کو اس جرم کے ثبوت شرعی کے بغیر سزا دی ہو۔

واضح رہے کہ کسی کے بارے میں ایسے سنگین الزام کے لیے بھی ثبوت کی ضرورت ہے۔ خون ناحق کا الزام معمولی نہیں ہے۔ حجاج ہو یا اور کوئی، کسی کو بھی اس جرم کا مرتکب ثابت کرنے کے لیے شرعی ثبوت کا احتیاج ہے۔ روایت کو سند اور درایت دونوں حیثیتوں سے جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود مؤرخ کے عقیدہ و کردار کو بھی ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ مؤرخ بھی ایک راوی ہے۔ جب رواۃ پر نقد کیا جائے گا تو اسے نقد سے مستثنیٰ کیوں سمجھا جائے؟ مختصر یہ کہ حجاج مرحوم پر جور کا الزام لگانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس الزام کا ثبوت دیں اور میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ حجاج مرحوم کے دور ولایت کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کر سکتے جس کے بارے میں وہ شرعی دلیل سے یہ ثابت کر سکیں کہ اس میں انھوں نے کسی کا خون ناحق بہایا تھا۔ صرف یہ کہہ دینا کہ فلاں مؤرخ نے یہ لکھا ہے، یا فلاں شیخ المشائخ، فلاں امام اہل سنت، فلاں عمدۃ الاولیاء اور فلاں علامہ نے یہ لکھا ہے، ثبوت کے لیے کافی نہیں۔ تاریخ اقوال و آراء کا نام نہیں بلکہ نقل و روایت کا نام ہے۔ کسی تاریخی واقعہ کے ثبوت کے لیے نقل شدہ صحیح و قوی روایت درکار ہے۔ نقل اقوال بالکل بیکار ہے۔

ممکن ہے کہ کسی معاملے میں ان سے نادانستہ غلطی بھی ہوئی ہو اور کسی غیر مجرم کو مجرم سمجھ کر انھوں نے سزا دی ہو۔ لیکن سبائیوں اور سبائیت نوازوں خصوصاً علوی راویوں اور مؤرخوں نے اس قسم کے ایک واقعہ کو دس

Marfat.com

واقعات کر کے دکھایا ہے اور مجرموں کو بے گناہ ظاہر کر کے ان کی مظلومیت کا رونا رویا ہے۔ ان کذاب سبائیوں کے جھوٹے آنسوؤں سے متاثر ہو کر بعض مؤرخین نے بھی ان کی مشہور کی ہوئی غلط افواہوں پر یقین کر لیا۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں اس کا علم تھا کہ حجاج ان الزاموں سے بری ہیں لیکن حکومت علویہ کو خوش کرنے کے لیے یہ علماء و مؤرخین ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔

سبائی مؤرخوں اور راویوں نے اسلامی تاریخ کو تاریک بنانے، خلفاء اسلام، ان کی حکومتوں اور ان کے عمال کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹ بولنے کے ساتھ مغالطہ دہی سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اس مغالطہ دہی کی ایک مثال عبدالرحمان بن محمد بن اشعث کی بغاوت کا بیان بھی ہے یہاں اس پر کچھ روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے مخالفین بنی امیہ کی بیمار ذہنیت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

ابن الاشعث کی بغاوت:

عبدالرحمان بن محمد بن الاشعث حجاج کے زمانہ میں ایک فوجی آفیسر تھا۔ آدمی تیز اور ذہین تھا۔ عراق کا باشندہ تھا، جہاں ایرانی سبائی خاصی بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ عراق کے دو اہم شہر کوفہ اور بصرہ کے ان اہم مرکز تھے۔ یہ ''تقیہ'' کے پردے میں پوشیدہ رہتے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خفیہ تدبیروں میں مصروف رہتے تھے۔ نفاق ان کا شعار اور خفیہ ساز باز ان کا اصول کار تھا۔ ابن الاشعث کے آخری کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی درحقیقت اسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر مدت دراز تک تقیہ کی نقاب میں اپنا اصل چہرہ چھپائے رہا۔ علماء و مؤرخین اسلام نے عموماً اس کی اس بغاوت کو ''فتنہ ابن الاشعث'' کے عنوان سے (بذیل حوادث ۸۰ھ و ۸۲ھ) ذکر کیا ہے اور اس کی بغاوت کے واقعہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

''عبدالرحمان بن محمد بن الاشعث ایک فوجی افسر تھا۔ یہ عراق کا رہنے والا تھا۔ تیز، جری اور ذہین آدمی تھا۔ حجاج نے اسے سجستان کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قریب کے کافر ملک پر حملے شروع کر دیے۔ ان بلاد و امصار کا والی ایک مشرک رتبیل نامی تھا۔ یہ حملے صرف سرحد تک محدود تھے اور سرحدی چھیڑ چھاڑ کی حد سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد حجاج نے اسے لکھا کہ ''رتبیل'' کے ملک پر باقاعدہ حملہ کرے اور اندرون ملک تک فوجیں لے جا کر اس کی سرزمین کو فتح کرے۔ چونکہ حجاج سے اس کی مخالفت تھی اس لیے اس نے یہ کہا کہ اس نے اسے جنگ کا حکم اس لیے دیا ہے کہ اسے اور اس کے لشکر کو تباہ کروا دے۔ اس نے اپنے لشکر والوں سے کہا کہ ہمارے پاس اتنی قوت نہیں ہے کہ ہم رتبیل کے ملک پر حملہ کر سکیں اور اندرون ملک جا کر لڑ سکیں، حجاج نے ہمیں تباہ کرنے کے لیے یہ حکم دیا ہے۔ اس لیے مجھے امیر بنا لو اور خلافت پر قبضہ کرو۔ حجاج اور عبدالملک دونوں کو ختم کر دو۔ فوج اس پر راضی ہوگئی اور اس نے بغاوت کر دی۔ اس کے ساتھ بہت

Marfat.com

سا لشکر ہو گیا اور اس نے بلاد اسلامیہ پر حملے شروع کر دیئے۔ حجاج نے عبد الملک کو لکھا۔ اس نے ابن الاشعث کے مقابلے کے لیے شام سے لشکر بھیجا، جس نے اسے ہزیمت دی یہاں تک کہ ''بست'' کے مقام پر پہنچ کر اس کا لشکر منتشر ہو گیا اور ''بست'' کے عامل نے اسے قید کر دیا۔ یہ واقعہ رتبیل کو معلوم ہوا تو وہ اپنا لشکر لے کر ''بست'' پہنچا اور ابن الاشعث کو قید سے چھڑا کر اعزاز واکرام کے ساتھ لے گیا۔'' (تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر والاعلام: ۲۳۰/۳)

علامہ ذہبی کے مندرجہ بالا بیان پر نظر کرنے کے بعد یہ بات محتاج بیان نہیں رہتی کہ ابن الاشعث نے بغاوت بھی کی اور غداری بھی۔ اس نے خلافت اسلامیہ کے خلاف تلوار اٹھائی اور نظام خلافت کو ختم اور مسلمانوں کے ملی شیرازے کو پراگندہ کرنے کی ناپاک اور انتہائی مذموم کوشش کی۔ اس نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ نہایت مکروہ قسم کی غداری بھی کی۔ وہ کافروں سے مل گیا اور انھیں اسلامی ملک پر مسلط کرنا چاہا۔ کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا خون بہایا اور اپنے کافر دوست ''رتبیل'' کی تحویل میں چلا گیا۔ اس طرح یہ غدار کافروں کا دوست اور مسلمانوں کا دشمن بن گیا۔ اس کا ناپاک کردار بتا رہا ہے کہ یہ یقیناً کوئی سبائی تھا جو اتنی مدت تک اپنی سبائیت کو تقیہ کی نقاب میں چھپائے رہا۔ موقع پاتے ہی اس نے امت مسلمہ پر وار کیا۔ اس کی اس بغاوت، غداری، عداوت، خلافت اسلامیہ اور مسلم کشی کو علامہ ذہبی (اور عام طور پر علماء ومؤرخین) ''فتنہ'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

علامہ ذہبی کے اس بیان میں صاف کہا گیا ہے کہ ''بست'' کے مقام پر پہنچ کر اس کا لشکر منتشر ہو گیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

وتفرق اصحاب ابن الاشعث۔

''ابن الاشعث کے ساتھی اس سے جدا ہو گئے۔''

''بست'' میں اس کے لشکر نے اسے چھوڑ دیا۔ اسی وجہ سے ''بست'' کے عامل نے اسے آسانی کے ساتھ گرفتار کر لیا۔

مودودی صاحب کہتے ہیں:

''ابن کثیر کا بیان ہے کہ قراء (یعنی علماء وفقہاء) کی ایک پوری رجمنٹ اس کے ساتھ تھی۔''

ان کے اس قول پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''قراء'' کی یہ ''رجمنٹ'' کب سے اس کے ساتھ ہوئی تھی اور کب اس سے الگ ہو گئی؟ اتنا تو ماننا پڑے گا کہ ''بست'' کے مقام پر پہنچ کر اس کا سارا لشکر اس کا مخالف ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اس لیے اتنا تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ قراء کی یہ ''رجمنٹ'' بھی اس سے الگ ہو گئی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قراء جو بقول مودودی صاحب ابن الاشعث کی فساد انگیزی اور بغاوت وغداری کو ''جہاد'' ہونے کی سند دے رہے تھے اور جہاد ہی سمجھ کر اس میں شریک ہوئے تھے۔ جہاد سے ''فرار'' کے گناہ کبیرہ

Marfat.com

کے مرتکب ہوئے یا نہیں؟ ہزاروں علماء کا اس طرح غدر کر کے بقول راوی ''جہاد'' سے ''فرار'' کی معصیت عظیمہ کا مرتکب ہونا تو بہت اہم اور عبرت خیز بات ہے، اگر ایسا ہوتا تو اس کا عام طور پر چرچا ہوتا۔ یقیناً تاریخ کے صفحات میں ملامت کے عنوان سے اس کا تذکرہ ہوتا۔ لیکن ہم تاریخ کے صفحات اس سے خالی پاتے ہیں۔ جن علماء ومشائخ کا نام اس سلسلہ میں آتا ہے مثلاً شعبی، ابن ابی لیلیٰ، حسن بصری، وامثالھم ان کا تذکرہ کتب رجال میں دیکھیے تو ان میں بھی ان کی اس مبینہ معصیت کبیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں ملے گا۔ مزید یہ کہ سب حضرات اپنے وطن واپس آئے تو ان سے حجاج یا عبدالملک رحمہ اللہ کسی نے بھی کوئی باز پرس نہیں کی اور ابن الاشعث کے ساتھ بغاوت میں شرکت پر ان میں سے کسی کو بھی سزا نہیں دی۔ پھر ابن کثیر کے اس قول کو کس طرح صحیح سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ ''قراء'' کی ایک پوری ''رجمنٹ'' باغی ہو کر ابن الاشعث کے ساتھ غدر و بغاوت میں شریک ہو گئی تھی۔ ان کے قول کی صحت کی صرف یہ صورت ہے کہ اس سے مراد ان کی ابتدائی شرکت ہو یعنی جب ابن الاشعث بحکم حجاج جہاد کے لیے روانہ ہوا تھا تو یہ سب حضرات علماء کفار سے جہاد کرنے کے لیے اس کے ساتھ گئے تھے اور جہاد میں شریک ہوئے تھے۔ مگر جب اس کی نیت خراب ہوئی اور کفار سے جہاد کے بجائے اس نے خلافت سے بغاوت اور ملت اسلامیہ کے ساتھ غداری کے جرم عظیم کا ارتکاب کیا تو یہ حضرات علماء اس سے الگ ہو گئے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ فوری طور پر واپس نہ آ سکے تو یہ رکنا بہ امر مجبوری تھا۔ ظاہر ہے کہ ابن الاشعث نے قطعاً یہ پسند نہ کیا ہو گا کہ اتنی بڑی جماعت خصوصاً علماء کی جماعت، عین میدان جنگ میں اس کے لشکر سے الگ ہو جائے اور دارالاسلام پہنچ کر اس کی مخالفت کرے۔ اس لیے اس نے انھیں ڈرا دھمکا کر لشکر میں ٹھہرنے پر مجبور کیا ہو گا۔ موقع ملتے ہی یہ لوگ وہاں سے واپس آ گئے اور اس فتنہ پرداز سبائی ذہن والے غدار باغی کے فتنہ کو فرو کرنے میں حکومت اسلامیہ کی اعانت کرنے لگے۔ اگر ابن کثیر کے قول مذکور کا یہ مطلب نہ لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ انھوں نے غلط بیانی کی اور سبائی مؤرخین و رواۃ کے کذب و بہتان کو نقل کر کے اپنے مؤرخانہ وقار کو مجروح کر لیا۔

ہمارے نزدیک ابن کثیر کے قول کا مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ مودودی صاحب نے اس سباق میں نقل کر کے ناواقف قاری کو مغالطہ دینے کی افسوس ناک کوشش کی ہے۔ جہاد میں ان علماء کی شرکت سے انکار نہیں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ بغاوت اور غدر میں بھی اس فتنہ پرداز کے ساتھ شریک تھے۔ انھیں مفسد و باغی ابن الاشعث کا شریک کار یا مؤید کہنا ان حضرات پر بہتان و افتراء اور سراسر کذب و دروغ ہے۔ بلاشبہ ان حضرات نے اس وقت اس کا ساتھ دیا تھا، جب وہ کفار کے مقابلے میں مصروف جہاد تھا مگر جب اس نے بغاوت اور غداری کی تو اس وقت یہ اس سے الگ ہو گئے۔ ابن کثیر کے قول مذکور یا اسی مضمون کے دوسرے اقوال و روایات سے اس مقصد پر استدلال کرنا بہت مذموم غلطی اور مکروہ قسم کی مغالطہ دہی ہے۔

اس سے یہ بات بھی روشن ہو گئی کہ ابن الاشعث کی تائید میں شعبی رحمہ اللہ، حسن بصری رحمہ اللہ، ابن ابی

Marfat.com

لیلی رحمۃ اللہ کی جو تقریریں مودودی صاحب نے نقل کی ہیں وہ بھی موضوع، جعلی اور سبائی رواۃ مؤرخین کی گھڑی ہوئی ہے۔ جب یہ لوگ اسے چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے اور غدر و بغاوت اور فتنہ میں اس کے شریک ہی نہیں رہے تو یہ تقریریں کب کیں؟ اور کیوں کیں؟ نیز یہ کہ پھر جب اپنے وطن واپس آئے تو ان تقریروں کی بناء پر حکومت اسلامیہ نے ان کی گرفت کیوں نہ کی؟ اس سے عیاں ہے کہ یہ تقریریں جھوٹے سبائی راویوں کی تصنیف کی ہوئی ہیں اور ان بزرگوں کی طرف ان کی نسبت بالکل غلط اور خالص جھوٹ ہے۔

سعید بن جبیر کے قتل کی اصل وجوہات:

تاہم سعید بن جبیر کی طرف منسوب کر کے جو تقریر نقل کی گئی ہے اس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعی ان کی تقریر تھی۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ ابن الاشعث کی تائید اور بغاوت وغدر پر لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے جرم عظیم پر ان کی گرفت کی گئی اور حجاج نے انھیں سزائے موت دی۔ ممکن ہے کہ دو ایک اور غیر معروف علماء جو سعید بن جبیر کی طرح سبائی تشہیر وتزویر کا شکار ہو گئے ہوں ان کے ہم خیال ہوں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ابن الاشعث حق پر تھا۔ اس کا باطل ہونا دلیل شرعی سے ثابت ہے۔ خلافت اسلامیہ سے بغاوت خود معصیت کبیرہ اور جرم عظیم ہے۔ اس کے ساتھ اس کا کفار سے مل جانا، ان کے ہاتھ سے مسلمانوں کو قتل کروانے اور مملکت اسلامیہ کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا تو نہایت مکروہ اور شنیع غداری ہے جس کا گناہ عظیم اور معصیت کبیرہ ہونا بدیہی اور واضح ہے۔ ایسے مفسد، باغی اور غدار کی تائید کرنا، اس کی غداری، بغاوت اور اس کے فساد فی الارض کو ''جہاد'' کہنا نہایت قبیح اور جرم عظیم ہے۔ اس تائید کا مطلب خود ان جرائم میں شرکت کرنا ہے۔ سعید بن جبیر اس کے مرتکب ہوئے۔ حجاج نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے گناہ عظیم سے باز آ جائیں۔ انھیں نرمی کے ساتھ سمجھایا بجھایا، استمالت کے لیے ہدیئے تحفے دیئے لیکن سبائی زہر ان کے دماغ پر اس قدر قوی اثر کر چکا تھا کہ وہ کسی طرح اس سے باز نہ آئے۔ بغاوت اور غداری کی سزا شرعاً وعقلاً قتل ہے۔ وہ ایک باغی، غدار اور مفسد کی پرزور تائید کر رہے تھے۔ اسے تقویت پہنچانے کے ساتھ دوسروں کو بغاوت وغداری اور فساد فی الارض کی ترغیب دے رہے تھے۔ اس طرح وہ خود ان عظیم وقبیح جرائم ومعاصی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ وہ شرعاً مستوجب قتل تھے۔ حجاج نے جو انھیں سزائے موت دی تو اس کا یہ فیصلہ شرعاً وعقلاً ہر طرح جائز تھا۔ اسے ظلم کہنا خود ظلم ہے۔

سعید بن جبیر بہت بڑے درجہ کے عالم دین تھے، مجتہد تھے، اپنی ذاتی وانفرادی زندگی میں بہت متقی اور عابد و زاہد تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلامی قانون سے بالاتر ہو گئے تھے۔ شریعت اسلامیہ قانون سے کسی کے استثناء کی اجازت نہیں دیتی۔ قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔ کسی کو اس کی ذاتی زندگی کی پاکیزگی یا اس کے علم وفضل کی وجہ سے کسی جرم کی سزا سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ان کی مغفرت کے لیے دعا تو کرتے ہیں مگر انھیں اس جرم سے بری نہیں کہہ سکتے۔ اور ان کی اس معصیت کبیرہ کو طاعت وسعادت نہیں کہہ سکتے۔

Marfat.com

بکثرت لوگ اس مغالطہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انسان کی انفرادی زندگی اور اس کی اجتماعی زندگی دونوں میں ہمیشہ یکسانیت ہوتی ہے۔ جو شخص اپنی ذاتی اور انفرادی حیات میں متقی، عابد و زاہد ہوتا ہے اس کے متعلق عام طور پر لوگ یہ حسن ظن قائم کر لیتے ہیں کہ سیاسی میدان میں بھی اس کا ہر قدم زہد و تقویٰ کا پابند ہوگا۔ بکثرت ایسا ہوتا بھی ہے یعنی ایسے افراد بھی شاذ و نادر نہیں ہیں جن کا انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ جس طرح اپنی ذاتی زندگی میں متقی ہوتے ہیں اسی طرح اپنی اجتماعی زندگی مثلاً معاشرت، سیاست وغیرہ میں بھی تقویٰ ان کا شعار ہوتا ہے۔ اور وہ حبۃ للہ اخلاص کے ساتھ دین و ملت کی خدمت و نصرت کرتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بکثرت مثالیں اس کے برعکس بھی ملتی ہیں۔ تاریخ دیکھئے اور اپنے زمانہ کے حالات کا بغور مطالعہ کیجیے تو بہت بڑی تعداد ایسے اشخاص کی ملے گی جن کی انفرادی زندگی دینی اور اخلاقی نقطہ نظر سے بہت قابل تحسین و ستائش نظر آتی ہے مگر ان کا اجتماعی کردار مذموم دکھائی دیتا ہے۔

سعید بن جبیر بھی اسی قسم کے شخص تھے۔ بہت بڑے درجہ کے عالم دین تھے۔ اور ان کی انفرادی زندگی زہد و تقویٰ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مگر ذہن نے سبائی زہر پی لیا۔ بعض افکار بگڑے تو اجتماعی کردار میں بھی فساد پیدا ہوا اور اس نے تقوی و احتیاط کی سب حدود پار کر لیں۔ اسلامی حکومت و نظام حکومت کے خلاف اسلام ہی کا نام لے کر ایک باغی و غدار کی حمایت کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی بغاوت و غداری کی تحسین کر کے دوسرے لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دینے لگے۔ ان حالات میں حجاج کی حکومت کے بجائے کوئی دوسری حکومت ہوتی تو وہ بھی وہی کرتی جو حجاج نے کیا۔ اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ان کا یہ فیصلہ شرعاً و عقلاً و عرفاً ہر طرح جائز تھا۔ اس پر اعتراض کرنا اور اسے ظلم کہنا صحیح نہیں۔

خلافت بنی امیہ کے مخالفین و معاندین اور ان کی عظمت پر حسد کرنے والوں میں جو ذہین اور صاحب علم ہیں وہ اپنی کمزوری سے واقف ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ دلیل و برہان سے ہم اپنے دعوے کو ثابت نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ تشہیر اور پروپیگنڈے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ استدلال کے بجائے خطابت سے کام لینے کے لیے اس دور اور بعد کے دور کے متعدد علماء کے اقوال پیش کرنے لگتے ہیں کہ دیکھوں فلاں بزرگ نے حجاج کو ظالم و جابر کہا ہے۔ جیسے مودودی صاحب نے حضرت حسن بصری وغیرہ کے دو تین اقوال پیش کیے ہیں۔ سعید بن جبیر کے قتل کے بارے میں مخالفین خلافت نے یہی روش اختیار کی ہے۔ یہ لوگ اس حادثے کے متعلق بہت سے علماء و مشائخ کے منشور مرثیوں کا انبار لگا دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سعید بن جبیر کے قتل کی کیفیت و حالت کے متعلق جو افسانے، سبائیوں اور سبائیت نوازوں نے گھڑے ہیں انھیں بھی بانداز مرثیہ خانی بیان کرتے ہیں۔ ان غلط اور سبائیوں کی گھڑی ہوئی کہانیوں کی اس قدر تشہیر کی گئی کہ قدیم طرز کے مدارس عربیہ کے طلبہ میں ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ حالانکہ ان مدارس میں تاریخ کا مضمون داخل نصاب نہیں ہے۔ عہد عبدالملک کے بارے میں جو مضمون لکھا جاتا ہے تو اس میں حجاج کا تذکرہ اور اس قتل کے واقعہ کا ذکر کرنا اور اس کے ساتھ یہ لکھنا کہ ''سعید بن جبیر

Marfat.com

نے قبلہ کی طرف رخ کیا تو حجاج نے ان کا رخ ادھر سے پھروا دیا۔'' ضروری سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ محض افسانہ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ سبائی راویوں نے یہ جھوٹے قصے گھڑے ہیں جو بالکل بے اصل ہیں۔

اس مغالطہ انگیز استدلال کا اطمینان بخش جواب یہ ہے کہ اس واقعہ کا کسی مؤرخ یا عالم دین نے انکار نہیں کیا کہ سعید بن جبیر ابن الاشعث کی تائید کر رہے تھے اور صرف تائید ہی نہیں بلکہ لوگوں کو اس کی بغاوت و غداری میں شریک ہونے کی ترغیب دے رہے تھے۔ باوجود افہام و تفہیم اور استمالت وہ اس سے باز نہیں آئے۔ یہی ان کا جرم تھا جب جرم ثابت ہو گیا تو شرعاً وعقلاً ہر طرح ان کا قتل جائز قرار پایا۔ اس کے بعد مؤرخین اور علماء کا محض اپنے جذبات کی بناء پر اسے مذموم کہنا قطعاً قابل اعتماد نہیں اور ان کے جذباتی اقوال کو پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں دیا جا سکتا۔ جب دلیل شرعی سے ایک چیز کی صحت ثابت ہو گئی تو مؤرخین وعلماء کی ذاتی و جذباتی رائے کی بناء پر عدل کو ظلم اور صحیح کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔

اموی دور یا عباسی دور کے بعض علماء نے جو اس واقعہ پر مرثیہ خوانی کی ہے۔ اور اسے حجاج کا ظلم قرار دیا ہے، اس کے متعدد اسباب ہیں۔ مناسب ہے کہ یہاں ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ صرف سعید بن جبیر کے قتل کے معاملے میں نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے بہت سے مسائل کے بارے میں قاری سبائی مغالطوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔

ایک عام قانون نفسی اس کا پہلا سبب ہے۔ وہ یہ کہ بعض خصوصیات میں اشتراک کی وجہ سے جب بہت سے افراد کا ایک گروہ بن جاتا ہے تو ان میں ایک گروہی عصبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کبھی یہ اس قدر بڑھتی ہے کہ انسان اپنے زمرے کے آدمی کی حمایت میں جا و بے جا کی بھی کوئی پروا نہیں کرتا۔ پھر یہ کہ سعید بن جبیر کے شاگرد بھی بکثرت تھے۔ ان صورتوں کی وجہ سے جب وہ قتل کیے گئے تو علماء کے دل کو انھیں خطاوار جاننے کے باوجود صدمہ پہنچا اور اس لیے انھوں نے حجاج کی مذمت شروع کر دی اور عدل کو ظلم کہنے لگے۔

بغیر کسی تحقیق کے حجاج کو ظالم اور اموی خلفاء کو ستم گر کہنا اسلامی تاریخ پر ظلم ہے:

عباسی دور کے بعض علماء و مؤرخین نے شیعوں اور حکومت کو خوش کرنے کے لیے بنو امیہ پر الزامات و بہتانات لگانا مناسب اور نفع بخش خیال کر کے موقع بے موقع ان پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کی۔ اس سلسلہ میں حجاج کے خلاف زہر افشانی ناگزیر تھی۔ عباسی دور میں شیعوں کا زور اتنا بڑھ گیا تھا کہ ارباب حکومت کا قرب حاصل کرنے کے لیے شیعوں کو خوش رکھنا مفید بلکہ ایک حد تک ناگزیر معلوم ہوتا تھا۔ براہ راست حکومت کو خوش کرنے کے لیے بھی یہ ذریعہ مناسب معلوم ہوتا تھا۔ ہندوستان کے علماء نے عہد عباسی کے انھیں علماء کی تقلید کی اور بغیر کسی تحقیق کے حجاج کو ظالم و جابر اور اموی خلفاء کو ستم گر کہتے رہے اور بعض نے ان مطاعن کی حقیقت سے واقفیت کے باوجود اموی خلفاء اور ان کے عمال و حکام کو برا کہنا اپنا شعار بنا لیا۔ ان علماء اور مؤرخین اہل سنت

Marfat.com

کے اس طرز عمل کی نوعیت کا علم ہونے کے بعد حجاج یا خلفاء بنی امیہ کے بارے میں ان کی مذمت کا اعتبار کرنا اور اسے اسلامی تاریخ کو تاریک ثابت کرنے کے لیے دلیل بنانا عقل و دانش سے بے رخی، عدل و انصاف سے بے مہری اور اسلامی تاریخ پر ظلم ہے۔

جس طرح ابن الاشعث کی بغاوت اور غداری ایک فتنہ تھی۔ اسی طرح صفحات تاریخ میں اس کی حکایت بھی کسی حد تک ایک فتنہ ثابت ہوئی ہے۔ یوں تو مؤرخین کا بیان واضح ہے خصوصاً علامہ ذہبی نے تو بات بالکل صاف کر دی ہے اور یہ حقیقت خوب عیاں کر دی ہے کہ ابن الاشعث مذکور باغی اور غدار واجب القتل تھا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ان کے بیان سے بالکل عیاں اور الم نشرح ہو گئی کہ علماء و صلحاء اہل سنت قطعاً اس کی بغاوت و غداری میں شریک نہیں ہوئے۔ ایک دو علماء جن کا ذہن سبائی زہر سے متاثر و مسموم ہو گیا تھا۔ اس کے موید ہو گئے تھے مگر ایک دو عالموں کی تائید و شرکت کو علماء کی شرکت نہیں کہہ سکتے۔ ان کی کتاب تاریخ الاسلام سے چند صفحات پہلے یہ سب باتیں نقل کی جا چکی ہیں، مگر جس عبارت کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس کے آخر میں ایک جملہ ایسا بھی ہے جس سے مخالفین خلافت بنی امیہ ناواقفوں کو مغالطہ دینے کا کام لے سکتے ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ اس کی وضاحت بھی کر دی جائے۔

علامہ ذہبی، عبدالرحمٰن ابن الاشعث کی غداری اور پھر اس کا عسکر خلافت سے شکست کھا کر ''بست'' کی طرف فرار، اس کے لشکر کا منتشر ہو جانا اور اس کا ساتھ چھوڑ دینا، عامل بست کا (جسے خود ابن الاشعث ہی نے مقرر کیا تھا) اسے گرفتار کر لینا۔ ان سب امور کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں کہ اس موقع پر رتبیل اپنا لشکر لے کر آیا اور عامل بست کو جنگ و قتل کی دھمکی دے کر ابن الاشعث کو رہائی دلائی اور اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

وكان مع ابن الاشعث عدد كثير من الاشراف والكبار ممن لم يثق بامان الحجاج۔

''اور ابن اشعث کے ساتھ بہت سے معززین اور بڑے لوگ تھے، جنھیں حجاج کے وعدہ امان کا اعتبار نہیں ہوا'' (مطلب یہ ہے کہ وہ بھی ابن الاشعث کے ساتھ رتبیل کے یہاں چلے گئے)

اس عبارت سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید علماء کی ایک کثیر تعداد ابن الاشعث کی ہم نوا ہو گئی تھی لیکن یہ شبہ بوجوہ ذیل بالکل غلط ہے:

(۱) اس میں اشراف'' و ''کبار'' کے الفاظ ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو سوسائٹی میں اعتبار رکھتے تھے، اور انھیں عوام سے نسبتاً اونچا درجہ دیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کا عالم دین ہونا ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ بڑے تاجر یا کسی بڑی جائیداد کے مالک ہوں یا کسی جگہ کے سیاسی یا معاشرتی لیڈر ہوں۔ ''شریف'' و ''کبیر'' ہونے کے لیے کسی زمانہ میں بھی عالم دین ہونا ضروری نہیں تھا۔ اس سے ان کا زمرۂ علماء

Marfat.com

میں سے ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علماء میں سے نہیں تھے۔ اگر علماء ہوتے تو مورخین ضرور ان کا تذکرہ ''علماء'' کے لقب کے ساتھ کرتے۔

(۲) "ممن لم یثق بامان الحجاج" کے الفاظ سے عیاں ہے کہ حجاج نے انھیں امان دے کر واپسی کی اجازت دے دی تھی۔ مگر امان کا مطلب تو یہی ہے کہ ان لوگوں نے ابن الاشعث کی بغاوت و غداری سے اپنی برأت و بے تعلقی ظاہر کی تھی۔ حجاج نے ان کی بات کا یقین کیا اور انھیں امان دے دی۔ اس سے روشن ہے کہ یہ لوگ بھی ابن الاشعث کے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک وہ کفار کے مقابلہ میں جنگ کرتا رہا۔ جب اس نے غدر کیا اور باغی ہو کر کافروں سے مل گیا تو ان ''اشراف'' و ''کبار'' نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس لیے علامہ ذہبی کی اس عبارت سے ابن الاشعث کی بغاوت و غداری میں علماء و صلحا کی شرکت ثابت کرنے کی کوشش کرنا افسوس ناک مغالطہ دہی اور فریب کاری ہے۔

حجاج کی عظیم القدر خدمات:

حجاج نے قرآن مجید کی جو عظیم القدر خدمت انجام دی اس کا اعتراف سبھی مورخین نے کیا۔ مودودی صاحب نے بھی لکھا ہے:

''قرآن پر اعراب لگوانا اس کی وہ نیکی ہے، جس کی تعریف رہتی دنیا تک کی جائے گی۔''

(خلافت وملوکیت: ص۱۸۶)

حجاج کی یہی نیکی سبائیوں کی شدید عداوت کا سبب بن گئی۔ قرآن مجید سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہو چکا تھا اور اس دور تک تواتر کے ساتھ پہنچا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں حفاظ اور ہزاروں کی تعداد میں قرآن مجید کے نسخے موجود تھے۔ ان سب کی تعداد روز افزوں تھی لیکن اس مکتوب قرآن مجید پر اعراب یعنی زیر زبر پیش نہیں لگے ہوئے تھے۔ قرآن مجید میں کسی تحریف کا تو امکان باقی نہیں رہا تھا لیکن اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں سبائی عجمی نو مسلموں کو فریب دے کر اعراب کی غلطیوں میں نہ مبتلا کر دیں۔ نیز اس سے جو اختلاف پیدا ہوا اس کی اشاعت کر کے قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے بارے میں دین سے ناواقف نومسلموں کے دلوں میں شکوک وشبہات نہ پیدا کر دیں۔ اس خطرے کا احساس حجاج نے کر لیا اور قرآن پر اعراب لگوا کر اس کی حفاظت کے لیے ایک اور مضبوط حصار کا اضافہ کر دیا۔ جس کی وجہ سے قرآن مجید میں اختلاف کا شبہ پیدا کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں باقی رہا۔

حجاج کے اس اقدام سے سبائیوں کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ یہ دشمنان قرآن تو اسی فکر اور کوشش میں لگے رہتے تھے کہ موقع نظر آئے تو قرآن مجید میں تحریف نہیں تو شبہ تحریف پیدا کر کے سب مسلمانوں کو

Marfat.com

نہ سہی، کم از کم نومسلموں کے ایک گروہ کو تو گمراہ کر دیں۔ حجاج نے ان سب کو مایوس کر دیا۔ اس مایوسی نے ان کے دل میں اس کے خلاف عداوت کا شعلہ بھڑکا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دشمنان قرآن و کارکنان امت سبائیہ نے اس کے خلاف پیٹ بھر کر جھوٹ بولا ہے، اور پیالہ بھر کر زہر اگلا ہے۔ سبائی اور ان کے معاون خوب سمجھ گئے کہ قرآن مجید میں تحریف غیر ممکن ہے۔ لیکن انھوں نے سوچا کہ پورے قرآن مجید کو نہ سہی اس کے کسی چھوٹے سے جزو ہی کو مشکوک بنا دیں۔ اس کے لیے انھوں نے یہ تدبیر کی کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف اختلاف قرأت کے نام سے بعض قرأتیں منسوب کر دیں جو قرأت متواترہ سے بالکل مختلف تھیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف جو قرأت، متواترہ قرأت کے خلاف منسوب ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ ان کے اس کید و فریب کو مٹانے کے لیے اور اہل ایمان کو بچانے کے لیے انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مبینہ قرأت کا پڑھنا اور لکھنا قانوناً ممنوع قرار دیا۔ اس کا یہ اقدام ہر طرح مستحسن اور لائق تعریف و ستائش ہے۔ مگر ایک گروہ اس واقعہ کو ان کا عیب کہتا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب لکھتے ہیں:

> ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو وہ سردار منافقین کہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ اگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ مجھے مل جاتے تو میں ان کے خون سے زمین کی پیاس بجھاتا۔ اس نے اعلان کیا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت پر کوئی شخص قرآن پڑھے گا تو اس کی گردن مار دوں گا۔ اور مصحف میں سے اس کی قرأت کو اگر سور کی ہڈی سے بھی چھیلنا پڑے تو چھیل دوں گا۔''

''سور کی ہڈی سے چھیلنا'' اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شان میں بے ادبی کرنا، روافض کا افتراء اور بہتان ہے۔ ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بھی یہ بہتان باندھا ہے کہ ''انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو پٹوایا جس سے انھیں ''ہرنیا'' (آنت اترنے) کا مرض ہو گیا۔''

یہ سب خود ساختہ روایتیں ہیں۔ صحیح بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مبینہ قرأت پڑھنے اور اشاعت و تعلیم کی سختی کے ساتھ ممانعت کر دی تھی۔ ان کا یہ فعل حد درجہ قابل تحسین ہے۔ اس کا مقصد قرآن مجید کی حفاظت تھا۔ سبائی ذہن رکھنے والوں کا اس پر اعتراض کرنا اس کی دلیل ہے کہ عداوت بنی امیہ کی شدت نے ان کی عقل و فہم کو ماؤف کر دیا ہے کہ خوبی کو برائی کہہ رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف قرأت متواترہ کے خلاف جو قرأت منسوب کی جاتی ہے وہ ان پر بہتان و افتراء ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم مثلاً ابن عمر رضی اللہ عنہ یا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کی طرف اسی قسم کی جو قرأتیں منسوب کی جاتی ہیں وہ قطعاً ان بزرگوں پر بہتان و افتراء ہیں، یہ حضرات اس سے بری ہیں۔ اس قسم کی سب روایتیں قطعاً باطل، کذب و دروغ اور مفسدوں کی وضع کردہ ہیں۔ قرآن مجید تواتر سے ثابت ہے اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے۔ خبر واحد سے کسی لفظ کا جزو قرآن ہونا قطعاً ثابت نہیں ہو سکتا۔ اسے قرآن یا اس کا جزو سمجھنا اس کی گمراہی اور ضلال ہے۔ کوئی عقل سلیم اس امر کو باور نہیں کر سکتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنھوں نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

Marfat.com

قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ کیا وہ ساری عمر کسی آیت کی تلاوت میں غلطی کرتے رہے؟ اور ان الفاظ کو الفاظ قرآن سمجھتے رہے جو درحقیقت قرآن کے الفاظ نہیں ہیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس موقع کے ان الفاظ سے مختلف ہیں جو ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم پڑھتے تھے۔

یہ بھی یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف ایک کتاب مسمی بقرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں دے دی تھی، کہ وہ جیسے چاہیں اسے پڑھتے رہیں۔ بلکہ آنحضور علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام نے قرآن مجید کی باقاعدہ تعلیم دی تھی۔ پھر کیا آنحضور ﷺ نے کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ پڑھایا تھا۔ جس قرآن کی تعلیم عام آپ ﷺ نے دی تھی جو ہزاروں نے آپ سے حاصل کی تھی اور جو تواتر کے ساتھ منقول ہے، کیا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ (یا دو تین مزید صحابہ، جن کی طرف اس قسم کی قرأتیں منسوب کی جاتی ہیں) کو اس کے خلاف تعلیم دی تھی؟ کوئی عقل سلیم اسے باور نہیں کرسکتی کہ آنحضور ﷺ نے تعلیم کتاب میں یہ تفریق فرمائی ہو۔

اسی طرح عقل اسے بھی باور نہیں کرسکتی کہ یہ حضرات نبی اکرم ﷺ سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عمر بھر غلطی میں مبتلا رہے۔ حالانکہ ان کے ہزاروں ساتھی قرآن مجید پڑھتے اور سنتے رہتے تھے مگر انھوں نے ان کی قرأت سن کر بھی اپنی غلطی کی اصلاح نہ کی۔ اور ان میں سے بھی کسی نے انھیں ان کی غلطی پر نہیں ٹوکا۔ حاصل بحث یہ کہ یہ اختلاف قرأت کی روایتیں جو اخبار آحاد ہیں اور ان میں بھی ضعاف بلکہ درحقیقت موضوع، جعلی، دشمنان قرآن کی وضع کی ہوئی ہیں، ان سے قرآن کریم کی جو قرأتیں معلوم ہوتی ہیں، ان کا لکھنا اور پڑھنا اور انھیں قرآن مجید کی قرأت سمجھنا، نیز ان نام نہاد قرأتوں کو ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کرنا قطعاً حرام اور ممنوع ہے۔ اگر ایسی قرأتوں کو لکھنے اور پڑھنے سے حجاج نے منع کر دیا تھا تو کیا برا کیا؟ اس پر اعتراض کرنا اس بات کی واضح علامت ہے کہ معترض کے دل میں قرآن مجید کی وہ عظمت اور وقعت نہیں ہے جو ایک مؤمن کے دل میں ہونا چاہیے۔

تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجاج حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت عقیدت رکھتے تھے۔ امیر المؤمنین عبدالملک نے بھی انھیں حضرت موصوف کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ حجاج ہمیشہ اس پر عامل رہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ انھوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کی دھمکی دی، کسی طرح قابل یقین نہیں۔ اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ، اور سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دینے، ان کی گردن پر مہریں لگوانے کی کہانی اور اسی قسم کے دوسرے قصے سبائیوں کے گھڑے ہوئے قصے ہیں۔ اور سبائی کارخانہ دروغ بافی کے تیار کیے ہوئے جھوٹے افسانے ہیں۔ یہ تاریخی خبریں نہیں ہیں بلکہ سبائی پروپیگنڈہ اور تشہیر ہے۔ جن کو شیعہ مؤرخین طبری، ابن اسحاق وغیرہ نے بہت شوق سے اپنی کتابوں میں اکٹھا کرلیا۔ پھر کچھ جھوٹ اور دروغ اپنی طرف سے اس میں ملا کر پروپیگنڈے کا ذہنی زہر تیار کیا۔ اس قسم کی سب روایات میں کوئی نہ کوئی سبائی راوی ضرور ملے گا۔ کبھی بغیر تقیہ اور کبھی نقاب تقیہ ڈالے ہوئے۔ اکثر و بیشتر تو یہ روایتیں مشہور کذاب و مفتری، ابومخنف کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ سنی

Marfat.com

مؤرخین مثل ابن کثیر وابن اثیر تاریخ لکھنے بیٹھے تو انھوں نے ''نقل راچہ عقل'' پر عمل کیا۔ یہ تاریخ کے ذوق اور اس کے سلیقے سے محروم تھے۔ انھیں صرف روایتوں کا انبار لگانا آتا تھا۔ سبائی پروپیگنڈے کے اثرات ان کی تاریخوں بلکہ ان کی دوسری کتابوں میں بھی نمایاں ہیں۔

بنوامیہ اور بنوعباس دونوں کے خلاف اس قسم کی غلط روایتیں مشہور کر کے اور معاندانہ جھوٹا پروپیگنڈہ کر کے سبائیوں نے عوام اہل سنت کو بھی ان سب کے خلاف بدگمان کر دیا تھا۔ عوام کے گمان واعتقاد کے خلاف زبان کشائی بڑی ہمت کا کام ہے۔ ایسے علماء تو بہت سے ملتے ہیں، جنھوں نے حکومت کے خلاف جرأت کے ساتھ بات کہی ہو لیکن ایسے علماء کی تعداد اقل قلیل ہے جنھوں نے عوام کے رجحانات کے خلاف زبان کھولی ہو۔ ہم نے اچھے اچھے علماء کبار کو دیکھا کہ ''خوف فتنہ'' کی آڑ لے کر عوام کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔ شیعوں نے پیہم پروپیگنڈے سے عوام کے ذہن کو مسموم کر دیا تھا۔ اس لیے وہ علماء ومؤرخین جنھوں نے بنوامیہ و بنوعباس کی خلافتوں پر اعتراضات کیے ہیں اور ان پر ''تبرا'' بھیجا ہے، ان میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا ہے، تاکہ عوام ان کے مخالف نہ ہو جائیں۔ ان علماء کی آراء اور اس موضوع پر ان کی روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم انھیں درایت کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی قبول یا رد کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے قرائن کی شہادت لازم ہے۔ تاریخ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ زیر بحث قسم کی جتنی روایتیں اور کہانیاں تاریخ میں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی درایت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی، اور قرائن کی شہادت ہمیشہ ان کے خلاف ہوتی ہے۔ جس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ کہانی کسی کارخانۂ دروغ بافی کی مصنوعہ اور کسی سبائی کی گھڑی ہوئی ہے اور اس سے کذب آفرینی، افتراء پردازی، بہتان طرازی کا سبائی آرٹ خوب نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کے متعدد نمونے ہم صفحات سابقہ میں پیش کر چکے ہیں۔ فاضل قاری ان مثالوں اور نمونوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد سبائیوں اور سبائی نوازوں کے باقی اعتراضات کی غلطی اور لغویت بھی انھیں مثالوں پر قیاس کر کے معلوم کر سکتے ہیں۔

خادم قرآن کریم، حجاج بن یوسف مرحوم ومغفور کے دو احسانات پوری امت پر ایسے ہیں جن کے بارے میں سبکدوش ہونا اس کے لیے ممکن نہیں۔ ان میں ایک قرآن کریم پر اعراب لگوا کر اس کی حفاظت اور اس کی اشاعت کرنا ہے۔ دوسرا سرزمین ہند تک اسلام پہنچانا ہے۔ یہ ان کے ایسے احسانات عظیمہ ہیں کہ جن کا اعتراف کرنے پر ان کے مخالفین بھی مجبور ہیں۔ لیکن ان کی یہی خوبی دشمنان قرآن اور دشمنان اسلام کے نزدیک بہت بڑا عیب تھا۔ اس لیے وہ حجاج کے سخت دشمن ہو گئے اور انھیں غلط اور لغو اعتراضات کا نشانہ بنایا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا معاملہ:

حجاج پر ایک اعتراض حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنا ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے یہ اعتراض غلط ہے۔ حجاج امیر المؤمنین عبدالملک کی طرف سے گورنر تھے۔ اور انھیں خلیفۃ المسلمین تسلیم کرتے تھے۔ اور حضرت

Marfat.com

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو باغی جانتے تھے۔ قرآن مجید میں صاف صاف باغی سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واقع کے اعتبار سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ باغی تھے یا نہیں؟ یہ مسئلہ الگ ہے۔ لیکن حجاج انھیں باغی ہی سمجھتے تھے۔ اور انھیں باغی ہی سمجھ کر ان سے جنگ کی۔ اس لیے شرعاً ان کے اوپر کوئی الزام نہیں ہے۔ اس اعتراض کے ساتھ جو حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔ مثلاً سیدنا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی لاش کی تدفین سے مانع ہونا اور اس کا بے گور و کفن کئی دن پڑا رہنا، یا سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کی شان میں بدزبانی یا خانۂ کعبہ پر پتھر برسانا وغیرہ۔ یہ مخالف بنی امیہ مورخین اور راویوں کے گھڑے ہوئے طبع زاد جھوٹے افسانے ہیں۔ جن کا کوئی قابل اطمینان ثبوت نہیں بلکہ درایت اور قرائن ان کی تردید کرتے ہیں۔

مودودی صاحب نے اگر زیر بحث مسئلہ پر علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کی کتاب ''النقد علی تاریخ التمدن الاسلامی'' کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو شاید وہ سبائیوں اور یہود و مستشرقین کے ان اعتراضات کا تذکرہ کرنے کی جسارت نہ کرتے۔ اگر انھوں نے کتاب مذکور دیکھی ہے تو ان کا ان غلط الزاموں کو دہرانا بہت ہی تعجب خیز اور افسوس ناک ہے۔ یہ الزام غلط ہیں اور ان کا کوئی اطمینان بخش ثبوت قیامت تک نہیں پیش کیا جا سکتا۔ آئندہ سطور میں ان پر تفصیلی بحث اور ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب ملاحظہ ہو:

(۱) مودودی صاحب حجاج کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس ظالم نے عین حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ پر چڑھائی کی جبکہ زمانہ جاہلیت میں کفار و مشرکین بھی جنگ سے ہاتھ روک لیتے تھے۔'' (خلافت و ملوکیت: ص ۱۸۵)

کتب تاریخ متفق ہیں کہ حج کے زمانہ میں حجاج کی طرف سے کوئی جنگ نہیں کی گئی۔ یکم ذی الحجہ سے محاصرہ کر لیا گیا تھا، جنگ نہیں کی گئی۔ پورے اشہر حرم میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ جنگ محاصرہ شروع ہونے سے پانچ ماہ بعد جمادی الاولیٰ میں ہوئی بلکہ بنظر غائر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کوئی جنگ ہوئی ہی نہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

قال الواقدی حدثنی معصب بن نائب عن مولی اسد وکان عالما بفتنة ابن الزبیر قال: حصر ابن الزبیر لیلة هلال الحجة سنة ثنتین و سبعین فکان حصر الحجاج له و خمسة اشهر سبع عشرة لیلة۔ (البدایہ والنہایہ: ۳۲۹/۸)

''واقدی کا بیان ہے کہ مجھ سے معصب بن نائب نے بروایت (نافع) مولیٰ اسد (وہ ابن زبیر سے خوب واقف تھے) بیان کیا کہ (حضرت) ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کا محاصرہ ذی الحجہ ۷۲ھ کی چاند رات سے شروع ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ حجاج نے یہ محاصرہ پانچ ماہ اور سترہ راتوں تک جاری رکھا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کے زمانہ میں محاصرہ جاری رہا، کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ جنگ کرنے کا الزام معترض نے اپنی طرف سے تراشا ہے، جو بالکل غلط ہے۔ حافظ ابن کثیر اس عبارت میں پانچ ماہ کے

Marfat.com

''محاصرے'' کا تذکرہ کرتے ہیں، جنگ کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔

حضرت حسن بصری کے حوالے سے موصوف لکھتے ہیں:

''تیسرا واقعہ وہی ہے جس کا حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے آخر میں ذکر کیا ہے۔ مدینہ سے فارغ ہونے کے بعد وہی فوج جس نے رسول اللہ ﷺ کے حرم میں یہ اودھم مچایا تھا، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے لڑنے کے لیے مکہ پر حملہ آور ہوئی۔ اور اس نے منجنیق لگا کر خانہ کعبہ پر سنگ باری کی جس سے کعبہ کی ایک دیوار شکستہ ہوگئی۔ اگرچہ روایات یہ بھی ہیں کہ انھوں نے کعبہ پر آگ بھی برسائی تھی۔ لیکن آگ لگنے کے کچھ دوسرے وجوہ بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ البتہ سنگ باری کا واقعہ متفق علیہ ہے۔''

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی طرف اس سراپا کذب و دروغ بیان کی نسبت بالکل غلط ہے۔ یہ جس طرح حجاج مرحوم اور ان کے لشکر پر بہتان وافتراء ہے، اسی طرح حضرت حسن بصری رحمہ اللہ پر بھی بہتان وافتراء ہے۔ کذاب راویوں نے یہ جھوٹ گھڑا۔ واقعیت سے اس کا ادنیٰ سا تعلق بھی نہیں۔ غلاف کعبہ شریف میں آگ لگنے کے متعلق مقبول اور معروف روایت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ والوں میں سے کسی نے موصوف کی اجازت سے کسی ضرورت سے حرم شریف میں آگ جلائی تھی۔ اس کی کوئی چنگاری اڑ کر غلاف کعبہ پر پڑ گئی۔ جس سے اس میں آگ لگ گئی جو فوراً بجھا دی گئی۔ اس میں حجاج یا ان کے لشکر کا کیا قصور تھا؟ یہ ایک اتفاقی واقعہ تھا جس کی ذمہ داری کسی شخص پر بھی نہیں ڈالی جا سکتی۔ سبائی راویوں اور مؤرخوں نے اس معمولی سی خبر کو اپنے قلب کی سیاہی میں رنگ کر پیش کیا ہے۔ یہ روایت بھی اس صورت میں ہے جب آگ لگنے کا واقعہ بھی ثابت ہو۔ حق یہ ہے کہ اگر اصول روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو نفس آگ لگنا ہی ثابت نہیں اور آگ لگنے کا قصہ ہی سرے سے سبائیوں کا تصنیف کیا ہوا جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ ''کعبہ پر آگ برسانے'' کا الزام تو سراسر بہتان وافتراء اور بے بنیاد جھوٹ ہے۔ سبائی راویوں اور مؤرخین کے پروپیگنڈے کے سوا اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ اس کے غلط اور جھوٹے ہونے پر دلائل قائم ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

اولاً: معترضین کہتے ہیں کہ جبل ابی قبیس پر منجنیق نصب کر کے آتش باری کی گئی۔ آپ خود حج یا عمرے کے لیے جا چکے ہوں تو فبہا ورنہ کسی پڑھے لکھے سمجھدار حاجی سے پوچھیے کہ جبل ابی قبیس کا فاصلہ مسجد حرام سے کتنا ہے؟ اور پھر اندازہ کر لیجیے کہ کیا اتنے فاصلہ سے مسجد شریف کے اندر تک کوئی شعلہ آتش پہنچایا جا سکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اتنی دور سے شعلہ نشانہ مذکورہ تک پھینکنا غیر ممکن ہے۔ اس لیے آگ پھینکنے کی روایت بالکل غلط اور کذب و دروغ ہے، جو بغض صحابہ و بعض بنی امیہ سے مغلوب سبائیوں اور سبائی نوازوں نے وضع کی ہے۔

ثانیاً: چند سطور کے بعد ہم اس خلفشار کے دوران مکہ معظمہ کے حالات ''البدایہ والنہایہ'' سے ان شاء اللہ نقل کریں گے۔ ان پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاج کی فوجیں مسجد حرام کے دروازوں کے

Marfat.com

قریب تک پہنچ چکی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ انھیں منتشر کر دیتے تھے وہ پھر جمع ہو جاتی تھیں۔ اگر آگ مسجد حرام کے اندر پہنچ سکتی تھی تو ان کے اوپر بھی گر سکتی تھی اور ان کے جسم ولباس میں بھی آگ لگ سکتی تھی۔ تو کیا حجاج اپنی ہی فوج کو جلانا چاہتے تھے؟ اس سے عیاں ہے کہ کعبہ پر آگ پھینکنے کی روایت بالکل غلط اور سراپا کذب وافتراء ہے۔ اس سراپا کذب روایت کو مختلف فیہ کہنا بڑی افسوس ناک جسارت ہے۔ اس کے غلط ہونے پر ان سب اہل سنت کا اتفاق ہو جو سبائیت سے متاثر نہیں ہیں۔ اور جن کے دل اہل ایمان کے ساتھ بغض وعداوت اور حسد رکھنے کی ظلمت سے پاک ہیں۔ اس روایت کو سامنے رکھنے سے کعبہ شریف پر منجنیق سے پتھر پھینکنے کی من گھڑت روایت کا غلط اور مکذوبہ ہونا بھی واضح ہو جاتا ہے۔

حجاج کے لشکر کے آدمی مسجد حرام کے دروازوں کے قریب تک آئے تھے تو کیا ان کی منجنیقیں خود اپنے لشکر والوں پر پتھر پھینکتی تھیں؟ اگر منجنیق سے کعبہ شریف پر پتھر پھینکے جاتے تو کیا اس کا خطرہ نہیں تھا کہ وہ مسجد حرام شریف سے باہر گریں اور خود حجاج کے لشکر والوں ہی کے لیے جان لیوا ثابت ہوں؟ علاوہ بریں بیت اللہ کا طواف کسی وقت بھی موقوف نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ لوگ ہر وقت طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ واقعہ مشہور ومعروف اور سیکڑوں مشاہدوں سے ثابت اور عام طور پر اہل اسلام میں تسلیم شدہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد سے کسی وقت بھی مطاف خالی نہیں رہتا اور کچھ نہ کچھ لوگ طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ اس سے صرف وہ وقت مستثنیٰ ہے جس میں کوئی فرض نماز ادا کی جاتی ہو۔ اگر کعبہ شریف پر منجنیق سے پتھر پھینکے جائیں تو طواف کرنے والوں کے زخمی ہونے یا مرنے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ طواف پر کسی طرف سے بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ طواف کرنے والوں میں حجاج کے لشکر والے بھی ہوتے تھے۔ اس سال خود حجاج امیر الحجاج تھے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

فلما دخل ذوالحجة حج بالناس الحجاج فی هذا السنة۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۳۴۵/۸)

''ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہوا تو حجاج نے اس سال لوگوں کو حج کرایا۔''

گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے کہ عبدالملک رحمہ اللہ نے حجاج کو حکم دیا تھا کہ وہ مناسک حج کے مسائل میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے احکام پر عمل کریں۔ اگر بقول مؤرخین دروازۂ کعبہ شریف پر دوران حج سنگ باری ہوتی رہتی تھی تو حجاج اور ان کے ساتھیوں نے طواف کیسے کیا؟ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کعبہ شریف پر اور مسجد حرام کے اندر سنگ باری کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کیسے گوارہ کیا؟ کیا یہ الحادفی الحرم نہیں ہے؟ اور کیا تعظیم شعائر اللہ مناسک کے حدود سے بالکل خارج اور ان سے کلیۃً بے تعلق ہے؟ اگر نہیں تو یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔ اگر نکیر کی ہوتی تو شہرت کے ساتھ منقول ہوتی۔ لیکن اس قسم کی کوئی چیز ہمیں نہیں ملتی۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کعبہ شریف پر سنگ باری کی

Marfat.com

روایت بالکل جھوٹی، موضوع، اور سبائیوں یا سبائیت نوازوں کی گھڑی ہوئی ہے۔ اور حجاج اور ان کے لشکر والوں پر روافض کا افتراء و بہتان ہے۔

تصادم کی ابتداء:

عبدالملک رحمہ اللہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے درمیان تصادم کی ابتداء جمادی الاولیٰ ۷۲ھ میں ہوئی تھی اور جمادی الاولیٰ ۷۳ھ میں حضرت ابن زبیر کی شہادت پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ گویا اس کی ابتداء اور انتہا کے درمیان ایک سال کا فاصلہ ہے۔ اس ایک سال کے واقعات متعلقہ کی کیفیت حافظ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھی ہے۔ ۷۲ھ کے احوال کے بیان میں انھوں نے لکھا ہے کہ امیر المومنین عبدالملک رحمہ اللہ نے حجاج کو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔

فبعثه فی جیش کثیف من اهل الشام وکتب معه امانا لاهل مکة ان هم اطاعوه۔

''انھیں (حجاج کو) اہل شام کا ایک بڑا لشکر دے کر روانہ کیا اور اہل مکہ کے لیے امان نامہ بشرط اطاعت لکھ کر انھیں دے دیا۔'' (البدایہ والنہایہ: ۸/۳۲۵)

پھر لکھتے ہیں کہ حجاج دو ہزار شامیوں کا لشکر لے کر گئے اور طائف کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا:

''حجاج نے طائف میں قیام کر کے عرفہ کی طرف لشکر بھیجنا شروع کیے۔ ادھر سے ابن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے سواروں کو بھیجتے تھے اور ادھر سے حجاج اپنے سوار بھیجتے تھے۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے سواروں کو شکست ہو جاتی تھی اور حجاج کے سوار غالب رہتے تھے۔'' (البدایہ والنہایہ: ۸/۳۲۵)

ان مقابلوں میں سے کسی معرکہ کا حرم شریف کے اندر ہونا کہیں سے بھی ثابت نہیں ہے۔ ذوالحجہ سے پہلے ہی یہ جنگ بند ہو گئی۔ اور محاصرہ کی ابتداء ہوئی۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:

ثم کتب الحجاج الی عبدالملک یستاذنه فی دخول الحرم و محاصرة ابن الزبیر رض۔

''پھر حجاج نے عبدالملک کو لکھا کہ انھیں حرم میں داخل ہونے اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کرنے کی اجازت دی جائے۔''

واقدی کی روایت بحوالہ ابن کثیر رحمہ اللہ اوپر نقل ہو چکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصرہ ذی الحجہ کی چاندرات سے شروع ہوا۔ اس سال حج کے حالات میں لکھتے ہیں:

''ذوالحجہ کا مہینہ آیا تو اس سال لوگوں کو حجاج نے حج کرایا اور حجاج اور ان کے ساتھیوں نے جب عرفہ میں وقوف کیا تو مسلح رہے۔ اسی طرح عرفات کے بعد والے مشاعر میں بھی یہ سب مسلح رہے۔ اور

Marfat.com

ابن زبیر رضی اللہ عنہ محصور رہے، وہ اس سال حج نہ کر سکے مگر یوم النحر میں اونٹوں کی قربانی کی اور اسی طرح ان کے بہت سے ساتھی بھی حج نہیں کر سکے۔" (البدایہ والنہایہ: ۳۲۵/۸)

ملحوظ رہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں پر جن کا تذکرہ اس روایت میں ہے حج فرض نہ تھا۔ اپنا حج فرض یہ بہت پہلے ادا کر چکے تھے، بلکہ اس کے بعد بکثرت نفل حج کر چکے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے اس سال حج نہیں کیا۔ حجاج کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رفقاء میں سے کثیر تعداد نے حج نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض نے حج کیا۔ اگر حجاج کی طرف سے کوئی امر مانع ہوتا تو ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے بعض رفقاء کیسے حج کرتے؟ علاوہ بریں حضرت موصوف قربانی کیسے کرتے؟ حج کرنے والے حجاج کے لشکر کے لوگ اور دوسرے باہر کے لوگ تھے جو اس معاملہ میں بالکل غیر جانبدار تھے۔ امیر الحجاج خود حجاج بن یوسف تھے جو لشکر کے سپہ سالار بھی تھے۔ اور وہ مناسک کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے تابع فرمان تھے۔ سوال یہ ہے کہ لشکر حجاج کے لوگ تو حج، طواف، سعی وغیرہ میں مشغول تھے، تو پھر اس موقع پر سنگ باری کون کر رہا تھا؟ مخالفین کہتے ہیں کہ پہاڑ پر منجنیق نصب کر لی گئی تھی اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مطاف، مسجد حرام، مسعی (صفا و مروہ کے درمیان) وغیرہ مقامات متبرکہ میں تو حجاج کا لشکر پھیلا ہوا تھا اور خود حجاج بھی موجود تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی انھیں کے ساتھ تھے۔ پھر یہ سنگ باری کیا یہ لوگ اپنے ہی اوپر کر رہے تھے؟ اور کیا حجاج نے اپنا اور اپنے لشکر والوں نیز غیر جانبدار لوگوں کا سر پھوڑنے کا حکم دیا تھا؟ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء تو وہاں موجود ہی نہیں تھے۔ پھر یہ سنگ باری کس پر ہو رہی تھی؟

تیسرا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس الحاد فی الحرم کو کس طرح گوارا کیا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسے دیکھتے اور کوئی نکیر نہ کرتے۔

ان واضح امور پر نظر کرنے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ کعبہ شریف پر آتش باری کی کہانی کی طرح اس پر سنگ باری کرنے کی کہانی بھی بالکل غلط اور سرتاپا جھوٹ ہے۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ حرم کعبہ مکرم کے اندر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ یہ کہنا کہ "مکہ معظمہ پر حجاج نے حملہ کیا" قطعاً غلط ہے۔ ان پر اور ان کے لشکر پر یہ الزام قطعاً بہتان و افتراء ہے۔ طبری نے اپنے رفض کی وجہ سے سبائیوں کی مشہور کی ہوئی یہ جھوٹی افواہ اپنی کتاب میں درج کر لی۔ ابن اثیر خبر و روایت کے بارے میں غیر محتاط ہیں۔ حدیث میں بھی وہ احتیاط نہیں کرتے چہ جائیکہ تاریخ میں انھوں نے بغیر سوچے سمجھے طبری سے من گھڑت کہانیاں نقل کر دیں اور دل میں "دروغ برگردن راوی" کہہ کر مطمئن ہو گئے۔ "نقل راچہ عقل" پر عمل ایک مؤرخ کے لیے بہت بڑا نقص ہے۔ وہ سبائی تو نہیں ہیں لیکن ان کی تالیفات دیکھ کر قاری ان کے ساتھ اس نقص سے بھی انکار کر سکتا کہ ان کے ذہن پر رفض کا خفیف سا اثر موجود ہے۔ بنو امیہ کے ساتھ ان کا عناد، اور ان کے دل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

Marfat.com

کی قدر وعظمت کی کمی، ایسی چیزیں ہیں جو ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کی یہ کمزوریاں اس درجہ کی نہیں ہیں کہ انھیں سبائی کہا جا سکے۔ اس سے کم درجہ کی ہیں اسی لیے ہم انھیں سبائی نہیں کہتے مگر یہ زیر بحث قسم کے حوادث واخبار کے بارے میں ان کی تاریخ پر بے اعتمادی پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

حصار پر کچھ مدت گزری تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے رفقاء ان کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وما زال اهل مكة يخرجون الى الحجاج بالامان ويتركون ابن الزبير حتى خرج اليه قريب من عشرة آلاف فامنهم و قال اصحاب ابن الزبير جداً، حتى خرج الى الحجاج حمزة وخبيب ابنا عبدالله بن الزبير فاخذا لا نفسهما امانا من الحجاج فامنها۔ (البدایہ والنہایہ: ۳۳۰/۸)

"اہل مکہ برابر حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ کر حجاج کے پاس ان سے امان لے کر پہنچتے رہے۔ یہاں تک تقریباً دس ہزار آدمی نکل گئے اور ان سب کو (حجاج نے) امان دے دی۔ اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت کم رہ گئے۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے حمزہ اور خبیب بھی حجاج کے پاس پہنچ گئے اور ان دونوں نے اپنے لیے امان حاصل کر لی۔ اور حجاج نے انھیں امان دے دی۔"

محاصرہ تنگ ہو گیا۔ یہاں تک کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو مسجد حرام میں محصور کر لیا گیا۔ حافظ ابن کثیر اس وقت کی کیفیت لکھتے ہیں:

"ان لوگوں نے بیان کیا ہے کہ وہ (حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ) مسجد حرام کے دروازے سے نکلتے تھے اور دروازے پر پانچ سو سوار اور پیادے جمع ہوتے تھے۔ وہ ان پر حملہ کرتے تھے تو وہ دائیں بائیں منتشر ہو جاتے۔ ان کے مقابلے میں کوئی نہیں ٹھہرتا تھا......

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ جس دروازے کے محافظوں کے مقابلے میں بھی نکلتے تھے، ان کے مجمع کو پراگندہ کر دیتے تھے، اور انھیں بھگا دیتے تھے حالانکہ وہ (حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ) زرہ بھی نہیں پہنے ہوتے تھے۔" (البدایہ والنہایہ: ۳۳۱/۸)

اس خبر سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ حجاج کی فوج کے لوگ جو محاصرہ کیے ہوئے تھے حرم میں خون نہیں بہانا چاہتے تھے اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے یا انھیں زخمی کرنے کا ارادہ نہ رکھتے تھے ورنہ پانچ سو آدمیوں کا ایک شخص کے سامنے سے ڈر کر بھاگ جانا بالکل بعید از عقل وقیاس ہے۔ خصوصاً جب ان میں سوار بھی ہوں۔ اگر ان کی نیت قتل وخونریزی کی ہوتی تو وہ انھیں آسانی کے ساتھ قتل کر سکتے تھے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان کے ساتھی، یہاں تک کہ ان کے بیٹے بھی ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

Marfat.com

علیٰ ہذا روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ بھی کسی کو قتل یا مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ کم از کم ایک دو کو تو وہ قتل یا مجروح کر ہی سکتے تھے۔ خصوصاً جبکہ بظاہر مخالفین کے یہ سپاہی ان سے مرعوب بھی تھے اور اسلحہ کے استعمال سے گریز کر رہے تھے۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا یہ رویہ بھی احترام حرم کی وجہ سے تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کی طرح خود بھی حرم شریف میں کسی کو قتل یا زخمی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ محض خالی ہاتھ دفاع کرنا چاہتے تھے یعنی مخالفین کو دھکے دے کر دروازہ پر سے ہٹانا چاہتے تھے مگر حجاج کے لشکر والوں نے اس کی بھی نوبت نہ آنے دی۔ وہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے قریب ہی نہ آتے تھے بلکہ پہلے ہی بھاگ جاتے تھے۔ اسی سلسلہ کی ایک روایت میں آتا ہے کہ

ولقد كان حجر المنجنيق يقع على طرف ثوبه فلا ينزعج بذالك۔

”منجنیق کے پتھر آپ کے دامن پر لگتے تھے مگر اس سے آپ کو کوئی ہچکچاہٹ نہیں پیدا ہوتی تھی۔“

یہ روایت قوسین کے درمیان لکھ کر حاشیہ پر ناشر نے لکھا ہے کہ یہ ”البدایہ والنہایہ“ کے مصری نسخہ میں موجود نہیں ہے۔ تاہم اگر اس روایت کو ثابت تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی اس امر کی ایک دلیل ہے کہ حجاج کے لشکر والے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل یا زخمی نہیں کرنا چاہتے تھے ورنہ تاک کر پتھر پھینکنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ پتھر ان کے دامن پر لگتا تھا مگر ان کے جسم کو چھوتا بھی نہ تھا؟ اگر انھیں قتل یا مجروح کرنا مقصود ہوتا تو منجنیق کے بجائے ہاتھوں سے پتھر مارے جا سکتے تھے۔ تیر سے بھی کام لیا جا سکتا تھا۔ پانچ سو میں سے دو سو آدمی بھی سنگ باری کرتے تو آپ کا ان سے محفوظ رہنا غیر ممکن تھا۔ خصوصاً جبکہ موصوف کے جسم پر زرہ بھی نہیں تھی۔ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ فریقین میں سے کوئی بھی حرم محترم میں خوں ریزی اور جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا اور حرم میں درحقیقت کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ یہ پتھر پھینکنا ایسا ہی تھا جیسے آج کل مجمع کو منتشر کرنے کے لیے ہوائی فائر کیے جاتے ہیں یا آنسو گیس پھینکی جاتی ہے۔ حجاج کے لشکر والے یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ حرم میں محصور رہیں۔ اور ہم پر حملہ نہ کر سکیں، نیز کسی دوسری جگہ نہ جا سکیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے ۱۷ / جمادی الاولیٰ ۷۳ھ کو جام شہادت نوش فرمایا۔ پوری رات نمازیں پڑھتے رہے۔ صبح کے قریب ذرا سی جھپکی لی۔ بیدار ہو کر اول وقت فجر کی نماز طول قنوت کے ساتھ ادا کی۔ اپنے رفقاء کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد محاصرہ کرنے والوں پر اپنے رفقاء کو ساتھ لے کر حملہ آور ہوئے، فوج مخالف تتر بتر ہو گئی اور آپ اپنے رفقاء کے ساتھ ان کا پیچھا کرتے ہوئے مقام الحجون تک پہنچ گئے۔ وہاں ایک اینٹ آ کر چہرہ مبارک پر لگی۔ جس سے خون بہنے لگا۔ اس پر آپ نے ایک رجزیہ شعر پڑھا، اس کے بعد گر گئے۔

(البدایہ والنہایہ: ۳۳۱/۸)

Marfat.com

ان واقعات کے تذکرے کے بعد حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

ثم سقط الی الارض فاسرعوا الیه فقتلوہ۔ (ایضاً)

پھر آنمحترم زمین پر گر گئے (یہ دیکھ کر) وہ لوگ (لشکر حجاج کے لوگ) جلدی سے دوڑے اور انھیں قتل کر دیا۔''

پھر ایک صفحہ کے بعد ص ۳۳۲ پر آپ کے سر کاٹنے، اور دمشق بھیجنے، جسم سولی پر لٹکانے کی غلط، موضوع اور جعلی روایتیں بھی نقل کی ہیں۔ سبائیوں کی گھڑی ہوئی ان سب روایتوں کا غلط اور بہتان خالص ہونا ان شاءاللہ مندرجہ ذیل سطروں سے واضح ہو جائے گا۔ اس روایت میں اتنی بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ چہرے پر اینٹ لگنے سے حضرت موصوف زمین پر گر پڑے۔ لیکن یہ بات کہ ''لشکر مخالف کے لوگ دوڑ پڑے اور انھیں قتل کر دیا'' بوجوہ غلط معلوم ہوتی ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ اسی ''اینٹ'' کے لگنے سے، چوٹ اور زخم ہو جانے سے خون زیادہ نکل گیا۔ جس کی وجہ سے وفات ہوگئی اور آپ مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔ مخالفین لشکر والوں نے انھیں قتل نہیں کیا۔ روایت کا یہ حصہ ''فاسرعوا الیه فقتلوہ'' بالکل غلط اور کسی سبائی یا سبائیت نواز راوی یا مؤرخ کا اضافہ ہے جو اس نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔

مندرجہ ذیل قرائن ہماری رائے کی تصدیق اور روایت زیر بحث کے حصہ مذکور کی تکذیب کر رہے ہیں:

اول: اس آخری کشمکش میں بھی فریقین کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ دونوں نے حرم کے احترام کی وجہ سے اسلحہ سے کوئی کام نہیں لیا۔ اس روایت میں اس حادثہ کے متعلق صرف اتنا کہا گیا ہے:

ثم نهض وحمل و حملوا حتی کشفوهم الی الحجون۔

''پھر (حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ) اٹھے اور آپ نے نیز ان کے رفقاء نے حملہ کیا یہاں تک کہ دشمنوں کو ''حجون تک پسپا کر دیا۔''

اس روایت میں نہ تو کسی کے قتل کا تذکرہ ہے، نہ زخمی ہونے کا، نہ کسی کے ہتھیار کے استعمال کا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جنگ نہیں ہوئی بلکہ فریقین نے حرم شریف کی حرمت وعظمت کا پاس ولحاظ کیا اور کسی نے ایک دوسرے پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ حسب سابق (جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے) حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ ان کی طرف بڑھتے تھے اور وہ لوگ بھاگ جاتے تھے۔ حرم مکہ کے اندر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اس سے عیاں ہے کہ لشکر حجاج انھیں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ صرف محصور کر کے ان سے ہتھیار ڈلوانا اور صلح پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ جب لشکر کا یہ رجحان تھا تو یہ بات بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے ان کو گرتا ہوا دیکھ کر ان کے قتل کا ارادہ کر لیا ہو اور انھیں شہید کر دیا ہو۔ خصوصاً جب کہ انھیں توقع ہو کہ اینٹ کی چوٹ ہی سے ان کی وفات ہو جائے گی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ''یہ واقعہ حرم سے باہر کا ہے۔ حرم کے اندر تو ان لوگوں نے احترام حرم کی وجہ سے ان کے قتل کا ارادہ نہیں کیا، لیکن ممکن ہے کہ

Marfat.com

جب وہ حرم سے باہر آ گئے تھے تو ارادہ قتل کر لیا ہو؟''

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کی طرح حجاج اور لشکر حجاج کو بھی احترام حرم کا پورا پاس و لحاظ تھا۔ اسی وجہ سے حرم شریف میں فریقین کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی، کسی نے اسلحہ سے کام نہیں لیا، نہ کسی نے کسی کو مجروح کرنے کی کوشش کی، لیکن حجاج کی فوج کا دوران محاصرہ جو رویہ رہا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف احترام حرم ہی اس کا سبب نہ تھا بلکہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل یا مجروح کرنا ہی نہ چاہتے تھے بلکہ اس سے گریز کرتے تھے۔ اگر وہ اس سے بچنا نہ چاہتے یا اس کے خواہاں ہوتے تو پانچ ماہ کے محاصرے کے دوران کسی موقع پر تو وہ اس کی کوشش کرتے کہ حضرت موصوف کو اپنے پیچھے لگا کر حرم مکہ سے باہر لے آئیں اور وہاں حملہ کر کے انھیں شہید کر دیں مگر اس قسم کی کسی کوشش کا کوئی ثبوت بھی نہیں ملتا بلکہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ملتی جس سے ان لشکر والوں پر اس کا شبہ بھی کیا جا سکے۔ اس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حجاج اور اس کے لشکر والے سب حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی عظمت کے قائل تھے اور ان کو قتل یا انھیں مجروح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ قطعاً انھیں جانی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ اس لیے یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے آپ کو شہید کیا ہو۔

دوم: حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس موقع پر تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ان کا لشکر تھا۔ ان کی تعداد اگرچہ بہت کم تھی مگر پھر بھی معتدبہ تھی۔ جب بقول راوی مخالفین دوڑ کر انھیں قتل کرنے کے لیے آئے تو ان کے رفقاء نے کیا کیا؟ انھوں نے آپ کی حفاظت اور ان کی طرف سے مدافعت کی یا نہیں؟ اس کا کوئی تذکرہ کسی روایت میں نہیں۔ اگر کوئی مدافعت کی تو ضرور اس کا تذکرہ ہوتا۔ یہ بھی بالکل بعید از عقل و قیاس ہے کہ انھوں نے کوئی مدافعت نہ کی اور اسے گوارا کر لیا ہو کہ ان کے منتخب کیے ہوئے خلیفہ اور امیر کو ان کے دشمن ان کے سامنے ذبح کریں۔ یہ بات تو غیرت و حمیت، خلوص اور وفاداری کے بالکل منافی اور مخالف ہے بلکہ ایک قسم کی غداری ہے، جو جائز بھی نہیں بلکہ سخت مذموم اور معصیت کبیرہ ہے۔ ان واقعات پر نظر کرنے سے یقینی طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حجاج کے لشکر والوں نے آپ کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ یا اقدام نہیں کیا۔ اور قتل والی روایت بالکل جھوٹی، غلط اور جعلی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آپ کی وفات اسی ''اینٹ'' کے لگنے سے ہوئی۔ اس کی چوٹ کھا کر جب موصوف گر پڑے تو کوئی بھی موصوف کے قتل کرنے کے لیے نہیں آیا بلکہ خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے آپ کا انتقال ہو گیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

سوم: حجاج قریشی نہیں تھا۔ ان کے لشکر میں بھی قریشی خال خال ہی ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، عبدالملک کے قریبی رشتہ دار اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی بھی تھے۔ حجاج اور ان کے لشکر کے کسی شخص

Marfat.com

کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ انھیں خلیفۃ المسلمین کی اجازت کے بغیر قتل کر دے۔ عبدالملک نے ان کے محاصرے کی اجازت دی تھی۔ قتال و قتل کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس لیے وہ کسی طرح ان کے قتل کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں قتل کرنے کی روایت قطعاً غلط ہے جو کسی سبائی یا سبائیت زدہ نے گھڑی ہے۔

قتل کی روایت کا سراپا کذب و افتراء اور من گھڑت ہونا تو روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا اور یہ بات صاف ہو گئی کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت اس ''اینٹ'' کے لگنے کی وجہ سے ہوئی تھی لیکن وہ ''اینٹ'' کہاں سے آئی تھی۔ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا۔ لیکن دشمنان بنی امیہ بھی یہ نہیں کہہ سکے کہ وہ اینٹ لشکر حجاج میں سے کسی نے پھینکی تھی۔ بلکہ سب ہی اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ کسی نے بھی قصداً ان کی طرف اینٹ نہیں پھینکی تھی۔ اتفاقی طور پر ان کے لگ گئی۔ پھر بھی یہ بات راز ہی رہتی ہے کہ وہ ''اینٹ'' کس نے اور کس طرف سے پھینکی تھی؟ حافظ ابن کثیر اس واقعہ کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

فجاء تہ آجرۃ فاصابتہ وفی وجھہ فارتعش بھا...... ثم سقط الی الارض۔

(البدایۃ والنہایۃ: ۳۳۱/۸)

''ایک اینٹ ان کے چہرے پر لگی۔ انھیں اس سے جھرجھری آئی۔ پھر وہ زمین پر گر پڑے۔''

اینٹ کس نے پھینکی؟ کدھر سے آئی؟ اس کی طرف اس روایت میں اشارہ تک نہیں ملتا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ حجاج کے لشکر والوں میں سے کسی نے ''اینٹ'' نہیں پھینکی تھی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے واقعۂ شہادت کے بارے میں مختلف و متناقض روایتیں ہیں۔ صحیح روایت صرف وہی ہے جو حافظ ابن کثیر نے لکھی ہے اور اوپر منقول ہوئی۔ باقی روایتیں غلط ہیں۔ اور جمہور مؤرخین کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہیں۔

اسی قسم کی ایک روایت ''البدایہ'' میں حافظ صاحب نے طبرانی سے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے اعوان و مددگار لشکر حجاج پر خشت باری کر رہے تھے۔ انھیں کی پھینکی ہوئی ایک اینٹ اتفاقی طور پر حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے سر مبارک میں لگی۔ جس سے سر کھل گیا اور گہرا زخم آیا۔ روایت تو غلط ہے۔ لیکن اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جب یہ روایت گھڑی گئی تھی اس وقت عام طور پر لوگ ''خشت باری'' کو لشکر حجاج کی طرف منسوب کرتے تھے۔ نیز یہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا اور کم از کم اس کا احتمال ہے کہ یہ ''اینٹ'' حضرت موصوف کی جماعت والوں اور طرف داروں ہی نے دشمنوں کی طرف پھینکی ہو جو اتفاق سے موصوف کو لگ گئی۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد کم از کم ظن غالب کی حد تک اس راز کی نقاب کشائی ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبائی سازش کے کچھ ارکان تقیہ کر کے مکہ معظّمہ میں مقیم ہوں گے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے رفقاء کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہوں گے۔ وہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ الحجون تک

Marfat.com

گئے اور کہیں چھپ کر موقع پا کر یہ اینٹ انھیں میں سے کسی نے پھینکی ہوگی جوان کی وفات وشہادت پر منتج ہوئی۔ جو لوگ سبائیہ کے مزاج سے واقف ہیں وہ ہماری اس بات کو بلاشک وشبہ تسلیم کر لیں گے۔

قتل کے روایت غلط ثابت ہونے کے بعد لاش کی بے حرمتی کی روایتوں کا غلط ہونا خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ تاریخ اسلام کے طالب علم کو یہ اصول ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تاریخ اور حدیث کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ حدیث کی روایت میں راوی جس قدر احتیاط کرتا ہے۔ تاریخ کا راوی اس کی عشر عشیر احتیاط بھی نہیں کرتا۔ تاریخی روایت کی صحت و غلطی متعین کرنے میں قرائن داخلی و خارجی کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور درحقیقت فیصلہ قرائن ہی کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ رواۃ کا ثقہ ہونا کسی تاریخی روایت کی صحت کے لیے کافی نہیں، جب تک قرائن بھی اس کی تائید نہ کرتے ہوں یا کم از کم اس کی نفی نہ کرتے ہوں اور اس کے خلاف نہ ہوں۔ اگر کسی تاریخی روایت کے سب راوی ثقہ ہوں، مگر قرائن قویہ اس روایت کو غلط ثابت کر رہے ہوں تو اسے یقیناً غلط اور مردود سمجھا جائے گا اور اسے محض ثقات کی روایت ہونے کی بناء پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث اور تاریخ میں یہ فرق پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ حدیث کی صحت وعدم صحت کی جانچ کرنے کی خاطر ہمارے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس حدیث کے راویوں کے احوال معلوم کریں۔ قرائن کو اس میں بھی اہمیت حاصل ہے مگر اس کا درجہ احوال رواۃ کے بعد ہے۔ بخلاف اس کے تاریخ میں قرائن ہی کو اہمیت حاصل ہے، اس میں راویوں کی جانچ ثانوی چیز ہے۔ اس کی ایک قوی وجہ یہی ہے کہ تاریخی روایتوں کے بارے میں بڑے بڑے ثقہ اور عادل اشخاص بھی اکثر و بیشتر غیر محتاط ہوتے ہیں، نسلی عصبیت، جماعتی وتحریکی تعصب، سیاسی اختلافات اور اس قسم کے دوسرے حالات و جذبات بعض اوقات غالب ہو کر ماضی کی خبروں کے بارے میں بڑے بڑے ثقات کو انتہائی بد احتیاطی کرنے، یہاں تک کہ کھلا ہوا جھوٹ بولنے اور افتراء کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔

یہ واقعہ تنہا میں نے نہیں بلکہ بہتوں نے دیکھا ہے اور دیکھتے رہتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ سیاسی معاملات اور اختلافات کی صورت میں۔ اس بارے میں احتیاط کرنے والے مفقود تو نہیں مگر بہت قلیل ہیں۔ ان امور پر نظر کرنے کے بعد کوئی ایسی تاریخی روایت جو اگرچہ ثقات سے مروی ہو مگر قرائن اس کی تکذیب کر رہے ہوں قطعاً قبول نہیں کی جا سکتی اور اس پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ مطالعۂ تاریخ میں اس اصول کا ملحوظ رکھنا لازم ہے، ورنہ سخت غلطیوں اور غلط فہمیوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ مطالعۂ تاریخ کے اس اہم اصول کی وضاحت کے لیے اگرچہ ہم نے زیر بحث روایتوں کے راویوں کو ثقہ فرض کیا تھا لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان سب کے راوی عام طور پر مجہول، سبائی یا سبائیت نواز ہیں۔ یہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی روایتیں نقل کرنے میں مشاق تھے۔ بنو امیہ سے بغض وعداوت کی وجہ سے ان کے خلاف زہر اگلنے اور ان پر بہتان وافتراء کرنے میں انھیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ایسے لوگوں کی خبر جو قرائن کے خلاف ہو، کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اس اہم اصول کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل قرائن پر غور کیجیے جو زیر بحث روایتوں کی تکذیب کر رہے ہیں۔

Marfat.com

اول: چند سطور پہلے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ حجاج کے لشکر کے لوگ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل یا مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کی عظمت بھی لشکر والوں کے دلوں میں تھی۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ انھوں نے ان کی لاش کی بے حرمتی کی ہو؟ ان کا سر کاٹا ہو اور لاش سولی پر چڑھائی ہو؟ اس سے عیاں ہے کہ یہ روایتیں بالکل غلط ہے۔

دوم: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وہاں موجود تھے۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور قریبی رشتہ سے بھتیجے تھے، دوسرے رشتے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خالو تھے۔ آپ کی شہادت کی خبر بہت تیزی کے ساتھ مکہ مکرمہ میں پھیل گئی ہوگی، اور لاش کے قریب لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے ہوں گے۔ یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جائے حادثہ پر اتنی تاخیر کے ساتھ پہنچے ہوں کہ ان کا سر بھی کاٹا جا چکا ہو اور ان کی لاش کو مقام "کدا" پر لے جا کر صلیب پر لٹکایا جا چکا ہو۔ یقیناً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فوراً پہنچے ہوں گے، پھر انھوں نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی لاش کی یہ بے حرمتی کیسے گوارا کی ہوگی؟ اور حجاج یا اس کے لشکر والوں کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی لاش کی بے حرمتی کریں؟ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہوتا یا اس کا کسی نے ارادہ کیا ہوتا تو یقیناً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اسے سختی کے ساتھ منع کرتے اور نہی عن المنکر کے فریضے سے غفلت نہ برتتے۔ مگر اس مضمون کی کوئی روایت تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کاٹنے، اسے دمشق بھیجنے، جسم بے سر کو سولی پر لٹکانے اور اس قسم کی دوسری روایتیں قطعاً غلط جھوٹی گھڑی ہوئی ہیں۔

سوم: اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ مکہ سے تقریباً دس ہزار آدمی امان لے کر لشکر حجاج میں پہنچ چکے تھے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے حمزہ اور خبیب بھی تھے۔ ان لوگوں نے ان کی لاش کی یہ بے حرمتی کیسے گوارہ کی؟ خصوصاً آپ کے بیٹوں سے باپ کی لاش کا سر کٹتے اور اسے سولی پر لٹکتے کیسے دیکھا گیا؟ اگر اس قسم کا واقعہ ہوا ہوتا تو یقیناً ان لوگوں نے حجاج کو اس سے منع کیا ہوتا اور اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہوتا، حالانکہ اس قسم کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ یہ اس امر کا قوی قرینہ ہے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ قطعاً نہیں ہوا بلکہ حجاج نے اس کا کوئی ارادہ بھی نہیں کیا۔ سر کاٹنے، اسے تشہیر کرنے اور لاش کو سولی دینے کی روایتیں قطعاً غلط، سبائی سانچے میں ڈھلی ہوئی، سراپا کذب و دروغ کہانیاں ہیں جن کی کوئی اصل و بنیاد نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ حجاج کے خوف کی وجہ سے خاموش رہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح انھیں حجاج کا خوف ہو سکتا تھا اسی طرح حجاج بھی ان سے خائف ہو سکتے تھے۔ اندرون لشکر اگر دس ہزار میں سے دو ہزار آدمی بھی تلواریں سونت لیتے تو حجاج کے لیے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ وہ ایک مدبر اور ذہین شخص تھا۔ ان حالات میں قطعاً ایسی کوئی بات نہیں کر

Marfat.com

سکتا تھا جس سے ان امان حاصل کرنے والوں میں اشتعال پیدا ہو۔ اول تو پرکاہ کے برابر بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ حجاج کی نیت حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی لاش کی توہین کرنے کی تھی لیکن بالفرض، بفرض محال، ان کی نیت ہوتی تو بھی وہ اس پر عمل تو کجا اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں امان لینے والوں کی بغاوت کا اندیشہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس صورت میں خود ان کا لشکر ان کے خلاف ہو جاتا۔ وہ صرف محاصرے کے لیے آئے تھے، انھیں قتل کرنے نہیں آئے تھے۔

چہارم: خود حجاج کا لشکر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا معتقد، ان کی عظمت اور ان کے مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کا قائل تھا۔ اسی لیے اس نے کسی موقع پر بھی ان سے مقابلے کی جسارت نہیں کی۔ انھیں دیکھ کر سب محاصرہ کرنے والے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ صرف ہاتھ پاؤں سے غیر مسلح تصادم کی نوبت بھی نہیں آئی اور محاصرہ کرنے والوں نے ان کا ادب ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ اس لشکر کے ایک سردار طارق نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی لاش کے پاس کھڑے ہو کر حجاج کے سامنے کہا کہ ''کسی عورت نے اس سے زیادہ جوانمرد نہیں جنا ہے۔'' (البدایہ والنہایہ: ۳۳۱/۸) خود حجاج بھی حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی عظمت اور ان کی ولایت کے قائل تھے۔ چنانچہ انھوں نے فتح کے بعد جو تقریر کی اس میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو ''من خیار الناس'' (بہترین لوگوں میں سے ایک) کہا ہے۔ ایسے لوگوں کا آپ کی لاش کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرنا بالکل بعید از قیاس و عقل ہے۔

بعض مورخین نے حجاج کے خلاف بعض بزرگ ہستیوں کے اقوال نقل کیے ہیں کہ

''مشہور امام قرأت عاصم بن ابی النجود کہتے ہیں کہ ''اللہ کی حرمتوں میں سے کوئی حرمت ایسی نہیں رہ گئی جس کا ارتکاب اس شخص نے نہ کیا ہو۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ

''اگر دنیا کی تمام قومیں خباثت کا مقابلہ کریں اور اپنے اپنے سارے خبیث لے آئیں تو ہم تنہا حجاج کو پیش کر کے ان پر بازی لے جا سکتے ہیں۔'' (خلافت وملوکیت: ص ۱۸۵)

اسی طرح ''ذم حجاج'' میں امام شعبی کا بھی قول نقل کیا ہے۔

سبائیوں اور ان کے ساتھ تحریک سبائیت میں شرکت کرنے والے علویوں کے جھوٹے پروپیگنڈے اور ارجاف کا اتنا اثر ہوا کہ بنو امیہ کی مذمت کرنا اور ان کے خلفاء عمال کو ظالم و جابر کہنا فیشن میں داخل ہو گیا۔ خصوصیت کے ساتھ حجاج کی مذمت تو ہر وہ شخص واجب و لازم سمجھتا ہے جو تاریخ اسلام کے متعلق کچھ لکھتا ہے یا تقریر کرتا ہے۔

بنو امیہ اور حجاج کی مذمت میں جن لوگوں کے اقوال نقل کیے گئے ہیں، اگر ان کی طرف ان اقوال و بیانات کی نسبت صحیح ہے تو ایک عام مسلمان کے دل میں یہ سوال پیدا ہونا ناگزیر ہے کہ کیا یہ بزرگان سلف بھی ''تبرا

Marfat.com

بازی'' کے خوگر تھے؟ اور کیا یہ حضرات غیبت و بہتان کو ''تقویٰ'' کے منافی نہیں سمجھتے تھے؟

اگر یہ بدگوئی کسی شرعی مصلحت و ضرورت کی بناء پر تھی تو وہ معلوم ہونی چاہیے۔ بظاہر تو کوئی مصلحت نظر نہیں آتی۔ عاصم بن ابی النجود نے مبینہ طور پر جس زمانہ میں حجاج کی غیبت یا ان پر بہتان باندھنے کا ارتکاب کیا ہے اس وقت خلافت امویہ کو زوال ہو چکا تھا۔ پھر ان کی مذمت کرنے سے کیا فائدہ تھا؟

ان کے بعد سب سے زیادہ شدت کے ساتھ حجاج کے مذمت کرنے والے مبینہ طور پر عمر بن عبدالعزیز ہیں۔ یہ امیر المؤمین عبدالملک کے زمانہ میں جوان تھے۔ حجاج کا دور ان کے سامنے گزرا۔ خاندان میں ان کا اتنا اثر تھا کہ ہشام رحمہ اللہ نے انھیں اپنا ولی عہد بنایا۔ یہ اپنے زہد و تقویٰ میں ممتاز و معروف ہیں۔ ہر مسلمان ان سے پوچھ سکتا ہے کہ حضرت اس دوران آپ کیا کرتے رہے؟ آپ کا منصب تو یہ تھا کہ آپ اس گریہ و بکا اور مشق تبرا کے بجائے حجاج پر علی الاعلان نکیر کرتے، امیر المومنین عبدالملک سے ان کی شکایت کر کے انھیں معزول کراتے، یہ سب آپ کر سکتے تھے مگر انسداد ظلم کے لیے آپ نے یہ کیوں نہ کیا؟

خلافت امویہ اور حجاج کے مخالفین نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا جو طرز عمل ان کے متعلق دکھایا ہے، وہ عجیب و غریب ہے۔ ایک طرف تو وہ حجاج اور اموی خلافت پر تبرا بھیجتے ہیں اور دوسری طرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے سے گریز کرنے کے ساتھ خلافت بنی امیہ کی امداد و اعانت بھی کرتے ہیں اور اس کے خلاف بغاوت کچلنے میں اس کے مددگار بن جاتے ہیں۔ امام شعبی کا مسئلہ بھی تقریباً اسی نوعیت کا ہے۔ ان کا انتقال بعمر اسی سال پہلی صدی ہجری گزرنے کے بعد ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے حجاج اور عبدالملک کا زمانہ پایا ہے اور ان ادوار میں وہ عاقل بالغ تھے۔ پھر انھوں نے حجاج اور عبدالملک پر نکیر کیوں نہیں کی؟ ان کی پوزیشن اس قدر اونچی تھی کہ انھیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے سے پیشتر حجاج اور عبدالملک کو بھی سوچنا پڑتا اور تابہ امکان وہ انھیں کوئی نقصان یا تکلیف پہنچانے سے گریز کرتے۔ تنقید کی بجائے ان دونوں صاحبان کو تو چاہیے تھا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے اور قولاً و عملاً ہر طرح ظلم بند کرنے کی کوشش کرتے مگر انھوں نے یہ نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو ثابت ہوتا۔

مختصر یہ کہ جن بزرگان ملت کی زبان سے مؤرخین، حجاج اور خلفاء بنی امیہ کی مذمت نقل کرتے ہیں اور انھیں ظالم و جابر کہلواتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ ثابت نہیں کہ اس نے حجاج یا عبدالملک پر یا کسی دوسرے خلیفہ پر اس کے مبینہ ظلم و جور یا فسق و فجور کے بارے میں نکیر کی ہو یا انھیں ظلم و معصیت سے باز رہنے کی نصیحت کی ہو، بلکہ عموماً یہ حضرات حجاج و عبدالملک اور دوسرے عمال و خلفاء بنی امیہ سے مالی امداد حاصل کرتے تھے۔ پھر ایسے حضرات کی بات پر کیسے اعتبار و اعتماد کیا جائے؟

جس طرح یہ ممکن ہے کہ یہ حضرات بخوف حجاج حق بات کہنے اور مظلوموں کی حمایت و نصرت کرنے سے باز رہے ہوں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صاحبان حجاج اور عبدالملک کے خلاف یہ تبرا بخوف عوام کرتے

Marfat.com

ہوں چونکہ عباسیوں کے ایجنٹوں نے خلافت بنی امیہ کے خلاف غلط باتوں اور بے بنیاد الزاموں کی تشہیر بہت زیادہ کی تھی اس لیے عوام کا ایک طبقہ ان کا مخالف ہو گیا تھا۔ اس طبقہ کے خوف کی وجہ سے ان لوگوں نے اپنے ضمیر اور حقیقت واقعہ کے خلاف یہ تبرا بازی کی ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جب یہ ممکن ہے تو ان کے اقوال مذکورہ اور اسی طرح کے دوسرے اقوال قطعاً ساقط الاعتبار کہے جائیں گے۔

یہ گفتگو تو ہم نے یہ فرض کر کے کی تھی کہ یہ اقوال اور ان کے امثال جو مذکورہ بالا یا ان جیسے دوسرے بزرگوں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں انھیں کے اقوال ہیں اور ان سے ثابت ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی قطعاً غلط ہے۔ یہ ان حضرات کے اقوال و آراء قطعاً نہیں ہیں بلکہ سبائیوں اور تحریک سبائیت کے حامیوں کے وضع کیے ہوئے اور گھڑے ہوئے جملے ہیں، جو ان کذابوں نے ان بزرگوں اور ان جیسے دوسرے بزرگوں کی طرف منسوب کر دیئے ہیں۔ یہ ان بزرگوں پر بہتان و افتراء ہے۔ یہ حضرات ان اقوال و آراء سے بالکل بری ہیں۔ اگر درحقیقت ان حضرات کے اقوال ہوتے تو یقیناً یہ حضرات حجاج اور عبدالملک پر ضرور نکیر کرتے۔ یہ مداہنت کرنے والے لوگ نہیں تھے اور اگر یہ حضرات نکیر کرتے تو یہ بات شہرت کے ساتھ منقول ہوتی۔ نیز یہ کہ اس کے اثرات ضرور ظاہر ہوتے اور اس کا ردعمل یقیناً واضح ہوتا، حالانکہ تاریخ ان سب امور کے بارے میں بالکل ساکت ہے۔ جن ظالموں کو احادیث وضع کر کے رسول اکرم ﷺ پر افتراء کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوئی وہ اگر حسن بصری و امام شعبی و امثالھم پر افتراء کریں اور ان کی طرف اپنے اقوال کاذبہ منسوب کر دیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

اگر بطور فرض یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ان بزرگوں نے واقعی جناب حجاج کی مذمت کی ہے اور انھیں ظالم کہا ہے تو بھی لازم نہیں آتا کہ ہم ان کے اقوال مذکورہ کو صحیح سمجھ لیں۔ اجتماعی نفسیات کے اس اصول کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ علماء اور صوفیاء، علمی ذوق اور علم میں انہماک رکھنے والے بعض لوگ پروپیگنڈے سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عوام سے بھی زیادہ اس معاملے میں کمزور ہوتے ہیں۔ ہاں، وہ علماء و صلحاء اس سے متاثر نہیں ہوتے یا کم متاثر ہوتے ہیں جو علمی مشغلہ کے ساتھ کچھ دنیاوی اور معاملاتی امور سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اس اصول کے پیش نظر اگر مذکورہ بالا بزرگوں نے سبائیوں کے جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اس قسم کی باتیں کہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن ان کے اقوال کو سند نہیں بنایا جا سکتا بلکہ اسے ان کی نادانستہ غلط بیانی کہا جائے گا۔ جھوٹ تو جھوٹ ہی رہے گا۔ خواہ دانستہ بولا جائے یا نادانستہ۔ ان کے ان اقوال کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جبکہ دوسرے جلیل القدر علماء حجاج کی تعریف کر رہے ہوں جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں بقول مخالفین بنی امیہ یہ مذموم واقعات پیش آئے تھے، اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معتدبہ تعداد میں موجود تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایسے جلیل القدر اور

Marfat.com

امتیازی شان رکھنے والے صحابی تو حجاج کے ساتھ مکہ معظمہ ہی میں موجود تھے اور حجاج ایک حیثیت سے ان کے تابع بھی تھے۔ ان کے علاوہ حضرت ابوثعلبہ بن جرہم خشنی، متوفی ۷۵ھ دمشق میں مقیم تھے، جو اموی خلافت کا پایہ تخت تھا۔ یہ بزرگ بیعت رضوان میں شریک تھے۔ حضرت سوید بن غفلہ متوفی ۸۰ھ کوفہ میں قیام پذیر تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری شریک بیعت عقبہ تھے، مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔ ۷۸ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہم ورضواعنہ۔ یہ چند اسماء گرامی بطور مثال پیش کر دیئے گئے ورنہ اس زمانہ میں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے ان کی تعداد اس سے زائد ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک وصف جمیل قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کے خوگر ہیں۔ اگر دشمنان بنی امیہ کا یہ بیان صحیح ہے کہ حجاج وعبدالملک بہت ظالم تھے، اور اموی خلافت سے عناد رکھنے والوں نے جو الزامات ان پر لگائے ہیں، ان میں ذرہ برابر بھی صداقت ہے تو ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان پر کوئی نکیر کیوں نہ فرمائی؟ اگر نکیر فرمائی ہوتی تو یقیناً شہرت کے ساتھ منقول ہوتی حالانکہ تاریخ میں اس قسم کی بات کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ اس سے روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ لوگوں نے جو اعتراضات حجاج وعبدالملک پر کیے ہیں وہ بالکل غلط اور بے بنیاد اور خالص جھوٹ ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جو اوصاف حسنہ بیان فرمائے ہیں، ان کا ان حضرات میں پایا جانا قطعی اور یقینی ہے۔ اور ان حضرات کا کسی وقت بھی ان میں سے کسی وصف سے خالی اور محروم ہونا قطعاً غیر ممکن اور محال ہے۔ سنیت کے مدعی مخالفین خلافت بنی امیہ کی ذمہ داری ہے کہ اس سوال کا جواب دیں لیکن میں پورے وثوق و یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ قیامت تک اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔

تیسرا سوال بھی ایسا ہی ہے جس کا کوئی جواب بنی امیہ کے ان مخالفین کے پاس نہیں ہے اور وہ اس کا بھی کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے۔ سوال یہ ہے کہ الصادق الامین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "خیر القرون قرنی" کے بموجب خلیفۃ المسلمین عبدالملک اور حجاج کا زمانہ قرون صحابہ رضی اللہ عنہم ہونے کی بناء پر ''خیر القرون'' کی حدود میں داخل تھا۔ اگر ان معاندین ومخالفین خلافت امویہ کے زیر گفتگو بیانات صحیح اور مطابق واقع ہیں تو اس ''قرن'' کو ''خیر القرون'' میں کیسے داخل سمجھا جا سکتا ہے؟ ایک مؤمن کا فیصلہ یقیناً یہی ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سچی اور سراپا صدق ہے۔ یہ مؤرخین ومعاندین یقیناً جھوٹے ہیں اور حجاج وعبدالملک کے اوپر جو الزامات انھوں نے لگائے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ اس حدیث شریف نے ان مسائل کا دوٹوک فیصلہ کر دیا۔ کسی مسلمان کے بارے میں کوئی ایسی بات کہنا جو اس حدیث کے خلاف ہو قطعاً حرام اور تقاضائے ایمان کے خلاف ہے۔ اموی خلافت کے زوال کے بعد عبدالملک اور حجاج کے بارے میں اموی وعباسی دور کے علماء ربانیین نے جس حسن ظن کا اظہار کیا ہے اور جس طرح ان کی تعریف کی ہے وہ ان شاء اللہ چند سطور کے بعد قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔

بحث کی طوالت ممکن ہے کہ بعض حضرات کو گراں گزرے لیکن میرا عذر یہ ہے کہ سبائیوں اور سبائیت

Marfat.com

نوازوں نے اس دور کے بارے میں جھوٹے قصے کہانیوں کو اس قدر شہرت دی ہے کہ حجاج کو ظالم کہنا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ایسے مضامین نظر سے گزرے جو حجاج اور عبدالملک کے کارناموں اور ان کی دینی خدمات کے تذکرے کے لیے لکھے گئے تھے مگر ان میں بھی مضمون نگار نے حجاج کے تذکرے میں لکھنا ضروری سمجھا "مگر وہ بہت ظالم تھا۔" اس طرح اچھے اچھے صلحاء بھی بہتان طرازی کے گناہ میں سبائیوں اور سبائیت نوازوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر حق پسند ہوں تو ان شاء اللہ اس بحث کو پڑھنے سے ان کی اصلاح ہو جائے گی اور وہ اپنی غلطی سے توبہ کریں گے اور بہتان کے گناہ سے محفوظ رہیں گے۔ اس تطویل کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے یہود اور مسیحی مستشرقین اور اب بعض ہنود بھی اس دور کے مبینہ غلط قصوں کو پیش کر کے اس سے استدلال کرتے ہیں کہ معاذ اللہ "نبی اکرم ﷺ کی تعلیم و تربیت تقریباً بے اثر رہی اور اسلام عملاً چند سال سے زیادہ قائم نہیں رہا۔" اس بحث سے اس غلط اور بے بنیاد اعتراض کو بھی دفع کرنا منظور ہے۔ تیسرے یہ کہ ہماری درخشاں تاریخ پر جو سیاہی سبائی منافقین اور یہود نے پھیری ہے، اسے دیکھ کر اور حقیقت حال سے بے خبر رہ کر ہماری نئی نسل خصوصاً جو یورپ و امریکہ سے متاثر ہے، قومی خود حقارتی کے مہلک مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کا سدباب اور اس مرض کا علاج مقصود ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ ہماری قوم میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو دین اسلام اور شریعت اسلامیہ کو بحالات موجودہ ناقابل عمل قرار دیتا ہے اور اس کی دلیل میں سبائیوں کے وضع کیے ہوئے ان جھوٹے قصوں کو پیش کرتا ہے جو خیر القرون کے ایک حصہ میں بھی اسے ناقابل عمل ظاہر کرتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کے مبارک قول "خیر القرون قرنی ......" کو سبائی اور ان کے معلم یہود معاذ اللہ غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری اس بحث کا ایک اہم مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ بلاشبہ الصادق الامین سید المرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کا قول بالکل سچا، بلکہ سراپا صدق اور سچائی ہے۔ کذابوں کی ہرزہ سرائیوں سے حقائق نہیں بدل سکتے۔ ان اکاذیب و بہتانات کو پیروں سے روند کر پھینک دو۔ پھر دیکھو تو نبی کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے قول مذکور کی صداقت روز روشن کی طرح نظر آئے گی۔

مسلمانوں کی ان دو جماعتوں کی اس کشمکش میں جسے علماء نے "فتنہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یہ واقعہ قابل توجہ ہے کہ کئی ماہ کی اس کشمکش میں فریقین نے حدود شرعیہ سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ حرم کی حرمت کا دونوں نے پورا پورا لحاظ رکھا۔ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے؟ اس کی کوئی نظیر کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی۔ اگر کعبہ شریف پر سنگ باری یا آتش باری یا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو مسجد حرام کے اندر قتل کرنے کی روایتوں میں سچائی کا شائبہ بھی ہوتا تو محاصرہ اتنے دن نہ جاری رہتا بلکہ جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے تقریباً دس ہزار رفقاء انھیں خیر باد کہہ چکے تھے، اسی وقت ان کو قتل کر دیا جاتا۔ ان کا قتل کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ اگر تلوار سے نہیں تو تیروں سے کام لے کر انھیں قتل کیا جا سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور اسی وجہ سے نہیں ہوا کہ آپ کی طرح

Marfat.com

ان کے مخالفین بھی حدود شرعیہ سے تجاوز نہیں کرنا چاہتے تھے اور احترام حرم کی رعایت کرنا فرض سمجھتے تھے۔ نیز یہ کہ وہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی جان کے دشمن نہیں تھے۔ ان کی آستین حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خون سے پاک ہے۔ انھوں نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ کسی شقی سبائی نے ان کے سر پر اینٹ مار کر انھیں شہید کیا تھا۔

سبائی سازش:

اس بحث میں طوالت بیان کا چوتھا سبب زیادہ اہم اور قابل ذکر ہے۔ چند سال سے پاکستان میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ نفاذ شریعت کی کیا صورت اختیار کی جائے؟ غالب اکثریت کی رائے ہے کہ فقہ حنفی کو قوانین کا ماخذ بنایا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ جملہ مکاتب فقہ کو سامنے رکھ کر قانون سازی کی جائے۔ نفاذ شریعت کی منزل تو ابھی بہت دور نظر آتی ہے۔ یہ بحث بھی اب ختم ہو چکی ہے یا دب گئی ہے۔ مگر اس بحث کے دوران ہماری قوم یعنی اہل سنت ہی کے ایک معتدبہ گروہ نے برملا کہا اور لکھا کہ

''فقہ حنفی و مالکی وغیرہ جو مدون ہوئے ان میں ان ادوار کے حکمرانوں (خلفاء وامراء) کی ذاتی سیاسی مصلحتوں کی رعایت کی گئی ہے اور احکام شرعیہ کو ان کے مصالح کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت ہے کہ پاکستان کے علماء اور قانون دان حل کرنے سرے سے اجتہاد کریں اور کتاب وسنت سے قوانین کا استنباط کریں۔''

یہ گروہ جسے اس وقت عرفاً دانش ور کہا جاتا ہے، وہ ہے جو انگریزی دان اور موجودہ قانون کا ماہر اور اس کے ساتھ عربی دان بھی ہے اور فقہ اسلامی پر نیز تاریخ اسلام پر بھی وسیع نظر رکھتا ہے۔ فقہ اسلامی اور فقہاء اسلام کے متعلق ان کی مذکورہ بالا رائے تو بالکل غلط ہے، لیکن قابل توجہ چیز یہ ہے کہ وہ اس گمراہی میں مبتلا کیوں ہوئے؟ اور ان کی رائے کا سبب کیا ہے؟

سبب ظاہر ہے۔ ان کا یہ مرض مطالعۂ تاریخ کا اثر ہے۔ سبائیوں نے جو جھوٹ، افتراء اور بہتانوں کے انبار ہماری تاریخ میں لگائے ہیں۔ ان کے سڑنے سے اس مہلک مرض کے جراثیم پیدا ہوئے، جن سے ہماری قوم کا ایک اچھا خاصا طبقہ متاثر ہوا اور ہو رہا ہے۔

اس بحث کو طول دینے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرات جو روافض اور رفض نواز لوگوں کی کورانہ تقلید میں یا اپنی ذاتی سیاسی یا غیر سیاسی غرض کے لیے یا نسلی تعصب یا حسد کی بنا پر خلفاء بنی امیہ و بنی عباس، اور ان کے عمال واعوان خصوصاً حجاج کو ظالم و جابر کہنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں، ان کے محاسن کو چھپاتے ہیں، ان کی تعریف کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ جو شخص جھوٹے الزاموں سے ان کی برات ثابت کرتا ہے، اسے خارجی کہنے لگتے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ وہ اسلام اور اہل اسلام کو کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی سوچیں کہ قیامت کے دن اس کے بارے میں باز پرس کا بھی خطرہ ہے۔

Marfat.com

خاتمہ بحث پر اس واقعہ کا اظہار کر دینا بھی ضروری اور مفید ہے کہ روافض نے اس سلسلہ میں بکثرت روایتیں وضع کی تھیں۔ یہاں تک کہ حدیث کے نام سے بھی متعدد کہانیاں وضع کر لیں اور رسول اکرم ﷺ پر افتراء پردازی کرتے ہوئے بھی انھیں اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہوا۔ ان روایتوں سے بعض حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ستائش اور بنو امیہ یا حجاج کی مذمت میں ہیں اور بعض خود حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مذمت میں ہیں۔

اس قسم کی روایات میں سے بعض پر حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ نے تنقید کی ہے اور ان کا باطل و موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔ بعض کو بلا تبصرہ اس لیے ذکر کر دیا ہے کہ ان کا موضوع، جعلی اور غلط ہونا ان کے مضمون یا اسلوب بیان کی وجہ سے ایسا ظاہر ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اس قسم کی سب روایتیں اور نام نہاد احادیث جو بنو امیہ یا حجاج کی مذمت میں یا خلاف واقعہ حکایات یا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی تنقیص پر مشتمل ہیں، قطعاً باطل، موضوع اور جعلی ہیں۔ یہ سب سبائیوں کے ایجنٹوں کے کارخانہ دروغ بافی میں ڈھالی ہوئی کہانیاں اور افتراء پردازیاں ہیں جو سبائی فن تشہیر کا نمونہ ہیں۔ ان بے اصل جھوٹی روایتوں اور ان نام نہاد حدیثوں کا کوئی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔

عبدالملک اور حجاج کے ساتھ لڑائی ہونے سے پہلے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور امیر یزید کے درمیان معرکہ آرائی ہو چکی تھی۔ مسلم بن عقبہ امیر یزید کی طرف سے اس فوج کے سپہ سالار تھے جو مکہ معظمہ کی طرف حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ سبائی افواہ بازوں اور مؤرخوں نیز نسلی و خاندانی تعصب جاہلی کے مریضوں نے ان واقعات کے متعلق بھی پیٹ بھر کر جھوٹ بولا ہے۔ سنگ باری و آتش باری وغیرہ کے جھوٹے الزام امیر یزید کے فرستادہ لشکر پر بھی لگائے ہیں۔ ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بھی غلط اور سراپا کذب و بہتان الزام ہیں۔ ہماری مذکورہ بالا بحث اور تحقیق ان کو بھی باطل اور غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ جن کذابوں نے حجاج اور عبدالملک اور ان کے لشکر پر بہتان باندھے ہیں، انھوں نے امیر یزید اور مسلم بن عقبہ اور ان کے لشکر پر بھی بہتان باندھے ہیں اور ان سب پر جھوٹے اتہامات لگائے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مسلم بن عقبہ اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے درمیان کوئی جنگ حرم مکہ کے اندر نہیں ہوئی۔ انھوں نے بھی صرف محاصرہ کیا تھا۔ دونوں فوجوں میں جو معمولی سی لڑائی ہوئی وہ حرم کے باہر ہوئی۔ احترام حرم کا پاس و لحاظ فریقین کرتے رہے۔ طبری وغیرہ تاریخوں میں جو سنگ باری وغیرہ کے قصے اس حادثہ کے متعلق ہیں وہ سب روافض اور رافضیت نوازوں کے گھڑے ہوئے، بے اصل و بے بنیاد جھوٹے قصے ہیں۔ ہماری بحث مذکورہ سے یہ حقیقت خوب روشن ہو جاتی ہے۔ ذرا غور کی ضرورت ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور دو اموی خلفاء کے درمیان جنگ کے اسباب:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور دو اموی خلفاء کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی، اس کے اسباب کیا

Marfat.com

ہوئے؟ اس کی تفصیل مؤرخ کا کام ہے۔ ہم تفصیل کو نظر انداز کر کے صرف اس امر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جو اس خلفشار اور باہمی منازعت وتفرقہ کا حقیقی سبب بنا۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس سوءِ ظن کو دور کیا جائے جو مؤرخین کے غلط اور نامناسب اسلوب بیان اور سبائیوں کے وضع کیے ہوئے جھوٹے قصص وروایات کی وجہ سے متعلقہ افراد کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔

پہلی بات کے متعلق ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ دونوں لڑائیاں سراسر سبائیوں اور سبائیت نوازوں کی ریشہ دوانیوں، دسیسہ کاریوں، اور فتنہ پردازیوں کا نتیجہ تھیں ورنہ دو فریقوں کا وجود ہی نہ ہوتا اور ان کے درمیان کسی جنگ کا تصور ہی نہ کیا جا سکتا۔ اختصار کے ساتھ اس کی توضیح یہ ہے کہ سبائیوں نے جو تقیہ کر کے دمشق میں بھی جمع ہو گئے تھے، عبداللہ بن مطیع کو اپنا آلہ کار بنایا، انھوں نے نیز بعض دوسرے تقیہ باز سبائیوں اور سبائیوں کے ایجنٹوں نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو یہ باور کرا دیا کہ یزید فاسق و فاجر ہے۔ ملت ان سے بیزار ہے۔ صالحین قوم کسی ایسی اولوالعزم شخصیت کے خروج کے منتظر ہیں جو اصلاح حال کے لیے یزید پر سختی کے ساتھ نکیر کرے۔ اگر وہ نہ مانے تو بزور قوت انھیں معزول کر دے۔ نیز انھیں یہ باور کرایا کہ قوم کی نظریں آپ کی طرف ہیں اور وہ آپ کو خلیفۃ المسلمین بنانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ دوسری طرف یزید کے کان بھرتے رہے اور انھیں یہ باور کرایا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جاہ واقتدار کے طالب، خلافت کے خواہاں اور آمادۂ بغاوت ہیں۔ ان دونوں کو ورغلا کر ان سبائی منافقین نے دونوں کی فوجوں کو آمنے سامنے صف آراء کر دیا۔

امیر یزید کی خلافت کے زمانہ میں پورا عالم اسلامی ایک مرکز پر مجتمع ہو گیا تھا۔ یہ چیز سبائیوں اور یہود کے لیے سوہان روح تھی۔ امیر یزید کے تدبر اور ان کی دانشمندی اور اعلیٰ صلاحیت حکمرانی (Statemanship) کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ امت میں خلفشار پیدا کرنے کی یہودی مساعی کے باوجود انھوں نے امت کو ایک مرکز پر مجتمع رکھا۔ ان کے انتقال کے بعد روافض اور ان کے آلۂ کار رافضی نوازوں، نیز یہود کی ریشہ دوانیوں اور خفیہ وعلانیہ دسیسہ کاریوں اور فساد انگیزیوں کی وجہ سے عالم اسلامی میں سخت خلفشار اور لامرکزیت کی کیفیت پیدا ہوئی۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "تین ماہ تک عالم اسلام بغیر کسی امام اور خلیفہ کے رہا"۔ اس لامرکزیت اور افراتفری کے عالم میں اہل حجاز نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی اور شام کے لوگوں نے مروان رضی اللہ عنہ سے بیعت کر کے انھیں خلیفہ منتخب کر لیا۔ بیعت دونوں میں سے کس سے پہلے کی گئی اور کس سے بعد کو؟ اس کا کوئی قطعی جواب نہیں مل سکا۔ سبائیوں نے فساد پیدا کرنے کے لیے اسے اور مبہم بنا دیا۔

ان مفسدین کے دو گروہ ہو گئے اور آپس میں صلاح ومشورہ کر کے دونوں طرف پہنچ گئے۔ ایک گروہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو باور کرا دیا ان کی بیعت پہلی ہے۔ اس لیے مروان رضی اللہ عنہ اور ان کے جانشین عبدالملک باغی ہیں اور حفاظت خلافت کے لیے ان سے قتال وجدال کرنا واجب ہے۔

دوسری طرف دوسرے گروہ نے مروان رضی اللہ عنہ اور عبدالملک کو اسی طرح اولیت کا یقین دلا کر بغاوت

Marfat.com

فرو کرنے اور اس کے لیے جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس طرح یہ مفسد منافقین ان صالح مسلمانوں کے دو ایسے گروہوں کو میدان جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل لے آئے، جو اپنے مسلمان بھائیوں سے قطعاً جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ سوء ظن کرنا کہ انھوں نے جاہ واقتدار حاصل کرنے کے لیے جنگ کی، سخت غلطی ہے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ وہ اس ورطہ میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر وقتی طور پر ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا بھی ہوتا تو اس کی بقا غیر ممکن تھی، کیونکہ پوری جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک خاص وصف جمیل قرآن مجید میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ

﴿ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾

''وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے درآں حالیکہ وہ جانتے ہوں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معصوم نہیں تھے۔ معصیت کا صدور ان سے بھی ممکن تھا، مگر کسی معصیت کا عادی ہو جانا، یا اسے بار بار دہرانا، ان کے لیے غیر ممکن تھا۔ جنگ وجدل کا سلسلہ خاصی مدت تک جاری رہا۔ اگر اس کا محرک جذبہ حب جاہ واقتدار ہوتا تو اتنے دن اس کی بقا کا شمار ''اصرار علی المعصیته'' میں ہوتا۔ جس کا صدور ان سے از روئے قرآن کریم غیر ممکن اور محال تھا۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مخلص تھے اور انھوں نے اپنے اجتہاد کے بموجب اتباع شریعت ہی کے لیے جنگ کی۔

ان کے مقابلہ میں عبدالملک تھے۔ وہ اگرچہ صحابی نہیں ہیں مگر ان کی پوزیشن بھی از روئے شریعت اور دستور اسلامی مستحکم تھی۔ انھوں نے بھی اپنے اجتہاد کے بموجب خلوص کے ساتھ اتباع شریعت ہی کے لیے جنگ کی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں حب و جاہ واقتدار کا مریض قرار دیں۔ وہ صحابی نہیں ہیں، اس لیے ان سے اس کی قطعی نفی کی تو کوئی دلیل شرعی ہمارے پاس نہیں ہے لیکن از روئے شریعت اسلامیہ و دستور اسلامی ان کا موقف بھی مستحکم تھا اور جس طرح حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے حفاظت خلافت اور بغاوت ختم کرنے کے لیے قتال وجدال شرعاً جائز تھا اسی طرح ان کے لیے بھی جائز تھا۔ دونوں کے اجتہادوں میں سے کس کا اجتہاد صحیح تھا؟ اس کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور اب اس کا فیصلہ کرنے کی کوشش کرنا بے سود ہے جب تک کوئی دلیل نہ ہو اس وقت تک ان کی نیت پر بھی شبہ کرنا جائز نہیں۔ انھیں بھی مخلص ہی کہا جائے گا۔ اختلاف اجتہاد کی وجہ سے جدال وقتال ہو جانا کوئی عیب نہیں کہا جا سکتا۔ یہ طاعت ہی تھی، معصیت نہیں تھی۔ اپنے اخلاص کی وجہ سے ابن زبیر رضی اللہ عنہ مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

مروان اور مسلم بن عقبہ کے متعلق بھی یہی تقریر کافی ہے۔ یہ حضرات بھی مخلص تھے اور اپنے مخلصانہ عمل میں ماجور ہوئے۔ فریق مقابل کے مقابلے میں یہ حضرات دلیل شرعی کی بناء پر خود کو حق پر سمجھتے تھے اور فریق مقابل کو اسی دلیل کی بناء پر برسر باطل جانتے تھے۔ حقیقت واقعہ کے لحاظ سے ان کی رائے صحیح تھی یا غلط؟

Marfat.com

اس سے بحث نہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں معاملہ ان کی نیت کی بناء پر ہوگا۔ اپنی دانست میں انھوں نے حکم شرعی پر عمل کیا، اس لیے وہ گناہ گار نہیں ہوئے بلکہ ماجور ہوئے۔

حرم شریف میں سنگ باری اور اس کے دوسرے متعلقات کی بحث تو ختم ہوئی۔ اس کے ساتھ خلافت عادلہ امویہ کے اوپر مخالفین کے بہت سے اعتراضات کی غلطی بھی ثابت ہوگئی۔ یہ اعتراضات والزام مخالفین بنی امیہ کے لیے مایۂ ناز ہیں لیکن اس کتاب کا مطالعہ کرنے والوں نے دیکھ لیا کہ یہ صحت وحقیقت سے کس قدر دور ہیں اور صرف بغض وعناد اور حسد سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی مستحکم اصل وبنیاد نہیں۔ اسی بحث کو سامنے رکھ کر ان لوگوں کے دوسرے غلط اعتراضات پر بھی نظر کرنا چاہیے۔ ان شاء اللہ ان کی غلطی بھی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے گی۔ اس کے پیش نظر ہم اس بحث کو بالکل ختم کر دیتے لیکن سبائی دروغ بافی، مغالطہ دہی اور سوء تعبیر کی ایک عجیب مثال پیش کیے بغیر اس بحث سے قلم روکنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ مثال ایسی ہے جس میں سبائی آرٹ خوب نمایاں ہے۔ مگر باوجود اس کے بڑے بڑے محققین اور فضلاء اس دام فریب میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ اسی پہلو کے پیش نظر ہم نے اسے عجیب مثال کہا ہے۔ مخالفین خلفاء بنی امیہ کا مشہور اعتراض ہے کہ ''بعض اموی افراد نے جو خلیفۃ المسلمین ہشام سے قرابت رکھتے تھے بعض ذمیوں کی زمینیں غصب کر لی تھیں۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہوئے تو ان اہل ذمہ نے ان سے فریاد کی اور وہ ایک دن خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے تو خطبہ سے فراغت سے قبل ان سب زمینوں کے متعلق اہل ذمہ کے حق میں فیصلہ کر دیا اور بنی امیہ کے ان افراد کو جو ان کی نظر میں غاصب وظالم ٹھہرے تھے، اراضی مذکور مالکان کو واپس کرنے کا حکم دے دیا۔'' دشمنان خلافت بنی امیہ اس قصے کو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی منقبت اور بنوامیہ کی منقصت یعنی ان کے ظلم وجور کو ثابت کرنے کے لیے بیان کیا کرتے ہیں۔

اصل واقعہ:

مندرجہ بالا قصہ سبائی فن دروغ گوئی اور مسخ حقائق کا ایک شاہکار ہے۔ پورا قصہ بالکل غلط اور کذب خالص ہے۔ اصل واقعہ کی تعبیر اپنے طبع زاد عنوان واسلوب سے کر کے بنی امیہ پر بہتان طرازی کی گئی ہے۔ اصل واقعہ کیا تھا؟ اسے معلوم کرنے کے لیے بطور تمہید ایک مسئلہ شرعی کی مختصر وضاحت کرنا پڑے گی۔ جو درج ذیل ہے:

''جب کوئی ملک فتح ہو کر اسلامی مملکت میں داخل ہوتا ہے تو اس کی پوری زمین مملکت (State) کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے۔ پھر اسلامی حکومت اسے مملکت کے باشندوں کو تقسیم کرتی ہے۔ اسلامی حکومت جو قطعہ اراضی کسی شخص کو بطور تملیک دیدے تو وہ اس کی ذاتی ملکیت میں داخل ہو جاتا ہے۔ مفتوحہ زمین میں ''افتادہ'' زمین بھی ہوتی ہے۔ جو غیر آباد ہوتی ہے۔ ایسی زمین کو فقہ کی اصطلاح

Marfat.com

میں ''ارض موات'' کہتے ہیں۔ جس کا لفظی ترجمہ ''مردہ زمین'' کیا جا سکتا ہے۔ انھیں ''موات'' (مردہ) اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا اور یہ خالی پڑی ہوتی ہیں۔ حکومت اسلامیہ ایسی زمینوں کو ''احیاء'' یعنی انھیں آباد کرنا چاہتی ہے تو اس کے قطعات کر کے اس کے طلب گاروں کو آباد کرنے کے لیے تقسیم کر دیتی ہے۔ آباد کرنے کا یہاں وسیع تر معنی میں استعمال کیا گیا۔ اس پر مکان وغیرہ تعمیر کرنا، باغ لگانا، کاشت کرنا یہ سب چیزیں آباد کرنے میں داخل ہیں۔ محل وقوع اور دوسرے امور کے اعتبار سے آباد کاری کا جو طریقہ مناسب ہو وہی اختیار کرنا ہوگا اور حکومت کو اس کے متعین کرنے کا بھی اختیار ہے۔

مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر زمین لینے والا ایک مدت مقررہ کے اندر اس قطعہ زمین کو آباد نہ کرے تو حکومت کو اختیار ہے کہ وہ اس سے زمین واپس لے لے اور کسی دوسرے کو دیدے جو اس کا ''احیاء'' (آباد کاری) کر کے اس سے فائدہ اٹھائے۔''

اس تمہید کے بعد مذکور بالا واقعہ کی حقیقت پر نظر کیجیے۔ یہ درحقیقت صرف ''احیاء وموات'' کا معاملہ تھا۔ ''غصب'' اور ''ظلم'' سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بعض اموی حضرات نے حکومت سے ''ارض موات'' کے کچھ قطعات حاصل کیے، مگر یہ مدت معین کے اندر انھیں آباد نہ کر سکے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو کچھ ذمی ان زمینوں کے طالب ہوئے۔ جنھوں نے ان کے ''احیاء'' (آباد کرنے) کا ارادہ ظاہر کیا ہو گا۔ اموی خاندان کے نام جو ان کی الاٹمنٹ ہوئی تھی، اس میں بقاء ملک کے لیے ایک مدت معینہ کے اندر ''احیاء'' کی شرط تھی۔ وہ شرط نہیں پوری ہوئی۔ اس لیے امیر المومنین نے زمینیں امویوں سے واپس لے لیں اور ان اہل ذمہ کے نام الاٹ کر دیں۔ وہ زمینیں ان اہل ذمہ کی ملکیت نہیں تھیں اور نہ کبھی ان کے قبضے میں رہی تھیں۔ وہ سب حکومت کی تھیں۔ حکومت نے ایک سے واپس لے کر دوسرے کو عطا کر دیں۔ اس میں نہ کوئی ''غصب'' تھا اور نہ کوئی ''ظلم'' ہوا۔ اسے ''غصب'' اور ''ظلم'' کہنا الزام تراشی اور بہتان طرازی کی بہت ہی مکروہ مثال ہے۔ آج بھی بکثرت ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ شہر یا دیہات میں لوگ حکومت سے زمین پٹے پر لیتے ہیں اور اگر وہ ایک مقررہ مدت کے اندر آباد نہیں کرتے تو حکومت ان سے زمین واپس لے کر کسی دوسرے شخص کو الاٹ کر دیتی ہے جو اس کا طالب ہوتا ہے۔ کوئی سمجھ دار آدمی اسے غصب اور ظلم کا معاملہ نہیں سمجھتا اور نہ سمجھ سکتا ہے۔ پھر زیر بحث معاملے میں بنی امیہ کو غصب اور ظلم کا مرتکب کیوں قرار دیا جاتا ہے؟

یہ بات کہ یہ معاملہ صرف ''احیاء وموات'' کا تھا۔ غصب اور ظلم کا اس میں شائبہ بھی نہیں تھا۔ مبینہ واقعہ میں معمولی غور کرنے سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ اگر اسے غصب اور ظلم کا معاملہ کہا جائے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے صرف مستغیث اور مدعی کا دعویٰ سن کر مدعا علیہم کا بیان اور جواب دعویٰ سنے بغیر مدعی کے حق میں فیصلہ کیسے کر دیا؟ صحیح اور عادلانہ طریقہ تو یہ تھا کہ موصوف مدعیان کا دعویٰ سننے

Marfat.com

کے بعد مدعا علیہم کو بلا کر ان کا جواب دعویٰ طلب کرتے۔ اگر وہ سب کا اقرار کرتے اور مدعیان کا دعویٰ تسلیم کر لیتے تو زمین ان کے قبضہ سے نکال کر مدعی کو دے دیتے۔ لیکن اگر وہ انکار کرتے تو مدعیان سے ان کے دعوے پر ''بینہ'' (ثبوت) طلب کرتے۔ بصورت ثبوت ان کے حق میں فیصلہ کرتے۔ عدم ثبوت کی صورت میں مدعا علیہم سے قسم لیتے۔ اگر وہ قسم نہ کھاتے تو مدعی کے حق میں فیصلہ ہوتا۔ بصورت قسم ان کے حق میں فیصلہ کرتے اور ان کا قبضہ برقرار رکھتے۔ اسلامی عدالت کا یہی طریقۂ کار (Procedure) ہے۔ بلکہ اب تو دنیا کی ہر عدالت میں یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور اسے لازم سمجھا جاتا ہے۔

ہم حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو نہ تو ظالم و جابر کہہ سکتے ہیں اور نہ طریق عدل و قضا سے جاہل۔ باعتبار علم و فہم تقویٰ ان کی عظمت تسلیم شدہ واقعہ ہے۔ اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ مخالفین بنی امیہ مؤرخین و علماء کا یہ بیان کہ زیر بحث واقعہ غصب کا معاملہ تھا بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے جسے صداقت سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں۔ پھر جب یہ غصب کا معاملہ نہیں تھا تو اسے ''احیاء وموات'' ہی کا معاملہ سمجھنا پڑے گا کیونکہ اس کے سوا کوئی تیسری صورت معاملہ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسا کوئی معاملہ جس میں ''خصومت'' ہو سکے اور حق تلفی و حق طلبی کا مسئلہ درپیش ہو، فرض کرنے سے وہی محذور لازم آتا ہے جس کا تذکرہ ابھی ہو چکا ہے۔ اس کے سوا چارۂ کار نہیں کہ اس واقعہ کا تعلق، ''احیاء موات'' سے سمجھا جائے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ اسے غصب اور ظلم کہنا بنی امیہ پر بہتان اور ظلم ہے۔

خلافت امویہ کی اسلامیت کے بارے میں جمہور متقدمین علماء کرام وفقہاء کی شہادت:

تیسری صدی ہجری یا اس سے پہلے جو علماء دین رہبر و رہنما رہے ہیں وہ بالاتفاق بنو امیہ کے دور خلافت کو اسلامی دور، ان کے نظام کو اسلامی نظام اور ان خلفاء نیز ان کے عمال کو ثقہ، عادل، فقیہ و متقی سمجھتے تھے۔ ان کی یہ رائے جو ان کے مشاہدے یا خبر متواتر پر مبنی تھی، ان کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے اور تواتر التزامی کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے۔ اس لیے ہم اموی دور خلافت کو مبارک، درخشاں، اسلامی، عادلانہ اور اسلامی نظام حکومت کا قابل تقلید نمونہ سمجھنے اور اس کا یقین رکھنے میں حق بجانب ہیں۔ اسی طرح ہم یہ سمجھنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ سبائیت نواز مؤرخین نے ان خلفاء، صالحین اور ان کے مبارک ادوار کے خلاف جو کچھ لکھا اور ان کی توہین و تنقیص کے لیے جو روایتیں بیان کی ہیں وہ حقیقت سے دور، خلاف واقعہ، من گھڑت اور دروغ محض ہیں، وہ درحقیقت یہود کی وضع کی ہوئی کہانیاں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں۔

علماء متقدمین کی اس پاکیزہ رائے کو علماء متاخرین بھی برابر صحیح تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں اور آج تک تسلیم کی جاتی ہے۔

جمہور اہل سنت کو جو اپنی تاریخ کی خوبی، رفعت اور تابناکی کا یقین اور اس پر فخر ہے، جو تواتر نفسی کے

Marfat.com

طریقہ سے چودہ سو برس سے ہر قرن میں منتقل ہوتا ہوا دور موجودہ تک پہنچا ہے جس کا تفصیلی تذکرہ ہم چند صفحات پیشتر کر چکے ہیں۔ اس کا ایک سبب علماء عظام کی مذکورہ بالا رائے بھی ہے جس سے عام مسلمان بھی بے خبر نہیں ہیں کیونکہ وہ تواتر التزامی کے طریقے سے بواسطہ خواص ان تک پہنچی ہے۔

اموی دور خلافت کی ابتداء امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت سے سمجھی جاتی ہے۔ ان کے عہد خلافت سے دمشق کی اموی خلافت کے خاتمہ تک جو نظام حکومت رہا، اور خلفاء اور ان کے قضاۃ وعمال نے جو فیصلے کیے یا فتویٰ دیئے اور نئے پیش آنے والے مسائل کے جو شرعی حل نکالے ان کو متقدمین فقہاء ملت وحکماء امت نے اہم اور وزنی قرار دیا ہے اور ان سے حسب موقع استشہاد کر کے انھیں فقہی وقانونی نظائر اور فتاویٰ کا درجہ دیا ہے۔ اسی طرح خلفاء کے ادوار حکومت کے تعامل کو بھی دلیل اور حکم شرعی کی معرفت کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھیں کے مطابق فتویٰ دیا اور حکومت عباسیہ کو ان قوانین وضوابط کو جاری ونافذ رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔

اموی عہد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔ اس لیے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے قول وعمل سے فقہاء وعلماء نے بکثرت استدلال واستناد کیا ہے۔ خصوصاً فقہاء احناف نے مثلاً امام محمد اپنی کتاب ''السیر الکبیر'' میں یہ مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ اگر بیت المال میں اخراجات جہاد کی گنجائش نہ ہو تو اخراجات جہاد ودفاع کے لیے مسلمانوں پر مزید ٹیکس لگانا جائز ہے اور دلیل میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا عمل پیش کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ٹیکس لگایا تھا۔ شرعی نقطہ نظر سے مسلمانوں پر ٹیکس لگانے کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ مگر اس ٹیکس کے جواز کے لیے امام محمد رحمہ اللہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عمل سے استدلال کافی سمجھتے ہیں۔ کتب فقہ اور شروح حدیث میں ان کے قول وعمل سے استدلال کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ ایک مسئلہ کا تذکرہ ہم نے بطور مثال کر دیا ورنہ ان کے دور خلافت کے مبارک ومستحسن ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کیونکہ وہ صحابی اور خلیفۂ راشد ہیں اور صحابہ کی عدالت وثقاہت اور ان کا راشد وہدایت یافتہ ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اور ان کا مقبول عنداللہ ہونا قطعی اور یقینی ہے۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی جلالت شان کے متعلق کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی مشہور تصنیف ''کتاب الخراج'' میں مفتوحہ ممالک میں کفار محاربین کی متروکہ اراضی کے بارے میں امیر المؤمنین ہارون الرشید کے ایک سوال کا جواب دینے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

فهذا سبيل القطائع عندي في ارض العراق والذي ضع الحجاج ثم فعل عمر بن عبدالعزيز فان عمر رضي الله عنه اخذ بذلك السنة فان من اقطعه الولاة الموهبون فليس لاحد ان يرد ذلك۔ (کتاب الخراج: ص ۶۳)

''پس ارض عراق میں زمینوں کے بارے میں میرے نزدیک یہ حکم ہے اور یہ وہی ہے جو حجاج نے کیا

Marfat.com

تھا پھر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بھی وہی کیا۔ بے شک عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے (اللہ ان سے راضی ہو) سنت کے مطابق عمل کیا کیونکہ جب کسی کو (کوئی قطعہ زمین) ہدایت یافتہ والی (حکومت) عطا کر دے تو کسی کے لیے اسے واپس لینا جائز نہیں۔"

امام ابو یوسف رحمہ اللہ، حجاج کے عمل سے استدلال فرما رہے ہیں۔ کیا کسی ظالم و جابر کے عمل کو بطور نظیر پیش کر کے اس کی پیروی کی تلقین کی جا سکتی ہے؟ پھر بتاتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے حجاج کے عمل کی پیروی کی اور ''اقطاع'' کے بارے میں ان کے حکم و فیصلے کو برقرار رکھا اور خود بھی وہی حکم دیا۔ یہی نہیں بلکہ حجاج اور دوسرے اموی عمال وولاۃ کو ''مہدی'' یعنی ہدایت یافتہ کہتے ہیں۔ گویا ان کے عام طرز عمل کی تحسین وتقویت اور اس کے مطابق شریعت ہونے کی تصدیق وتوثیق کر کے اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ نیز امیر المومنین ہارون الرشید کو ان کی اتباع کی تلقین کرتے ہیں۔

خلافت بنی امیہ کے متعلق امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی یہ رائے تنہا ان کی رائے نہ تھی بلکہ اس دور میں جملہ فقہاء ومحدثین وعلماء اعلام کی رائے تھی، جس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے فتویٰ پر امیر المومنین ہارون الرشید رحمہ اللہ نے عمل کیا اور کسی عالم دین نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ یہ فتویٰ فقہ اسلام کا جزو بن گیا اور کتب فقہ کے ہزاروں نسخوں میں مندرج ہوا۔ علماء ہر زمانہ میں اسے پڑھتے پڑھاتے رہے، اور آج بھی ان مسائل کی تعلیم جاری ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ خلافت بنی امیہ کی مذکورہ بالا تحسین وستائش جمہور علماء اہل سنت کی رائے ہے جو تواتر کے ساتھ منقول ہے اور جس کی ابتدا مشاہدے سے ہوئی۔ فقہ حنفی کی تدوین، عہد بنو امیہ میں ہوئی تھی۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اسی دور میں امام فقہ بنے تھے۔ خلافت اسلامیہ کے اس تابندہ دور کا خود انھوں نے مشاہدہ کیا تھا۔ اس لیے وہ ''کتاب الخراج'' میں جو مالیات وانتظامات اور دستور وغیرہ کے مسائل بیان کرتے ہیں اور جو فتویٰ دیتے ہیں، ان میں بنی امیہ کے تعامل کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں صراحت کے ساتھ اس کا حوالہ بھی دیتے ہیں اس کی ایک مثال اوپر گزری، دوسری مثال ملاحظہ ہو:

امام ابو یوسف رحمہ اللہ یہ مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ اگر اہل کتاب سے شرائط صلح میں یہ بات طے پائی ہو کہ ان کے گرجے اور بیعے (یہود کی عبادت گاہیں) باقی رہیں گے۔ تو قبضہ کے بعد انھیں منہدم کرنا جائز نہیں۔ اس فتویٰ پر عہد خلافت بنی امیہ کے ایک واقعہ اور اس پر اس دور کے علماء کے فتویٰ، اور اس فتویٰ پر اموی حکومت کے عمل سے استدلال کرتے ہیں:

وقد كان نظر فی ذلك غير واحد من الخلفاء والماضيين و هموا بهدم البيع والكنائس التی فی المدن والامصار فاخرج اهل المدن الكتب التی جری الصلح فيها بين المسلمين و بينهم ورده عليهم الفقهاء والتابعون ذلك

Marfat.com

وعابوه عليهم فكفوه عما ارادوا من ذلك۔ (کتاب الخراج: ص ۱۵۹)

''ایک سے زیادہ گزشتہ خلفاء نے اس مسئلے پر نظر ثانی کی تھی اور شہروں اور بستیوں میں تعمیر شدہ بیعوں (یہود کی عبادت گاہوں) اور کنیسوں (گرجوں) کو منہدم کرنے کا ارادہ کیا۔ تو ان شہر والوں (یہود اور مسیحیوں) نے وہ مکتوبات نکال کر دکھائے جن میں وہ صلح نامہ درج تھا۔ جو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا اور فقہاء و تابعین نے (ان خلفاء کو عمارات مذکورہ منہدم کرنے سے) منع کیا اور اسے معیوب قرار دیا پس (یہ خلفاء) اپنے اس ارادے سے باز آئے۔ (یعنی ان عمارات کو منہدم کرنے سے باز آ گئے)۔''

یہود و نصاریٰ اپنی ان عبادت گاہوں کو اسلام اور خلافت اسلامیہ کے خلاف سازشوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ انھیں عمارتوں میں بیٹھ کر اسلام و خلافت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے کے لیے یہود و نصاریٰ گٹھ جوڑ کر کے اپنے ناپاک منصوبے بناتے تھے۔ ان مفاسد پر نظر کر کے ان خلفاء اسلام نے انھیں منہدم کرنے کا ارادہ فرمایا ہوگا۔ مگر چونکہ یہ معاہدہ کی خلاف ورزی تھی اس لیے فقہاء نے اس سے روکا۔ اور یہ حضرات خلفاء باوجودیکہ خود فقہاء و مجتہدین تھے، مگر انھوں نے جمہور علماء کی اتباع کی اور اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ یہ ان کے متقی، خدا ترس اور متبع شریعت ہونے کی ایک روشن دلیل ہے۔

دوسری طرف اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے علماء دین اپنے فریضۂ احتساب حکومت سے غافل نہیں رہتے تھے اور حسبۃً سے انجام دیتے رہتے تھے۔ نیز اس سے اندازا ہوتا ہے کہ خلفاء بنی امیہ اور ان کے عمال رحمہم اللہ کی نظر میں علماء دین فقہاء ملت کی کیسی عظمت و وقعت تھی اور حکومت و عوام پر علماء دین کا کتنا اثر تھا۔

خلفاء بنی امیہ اور ان کے عمال و معاونین کے متعلق امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی جو تحسین آفرین رائے ظاہر ہو رہی ہے وہ تنہا ان کی رائے نہیں ہے بلکہ اس دور سے بھی پہلے کے ادوار کے جملہ علماء و فقہاء کی رائے تھی۔

امام مالک رحمہ اللہ کے علم و فضل اور ورع و تقویٰ کی رفعت و عظمت معروف و مشہور ہے۔ ان کی کتاب مؤطا کی مندرجہ ذیل سطریں ملاحظہ ہوں:

حدثني مالك عن ابن شهاب ان عبدالملك بن مروان قضى في امراة اصيبت مستكرهة بصداقها على من فعل ذلك بها۔

''امام مالک رحمہ اللہ ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ (امیر المؤمنین) عبدالملک رحمہ اللہ بن مروان رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کے بارے میں جس سے زنا بالجبر کیا گیا تھا، یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ جس نے جبراً اس کی عصمت دری کی ہے، وہ اس کا مہر ادا کرے۔'' (باب المستکرهة من النساء)

ملاحظہ ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ ایسے جلیل القدر امام و مجتہد اور فقیہ لبیب امیر المؤمنین عبدالملک رحمہ اللہ

Marfat.com

اموی کے فیصلے کو نظیر کا درجہ دے رہے ہیں اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔ موطا میں امیر المؤمنین عبدالملک کے فیصلے سے کتاب المکاتب اور کتاب العقول میں بھی استدلال کیا گیا ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ خلیفۃ المسلمین عبدالملک رحمہ اللہ سے کس قدر حسن ظن رکھتے تھے۔ اگر انھیں خلیفہ، عادل، فقیہ، مجتہد، متقی متورع نہ سمجھتے تو ان کے فیصلے سے استدلال کیسے کرتے؟ کیا کسی ظالم کے فیصلے اور فتویٰ کو بھی دلیل بنایا جاسکتا ہے؟

امام قاضی ابوعبید قاسم بن سلام البغدادی الفقیہ (متوفی: ۲۲۴ھ) مشہور فقیہ و محدث ہیں۔ ایک مدت تک منصب قضاء پر فائز رہے۔ اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے ان کے متعلق کہا ہے کہ "وہ مجھ سے زیادہ فقیہ ہیں۔" اپنی مشہور کتاب "الاموال" میں لکھتے ہیں:

حدثنی نعیم بن حماد عن ضمرہ بن ربیعة عن رجاء بن ابی سلمة ان فلانا ذکر رجلا من خلفاء بنی امیة اقطع سعید بن عبدالملک نهره الذی علی الفرات ، وکان غیضة فیها سباع فاعطاها ایاه فعمرها ، فهی نهر سعید۔

"مجھ سے نعیم بن حماد نے ضمرہ بن ربیعہ کے واسطے سے رجاء بن ابی سلمہ کی یہ روایت بیان کی کہ فلاں شخص یعنی خلفاء بنی امیہ کے ایک خلیفہ نے سعید بن عبدالملک کو وہ زمین بطور اقطاع (جاگیر) دی تھی، جس پر انھوں نے فرات سے نہر نکالی۔ وہاں پہلے جنگل تھا جس میں درندے رہتے تھے۔ (ان خلیفہ نے) انھیں یہ زمین عطا کی اور انھوں نے نہر نکال کر اسے آباد کیا۔ اسی لیے اس نہر کا نام نہر سعید ہے۔"

پھر ایک دو سطروں کے بعد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا تذکرہ کیا ہے کہ انھوں نے بھی اسی طرح "اقطاع" کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "رجلا من خلفاء بنی امیہ" سے مراد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ کوئی دوسرے اموی خلیفہ ہیں۔ پھر ان کا نام لیے بغیر ان کے عمل سے استدلال کے کیا معنی؟ اس کی توجیہہ یہی ہوسکتی ہے اور یہی صحیح ہے کہ مصنف اور اس دور کے جمہور علماء اہل سنت کے نزدیک سب خلفاء بنی امیہ ثقہ، عادل، فقیہ، اور قابل اعتماد تھے، اس لیے نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ رجاء بن ابی سلمہ نے ان کا نام لیا تھا مگر نعیم بن حماد کو یاد نہیں رہا۔ اور انھیں اس کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوئی۔

زیاد بن ابی سفیان پر سبائیت نواز طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن امام شاطبی رحمہ اللہ ان کے ایک عمل سے استشہاد کرتے ہیں۔ اپنی مشہور و مقبول، بلند پایہ تصنیف "الموافقات" میں سد ذرائع سے بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقد عول العلماء علی هذا المعنی وجعلوه اصلاح یطرد مدارج الی سد الذرائع۔

Marfat.com

''زیاد نے جامع بصرہ و جامع کوفہ کے نمازیوں کے بارے میں اس اصول کی رعایت کی، واقعہ یہ ہوا کہ لوگ جب ان مسجدوں کے صحن میں نماز پڑھتے تھے تو نماز سے فراغت کے بعد اپنی پیشانیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ یہ دیکھ کر زیاد نے صحن مسجد میں بجری بچھانے کا حکم دیا، اس کی وجہ یہ بیان کی کہیں نئی نسل کے بچے نماز کے بعد پیشانی پر مسح کو بھی سنت صلوٰۃ نہ سمجھ لیں۔''

امام شاطبی رحمہ اللہ ایسے جلیل القدر عالم دین اور محقق فقیہ کے اس بیان سے ایک طرف تو زیاد کا تفقہ، اوران کی دینی بصیرت، نیز حفاظت صلوٰۃ کے لیے ان کا اہتمام ظاہر ہو رہا ہے تو دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ امام شاطبی رحمہ اللہ اور ان کے دور کے علماء وفقہاء کے نزدیک ان کی گورنری کا دور، عدل وتقویٰ کا دور تھا، جس میں شریعت کے نفاذ کے ساتھ ایسی بدعات اور کمی بیشی سے محفوظ رکھنے کا اہتمام بھی عمال حکومت کرتے تھے۔ اس لیے وہ ان کے فعل کو بطور نظیر پیش کرتے ہیں جو ایک درجہ میں دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

واضح رہے کہ اسے صرف امام شاطبی رحمہ اللہ کی رائے نہیں کہا جا سکتا۔ زیاد کا عمل مذکور سد ذرائع کی مثال اور اس اصول پر مبنی احکام کے لیے ایک نظیر و دلیل کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے زمانہ کے جمہور علماء وفقہاء زیاد مرحوم کو معتمد علیہ، صالح، عادل، قابل، اتباع اور ان کے دور کو عادلانہ دور سمجھتے تھے، ورنہ امام شاطبی رحمہ اللہ اس کے فعل سے استدلال نہ کرتے بلکہ اس کا تذکرہ بھی اس مقام پر نہ کرتے۔ کسی کی مدح وستائش تو آدمی اپنی انفرادی رائے کی بناء پر ذکر کر سکتا ہے مگر کسی کے عمل کو بطور دلیل اور قابل اتباع نظیر اس وقت تک نہیں پیش کر سکتا، جب تک وہ دوسروں کو بھی تسلیم نہ ہو۔ اس سے عیاں ہے کہ اس وقت کے جمہور علماء وفقہاء اہل سنت زیاد اور ان کے دور ولایت کے متعلق یہ حسن ظن رکھتے تھے۔

خلافت اسلامیہ کے مبارک ادوار:

خلافت راشدہ ایک خاص اصطلاح ہے اس اصطلاح کے لحاظ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آخری خلیفہ راشد تھے اور انھیں پر خلافت راشدہ کا خاتمہ ہو گیا۔

اگرچہ دور صحابہ رضی اللہ عنہم تو ان پر ختم نہیں ہوا کیونکہ ان کی وفات کے بعد بھی ایک معتد بہ تعداد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خاصی مدت تک باقی رہی۔ مگر دور خلافت راشدہ ان پر ختم ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے بعد کوئی صحابی خلیفہ نہیں ہوا۔ ان کے بعد ۱۳۲ھ تک کا زمانہ حکمرانی اموی دور کہلاتا ہے۔ اس کے بعد عباسی دور شروع ہوتا ہے، جو ۶۵۶ھ تک قائم رہا۔ ان کے علاوہ اندلس (اسپین و یورپ) میں اموی عہد خلافت ہے جو تقریباً آٹھ صدیوں تک رہا۔

ہماری تاریخ اموی وعباسی ادوار کے ساتھ تو مخصوص نہیں۔ خلافت ترکیہ بھی صدیوں تک قائم رہی، ہندوستان میں دولت مغلیہ وغیرہ کے ادوار بھی ہماری تاریخ کا جزو ہیں لیکن دمشق، بغداد اور اندلس کی خلافتوں کو

Marfat.com

پوری امت مسلمہ جانتی ہے، کیونکہ ان کا سرا اسلام کے اولین دور سے ملتا ہے۔ نیز یہ کہ انھوں نے پوری دنیا میں اسلام کا پیام پہنچایا۔ اس لیے ان کا اثر عالمگیر ہوا۔

علم دین اور دعوت اسلام کی اشاعت کرنا، اس کی دعوت دینا، احکام شرعیہ کا نفاذ کرنا اور ہدایات کتاب وسنت کی تعمیل وترویج کرنا، اسلامی مملکت کے مقاصد ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مذکورہ بالا ادوار خلافت میں یہ مقاصد کس درجہ میں حاصل ہوئے؟

یہ واقعہ صرف اوراق تاریخ سے نہیں بلکہ تواتر سے ثابت ہے، جس کا انکار تاریخ اسلام کا بڑے سے بڑا ناقد بھی نہیں کرسکتا کہ اموی وعباسی ادوار میں اسلام نور آفتاب کی طرح سرعت اور وسعت کے ساتھ پھیلا ور تھوڑی سی مدت میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ ترکستان، چین، افریقہ، ہندوستان، جاوا، یورپ غیرہ دنیا کے ہر متمدن خطے میں اسلام کا نور پہنچ گیا۔ نبی کریم ﷺ کے دور مسعود اور دور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو وراثت انھیں ملی تھی، اسے انھوں نے اپنی کمائی سے اضعافاً مضاعفةً کر دیا۔ صرف مسلم مؤرخین ہی نہیں بلکہ مسیحی مؤرخین بھی بیان کرتے ہیں کہ اسپین میں اموی فاتحین کے قدم پہنچتے ہی اسلام سیل رواں کی طرح پھیلنے لگا اور مسیحی جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ خلافت یزید کے دور میں افریقہ کے بربر قبائل تقریباً سب کے سب مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ہندوستان میں غازی محمد بن قاسم کے داخل ہوتے ہی اسلام پھیلنا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے دور دور تک پھیل گیا اور اس خطے میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی۔ اموی خلافت ختم ہونے کے بعد بھی اسلام کی روشنی پھیلتی رہی اور مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر کی تقسیم ہوکر پاکستان وجود میں آیا ہے تو سندھ میں مسلمان ۷۵ فیصد تھے۔ یہ اموی لشکر ہی کی تبلیغ، ان کے ایمان اور ان کی اخلاقی بلندی کا اثر تھا کہ ان کے چلے جانے کے بعد بھی اس سرزمین میں مدت دراز تک تو نور ہدایت پھیلتا رہا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔

مختصر یہ کہ خلافت اسلامیہ کے ان دونوں مبارک ادوار میں اسلام کی اشاعت خوب ہوئی، اور اتنی کثیر تعداد میں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان ادوار کے حکمران فاسق وفاجر اور ظالم وجابر تھے تو انھیں دیکھ کر اتنے آدمی مشرف بہ اسلام کیسے ہو گئے؟ اسلام کا عملی نمونہ دیکھے بغیر لوگوں کو اسلام کی طرف کشش اور رغبت کیسے ہوئی؟ جبکہ ان نو مسلموں میں ایک فی ہزار بھی ایسا نہ تھا جس نے اسلام کا مطالعہ کیا ہو؟

ان مبارک ادوار میں دین حق کا اس تیزی کے ساتھ پھیلنا اور بکثرت غیر مسلموں کا شرح صدر کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہونا اس حقیقت کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ یہ حکمران متقی، رعیت پرور اور اعلیٰ کردار رکھنے والے تھے اور ان کے ادوار کی فضا اسلامی اور روح پرور تھی جسے دیکھ کر غیر مسلموں کو اسلام کی طرف کشش

Marfat.com

اور رغبت ہوتی تھی اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے تھے۔

اگر ہماری تاریخ کی وہ تصویر صحیح ہوتی جو سبائی موئے قلم نے تیار کی ہے تو اموی و عباسی ادوار میں اسلام اس تیز رفتاری کے ساتھ نہ پھیلتا اور اتنی کثرت کے ساتھ لوگ مشرف بہ اسلام نہ ہوتے۔ ان خلفاء اسلام اور ان کے عمال وولاۃ نے خود اسلام کی دعوت دی، تاریخ شاہد ہے کہ ان ادوار، خصوصاً بنی امیہ کے مبارک دور خلافت میں فوج کے معمولی سپاہی بھی داعی الی اللہ ہوتے تھے اور غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ مسلمانوں کے اخلاق عالیہ، اعلیٰ کردار، مساوات، صداقت، عفت و پاکبازی، ان کی ذہنی وفکری بلندی و برتری، ان کے حکمرانوں کا عدل و انصاف، ان کی رعیت پروری اور وسعت قلبی و رحم دلی۔ یہ وہ چیزیں تھیں جن سے متاثر ہو کر کثیر تعداد میں لوگ مشرف بہ اسلام ہوتے رہے۔

خلافت عباسیہ کا دور بھی مبارک تھا۔ اس کا مبارک و مسعود ہونا بھی اسی طرح ثابت ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام اوزاعی، امام مالک، امام ابو یوسف، امام محمد رحمۃ اللہ علیہم کی ایسی عظیم شخصیتوں نے خلفاء عباسیہ اور ان کے عمال کے ساتھ تعاون کیا۔ ان خلفاء نے ان ائمہ فقہ اور دوسرے اکابر علماء کے مشورے سے حسب ضرورت قوانین ملکی مقرر کیے۔ باوجودیکہ خلافت عباسیہ کی تعمیر خلافت امویہ کے کھنڈر پر کی گئی تھی، مگر انھوں نے اموی خلفاء کی عظمت و دیانت کا اعتراف کیا اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ان کے تعامل کو نظیر سمجھا اور اس کی اتباع کی۔ عباسی خلفاء کے اس طرز عمل کو ان کے عدل و انصاف، تقویٰ اور للّٰہیت کی دلیل قرار دینا بالکل صحیح استدلال ہے۔

تاہم ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عباسی دور خلافت بحیثیت مجموعی اموی دور خلافت کی بلندی کو نہیں پہنچتا۔ دونوں دور مسعود تھے اور دونوں کی خلافت موعودہ انعامی خلافت تھی مگر دونوں کے درمیان درجہ اور مرتبہ سعادت کا فرق کرنا ناگزیر ہے۔ اس کی وجہ بنوعباس کی ایک غلطی تھی جو آخر کار ان کے زوال کا باعث بنی۔ انھوں نے سبائیوں کے ساتھ اتحاد کیا اور حصول خلافت میں ان سے بھی اعانت حاصل کی۔ اس کی وجہ سے پیروان ابن سبا کا یہ گروہ کار خلافت میں دخیل ہو گیا سبائی عمال قصداً ایسے کام کرتے تھے جن سے نظام خلافت کو نقصان پہنچے۔ سنی عمال اور اہل کاروں کو بھی غلط راستوں پر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ مامون و معتصم پر ان کا جادو زیادہ موثر ہوا۔ انھوں نے ان دونوں کو ورغلا کر اہل سنت خصوصاً حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی مخالفت پر ابھارا۔ اس سے خلافت عباسیہ کی شہرت کو نقصان پہنچا۔ اس حادثہ فاجعہ میں بڑا دخل معتصم کی بیوی کو تھا جو سبائی تھی۔ امیر المؤمنین ہارون الرشید رحمہ اللہ نے خلافت کو روافض سے پاک کرنے کی کوشش کی جو ایک حد تک کامیاب بھی ہوئی، مگر پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک مدت کے بعد یہ منافق پھر دخیل ہو گئے اور بالآخر ان دوست نما دشمنان اسلام نے یہود اور تاتاریوں کے تعاون سے خلافت عباسیہ کو تباہ کر کے چھوڑا۔

مامون و معتصم کے زمانہ میں جو بلا نازل ہوئی وہ درحقیقت جمہور اہل سنت خصوصاً ان کے قائدین کی غلطی کا نتیجہ تھی۔ اگر وہ سبائیوں سے میل جول نہ بڑھاتے تو سبائی حکومت اسلامیہ میں اس قدر دخیل نہیں ہو

Marfat.com

سکتے تھے۔ معتصم شیعہ عورت سے شادی کرنے کی جسارت نہ کرتا۔ مامون خلیفہ نہ ہوتا، اگر ہوتا تو پورا سنی ہوتا شیعہ نہ ہوتا اور یہ افسوس ناک واقعات پیش نہ آتے، مامون کے شیعی رجحانات معلوم تھے اور صاف نظر آرہا تھا کہ اگرچہ وہ پورا شیعہ نہیں ہوا ہے مگر شیعی تحریک میں شریک ہو گیا ہے۔ پھر جمہور اہل سنت نے جن میں علماء و صلحاء بھی شامل تھے، اسے خلیفہ کیوں بنایا؟ امین کے مقابلے میں اس کی مدد کیوں کی؟ اگر اس کا تشیع پہلے مخفی تھا تو ظاہر ہونے کے بعد اسے معزول کیوں نہ کیا؟ وہ جب کلیدی مناصب اور اہم خدمات پر شیعوں کو مقرر کر رہا تھا تو اس پر نکیر کیوں نہ کی؟ اور اسے اس سے روکنے کی کوشش میں کیوں کوتاہی کی؟ معتصم کے بارے میں بھی اس وقت کے جمہور اہل سنت پر یہی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ جمہور اہل اسلام، علماء کرام اور قائدین امت کی ان غلطیوں کی وجہ سے خلافت کی برکتوں میں کمی ہوئی اور مامون و معتصم کو اہل سنت کی سربراہی اور ان کے سر پر مسلط ہو کر انھیں اذیت و نقصان پہنچانے کا موقع ملا۔ یہ اپنا ہی کیا ہوا اور جمہور کا قصور تھا۔ اس کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی مگر پھر بھی یہ کرم ہوا کہ انعام خلافت ضبط نہیں کیا گیا اور اصلاح کا موقع دیا گیا۔ ان واقعات سے جو جمہور اہل سنت کی غلطی کا نتیجہ تھے یہ لازم نہیں آتا کہ عباسی خلافت موعودہ انعامی خلافت نہ تھی۔ وہ یقیناً موعودہ انعامی خلافت تھی۔ جمہور نے جب اس کی ناقدری کی تو اس کی سزا انھیں ملی۔

تنبیہ:

قرآن و سنت کی روشنی میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ ہماری تاریخ بہت قابل تحسین، بلند پایہ اور مثالی تاریخ ہے۔ دور خلافت راشدہ کی عظمت کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ان کے بعد دمشق، بغداد اور اندلس کی خلافتیں بھی قابل تحسین اور مسلمانوں کے لیے قابل فخر ہیں۔ جمہور اہل سنت اور جمہور علماء و فقہاء اہل سنت اخبار متواترہ کی بنا پر یہی رائے رکھتے ہیں۔ شیعیت سے متاثر سنی مؤرخین نے اسلامی تاریخ پر جو سیاہی پھیرنے کی کوشش کی ہے، کبار علماء اہل سنت نے جو مؤرخ بھی تھے، پوری قوت سے اس کی تردید کی ہے اور اس تردید کو بہت اہم کام سمجھا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو شیخ عبدالعزیز رحمہ اللہ کتاب ''شرح العقیدۃ الطحاویہ'' میں ''خلفاء اثنا عشرہ'' کے متعلق حدیث کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وهو ما خرجا فى الصحيحين عن جابر بن سمرة دخلت مع النبى صلى الله عليه وسلم فسمعته يقول "لايزال امر الناس ماضيا وليهم اثنا عشر رجلا ثم تكلم النبىؐ بكلمت خفيت على فسالت ابى ماذا قال النبىؐ قال: "كلهم من قريش" وفى لفظ: لا يزال الاسلام عزيزا الى اثنى عشر خليفة" وكان الامر كما قال النبىؐ والاثنا عشر الخلفاء الراشدون الاربعة ومعاوية وابنه يزيد وعبدالملك بن مروان و اولاده الاربعة وبينهم عمر بن عبدالعزيز

Marfat.com

ثـم اخذ الامر فی الانحلال و عند الرافضة "ان امرا الامة یزل فی ایام ھؤلاء فـاسـدا مـنـغـصـا یتولی علیھم الظالمون المعتدون بل المنافقون الکافرون واھـل الـحـق اذل من الیھود" وقولھم ظاھر البطلان لم یزل الاسلام عزیزا فی ازدیاد فی ایام ھؤلاء الاثنی عشر۔"

''اور وہ (حدیث ہے) جس کی تخریج (بخاری و مسلم نے) صحیحین (صحیح بخاری و صحیح مسلم) میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ بن سمرہ سے کی ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''لوگوں کا (خلافت سے) کام ہوتا رہے گا۔ چنانچہ ان پر بارہ اشخاص حکومت کریں گے پھر نبی کریم ﷺ نے کوئی بات فرمائی جو مجھ سے مخفی ہوگئی۔ تو میں نے اپنے والد صاحب سے پوچھا کہ نبی ﷺ نے کیا فرمایا تھا؟ انھوں نے بتایا کہ یہ فرمایا تھا کہ ''سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔'' یہ حدیث دوسرے الفاظ میں یوں ہے: ''اسلام بارہ خلفاء کی خلافت تک غالب رہے گا۔'' اور وہی واقع بھی ہوا، جو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: اور خلفاء اثنا عشرہ میں یعنی چاروں حضرات خلفاء راشدین، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید، عبدالملک بن مروان اور ان کے چاروں بیٹے اور ان کے درمیان عمر بن عبدالعزیز ہیں اور روافض کے نزدیک ''امت کا حال ان خلفاء کے زمانہ میں فاسد اور گدلا رہا ان پر حد سے تجاوز کرنے والے ظالم مسلط رہے بلکہ منافق کافر مسلط رہے۔ اور اہل حق یہود سے بھی زیادہ ذلیل رہے۔'' (رافضہ کا قول ختم ہوا) ''اور ان کا (روافض کا) یہ قول واضح طور پر باطل ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان بارہ خلفاء کے زمانہ میں اسلام برابر معزز رہا اور برابر ترقی کرتا رہا۔''

ہم نے اس سلسلہ میں خلافت اندلس کا تذکرہ اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں کیا جتنا تفصیلی تذکرہ خلافت دمشق و بغداد کا کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں خلافتوں پر سبائیوں اور سبائیت زدہ لوگوں نے حملے زیادہ کیے ہیں۔ اسپین کی خلافت بھی بہت مبارک، باعظمت اور مثالی تھی۔ وہ بھی خلاف موعودہ ہی کا ایک حصہ تھی۔ لیکن ان لوگوں نے اسے مخصوص طور پر مطاعن کا ہدف نہیں بنایا۔ نیز اس کی ابتداء بھی دور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد ہوئی اس لیے اس کا مختصر تذکرہ کافی سمجھا گیا۔ خلافت ترکیہ کا بھی ہم نے تذکرہ نہیں کیا کیونکہ وہ اس دور سے متصل نہیں تھی۔ مگر یہ واضح رہے کہ سبائیوں اور یہود کو عداوت اور دشمنی ان دونوں خلافتوں سے بھی ہے بلکہ انھیں ہر اسلامی سلطنت سے عداوت ہے اور ان دونوں خلافتوں کا زوال بھی یہود اور سبائیوں کی متفقہ سازشوں اور فریب کاریوں سے ہوا بلکہ چودہ صدیوں میں جتنی اسلامی سلطنتیں زوال پذیر ہوئیں، کم از کم ان میں سے پچانوے فیصد کے زوال میں سبائیوں کا ہاتھ ضرور رہا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

Marfat.com

حاصل کلام:

حجاج کے دو احسانات پوری امت مسلمہ پر ایسے ہیں جن کے بارے سے سبکدوش ہونا اس کے لیے ممکن نہیں۔ ان میں سے ایک قرآن پر اعراب لگوا کر اس کی حفاظت اور اس کی اشاعت کرنا ہے۔ دوسرا سر زمین ہندوستان تک اسلام پہنچانا ہے۔ آج پاک و ہند میں ہمارا کلمہ گو ہونا حجاج ہی کی مساعی کا مرہون منت ہے۔ یہ حجاج کے ایسے احسانات عظیمہ ہیں جن کی وجہ سے دشمنان قرآن اور دشمنان اسلام ان کے سخت دشمن بن گئے اور انھیں غلط اور لغو اعتراضات کا نشانہ بنایا۔

حجاج کے بارے میں ایک غلط قصہ مشہور کر دیا گیا کہ پیدائش کے وقت اسے شہد کی بجائے خون چٹایا گیا جس کی وجہ سے وہ جوانی میں ظالم وسفاک بن گئے۔ ایک دوسرا جھوٹا قصہ یہ ہے کہ جب وہ عراق کا گورنر تھا تو اسے بتایا گیا کہ وہاں کچھ مستجاب الدعوات لوگ ہیں اس لیے وہ ان پر ظلم سے پرہیز کرے۔ چنانچہ حجاج نے حیلے بہانے سے ان لوگوں کو دعوت پر بلایا اور یتیموں کا مال (یعنی مال ناحق) انھیں کھلا دیا اور پھر مشتہر کر دیا کہ اب وہ لاکھ اس کے حق میں بددعائیں کریں وہ قبول نہ ہوں گی کیونکہ حرام کی غذا ان کا جزو بدن بن چکی ہے۔ یہ قصہ بھی من گھڑت ولغو ہے اور فقط حجاج کو بدنام کرنے کے لیے دشمنان خلافت اسلامیہ نے پھیلا دیا ہے۔

حجاج کے بارے میں حضرت مولانا محمد اسحاق سندیلوی رحمہ اللہ، سابق شیخ الحدیث و مہتمم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنی یہ رائے اپنی کتاب اظہار حقیقت جلد ۳ میں بیان کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ رائے نہایت صائب اور غور وفکر پر مبنی ہے۔ ہماری تاریخ کو جس حسن وخوبی کے ساتھ بگاڑا گیا ہے، بڑے بڑے علماء حضرات اس سے ناواقف ہیں اور وہ غلط سلط روایت پر مبنی تاریخ کو ''اسلامی تاریخ'' بتانے کی سعی نامشکور کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ یہ کتاب مولانا سندیلوی رحمہ اللہ نے چونکہ مودودی صاحب کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' کے جواب میں لکھی تھی، اس وجہ سے اس میں مودودی صاحب کا نام بھی آ گیا ہے۔

Marfat.com

فتوحات

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب باہمی اختلاف کی گھنگور گھٹائیں ہر طرف چھائی ہوئی تھیں اور جمل اور صفین کی جنگوں نے مسلمانوں کی بیرونی فتوحات کو بہت متاثر کیا تھا بلکہ بیرونی فتوحات یک قلم بند ہوگئی تھیں اور مسلمانوں کی تلواریں اور نیزے جو دوسروں کے لیے تیار ہوئے تھے، آپس میں چلنے لگے۔ یہ ایک عجیب عالم تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی تلواروں کو توڑ کر گھروں سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے تو اس سال کو تاریخ میں ''عام الجماعۃ'' کے نام سے موسوم کیا گیا کیونکہ ملت اسلامیہ نے پانچ چھ سال کے تشتت و انتشار کے بعد اس سال ایک خلیفہ پر اجماع کیا تھا۔

(فتح الباری: ۵۳/۱۳، البدایہ والنہایہ: ۱۲/۸، تاریخ الخلفاء للسیوطی: ص ۱۹۴)

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خارجی جنگوں اور اسلام کی نشر واشاعت میں جو تعطل واقع ہو گیا تھا، اس سے پوری امت کو چھٹکارا مل گیا۔ آپس میں جو دلی منافرت پیدا ہو چکی تھی وہ کلیۃً جاتی رہی اور تمام مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ پوری امت مجتمع ہو گئے۔ اختلافات بالکل ختم ہو گئے اور امت کی وہ قوت جو آپس کے جنگ و جدال میں ختم ہو رہی تھی، اب دشمنان اسلام کے خلاف صرف ہونے لگی۔

یزید بن معاویہ کے زمانہ میں ایک بربری سردار کسیلہ بن مکرم بربری نے بغاوت کر کے عقبہ بن نافع کو شکست دے کر شمالی افریقہ کے تمام اسلامی مقبوضات چھین لیے تھے۔ یزید کے زمانہ سے لے کر عبدالملک کی تخت نشینی تک برابر ایسے سیاسی انقلابات ہوتے رہے کہ کسی خلیفہ کو افریقہ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ ملی بلکہ وہ اپنی باہمی جنگوں ہی میں مصروف رہے۔ سنہ ۶۹ھ میں زہیر بن قیس کو جنھیں افریقہ کے حالات کا کافی تجربہ تھا، بڑے ساز و سامان کے ساتھ اس مہم پر روانہ کیا گیا۔ ان کے افریقہ میں داخل ہونے کے وقت کسیلہ قیروان میں تھا۔ یہاں مسلمانوں کی کافی تعداد موجود تھی کیونکہ یہ شہر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہی نے اپنے عہد خلافت میں آباد کیا تھا، اس لیے کسیلہ نے یہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے خیال کے مطابق ایک نہایت محفوظ مقام ممش چلا گیا۔ زہیر کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ قیروان میں دو چار روز آرام کرنے کے بعد کسیلہ کی تلاش

Marfat.com

میں روانہ ہو گئے۔ ممش کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ کسیلہ کے ساتھیوں رومیوں اور بربریوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ فریقین میں اتنی شدید اور خون ریز جنگ ہوئی کہ کسی فریق کو زندہ بچنے کی امید باقی نہ رہی، لیکن مسلمانوں کی جانبازی، صبر و ثبات اور استقلال کی وجہ سے میدان ان کے ہاتھ میں رہا۔ کسیلہ نے بہت بری شکست کھائی۔ رومیوں اور بربریوں کی ایک بہت بڑی تعداد میدان میں کام آئی اور کافی تعداد گرفتار بھی ہوئی جن میں افریقہ کے ممتاز امراء اور عمائد بھی تھے۔ اس عظیم الشان کامیابی نے مسلمانوں کی عرصے سے اکھڑی ہوئی ساکھ کو پھر بحال کر دیا، اور زہیر قیروان کے بجائے برقہ لوٹ گئے۔

جس زمانہ میں زہیر بن قیس کسیلہ کے ساتھ مشغول تھے، رومیوں نے میدان خالی پا کر برقہ پر حملہ کر دیا۔ یہاں مدافعت کے لیے کوئی فوج نہ تھی۔ رومیوں نے برقہ پر حملہ کرنے کے لیے جزیرہ صقلیہ سے بڑی تعداد میں فوج منگوائی تھی۔ زہیر برقہ کے قریب پہنچے تو انھیں اس ناگہانی آفت کی خبر ہوئی۔ اگرچہ وہ قیروان سے جنگ کے ارادہ سے نہیں نکلے تھے لیکن اپنی مٹھی بھر فوج کو لے کر مردانہ وار مقابلہ میں آ گئے۔ رومیوں اور مسلمانوں کی تعداد میں کوئی تناسب نہیں تھا۔ زہیر بن قیس اور ان کے تمام ساتھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ رومیوں نے تاخت و تاراج کر کے قسطنطنیہ کا راستہ لیا۔ مسلمانوں کی بہت تھوڑی تعداد زندہ بچی۔ زہیر کی شہادت کے باعث افریقہ کے مقبوضات پھر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔

عبدالملک بن مروان کو جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو اسے بڑا صدمہ ہوا۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ہمہ تن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں مشغول تھا، لہٰذا افریقہ میں یہ اتنا بڑا حادثہ ہونے کے باوجود وہ افریقہ کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے کی شہادت کے بعد سنہ ۷۴ھ میں عبدالملک نے ایک عظیم الشان لشکر مرتب کیا اور حسان بن نعمان غسانی کو افریقہ کا والی بنا کر اس کے ساتھ افریقہ روانہ کیا۔ چالیس ہزار فوج اس کے ہمراہ کی اور مصر کے خزانہ کی چابی اس کے ہاتھ میں دی کہ اس کو افریقہ کی مہم میں جس طرح چاہے صرف کرے۔ (المونس: ص ۳۱) ایک روایت یہ بھی ہے کہ اتنا بڑا لشکر اس سے قبل افریقہ نہ گیا تھا۔

افریقہ کی اس بغاوت میں رومی بھی بربریوں کے ساتھ تھے اور سسلی اور اسپین تک کی حکومتیں بربریوں کی پشت پناہی کر رہی تھیں۔ اس لیے حسان بن نعمان نے ان کا زور توڑنے کا عزم کر لیا۔ اس وقت شمالی افریقہ میں قرطاجنہ کی حکومت سب میں ممتاز اور قسطنطنیہ کی مرکزی حکومت کی باجگزار تھی۔ دارالسلطنت قرطاجنہ بحر روم کے ساحل پر نہایت خوب صورت اور مضبوط و مستحکم شہر تھا۔ لہٰذا حسان سب سے پہلے قیروان پہنچے اور وہاں سے پوری تیاریوں کے ساتھ قرطاجنہ کا رخ کیا۔ قرطاجنہ میں پہلے سے رومیوں اور بربریوں کا ایک انبوہ عظیم جمع تھا جس میں اسپین و سسلی تک کے رومی تھے۔ وہاں فریقین میں ایک خون ریز جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں رومی اور بربری میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ سسلی اور اسپین کی طرف فرار ہو گئے۔ حسان نے قرطاجنہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور برقہ پر رومیوں کی غارت گری کا پورا بدلہ لیا۔

Marfat.com

قرطاجنہ کے شکست خوردہ رومی اور بربری صطفورہ اور بینزت میں جمع ہوئے اس لیے قرطاجنہ کو فتح کرنے کے بعد حسان صطفورہ پہنچے اور ان کو شکست دے کر سارے علاقہ میں اپنی فوجیں پھیلا دیں۔ اس شکست سے رومیوں اور بربریوں میں بڑا خوف پھیل گیا۔ حسان کی ان فتوحات سے مسلمانوں کا اقتدار پھر افریقہ میں بحال ہو گیا۔ اب حسان کی فوج تھک گئی تھی، زخمیوں کی تعداد بھی کافی تھی اس لیے وہ واپس قیروان آ گئے۔

حسان کی شکست:

قیروان میں کچھ روز آرام کرنے کے بعد جب فوج تازہ دم ہو گئی تو حسان نے معلوم کیا کہ افریقہ کے بادشاہوں میں کوئی طاقتور بادشاہ تو باقی نہیں رہ گیا؟ لوگوں نے بتایا کہ ملکہ دانیہ جو کاہنہ کے لقب سے مشہور ہے جو جبل اوراس میں حکمران ہے، اس وقت افریقہ کی وہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسے سارے شمالی افریقہ کے رومی اور بربری مانتے ہیں۔ چنانچہ کسیلہ کے قتل کے بعد وہ اسی کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ حسان کو معلوم ہوا کہ اگر اسے ختم کر دیا تو تمام افریقہ میں امن وامان ہو جائے گا۔ اور پھر شمالی افریقہ میں ان کا کوئی مزاحم باقی نہ رہے گا۔ (المونس: ص ۳۱۔ ۳۲، اخبار المغرب: ص ۳۷) اس لیے چند روز قیروان میں آرام کرنے کے بعد حسان نے جبل اوراس کا رخ کیا۔ ملکہ کاہنہ کے پاس پہلے سے کافی تعداد میں رومی اور بربری جمع تھے۔ انھیں لے کر وہ حسان کے مقابلہ کے لیے نکلی۔ دریائے سکتاقہ پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ ایک خون ریز جنگ کے بعد حسان کو شکست فاش ہوئی۔ بہت سے مسلمان قتل اور گرفتار ہوئے۔ اور پھر سے تمام اسلامی مقبوضات ملکہ کے قبضہ میں آ گئے۔

اس شکست کے بعد حسان برقہ چلے گئے۔ عبدالملک کو اس کی اطلاع دی گئی۔ عبدالملک اس زمانہ میں خوارج سے ہنگامہ آرا تھا، اس لیے حسان کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ ملکہ کاہنہ پانچ سال تک افریقہ پر قابض رہی۔ اس عرصہ میں اس نے اہل افریقہ سے نہایت ظالمانہ برتاؤ کیا جس کی وجہ سے وہ اس سے تنگ آ گئے۔

سنہ ۷۸ھ میں، جب حالات بہتر ہوئے اور عبدالملک کو خوارج سے کچھ فراغت ملی تو اس نے کثیر تعداد میں فوج اور سامان جنگ بھیج کر حسان کو ملکہ کاہنہ پر فوج کشی کا حکم دیا۔

گذشتہ جنگ میں جن فوجیوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان میں ایک نوجوان خالد بن یزید قیسی بھی تھے۔ باقی سب مسلمان قیدیوں کو ملکہ نے رہا کر دیا لیکن خالد بن یزید کو اس کی بعض خوبیوں کے باعث ملکہ نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ حسان نے فوج کشی سے پہلے ایک خط حالات دریافت کرنے کے لیے خفیہ طور پر خالد بن یزید کے نام بھیجا۔ خالد نے جواب دیا کہ اس وقت رومی اور بربری منتشر ہو چکے ہیں، میدان بالکل خالی ہے، حملہ کے لیے اچھا موقع ہے۔ ملکہ کاہنہ کو کسی طرح اس پیام وسلام کی خبر ہو گئی۔ لیکن حسان ملکہ پر حملہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور ملکہ کے پاس اپنے دفاع کے لیے کوئی فوج نہ تھی، اس لیے اسے اپنی حکومت کے خاتمہ کا یقین ہو

Marfat.com

گیا۔اس نے اس خیال سے کہ مسلمان مال و دولت اور سیم و زر کے لالچ میں بار بار افریقہ پر حملہ کرتے ہیں، اس لیے اس نے بڑے بڑے شہروں، قلعوں، آبادیوں اور سرسبز و شاداب علاقوں کو جو دو ہزار میل میں پھیلے ہوئے تھے، بالکل ویران اور منہدم کر دیا تا کہ اس علاقہ کو ویران اور برباد دیکھ کر مسلمان اس طرف کا رخ نہ کریں، اور اگر وہ پھر بھی آ جائیں تو ان کے ہاتھ کچھ نہ لگے۔اس انہدام اور ویرانی سے ملک ویسے ہی بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام رعایا اس کے خلاف ہو گئی۔

اب جو حسان فوج لے کر شمالی افریقہ میں داخل ہوئے تو بربریوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور ملکہ کاہنہ کے مقابلہ میں ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔چنانچہ قابس اور قفصہ کے باشندوں نے جو اسلامی حکومت سے بغاوت کر چکے تھے، خود سے اطاعت قبول کر لی اور قسطلیلہ اور نفرادہ پر بھی بغیر کسی مزاحمت کے مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

عوام کی اس مخالفت کو دیکھ کر ملکہ کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا۔اس وقت اس نے اپنے دونوں لڑکوں کو کہا کہ میں بہت جلد قتل ہونے والی ہوں، تم خالد بن یزید کے وسیلہ سے حسان کے پاس جا کر اپنی جان بخشی کروا لو۔اس کی ہدایت کے مطابق خالد کی معرفت یہ دونوں حسان کے پاس چلے گئے اور وہیں رہ گئے۔

ملکہ کاہنہ کو اگرچہ اپنی شکست کا پورا پورا یقین تھا تاہم وہ حسان سے آخری مقابلہ کے لیے میدان میں نکلی۔دونوں میں بڑی خون ریز جنگ ہوئی۔ملکہ شکست کھا کر قتل ہوئی اور شکست خوردہ بربریوں نے نہ صرف جسمانی اطاعت قبول کر لی بلکہ بہت سے بربری دائرہ اسلام میں خلوص نیت سے داخل ہو گئے۔ملکہ کے قتل ہونے کے بعد حسان نے اس کے لڑکوں کی جان بخشی کر دی اور نومسلم بربریوں کی ایک بٹالین بنا کر ان کو اس کا افسر بنا دیا۔(کتاب المونس: ص ۳۲، ابن اثیر: ۴/۴۴)

ملکہ کی موت کے بعد افریقہ میں اب کوئی حریف باقی نہ رہا۔

حسان قیروان واپس آ گئے اور عبدالملک کی وفات تک وہیں مقیم رہے۔اس دوران میں انھوں نے اسلام کی اشاعت کی طرف خاص توجہ کی اور ان کی وجہ سے بربریوں کی ایک بہت بڑی تعداد دائرہ اسلام میں داخل ہوئی۔

Marfat.com

علمی ماحول

عبدالملک بن مروان ایک صاحب علم خلیفہ تھا۔ اگر یہ مسند خلافت پر نہ بیٹھتا تو فقہائے سبعہ میں سے ایک ہوتا۔ اس کے علمی کمالات کا مختلف صاحب علم حضرات نے اعتراف کیا ہے جس کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ کی جلد ۹ صفحہ ۶۱ تا ۶۹ میں نقل کیا ہے۔ بہر حال اس زمانہ میں تابعین میں سے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے۔ ابراہیم بن یزید نخعی ○ احنف بن قیس ○ اسود بن یزید ○ امام اعمش (سلیمان بن مہران) ایاس بن معاویہ ○ جابر بن زید ○ حسن بن حسن ○ حسن بصری ○ خارجہ بن زید ○ داؤد بن دینار رضی اللہ عنہ ○ ربیعۃ الرائے ○ رجاء بن حیوہ ○ سعید بن جبیر ○ سعید بن المسیب ○ سلیمان بن ایسار ○ قاضی شریح ○ سلمان بن طرخان ○ طاؤس بن کیسان ○ عامر بن شرحبیل شعبی ○ عامر بن عبداللہ ○ عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ ○ عبدالرحمن بن قاسم ○ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ○ عطاء بن ابی رباح ○ عکرمہ مولیٰ ابن عباس ○ علی بن حسین رضی اللہ عنہ ○ قاسم بن محمد بن ابی بکر ○ علقمہ بن قیس ○ قبیصہ بن ذویب ○ محمد بن اسحاق ○ محمد بن حنفیہ ○ محمد بن سیرین ○ محمد بن علی (امام باقر) ○ مسلم بن یسار ○ میمون بہ مہران ○ نافع بن جبیر ○ وہیب بن منبہ ○ یحییٰ بن سعید ○ ابواسحاق سبیعی ○ محمد ادریس خولانی ○ ابوالزناد ○ ابو بردہ بن ابی موسیٰ اشعری ○ ابو سلمہ عبدالرحمن رضی اللہ عنہم جیسے صاحب علم حضرات قرآن اور سنت کی تعلیم کو پھیلا رہے تھے مدینہ میں ''فقہائے سبعہ'' تمام علماء میں ممتاز سمجھے جاتے تھے جن کے نام حسب ذیل تھے:

① سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ ② قاسم بن محمد رضی اللہ عنہ ③ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ④ عبیداللہ بن عبداللہ ⑤ ابوبکر بن عبدالرحمن ⑥ خارجہ بن زید اور ⑦ سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ۔

فقہائے سبعہ نے چونکہ اپنی زندگی کے ایام اموی دور میں بسر کیے ہیں۔ اموی حکومت خلافت راشدہ اور عباسی حکومت کے مابین برزخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ ''اموی حکومت خلافت راشدہ سے تو اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ خلافت راشدہ اگر خالص دینی منہاج کا نام ہے تو اموی حکومت خاص دنیوی سیاسی نظام ہے اور دولت عباسی سے اس حیثیت سے الگ ہے کہ عباسی حکومت اگر عربوں اور عجمیوں کی ملی جلی حکومت ہے تو اموی حکومت خالص عربی حکومت ہے۔'' (تاریخ التمدن الاسلامی: ۱۸/۲) یہ جرجی زیدان کا

Marfat.com

اپنا خیال ہے وگرنہ اموی دور میں حکومت کے مختلف شعبوں اور معاشرہ میں بہت دینی اثرات موجود تھے۔''
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اموی حکومت میں جو علمی، اجتماعی اور دینی روح پائی جاتی تھی وہ اہل علم اور فقہائے سبعہ کی مرہون منت تھی۔ علماء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علمی ورثے سے مالا مال تھے۔ اس زمانہ میں بعض سیاسی اسباب کی بنا پر کچھ سیاسی پارٹیاں پیدا ہوگئیں تھیں ایسے ہی سیاسی انتشار اور نئی نئی قوموں کے اسلام میں داخل ہونے، اور پھر امویوں کے زمانے میں یونانی اور ہندی کتابوں کے تراجم سے بعض دینی فرقے پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں نت نئے فتنے پیدا ہو گئے۔ فقہائے سبعہ ان فرقوں کے پیدا کیے ہوئے مسائل سے نظر ہٹا کر شریعت کی سادہ اور اعلیٰ تعلیم کی حفاظت اور اشاعت میں لگے ہوئے تھے، لیکن پھر بھی ان کو کبھی کبھی ان کے خلاف زبان کھولنی پڑتی تھی۔ وہ فرقے جو اس زمانہ میں پیدا ہوئے ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

شیعیت:

یہ اگرچہ ایک خالص سیاسی تحریک ہے لیکن بعد میں اس نے ایک مذہبی فرقے کی شکل اختیار کر لی۔ ان کی مذہبی اور سیاسی کش مکش کی داستان بڑی طویل ہے۔

مستشرق ڈوزی کی رائے یہ ہے کہ

''شیعہ تحریک کی اساس فارسی ہے۔ عرب آزاد اور حریت پسند تھے جب کہ ایرانی شہنشاہیت نواز اور وراثتی حکومت کے قائل تھے۔ وہ جمہوریت اور انتخابی حکومت سے یک قلم نا آشنا تھے۔ یہ دیکھ کر کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ قریب ترین ہیں، خلافت کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دم بھرنے لگے۔ چونکہ سربراہ مملکت میں الٰہی پرتو دیکھنے کے پہلے سے عادی تھے، اس لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو انھوں نے یہی حیثیت دے کر یہ اعلان کر دیا کہ امام کی اطاعت واجب ہے یعنی وہ مفترض الطاعت ہے۔'' (فجر الاسلام: ص ۲۷۳)

یہی کچھ ان کے بارے علامہ ابن حزم نے بھی لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو الفصل فی الملل والنحل: ۱/۱۸۶، ۲/۱۱)

ان کا سیاسی منہج یہ ہے کہ امامت مصلحت عامہ کی چیز نہیں کہ امت مسلمہ کو سونپ دی جائے اور امام عوام کی رائے سے مقرر کیا جائے بلکہ یہ دین کا ستون اور اسلام کی اساس ہے۔ کسی نبی کے لیے اس سے غفلت برتنا اور امت کے حوالے کر دینا درست نہیں ہے بلکہ اس پر واجب ہے کہ وہ لوگوں کے لیے امام مقرر کرے۔ ایسے امام کو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم ہونا ضروری ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون: ص ۱۶۴)

ابتداء میں شیعیت ایک سیاسی تحریک تھی جس نے بعد میں مذہبی فرقے کی حیثیت اختیار کر لی۔ فقہائے سبعہ کے زمانہ میں یہ صرف تفضیلیت تک محدود تھی یعنی اس خیال کے لوگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شیخین سے افضل سمجھتے تھے۔

Marfat.com

خوارج:

خوارج کی ابتداء اس جنگ سے ہوئی جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین صفین میں ہوئی۔ چنانچہ طبری نے لکھا ہے کہ

”جو جماعت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ صفین گئی اس پوری جماعت میں الفت اور ہم آہنگی تھی لیکن واپسی پر باہم منتشر اور سینوں میں بغض و عداوت لے کر آئے۔ تحکیم کے مسئلہ پر یہ لوگ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے الگ ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ اللہ کے حکم کی توہین ہے۔ واپسی پر یہ لوگ کوفہ نہیں گئے بلکہ حروراء رہ گئے، ان کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ وہاں انھوں نے اپنی الگ تنظیم قائم کر لی۔“ (طبری:۱/۳۰)

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج نے فروہ بن نوفل کی قیادت میں ہنگامہ آرائی کی اور کوفہ میں ان سے مقابلہ ہوا، عبدالملک کی حکومت آئی تو مہلب بن ابی صفرہ کی کمان میں بصرہ ان کی جولان گاہ بنا۔ ان کا لیڈر مارا گیا اور میدان احنف بن قیس کے ہاتھ آیا۔ وہاں سے یہ لوگ کرمان اور اصفہان میں پھیل گئے۔ حکومت نے ان کا تعاقب کیا۔ بہت بڑی فوجی کارروائیوں کے باوجود حکومت ان کی یورشوں پر قابو نہ پا سکی۔ ولید اور سلیمان کے زمانوں میں یہ لوگ خاموش رہے لیکن عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ اقتدار میں شوذب نامی شخص نے پھر ہنگامہ کیا۔ ان کے چند مخصوص افکار و نظریات حسب ذیل تھے:

① خلیفہ کا تقرر آزادانہ اور منصفانہ انتخاب کے ذریعہ ہونا چاہیے جس میں سارے مسلمان حصہ لیں۔

② خلافت کسی عرب خاندان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

③ خلیفہ اس وقت تک اپنے منصب پر قائم ہے جب تک وہ عدل و انصاف کا دامن تھامے ہوئے ہے اور شریعت کے احکام کو نافذ کر رہا ہے۔ اگر ان کو چھوڑ دے تو اس کا عزل واجب ہے۔

④ خوارج ہر گنہ گار کو کافر سمجھتے تھے خواہ یہ گناہ ارادہ سے ہو یا بلا ارادہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تحکیم کے معاملے میں وہ (معاذ اللہ) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھی کافر سمجھتے تھے تبھی تو ان کے قتل کے درپے ہوئے۔ وہ موالی کو حقیر جانتے تھے۔ مسلمان کا قتل روا سمجھتے تھے۔ وغیرہ۔

خوارج بھی شیعوں کی طرح سیاسی اور دینی تحریک تھی، لیکن ان پر دین کا غلبہ تھا اس لیے ان کے عقائد و اعمال میں بعض خوبیاں تھیں، مثلاً وہ انتہائی عبادت گزار اور دیانت دار تھے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتے اس میں دینی رنگ بھی غالب ہوتا تھا۔ ان کا سب سے بہتر عقیدہ یہ تھا کہ خلافت کسی خاندان یا گروہ کے لیے مخصوص نہیں، اور سب سے غلط عقیدہ یہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ تک جہنم میں رہے گا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

Marfat.com

''میرے بعد خوارج سے جنگ نہ کی جائے اس لیے کہ جس شخص نے حق طلب کیا مگر اس میں اس سے غلطی ہوئی وہ اس شخص کی طرح نہیں جس نے باطل طلب کیا اور اسے پا بھی لیا۔''

(فجر الاسلام: ص ۳۱۵)

اور عمر بن عبدالعزیز ان کو مخاطب کر کے فرماتے تھے کہ

''میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ موقف دنیا اور نتائج دنیا کے لیے اختیار نہیں کیا بلکہ آخرت کے لیے اختیار کیا ہے لیکن راستہ اختیار کرنے میں تم سے غلطی ہوئی۔'' (ابن اثیر: ۲/ ۳۶)

ابتداء میں خوارج اگرچہ ایک خالص سیاسی تنظیم تھے لیکن بعد میں انھوں نے دینی لبادہ پہن کر ایک دینی فرقے کی حیثیت اختیار کر لی۔

"كانت صنعة الخوارج منذنشئتهم صنعة سياسية خالصة"

(تاریخ الاسلام السیاسی: ص ۳۰۱)

حسن ابراہیم حسن ہی نے پروفیسر نکلسن کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

''عبدالملک کی خلافت تک خوارج ایک سیاسی تنظیم تھی، بعدازیں انھوں نے اپنے سیاسی افکار میں دینی عقائد کی آمیزش کر لی اور انھوں نے دعویٰ کر دیا کہ اوامر دین پر عمل جز وایمان ہے، اور ایمان صرف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور سرکار دو عالم ﷺ کی نبوت و رسالت پر اعتقاد کا نام نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس کے ساتھ فرائض دینی کی پابجائی نہ کرے گا اور کبائر کا مرتکب ہوگا وہ کافر ہے۔ ان کے دینی عقائد میں سیاسی عصبیت کا بہت ہاتھ تھا۔ دین کی حد تک ان میں بے حد صلاحیت تھی۔ مروت اور یُسر سے ان کی زندگی یک قلم خالی تھی۔'' (عربک ہسٹری: ص ۲۱۰، بحوالہ تاریخ الاسلام السیاسی: ص ۳۰۲)

فقہائے سبعہ کا پورا زمانہ ان سیاسی شورشوں اور ہنگاموں سے بھرپور ہے۔ یہ حضرات اگرچہ ان ہنگاموں سے الگ تھلک رہے مگر پھر بھی گاہے گاہے انھیں ان فتنوں کے بارے میں کہنا پڑتا تھا۔

فقہائے سبعہ کے معاشرہ پر اثرات:

بنوامیہ کے اس اقتدار اور اس کے قدرتی اسباب کے باوجود اس عہد تک دین کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر کافی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم رہا۔ یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر فقہائے سبعہ اور دوسرے ائمہ فقہ کی بدولت تھا جو دینی اور علمی حیثیت سے بلند مقام کے حامل تھے اور اپنی للّٰہیت، اخلاص، پاکیزہ نفسی اور علم و تفقہ میں مشہور تھے، حکومت اور انتظامات حکومت سے باہر انہی حضرات کا اثر و اقتدار تھا۔ اس اثر اور قلبی احترام کے باعث مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے۔ یہ تمام دینی شخصیتیں سب با اثر اور عوام کی محبوب تھیں جو زہد و ورع اور عبادت و تقویٰ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کا جو تعلق تھا اس کا

Marfat.com

اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایک دن ہشام بن عبدالملک بیت اللہ میں آیا تو اچانک وہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پوتے سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی۔ ہشام نے کہا: ''سالم! مجھ سے کچھ مانگئے۔'' فرمایا: ''مجھے اللہ کے گھر میں غیر اللہ سے کچھ مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔'' سالم باہر آئے تو ہشام نے پھر کہا: ''اب تو آپ اللہ کے گھر سے باہر ہیں، اب کچھ اپنی ضرورت بتائیے؟'' فرمایا: ''کون سی ضرورت؟ دنیوی یا اخروی؟'' ہشام نے کہا: ''دنیوی۔'' فرمایا: ''دنیا تو میں نے کبھی دنیا کے مالک سے نہیں مانگی اس لیے اس سے کیسے مانگوں جو دنیا کا مالک ہی نہیں ہے۔'' (البدایہ والنہایہ: ۲۳۵/۱۱)

فقہائے سبعہ اور دوسرے ائمہ فقہ وحدیث اسلام کی صحیح زندگی کا نمونہ تھے۔ انھوں نے اپنی خودداری، اقتدار سے بے تکلفی، علمی انہماک، بے باکی اور بے غرض خدمت دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش لوگوں کے دلوں پر قائم کر دیا تھا۔ حکومت کے بڑھتے ہوئے ہمہ گیر اثرات کے مقابلہ میں یہ اخلاقی اثر اگرچہ کافی نہ تھا لیکن یہ بے نتیجہ اور بے قیمت بھی نہ تھا۔ اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال وتوازن اور دین کا احترام قائم تھا اور کبھی کبھار عین دنیوی انہماک میں بھی اصلاح احوال کا جذبہ ابھرتا تھا۔ حکومت واقتدار پر ان کے اثر کا اندازہ کرنا ہو تو عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا یہ بیان پڑھیے:

''جب عوامی زندگی میں کوئی دریافت طلب مسئلہ درپیش آتا تو فقہائے سبعہ مل کر بیٹھتے اور اس پر غور وفکر کرتے، اور ریاست میں کوئی عدالت اس وقت تک فیصلہ نہ کرتی جب تک معاملہ ان کے روبرو پیش نہ ہوتا اور یہ اس پر غور وفکر کر کے قرآن وسنت کی راہ نمائی میں فتویٰ نہ دیتے۔''

(تہذیب التہذیب: ۱۳۷/۳)

امویوں کی اس فوجی اور مارشل حکومت میں حالات پر اتنا قابو پالینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ ان حضرات فقہاء کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اموی حکومت ایسی مستحکم اور مضبوط بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے اس کو ہلایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس وقت کوئی اندرونی یا بیرونی طاقت ایسی نہ تھی جو اسے میدان جنگ میں شکست دیتی۔ ماضی قریب میں دو بڑی تحریکیں ناکامی کا منہ دیکھ چکی تھیں۔ ایک سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا سرفروشانہ اقدام، دوسرے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا دلیرانہ اور منظم مقابلہ۔ اس وقت اسلام کو غالب ہونے کے لیے ایک معجزے کی ضرورت تھی۔ فقہائے سبعہ اور دیگر ائمہ فقہ نے شاہی خاندان کے افراد کو تعلیم وتربیت کے ذریعے تیار کرنا شروع کیا۔ پہلے عبدالملک پر محنت کی مگر ناکامی ہوئی، پھر بانی خاندان کے پوتے عمر بن عبدالعزیز کو تعلیم وتربیت کے ذریعے تیار کیا۔ یہ تیر نشانے پر لگ گیا۔ عمر بن عبدالعزیز دراصل فقہائے سبعہ اور دیگر فقہاء کا ایک اعجازی کارنامہ ہیں اور اتنا بڑا کارنامہ کہ بنوامیہ کے خاندان میں ایک خلیفہ راشد پیدا ہوگیا۔ جس نے ملک اور معاشرہ میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا کہ لوگوں کو سیدنا عمر بن خطاب کا زمانہ یاد آگیا۔

Marfat.com

سعید بن المسیب:

ان فقہاء میں سب سے پہلا نام سیدنا سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کا آتا ہے۔ سعید بن مسیّب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوسرے سال پیدا ہوئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت جو کہ سنہ ۲۳ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر ۸ سال تھی۔ والد کی جانب سے آپ قرشی تھے اور والدہ کی طرف سے سلمی۔ (جمہرۃ انساب العرب: ص ۱۲، معارف: ص ۱۹۳)

آپ کے والد اور دادا حزن دونوں صحابی تھے۔ (الاصابہ: ۹۹/۶) آپ کے والد مسیّب بیعت رضوان سے تعلق رکھتے تھے۔ (جمہرۃ انساب العرب: ص ۱۴۱) آپ کے دادا حزن بھی ایک سپاہی تھے۔ حزن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نام دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرا نام حزن ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں تم سہل ہو۔'' آپ نے یہ ایک بار نہیں تین بار فرمایا۔ حزن نے کہا میں ماں باپ کا رکھا ہوا نام نہیں بدلوں گا۔ (البدایہ والنہایہ: ۲۳۵/۱۰) آخر کار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اچھا تم حزن ہو۔'' سعید بن المسیب فرماتے ہیں: ''بس اسی روز سے ہمارا گھرانا حزونت کا شکار ہے۔

مدینہ منورہ ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر تعداد کی وہاں بودوباش تھی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک محدثین، فقہاء مفسرین اور قراء کا ایک جم غفیر وہاں موجود تھا۔ لوگ دور دور سے رخت سفر باندھ کر مدینہ آئے تھے۔ اس بابرکت ماحول میں سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ نے نشوونما پائی۔ بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت کا شرف آپ کو حاصل ہوا اور آپ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے طلب علم میں دن رات ایک کر دیئے۔ خود فرماتے ہیں کہ میں ارشادات نبوت کی تلاش میں دن رات چلتا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۱۲۰/۵) حافظہ نہایت تیز تھا لہٰذا جو کچھ بھی ان کے کان سے گزرتا دل اس کو صحیح طور پر محفوظ کر لیتا۔ (طبقات: ۱۲۲/۵) علم حدیث حاصل کرتے وقت اس کا بے حد ادب واحترام کرتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ: ۱۰۰/۹) پھر انھوں نے اتنا علم حاصل کیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی ہی میں ان کی شہرت اطراف واکناف میں پہنچ گئی۔ چنانچہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی ہی میں یہ افتاء کا کام کرتے تھے۔ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ''مدینہ کے ہر عالم کا علم میرے پاس موجود ہے لیکن سعید کے علم کے لیے مجھے محنت کرنا پڑتی ہے۔'' (تہذیب الاسماء: ۲۱۳۲/۱) اور مکحول کہتے ہیں کہ میں نے ساری مملکت اسلامیہ کا سفر کیا لیکن مجھے سعید بن المسیب سے زیادہ عالم کوئی نہیں ملا۔ (تہذیب التہذیب: ۸۵/۴) مختصر یہ کہ سعید بن المسیب میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی صفات جمع کر رکھی تھیں۔ قوت حافظہ نہایت تیز، علم نہایت باکمال اور جامع، صبر وضبط میں اپنی مثال آپ، بے لوثی اور نزاہت کا بہترین مظہر اور حق گوئی اور بے باکی میں نہایت جلالت شان کے حامل تھے۔

خلافت راشدہ کا دور ہر قسم کے برکتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا اور زمانہ نبوت کی تمام تر سعادتیں اور برکتیں اور اسلام کی تمام اخلاقی اور قانونی خوبیاں حکومت اور معاشرے میں پورے جوبن پر تھیں۔

Marfat.com

اس عہد سعید کے بعد سوء اتفاق سے اقتدار کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو اپنی بہت سی انفرادی اور اسلامی خصوصیات کے باوجود سیاسی میدان اور حکومت کے ایوان میں اپنی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا نہ کر سکے۔ جس کے نتیجہ میں اسلامی خلافت شخصی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔ اس تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں بعض نئی اور بعض دبی ہوئی برائیاں پھر ابھرنے لگیں، لیکن ایوان کے باہر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت موجود تھی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی سے ہرگز نہیں چوکتی تھی اور اس راہ میں انھوں نے وہ سب کچھ برداشت کیا جو راہ حق کے راہ نوردوں کو ہمیشہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ لوگ ایوان حکومت کو کما حقہ تو نہ بدل سکے لیکن ایوان حکومت کے باہر معاشرے کا ذہن خلافت اور حکومت کے جوہری فرق سے آشنا رہا، معاشرے کی اکثریت دین اسلام پر قائم رہی، معاشرہ فتنوں کو فتنہ ہی سمجھتا رہا اسے دین نہیں سمجھا۔

واقعہ حرہ میں مؤرخین نے بڑی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ بہر حال سعید بن المسیب کو اس واقعہ میں کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچا، اس لیے کہ ان کے جسم میں توانائی نہ تھی۔ ان کے قلب میں ایمان تھا۔ استبداد نے ان کو اپنے تئیں عروس مرگ سے ہم کنار کر دیا۔ ۸۵ھ میں عبدالملک نے اپنی زندگی میں اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کی ولایت عہد کی تحریک اٹھائی۔ اس تحریک کا باعث بقول حافظ ابن کثیر حجاج تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک وفد عمران بن عصام کی قیادت میں مدینہ منورہ روانہ کیا۔ ادھر عبدالملک کے بھائی عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا۔ اب میدان صاف تھا۔ چنانچہ ان سب سے پہلے ان دونوں بیٹوں کی ولایت عہد کے لیے دمشق میں بیعت لی گئی۔ بعد ازاں تمام مملکت اسلامیہ میں بیعت کی یہ تحریک سرکاری طریقے سے چلی، لیکن یہ تحریک جب مدینہ منورہ پہنچی تو سعید بن المسیب نے یہ کہہ کر بیعت کرنے سے انکار کر دیا کہ "میں جب تک عبدالملک زندہ ہے اور کسی کی بیعت نہ کروں گا۔" (انساب الاشراف: ۱/۴۴۴) ابو نعیم اصفہانی نے لکھا ہے کہ جب ان دو صاحب زادوں کی ولایت عہد کے لیے بیعت کی دعوت دی گئی تو سعید نے کہا کہ جب تک لیل و نہار کی گردش قائم ہے میں دو کی بیعت نہ کروں گا۔" (حلیۃ الاولیاء: ۳/۱۷۰)

والی مدینہ ہشام بن اسماعیل نے صورت حال سے عبدالملک کو اطلاع دی کہ سعید کے سوا تمام لوگوں نے بیعت کر لی ہے۔ عبدالملک نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا اس میں تازیانوں کی سزا کا بھی ذکر تھا۔ جب مدینہ کے گورنر کے پاس خط پہنچا تو اس نے شہر کے سر برآوردہ لوگوں کو بلایا اور انھیں سعید بن المسیب کو سمجھانے کے لیے ان کے پاس بھیجا۔ ان حضرات نے کہا کہ مرکزی حکومت کے آپ کے بارے میں خاص آرڈر آئے ہیں کہ اگر آپ بیعت نہ کریں تو آپ کو قتل کر دیا جائے۔ ہمیں آپ کی زندگی بے حد عزیز ہے لہٰذا آپ ہماری تین باتوں میں سے ایک بات ضرور مان لیں۔ پہلی یہ کہ جب گورنر مدینہ آپ کے سامنے عبدالملک کا خط پڑھے تو آپ بالکل خاموش رہیں۔ ہاں یا نہ کچھ نہ کہیں، سعید نے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ لوگ کہیں

Marfat.com

گے کہ سعید نے بیعت کر لی۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ فرمایا: ''دوسری بات کیا ہے؟'' کہا گیا کہ آپ چند روز مسجد میں نماز کے لیے تشریف نہ لائیں بلکہ گھر ہی میں رہیں۔ فرمایا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کانوں سے حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کی آواز سنوں اور مسجد نہ جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے تیسری بات پوچھی تو ان حضرات نے کہا: ''تیسری بات یہ ہے کہ آپ چند دنوں کے لیے مسجد نبوی میں اپنی نشست تبدیل کر لیں۔ فرمایا: ''میں مخلوق کے ڈر سے ایک بالشت بھی آگے پیچھے ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' (حلیۃ الاولیا: ۱۷۱/۳)

یہ سر برآوردہ تینوں حضرات واپس آگئے۔ ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہشام گورنر مدینہ نے آپ کو بلایا اور کہا: ''امیر المومنین کا خط آیا ہے کہ اگر آپ بیعت نہ کریں تو آپ گردن زدنی ہیں۔'' اس کے جواب میں سعید بن المسیب نے سب لوگوں کے سامنے برملا اپنا موقف بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک وقت میں دو بیعتوں سے منع فرمایا ہے۔'' یہ کہنا تھا کہ آپ کو باہر لے جایا گیا، گردن ناپ لی گئی اور تلواریں بے نیام ہو کر ہوا میں لہرانے لگیں اور ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ تلوار کے ایک ہی وار سے گردن تن سے جدا ہو جائے گی لیکن ہوا یہ کہ آپ کو برسر عام پچاس کوڑے مارے گئے اور پھر اسی ہیئت کذائی میں آپ کا جلوس نکالا گیا۔ (حلیۃ الاولیاء: ۱۷۲/۲)

صرف تازیانوں ہی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اہانت و تذلیل کے بعد قید کی سزا بھی تجویز کی گئی۔ جیل میں بھی صرف نظر بند نہیں رکھا گیا بلکہ بڑی ہولناک سزائیں دی گئیں۔ دوست احباب جیل میں جا کر انھیں سمجھاتے لیکن وہ اپنے موقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ مشہور فقیہ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بھی سعید کو سمجھانے کے لیے خود جیل گئے۔ بہت سمجھایا لیکن ان کے عزم میں کوئی لغزش اور جنبش پیدا نہ ہوئی۔ باہر آ کر انھوں نے گورنر مدینہ کے پوچھنے پر بتایا کہ واللہ! سعید تو مار کے بعد پہلے سے بھی زیادہ بے نیام تلوار ہو گئے ہیں۔ اس لیے آپ ان سے توجہ ہٹا لیں۔ (طبقات ابن سعد: ۱۲۷/۵)

قبیصہ بن ذویب [1] عبدالملک کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ تمام شاہی ڈاک پہلے ان کے پاس آتی

---

[1] قبیصہ بن ذویب مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ (تہذیب الاسماء: ۹۶/۱) شروع میں مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔ پھر شام میں سکونت اختیار کر لی۔ اور عبدالملک کے زمانہ میں ڈاک کی ساری ذمہ داری کا عہدہ ان کے پاس تھا۔ جو خطوط بھی آتے یہ ان کو پڑھ کر پھر عبدالملک کے سامنے پیش کرتے۔

قبیصہ مدتوں مدینہ میں رہے۔ ان کے زمانہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد مدینہ میں موجود تھی۔ ان سے فیض حاصل کیا۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ ان کی توثیق اور علمی جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء: ۱۵۶/۱) بڑے بڑے معاصر علماء ان کی جلالت علمی کے معترف تھے۔ چنانچہ مکحول شامی اور زہری نے ان کے کمال علمی کو بیان کیا ہے۔ (تہذیب الاسماء: ۱۵۶/۱، تہذیب التہذیب: ۳۴۶/۸) فقہ میں بھی درک رکھتے تھے۔ اور مدینہ کے فقہا صالحین میں سے تھے۔ (تہذیب التہذیب: ۳۴۶/۸) ان کی وفات سنہ ۸۶ھ میں ہوئی۔ (طبقات ابن سعد: ۱۳۱/۵)

Marfat.com

تھی، یہ پڑھ کر اس کو عبدالملک کے سامنے پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ہشام کا خط بھی جس میں اس نے عبدالملک کو اپنی کارگزاری کی اطلاع دی تھی، پہلے قبیصہ کے ہاتھ آیا۔ یہ بڑے عاقبت اندیش اور مصلحت شناس اور سب سے بڑھ کر سعید کے مرتبہ شناس تھے۔ اس لیے ہشام بن اسماعیل گورنر مدینہ کی کارگزاری پڑھ کر بہت برہم ہوئے اور اسی وقت عبدالملک کے پاس خط لے جا کر کہا: ''امیرالمومنین! ہشام خودرائی سے جو چاہتا ہے سعید بن المسیب کو اس طرح مارتا اور ان کی تشہیر کراتا ہے۔ خدا کی قسم! وہ اس تشدد اور مار سے اور زیادہ سخت ہو جائیں گے۔ اگر وہ بیعت نہ کریں تب بھی ان سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن سے رخنہ اندازی اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی برائی کا خطرہ ہو۔ وہ اہل السنّت والجماعت میں سے ہیں۔ آپ خود سعید کو اس کی معذرت لکھیے۔ عبدالملک نے کہا آپ ہی اپنی طرف سے لکھ دیں اور یہ ظاہر کریں کہ ہشام نے میرے منشاء اور میری مرضی کے خلاف یہ سب کارروائی کی ہے۔ چنانچہ قبیصہ نے اسی وقت سعید بن المسیب کو خط لکھ دیا انھوں نے اس خط کو پڑھ کر کہا کہ جس نے مجھ پر ظلم کیا ہے اس کے اور میرے درمیان خدا ہے۔ (ابن سعد: ۱۷۲/۵)

ابن مسیّب کو خط بھجوانے کے بعد عبدالملک نے ہشام کو بھی ایک تنبیہی اور ملامت آمیز خط بھیجا اور لکھا:

''اللہ کی قسم! سعید بن المسیب مارے جانے کے بجائے صلہ رحمی کے زیادہ مستحق ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ان سے کسی مخالفت اور تفرقہ کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' (طبقات ابن سعد: ۱۷۳/۵)

یہ خط پڑھ کر ہشام سخت نادم اور شرمسار ہوا اور اسی وقت سعید کو رہا کر دیا۔

عبدالملک کے بعد ولید سے سعید بن المسیب کی کوئی مخالفت نہیں ہوئی۔ انھوں نے کبھی اس کے سامنے سرنیاز نہیں جھکایا۔

طبقات کی روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک وقت وہ بھی آیا جب سعید کا سوشل بائیکاٹ کیا گیا۔ لوگوں کو ان سے ملنے سے روکا گیا تاکہ ان کے خیالات لوگوں میں نہ پھیل جائیں۔ وہ خود بھی لوگوں کو اپنے پاس نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ چنانچہ ابونعیم نے نقل کیا ہے کہ ''جب بھی کوئی شخص سعید کے پاس آتا آپ اس سے کہہ دیتے کہ مجھے حکومت نے سزا دی ہے اور مجھ سے لوگوں کا ملنا جلنا قانوناً بند کر دیا ہے۔'' (حلیۃ الاولیاء: ۱۷۲/۲)

ابویونس القربی کہتے ہیں کہ ''میں مسجد نبوی کے اندر گیا تو دیکھا کہ سعید بن المسیب اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ اکیلے کیوں بیٹھے ہیں؟ فرمایا اس لیے کہ حکومت کی جانب سے لوگوں کو مجھ سے ملنے جلنے سے منع کر دیا گیا ہے۔'' (طبقات ابن سعد: ۱۲۸/۵)

جب اللہ کے اس درویش سے سختی سے کام نہ بنا تو نرمی شروع کر دی، لیکن دیکھا یہ گیا کہ صاحب اقتدار اگر اپنے اقتدار میں مست ہوتا ہے تو درویش خدامست اپنی کھال میں مست ہوتا ہے۔ اس نرمی کا مطلب یہ تھا سعید کی استقامت کے سامنے حکومت نے ہتھیار ڈال دیے۔ عمران بن عبداللہ کا بیان ہے کہ عبدالملک حج

Marfat.com

کے لیے مدینہ منورہ آیا۔ مسجد نبوی کے دروازے پر ٹھہر کر مسجد کے اندر ایک آدمی کو بھیجا کہ سعید بن المسیب کو بلا لاؤ۔ لیکن صرف آنے کی دعوت دینا کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ وہ آدمی مسجد کے اندر گیا اور عبدالملک کا پیغام دیا کہ امیر المومنین مسجد کے دروازے پر کھڑے آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا: ''نہ امیر المومنین کو میری ضرورت ہے اور نہ مجھے امیر المومنین کی۔'' ایلچی نے آکر جواب سنا دیا۔ ایلچی کو پھر بھیجا گیا کہ کہو امیر المومنین آپ سے کچھ بات کہنا چاہتے ہیں۔ سعید نے اب کی دفعہ پہلا ہی جواب دیا۔ ایلچی نے کہا کہ اگر مجھے ہدایت نہ ہوتی تو میں تمھارا سر لے جاتا۔ امیر المومنین تم کو بلا رہے ہیں اور تم اس قدر ترش جواب دیتے ہو۔ فرمایا: کہ اگر ان کا ارادہ خیر کا ہے تو تم ہی اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر اس کے علاوہ کوئی ارادہ ہے تو میں ایک انچ بھی چلنے کو تیار نہیں ہوں۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کرلے۔ ایلچی نے یہ تمام باتیں عبدالملک کو آکر سنا دیں تو عبدالملک نے کہا: ''ابو محمد! اللہ تجھ پر رحم کرے، سختی ہی سختی ہے نرمی کا نام ونشان نہیں۔ (طبقات ابن سعد: ۱۲۰/۵) اب ایک حربہ یہ اختیار کیا گیا کہ عبدالملک نے اپنے ولی عہد بیٹے ولید کے لیے سعید بن المسیب کی بیٹی کا ہاتھ مانگ لیا لیکن سعید نے اس رشتہ داری سے بھی انکار کر دیا۔ (حلیۃ الاولیاء: ۱۹۸/۲)

ابوبکر بن عبدالرحمٰن:

مدینہ طیبہ کے فقہائے سبعہ میں سے ایک ابوبکر بن عبدالرحمٰن تھے۔ یہ سنہ ۲۳ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۹۴ھ میں وفات پائی۔ نمازیں بہت کثرت سے پڑھتے تھے اس وجہ سے انھیں راہب قریش کہا جاتا تھا۔

(حلیۃ الاولیاء: ۱۸۸/۱)

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت ان کے والد کی عمر ۱۳ سال تھی۔ دیانت وتقویٰ اور علم وعمل اپنے وقت میں انھیں امامت کا درجہ حاصل تھا۔ ابوبکر کے والد عبدالرحمٰن کثیر الاولاد تھے۔ ان کے سترہ لڑکے اور سترہ لڑکیاں تھیں۔ (طبقات ابن سعد: ۶/۵) ابوبکر بن عبدالرحمٰن کی والدہ کا نام فاختہ بنت عتبہ ہے۔ ان فاختہ سے عبدالرحمٰن کے چھ لڑکے تھے۔ ابوبکر، عمر، عثمان، محمد، عکرمہ اور خالد (جمہرۃ انساب العرب: ۱۴۵/۱) ابوبکر کے تمام بھائی علمی شان اور جلالت قدر کے لحاظ سے ایک بلند مقام کے حامل تھے۔ (تہذیب التہذیب: ۳۱/۱۲)

ابوبکر نے بڑے جلیل القدر اساتذہ سے علم حاصل کیا جن کی فہرست نووی نے تہذیب الاسماء: ۱۹۴/۱، اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ: ۵۹/۱ میں دی ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی ہی میں ان کے علم کی شہرت تمام اطراف مملکت میں پھیل گئی تھی۔ مدینہ کے علاوہ مکہ میں بھی ان کی جلالت علمی کا آوازہ ان کے قیام مکہ کے زمانہ میں گشت کرنے لگا تھا۔ (طبقات: ۳۸۵/۳)

فقیہ ابوبکر بن عبدالرحمٰن اپنے کردار کے لحاظ سے ملنسار اور شیر وشکر رہنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ وہ وقت کے سیاسی جھمیلوں سے الگ تھلگ اور وقتی شورشوں سے بے رخ ہوکر علمی زندگی گزارتے تھے۔ نہ تو وہ

Marfat.com

مناقشات میں حصہ لیتے تھے اور نہ وہ اپنی جلالت علمی کی بنا پر کسی قسم کی آویزش کو پسند کرتے تھے۔ وہ سیاسی ناخوش گواریوں میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے درمیان برزخ تھے۔ ان کے دونوں سے یکساں خوش گوار تعلقات تھے۔ اس دور میں جب کہ اکابر دو حصوں میں منقسم تھے۔

کچھ اقتدار کا ساتھ دینے والے اور کچھ حزب اختلاف سے تعاون کرنے والے، ابوبکر نے اپنے آپ کو اپنے اعمال، اخلاق اور علم کے لحاظ سے کچھ ایسے سانچے میں ڈھال لیا تھا کہ دونوں کا یکساں احترام کرتے تھے اور ان کو دونوں کا اعتماد حاصل تھا۔ نہ وہ قاسم بن محمد کی طرح صموتا کا مصداق تھے اور نہ سعید بن المسیب کی حزب اختلاف کی قیادت کر رہے تھے بلکہ افراط وتفریط کی دونوں راہوں سے ہٹ کر انھوں نے اعتدال کی نئی شاہراہ بنائی تھی۔ یہ راہ ان دونوں کے بین بین تھی۔ وہ حکمرانوں سے ملتے تھے اور ان سے تعلقات بھی رکھتے تھے۔ جس زمانے میں مدینہ کا گورنر ہشام تھا اور اس نے سعید بن المسیب کو عبدالملک کے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کی ولایت عہد کی بیعت نہ کرنے کی پاداش میں جیل میں ڈال دیا تھا۔ حکمران جماعت نے سعید سے جیل میں بات کرنے کے لیے ابوبکر ہی کو منتخب کیا۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے:

''سعید بن المسیب کے پاس جیل میں ابوبکر گئے اور بیعت کے موضوع پر سعید سے گفتگو کی۔ ان سے یوں گویا ہوئے کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں اور سٹھیا گئے ہیں۔ سعید نے کہا: ''ابوبکر! اللہ سے ڈر، اس کا ساتھ دے۔'' ابوبکر ان کو بار بار سمجھاتے رہے اور بتاتے رہے کہ آپ کی بات عقل وحکمت کی نہیں، یہ تو صرف بڑھاپے میں سٹھیانے کی نشانی ہے۔'' سعید نے کہا: ''اللہ نے تجھے دل اور آنکھوں کی بینائی سے محروم کر دیا ہے۔'' ابوبکر ان کے پاس سے اٹھے اور گھر آ گئے۔ مدینہ کے گورنر نے ان کو بلا کر دریافت کیا کہ سعید کچھ نرم پڑے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''وہ آپ کے کرتوت کے بعد پہلے سے بھی سخت ہو گئے ہیں۔'' آپ ان سے بے رخ ہو جائیے وہ آپ کے ہتھ کنڈوں سے ہرگز باز نہ آئیں گے۔'' (طبقات ابن سعد: ۱۲۷/۵)

ابوبکر بن عبدالرحمٰن کے سربراہ مملکت عبدالملک بن مروان سے دیرینہ مراسم تھے۔

(نسب قریش، مصعب زبیری: ۳۰۴/۱)

شاید ان ہی تعلقات کی بنا پر ابوبکر نے ہشام اور سعید بن المسیب کی داستان سے عبدالملک کو مطلع کیا ہوگا، اس کی مثبت تصریح نہیں ملتی، مگر قیاس یہی ہے کہ ابوبکر نے ہشام کی عبدالملک سے شکایت کی۔ لیکن جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ہم نے لکھا ہے کہ یہ ڈانٹ ڈپٹ کا خط قبیصہ بن ذویب کی وجہ سے لکھا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے بھی عبدالملک کو مطلع کیا ہو۔ ابن سعد نے ہی طلحہ بن محمد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

''ہشام بن اسماعیل کے پاس عبدالملک کا خط آیا جس میں ہشام کو سعید بن المسیب کو سزا دینے پر بہت بری طرح ڈانٹا تھا۔ اور خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر تم سعید کو کچھ نہ کہتے تو سعید تمھیں کچھ بھی

Marfat.com

نقصان نہ دیتا۔'' (طبقات ابن سعد: ۱۲۷/۵)

کہتے ہیں کہ اس خط کے موصول ہونے پر ہشام کو اپنی جگہ بڑی ندامت ہوئی۔ اور سعید بن المسیب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ ابوبکر کے عبدالملک کے یہاں ذو منزلت ہونے کا اندازہ اور ان سے تعلقات کی معیار کا پتہ مصعب زبیری کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے کہ عبدالملک موت کے وقت بھی ابوبکر کو نہ بھولا۔ اس نے مرض الموت میں اپنے بیٹے ولید کو وصیت کی کہ ابوبکر کا خاص خیال رکھنا۔ وہ میرے دوست ہیں۔ بلکہ ابن سعد کی ایک روایت سے اس بات کا انکشاف بھی ہوتا ہے کہ مدینہ میں خواہ حکومت کے خلاف عبدالملک کے زمانہ میں کتنی سیاسی تحریکیں اٹھیں اور مدینہ والوں نے ان میں کیسا ہی حصہ کیوں نہ لیا، لیکن صرف ابوبکر کی وجہ سے مرکزی حکومت مدینہ والوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرتی تھی۔ چنانچہ عبدالملک کا بیان ہے کہ

''میں کئی بار مدینہ والوں کو ان کی حکومت کے خلاف کارروائیوں کی پاداش میں سزا دینا چاہتا ہوں اور اس کا ارادہ بھی کرتا ہوں لیکن مجھے ابوبکر بن عبدالرحمٰن یاد آ جاتے ہیں۔ اس سے مجھے شرم آ جاتی ہے اور معاملہ کو چھوڑ دیتا ہوں۔'' (طبقات ابن سعد: ۲۰۹/۵)

ابوبکر کے عبدالملک سے تعلقات کب سے تھے اور کیوں کر پیدا ہوئے؟ دراصل ابوبکر کے عبدالملک سے اس زمانے کے تعلقات تھے جب عبدالملک ابھی مسند خلافت پر نہ بیٹھا تھا۔ (البدایہ والنہایہ: ۶۲/۹) سولہ سال کی عمر میں عبدالملک کو جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کا والی بنایا اس دور کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ فقہاء، علماء، صلحاء اور عباد کی ایک مجلس لگایا کرتا تھا۔ (البدایہ والنہایہ: ۶۲/۹) عبدالملک بھی امیر مدینہ ہونے کی حیثیت سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فقہاء کی اس مجلس کا ممبر تھا کیونکہ وہ بھی زمرۂ فقہاء میں تھا۔ اس مجلس کے ارکان کے بارہ میں ایک رکن نے بیان کیا ہے:

''ہم سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں رات کو مسجد نبوی میں علمی اجتماع کرتے تھے۔ اس میں بھی قبیصہ بن ذویب، مصعب بن زبیر، عروہ بن زبیر، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، عبدالملک بن مروان، عبدالرحمٰن بن مسور، ابراہیم بن عبدالرحمٰن اور عبیداللہ بن عبداللہ شریک ہوتے تھے۔'' (انساب الاشراف: ۲۵۷/۱)

ولید اور سلیمان کی ولایت عہد:

ہمارا ایک مؤرخ جب کوئی غلط روایت نقل کر دیتا خصوصی طور پر بنو امیہ کے بارے میں تو دوسرے مؤرخ اس کو نقل در نقل کرتے چلے آتے ہیں یہاں تک کہ لوگ اس روایت کو درست سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی ابن اثیر وغیرہ نے ایک روایت نقل کر دی کہ مروان بن الحکم نے یہ وصیت کی تھی کہ میری وفات کے بعد میرا جانشین عبدالملک ہوگا اور اس کا ولی عہد میرا بیٹا عبدالعزیز ہوگا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ عبدالملک باپ کی اس وصیت کو منسوخ کر کے اپنے بیٹوں ولید اور سلیمان کو اپنے بعد یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کرنا چاہتا تھا، لیکن

Marfat.com

یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ عوام کی طرف سے اس بارے میں سخت مخالفت کا خطرہ تھا۔ عبدالعزیز مصر کا گورنر تھا انہی دنوں اس کے انتقال کی خبر آ گئی اور عبدالملک کے لیے اپنے بیٹوں کو ولی عہد نامزد کرنے کا مرحلہ آسان ہو گیا۔

یہ روایت درست نہیں ہے۔ عبدالملک اپنے بھائی عبدالعزیز ہی کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا جیسا کہ اس کے باپ مروان نے بنایا تھا لیکن سوء اتفاق سے عبدالعزیز کا عبدالملک کے آخری دنوں میں انتقال ہو گیا اس وجہ سے عبدالملک نے اپنے بیٹوں ولید اور سلیمان کو ولی عہد نامزد کر دیا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ عبدالملک کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ نیت کا حال تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے ابن اثیر کو عبدالملک کی نیت کی خرابی کا کیسے پتہ چل گیا؟ بہر حال اپنی وفات سے قبل عبدالملک نے رمضان المبارک سنہ ۸۶ھ میں تمام صوبوں کے گورنروں اور عاملوں کے نام فرامین جاری کیے گئے کہ عید الفطر کے روز یعنی یکم شوال کو لوگوں سے ولید اور سلیمان کی ولایت عہد کی بیعت لی جائے۔ چنانچہ پوری مملکت اسلامیہ میں تاریخ مقررہ پر ان دونوں کی ولایت عہد کی بیعت لی گئی۔ مدینہ کا گورنر ہشام بن اسماعیل مخزومی تھا۔ اس نے جب ان دونوں کی ولایت عہد کی بیعت کے لیے کہا تو سوائے سعید بن المسیب کے باقی مدینہ کے سارے اہل علم نے بیعت کر لی۔ اس بارے میں ہشام نے سعید پر تشدد کیا جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ بہر حال عبدالملک کو جب سعید بن المسیب پر تشدد کا پتہ چلا تو اس نے گورنر مدینہ ہشام کو ایک تہدیدی خط لکھا کہ تم نے سعید پر تشدد کر کے سخت غلطی کی ہے کیونکہ اس میں نہ عداوت ہے، نہ مخالفت اور نہ منافقت، ایسے شخص کو ہرگز تکلیف نہیں دینی چاہیے۔

عبدالملک کی وفات:

شوال سنہ ۸۶ میں عبدالملک بن مروان مرض الموت میں مبتلا ہوا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو بلا کر یہ وصیت کی:

''میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ یہ بہترین زیور اور سب سے زیادہ محفوظ جائے پناہ ہے۔ بڑوں کو چھوٹوں پر شفقت اور مہربانی کرنی چاہیے اور چھوٹوں کو بڑوں کا حق پہچاننا چاہیے۔ مسلمہ کا خیال رکھنا اور اس کی رائے پر عمل کرنا کیونکہ وہ تمہارا قوت بازو ہے۔ حجاج بن یوسف کا احترام کرنا۔ ایک ماں کے نیک بیٹے بنے رہنا اور آپس میں محبت اور پیار سے رہنا۔ شریفوں کی طرح لڑائی سے منہ نہ پھیرنا کیونکہ موت اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔ نیکی کا مناد بننا کیونکہ اس کا ثواب اور اس کی یاد باقی رہتی ہے۔ بھلائی شریفوں ہی کے ساتھ کرنا، وہی اسے یاد رکھتے ہیں اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ خطا کاروں کی خطاؤں کو نگاہ میں رکھنا۔ اگر وہ معافی چاہیں تو معاف کر دینا اور اگر خطا پر عمل کریں تو بدلہ لینا۔ مسلمانوں کی رائے اور مشورہ کی ہمیشہ قدر کرنا اور مخالفت سے بچنا کیونکہ وہی جبڑے ہیں جن سے تم چباتے ہو اور وہی دانت ہیں جن سے تم توڑتے ہو۔ عقل مندوں

Marfat.com

پر احسان کرنا کیونکہ وہ اس کے مستحق اور سزاوار ہیں۔"

وفات کے وقت عبدالملک کی عمر ۶۰ سال تھی۔ کل مدت خلافت ۲۱ سال ڈیڑھ ماہ، اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ۱۳ سال چار ماہ۔ دمشق میں باب جابیہ کے باہر ان کو دفن کیا گیا۔ وفات کے وقت ان کے بیٹے ہشام نے یہ شعر پڑھا ؎

فما كان قيس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

"یعنی قیس کا مرنا کسی ایک فرد کا مرنا نہیں ہے بلکہ یہ پوری قوم کی بنیاد کا گر جانا ہے۔

ولید نے کہا لغو گفتگو نہ کرو بلکہ اوس بن حجر کا یہ شعر پڑھو ؎

اذا مقرم منا ذرا حد نابه

تخمط باب آخر مقرم

"یعنی جب کسی سردار کے دانت کی تیزی کند ہو جاتی ہے تو دوسرے سردار کے دانت تیز ہو جاتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی زندگی کا اس قسم کے گرم جذبات ہی سے پتہ چلتا ہے۔

عبدالملک کا خاندان:

عبدالملک نے آٹھ عورتوں سے نکاح کیے۔ ان بیویوں سے اس کے پندرہ سولہ بیٹے اور کئی بیٹیاں تھیں۔ ان کی بیویوں میں ایک یزید بن معاویہ کی بیٹی۔ ایک سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ایک عبداللہ بن جعفر طیار کی بیٹی تھی۔ ولید اور سلیمان دونوں بھائی ولادہ بنت عباس کے بطن سے تھے۔ اس کے بطن سے مروان اکبر بھی پیدا ہوا۔

دوسری بیوی عاتکہ بنت یزید بن معاویہ تھی۔ اس کے بطن سے یزید، مروان اصغر، معاویہ اور ام کلثوم پیدا ہوئے۔

تیسری بیوی ام ہشام بنت ہشام مخزومی تھی۔ اس سے ہشام پیدا ہوا۔

چوتھی بیوی عائشہ بنت موسیٰ تیمی تھی۔ اس سے ابوبکر بکار پیدا ہوا۔

پانچویں بیوی ام ایوب بنت عمرو بن عثمان تھی، اس سے حکم پیدا ہوا۔

چھٹی بیوی ام مغیرہ بنت مغیرہ بن خالد مخزومی تھی۔ اس سے ایک لڑکی فاطمہ پیدا ہوئی۔

ساتویں بیوی شقراء بنت مسلمہ طائی تھی۔

آٹھویں بیوی ام ابیہا بنت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب تھی۔

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ عبدالملک کے نکاح میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بھی ایک صاحب زادی تھی۔

(ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ: ۶۹/۹)

Marfat.com

بیویوں کے علاوہ امہات اولاد سے بھی چند بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام یہ ہیں:
عبداللہ، مسلمہ، منذر، غبسہ، محمد، سعید، خیر اور حجاج

کارہائے نمایاں:

عبدالملک نہایت ذہین وفطین اور صبر واستقلال کا حامل انسان تھا۔ یہ اور یزید بن معاویہ ایک ہی سال میں پیدا ہوئے۔ جو کہ سنہ ۲۶ ھ تھا۔ مسند خلافت پر بیٹھنے سے قبل وہ عبادت گزار، زاہدان فقہاء میں سے شمار ہوتا تھا جو مسجد نبوی میں پڑے رہتے اور ہر وقت تلاوت قرآن حکیم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ نافع فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں کسی نوجوان کو عبدالملک سے زیادہ فقیہ اور قرآن حکیم کا قاری نہیں دیکھا۔ اور ابوالزناد کا قول ہے کہ خلافت سے قبل عبدالملک مدینہ کے چار بہترین فقہاء میں سے تھا وہ چار فقہاء یہ تھے سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، قبیصہ بن ذوئب، اور عبدالملک بن مروان۔

عبدالملک بن مروان اموی حکومت کا دوسرا مؤسس اور بانی ہے۔ معاویہ بن یزید کی مسند خلافت سے دست برداری کے بعد اموی حکومت قریباً ختم ہو چکی تھی۔ اور دنیائے اسلام کے اکثر و بیشتر حصہ کے لوگوں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کو تسلیم بھی کر لیا تھا، لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ایک سیاسی غلطی نے ہوا کا رخ موڑ دیا۔ وہ یہ کہ مروان اور اس کے خاندان کو مدینہ منورہ سے نکال دیا اور وہ بصد مشکل دمشق پہنچے۔ یزید کی وفات کے بعد ان کی ہمت اس قدر پست ہو چکی تھی کہ مروان ابن زبیر کی بیعت کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ (ابوالفداء: ۱۹۲/۱) لیکن عبیداللہ بن زیاد نے ان کو سنبھالا دیا۔ لہٰذا وہ بیعت کرنے کے بجائے خود خلیفہ بن کر دمشق پر قابض ہو گیا کیونکہ بنو کلب اور بنو امیہ کے تمام سرداران قبائل نے ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا، لیکن مروان کو صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ اس نے شام پر قبضہ کر کے دوبارہ مرکز حکومت قائم کر دیا۔ چند روز کے بعد اس نے مصر پر بھی قبضہ کر لیا لیکن اس کو حکومت کرنے کا زیادہ موقع نہ ملا جس کی وجہ سے بنو امیہ کی حکومت کو استحکام حاصل نہ ہوا کیونکہ عبداللہ بن زبیر کے پاس زیادہ علاقہ تھا اور کافی دیر سے اس کے ہاتھ میں زمام حکومت تھی۔ مروان کے انتقال کے بعد جب زمام حکومت عبدالملک کے ہاتھ میں آئی۔ تو یہ درست ہے کہ عبدالملک میں حکومت چلانے کی بہت سی خصوصیات اللہ تعالیٰ نے رکھی تھیں۔ اسی وجہ سے سولہ سال کی عمر میں وہ مدینہ منورہ کا گورنر بھی رہا، لیکن اس کے مسند خلافت پر بیٹھنے کے وقت ساری دنیائے اسلام پُر آشوب ہو رہی تھی۔ مختلف حوادث اور فتنے سر اٹھائے ہوئے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پہلے سے مقابلہ میں تھے۔ علاوہ ازیں مختار ثقفی کا خروج، خوارج کی شورش جس نے کئی سالوں سے لوگوں اور حکومت کو پریشان کر رکھا تھا اور ابن اشعث کی انقلابی بغاوت، یہ سب اسی کے عہد حکومت ہی میں ہوئیں۔ علاوہ ازیں اور بھی بہت سے حوادث وانقلابات تھے جو اس کے زمانہ میں پیش آئے، لیکن عبدالملک بڑا قوی عزم اور صبر واستقلال کا مالک تھا۔ وہ حوادث سے کبھی بھی گھبرایا

Marfat.com

نہ کرتا تھا۔ یہ اللہ نے اسے ایک خاص خوبی عطا فرمائی تھی۔ وہ بڑا قوی دل اور مستقل مزاج تھا۔ وہ نازک سے نازک حالات میں بھی پریشان نہیں ہوتا تھا۔ مشکلات اور مصائب کے ہجوم میں اس کی ہمت اور زیادہ قوی ہو جاتی تھی۔ سنہ ۶۲ھ میں جب وہ مختار ثقفی کے مقابلہ کے سلسلہ میں دارالخلافہ سے باہر تھا تو اس کو ایک ہی رات میں پے در پے کئی حوصلہ شکن خبریں ملیں کہ اموی حکومت کا قوت بازو عبیداللہ مختار ثقفی کے مقابلہ میں مارا گیا ہے۔ ایک اور ممتاز افسر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں کام آیا، اور مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی فوجیں لے کر سرزمین فلسطین میں داخل ہو گئے ہیں۔ پھر ایک مخبر کی معرفت یہ خبر ملی کہ شہنشاہ روم کا لشکر شام کی سرحد کے نزدیک ایک شہر مصیصہ میں داخل ہو گیا ہے۔ پھر کسی نے یہ مژدہ سنایا کہ دمشق کے بدمعاشوں نے شہر میں اس قدر شور مچا دیا ہے کہ قیدی جیل توڑ کر نکل گئے ہیں اور اعراب نے حمص اور بعلبک میں قتل و غارت شروع کر دی۔ ایک وقت میں اس قدر مخالف خبریں سن کر ایک نہایت مستقل مزاج شخص بھی گھبرا جاتا ہے لیکن عبدالملک مطلق پریشان نہیں ہوا بلکہ اس رات وہ زیادہ ہشاش بشاش اور خوش نظر آیا۔ (مروج الذھب، مسعودی: ۱۱۳/۴)

اس کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے سنہ ۷۱ھ میں جب اس نے مصعب بن زبیر کے مقابلہ میں عراق جانے کا ارادہ کیا تو اس نے اپنے احباب اور مشیروں سے مشورہ کیا۔ بعض مشیروں نے کہا ہماری رائے میں بہتر یہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسی بااثر شخصیت سے نہ ٹکرایا جائے۔ آپ اپنے مقبوضہ صوبوں پر قناعت کریں اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے ان کے مقبوضہ علاقے چھوڑ دیں، لیکن عبدالملک نے ان کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ بعض ساتھیوں نے یہ کہا کہ اگر جنگ کرنا ہی ہے تو کسی سپہ سالار کو بھیج دیا جائے اور امیر المومنین دارالحکومت میں رہ کر اس کی امداد کرتے رہیں۔ عبدالملک نے اس رائے کو بھی قبول نہ کیا اور کہا کہ ”مصعب جیسے بہادر شخص کے مقابلہ میں مجھ جیسے آزمودہ کار جنگجو کا میدان میں جانا ضروری ہے۔“ چنانچہ جب وہ اس مہم پر روانہ ہونے لگے تو اس کی بیوی عاتکہ بنت یزید بے اختیار رونے لگی۔ اس کو روتے دیکھ کر اس کی سہیلیاں بھی رونے لگیں۔ عبدالملک نے کثیر عزہ کے دو شعر پڑھے اور بلا کسی پس و پیش کے میدان جنگ کو روانہ ہو گیا اور آخر کار کامیاب و بامراد واپس آیا۔

اس کے اس استقلال، عزم و ہمت اور شجاعت و جرأت نے نہ صرف تمام حالات پر قابو حاصل کر لیا بلکہ فتوحات بھی حاصل ہوئیں اور سندھ سے لے کر جزائر تک ایک متحدہ حکومت قائم ہو گئی اور اس کے جانشینوں کو اطمینان کے ساتھ تعمیری کاموں کا موقع ملا۔ اس سلسلہ میں تاریخ ان ناروا واقعات پر اس پر نکتہ چینی بھی کرتی ہے اور اس کے دامن کو داغدار کرنے کی کوشش کرتی ہے جو اس کے زمانہ میں پیش آئے، مثلاً خانہ کعبہ پر سنگ باری، مشہور صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی توہین و تحقیر، سعید بن المسیب پر بے جا تشدد اور بعض دوسرے تابعین کی تذلیل اور حجاج بن یوسف جیسے ظالم شخص کو بصرہ اور کوفہ کا امیر بنانا جس نے کئی پاکیزہ لوگوں کو خاک و خون میں تڑپایا۔ لیکن اگر ان تمام واقعات پر غور و فکر کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعات بعض ناگزیر

Marfat.com

حالات اور واقعات کا نتیجہ تھے اور بعض کی ذمہ داری عبدالملک پر نہیں بلکہ ان کے عمال کے سر ہے لیکن عبدالملک کو بھی ان سے یک قلم بری نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ زمانہ نبوت سے جوں جوں دوری ہوتی گئی خلافت کے نظام میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں۔ ان میں کچھ تبدیلیاں وقت کا اہم تقاضا تھیں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ عبدالملک کو جن لوگوں سے واسطہ پڑا وہ لوگ تھے جنھیں اپنی ذاتی اغراض وخواہشات کی تکمیل کے لیے اسلام کی مرکزیت کو پارہ پارہ کرنے میں کبھی کوئی باک نہیں رہا اور بادشاہوں کے تاج وتخت سے کھیلنا ان کا ایک نہایت مفید مشغلہ تھا۔ چنانچہ وہ خود کہا کرتے تھے کہ

''ہر زمانہ کے حکام کا رویہ اس زمانہ کی رعایا کے طرز عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ مجھے جن لوگوں سے واسطہ پڑا ہے اگر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ان سے واسطہ پڑتا تو وہ بھی یہی طرز عمل اختیار کرتے۔''

ایک اعتراض عبدالملک پر یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے خانہ کعبہ پر سنگ باری کروائی۔ اس سنگ باری کا سبب یہ تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حرم میں قلعہ بند ہو گئے تھے۔ یہاں ان کی فوج اور سامان رسد تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اگرا یک جلیل القدر صحابی تھے لیکن حکومت کے نقطۂ نظر سے باغی تھے، اس لیے حجاج بن یوسف کو حرم میں بھی ان کا مقابلہ کرنا پڑا، اور چونکہ وہ کعبہ کو آڑ بنائے ہوئے تھے، اس لیے ناگزیر طور پر کعبہ پر بھی پتھر گرے جس سے اس کی عمارت کو بھی نقصان پہنچا۔ گو ابن زبیر کا محاصرہ ختم ہونے کے فوراً بعد حجاج بن یوسف نے خانہ کعبہ کو صاف کرا دیا اور عبدالملک نے اس کی عمارت تعمیر کروا دی۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ وہ حجاج کو پسند نہیں کرتے اور ان کا قیام بصرہ میں تھا۔ ابن اشعث کی بغاوت میں حجاج کی نگاہ میں وہ بھی متہم تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حجاج نے ان سے سختی سے باز پرس کی اور کہا یہ دورنگی کیا ہے کہ کبھی مختار کے ساتھ اور کبھی ابن اشعث کے ساتھ۔ میں آپ کو سخت سزا دوں گا۔ یہ بات سن کر سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''امیر! یہ بات کس کے بارے میں کہہ رہے ہو؟'' حجاج نے کہا: ''خدا تم کو بہرہ کرے، تم کو یہ بات کہہ رہا ہوں۔ یہ جواب سن کر سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ لوٹ گئے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے عبدالملک کو حجاج کی شکایت کا ایک خط لکھا جس کو حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں نقل کیا ہے: انھوں نے حجاج کی شکایت کرتے ہوئے عبدالملک کو لکھا:

''اگر کسی شخص نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت کی ہو یا ان کی زیارت کی ہو یا ان کی صحبت میں رہا ہو اور نصاریٰ کو اس بات کا پتہ ہو تو وہ اس سے نہایت عظمت سے پیش آئیں گے، اس کی عزت وتوقیر ان کے دلوں میں ہو گی اور بڑے بڑے بادشاہ اس کے پاس چل کر آنا اپنے لیے باعث فخر سمجھیں گے۔ ایسے ہی اگر کسی شخص نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی خدمت کی ہو، ان کی صحبت میں رہا ہو یا ان کی زیارت کی ہو تو یہودی اس کے ساتھ کس قدر عزت وتوقیر اور محبت وعظمت کے ساتھ پیش آئیں گے، اور آپ کے گورنر حجاج نے میرے ساتھ یہ یہ بدسلوکی کی ہے۔''

Marfat.com

امام اعمش فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات اس شخص نے بتائی جو عبدالملک کو خط ملنے کے وقت وہاں موجود تھا کہ عبدالملک خط پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا اور وہ خط پڑھ کر غضبناک ہو گیا۔ پھر حجاج کو ایک نہایت سخت خط لکھا۔ جب یہ خط حجاج کو ملا تو خط پڑھ کر اس کا رنگ متغیر ہو گیا اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس خود جا کر ان کو راضی کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ جب عبدالملک کو سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا یہ شکایتی خط موصول ہوا تو خط پڑھ کر وہ جوش غضب سے لبریز ہو گیا اور اسی وقت حجاج بن یوسف کو ایک نہایت غضب آلود خط لکھا کہ تم اپنی اوقات اتنی بھول گئے ہو اور تمھاری یہ جرأت کہ خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی سے پیش آؤ۔ میرا یہ خط ملتے ہی پاپیادہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی رضامندی حاصل کرو ورنہ تم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ عبدالملک کا یہ خط پا کر حجاج نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی خدمت میں پاپیادہ حاضر ہو کر ان سے معافی چاہی اور ان سے رضامندی اور خوشنودی کا خط لے کر عبدالملک کے پاس بھجوا دیا۔

(اخبار الطوال لابی حنیفہ الدینوری: ص ۳۲۷)

سیدنا سعید بن المسیب کی تحقیر کا حال گزشتہ صفحات میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت عبدالملک بذات خود نہ ظالم تھا اور نہ ہی ظلم کو پسند کرتا تھا۔ اور اسے جب کسی گورنر کی زیادتی کی اطلاع ملتی تو وہ فوری طور پر اس سے جواب طلبی اور باز پرس کرتا چنانچہ ابن اشعث کے بارے میں بھی جب اسے معلوم ہوا کہ ابن اشعث کی بغاوت فرو ہونے کے بعد شکست خوردہ باغیوں اور قیدیوں کی خون ریزی اور قتل میں بے اعتدالی سے کام لیا ہے اور اپنے آدمیوں کی حوصلہ افزائی اور بڑھاوا دینے کے لیے مسرفانہ روپیہ ان میں تقسیم کیا ہے تو اس نے فوری طور پر ایک تہدید آمیز خط حجاج کو لکھا جس کو مسعودی نے مروج الذہب میں نقل کیا ہے۔ عبدالملک نے لکھا:

''امیر المومنین کو تمھاری خون ریزی میں بے اعتدالی اور مال کی مسرفانہ تقسیم کا پتہ چلا ہے۔ امیر المومنین ان دونوں باتوں کو کسی کے لیے بھی اور کسی صورت بھی پسند نہیں کر سکتے اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ قتل خطاء میں تم سے دیت اور قتل عمد میں تم سے قصاص لیا جائے گا۔ اور جو مال تم نے بے جا اور اسراف سے خرچ کیا ہے، وہ تمھیں واپس کرنا ہوگا اور اس کے مصرف پر بعد میں غور کیا جائے گا۔ امیر المومنین اللہ تعالیٰ کی طرف سے امین ہیں۔ ان کے نزدیک کسی کا حق روکنا اور ناحق دینا دونوں برابر ہیں۔ اگر اس سے تمھارا مقصد یہ ہے کہ لوگ امیر المومنین کے حامی ہو جائیں تو اس سے تم نے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ تم کو امیر المومنین کی جانب سے نرمی اور سختی برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ طاعت میں تمھاری بھلائی اور سرکشی میں خرابی ہے امیر المومنین کی ذات سے اپنی خطاؤں کو برداشت کرنے کے علاوہ اور ہر چیز میں حسن ظن رکھ سکتے ہو۔ جب اللہ تعالیٰ تم کو کسی قوم کے مقابلہ میں فتح یاب کرے تو صلح جو لوگوں اور قیدیوں کو ہرگز ہرگز قتل نہیں کرنا چاہیے۔''

Marfat.com

حجاج بن یوسف کو جونہی امیر المومنین کا یہ خط موصول ہوا فوراً ایک معذرت خواہانہ جواب لکھ کر بھجوایا۔ لکھا:

''امیر المومنین کے مکتوب جس میں خون ریزی میں میری زیادتی اور مال میں بے اعتدالی اور اسراف کا ذکر ہے، موصول ہوا۔ اپنی عمر کی قسم! باغی جس سزا کے مستحق ہیں وہ سزا انھیں پوری نہ دے سکا اور اہل طاعت جس صلہ کے مستحق ہیں، میں اسے پورا نہ کر سکا۔ اگر ان نافرمانوں اور باغیوں کا قتل زیادتی اور اہل طاعت کو صلہ دینا اسراف ہے، تو جو کچھ ہو چکا اس کی معذرت چاہتا ہوں، آئندہ کے لیے امیر المومنین ایک حد مقرر کر دیں تاکہ میں اس سے تجاوز نہ کروں۔ اللہ کی قسم! نہ مجھ پر دیت ہے اور نہ قصاص کیونکہ میں نے قتل میں کوئی غلطی نہیں کی۔ جنھیں میں نے دیا ہے وہ آپ ہی کے لیے دیا ہے، اور جنھیں قتل کیا ہے، آپ ہی کے لیے کیا ہے۔ میں آپ کے دونوں طرز عمل سختی اور نرمی کو اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔'' (مروج الذہب، مسعودی: ص ۵۵۷)

خلاصہ یہ کہ عبدالملک کا یہ خط اس کی سیاست کے سرسری اندازہ کے لیے کافی ہے۔ وہ ذاتی طور پر ظلم و زیادتی اور تشدد کو ناپسند کرتا تھا کیونکہ اس سے حکومت کے معاملات اکثر و بیشتر سلجھتے نہیں بلکہ الجھتے ہیں۔ اس نے لوگوں کو ممانعت کر دی تھی کہ وہ رعایا کے خلاف بھڑکانے والی باتیں نہ کریں بلکہ ان کے ساتھ نہایت نرمی اور شفقت سے پیش آئیں کیونکہ دین اور سیاست کا تقاضا یہی ہے۔ گورنروں اور والیوں کا جب تقرر کیا جاتا تو عبدالملک رعایا سے نرمی کرنے اور شفقت اور خندہ جبینی سے پیش آنے کی تاکید کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی عبدالعزیز کو جب مصر کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان کو جو ہدایات کی تھیں ان میں یہ بھی تھا کہ لوگوں سے نرمی اور خندہ جبینی کا رویہ اختیار کرنا اور تمام امور میں نرمی اور آشتی کو ترجیح دینا۔

(تاریخ الخلفاء: ص ۲۱۷، آداب السلطانیہ ماوردی: ص ۱۱۳)

مختلف روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حرمین شریفین کے لوگوں کے لیے اس کا رویہ اور طرز عمل نہایت شریفانہ، بردباری اور تحمل کا تھا۔ چنانچہ سنہ ۷۵ھ میں جب حج کے سلسلہ میں وہ مدینہ منورہ حاضر ہوا تو اس نے اہل مدینہ کو جمع کر کے ایک تقریر کی۔ اس کے بعد حکومت کے ایک اور رکن کھڑے ہوئے اور انھوں نے مدینہ کے گذشتہ واقعات کی طرف اشارہ کر کے لوگوں سے کہا کہ جو کچھ ہوا وہ تمھاری نافرمانی، شورش پسندی اور بنوامیہ اور امیر المومنین کے ساتھ تمھارے ناپسندیدہ طرز عمل کا نتیجہ تھا۔ تم لوگوں کی مثال اس بستی جیسی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ذکر کیا ہے۔

''وہ امن و اطمینان کے ساتھ تھے اور ہر جگہ سے فراغت کے ساتھ ان کے پاس رزق پہنچتا تھا، مگر انھوں نے اللہ کی ناشکری کی، اس کردار کا اللہ نے ان کو مزہ چکھایا اور بھوک اور خوف کو ان کا لباس بنا دیا۔''

یہ سن کر مدینہ کے ایک بزرگ ابن عبد نے کہا: تم جھوٹ کہتے ہو، ہم لوگ ایسے نہیں ہیں۔ اس آیت

Marfat.com

کے بعد والا حصہ بھی تو پڑھو۔

"کہ ان (کفار) کے پاس انہی میں سے ایک رسول آیا، بس ان لوگوں نے اس کو جھٹلایا، اس کی سزا میں ان کو عذاب نے پکڑا اور وہ لوگ ظالم تھے۔ ہم لوگ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔"

صاحبان اقتدار کو سب کچھ برداشت ہوتا ہے لیکن اپنے اوپر تنقید کو وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔ ابن عبد کا یہ بے باکانہ جواب ارباب اقتدار کو کیسے ہضم ہوسکتا تھا۔ سپاہیوں نے فوری طور پر ابن عبد کو پکڑ لیا اور عبدالملک کے پاس لے گئے۔ اس نے انھیں اسی وقت رہا کر دیا اور ابن عبد سے کہا کہ میں تو درگزر سے کام لیتا ہوں لیکن کسی اور والی کے سامنے ایسی باتیں نہ کرنا۔ وہ اس قسم کی باتوں کو ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔ اور اس کو چھ سو اشرفیاں عطا کیں۔ (طبقات: ۱۷۲/۵)

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ابن اشعث کی بغاوت اور عراق کے انقلاب میں بعض کارکنان حکومت اور عمال کی جانب سے بدعنوانیاں بھی ہوئیں لیکن اس کی زیادہ تر ذمہ داری انھیں کے سر ہے۔ دوسرے ایسی بغاوتوں میں جن کا مقصد حکومت کا تختہ الٹنا ہو، کسی حاکم کا جادۂ اعتدال پر قائم رہنا بہت مشکل ہے۔ عبدالملک کا زمانہ جیسا پرآشوب تھا اور جس قسم کے سرکشوں اور شورش پسندوں سے اس کو واسطہ پڑا، وہ بغیر سختی کے درست نہیں ہوسکتے تھے۔ وہ اپنے طرز عمل کی توجیہ میں خود کہا کرتا تھا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ان کی نرمی کا نتیجہ تھا۔ اگر وہ عمر رضی اللہ عنہ کی طرح سخت ہوتے تو ہرگز اس کی نوبت نہ آتی۔ آج ایسے لوگ کہاں ہیں جن کے ساتھ عمر رضی اللہ عنہ کا طرز جہاں بانی برتا جائے۔ ہر زمانہ کے آدمیوں کی سرشت کے ساتھ حاکم وقت کا طریقہ بدلتا رہتا ہے اگر آج وہی طریقہ اختیار کیا جائے تو گھروں میں ڈاکے پڑنے لگیں، راستے غیر محفوظ ہوجائیں، ظلم اور فتنہ عام ہوجائے۔ اس لیے ہر حکمران کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر زمانہ میں وہی طریقہ اختیار کرے جو اس زمانہ کے اقتضاء کے موافق ہو۔ (طبقات ابن سعد: ۱۷۳/۵) عبدالملک کا یہ بھی قول تھا کہ اس زمانہ میں مجھ سے اس بار کو اٹھانے کی کسی اور میں طاقت نہیں ہے۔" (ابن اثیر: ۱۵۵/۴)

عبدالملک کے طرز حکمرانی کے مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ طرز جہاں بانی میں سیدنا معاویہؓ کے نقش قدم پر چلتا تھا۔ گو وہ ان کے درجہ کو نہ پہنچ سکا تاہم یہ بات مسلم ہے کہ وہ نہایت بیدار مغز اور اپنے عمال اور کارکنان حکومت کی سخت نگرانی کرتا تھا۔ اسے ایک مرتبہ ایک عامل کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ رعایا سے تحفے لیتا ہے تو فوری طور پر اس کو طلب کرکے باز پرس کی اور اسے عہدہ سے معزول کردیا۔ (مروج الذہب: ۳۷۵/۲)

بہرحال اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عبدالملک کا یہ ایک بہت بڑا احسان ہے خواہ اس کا اپنا مقصد یہ ہو یا نہ ہو کہ اس نے پھر ایک ایسی مضبوط اور مستحکم اسلامی عربی حکومت کی بنیادیں استوار کردیں جو دشمنان اسلام کی اغراض فاسدہ کی تکمیل کی راہ میں حصار بن کر کھڑی ہوگئی اور جس کے زیر سایہ مدت دراز تک

Marfat.com

کلمۃ الاسلام، علوم اسلامیہ کی اشاعت اور تہذیب وتمدن اسلامی کی حفاظت وترویج کی خدمات انجام دی جاتی رہیں۔ گو عبدالملک کا دور نہایت پر آشوب تھا اور اس کا پورا زمانہ شورشوں اور انقلابوں کے دبانے میں گزرا اور اسے تعمیری کاموں کا بہت کم موقع ملا، تاہم اس لحاظ سے بھی اس کے بعض کارنامے بہت اہم ہیں۔

تعمیر کعبہ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کعبہ کے ۱۶۷۵ سال بعد اور نبوت محمدیہ سے پانچ سال قبل قریش نے خانہ کعبہ کو منہدم کر کے اسے دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ اس تعمیر کے وقت سرمایہ کی کمی کے باعث حجر اسماعیل کی طرف بنیاد ابراہیمی سے چند ہاتھ چھوڑ کر دیوار اٹھائی گئی۔ نیز دروازہ بھی قد آدم اونچا رکھا گیا تاکہ کوئی شخص قریش کی اجازت کے بغیر اس میں داخل نہ ہو سکے۔ سنہ ۶۴ھ میں جب یزید بن معاویہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کے لیے حصین بن نمیر کو بھیجا تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خانہ کعبہ میں پناہ لی اور حصین نے ان کو وہاں سے نکالنے کے لیے خانہ کعبہ پر سنگ باری کرائی۔ اس سنگ باری سے خانہ کعبہ کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں اور وہ جھک گئیں۔ نیز آگ لگ جانے کی وجہ سے غلاف کعبہ اور عمارت کعبہ کا وہ حصہ جو لکڑی سے بنا ہوا تھا جل گیا۔

یزید کے انتقال کے بعد جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا حجاز میں پورا تسلط ہو گیا تو آپ نے ایرانی، مصری اور رومی کاریگروں کو بلا کر خانہ کعبہ کو منہدم کر کے دوبارہ اسی کی تعمیر شروع کر دی۔ آپ کو اپنی خالہ محترمہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی تھی کہ اگر قریش جدید الاسلام نہ ہوتے تو میں کعبہ کو بنیاد ابراہیمی پر تعمیر کرتا اور حجر اسماعیل یعنی کعبہ کا چھوڑا ہوا حصہ بھی اس میں داخل کر دیتا۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تعمیر جدید میں کعبہ کا چھوڑا ہوا حصہ بھی داخل کر لیا۔ اس کے علاوہ آپ نے زمین سے ملا کر آمنے سامنے دو دروازے قائم کیے تاکہ زائرین ایک طرف سے اندر داخل ہوں اور دوسری طرف سے نکلتے جائیں، اور عمارت کی بلندی میں بھی نو ہاتھ کا اضافہ کر دیا۔ (دول الاسلام: ۱/۳۰)

سنہ ۷۳ھ میں جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہید اور حجاج بن یوسف حجاز کا والی مقرر ہوا تو اس نے حطیم (حجر اسماعیل) کو پھر خانہ کعبہ سے خارج کر دیا اور دروازہ جدیدہ کو تیغہ لگا کر بند کر دیا اور دروازہ قدیم کو اونچا کر دیا جیسا کہ قریش نے کیا تھا۔ یوں خانہ کعبہ پھر بنائے قریش کے مطابق ہو گیا۔ خانہ کعبہ کی موجودہ عمارت وہی ہے کہ تینوں طرف بنائے عبداللہ بن زبیر ہے اور شمالی جانب حجاج بن یوسف ثقفی کی تعمیر ہے۔

اسلامی سکہ کا اجراء:

اس سلسلہ میں اس کا سب سے ممتاز کارنامہ اسلامی سکہ جس کو دینار کہتے تھے، اس کا اجراء ہے۔ اس وقت تک مسلمانوں کا اپنا سکہ نہ تھا بلکہ عرب میں ایرانی درہم اور رومی دینار چلتے تھے۔ اس سے بڑی حد تک

Marfat.com

مسلمانوں کی اقتصادی باگ ڈور ان قوموں کے ہاتھ میں تھی۔ سنہ ۱۸ھ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے درہم ڈھلوائے۔ یہ درہم ایرانی درہم کے نمونہ پر ڈھالے گے لیکن ان کا نقش "الحمدللہ" اور "لا الہ الا اللہ" اور "محمد رسول اللہ" قرار دیا گیا۔ اس کے بعد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے اپنے عہد میں درہم ڈھلوائے۔ سنہ ۷۶ھ میں عبدالملک بن مروان نے خالد بن یزید کے مشورہ سے دینار بھی ڈھلوائے۔ ہوا یہ کہ عبدالملک کے پاس سے قیصر روم کے نام جو خطوط جاتے تھے ان کی پیشانی پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا ذکر ہوتا تھا۔ قیصر روم نے عبدالملک کو لکھا کہ یہ ایک نیا طریقہ جاری کیا گیا ہے جسے میں پسند نہیں کرتا۔ اگر اس سلسلہ کو بند نہ کیا گیا تو ہم اپنی ٹکسال میں ایسے درہم و دینار مضروب کرا کر رائج کریں گے جن پر تمھارے نبی کا نام توہین کے ساتھ لکھا ہوا ہوگا جو تم کو بے حد ناگوار گزرے گا۔ عبدالملک کو اس خط کے پڑھنے سے تردد پیدا ہوا اور اس نے خالد بن یزید بن معاویہ سے مشورہ طلب کیا۔ خالد نے کہا کہ تم رومی سکوں کا رواج اپنے ملک میں یک قلم ترک کر دو اور اپنے سکے مضروب کروا کر رائج کرو۔ عبدالملک نے اس رائے کو پسند کیا اور دارالضرب قائم کر کے چودہ قیراط وزن کے درہم مضروب کروائے جو پانچ ماشہ کے قریب وزنی ہوتے تھے۔ قیصر روم کے اس خط کا جواب عبدالملک نے اس طرح دیا کہ رومی دیناروں کا داخلہ ممالک اسلامیہ میں بند کر دیا اور اسلامی درہم و دینار جاری کیے اور یہ فرمان جاری کر دیا کہ خراج میں سوائے عربی سکوں کے کوئی دوسرا سکہ قبول نہ کیا جائے۔ اس طرح تمام ملک میں عربی درہم و دینار رائج ہو گئے۔ (طبقات ابن سعد: ۲۷۳/۵) اس کے بعد حجاج بن یوسف نے درہم و دینار کے ایک طرف "قل ھو اللہ احد" مضروب کر لیا۔

ابن اثیر وغیرہ میں ہے کہ بعد میں حجاج بن یوسف کی نگرانی میں عراق میں اسلامی ٹکسال قائم کی گئی اور دوسروں کو سکہ ڈھالنے کی ممانعت کر دی گئی۔ چنانچہ سمیر نامی ایک یہودی نے سکہ ڈھالا تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ سمیر نے دراہم و دنانیر کا وزن کرنے کے لیے ایک کانٹا ایجاد کیا تاکہ اس کارگزاری پر حجاج کے عتاب سے بچ جائے لیکن حجاج نے اسے قتل کر دیا۔

عبدالملک کی ٹکسال سے جو سکہ جاری ہوا اس میں ایک رخ پر "قل ھو اللہ احد" اور دوسرے رخ پر لا الہ الا اللہ نقش ہوتا تھا۔ دونوں رخ حاشیہ پر ایک حلقہ بنا ہوتا تھا۔ ایک حلقہ میں تاریخ اور مقام درج ہوتا تھا اور دوسرے میں "محمد رسول اللہ ارسلہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ" لکھا ہوتا تھا۔ (ابن اثیر: ۱۶۱/۴، تاریخ الامم الاسلامیہ: ۳۴۲/۴)

عربی کا دفتری زبان بنانا:

عبدالملک کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے عربی زبان کو دفتری زبان قرار دے دیا۔ اب

Marfat.com

تک حکومت کے دفاتر فارسی اور رومی زبان میں تھے۔ اس سے مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہوتی تھیں۔ ان خرابیوں کو محسوس کر کے عبدالملک نے عربی زبان کو دفتری زبان قرار دیا۔ اس سے دفتری معاملات میں سہولت کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی ترویج و ترقی میں بڑی مدد ملی۔ (آداب السلطانیہ: ص۱۰۰، ابن اثیر: ۵۲۲/۴)

رفاہ عامہ کے کام:

عبدالملک نے اپنے عہد خلافت میں رفاہ عام کے بہت سے کام کیے۔ سنہ ۸۰ھ میں مکہ مکرمہ میں بہت بڑا سیلاب آیا جو "سیل جارف" کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے مکہ کی تمام آبادی زیر آب آ گئی اور اہل مکہ کا جانی اور مالی بہت بڑا نقصان ہوا۔ عبدالملک نے مستقبل میں ان کو اس قسم کے مصائب سے محفوظ رکھنے کے لیے ان تمام مکانوں میں جو وادی کے کنارے واقع تھے، اور مسجدوں اور گلیوں میں نہایت مستحکم حصار اور بند بنوا دیئے۔

دینی خدمات:

رفاہ عامہ کے علاوہ عبدالملک نے بہت سی دینی خدمات بھی انجام دیں۔ وہ ہر سال خانہ کعبہ کے لیے دیبا کا غلاف اور مسجد نبوی میں خوشبو کے لیے بخورات اور عود دان بھیجتے تھے۔ (تاریخ مکہ ازرقی: ۱۳۸/۱) سنہ ۷۷ھ میں عبدالملک کے بھائی عبدالعزیز بن مروان نے جو مصر کا گورنر تھا، جامع مسجد مصر کو گرا کر از سر نو تعمیر کرایا اور چاروں اطراف سے اس کو وسیع کیا۔

عبدالملک بن مروان خلفائے بنو امیہ میں ایک مشہور اور با اقبال خلیفہ تھا۔ اس نے تمام عالم اسلام کو ایک مرکز سے وابستہ کرنے میں کامیابی حاصل کی اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے جو افتراق و انتشار پیدا ہو گیا تھا، اس کو دور کر کے ایک عالم گیر اسلامی حکومت قائم کی۔ اگر چہ اس نے اس کام میں سختی اور تشدد سے کام لیا لیکن وہ اس کی معذرت کیا کرتا تھا۔ عبدالملک کے مزاج میں اگر چہ درشتی اور سخت گیری تھی لیکن معقول پسندی اور حق شناسی بھی تھی۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ علم و فضل کے لحاظ سے وہ اپنے عہد کے اکابر علماء میں سے تھا۔ اگر وہ حکومت کی آزمائشوں میں نہ پڑ گیا ہوتا تو مدینہ طیبہ کی مسند علم کی زینت ہوتا۔ سیدنا زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے بعد مدینۃ الرسول کے منصب قضاء و افتاء پر فائز ہوتا۔ (ابن اثیر: ۱۹۹/۴) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے بعد ہم لوگ کس کی طرف علمی لحاظ سے رجوع کریں تو فرمایا: مروان کا بیٹا عبدالملک فقیہ ہے، اس سے پوچھنا۔ (تاریخ الخلفاء: ص۲۱۶)

خلافت سے پہلے وہ بڑا متقی اور پرہیز گار تھا۔ عبادت و ریاضت اور تلاوت قرآن حکیم سے کام رکھتا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۱۰۴/۵) لیکن خلافت کی ذمہ داریوں کے بعد یہ زندگی قائم نہ رہ سکی۔ اگر چہ وہ سیاسی امور میں بعض دفعہ مذہبی حدود سے بھی متجاوز ہو جاتا تھا لیکن دوسرے اعمال میں وہ بہت دینی تھا۔ اس کی انگوٹھی کا نقش

Marfat.com

"آمنت بالله مخلصاً" تھا یعنی میں خلوص دل سے اللہ پر ایمان لایا۔ (کتاب التنبیہ والاشراف:ص ۳۱۶)

سعید بن المسیب رحمہ اللہ سے درخواست کر کے قرآن حکیم کی تفسیر لکھوائی۔ (میزان الاعتدال:۱/۱۹۷)

سنہ ۷۵ھ میں امیر الحج کے فرائض انجام دیئے اور سنہ ۸۱ھ میں اپنے لڑکے سلمان کو امیر الحج بنا کر بھیجا۔ (یعقوبی:۱/۳۳۶)

امام شعبی اس کے ہم نشین تھے اور امام زہری ان کے عمل کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔

(طبقات ابن سعد:۵/۱۷۴)

عبدالملک ایک مستقل مزاج اور بلند ہمت آدمی تھا اور اس بارے میں اس کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ عبدالملک کی غلطیوں اور خطاؤں میں سب سے بڑی خطا یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس نے حجاج بن یوسف ثقفی کو اس کے استحقاق سے زیادہ اختیار و اقتدار دیا تھا اور حجاج نے اپنے اختیارات کو اچھے طریقے سے استعمال نہیں کیا، لیکن اس قسم کی غلطیاں ہر اس حکمران سے ہو جاتی ہیں جو اپنی حکومت کے قیام اور استحکام کا خواہاں ہو۔ عبدالملک کی کامیابیوں میں عبیداللہ بن زیاد، حجاج بن یوسف ثقفی اور مہلب بن ابی صفرہ کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اس نے اندرونی اور بیرونی تمام خدشات و خطرات کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ اس اعتبار سے اس کا شمار نامور اور کامیاب خلفاء میں سے ہے۔ وہ ایک باعظمت اور باجبروت خلیفہ تھا۔ علم و فضل کے اعتبار سے بھی اس کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ عبدالملک کی وفات کے وقت ہم عالم اسلام کے ایک پر آشوب زمانہ سے نکل کر پر امن اور پر سکون زمانہ میں پہنچ گئے ہیں۔ اس کے کمانڈروں کے بارے میں اکثر روایات جعلی اور موضوع ہیں جو بنو امیہ کو بدنام کرنے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے امام الہند انھیں غلط روایات پر اعتماد کر کے بنو امیہ کو کوستے رہے ہیں۔ جو کہ ایک بہت بڑی زیادتی ہے، اور دوسرے بعض علماء بھی صرف اس وجہ سے ان روایات کو فلاں نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، بغیر سوچے سمجھے آگے نقل کرتے چلے آ رہے ہیں حالانکہ وہ روایات روایتاً اور درایتاً دونوں لحاظ سے غلط ہیں۔

Marfat.com

ولید بن عبدالملک

سنہ ۸۶ھ......تا......۹۶ھ/مطابق سنہ ۷۰۵ء......تا......۷۱۳ء

ولید، عبدالملک بن مروان کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوا۔ اس کی ماں ولادہ بنت عباس قبیلہ عبس سے تھی۔ اپنے والد کے برعکس وہ علم وفن سے ناآشنا تھا۔ عبدالملک نے بہت کوشش کی کہ وہ علم حاصل کرلے لیکن اس کی طبیعت تحصیل علم کی طرف راغب نہ ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ علم وفن اور پڑھنے لکھنے میں ناقص تھا لیکن حکمرانی اور جہاں بانی کے تمام اوصاف بدرجۂ اتم اس میں موجود تھے، اس وجہ سے وہ بنوامیہ کا ایک کامیاب ترین خلیفہ تھا۔ عبدالملک نے اگرچہ اس کو اپنی زندگی میں ولی عہد بنا کر اس کی بیعت بھی لے لی تھی لیکن خلیفہ عبدالملک کے انتقال کے بعد عوام کے بھرپور اعتماد کا ہونا ضروری تھا لہٰذا عبدالملک کی تکفین وتدفین سے فارغ ہو کر اس نے شوال سنہ ۸۶ھ جامع مسجد دمشق میں آ کر خطبہ دیا جس میں پہلے تو عبدالملک کی خوبیاں بیان کیں پھر لوگوں سے کہا:

''لوگو! جس کو اللہ تعالیٰ نے مقدم کیا اس کو کوئی مؤخر نہیں کرسکتا اور جس کو اللہ نے مؤخر کیا اس کو کوئی مقدم نہیں کرسکتا۔ موت اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں تھی جس کو اس نے انبیاء اور صلحاء سب کے لیے لازم کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اب اس امت کا ولی ایک ایسے شخص کو بنایا ہے جو مجرموں پر سختی اور اہل علم وفضل اور اہل حق پر نرمی کرنے اور حدود شرعیہ کو قائم رکھنے کا عزم کرتا ہے، اور خانہ کعبہ کے حج اور سرحدوں پر جہاد یعنی دشمنان دین پر حملے کرتے رہنے کے لیے پرعزم ہے۔ اس کام میں نہ وہ سستی کرنا چاہتا ہے اور نہ حد سے تجاوز کرنے کو اچھا سمجھتا ہے۔ لوگو! تم خلیفہ وقت کی اطاعت کرو اور مسلمانوں میں اتفاق واتحاد کو قائم رکھو۔ یاد رکھو، جو سرکشی کرے گا اس کا سر توڑ دیا جائے گا اور جو خاموش رہے گا وہ اپنے مرض میں خود ہی ہلاک ہوجائے گا۔'' (البدایہ والنہایہ: ۷۰/۹، ابن اثیر: ۵۲۲/۴)

اس کے بعد اس نے لوگوں سے بیعت لی۔ ولید کا عہد بنوامیہ کی حکومت کا ایک کامیاب ترین دور ہے۔ عبدالملک نے حکومت کے راستہ کے تمام کانٹے صاف کردیئے تھے۔ خوارج کا فتنہ بڑی حد تک دب چکا

Marfat.com

تھا۔شیعہ کے جذبات نہ صرف سرد بلکہ منجمد ہو چکے تھے۔ بنوامیہ کی رقیب طاقتیں ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھیں، اس لیے ولید کو اطمینان کے ساتھ داخلی انتظامات اور خارجی اقدامات اور فتوحات کی طرف توجہ کا موقع ملا۔ خوش قسمتی سے اس کو قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، محمد بن قاسم اور مسلمہ بن عبدالملک جیسے نامور اور بہادر سپہ سالار مل گئے جنھوں نے اسلامی حکومت کے ڈانڈے اسپین اور یورپ تک ملا دیئے۔

ولید نے خلیفہ ہوکر حجاج بن یوسف کے اختیار و اقتدار کو بدستور قائم رکھا۔ حجاج نے مفضل بن مہلب کو خراسان کی گورنری سے ۹ ماہ کے بعد ہی معزول کر کے اس کی جگہ گورنر (رے) قتیبہ بن مسلم باہلی کو خراسان کا گورنر بنا دیا۔ قتیبہ بن مسلم نے چین اور ترکستان تک بڑی اہم قسم کی فتوحات کیں۔ مغرب کی جانب موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے اسلامی سلطنت کی حدود وثغور کو مراکش سے بڑھا کر اندلس (موجودہ اسپین) تک پہنچا دیا۔ ولید کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک نے رومیوں کے مقابلہ میں بہت سے شہر اور قلعے فتح کیے۔ محمد بن قاسم ثقفی نے جو حجاج بن یوسف کا بھتیجا اور داماد تھا، سندھ اور ہند کی طرف فتوحات کیں اور وہ ملتان کے قریب تک فتوحات کرتا ہوا آ گیا اور تمام ہندوستان کے راجے اور مہاراجے اس کا نام سن کر ڈرنے لگے۔

سنہ ۸۷ھ میں مسلمہ بن عبدالملک اور عباس بن ولید نے بلاد روم پر حملہ کیا۔ رومیوں کے ایک ٹڈی دل لشکر نے ان کا مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں کی فوج نے ہر مقام پر ان کو شکست فاش دی۔ قلعہ سوریا، قلعہ اردونیہ، عموریہ، ہرقلہ اور قمولیہ وغیرہ مسلمانوں نے فتح کیے۔ اسی سال مسلمہ بن عبدالملک نے آذربائیجان کی طرف ترکوں پر حملہ کر کے بہت سے شہروں اور قلعوں کو فتح کیا اور اسی سال جزیرہ منورقہ اور میورقہ مفتوح ہوئے۔ اس طرح ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں اس کے بہادر اور جرأت مند سپہ سالاروں نے اسلامی حکومت کی حدود وثغور میں بہت بڑا اضافہ کیا۔ ان سپہ سالاروں کی فتوحات کا تذکرہ اجمالی طور پر الگ الگ کیا جاتا ہے۔

محمد بن قاسم:

محمد بن قاسم ہند اور سندھ کا فاتح کہلاتا ہے۔ ایران کی ساسانی حکومت اور سندھ کی بدھ حکومت میں کئی سالوں سے دوستانہ تعلقات تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں حکومتوں کی سرحدیں آپس میں ملتی تھیں۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایرانیوں اور مسلمانوں کے مابین جو لڑائیاں ہوئیں، ان میں سندھی فوجیں بھی ایرانی فوجوں کے دوش بدوش مسلمانوں سے لڑتی رہیں۔ جنگ قادسیہ میں ایرانی فوجوں کا مسلمانوں کے مقابلہ میں جو ہاتھیوں کا دستہ میدان جنگ میں آیا وہ بھی ہندوستان کی حکومت کا مہیا کردہ تھا کیونکہ ایران میں ہاتھی نہیں ہوتے۔ ایرانی حکومت کے خاتمہ کے بعد بہت سے ایرانی سردار سندھ میں آ کر آباد ہو گئے اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف سازشی سرگرمیوں میں مصروف رہے کیونکہ انھیں ساسانی حکومت کے برباد ہونے کا بہت غم تھا اور وہ مسلمانوں سے اس کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں بعض عربی سردار بھی حکومت وقت سے

Marfat.com

باغی ہو کر سندھ میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے سندھ پر فوج کشی کا سلسلہ عرصہ سے جاری تھا اور کرمان اور مکران پر قابض ہونے کے بعد سے مسلمانوں اور سندھیوں میں چھیڑ چھاڑ کا ایک سلسلہ جاری رہا تاہم اندرون ملک میں گھس کر مسلمانوں کو سندھ پر قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

سندھ پر حملہ کے کچھ اور محرکات بھی تھی۔ سندھ کا علاقہ بصرہ اور کوفہ یعنی عراق سے نسبتاً قریب تھا اور ایرانی حکومت کی سرحد اس سے ملتی تھی، اس لیے شورش پسند اور شرارت پسند ایرانیوں کے لیے سندھ کا علاقہ جائے امن بنا ہوا تھا۔ اسلامی فتوحات کے سیلاب کو دیکھ کر سندھ کا راجہ خود بھی اس امر کا کوشاں تھا کہ کسی طرح ایرانی اپنی سلطنت کو قائم رکھ سکیں۔ چنانچہ نہاوند کی جنگ میں بھی سندھ کی فوج ایرانی فوج کے ساتھ امداد کر رہی تھی۔ ایران کی سلطنت جب برباد ہوئی اور کسریٰ ایران جب مارا گیا تو سندھ کے راجہ نے اپنے سرحدی ایرانی صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور مفتوح ایرانیوں نے کرمان اور بلوچستان وغیرہ کے علاقوں کو اپنی خوشی سے سندھ کے راجہ داہر کے سپرد کر دیا تاکہ وہ مسلمانوں کے قبضہ میں نہ جا سکیں۔ یہ سب امور اس بات کے محرکات تھے کہ مسلمان سندھ پر حملہ کر کے سندھ کے راجہ کو درست کریں۔

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی ایران اور خراسان پر مکمل طور پر قبضہ نہ ہونے پایا تھا کہ سلطنت اسلامیہ میں شورش پسندوں نے شورش برپا کر دی، لہٰذا سندھ کی طرف کوئی توجہ نہ ہو سکی۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں سندھ کے صوبہ سے دو علاقے جو ایرانی سلطنت کا جزو تھے، واپس لینے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ عبدالملک کے زمانہ میں پھر مسلمانوں کو بیرونی ممالک کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ ملا اور حجاج نے جو مشرقی ممالک کا وائسرائے تھا، سندھ کے مقابلہ میں افغانستان اور بدخشاں کے حاکم رتبیل کی سرکوبی کو ترجیح دی کیونکہ وہ خراسان کے اسلامی صوبہ کے لیے زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ حجاج کے گورنر قتیبہ نے چین تک کے سرکشوں کو سیدھا کر دیا، اب سندھ ہی ایک ایسا علاقہ تھا کہ مسلمان حکومت سندھ کے راجہ کو اس کی سرکشی اور شورش پسندی کا جواب دیں۔ لیکن مسلمان حکومت ابھی اس طرح متوجہ نہ ہونے پائی تھی کہ ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ سندھ پر حملہ آور ہو کر راجہ کو چھٹی کا دودھ یاد کرائیں اور مسلمانوں کے حقوق اس سے واپس لیں۔

لنکا (سراندیپ) سرزمین میں کچھ عرب آباد تھے۔ ان میں سے ایک تاجر کا انتقال ہو گیا۔ لنکا کا راجہ مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا بہت خواہش مند تھا۔ اس متوفی تاجر کے اہل وعیال کو جن میں کئی مستورات بھی تھیں اور ولید کے لیے قیمتی ہدایا اور تحائف بھی تھے اور کچھ حاجی بھی تھے، ایک جہاز کے ذریعہ بھجوایا گیا۔ دیبل کے نزدیک سندھی بحری قزاقوں نے جہاز پر حملہ کر کے مال واسباب تو لوٹ لیا اور عورتوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں سے ایک عورت نے غائبانہ حجاج سے فریاد کی کہ ''حجاج ہماری مدد کرے۔'' حجاج کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی اور اسے بتایا گیا کہ گرفتار شدہ عورتوں میں سے ایک عورت نے تجھے مدد کے لیے پکارا تو حجاج پر

Marfat.com

اس کا بہت اثر ہوا اور اس نے جواب میں کہا کہ "بہن! میں تمھاری مدد کے لیے آیا۔" اس نے اسی وقت دیبل کے راجہ داہر کو خط لکھا کہ عرب عورتوں کو فوری طور پر واپس کر دو اور ان کا لوٹا ہوا مال و اسباب بھی واپس بھیج دو۔ راجہ داہر نے جواب دیا کہ یہ کام بحری قزاقوں کا ہے، اس لیے میں مجبور ہوں، نہ عورتیں واپس کر سکتا ہوں اور نہ مال و اسباب۔

حجاج راجہ داہر کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوا، لہٰذا اب فوج کشی کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ راجہ داہر کا یہ جواب سن کر حجاج نے عبیداللہ بن نبہان کو چھ ہزار فوج دے کر روانہ کیا۔ یہ میدان جنگ میں کام آئے۔ اس کے بعد بدیل بن لمہفہ بجلی کو جو عمان میں تھے، دیبل پہنچنے کا حکم دیا اور وہ چھ ہزار فوج کے ساتھ مکران سے ہوتے ہوئے دیبل پہنچے۔ راجہ داہر نے کئی ہزار فوج ان کے مقابلہ کے لیے بھیجی۔ لیکن عین میدان جنگ میں ان کا گھوڑا بدکا اور وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ سندھیوں نے یورش کر کے انھیں شہید کر دیا۔ ان کے قتل ہوتے ہی مسلمان شکست کھا گئے۔

حجاج کو جب اس شکست کی اطلاع ملی تو اسے بہت صدمہ ہوا۔ اب تیسری مرتبہ اس نے اپنے داماد محمد بن قاسم کو جو اس کا چچیرا بھائی بھی تھا، اور صرف سترہ برس کی عمر کا نوجوان تھا، چھ ہزار شامی فوج کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ کیا۔ محمد بن قاسم کے ساتھ اس مرتبہ شامی سپاہی اس لیے بھیجے گئے کہ حجاج بن یوسف کو اس بات کا شبہ تھا کہ ایرانی اور عراقی سپاہی سندھیوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ محمد بن قاسم نے اپنا تمام بھاری اسلحہ اور ساز و سامان رسد جس میں سوئی دھاگہ بھی تھا بحری راستہ سے روانہ کر دیا۔ اور خود اپنی فوج کے ساتھ خشکی کے راستے آیا۔ محمد بن قاسم نے پہلے صوبہ مکران کو جس پر سندھیوں نے قبضہ کر رکھا تھا، فتح کر کے سندھیوں کو بھگا دیا۔ پھر وہ پنج گور کی طرف بڑھا اور اسے فتح کر کے ارمابیل (ارمن بیلہ) کو فتح کیا۔

ارمن بیلہ کو مسخر کرنے کے بعد وہ دیبل کی طرف بڑھا۔ اس کے پہنچنے کے ساتھ ہی وہ سامان بھی جسے اس نے بحری راستے سے بھیجا تھا، پہنچ گیا۔ اس میں ایک قلعہ شکن منجنیق بھی تھی جسے پانچ سو آدمی حرکت دیتے تھے۔ اس کا نام "عروس" تھا۔ محمد بن قاسم دیبل پہنچا تو شہر کے باشندے شہر میں قلعہ بند ہو گئے۔ محمد بن قاسم نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور اور چاروں طرف منجنیقیں نصب کر دیں۔ اہل شہر کئی ماہ تک نہایت شجاعت اور بہادری سے اپنا دفاع کرتے رہے لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

حجاج کو محمد بن قاسم کی اس مہم سے اس قدر تعلق خاطر تھا کہ ہر تیسرے روز محاذ جنگ کی خبریں منگوا کر اور وہاں کے حالات معلوم کر کے مناسب ہدایات بھیجتا تھا۔ جب دیبل کے محاصرہ نے طوالت اختیار کی اور کوئی نتیجہ نہ نکلا تو حجاج نے لکھا کہ منجنیق کا ایک زاویہ کم کر کے مشرقی جانب نصب کر کے دیول پر سنگ باری کی جائے۔ دیول ایک تیرتھ گاہ تھا۔ شہر کے وسط میں ایک بہت بڑے مندر میں مہاتما بدھ کا بت تھا۔ مندر کی شاندار عمارت پر ایک بہت اونچا مینار بنا ہوا تھا۔ مینار کے برج پر ایک بہت بڑا سرخ جھنڈا نصب تھا۔ جب ہوا چلتی تو

Marfat.com

یہ جھنڈا سارے شہر پر لہراتا۔ ایک روز مسلمانوں نے تاک کر منجنیق سے نشانہ لگایا تو مندر کے مینار کی ایک برجی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور وہ مقدس جھنڈا زمین پر آرہا۔ اہل شہر نے اسے بدشگونی سمجھا اور ان کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ ان کی ہمتوں کی یہ پستی دیکھ کر مسلمانوں نے نہایت جوش و خروش سے شہر پر حملہ کر دیا۔ کچھ نوجوان رسوں کی کمندیں ڈال کر فصیل پر چڑھ گئے اور شہر کو بزور شمشیر فتح کر لیا۔ راجہ داہر کا حاکم بھی موقع دیکھ کر فرار ہو گیا۔ محمد بن قاسم مسلمان فاتح فوج کو لے کر شہر میں داخل ہوا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد ایک مسجد تعمیر کرائی۔ یہ اس علاقہ میں سب سے پہلی مسجد تھی جو اللہ تعالیٰ کی توحید کے اعلان کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ دوسرا کام یہ کیا کہ چار ہزار مسلمانوں کو وہاں آباد کیا۔ (فتوح البلدان بلاذری: ص ۴۴۲)

دیبل کو فتح کرنے کے بعد وہاں سے تھوڑی مسافت پر ایک شہر نیرون تھا۔ محمد بن قاسم بن نیرون اور برہمن آباد کی طرف بڑھا۔ نیرون کے راجہ بھدرکن نے اہل دیبل کا انجام دیکھ کر محمد بن قاسم سے پہلے ہی صلح کر لی۔ چنانچہ جب محمد بن قاسم شہر میں داخل ہوا تو اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ نیرون جاتے ہوئے راستہ میں بہرج کا علاقہ جو راجہ داہر کے بھتیجے بجرا کے زیر حکومت تھا، پڑتا تھا۔ یہاں کی آبادی بدھ مت کی پیروکار تھی، جو کشت و خون کو ناپسند کرتی تھی کیونکہ بدھ مت کا فلسفہ زندگی یہی ہے۔ مسلمانوں کا رخ بہرج کی طرف دیکھ کر اس نے بجرا سے درخواست کی کہ ہم لوگ امن و آشتی کے خواہش مند ہیں اور قتل و غارت کو پسند نہیں کرتے، اس لیے اگر ہم نے عربوں سے مقابلہ کیا تو وہ ہم کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں گے۔ ہم کو یہ پتہ چلا ہے کہ خلیفہ کا حکم ہے کہ مطیع اور امن پسند آبادی سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ عرب جو وعدہ کرتے ہیں اس کو بہرصورت پورا کرتے ہیں خواہ انھیں کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے، اس لیے اگر آپ کی رائے ہو تو ہم عربوں سے صلح کر لیں لیکن بجرا نے ان کی اس درخواست کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

بہرج کی آبادی فرمان بردار اور اطاعت کیش تھی، اس لیے محمد بن قاسم نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا اور اصل مرکز سیوستان کی طرف بڑھا۔ محمد بن قاسم کا جاسوسی نظام بھی بہت اچھا اور سخت تھا۔ اس کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ سیوستان کے عام رہائشی اور باشندے اطاعت کے لیے آمادہ اور تیار ہیں لیکن راجہ بجرا اور قلعہ کی مسلح فوج اطاعت کے بجائے مقابلہ کرنا چاہتی ہے۔ اس اطلاع کے باعث محمد بن قاسم نے سیوستان پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور منجنیقوں سے شہر اور قلعہ پر سنگ باری شروع کر دی۔ یہاں کی آبادی بھی چونکہ جنگ کرنا نہیں چاہتی تھی اس وجہ سے انھوں نے اپنے راجہ بجرا سے درخواست کی کہ ہم لوگوں میں ان عربوں کے مقابلہ کی طاقت نہیں اور نہ ہی ہمارے عقیدے کے باعث قتل و قتال جائز ہے، اس لیے جنگ نہ کی جائے اور مصالحت کی کوئی صورت پیدا کی جائے تاکہ امن و آشتی کا دور دورہ ہو لیکن بجرا نے ان کی اس التجا کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ملوکیت ہو یا جمہوریت عوام کی درخواستوں پر صاحبان اقتدار کوئی توجہ نہیں دیتے۔ اہل شہر کسی صورت بھی بجرا کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے کیونکہ وہ لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اہل شہر نے مجبور ہو کر محمد بن قاسم کو کہلا بھیجا

Marfat.com

کہ ہم سب لوگ بجرا سے نفرت کرتے ہیں اور جنگ وجدال کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لہٰذا ہم کو اس جنگ سے کوئی تعلق نہیں۔ راجہ کے پاس کوئی خاص فوجی قوت بھی نہیں۔ رعایا کا یہ پیغام مسلمانوں کے لیے حوصلہ افزا تھا لہٰذا انھوں نے جنگ اور محاصرہ میں اور سختی کر دی۔ ایک ہفتہ کے مقابلہ کے بعد بجرا کی فوج کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ کمزوری دکھانے لگی۔ اپنی فوج کی یہ کمزوری دیکھ کر بجرا ایک رات اپنی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ شہر سے فرار ہوگیا اور بودھیا کے حاکم کاکے کے پاس جا کر پناہ لی۔ یہ داہر کا ماتحت تھا۔ اس نے بجرا کو بڑے احترام اور اعزاز کے ساتھ اپنے ہاں ٹھہرایا۔ بجرا کے فرار کے بعد سیوستان پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور محمد بن قاسم نے چند روز قیام کرکے یہاں ضروری انتظامات کیے تاکہ رعایا کو بھی امن وسکون حاصل ہو اور شہر کا انتظام بھی پہلے سے بہتر ہو۔

بجرا خالص ہندو ذہنیت کا راجہ تھا وہ کسی صورت بھی مسلمانوں کو پسند نہیں کرتا تھا اس وجہ سے اس نے اپنی رعایا کی بات پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ اب وہ سیوستان سے فرار ہو کر جب کاکا کے دارالسلطنت سیسم میں پناہ لینے کے لیے گیا تو وہاں بھی اس نے سیسم کو اپنی ریشہ دوانیوں اور شورشوں کا مرکز بنایا۔ محمد بن قاسم اس کی اس شرارتوں اور شورشوں کو کیسے پسند کرسکتا تھا لہٰذا اس نے سیوستان کے انتظامات سے فراغت کے بعد سیسم کا رخ کیا۔ مفتوحہ علاقے کے باشندے محمد بن قاسم کے حسن سلوک سے اس قدر متاثر تھے کہ سیسم کی جانب فوج کشی میں بہت سے سردار بھی اس کے ہم رکاب ہوگئے۔

کاکا خود ایک صلح پسند شخص تھا لیکن وہ چونکہ راجہ داہر کا ماتحت تھا اور راجہ داہر کا بھتیجا تھا لہٰذا وہ بجرا کی کارگزاریوں میں مزاحمت نہیں کرسکتا کیونکہ وہ مجبور تھا۔ لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ محمد بن قاسم نے اب سیوستان سے سیسم کی جانب رخ کیا ہے تو اسے سخت پریشانی ہوئی۔ چنانچہ وہ اپنے چند معتمد علیہ ساتھیوں اور سرداروں کے ساتھ محمد بن قاسم کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس کے روانہ ہونے سے قبل محمد بن قاسم نے ایک عرب سردار بنانہ بن حنظلہ کو حالات کی تحقیقات کے لیے سیسم کی جانب روانہ کر دیا تھا۔ راستہ میں کاکا اور اس کے ساتھیوں کی اس عرب سردار سے ملاقات ہوگئی۔ بنانہ کاکا کا ارادہ اور عندیہ معلوم کرکے اسے اپنے ساتھ محمد بن قاسم کے پاس لے آیا۔ کاکا اور اس کے ساتھیوں نے محمد بن قاسم کو اپنی اطاعت اور وفاداری کا ہر ممکن یقین دلایا۔ محمد بن قاسم نے ان لوگوں کی بہت عزت افزائی کی، خلعت فاخرہ سے نوازا۔ ایک مسلمان وکیل عبدالملک بن قیس کو ان کے ساتھ کرکے بڑے اعزاز واحترام کے ساتھ انھیں واپس بھیجا۔ کاکا محمد بن قاسم کی اس عزت افزائی سے بڑا متاثر ہوا کیونکہ یہ اس کے لیے ایک انوکھی بات تھی۔ ہندوستان کی سرزمین میں کبھی کسی فاتح نے دوسرے راجاؤں سے ایسا اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ کاکا نے گو خود تو اطاعت قبول کر لی تھی لیکن وہ راجہ بجرا کو جواب تک سیسم میں مقیم تھا، اپنے ہاں سے نکال نہیں سکتا تھا۔ فوج اور کچھ جرنیل بھی اس کے ساتھ تھے کیونکہ وہ راجہ داہر کا بھتیجا تھا۔ چنانچہ محمد بن قاسم نے سیسم پہنچ کر قلعہ پر حملہ کر دیا۔ بجرا نے اپنے سرداروں کے

Marfat.com

ساتھ مقابلہ کیا اور ایک ایک سردار نے مادر وطن کی حفاظت کی خاطر لڑ کر جان دی۔ کچھ لوگ شکست کھا کر بھاگ گئے اس شکست کے بعد چند سرداروں نے جو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے راجہ داہر کے خلاف تھے لیکن علانیہ اس کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے، محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کر لی۔ سیسم کے قلعہ کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے حمید بن وداع اور عبدالقیس جارودی کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔

سیسم میں چند روز آرام کرنے اور وہاں کے شہری انتظامات کو درست کرنے کے بعد محمد بن قاسم آگے بڑھنے کا قصد کر رہا تھا کہ حجاج بن یوسف کا خط آیا کہ یزون واپس جا کر راجہ داہر کے پایہ تخت پر فوج کشی کرو۔ حجاج کا یہ حکم پا کر محمد بن قاسم یزون واپس آ گیا اور چند روز یہاں قیام کر کے راجہ داہر کے پایہ تخت کی طرف بڑھا۔ راستہ میں شیلہار کے قلعہ کو فتح کرتے ہوئے دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر پہنچا اور بیٹ کے راجہ موکا کو جو راجہ داہر کے ماتحت تھا، لکھا کہ اگر تم اطاعت قبول کر لو تو کچھ اور سورت کی حکومت تم کو دی جائے گی۔ راجہ موکا اور اس کے بھائی راسل کے درمیان تخت کے معاملہ میں اختلاف چلا آ رہا تھا، اس لیے راسل کے مقابلہ میں اس کو مسلمانوں کی حمایت کی سخت ضرورت تھی، لیکن حالت یہ تھی کہ وہ علانیہ راجہ داہر کے دشمنوں کی اطاعت قبول نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اس نے محمد بن قاسم کو لکھ بھیجا کہ بغیر جنگ کے آپ کی اطاعت قبول کر لینے میں میری اور میرے خاندان کی بہت بڑی رسوائی ہوگی، اس لیے میں ایک مختصر جماعت کے ساتھ سانکڑا جاتا ہوں۔ آپ ایک ہزار فوجیوں کو بھیج کر مجھے گرفتار کرا لیجئے۔ یہ خط لکھ کر وہ سانکڑا روانہ ہو گیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق محمد بن قاسم نے نبانہ بن حنظلہ کو ایک ہزار فوجیوں کے ساتھ اس کے پیچھے روانہ کر دیا۔ اس نے سامنا ہوتے ہی حملہ کر دیا۔ چونکہ پہلے سے بات ہو چکی تھی اس لیے موکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسلمان فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ جب وہ گرفتار شدہ محمد بن قاسم کے پاس لایا گیا تو محمد بن قاسم نے اس کی بڑی عزت افزائی کی۔ ایک لاکھ نقد انعام عطا کیا اور خلعت فاخرہ سے نوازا اور ہمیشہ کے لیے اسے اور اس کی نسل کو بیٹ کی حکومت کا پروانہ عطا کر دیا۔

محمد بن قاسم اگرچہ سترہ سال کا نوجوان تھا لیکن عقل و دانش میں وہ بوڑھوں سے بھی زیادہ ہوش مند تھا۔ فوجی اور شہری انتظامات کے نشیب و فراز سے بھی بخوبی آشنا تھا۔ اس کا مقصد خواہ مخواہ راجہ داہر سے جنگ و قتال کرنا نہیں تھا بلکہ اسے مطیع و منقاد کرنا تھا۔ اس لیے راجہ موکا کی اطاعت کے بعد راجہ داہر سے جارحانہ اقدام سے قبل، اس نے داہر کے پاس ایک وفد بھیجا تا کہ مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے اور وہ اسلامی سلطنت کا باجگزار بن جائے۔ لیکن اسے اپنی فوجی قوت پر بہت ناز تھا۔ اسی عسکری قوت کے نشہ میں اس نے اس وفد کو یہ جواب دے کر واپس کر دیا کہ مسلمانوں سے ہماری تلوار فیصلہ کرے گی۔ وفد کو یہ جواب دینے کے ساتھ ہی وہ فوجیں لے کر محمد بن قاسم سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنے پایہ تخت سے روانہ ہو گیا اور مسلمانوں کی فرودگاہ کے پاس پہنچ کر اس کے بالمقابل دریائے سندھ کے مشرقی جانب خیمہ زن ہو گیا۔ اب حالت یہ تھی کہ دونوں فوجوں

Marfat.com

کے درمیان صرف دریائے سندھ حائل تھا۔ راجہ داہر بڑا تجربہ کار اور منجھا ہوا شخص تھا اور جنگی فنون سے بخوبی آشنا تھا، اس لیے اس نے جا بجا تیر انداز متعین کر دیئے تاکہ مسلمان کشتیوں کا پل بنا کر دریا پار نہ کر سکیں۔ چنانچہ جیسے ہی مسلمان فوجیں پل بنانے کے لیے کشتیاں جوڑنے کی کوشش کرتے، تیر انداز تیروں کی بارش کر کے ان کو ہٹنے پر مجبور کر دیتے۔ یہ حالت دیکھ کر مسلمانوں نے کشتیوں کو دریا کے عرض میں جوڑنے کے بجائے پاٹ کا اندازہ کر کے رات کی تاریکی میں طول میں جوڑ کر ایک لمبا پل بنایا اور اس کو دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ اس تدبیر سے کشتیوں کا دوسرا سرا ساحل پر پہنچ گیا، اور مسلمان راتوں رات دریا کو عبور کر کے اس زور شور سے راجہ داہر کی فوج پر حملہ آور ہوئے کہ وہ مسلمانوں کے اس ناگہانی حملہ کی تاب نہ لا کر جہم کے پھاٹک تک پسپا ہوتے چلے گئے۔ ان کو پسپا کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے بیٹ کو اپنا مرکز قرار دیا اور عبداللہ بن علی ثقفیؒ کو ایک دستہ کے ساتھ آگے روانہ کر دیا۔ راجہ داہر اس وقت کا جی جاٹ میں مقیم تھا۔ عبداللہ ارور ہوتا ہوا جیور کی طرف بڑھا۔ راستہ میں داہر کا ایک لڑکا (بعض نے اس کا نام جے سنگھ لکھا ہے لیکن یہ غلط ہے) کچھری جھیل پر پہلے سے مزاحمت کے لیے موجود تھا۔ یہاں دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ راجہ داہر کے بیٹے کی فوج مقابلہ کی تاب نہ لا سکی۔ وہ خود بھی گھوڑے سے گر پڑا لیکن کسی طرح بچ کر نکل گیا۔

اس شکست کی اطلاع جب راجہ داہر کو ملی تو وہ اور اس کے جرنیل سخت پریشان ہوئے بلکہ ان میں بددلی اور دون ہمتی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ راجہ موکا کا بھائی ارسل جو بیٹ کی حکومت کے لالچ میں راجہ داہر کے ساتھ تھا، مایوس ہو کر محمد بن قاسم سے مل گیا، اور اپنے قیمتی مشوروں سے مسلمان فوجیوں کو بڑی مدد پہنچائی، اور محمد بن قاسم اس کے مشورے اور راہ نمائی میں دہر کی طرف بڑھا، اور جیور پر قبضہ کر کے وہاں اپنی فوجوں کو اتار دیا۔ اس وقت راجہ داہر مقابلہ کے لیے روانہ ہوا۔ محمد بن قاسم پہنچ چکا تھا۔ راجہ داہر بڑے شکوہ وتجمل اور شان وشوکت کے ساتھ مسلمان فوجوں کے مقابلہ میں آیا۔ آگے کوہ پیکر ہاتھیوں کی صف تھی۔ ان کے پیچھے دس ہزار سوار اور تیس (۳۰) ہزار پیدل سپاہ تھی۔ خود داہر (ایرانی وزیر جنگ رستم کی طرح) ایک سفید ہاتھی پر سوار تھا۔ خواصیں دائیں بائیں جلوہ فگن تھیں۔ داہر کے پہنچتے ہی دونوں فریقوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ دونوں طرف کی فوجیں نہایت شجاعت، جرأت، استقلال اور پامردی سے لڑیں۔ ہاتھیوں کی آہنی دیوار کے سامنے مسلمانوں کا زور نہ چلتا تھا، اس لیے انھوں نے نفت کے ذریعہ آگ برسانا شروع کی۔ اس آگ کے سامنے ہاتھی نہ ٹک سکے اور بدحواسی سے پیچھے بھاگے۔ راجہ داہر کا سفید ہاتھی بھاگ کر ندی میں جا کر دلدل میں بیٹھ گیا۔ مسلمانوں نے ہاتھی پر تیر برسانا شروع کر دیئے۔ فیل بان نے کسی نہ کسی طرح ہاتھی کو اٹھایا لیکن وہ میدان جنگ میں جانے کے بجائے سیدھا قلعہ کی طرف بھاگا۔ راجہ داہر کی فوج برابر لڑتی رہی اور اس کے بڑے جرنیلوں نے مردانہ وار لڑ کر اپنی جانیں دیں۔ ان کی شجاعت، بہادری اور جانبازی دیکھ کر داہر کی حمیت وغیرت میں پھر جوش پیدا ہوا اور وہ شمشیر بکف میدان جنگ میں پہنچا اور پا پیادہ عام سپاہیوں کے دوش بدوش لڑ کر میدان میں کام آیا۔ جونہی راجہ

Marfat.com

داہر قتل ہوا اس کی فوج میں اور جوش پیدا ہوا اور وہ مادر وطن کے دفاع اور اپنے راجہ کا انتقام لینے کے لیے اس جوش و خروش سے لڑی کہ مسلمانوں کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ مسلمانوں نے بھی مقابلہ میں پوری قوت صرف کر دی۔ نتیجہ میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور سندھیوں کو شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ قلعہ راور کی طرف بھاگے۔ مسلمانوں نے دور تک ان کا تعاقب کر کے بعض کو قتل اور بعض کو گرفتار کر لیا۔

راجہ داہر کا قاتل اس کارنامہ پر بعض اشعار میں بڑے فخر کا اظہار کرتا تھا۔ اس کے تین شعروں کا ترجمہ یہ ہے:

''داہر سے لڑائی کے روز گھوڑے، نیزے اور محمد بن قاسم اس بات کے گواہ ہیں کہ میں بغیر پیچھے ہٹے میدان کو صاف کرتا ہوا بڑھتا رہا یہاں تک کہ میں نے اسے اس وقت چھوڑا جب وہ غبار کی چادر میں لپٹا پڑا تھا۔ اس کے دونوں رخسار خاک آلود تھے اور اس کے سرہانے کوئی تکیہ بھی نہ تھا۔''

یہ شکست کوئی معمولی شکست نہ تھی۔ تمام ہندوستان کے راجے مہاراجے اس سے بدحواس اور پریشان ہو گئے۔ شکست خوردہ فوج راور کے قلعہ کی طرف بھاگی تھی۔ لہٰذا راجہ داہر کے لڑکے جے سنگھ نے شکست خوردہ فوج کو راور میں جمع کر کے از سر نو مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے دانش منداور عاقبت اندیش وزیر نے مشورہ دیا کہ شکست خوردہ فوج اور اس کے نواح و اطراف کے لوگوں کے دلوں پر مسلمانوں کی ہیبت اور ان کا رعب بیٹھ چکا ہے، اس لیے یہاں مقابلہ کرنا مناسب نہیں ہے برہمن آباد چل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ وہاں جنگ کے ذرائع یہاں سے بہتر ہیں۔ مشورہ بہت اچھا تھا اور عقل و خرد رکھنے والے دماغ سے نکلا تھا کیونکہ اس زمانہ کے وزیر آج کل کے وزیروں کی طرح عقل و دانش سے عاری نہیں ہوتے تھے۔ جے سنگھ کو اپنے وزیر کا یہ مشورہ پسند آیا، اس لیے وہ راور سے برہمن آباد چلا گیا۔

راجہ داہر کی ایک رانی جے سنگھ کے ساتھ برہمن آباد نہ گئی بلکہ جے سنگھ کے برہمن آباد جانے کے بعد فوج لے کر وہ خود مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے آمادہ اور تیار ہوگئی۔ راور کے قلعہ کی فوج نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ محمد بن قاسم کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی تو وہ سیدھا راور پہنچا اور قلعہ کا محاصرہ کر کے سنگ باری اور آتش زنی شروع کر دی۔ اس سے قلعہ کر کے برج منہدم ہو گئے۔ رانی نے جب دیکھا کہ قلعہ کا بچنا مشکل ہے تو وہ اپنی خواصوں سمیت ستی ہوگئی اور راور پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ (فتوح البلدان: ص ۴۴۳)

برہمن آباد پہنچنے کے بعد جے سنگھ مسلمانوں کے مقابلہ کی تیاریاں کر رہا تھا اس لیے راور فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے برہمن آباد کا رخ کیا اور راستہ میں بہرور اور دھلیلا کے قلعے فتح کیے۔

راجہ داہر کا وزیر سی ساکر بڑا عاقبت اندیش تھا جو دوسروں کو دیکھ کر عبرت حاصل کر لیا کرتا تھا۔ جے سنگھ کے انجام کا اندازہ کر کے اس نے محمد بن قاسم سے جان بخشی اور اطاعت کی درخواست کی۔ دہلیلا کے قلعہ کی فتح کے بعد اس کے قاصد محمد بن قاسم کے پاس پہنچے۔ محمد بن قاسم بڑا قدر شناس شخص تھا۔ ویسے بھی اسلام انسانیت

Marfat.com

کی بہت قدر کرتا ہے۔ وزیر مذکور نے ملاقات کا وقت مانگا۔ محمد بن قاسم نے وزیر کی درخواست منظور کر کے اسے وقت دے دیا، وزیر سی ساکر خود محمد بن قاسم کے پاس گیا اور وہاں جا کر اپنا اظہار اطاعت کیا اور وہ عرب عورتیں پیش کیں جنھیں سندھ کے بحری قزاقوں نے (ہمارے خیال میں راجہ داہر کے کہنے پر) جہاز سے گرفتار کیا تھا اور جن کے باعث حجاج بن یوسف نے سندھ پر حملہ کر دیا تھا۔ وزیر سی ساکر کی اطاعت کیشی اور مطیع و منقاد ہونے کے باعث محمد بن قاسم نے دوسرے اطاعت کیشوں کی طرح اس کی بھی بڑی عزت افزائی کی اور اس کو وزیر بنا کر اس کا اعزاز قائم رکھا۔ سی ساکر نے بھی اپنی خیر خواہی اور وفا کیشی سے اتنا اعتماد حاصل کر لیا کہ محمد بن قاسم اس کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔

ڈھلیلا کے قلعہ کے فتح کے بعد اب جے سنگھ کا مرکز جنگ برہمن آباد ہو گیا تھا۔ سارے مشورے وہیں ہوتے اور ساری تدابیر کی انجام دہی کے منصوبے بھی وہیں تیار ہوتے۔ برہمن آباد اب مسلمان فوجوں کے لیے ایک نہایت خطرناک مقام بن گیا تھا، اس لیے اب سنہ ۹۲ ھ میں محمد بن قاسم برہمن آباد پہنچا۔ جے سنگھ مسلمان فوجوں کے ساتھ مقابلہ کے تمام انتظامات مکمل کر چکا تھا اور اپنے نامور سرداروں کو ذمہ دار بنا کر کسی جنگی ضرورت سے خود برہمن آباد سے چلا گیا۔ محمد بن قاسم نے جنگ شروع کرنے سے قبل اہل شہر کو کہلا بھیجا: یا تو اسلام قبول کر لو، یا پھر ہمارے باجگزار بن جاؤ ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جب محمد بن قاسم کو اس کا کوئی جواب نہ ملا کیونکہ وہاں جواب دینے والا کوئی تھا نہیں۔ جے سنگھ کا نائب اس کی مرضی کے خلاف کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا، لہٰذا کوئی جواب نہ آنے کی صورت میں محمد بن قاسم نے جنگ شروع کر دی۔ جے سنگھ کی فوج قلعہ بند ہو کر لڑ رہی تھی، اور محمد بن قاسم نے شہر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ محاصرہ عرصہ تک جاری رہا اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس دوران میں جے سنگھ واپس آ گیا۔ قلعہ اور جے سنگھ کے درمیان مسلمان حائل تھے، اس لیے وہ برہمن آباد نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ اس نے وہیں ٹھہر کر مسلمانوں کے سامان رسد کی ناکہ بندی کر دی۔ اس سے مسلمانوں کو بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ محمد بن قاسم نے راجہ موکا کے مشورہ سے فوج کا ایک دستہ جے سنگھ کے مقابلہ کے لیے بھیج دیا کیونکہ جے سنگھ کے پاس زیادہ فوجی قوت نہ تھی۔ اس وجہ سے وہ پیچھے ہٹ گیا اور اپنے بھائی گوپی کو اپنا نائب بنا کر مختلف منزلیں طے کرتا ہوا کشمیر نکل گیا۔ جے سنگھ کے فرار کے بعد کچھ دنوں تک فوج اور برہمن آباد کے باشندوں نے مدافعت کی لیکن کب تک؟ جب محاصرہ نے طول کھینچا تو اہل شہر گھبرا کر محمد بن قاسم سے مل گئے۔ چنانچہ ایک روز وہ اپنے معمول کے مطابق مقابلہ کے لیے نکلے اور معاہدہ کے مطابق معمولی جنگ کے بعد شہر میں پسپا ہو گئے اور شہر کے دروازے کھلے رہنے دیئے۔ قلعہ کے اندر جو فوج تھی اس کو اہل شہر کے اس معاہدے کا علم نہ تھا۔ وہ مسلمان فوج کے اس ناگہانی داخلہ سے گھبرا گئی اور جس فوجی کو جہاں سے راستہ ملا وہ شہر سے نکل گیا اور محمد بن قاسم نے شہر میں داخل ہو کر عام معافی کا اعلان کر دیا۔ راجہ داہر کی ایک رانی لاڈی جو برہمن آباد میں تھی، گرفتار ہوئی اسے محمد بن قاسم نے نہایت عزت کے ساتھ ارور میں ٹھہرایا اور پھر حجاج بن

Marfat.com

یوسف کی اجازت سے اپنے عقد میں لے آیا۔

برہمن آباد فتح ہو گیا۔ وہاں کے باشندے مسلمانوں کے حسن سلوک سے بہت خوش تھے کیونکہ کبھی کسی فاتح نے مفتوح قوم سے اتنا اچھا سلوک نہیں کیا تھا جیسا مسلمانوں نے ان لوگوں سے کیا۔ برہمن آباد کی فتح کے بعد راجہ داہر کا لڑکا گوپی ارور چلا گیا اور وہاں کے باشندوں کو یہ یقین دلانا شروع کر دیا کہ راجہ داہر قتل نہیں ہوا بلکہ ہندوستان کے راجاؤں کے پاس چلا گیا ہے اور جلد ہی وہ ان راجاؤں سے مدد لے کر یہاں پہنچے گا، اہل شہر کو یہ دھوکہ دے کر جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اس وجہ سے برہمن آباد کے ضروری انتظامات سے فراغت کے بعد محمد بن قاسم ارور روانہ ہو گیا۔ راستہ میں ساوندری کے باشندوں نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت کا اظہار کیا اور محمد بن قاسم اور بھی چھوٹے چھوٹے شہر فتح کرتا ہوا ارور پہنچا۔ اس درمیان میں گوپی جنگ کی پوری تیاری کر چکا تھا۔ محمد بن قاسم نے ارور پہنچتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہل شہر راجہ داہر کی امداد کی توقع پر مقابلہ کرتے رہے۔ محمد بن قاسم کو جب اس بات کا علم ہوا کہ گوپی نے انھیں یقین دلایا ہوا ہے کہ داہر زندہ ہے، اس لیے وہ مقابلہ کر رہے ہیں، تو اس نے رانی لاڈی کے ذریعہ اہل شہر کو کہلا بھیجا کہ راجہ تو قتل ہو چکا ہے، لہٰذا تم لوگ مقابلہ کے بجائے اطاعت قبول کر لو۔ یعقوبی کا بیان ہے کہ لاڈی کے یقین دلانے پر اہل شہر نے محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کر لی اور مسلمان فوج کے لیے شہر کے دروازے کھول دیئے۔ (یعقوبی: ۳۴۶/۲) بعض دوسری تاریخوں میں ہے کہ اہل شہر نے رانی کے بیان پر اعتماد نہ کیا اور اس کی شان میں نازیبا باتیں کہیں، اس لیے محاصرہ جاری رہا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جب راجہ داہر کی کوئی کمک نہ آئی اور انھیں خود بخود یقین ہو گیا کہ راجہ موت کی آغوش میں چلا گیا ہے۔ اب انھیں کسی قسم کی مدد کا سہارا نہ رہا لہٰذا اب وہ اطاعت قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ صورت دیکھ کر گوپی کیرج بھاگ گیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ گوپی کے فرار کے بعد ارور کے باشندے اس شرط پر شہر حوالہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے کہ ہر شہری کو امان دی جائے۔ کسی کو قتل نہ کیا جائے اور بدھ کے صنم کدہ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ محمد بن قاسم نے ان کی یہ سب شرطیں منظور کر لیں اور اہل شہر نے شہر فاتح فوجوں کے حوالے کر دیا۔ محمد بن قاسم نے قلعہ کی مسلح سپاہ کے علاوہ باقی شہر کی عام آبادی کو عام معافی دے دی اور صنم کدہ کو کلیسا اور آتش کدہ کے حکم میں قرار دے کر اس سے کوئی تعرض نہیں کیا اور اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا، اور اہل شہر پر معمولی خراج عائد کر دیا۔ (فتوح البلدان: ص ۴۳۲)

ارور کے تمام انتظامات مکمل کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے اب قلعہ بابیہ کا رخ کیا۔ یہاں کے حاکم راجہ کسکا نے اطاعت قبول کر لی کیونکہ ان چھوٹے چھوٹے راجاؤں میں مسلمان فوجوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی، لہٰذا یہاں جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ بابیہ کے بعد محمد بن قاسم اسکلندہ پہنچا۔ یہاں کے راجہ نے پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ سترہ روز تک نہایت خون ریز جنگ ہوتی رہی۔ بہت سے مسلمان جرنیل شہید ہوئے

Marfat.com

لیکن سندھیوں کا مسلمانوں سے کہیں زیادہ نقصان ہوا۔ آخر کار راجہ اور اس کی فوج ہمت ہار بیٹھی۔ راجہ تو ملتان کی طرف بھاگ گیا اور قلعہ پر مسلمان قابض ہو گئے۔

اسکلندہ کے بعد محمد بن قاسم دریائے چناب کو عبور کر کے ملتان کی طرف بڑھا۔ یہاں کا راجہ گور سنگھ تھا۔ اسے محمد بن قاسم کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی، اس وجہ سے وہ پہلے سے مقابلہ کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ ملتان کی حدود میں پہنچتے ہی فریقین میں سخت جنگ شروع ہو گئی۔ زائدہ میں عمیر طائی نے حیرت انگیز شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ اہل شہر کے پاس سامان رسد کم تھا جو کہ چند ہی روز میں ختم ہو گیا یہاں تک بار برداری کے جانور ذبح کرنے کی نوبت آ گئی، تاہم اس حالت میں بھی وہ اپنے دفاع کے لیے جمے رہے۔ حسن اتفاق سے ایک ملتانی مسلمان فوج کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے قلعہ کے کمزور حصہ کا پتہ بتا دیا۔ مسلمانوں نے منجنیقوں سے اس پر سنگ باری کر کے اس کو توڑ دیا، اس لیے اہل شہر کو اب باہر نکل کر مقابلہ کرنا پڑا۔ کھلے میدان میں مقابلہ میں وہ زیادہ دیر تک ٹک نہ سکے، لہٰذا جلد ہی مسلمان فوج کے ہاتھوں شکست کھا گئے اور مسلمانوں کا شہر پر قبضہ ہو گیا۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ اس ملتانی نے اس تالاب کا پتہ دیا جس سے قلعہ میں پانی جاتا تھا۔ مسلمانوں نے اس تالاب پر قبضہ کر کے قلعہ میں پانی جانے کو بند کر دیا۔ اس سے اہل شہر نے مجبوراً اطاعت قبول کر لی۔

(فتح البلدان: ص ۴۴۵)

ملتان بدھ مت کا بہت بڑا تیرتھ تھا اور یہاں کے صنم کدہ میں مال و دولت کے انبار لگے ہوئے تھے، لہٰذا یہ بے اندازہ دولت مسلمانوں کے قبضہ میں آئی۔ یہاں کے تیرتھ کی یاترا کرنے کے لیے دور دور سے یاتری آتے تھے اور بدھ کے بت پر بیش قیمت چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ یہاں صرف سونے کی مقدار اتنی تھی کہ ایک مکان میں جو اٹھارہ گز لمبا اور دس گز چوڑا تھا، اس میں سونا وغیرہ جمع کیا گیا تو وہ بھر گیا۔ اسی لیے عربوں میں ملتان ''سونے کی کان'' مشہور ہو گیا۔ حجاج بن یوسف نے حساب لگایا تو فتوحات سندھ پر ساٹھ لاکھ درہم صرف ہوئے تھے اور صرف مال غنیمت کی آمدنی ایک کروڑ بیس لاکھ ہوئی تھی۔ اس نے کہا: ''اس مہم میں ساٹھ لاکھ درہم کا فائدہ رہا اور ہم نے اپنا انتقام الگ لے لیا۔''

محمد بن قاسم ملتان ہی میں مقیم تھا کہ اسے حجاج بن یوسف کے انتقال کی خبر پہنچی۔ ان عظیم الشان فتوحات کے بعد جنھوں نے اسلام کی روشنی سے سندھ کے بیابانوں کو جگمگا دیا، ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ محمد بن قاسم کے بقیہ حالات سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ خلافت میں بیان ہوں گے۔ محمد بن قاسم نے اپنے آپ کو سندھیوں کے لیے نہایت شفیق اور رحم دل فاتح ظاہر کیا اور اس نے اپنے آپ کو رعایا پرور حکمران ثابت کیا۔ اس نوجوان سپہ سالار اور فاتح نے جس رواداری، بردباری، سیر چشمی اور لطف عطا کا اظہار کیا اس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ہیں۔ حجاج بن یوسف اور ولید بن عبدالملک کی وفات کے بعد اس نے اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا اور سنہ ۹۶ھ تک سورت سے لے کر کشمیر تک تمام مغربی ہندوستان کو مفتوح و محکوم کر لیا۔

Marfat.com

قتیبہ بن مسلم:

قتیبہ بن مسلم بھی محمد بن قاسم کی طرح ایک نہایت بہترین جرنیل تھا۔ سنہ ۸۶ھ میں حجاج بن یوسف نے قتیبہ کو مفضل بن مہلب کی جگہ خراسان کا والی مقرر کیا قتیبہ نے خراسان پہنچتے ہی جہاد کی اہمیت اور فضیلت پر ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے لوگ اللہ کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ قتیبہ ان مجاہدین کو لے کر ترکستان کے فتنہ انگیز اور باغی سرداروں پر فوج کشی کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ قتیبہ خانقان پہنچا تو بلخ کے سردار بھی اس سے آملے۔ جب قتیبہ نے دریائے جیحون کے پار قدم رکھا تو صفانیان کے بادشاہ نے تحائف وہدایا کے ساتھ مسلمان فوجوں کا استقبال کیا اور سونے کی کنجی اس کی خدمت میں پیش کر کے شہر کو قتیبہ ہی کی نگرانی میں دے دیا کیونکہ پڑوسی شاہ آفروں وشومان اس کو بہت پریشان کرتا تھا۔

گورنر خراسان بننے کے بعد قتیبہ بن مسلم نے ترکستان کا رخ اس لیے کیا کہ ترکستان کے اچھے خاصے حصہ پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور یہاں کے کئی چھوٹے چھوٹے حکمران مسلمانوں کے باجگزار بن چکے تھے، لیکن جب بھی موقع ملتا وہ باغی ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی سمرقند اور بخارا کے اطراف ونواح کے حکمرانوں کا رویہ باغیانہ تھا۔ علاوہ ازیں بعض علاقے اب تک اسلامی حکومت کے زیر اقتدار نہ آئے تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر گورنر خراسان مقرر ہوتے ہی سنہ ۸۶ھ میں قتیبہ بن مسلم نے ترکستان پر فوج کشی کی۔ حسن اتفاق سے اس زمانے میں یہاں کے حکمرانوں میں باہمی مخالفت چل رہی تھی۔ اس سے قتیبہ کو بہت فائدہ ہوا اور جب انھوں نے دریائے جیحون کے پار قدم رکھا اس وقت چغانیاں کے فرماں روا نے جو شومان کے حکمران کے خلاف رہتا تھا، اطاعت قبول کر لی اور ہدایا اور تحائف پیش کر کے اپنا مہمان بنایا۔ صفانیاں سے قتیبہ نے شومان کا رخ کیا۔ شومان اور کفیان کے فرمان رواؤں نے بھی صفانیاں کا طرز عمل دیکھ کر اطاعت قبول کر لی۔ ان دونوں کو مطیع ومنقاد بنانے کے بعد قتیبہ اپنے بھائی صالح کو انتظام اور نگرانی کے لیے چھوڑ کر مرو واپس آ گیا۔ اس کی واپسی کے بعد صالح اور نصر بن یسار نے کاشان اور فرغانہ کے شہر اورشت، بینخر اور اخسیکت فتح کر لیے۔ (فتوح البلدان، بلاذری: ص ۴۲۶)

بادغیس کے فرمان روا نیزک کے یہاں عرصہ سے کچھ مسلمان قید تھے۔ مرو واپس آنے کے بعد قتیبہ نے ان کی رہائی کے بارے میں لکھا۔ نیزک نے انھیں رہا کر دیا اور اس شرط پر صلح کر لی کہ اس کا علاقہ محفوظ رکھا جائے گا اور وہ ترکستان کے معرکوں میں قتیبہ کا معاون ومددگار بن گیا۔

سنہ ۸۷ھ میں قتیبہ نے بخارا کے شہر بیکند پر فوج کشی کی۔ بخارا کے باشندوں نے صغد کے مدد سے مقابلہ کیا اور شکست کھا کر شہر میں قلعہ بند ہو گئے۔ قتیبہ نے شہر پناہ تڑوانا شروع کر دی۔ اہل شہر نے جب دیکھا کہ اگر اس طرح مسلمان فوجوں نے شہر پر قبضہ کیا تو ان کو زیادہ نقصان ہوگا، اس لیے انھوں نے صلح کر لی اور قتیبہ یہاں ایک مسلمان حاکم مقرر کر کے لوٹ گیا۔ ابھی یہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اہل شہر کے مسلمان حاکم

Marfat.com

اور اس کے عملہ کو قتل کر دیا۔ یہ خبر سن کر قتیبہ راستہ ہی سے واپس لوٹ آئے اور اہل شہر پھر محصور ہو گئے۔ اب قتیبہ نے شہر پناہ مسمار کروا دی۔ بیکند والوں نے پھر صلح کرنا چاہی اور اپنے کیے پر افسوس کا اظہار کرنے لگے، لیکن چونکہ وہ ایک مرتبہ نقض عہد کر کے اپنا اعتبار کھو چکے تھے، اس لیے اس مرتبہ قتیبہ نے ان کی صلح کی پیش کش کو مسترد کر دیا اور شہر کو بزور شمشیر فتح کر کے جس قدر جنگ جو تھے، ان سب کو قتل کروا دیا۔ اس فتح میں بے شمار اسلحہ اور سونا چاندی اور اس کے ظروف ہاتھ آئے جس سے مسلمانوں کو مالی طور پر بہت تقویت پہنچی۔ (ابن اثیر: ۲۰۳/۴)

اس بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ قتیبہ نے دریائے جیحون کو عبور کر کے بخارا کے شہر بیکند پر جو دریائے جیحون کے کنارے واقع تھا، حملہ آور ہوا۔ اہل بیکند نے صغد اور قرب و جوار کی دوسری قوموں سے امداد کی استدعا کی۔ چنانچہ ان کی استدعا پر ایک بہت بڑی جماعت ان کی امداد کے لیے آ پہنچی اور مسلمانوں کو گھیر کر ان کے تمام راستے بند کر دیئے۔ یہ محصوری کی کیفیت دو ماہ تک جاری رہی۔ قتیبہ کا کوئی قاصد اسلامی علاقہ میں جا سکا اور نہ وہاں کا کوئی پیام بر قتیبہ کے پاس پہنچ سکا۔ حجاج بن یوسف بھی اس صورت حال سے بہت پریشان تھا۔ اس نے قتیبہ کی کامیابی و کامرانی کے لیے مسجدوں میں دعائیں کرائیں۔ آخر کار محصور مسلمانوں نے ایک روز جان توڑ کر حملہ کیا جس سے کافروں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ شہر کی طرف بھاگے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور انھیں بے دریغ قتل اور گرفتار کیا۔ پھر بھی کچھ لوگ شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے اور شہر کے دروازے بند کر لیے۔ قتیبہ بن مسلم نے حکم دیا کہ شہر کی فصیل کو توڑ دیا جائے۔ اہل بیکند کو جب یقین ہو گیا کہ سوائے اطاعت کے اور کوئی چارۂ کار نہیں تو انھوں نے صلح کی پیش کش کی۔ قتیبہ نے ان کی یہ پیش کش منظور کر لی اور اپنی طرف سے وہاں ایک حاکم مقرر کر کے واپس لوٹ آیا۔ ابھی قتیبہ قریباً پانچ میل ہی گیا تھا تو اسے پتہ چلا کہ اہل بیکند نے بغاوت کر کے اس کے عامل کو قتل کر دیا ہے۔ قتیبہ یہ خبر سنتے ہی واپس لوٹ آیا اور شہر کی فصیل کو پورے طور پر منہدم کرنے کا حکم دے دیا۔ اہل بیکند نے پھر صلح کی درخواست کی لیکن قتیبہ نے اسے قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا اور زبردستی شہر میں داخل ہو کر دشمن کے جنگ جو جوانوں کو قتل کر دیا۔ ایک کانا شخص جس نے ان شورش پسندوں کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا، گرفتار ہو کر قتیبہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے کہا کہ میں اپنی جان کے فدیہ میں پانچ ہزار ریشمی تھان جن کی قیمت دس لاکھ درہم ہے، پیش کرتا ہوں، لیکن قتیبہ نے کہا کہ اب کوئی مسلمان تیرے دھوکے میں نہ آئے گا اور اسے قتل کرا دیا۔

سنہ ۸۸ھ کے موسم بہار میں قتیبہ بن مسلم پھر مناسب تیاریوں کے ساتھ روانہ ہوا اور دریائے جیحون کو پار کر کے نومشکث پہنچا۔ یہاں کے باشندوں نے صلح کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ یہاں سے قتیبہ رامثنہ پہنچا۔ یہاں کے باشندوں نے بھی صلح کی استدعا کی۔ قتیبہ نے ان کی درخواست بھی منظور کر لی۔ ان مہمات سے فارغ ہو کر قتیبہ نے مرو واپسی کا ارادہ کیا۔ جب وہ واپس لوٹ رہا تھا تو ترک، صغد اور اہل فرغانہ نے دو لاکھ کی تعداد میں جمع ہو کر خاقان چین کے بھتیجا کی قیادت میں قتیبہ کے لشکر کے پچھلے حصے (ساقہ) پر حملہ کر دیا۔ قتیبہ لشکر کے ساتھ

Marfat.com

آگے نکل چکا تھا۔ امیر ساقہ عبدالرحمٰن بن مسلم نے اپنے بھائی قتیبہ کو اس ناگہانی حملہ کی اطلاع دی اور خود اپنی مختصر جمعیت کے ساتھ بڑی بہادری سے دشمن کے لشکر جرار کا مقابلہ کیا۔ قتیبہ بھی خبر ملتے ہی واپس لوٹ پڑا۔ مسلمانوں نے قلت تعداد کے باوجود ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کو شکست فاش ہوئی۔ اس جنگ میں رئیس باذغیس نیزک نے مسلمانوں کی بڑی شجاعت، بہادری اور جانثاری کے ساتھ حمایت کی۔ (ابن اثیر: ۵۴۴/۴) قتیبہ ترمذ کے راستہ سے مرو لوٹ آیا۔

سنہ ۸۹ھ میں قتیبہ نے پھر فتح بخارا کے قصد سے دریائے جیحون کو عبور کیا۔ فرقانہ فلی پہنچا تو دشمنوں کی بہت بڑی جماعت سے مقابلہ ہوا۔ قتیبہ نے ان کو شکست فاش دی اور بخارا کے قریب پہنچ گیا۔ شاہ بخارا اور وردان کو قتیبہ کے حملہ کے اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے پوری تیاری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ قتیبہ بخارا کو فتح نہ کر سکا اور مرو واپس لوٹ آیا۔ بلاذری کا بیان ہے کہ جنگ کی نوبت نہیں آئی اور فرمان روائے بخارا اور وردان نے صلح کر کے اطاعت قبول کر لی۔ لیکن ابن اثیر کا بیان ہے کہ فریقین میں مقابلہ ہوا لیکن قتیبہ کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے حجاج کو اس کی اطلاع دی۔ حجاج نے بخارا کی جنگ کا نقشہ طلب کیا اور اسے دیکھ کر حملہ اور جنگ کے بارے میں مفصل ہدایات دیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حجاج کو جب اس ناکامی کی اطلاع ملی تو اس نے قتیبہ کو لکھا کہ تم نے وردان کے مقابلہ میں جو کمزوری دکھائی ہے اس کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور میرے مجوزہ نقشہ کے مطابق بخارا پر دوبارہ حملہ کرو۔ چنانچہ حجاج کی ہدایات کی روشنی میں سنہ ۹۰ھ میں قتیبہ دوبارہ بخارا کی فتح کے ارادہ سے مرو سے روانہ ہوا۔ شاہ بخارا نے اپنے اطراف و جوانب کے قبائل صغد اور ترک سے مدد مانگی لیکن ان کی امداد ابھی پہنچنے نہ پائی تھی کہ قتیبہ نے بخارا کا محاصرہ کر لیا۔ جب ترک اور صغد مدد کو آ گئے تو اہل بخارا کی جرأت اور ہمت میں قوت پیدا ہو گئی اور وہ بھی مقابلہ کے لیے باہر نکلے۔ اس لڑائی میں دشمن ایسی بہادری سے لڑا کہ ایک مرتبہ وہ مسلمان فوج کے ایک حصہ کو دھکیلتے ہوئے قلب لشکر میں پہنچ گیا۔ مسلمان عورتیں رونے لگیں اور انھوں نے اپنے مردوں کے گھوڑوں کو مار مار میدان جنگ میں واپس دھکیل دیا۔ عورتوں کے اس اقدام سے مردوں کی رگ حمیت پھڑکی اور انھوں نے پلٹ کر دشمن پر اس شدت سے حملہ کیا کہ دشمن کو ایک اونچے ٹیلے پر پناہ لینا پڑی۔ اس ٹیلہ اور مسلمانوں کے لشکر گاہ کے مابین اور نہر حائل تھی۔ یہ دیکھ قتیبہ نے للکار کر کہا کہ کوئی ہے جو دشمن کو اس ٹیلہ سے ہٹا دے۔ بنو تمیم کے دو سردار وکیع اور ہریم ہمت کر کے اور اپنے قبیلہ کے دوسرے جوانوں کو ساتھ لے کر مردانہ وار نہر پار کر کے دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ دشمن نے شکست فاش کھائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ یوں آخر کار بخارا پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں شاہ ترک خاقان اور اس کا بیٹا بھی زخمی ہوا۔ صغد کا بادشاہ بخارا کے بادشاہ کی شکست سے کچھ ایسا مرعوب ہوا کہ اس نے میدان جنگ ہی میں قتیبہ بن مسلم کو صلح کا پیغام بھیج دیا۔ قتیبہ نے جزیہ پر صلح کر لی۔ اس کامیابی کے بعد قتیبہ مرو واپس لوٹ آیا اور حجاج کو فتح کی خوش خبری بھیجی۔ (فتوح البلدان: ص ۲۰۷)

Marfat.com

نیزک کی بغاوت اور اس کا قتل:

باذغیس کا فرمان روا نیزک مسلمانوں کا ساتھی اور ان کا معاون و مددگار تھا لیکن پھر ترکستان وغیرہ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر قتیبہ کی جانب سے اس کو خوف سا پیدا ہو گیا اور وہ اس کی اجازت لے کر طخارستان واپس آ گیا اور مرو، روز، طالقان، فاریاب اور جوز جان وغیرہ اطراف و جوانب کے تمام حکمرانوں کو ساتھ لے کر مسلمانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور طخارستان سے مسلمان حاکم کو نکال دیا۔ قتیبہ کو جب نیزک کی اس حرکت کا پتہ چلا تو اس نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو طخارستان روانہ کیا اور خود دوسرے باغی فرمان رواؤں کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے طالقان فتح کر کے یہاں کے حکمران اور باشندوں سے ان کی بغاوت کا انتقام لیا۔ ایک بیان یہ ہے کہ یہاں کے حکمران نے سپر ڈال دی اس لیے قتیبہ نے درگزر سے کام لیا۔ طالقان کے بعد سنہ ۹۱ھ میں فاریاب کا رخ کیا۔ یہاں کے فرمان روا نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ قتیبہ نے اسے بھی معاف کر دیا اور یہاں ایک مسلمان حاکم کو چھوڑ کر جوز جان پہنچا۔ یہاں کا حکمران شہر کو چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف نکل گیا اور شہر کے باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔ پھر وہ بلخ ہوتا ہوا نیزک کی تلاش میں اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن مسلم سے حلم کی وادی میں جا ملا۔ عبدالرحمٰن پہلے ہی نیزک کی تلاش میں تھا۔ نیزک حلم کی پر پیچ اور دشوار گزار وادی میں گھس گیا تھا۔ گھاٹی کے منہ پر ایک دستہ فوج کا حفاظت کے لیے متعین کر دیا تھا۔ راستہ بہت دشوار گزار اور تنگ تھا۔ گھاٹی کی پشت پر ایک محفوظ قلعہ تھا جس میں ایک فوجی رکھا ہوا تھا اور خود نیزک بغلاں کی طرف نکل گیا۔

اس گھاٹی میں قتیبہ اور اس کے بھائی عبدالرحمٰن کو داخل ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لہٰذا قلعہ تک پہنچنے کی بھی کوئی سبیل نہ تھی۔ کچھ دنوں تک یونہی سی جھڑپ ہوتی رہی۔ اسی دوران میں حسن اتفاق سے یہیں کا ایک واقف کار آدمی مل گیا۔ اس نے مسلمانوں کو پشت سے لے جا کر انھیں قلعہ تک پہنچا دیا۔ قتیبہ نے ایک پہاڑی دستہ اس کے ساتھ کر دیا۔ جونہی یہ دستہ قلعہ تک پہنچا اس نے دفعۃً اہل قلعہ پر حملہ کر دیا۔ قلعہ کے فوجی بالکل مطمئن تھے۔ انھیں اس بات کا قطعاً کوئی گمان نہ تھا کہ کوئی یہاں تک پہنچ سکے۔ مسلمان دستہ کے اچانک حملہ سے یہ لوگ بوکھلا گئے اور حملہ کی تاب نہ لا کر بہت سے مارے گئے اور جو زندہ بچے وہ بھاگ گئے۔ نیزک نے وادی فرغانہ کو عبور کر کے زکی گھاٹی میں پناہ لی۔ اب قتیبہ بھی اپنی فوج کے ساتھ گھاٹی میں داخل ہو گیا اور سمنجان پہنچا۔ یہاں کچھ روز ٹھہر کر آگے بڑھا۔ نیزک نے وادی فرغانہ کو عبور کر کے کرز کی وادی میں پناہ لی۔ قتیبہ بھی تعاقب میں تھا، لیکن یہ گھاٹی بھی حلم کی گھاٹی کی طرح بہت محفوظ اور دشوار گزار تھی۔ فوج کے لیے اس تنگ اور دشوار گزار گھاٹی کو عبور کرنا بہت مشکل تھا۔ اس لیے قتیبہ نے بجائے گھاٹی کے اندر جانے کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ دو ماہ تک جاری رہا، اس عرصہ میں نیزک اور اس کے ساتھیوں کا تمام سامان

Marfat.com

رسد ختم ہو گیا۔ سردی کا زمانہ قریب آ رہا تھا اور یہاں کی سردی مسلمان برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لیے قتیبہ نے ایک شخص سلیم کو نیزک کے پاس بھیجا کہ وہ کسی طرح اس کو سمجھا بجھا کر بغیر امان دیئے ہوئے لے آئے۔ نیزک کو سلیم پر بہت اعتماد تھا۔ چنانچہ وہ اسے نشیب و فراز سمجھا کر اور جان بخشی کی امید دلا کر قتیبہ کے پاس لے آیا۔ قتیبہ نے نیزک اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور اس کے قتل کے بارے میں مشورہ کیا بعضوں نے اس کے قتل کی مخالفت کی۔ حجاج سے بھی اس کے بارے میں مشورہ طلب کیا، نیزک کا جرم بہت سنگین تھا۔ اس نے نہ صرف تنہا مخالفت اور بغاوت کی تھی بلکہ اپنے ساتھ بہت سے فرمان رواؤں کو بھی بغاوت پر نہ صرف آمادہ کیا بلکہ باغی بنا دیا تھا جس سے مسلمانوں اور اسلامی حکومت کو سخت نقصان پہنچا تھا، اس لیے حجاج نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ چنانچہ قتیبہ نے نیزک اور اس کے سات سو ساتھیوں کو قتل کرا دیا۔ البتہ جغبویہ جو طخارستان کا اصل حکمران اور نیزک کا آقا تھا اور اب نیزک کے ہاتھوں قید تھا اس کا قصور معاف کر کے اس کو رہا کر دیا گیا۔

نیزک کے قتل کے بعد قتیبہ دوسرے باغی فرمان رواؤں کی طرف متوجہ ہوا اور فوجی پیش قدمی سے قبل ان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ فرمان روائے شومان کے پاس جس نے اپنے یہاں سے مسلمان حاکم کو نکال دیا تھا، کو یہ پیغام بھجوایا کہ اب بھی وہ بغاوت سے باز آ جائے تو اس کا قصور معاف کر دیا جائے گا، لیکن اس کو اپنی قوت و طاقت پر اتنا بھروسہ اور غرور تھا کہ اس نے اسے پیغام کا جواب اس طرح دیا کہ ایک قاصد کو تو قتل کر دیا اور دوسرا بمشکل جان بچا کر بھاگ آیا۔ لہٰذا اب قتیبہ کے پاس سوائے فوج کشی کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ قریب پہنچ کر قتیبہ کے بھائی صالح نے اس کو دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اب بھی باز نہ آیا اور قلعہ بند ہو گیا۔ قتیبہ نے سنگ باری کر کے قلعہ کی دیواریں توڑ دیں۔ جب اس نے جنگ یا اطاعت کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ دیکھا تو قلعہ سے نکل کر مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ شومان کے بعد قتیبہ نے کش اور نسف فتح کیے اور اپنے بھائی صالح کو بھیج کر صغد کے فرمان روا طرخون سے خراج وصول کیا۔ (ابن اثیر: ۵۳۷/۴)

سنہ ۹۳ھ میں خوارزم شاہ (خوارزم کے ہر فرمان روا کا لقب خوارزم شاہ ہوتا تھا) نے قتیبہ سے صلح کر لی۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ خوارزم شاہ ایک کمزور حکمران تھا اور اس کا بھائی امور سلطنت پر حاوی ہو گیا تھا اور خوارزم شاہ کو عضو معطل بنا دیا گیا تھا۔ خوارزم شاہ اپنے بھائی کی زیادتیوں سے تنگ آ گیا تو اس نے قتیبہ بن مسلم کو لکھا کہ اگر مجھے میرے بھائی کے پنجۂ ظلم سے نجات دلا دیں تو میں آپ کی اطاعت قبول کر لوں گا۔ قتیبہ نے اس کی درخواست قبول کر لی اور وہ مرو سے روانہ ہو کر ہزار سلب میں مقیم ہوا۔ خوارزم شاہ نے ایک وفد قتیبہ کے پاس بھیجا اور اس سے صلح کی شرائط مکمل کر لیں۔ قتیبہ نے اس کے بھائی خرزاد اور اس کے دوسرے مخالفین کو قید کر کے اس کے پاس بھیج دیا۔ خوارزم شاہ نے سب کو قتل کرا دیا اور اس کا تمام مال و اسباب بطور نذرانہ قتیبہ کے پاس بھیج دیا، اور شرائط کے مطابق بہت سا نقد روپیہ اور جنس قتیبہ کی خدمت میں پیش کی۔

Marfat.com

بلاذری (فتوح البلادن: ص ۴۲۷) کا بیان ہے کہ قتیبہ کی سلطنت واپس دلانے کے بعد خوارزم شاہ کی کمزوری کی وجہ سے اس کی رعایا نے اسے قتل کر دیا اور اس کے قتل کے بعد قتیبہ نے اپنے بھائی عبیداللہ کو خوارزم کا حاکم مقرر کر دیا۔

سمرقند کی فتح:

صغد یعنی اہل سمرقند اور مسلمانوں میں بہت قدیم سے مصالحانہ تعلقات چلے آ رہے تھے لیکن ترکستان کی جنگوں میں انھوں نے عہد شکنی کر کے مسلمانوں کے خلاف ترکستان کے حکمرانوں اور فرمان رواؤں کی مدد کی تھی۔ اس لیے خوارزم کی مہم سے فراغت کے بعد قتیبہ نے سمرقند پر فوج کشی کا ارادہ کیا اور مسلمانوں سے کہا کہ صغد نے جس طرح عہد و پیمان کو توڑا ہے، وہ تم سب حضرات کو معلوم ہے۔ مجھے امید ہے کہ خوارزم اور صغد کا حشر بنو قریظہ اور بنو نضیر ❶ کی طرح ہوگا، اور اپنے بھائی کو ایک فوجی دستے کے ساتھ سمرقند روانہ کیا اور پھر تین چار روز کے بعد اہل خوارزم اور اہل بخارا کو اپنے ساتھ لے کر خود بھی اپنے بھائی سے جا ملا۔

صغد (اہل سمرقند) نے مقابلہ کی اپنے میں طاقت نہ دیکھی تو شہر بند ہو گئے۔ قتیبہ نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہل سمرقند ایک ماہ تک مدافعت کرتے رہے۔ جب محاصرہ کی مدت زیادہ طویل ہو گئی تو انھوں نے پڑوسی حکمرانوں شاش، خاقان چین اور حاکم فرغانہ وغیرہ کو خطوط لکھ کر مدد کرنے کے لیے کہا۔ انھیں لکھا کہ آج ہماری اور کل تمھاری باری ہے۔ یہ وقت ہے کہ تم جو ہماری مدد کر سکتے ہو وہ کرو، ورنہ عرب تمھارے قبضہ میں ایک انچ زمین بھی نہ چھوڑیں گے، لہٰذا ہماری نہیں بلکہ اپنی حفاظت کے لیے آج ہماری مدد کرو۔"

پیغام سخت تھا لہٰذا صغد کے پیغام پر ان بادشاہوں نے غور کیا۔ آپس میں مشورہ بھی کیا۔ اس میں فیصلہ یہ ہوا کہ عربوں کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کے مقابلوں میں معمولی لوگ جا رہے ہیں۔ جب تک کہ معزز شہزادے اور بہادر شرفائے قوم میدان میں نہیں آئیں گے حریف (مسلمانوں) کا زور نہیں ٹوٹے گا۔ قتیبہ کی پے در پے فتوحات کو تمام حکمران خوف و خطر کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اس لیے تمام سرحدی حکمران اہل سمرقند کی امداد کے لیے تیار ہو گئے اور وہ اپنے لڑکوں اور اپنے ہاں کے عمائد و اشراف اور نامور بہادروں اور جرأت و ہمت کے ستونوں کو خاقان چین کے لڑکے کی قیادت میں اہل سمرقند کی امداد کے لیے ایک لشکر جرار روانہ کیا۔

قتیبہ کو جب اس فوج کے آنے کی اطلاع ہوئی تو اس نے چھ سو بہادروں کا ایک دستہ اپنے بھائی صالح بن مسلم کی زیر قیادت ان کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا۔ صالح نے اپنی فوج کے حصے کیے۔ دو حصے دائیں بائیں گھاٹیوں میں چھپا دیے اور ایک حصہ کو لے کر امدادی فوج کے رستہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ آدھی رات گزرنے کے بعد دشمن کی فوج آئی اور مسلمانوں کو دیکھتے ہی حملہ کر دیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ دشمن کی فوج دیکھتے ہی

❶ یہ دونوں یہودی قبیلے تھے جنہوں نے عہد نبوت میں عہد شکنی کی تھی اور اس کے نتیجے میں وہ جلاوطن کیے گئے تھے۔

Marfat.com

مسلمانوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے سختی کے ساتھ اس کو روکا۔ تھوڑی دیر بعد بقیہ مسلمان بھی دائیں بائیں کی گھاٹیوں سے نکل کر عقاب کی طرح دشمن پر جھپٹ پڑے۔ دشمن نے اگرچہ بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن شکست اس کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی اور فتح مندی نے مسلمانوں کے قدم چوم لیے بڑی تعداد شہزادوں اور رئیس زادوں اور زورآور بہادروں کی میدان جنگ میں ماری گئی۔ باقی فرار کرتے ہوئے گرفتار ہو گئے۔

اس امدادی فوج کو اہل سمرقند کو امداد بہم پہنچانے سے پیشتر ہی جو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا اور اس میں ان کے شہزادے اور بڑے بڑے جرنیل کام آئے، اس شکست نے ان کی کمر ہمت توڑ دی۔ اب ان کے لیے باہر کی امداد کی امید نہ رہی۔ قتیبہ نے محاصرہ اور زیادہ سخت کر دیا اور پتھر برسا کر فصیل شہر یک قلم مسمار کر دی۔ تاہم اہل سمرقند نے اپنی مدافعت میں اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ قتیبہ نے مسلمان فوج کو للکارا کہ شہر پناہ کے روزن تک پہنچنے کی دیر ہے۔ اس للکار پر مسلمان فوج آگے بڑھی جب کہ اہل سمرقند اوپر سے تیروں کا مینہ برسا رہے تھے، لیکن مسلمانوں نے ان کے ان تیروں کی بارش کی کوئی پروا نہ کی اور چہروں کو اپنے ڈھالوں سے بچاتے ہوئے روزن تک پہنچ کر جم گئے۔ مسلمانوں کی یہ پامردی استقلال اور جرأت و شجاعت دیکھ کر اہل سمرقند کے لیے صلح کے سوا اور کوئی صورت باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے مسلمان فوج کو کہلا بھیجا کہ آج تم یہاں سے ہٹ جاؤ کل ہم صلح کر لیں گے۔ قتیبہ نے جواب دیا کہ صلح اسی وقت ہو سکتی ہے کہ ہمارے آدمی روزن پر موجود رہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ قتیبہ نے ان کی درخواست پر آدمی ہٹا لیے تھے۔ بہر حال اب اہل سمرقند کے لیے سپر ڈال دینے کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں رہ گیا تھا، اس لیے دوسرے روز انھوں نے حسب ذیل شرائط پر مسلمانوں سے صلح کر لی:

① اہل سمرقند ۱۲؍لاکھ سالانہ خراج دیا کریں گے۔
② اس سال تیس ہزار سوار دیں گے۔
③ تین دن تک مسلمانوں کی دعوت کریں گے۔
④ مسلمان شہر میں فاتحانہ داخل ہوں گے۔ ان کے داخلہ کے وقت مسلح آبادی شہر خالی کر دے گی۔
⑤ مسلمان یہاں مسجد بنا کر نماز ادا کریں گے۔

ان شرائط کے مطابق صغد نے شہر خالی کر دیا۔ مسلمانوں نے شہر میں مسجد تعمیر کر کے نماز پڑھی اور خطبہ پڑھا اور اعلان عام کر دیا کہ صلح کی رقم کے علاوہ ہم اور کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ جس جس کا مال ہو وہ اپنا مال آ کر لے لے۔ (ابن اثیر: ۴؍۲۱۷)

سمرقند کے باشندے بت پرست تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان کے بعض دیوتا ایسے ہیں جن کو جو شخص بھی ہاتھ لگائے گا وہ اسے ہلاک کر دیں گے۔ ان کے اس وہم کو دور کرنے کے لیے قتیبہ نے ان بتوں کو آگ میں جلا دیا جس سے نہ تو قتیبہ کو کوئی گزند پہنچا اور نہ ہی کسی مسلمان فوجی کو کوئی تکلیف ہوئی۔ اس چیز کو دیکھ کر بہت

Marfat.com

سے صغد (اہل سمرقند) بتوں کی پرستش سے توبہ کر کے مسلمان ہو گئے۔ علاوہ ازیں قتیبہ نے بہت سے مسلمانوں کو سمرقند میں بسا دیا۔ (فتوح البلدان: ص ۴۲۷)

ایک روایت میں ہے کہ قتیبہ نے اہل سمرقند کے اس توہم کو دور کرنے کے لیے کہ یہ بت نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں، خود اپنے ہاتھ سے ان بتوں کو نذر آتش کیا۔ اس سے ایک تو اہل سمرقند کا یہ وہم دور ہو گیا۔ دوسرے ان میں سے پچاس ہزار مثقال سونا نکلا۔ اپنے معبودوں کی اس بے چارگی اور بے دست و پائی کو دیکھ کر سمرقند کے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد اسی وقت دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی۔

اس کامیابی کے بعد قتیبہ نے عبداللہ بن مسلم کو سمرقند کا حاکم مقرر کیا اور کچھ فوج اس کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر مرو لوٹ آیا۔

شاش اور فرغانہ کے فرماں رواؤں نے اہل سمرقند کی مدد کی تھی، اس لیے سمرقند سے فراغت کے بعد قتیبہ نے ان دونوں کی طرف توجہ کی اور سنہ ۹۴ھ میں اہل خوارزم، کش اور نسف کی فوج بھیج کر شاش کو فتح کرایا اور خود فرغانہ کی طرف بڑھا۔ راستہ میں خجندیوں نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ ان کو شکست دینے کے بعد آگے بڑھ کر فرغانہ کے دارالسلطنت کاشان کو فتح کر کے ترکستان، چین کی سرحد اسبیجاب کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اس سے آگے چونکہ چین کی سرحد شروع ہو جاتی تھی لہٰذا اس سال یہیں تک پہنچ کر لوٹ آئے۔

چین پر فوج کشی:

خاقان چین آئے روز مسلمانوں کے خلاف مختلف قسم کی سازشیں اور شرارتیں کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ خاقان چین نے اہل سمرقند کی بھی مدد کی تھی۔ خاقان چین مسلمانوں کی فتوحات کا شہرہ سن چکا تھا، اس لیے ان کے حالات معلوم کرنے اور ان سے گفتگو کرنے کے لیے اس نے مسلمانوں کے ایک وفد کو اپنے ہاں طلب کیا۔ قتیبہ نے ہبیرہ بن مشرح کو دس دانشور اور سنجیدہ حضرات کے ساتھ خاقان چین کے پاس بھیجا اور انھیں ہدایت کر دی کہ وہ خاقان چین کو اس بات کا یقین دلا دیں کہ میں نے قسم کھالی ہے کہ جب تک تمھاری سرزمین کو اپنے پاؤں سے پامال کر کے تجھ سے خراج وصول نہ کرلوں گا اس وقت تک واپس نہیں جاؤں گا۔ یہ وفد خاقان کے دربار میں پہنچا اور اس سے کئی روز تک ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ آخری ملاقات خاقان نے ہبیرہ اور وفد کے دوسرے ارکان سے کہا:

> ''تم عقل مند آدمی معلوم ہوتے ہو، اس لیے جاؤ اور اپنے سپہ سالار سے جا کر یہ کہہ دو کہ واپس لوٹ جانے میں ہی تمھاری خیر اور بہتری ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تمھارا لشکر بہت تھوڑا اور کم تعداد میں ہے۔ اگر تم لوگ اپنے اس ارادہ سے باز نہ آئے تو میں تمھارے مقابلہ میں ایسی تباہ کن فوج بھیجوں گا جو تمھیں کچل کر رکھ دے گی۔''

Marfat.com

ہبیرہ نے خاقان چین کی یہ بات سن کر کہا:

''اے خاقان! اس لشکر کو کون تھوڑا کہہ سکتا ہے جس کا ایک سرا کوہستان چین میں ہو اور دوسرا مرغزار شام میں۔ رہی موت اور قتل کی دھمکی تو ہم لوگ موت اور قتل سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ وہ آگے پیچھے نہیں آسکتی، اس لیے نہ ہم قتل ہونے کو برا سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ ہمارے سردار نے قسم کھالی ہے کہ جب تک وہ اپنے پیروں سے تمھاری سرزمین کو پامال کر کے تم لوگوں سے جزیہ وصول نہ کرے گا اس وقت تک واپس نہ جائے گا۔''

ہبیرہ کے اس درشت جواب کو سن کر خاقان چین دہشت زدہ ہو گیا۔ اسے مسلمانوں کی قوت کا پہلے سے اندازہ ہو چکا تھا۔ ترکستان اور دوسرے ممالک کا حشر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا، اس لیے وہ خواہ مخواہ مسلمانوں کی طاقت سے ٹکرانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ صرف آزما رہا تھا۔ ہبیرہ کے دلیرانہ جواب نے اس پر مسلمانوں کی اور ہیبت طاری کر دی لہٰذا اس نے جزیہ دے کر صلح کر لی اور بہت قیمتی ہدایا اور تحائف اس وفد کے ہاتھ قتیبہ بن مسلم کو بھیجے۔ قتیبہ کا مقصد بھی چین کو فتح کرنا نہیں تھا بلکہ اس کی شورش پسندیوں اور آئے دن کی سازشوں کا انسداد کرنا تھا، اس لیے اس نے خاقان چین کی جزیہ کی پیش کش قبول کر کے اس سے مصالحت کر لی اور فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ جب ہبیرہ نے کہا کہ ہمارا جرنیل تمھاری سرزمین کی مٹی کو روندنے اور تم سے جزیہ وصول کرنے کی قسم کھا چکا ہے، تو خاقان نے کہا کہ ہم جرنیل کی قسم پوری کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ اس نے سونے کے چند طشتوں میں مٹی، کچھ نقدی اور سامان اور چار شہزادے قتیبہ کے پاس روانہ کیے۔ قتیبہ نے خاقان کی صلح کی پیش کش کو قبول کر لیا۔ مٹی کو اپنے قدموں سے روند ڈالا، شہزادوں کو مہریں لگا کر واپس کر دیا اور نقدی اور سامان جزیہ کے طور پر قبول کر لیا۔

اس بڑی کامیابی کے بعد قتیبہ مرو واپس لوٹ آیا۔ اس جنگ کے آغاز ہی میں قتیبہ کو ولید بن عبدالملک کے انتقال کی افسوس ناک خبر موصول ہو چکی تھی۔

فتوحات اندلس اور طارق بن زیاد:

اندلس اسپین کا قدیم نام ہے۔ اندلس نام کیوں رکھا گیا اس کو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بعض مؤرخین نے یہ کہا ہے کہ رومیوں نے اس کو ہسپانیہ کے نام سے پکارا، اس لیے کہ یہ رومی سلطنت سے مغربی جانب کا ملک تھا، اور عرب مؤرخین کی توجیہ کے مطابق یہ ''اشبانیا'' کہا گیا جو رومی حکمران اشبان بن طیطش کی طرف منسوب ہے، اور یہ نام شروع سے اشبیلیہ کا تھا جو ''اشباق'' اور ''ایلیا'' (بیت المقدس) سے مرکب ہے۔

اندلس کی قدیم تاریخ کیا تھی؟ اور مسلمانوں کی حکومت سے پہلے وہاں کے حکمرانوں کے خاندان اور

Marfat.com

لوگوں کی حالت کیا تھی اور کن وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کو اندلس پر حملہ کرنا پڑا؟ اندلس میں سب سے پہلے آباد ہونے والی قوم کا نام عرب مؤرخین کے مطابق ''اندلس'' تھا اور مغربی مؤرخین کے بیان کے مطابق ''سلٹ'' تھا۔ پھر سنہ ۲۴۷ قبل مسیح قرطاجنی جنوبی اسپین میں آئے۔ اسی زمانہ میں یونانیوں نے مشرقی ساحل پر بستیاں آباد کیں۔ مختلف قومیں آباد ہونے کے باعث وہاں الگ الگ حکومتیں قائم ہو کر لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا کیونکہ ہر قوم کی یہ خواہش تھی کہ اندلس کے زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضہ کر کے دوسری قوموں پر حکمرانی کرے کیونکہ اقتدار کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے خصوصی طور پر ایک خدانا آشنا معاشرہ میں، کیونکہ اس میں حکمران پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں ہوتی۔ ان جنگوں میں قرطاجنیوں نے شکست کھائی اور ان کا دارالسلطنت اور صدر مقام اشبیلیہ تھا۔ اس کے بعد رومیوں کو اقتدار نصیب ہوا اور وہ کئی سو سال تک اندلس پر اپنے اقتدار کا پھریرا لہراتے رہے۔ رومی حکومت وقت کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتی گئی یہاں تک کہ ملک میں خودمختار حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ چھٹی صدی عیسوی سے اندلس میں کیتھولک مذہب کا دور شروع ہوا جس کی وجہ سے پادریوں کے اقتدار میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ وہ اندلس کے سیاہ وسفید کے مالک ہو گئے۔ خود شاہ اندلس اب اپنے آپ کو ان کا دست نگر سمجھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ارباب اقتدار اور پادریوں میں کش مکش شروع ہو گئی، لیکن ان کی باہمی کشمکش میں پادریوں کی برتری میں کوئی فرق نہ پڑا اور وہ زیردست ہونے کے بجائے زبردست ہی رہے۔

اندلس میں عیسائیوں کے علاوہ یہود بھی آباد تھے ان کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ یہود نے جب سے انبیاء علیہم السلام کی نافرمانی کی اور ہر زمانہ میں ان کے خلاف سازشوں کے جال تنے یہاں تک کہ ان کو قتل بھی کیا، اس وقت سے وہ ذلت ومسکنت کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ اگرچہ وہ آج کی طرح ہر زمانہ میں ملکی معیشت پر قابض رہے لیکن اقوام عالم کی نگاہ میں ان کی کوئی عزت وحرمت نہ تھی اور ہر ملک کے عوام ان کو اپنی ہر مصیبت کا منبع سمجھتے تھے۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یہود دنیا میں سب سے زیادہ احسان فراموش قوم ہے۔ اندلس میں بھی یہود نہایت ذلت وخواری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ شہری حقوق سے محروم تھے لیکن ان سے توطن کا حق بھی چھین لیا گیا تھا۔ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ان کو اصل دین سے دور کر دیا تھا۔ ان کے عقائد میں غیر عناصر کی آمیزش ہو گئی تھی۔ ان کی عملی زندگی نہایت گندی اور انحطاط پذیر تھی۔ انھوں نے انحطاط کو انسانی کلام میں خلط ملط کر دیا تھا اور خدا کا جو کلام کچھ محفوظ تھا، اس کو بھی انھوں نے اپنی من مانی تاویلوں سے گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیا تھا۔ صرف ظاہری مذہبیت کا ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا۔ جس کو وہ سینے سے لگائے رکھتے تھے۔ ان کے علماء اور راہب اور ان کے سردارانِ قوم اور ان کے عوام سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت یک قلم بگڑ چکی تھی اور وہ اب کسی اصلاح کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے تھے اور ان کے ہاں بدعتوں، تحریفوں، تاویلوں، موشگافیوں، فرقہ بندیوں اور خدا فراموشی اور دنیا پرستی ان کی زندگی کے ایک ایک عمل سے ظاہر ہوتی تھی۔ اندلس میں اس زمانہ میں پادریوں کا دور دورہ تھا اور وہ

Marfat.com

دنیا اور دولت کی طمع میں غلطان اور حریص تھے، لہٰذا ان پادریوں کو بڑی رشوتیں دے کر انھوں نے اپنا ہم نوا بنا لیا تھا جس طرح وہ اپنی دولت کے خزانوں کے منہ امریکہ کے صدر کے الیکشن کے لیے کھول کر اس کو اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں، یہاں تک کہ حکومت کے مالیات کا عہدہ انہی کے ہاتھ میں آ گیا۔ مختلف علاقوں میں وہ سفارتی خدمات انجام دینے لگے اور مختلف علمی، ادبی اور دوسری تمدنی اور تہذیبی ترقیوں میں پیش پیش رہنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے اندلسی امراء اور جاگیردار جو اکثر و بیشتر ان پڑھ اور جاہل تھے، یہودیوں کے علمی تفوق اور برتری کے باعث انھیں اپنی جائداد کا منتظم اور منصرم بنانے لگے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں دولت و ثروت کی فراوانی سے پادریوں کے دلوں میں حرص و طمع بہت زیادہ پیدا ہو گئی تھی کیونکہ دولت کا خاصہ یہ تھا کہ وہ جتنی بھی زیادہ ہو کم نظر آتی ہے۔ پھر اس کی مثال سمندر کے نمکین پانی کی ہے۔ سمندر کا پانی جتنا پئیں، پیاس بجھتی نہیں بلکہ زیادہ لگتی ہے۔ ایسے ہی مال و دولت جتنا بھی ہو کم معلوم ہوتا ہے اور اس کی حرص اور خواہش روز بروز زیادہ ہو جاتی ہے۔ گویا کہ

ہفت اقلیم ار بگیرد بادشاہ
ہم چناں در بند اقلیمے دگر

چنانچہ ان پادریوں میں بھی جاہ طلبی، عیش پرستی اور عیاشی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسقف اعظم کا محل شبانہ روز فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ پادریوں کی عیاشیوں، مترفانہ اور مسرفانہ زندگیوں کے ساتھ سلاطین اور اس زمانہ کے بیوروکریٹس بھی بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے تھے اور جاہ و منصب اور دولت و ثروت کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور سبقت لے جانے میں سرگرم رہنے لگے۔ اس مسرفانہ اور مترفانہ زندگی گزارنے کے لیے اور ذاتی اغراض کی تسکین و اطمینان کے لیے عوام کو نہایت بری طرح ستانے اور تنگ کرنے لگے، خصوصاً غلاموں کے ساتھ تو جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ عوام الناس پر جب ظلم و تشدد زیادہ ہونے لگا تو ان میں حرکت ہوئی۔ وہ کوئی پتھر کے بت نہیں تھے بلکہ گوشت پوست کے چلتے پھرتے انسان تھے۔ ان کی انسانی غیرت و حمیت نے کروٹ لی اور انھوں نے امراء نے یک در و دیوار ہلانے کا عزم کر لیا۔ چنانچہ ملک میں بغاوتوں کا دور شروع ہو گیا۔ بالآخر ویمبا (Wamba) فرمان روائے اندلس جو کچھ ہوش و خرد رکھتا تھا، اس نے سمجھا اور بالکل درست سمجھا کہ اب اندلس کے غریب اور پس ماندہ طبقہ پادریوں کے اس ظلم و ستم کی وجہ سے زیادہ دیر تک بے حس و حرکت نہیں رہ سکتا کیونکہ اب وہ طبقہ بیدار ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے ابتدائی حملے بھی اندلس پر ہو چکے تھے، لہٰذا اس نے ایک فوجی حکم کے ذریعے پادریوں کے اختیارات میں تحدید اور تجدید کر دی لیکن پادریوں کو جو عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے تھے اور بے پناہ اختیارات کے مالک تھے، وہ بھلا کب برداشت کر سکتے تھے کہ فرمان روائے وقت ان کے اختیارات پر کسی قسم کی کوئی قدغن لگائے، لہٰذا پادریوں نے اس کے خلاف جنگ کی آگ سلگا کر اس کو جلد ہی تخت نشین

Marfat.com

سے خاک نشین اور فرماں روا سے زیر فرمان کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پادریوں کے جن بے حد اختیارات پر اس نے جو قدغن لگائی تھی اور ان کو محدود کیا تھا، وہ اس کے معزول ہونے کے بعد پھر غیر محدود ہو گئے اور انھوں نے پھر وہی بے لگام اقتدار حاصل کر لیا اور عوام ان کے ظلم و ستم سے پھر کراہنے لگے اور وہ اپنے دل سے پادریوں کو شدید نفرت کرنے لگے۔

بعض مؤرخین نے یہ لکھا ہے کہ اندلس میں عیسائیوں کا کیتھولک فرقہ اریوسی عقائد کا غلبہ حاصل کرنے کے بعد ملک پر پوری مضبوطی اور طاقت سے مسلط ہو چکا تھا۔ پادریوں نے اپنی سیادت کو دوام بخشنے کے لیے کئی قوانین بنائے۔ ان میں سے ایک قانون یہ بھی تھا کہ جو شخص مقدس کیتھولک کلیسا اور مذہبی پیشواؤں کے ارشادات، کلیسا کے فتاویٰ اور دینی رسومات کو شک کی نگاہ سے دیکھے یا ان پر اعتراض کرے گا، اس کی تمام جائداد مکمل طور پر ضبط کر لی جائے گی اور اسے عمر قید کی سزا بھی دی جائے گی۔

یہ پادریوں کا عروج تھا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ اندلس میں پادریوں کا زوال شروع ہوا۔ اس زوال میں اندلس کے فرمان روا کو کامیابی ہوئی اور اندلس کا اسقف اعظم (لاٹ پادری) اپنے عہدہ سے معزول کر دیا گیا۔ پادریوں کے اس زوال کو دیکھ کر یہودیوں نے ایک سازش کے ذریعہ سلطنت پر قبضہ کرنا چاہا لیکن ان کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمین اندلس سے انھیں جلاوطن ہونا پڑا اور اس کی دولت و ثروت اور تمام جائدادیں پھر ایک بار بحق سرکار ضبط ہو گئیں، لیکن کچھ عرصہ بعد عیسائیوں کے اشتعال میں کچھ کمی واقع ہوئی تو ضبطی کے یہ احکام واپس لے لیے گئے اور یہودیوں کو اندلس میں دوبارہ آباد ہونے اور ان کو مال و دولت اور جائدادوں پر قبضہ رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے بعد حکومت کی زمام کار ایک ہوش مند وٹیزا (غیطشہ) کے ہاتھوں میں آئی۔ وہ بڑا سمجھ دار، ذی ہوش اور رعایا پرور آدمی تھا۔ اس نے اپنی خدمات سے بڑی ہر دل عزیزی حاصل کر لی۔ یہودیوں کے ساتھ جو کئی سالوں سے عیسائیوں کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اس نے بڑی نرمی کا سلوک کیا، لیکن ابھی اسے بادشاہ بنے چند ہی سال ہوئے تھے کہ وہ عیش و عشرت کا دلدادہ ہو گیا کیونکہ اقتدار کا نشہ آدمی کے دماغ کو بہت جلد خراب کر دیتا ہے۔ اس کی اس عیش پرستانہ زندگی نے کلیسا کے پادریوں کو ایک بار پھر یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ اس کی حکومتی پالیسیوں میں دخل اندازی کریں۔ وٹیزا اقتدار کے نشہ میں بدمست تھا، پھر عیش و عشرت نے اقتدار کے نشہ کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ لیکن اس نے حکومتی معاملات میں پادریوں کی اس دخل اندازی کی کوئی پروا نہ کی۔ چنانچہ پادری غالب آ گئے اور بالآخر اس کو تخت شاہی سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کا دست بردار ہونا تھا کہ ایک غیر ملکی راڈرک (رزدیق) اس کا جانشین مقرر ہوا اور اندلس کے تخت شاہی پر براجمان ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تخت نشین ہوتے ہی گاتھ خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ ۸۲ سال کی عمر میں اندلس کے تخت شاہی پر بیٹھا۔ لوگ اس کے بادشاہ بننے پر بڑے خوش تھے، لیکن تخت شاہی پر بیٹھنے کے ساتھ ہی وہ بھی اقتدار کے نشہ میں مخمور ہو کر اپنے فرائض منصبی

Marfat.com

سے یک قلم غافل ہو گیا جس سے لوگوں میں مایوسی اور برہمی پھیل گئی۔

دوسری طرف جن لوگوں سے حکومت چھینی گئی تھی اب اس گاتھ خاندان کے شہزادوں کے دلوں میں اپنی حکومت کے زوال کا احساس پیدا ہوا۔ وہ کہاں برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے خاندان کے برسوں کی حکومت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے۔ چنانچہ جب ان شہزادوں نے فوج اور عوام سے رابطہ کیا تو انھوں نے ان کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ وہ اب راڈرک (رزدیق) کو تخت شاہی سے ہٹا کر قدیم شاہی خاندان کے افراد کو برسر اقتدار لانے کے خواہش مند تھے۔

جزیرہ نما اندلس میں مسلمانوں کے قدم رکھنے کے وقت کوہ پائیرنیس کے اس پار علاقہ جنوبی فرانس میں جرمن قبیلہ فرینک (Frank) کا قبضہ واقتدار تھا۔ یہی لوگ شمالی فرانس کے حکمران تھے۔ بہرحال طارق بن زیاد کے حملہ کے وقت رزدیق (راڈرک) ہی اندلس کا حکمران تھا۔

اندلس اور مسلمان:

اسلام کا آفتاب عالمتاب فاران کی پہاڑیوں سے طلوع ہوا اور پھر وہ اس قدر تیزی اور سرعت کے ساتھ چمکا کہ تمام دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ اس زمانہ کی دو سپر پاورز سلطنت ایران اور سلطنت روما اس آفتاب کی روشنی کو برداشت نہ کر سکیں اور ان کے جاہ وجلال کے ستارے جھلملانے لگے۔ اسلام کے آفتاب عالمتاب کی کرنوں کی روشنی پھیلی اور پھیلتی چلی گئی یہاں تک کہ وادی نیل کی فضا بھی رومی گرد وغبار سے پاک و صاف ہو گئی۔ ایرانی سلطنت کا تو چند ہی سالوں میں خاتمہ ہو گیا البتہ بازنطینی سلطنت نے کچھ سالوں تک قدم جمائے رکھے لیکن پھر اس کو بھی دم توڑنا پڑا۔ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے خلافت فاروقی میں مصر سے رومی سلطنت کے اقتدار کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا لیکن رومی حکومت نے مصر سے نکل کر افریقہ میں اپنے قدم جما لیے، مگر والی مصر سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے عقبہ بن نافع فہری کو افریقہ کی سمت بھیجا۔ وہ افریقہ کی چوکیوں رزیلہ اور برقہ کو اسلامی حدود میں لے آئے اور آگے بڑھ کر طرابلس پر حملہ کیا۔ جب سیدنا عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ عہد عثمانی میں مصر کے گورنر بنائے گئے تو انھوں نے رومی حاکم افریقہ بطریق جرجیر سے مقابلہ کیا۔ وہ ایک لاکھ بیس ہزار فوج لے کر میدان میں آیا تھا۔ چالیس روز تک زور کا رن پڑا لیکن جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ یرموک اور قادسیہ کے بعد یہ سب سے زبردست جنگ تھی جو مسلمانوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں لڑی۔ صبح سے ظہر تک ہر روز لڑائی ہوتی لیکن ظہر تک کوئی فیصلہ نہ ہوتا۔ کفر اسلام کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہ تھا اور اسلام بھی باطل کے سامنے دبنے والا نہ تھا۔ جب لڑائی نے طول کھینچا تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ

Marfat.com

کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ یہ حضرات محاذ جنگ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس اثناء میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک تیسرا لشکر سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت بطور کمک روانہ فرمایا اور انھیں تاکید کی کہ نہایت سرعت اور عجلت کے ساتھ محاذ جنگ پر پہنچیں۔ چنانچہ یہ لشکر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے گیا۔ اسلامی فوج متواتر جنگوں سے کچھ تھک چکی تھی، لہٰذا جب انھیں اس تازہ دم فوج کی آمد کی اطلاع ملی تو لشکر اسلام کے سپاہیوں نے نعرہ ہائے تکبیر بلند کیے۔ ان کی تھکاوٹ دور ہوگئی۔

اگلے روز جب جنگ شروع ہوئی تو سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی تازہ دم فوج کے ساتھ میدان جنگ میں گئے۔ آپ نے اس لشکر میں منادی کرادی کہ جو کوئی جرجیر کا سر کاٹ کر لائے اسے مال غنیمت میں سے ایک لاکھ دینار اور جرجیر کی لڑکی حوالے کر دی جائے گی۔ اور خود فوراً عقب لشکر سے قلب لشکر میں پہنچ کر بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھانے شروع کر دیے۔ جرجیر نے جب اس منادی کی بابت سنی تو سخت گھبرایا۔

(ابن اثیر: ۴۵/۳)

دوسرے روز جب لڑائی شروع ہوئی تو ایک طرف رومی اور بربر اسلامی لشکر کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے اور دوسری طرف سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی نگاہیں جرجیر کو ڈھونڈنے لگیں۔ وہ اپنی فوج کے عقب میں اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور لڑکیاں اسے مورچھل سے سایہ کیے ہوئے تھیں۔ چنانچہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ چند جنگ جو سپاہیوں کے ساتھ اس کے سر پر جا پہنچے۔ اس نے بھاگنے کی پوری پوری کوشش کی لیکن سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کے قریب پہنچ کر اس کے سر پر اس زور سے نیزہ مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ پھر ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے نہایت مستعدی اور سرعت کے ساتھ اس کو اپنی تلوار پر لے لیا اور ایک ہی وار میں اس کا سر کاٹ کر اپنے نیزے پر چڑھا لیا۔ اس طرح افریقہ فتح ہو گیا۔

افریقہ کی جنگوں سے فراغت کے بعد اب اندلس کی طرف رخ کیا گیا۔ اندلس براعظم یورپ میں واقع ہے۔ گویا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے میں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے صرف ۱۷ سال بعد مسلمان یورپ کے براعظم تک پہنچ گئے۔ افریقہ کی فتح کے بعد امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں حکم دیا کہ وہ عبداللہ بن نافع بن حصین فہری اور عبداللہ بن نافع بن عبدالقیس کو فوری طور پر اندلس بھیجیں اور اسے جلد از جلد فتح کریں۔ وہ دونوں حضرات سمندر کے راستے اندلس پہنچے اور مجاہدین اسلام ان کے ساتھ اندلس گئے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں لکھا:

"امابعد! بے شک قسطنطنیہ اندلس کے راستہ سے فتح ہوگا۔ جب تم اندلس کو فتح کر لو گے تو تم لوگ ان مجاہدین کے ساتھ اجر و ثواب میں شریک ہو گئے جو قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔ والسلام۔"

(البدایہ والنہایہ: ۱۵۲/۷، ابن اثیر: ۴۷/۳)

یہ دونوں حضرات سمندر کے راستہ سے اندلس میں داخل ہوئے۔ اس فوج میں افریقہ کے نومسلم

Marfat.com

بربروں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد تھی۔ اس زمانہ میں اندلس میں عیسائی حکومت قائم تھی۔ مسلمانوں کا لشکر جب اندلس کے ساحل پر اترا تو عیسائی حکومت نے اسلامی لشکر کی سخت مزاحمت کی لیکن عیسائی فوجیں اسلامی لشکر کے مقابلہ میں ٹک نہ سکیں اور جلد ہی اندلس کا ایک ساحلی علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا اور انھیں سرزمین اندلس میں قدم جمانے کا ایک ٹھکانہ مل گیا۔ گویا اندلس اور براعظم یورپ پر لشکر اسلام کا یہ پہلا حملہ تھا جو خلافت عثمانی میں کیا گیا۔ اندلس کی زرخیز اور سرسبز زمین پر شتربان عربوں نے سمندر کی تلاطم خیز موجوں سے کھیلتے ہوئے پہلی مرتبہ عہد عثمانی میں قدم رکھا۔ پھر طارق بن زیاد رحمہ اللہ اور موسیٰ بن نصیر رحمہ اللہ جیسے جانباز مجاہدوں اور بہادر جرنیلوں نے یہاں فتح وظفر کے اسلامی پرچم لہرائے اور عربوں اور بربروں کے مختلف قبائل نے یہاں کی سرسبز و شاداب وادیوں میں مستقل سکونت اختیار کر کے اس کے ایک وسیع و عریض خطہ کو اسلامی مملکت کا جزو بنا لیا۔ پھر چشم آفتاب اور دنیا کی نگاہوں نے یہ نیرنگی بھی دیکھی کہ دولت بنی امیہ کا آفتاب اقبال مشرق میں غروب ہو کر مغرب میں طلوع ہوا اور اس کی تابانی اور درخشانی سے قریباً آٹھ سو سال مغرب کا یہ افق روشن رہا اور اس نے تمام مغربی ممالک کو روشن اور درخشاں کر دیا۔ جس طرح سسلی کے مسلمانوں نے اٹلی کی سرزمین کو اپنی آماجگاہ بنائے رکھا اسی طرح اندلس کے مسلمانوں نے دو صدیوں تک فرانس کی سرزمین میں سبز ہلالی پرچم کو بلند رکھا اور موجودہ اسپین، پرتگال اور فرانس کے کئی علاقے اسلامی حدود میں داخل رہے اور اندلس میں مسلمانوں کی علمی، تمدنی، تہذیبی، عمرانی اور روحانی ترقیوں کی جو شمع روشن ہوئی اس سے تمام مغربی ممالک نے روشنی پائی اور یورپ کے نئے علوم وفنون اور سائنسی تمدن کے مینارے انہی بنیادوں پر قائم کیے گئے ہیں۔

(تفصیل تاریخ اسلام جلد ۴ میں ملاحظہ فرمائیں۔)

سنہ ۲۷ھ میں مسلمان بربری مجاہدین کے ساتھ اندلس پر حملہ آور ہوئے اور اس کے بعض شہروں پر قابض ہو گئے اور افریقہ کے بربری قبائل سے انھیں ہر قسم کی مدد ملتی رہی، لیکن جب ابتداءً بربری قبائل مرتد ہو گئے تو پھر اندلس اور افریقہ کی تعلق داری منقطع ہو گئی اور جو مجاہدین اسلام اندلس میں موجود تھے وہ وہیں رہ گئے اور ان کے تعلقات کا سلسلہ اسلامی حکومت سے منقطع ہو گیا۔ (ابن اثیر: ۳/۷۲)

مسلمانوں کے اس حملہ کے بارے میں گبن (Gibbon) نے اپنے عیسائی ہونے کا مکمل ثبوت دیتے ہوئے لکھا ہے:

''عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے میں ان کے غارت گروں کی جماعت نے اندلیسیا کے ساحل کو تاراج کیا تھا۔'' (The Decline and Fall of The Roman Empire)

اس کے لکھنے کے اس انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب یہاں آئے اور تاخت و تاراج کر کے واپس چلے گئے۔

اندلس پر مسلمانوں کا دوسرا حملہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس وقت کیا گیا جب سیدنا معاویہ بن

Marfat.com

خدیج رضی اللہ عنہ افریقہ کے گورنر تھے، لیکن اس حملہ کی تفصیلات تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتیں۔ مگر جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ بربری قبائل دین اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو گئے تھے جن کی وجہ سے اندلس میں مقیم مسلمان وہاں پھنس گئے اور مزید فتوحات کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اس کا تدارک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ کیا کہ وہاں ایک چھاؤنی تعمیر کی جس میں مستقل طور پر اسلامی فوجوں کو مقیم رکھا۔ یہ چھاؤنی بعد میں قیروان نامی شہر کی صورت اختیار کر گئی۔ اس شہر کی وجہ تعمیر تاریخ کے اوراق میں یہ بیان کی جاتی ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے سیدنا عقبہ بن نافع رحمہ اللہ افریقہ کی گورنر تھے۔[1]

اس سے قبل سیدنا معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ نے افریقہ کے بیشتر علاقوں کو فتح کیا تھا اور یہاں کی بربر قوم کو مطیع ومنقاد بنایا تھا۔ اہل اسلام کی زبردستی کو دیکھ کر بربر قبائل زیردست ہو گئے اور وقتی طور پر انھوں نے اسلام کا حلقہ بھی اپنی گردن میں ڈال لیا لیکن جونہی مسلمانوں کا لشکر وہاں سے ہٹتا تو وہ سارے لوگ جو مسلمان ہوتے تھے، اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو جاتے۔ اور اسلامی لشکر کے رہے سہے مسلمانوں کو تاخت وتاراج کرنا شروع کر دیتے۔ سیدنا معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ وہاں کے گورنر مقرر ہوئے۔ انھوں نے بربروں کی اس آئے دن کی غارت گری سے اہل اسلام کو بچانے کے لیے وہاں ایک چھاؤنی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا، لیکن جس جگہ شہر اور چھاؤنی بنانا مقصود تھا وہاں میلوں میں گھنا جنگل تھا اور اس میں نہایت موذی قسم کے سانپ اور جنگلی درندے رہتے تھے، اور انسانی فکر میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ان سانپوں اور درندوں سے اس گھنے جنگل کو خالی کروا کر وہاں کوئی شہر آباد کیا جا سکے۔ بربر قبائل مسلمانوں کے اس منصوبے کو حیرت واستعجاب کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی تکمیل کو بالکل ناممکن خیال کرتے تھے۔ ایک روز سیدنا عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ گورنر افریقہ نے جنگل کے ایک کنارے پر کھڑا ہو کر جنگلی جانوروں کو مخاطب کر کے فرمایا:

”ایتها الحيات والسباع! نحن اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، ارحلوا عنا، فانا نازلون، ومن وجدنا بعد ذالك قلتناه“ (ابن اثیر: ۲۳۱/۳)

”اے سانپو اور درندو! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، تم یہاں سے نکل جاؤ کیونکہ ہم اس جنگل کو اپنا ٹھکانہ بنانا چاہتے ہیں، اور اس کے بعد ہم جس جانور کو اس جنگل میں دیکھ لیں گے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔“

---

[1] سیدنا عقبہ بن نافع رحمہ اللہ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ عمرو رضی اللہ عنہ صحابی تھے۔ عقبہ رضی اللہ عنہ صحابی نہیں بلکہ تابعی تھے، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طرح انہیں بھی بے شمار صفات سے نوازا تھا۔ یہ نہایت قابل اور تجربہ کار جرنیل تھے۔ صرف دس ہزار مجاہدین کو لے کر بلاد افریقہ میں گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایک وسیع وعریض علاقہ فتح کر کے قلمرو اسلامی میں داخل کیا جس میں سوڈان، برقہ اور بربروں کا علاقہ بھی شامل ہے۔ ایک خالہ زاد بھائی سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر تھے تو دوسرے بھائی عقبہ بن نافع الفہری رضی اللہ عنہ فاتح بلاد افریقہ تھے۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء۔

Marfat.com

اس روز ایک نہیں ہزاروں لوگوں نے دیکھا کہ جنگل کے سانپ اور درندے اور دوسرے موذی جانور اپنے بچوں کو چمٹائے اس جنگل کو چھوڑ رہے تھے اور اسی روز وہ جنگل ان موذی جانوروں سے یک قلم خالی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بربروں کی ایک کثیر تعداد خلوص دل سے دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی۔

(ابن اثیر: ۲۳۱/۳، معجم البلدان حموی: ۱۹۴/۷، البدایہ والنہایہ: ۳۵/۸، ہسٹری آف سیرسنز: ص ۷۹ از سید امیر علی)

جنگل خالی ہونے کے بعد وہاں قیروان نامی ایک شہر آباد کیا گیا اور جامع مسجد تعمیر کی گئی۔ لوگوں نے بھی اپنے مکانات تعمیر کیے اور اپنے محلوں میں مساجد بنائیں۔ اور ایک چھاؤنی قائم کی گئی۔ شہر کی وضع اس طرز کی تھی کہ شہر کے عین وسط میں دارالامارہ تھا اور اس کے اردگرد چاروں طرف مسلمانوں کے محلے بنائے گئے۔ اس شہر کی تکمیل سنہ ۵۵ھ میں ہوئی۔ یہ شہر صرف اس لیے بسایا گیا تھا تاکہ افریقی بربروں کو مطیع ومنقاد رکھا جاسکے کیونکہ وہ ایک ایسی قوم تھے کہ جب تک ان کے سروں پر فوجی طاقت مسلط نہ رہتی وہ بغاوت سے باز نہ آتے۔ اس شہر نے بعد میں اس قدر ترقی کی کہ یہ شمالی افریقہ کا ایک بہت بڑا شہر بن گیا۔

اندلس پر تیسرا حملہ:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اندلس پر مسلمانوں کا دوسرا حملہ ہوا جس کی تفصیل کتابوں میں نہیں ملتی۔ تیسرا حملہ اسلامی تاریخوں کے مطابق اس وقت ہوا جب عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ کو یزید بن معاویہ نے افریقہ کی گورنری پر دوبارہ بھیجا۔ عقبہ بن نافع پیش قدمی کر کے طنجہ تک پہنچے۔ کاؤنٹ جولین (یولیاں) جس نے بعد میں اندلس کے معاملات اور اس کی فتح میں ایک نمایاں کردار ادا کیا، ان دنوں یہاں کا حکمران تھا۔ اس نے عقبہ کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد عقبہ نے جولین سے اندلس کی طرف بڑھنے کا مشورہ کیا۔ یہ بات اسے شاق گزری، تو انھوں نے اس سے بربر قبائل کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا:

''وہ عیسائی نہیں ہیں بلکہ کافر ہیں۔ اب وہ کتنے ہیں؟ ان کی تعداد کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ ان کی زیادہ تر آبادی سوس ادنیٰ کی طرف ہے۔ اس طرف پیش قدمی کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ عقبہ اس موقع پر جولین کے مشورہ کے مطابق طنجہ سے اندلس کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے مغرب کی سمت سوس کی طرف نکل گئے۔'' (ابن اثیر: ۸۹/۴)

بہرحال یہ اندلس پر ابتدائی حملے تھے۔ ان کو حقیقی معنوں میں اندلس پر فوج کشی نہیں کہا جاسکتا۔ صحیح حملہ اور فتح کی نیت سے صحیح معنوں میں فوج کشی طارق بن زیاد ہی نے کی اور اس حملہ کے بعد مسلمانوں نے اندلس کو اپنا وطن بنا کر اپنی فتوحات کا دائرہ روز بروز وسیع کیا اور پھر چشم فلک نے وہ دن بھی دیکھا کہ پورے اندلس پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔

اس زمانہ میں شمالی افریقہ میں خلافت امویہ دمشق کی سیادت میں موسیٰ بن نصیر جیسا بیدار مغز حکمران

Marfat.com

تھا۔ اس نے چند برسوں میں شمالی افریقہ کو نئے سرے سے مطیع و منقاد کر لیا، اور اسلامی دستوں کو بحر روم کے مختلف جزیروں میں چھاپے مارنے کے لیے بھیجتا رہتا تھا۔ وہ سبتہ پر بھی دو مرتبہ پیش قدمی کر چکا تھا لیکن کاؤنٹ جولین نے پوری طاقت اور قوت سے اس کی مدافعت کی تھی۔ ان دنوں طارق بن زیاد طنجہ کا والی اور حکمران تھا۔ کاؤنٹ جولین نے اس سے مراسم پیدا کیے اور اسلامی حکومت کی اطاعت اور اس کو اندلس پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ طارق بن زیاد نے جولین سے کہا کہ تم براہ راست موسیٰ بن نصیر سے بات کرو۔ چنانچہ اس نے موسیٰ سے براہ راست مراسلت کی۔ جولین نے موسیٰ کو اپنی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی سبتہ آنے کی دعوت دی جس کو موسیٰ نے قبول کر لیا کیونکہ جولین کی یہ پیش کش بڑی خوش آئند تھی۔ چنانچہ وہ سنہ ۹۰ھ میں خود قیروان سے سبتہ آیا (لیکن بعض تواریخ میں ہے کہ جولین خود سبتہ سے قیروان آیا) جولین نے نہایت خندہ پیشانی سے موسیٰ کا خیر مقدم کیا اور اس کو حملہ آور ہونے کی ترغیب دی اور اس کو اندلس کی زرخیزی اور شادابی، میوؤں اور زرعی فصلوں کی بہتات، دریاؤں کی کثرت، پانی کی شیرینی اور سیاسی حالات کے سلسلہ میں یہاں کے باشندوں اور مختلف گروہوں کے باہمی اختلافات اور ایک غیر شاہی خاندان کے قائد اور سربراہ کے برسر اقتدار آ جانے کی تفصیلات بیان کیں، اور اس مہم میں اپنی طرف سے پوری پوری امداد فراہم کرنے کا یقین دلایا۔

موسیٰ بن نصیر نہایت دوربین اور گہری سوچ کا مالک تھا، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جولین اس کے ساتھ کوئی دھوکہ اور فریب کر رہا ہو۔ اس لیے موسیٰ نے نہایت غور و فکر سے اس کی اس تجویز کا جائزہ لیا، وہ اس کی اس تجویز پر عمل کرنے سے پہلے جولین کو پورے طور پر آزما لینا چاہتا تھا۔ موسیٰ نے جولین سے کہا کہ پہلے وہ خود کسی مختصر لشکر سے حکومت اندلس سے چھیڑ چھاڑ کرے۔ اس سے موسیٰ کا مقصد یہ تھا کہ جولین کے اندلس کی حکومت سے تعلقات کھلے طور پر خراب ہو جائیں اور آئندہ اس کے انحراف اور غداری کا کوئی موقع باقی نہ رہ جائے۔ جولین نے موسیٰ کی اس تجویز کو نہایت خوشی سے منظور کر لیا اور ایک مختصر لشکر تیار کر کے اس کو دو جہازوں پر سوار کر کے اندلس کے ساحلی شہر جزیرۂ خضراء بھیجا، جہاں اس لشکر نے معمولی چھیڑ چھاڑ کی اور لوٹ مار کر کے واپس سبتہ آ گیا۔ جب جولین کے اس حملہ کی اطلاع موسیٰ بن نصیر کو ملی تو وہ بہت خوش ہوا کیونکہ اسے جولین کے اخلاص اور اس کی سچائی میں اب کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اب موسیٰ نے خلیفہ مسلمین ولید بن عبدالملک کو ان تمام حالات سے باخبر کر کے اس سے اندلس پر فوج کشی کی اجازت طلب کی۔ ولید نے جواب دیا کہ ''بغیر تجربہ کے مسلمانوں کو متلاطم سمندر کے خطرات میں پھنسانا مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے وہاں کے مکمل حالات معلوم کرو۔'' موسیٰ نے جواب دیا ''متلاطم سمندر نہیں بلکہ ایک معمولی خلیج ہے۔ اس پار سے اس پار کی تمام چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔'' اس اطلاع پر ولید نے اجازت دے دی۔ لیکن یہ تاکید کی کہ فی الحال کسی بڑی لشکر کشی سے باز رہا جائے اور کسی چھوٹے دستہ کو بھیج کر آزمائش اور تجربہ کر لیا جائے کیونکہ چھوٹے دستہ کی صورت میں اگر

Marfat.com

نقصان بھی ہوا تو کم ہوگا۔ موسیٰ کو بھی ولید کی یہ بات اچھی لگی، چنانچہ موسیٰ نے فرمان خلافت کی تعمیل میں مسلمانوں کا ایک مختصر سا دستہ جس کی تعداد پانچ سو تھی سنہ ۹۱ھ میں اپنے ایک غلام طریف بن مالک نخعی کی زیر قیادت اندلس پر حملہ آوری کے لیے روانہ کیا۔ بعض روایات میں لشکر کی تعداد چار سو ہے۔ یہ لوگ چار کشتیوں پر سوار ہو کر روانہ ہوئے اور جنوب مغربی اندلس کے ایک شہر میں جا کر اترے جس کا نام بعد میں جزیرہ طریف پڑا۔ یہ لوگ وہاں حملہ آور ہوئے اور پھر اندلس کے ساحلی شہر جزیرہ خضراء میں اترے یہاں بھی انھوں نے حملہ کیا اور بہت سا مال غنیمت اور تنومند قیدیوں کو اپنے ہمراہ لے کر رمضان المبارک سنہ ۹۱ھ میں بخیر و عافیت واپس آ گئے۔ (نفح الطیب: ۱/۱۰۶، افتتاح الاندلس ابن قوطیہ قرطبی: ص ۸)

طریف بن مالک کی اس مہم کی کامیابی نے اہل اسلام میں ایک خوشی اور مسرت کی لہر دوڑا دی۔ ان کے حوصلے بلند ہو گئے اور مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اس غزوہ میں شرکت پر آمادہ ہو گئی۔ خود موسیٰ کو بھی اندلس کی راہ کی آسانیاں نظر آنے لگیں اور اس نے اندلس پر حملہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑے لشکر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ جلد ہی ایک عظیم لشکر طارق بن زیاد کی سرکردگی میں تیار ہو گیا۔ طارق ایک نہایت قابل اعتماد قائد اور سپہ سالار تھا، اسی قائد اور جرنیل نے آگے چل کر فاتح اندلس کا لقب حاصل کیا۔

جولین نے مسلمانوں کو حملہ کی کیوں ترغیب دی؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جولین نے مسلمانوں کو اندلس پر حملہ کرنے کی کیوں ترغیب دی؟ بلکہ وہ خود سبتہ سے قیروان آیا اور موسیٰ بن نصیر کو اندلس پر حملہ کرنے کے لیے کہا اور اندلس کی سرزمین کی زرخیزی وشادابی، فصلوں اور میووں کی بہتات، پانی کی شیرینی اور دریاؤں کی کثرت اور ملک میں سیاسی خلفشار کا تذکرہ کر کے ان کے دل میں ایک حرص کی کیفیت پیدا کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اپنی مدد کا یقین بھی دلایا۔ اس کی چھوٹی بڑی وجوہات تو کئی ہو سکتی ہیں لیکن مؤرخین نے جو اہم وجہ بیان کی ہے وہ یہ ہے:

شمالی افریقہ میں جب طنجہ تک کا علاقہ اسلامی اقتدار میں داخل ہو گیا تو اندلس کے ساحل کے قریب کے تمام اضلاع اندلس کے بادشاہ کی سیادت اور عمل داری میں داخل ہو گئے تھے سبتہ ان اضلاع کا دارالحکومت تھا اور کاؤنٹ جولین جسے عرب یلیان کہتے ہیں اور جو پہلے طنجہ کا والی تھا، یہاں کا گورنر تھا۔ جولین اندلس کے سابق گاتھ فرماں روا وٹیزا کا داماد تھا۔ اندلس کی عام رسم کے مطابق اس کی لڑکی فلورنڈا طلیطلہ میں اندلس کے نئے حکمران راڈرک کے شاہی محل میں تعلیم و تربیت سیکھنے کے لیے سکونت پذیر تھی۔ وہ جب وہاں گئی تو چھوٹی تھی لیکن جب جوان ہوئی تو راڈرک اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا۔ اور اپنے مقام، مرتبہ اور ذمہ داریوں کا احساس نہ کرتے ہوئے اس کے شیشۂ عصمت کو زبردستی چور کر دیا۔ اس زبردستی کے واقعہ پر ایک ایسی چنگاری اٹھی جس سے نہ صرف راڈرک کا تخت و تاج جل کر خاکستر ہو گیا بلکہ ملک میں ایک ایسا سیاسی اور مذہبی انقلاب

Marfat.com

آیا جس نے صدیوں تک اس ملک کی نہ صرف تاریخ بلکہ تہذیب بھی بدل دی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب یہ نئی تہذیب رائج نہیں ہوئی تھی۔ یورپ میں بے غیرتی، بے حمیتی اور بے حیائی کا وہ چلن نہیں تھا جو آج ہے۔ آج کے یورپ میں تو حیا نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی۔ عورت کو اشتہاری چیز بنا دیا گیا ہے حالانکہ حیا انسان کا وہ فطری وصف ہے جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی آبیاری اور پرورش ہوتی ہے۔ عفت اور پاکبازی کا دامن اسی کی بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے۔ یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے، اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے بلکہ بڑھتا جاتا ہے اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا رہتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا۔ ستر عورت کا خیال کرنا، نگاہیں نیچی رکھنا، بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، برہنگی اور ننگا پن کو منع کرنا یہاں تک کہ غسل خانہ، باتھ روم اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ دینا، اسی لیے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے جھینپتی رہیں۔ اگر تھوڑی تھوڑی بے شرمی اور بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیا بن جائے گا جیسا کہ آج کل مغربی ممالک اور امریکہ میں نئی تہذیب اور نئے تمدن کے سایہ میں مرد و عورت بے حیائی کی تمام حدود کو پھلانگ چکے ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں ابھی نوبت یہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ عورتوں میں بھی حیا باقی اور مردوں میں بھی غیرت وحمیت کا جذبہ موجود تھا اس جذبہ کے تحت وہ بڑے سے بڑا کام کر گزرتے تھے۔ چنانچہ فلورنڈا کے شیشۂ عصمت کو جب زبردستی چکنا چور کیا گیا اور وہ بھی بادشاہ راڈرک (Roderic) کے ہاتھوں، کیونکہ بادشاہ تو پوری رعایا کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے، اور فلورنڈا تو اس کے محل میں اس کی لڑکی کی طرح تعلیم و تربیت حاصل کر رہی تھی، تو اس نے اس کی اطلاع اپنے باپ کاؤنٹ جولین (Count Juline) کو پہنچائی۔ وہ اس شرمناک واقعہ کو سن کر غیرت وحمیت میں ڈوب گیا اور جوش انتقام میں راڈرک (رزدیق) کو تخت و تاراج سے یک قلم محروم کرنے کا پختہ عزم کر لیا۔ چنانچہ وہ یہی منصوبہ باندھ کر فلورنڈا کو شاہی محل سے لے آنے کے لیے طلیطلہ گیا۔ راڈرک جولین طلیطلہ میں غیر متوقع آمد کا سن کر حیران ہو گیا کیونکہ وہ جو کچھ فلورنڈا سے کر چکا تھا وہ اس کے سامنے تھا۔ اس کے دل میں خوف کے کچھ جذبات پیدا ہوئے لیکن جولین نے اسے محسوس نہ ہونے دیا کہ اسے اس شرمناک واقعہ کی اطلاع مل چکی ہے اور وہ اسی کے لیے آیا ہے۔ راڈرک نے جب اس سے طلیطلہ آنے کا مقصد پوچھا تو جولین نے اپنی خانگی پریشانیوں کی ایک فرضی داستان اس کو سنائی کہ اس کی بیوی بستر مرگ پر ہے اور وہ اپنی بیٹی فلورنڈا سے آخر ملاقات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ راڈرک کو جولین کی پریشانی کا حال دیکھ کر اس پر ترس آ گیا اور اس نے فلورنڈا کو واپس لے جانے کی اجازت دے دی۔ روانگی کے وقت راڈرک نے جولین سے کہا:

"سنا ہے کہ افریقہ کے باز بہت اچھے ہوتے ہیں، چند باز بھیج دینا۔ کاؤنٹ جولین نے جواب دیا: اگر میں زندہ رہا تو ایسے باز بھیجوں گا جن کو آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔"

Marfat.com

ان بے نظیر بازوں سے جولین کی مراد عرب کے شہ سوار تھے۔ چنانچہ جولین نے سبتہ واپس آتے ہی شمالی افریقہ کی اسلامی حکومت سے اندلس پر حملہ آور ہونے کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کر دی جس کا تذکرہ گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔

دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ

''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ موسیٰ بن نصیر نے یہ قدم (یعنی اندلس پر حملہ) شہر سبتہ (Soptem) کے سابق حکمران کی طرف سے امداد کے وعدے پر اٹھایا تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں قرطاجنہ (Carthage) کے سقوط کے بعد بھی سبتہ بدستور بازنطینی سلطنت کے قبضہ میں تھا۔ اس کے حاکم کا نام کاؤنٹ جولین (Julian) تھا اور اس نے مسلمانوں کو سپین کی سرزمین پر پہلی بار قدم رکھنے کی سہولت بہم پہنچائی، لیکن یہ محض افسانہ ہے۔ موسیٰ بن نصیر اپنی قوت اور فاتحیت کے پیش نظر اس امر کا محتاج نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک معمولی شہر کا حاکم مدد دے تو اندلس پر حملہ کیا جائے۔ دراصل اس سلسلے میں بہت سے اسباب فراہم ہو گئے تھے، مثلاً ہسپانیہ کے عوام کی حالت زار، قوطیوں کے ظلم و جور سے بیزاری جو صرف پادریوں کی دلداری کا خیال رکھتے تھے، عوام سے خود پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کی بے اعتنائی، یہاں تک کہ ہسپانیہ کے یہودی بھی مسلمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے جن پر مسیحوں کی طرف سے برابر مظالم ہوتے رہتے تھے، اور سب سے بڑھ کر عوام سے مسلمانوں کا حسن سلوک اہل ہسپانیہ کے لیے بطور خاص باعث کشش تھا۔'' اس حملے کی نوعیت محض ایک تاخت کی سی تھی جو بربری سپہ سالار طریف کی سرکردگی میں جزیرۂ طریف (Tarif) پر عمل میں آئی۔ طریف کی اس کامیابی کے بعد موسیٰ کا نائب طارق سات ہزار جمعیت کے ساتھ باقاعدہ میدان جنگ میں کود پڑا۔ رجب یا شعبان سنہ ۹۲ھ، اپریل یا مئی سنہ ۷۱۱ء میں اس جمعیت نے اس پہاڑ کے قریب پاؤں جما لیے جو بعد میں طارق کے نام سے جبل الطارق (Gibralter) کہلایا۔'' (دائرہ معارف اسلامیہ: ۳۴۸/۲)

Marfat.com

فاتح اندلس طارق بن زیاد کا حملہ

طارق بن زیاد فاتح اندلس افریقہ کا باشندہ تھا اور بربر نسل سے اس کا تعلق تھا۔ اگر چہ بعض لوگوں نے اس کے افریقی ہونے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ فارسی الاصل تھا اور اس کا تعلق ایران کے شہر ہمدان سے تھا، لیکن ہمارے نزدیک یہ درست نہیں ہے۔ طارق کا تعلق افریقہ ہی سے تھا اور یہ موسیٰ بن نصیر کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھا۔ یہ پہلے مختلف فوجی خدمات پر مامور رہا اور فوج میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ چنانچہ اسے طنجہ کا والی بنا دیا گیا۔ اسی دوران کہتے ہیں کہ سبتہ کے حکمران کاؤنٹ جولین سے اس کے مراسم اور تعلقات قائم ہو گئے۔ ان تعلقات میں یہاں تک گہرائی پیدا ہوئی کہ ایک روز جولین نے انھیں اندلس پر حملہ کرنے کی ترغیب دی، لیکن طارق نے کہا کہ آپ اس بارے میں موسیٰ بن نصیر سے بات کریں۔ چنانچہ جولین نے براہ راست موسیٰ سے بات کی لیکن جس مجلس میں یہ گفتگو ہوئی اس میں طارق بن زیاد بھی شریک تھے۔ موسیٰ نے پہلے طریف بن مالک کو چار پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ بھیجا جن کا حملہ نہایت کامیاب رہا۔ اب اندلس کی مکمل فتح کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے جو فوج بھیجی گئی اس کا سپہ سالار موسیٰ نے اپنے آزاد کردہ غلام (مولیٰ) طارق بن زیاد بربری کو بنایا۔ جولین نے وعدہ کے مطابق اپنے چار تجارتی جہاز افریقہ بھیجے اور ان جہازوں پر طارق سات ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک لشکر لے کر اندلس روانہ ہو گئے۔ ان میں تین سو عرب اور باقی بربر تھے۔ اگر چہ اسلامی لشکر کی تعداد میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ ابن اثیر نے تعداد سات ہزار لکھی ہے۔ پھر پانچ ہزار کمک کا اور تذکرہ کیا ہے۔ ابن خلدون نے تین سو عرب اور دس ہزار بربر لکھا ہے۔ بہر حال یہی تعداد تھی جو فاتح اندلس بنی۔ اس لشکر کی راہنمائی کاؤنٹ جولین کر رہا تھا۔

یہ اسلامی لشکر چار جہازوں پر بروز پیر ۵ رجب سنہ ۹۲ھ کو آبنائے کو عبور کر کے ایک پہاڑی پر اترا جو بعد میں طارق بن زیاد کی طرف منسوب ہو کر جبل الطارق کے نام سے موسوم ہوئی۔ جس کو اب جبرالٹر (Gibralter) کہا جاتا ہے۔ مسلمان چونکہ اپنے جہازوں پر نہیں آئے تھے بلکہ جولین کے تجارتی جہازوں پر اندلس میں وارد ہوئے تھے اس لیے ان کے اترنے سے کسی کو یہ احساس بھی نہ ہوا کہ کوئی باہر سے حملہ آور آیا ہے۔ یہ چاروں جہاز سپاہیوں کو ساحل پر اتار کر باقی ماندہ سپاہیوں کو لانے کے لیے واپس چلے گئے۔

Marfat.com

بعض کتابوں میں ہے کہ طارق بن زیاد نے اثنائے راہ میں ایک مبارک خواب دیکھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ مہاجرین و انصار کی معیت میں تشریف فرما ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تلواریں لٹکائے اور مونڈھوں پر کمانیں چڑھائے ہیں۔ آپ ﷺ نے طارق سے فرمایا: ''طارق! اسی شان سے قدم بڑھائے جاؤ۔'' پھر آپ ﷺ نے اس کو مسلمانوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنے اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اس کے بعد طارق نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جلو میں اندلس میں داخل ہوئے اور طارق اس مقدس جماعت کے پیچھے ہے۔''

یہ خواب نہایت مبارک تھا۔ اسے دیکھ کر طارق بہت خوش ہوئے اور اس سے انھیں اپنی کامیابی اور فتح مندی کی امید بندھی۔ طارق نے یہ خواب اپنے ساتھیوں کو بھی سنایا، وہ بھی سن کر بہت خوش ہوئے اور اس خواب نے ان کے حوصلے بلند اور ارادے مضبوط کر دیے۔

طارق نے اس پہاڑ پر چند روز قیام کیا۔ اس اثناء میں جولین کے تجارتی جہاز باقی ماندہ مجاہدین کو بھی لے کر آ گئے۔ ابتدائی انتظامات مکمل کرنے کے بعد اب اس لشکر نے فوجی نقل و حرکت شروع کی۔ جبل الطارق کے بالکل شمالی ساحل پر قدیم تاریخی شہر قرطاجنہ آباد تھا۔ طارق نے عبدالملک معافری کو ایک دستہ دے کر اس کی طرف روانہ کیا۔ اہل شہر نے کوئی مزاحمت نہ کی اور وہ بلا مزاحمت شہر میں داخل ہو گیا۔ پھر یہ جزیرہ خضراء کی طرف بڑھے۔ یہاں بھی کامیابی و کامرانی نے ان کے قدم چومے۔ یہ جزیرہ گزشتہ سال طریف کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا لہٰذا اسے فتح کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی، پھر ایک چھوٹا سا لشکر طریف ہی کی قیادت میں جزیرہ طریف کو فتح کرنے کے لیے بھیجا گیا جس نے کسی بڑی مزاحمت کے بغیر اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ تین شہر قرطاجنہ، جزیرہ خضراء اور جزیرہ طریف مسلمانوں کے زیر نگین تھے اور مجاہدین کا ان پر مکمل کنٹرول تھا۔ طارق نے ان شہروں کی فصیل اور قلعوں کو درست کرایا۔ جہاں جہاں مرمت کی ضرورت تھی وہاں مرمت کرائی اور ان شہروں کو اپنی پشت پناہ بنا کر اندلس کے شاہی لشکر سے کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

چند افسانے:

بعض تواریخ میں ہے کہ اندلس میں اس زمانہ میں نجوم و طلسمات کے بہت سے افسانے پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض مؤرخین کے کانوں تک بھی پہنچے، اور انہوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ اپنی کتابوں میں انھیں نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جزیرہ خضراء میں تفاول کے طور پر ایک واقعہ پیش آیا۔ یہاں طارق بن زیاد سے ایک بڑھیا نے کہا کہ اس کا شوہر علم نجوم میں بڑا ماہر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اس ملک میں ایک امیر اور جرنیل داخل ہو گا جو سب پر غلبہ حاصل کرے گا اور اندلس کا پورا علاقہ اس کے ہاتھوں فتح ہو گا۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کا سر بڑا ہو گا اور اس کے بائیں بازو پر ایک تل ہو گا جس پر بال اگے ہوں گے۔ طارق نے اس بڑھیا سے

Marfat.com

جب یہ بات سنی تو اسے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنا بایاں بازو کھول کر دیکھا تو واقعی اس پر تل موجود تھا جس میں بال اگے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس بات سے بھی طارق کا حوصلہ بلند ہوا اور وہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو اس ملک کا فاتح سمجھنے لگا۔

جس طرح طارق کے بارے میں اس قسم کی باتیں کتابوں میں ہیں جس سے اس کا فاتح ہونا ثابت ہوتا ہے اسی طرح راڈرک شاہ اندلس کی طرف بھی اس قسم کی کئی باتیں منسوب کر کے لکھی گئی ہیں جن سے اس کی حکومت کا زوال اور عربوں کی فتح کی بشارت ملتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ طلیطلہ میں ایک قدیم تاریخی عمارت تھی جو بیت الحکمت کے نام سے موسوم تھی۔ یہ عمارت مقفل تھی، اور کئی پشتوں سے دستور یہ چلا آ رہا تھا کہ اندلس کا نیا فرماں روا اس کے دروازہ پر ایک تالہ چڑھا دیتا تھا اور اس کی چابی اس تالے کے ساتھ لٹکتی رہتی تھی۔ کسی فرماں روا اور صاحب اقتدار کو اجازت نہ تھی کہ وہ اس تالے کو کھول لے کیونکہ تالے کے کھولنے کے معنی ملک کو آفات وحوادث اور زوال وانحطاط میں مبتلا کر دینے کے تھے۔ اس عمارت کی حفاظت کے لیے کئی دربان مقرر تھے تاکہ کوئی اس کا تالہ نہ کھول سکے۔ چنانچہ راڈرک جب تخت نشین ہوا تو اس کی تخت نشینی کے وقت بھی دستور کے مطابق عمائدین سلطنت دربار میں حاضر ہوئے اور اس عمارت کے دروازہ پر قفل چڑھانے کی رسم انجام دینے کی درخواست کی۔ کہتے ہیں کہ اس وقت عمارت کے دروازے پر ۲۶ قفل چڑھے ہوئے تھے اور ستائیسواں قفل راڈرک کی خدمت میں پیش کیا گیا تاکہ وہ بھی اپنے حصہ کا قفل چڑھائے۔ لیکن راڈرک کا تعلق چونکہ شاہی خاندان سے نہیں تھا کہ وہ گزشتہ خاندانی روایات کا احترام کرتا، اس لیے بجائے قفل چڑھانے کے اس کو اس طلسمی عمارت کی حقیقت سے آشنائی پیدا کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ اس عمارت کو تالے اس لیے لگتے ہیں کہ شاید پچھلے بادشاہوں کی دولت اس میں چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ اس لیے اس نے اسپین کے عمائدین کے سامنے اس قفل کو کھولنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن عمائدین سلطنت نے یک زبان ہو کر اس کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ کہا کہ اگر آپ کو زر و جواہر اور مال و دولت کا خیال ہے تو ملک سے ڈھیروں دولت جمع کر دی جائے گی، لیکن اس عمارت کے طلسم کو توڑ کر ملک کو کسی نئی مصیبت اور آفت میں مبتلا نہ کیا جائے۔ مگر راڈرک بضد تھا کہ اس طلسمی عمارت کے سربستہ رازوں کو وہ ضرور معلوم کر کے رہے گا۔ عمائدین کو سمجھانے سے وہ اپنے ارادے سے باز نہ آیا اور اس نے خود جا کر ایک ایک کر کے سارے قفل کھول دیے۔ بیت الحکمت کا دروازہ کھلا تو سامنے ایک زر و جواہر سے مرصع زرنگار خوبصورت میز رکھی ہوئی ملی۔ معلوم ہوا کہ یہ "مائدہ سلیمان" ہے جو بیت المقدس کی فتح کے بعد وہاں لایا گیا تھا۔ پھر اسی کمرے میں ایک مقفل صندوق ملا۔ راڈرک نے اس کے تالے کو بھی کھولا تو صندوق میں نہایت عمدہ قسم کی بنی ہوئی سواروں کی چند تصویریں نکلیں جن کی شکلیں عربوں سے ملتی تھیں۔ وہ جانوروں کی کھالیں پہنے، عمامے باندھے، گیسو لٹکائے، عربی گھوڑے پر سوار، ننگی تلواریں سونتے اور برچھے تانے کھڑے تھے۔ انھیں تصویروں کے ساتھ ہرن کی ایک جھلی رکھی ہوئی تھی۔ راڈرک نے

Marfat.com

اس جھلی کو کھلوایا تو اس میں مکتوب تھا کہ

''جب اس مقفل عمارت اور صندوق کو کھولا جائے گا تو وہ قوم جس کی تصویریں اس صندوق میں بنی ہوئی ہیں، جزیرہ اندلس میں داخل ہوگی، اور جن لوگوں کے ہاتھوں میں ملک ہوگا، ان کی حکومت ہمیشہ کے لیے جاتی رہے گی۔''

راڈرک نے اس طلسمی عمارت اور صندوق کا کھول تو لیا لیکن وہ اس نوشتہ کو پڑھ کر اپنے کیے پر پچھتایا اور اس کو اپنی سلطنت کے زوال کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اس واقعہ پر چند روز ہی گزرے تھے کہ اس نے سنا کہ مشرق سے شہنشاہ عرب کی فوج اندلس کی فتح کے لیے ملک میں داخل ہوگئی ہے۔ اس خبر نے اس کے ہوش اڑا دیے۔

یہ واقعات کہاں تک درست اور صحیح ہیں، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ بہرحال ہم نے زیب داستان کے لیے ان کو نقل کر دیا ہے۔ اگر یہ واقعات اور افسانے درست بھی ہوں تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

ڈیوک تھیوڈومیر کی شکست:

طارق بن زیاد جولین کے تجارتی جہازوں پر آبنائے کو عبور کر کے اندلس میں پہنچ تو گیا۔ لیکن اس کا پہنچنا ارباب اقتدار سے مخفی رہا لیکن جب چند ہی دنوں میں اس کے جرنیلوں نے چند شہروں پر قبضہ کر لیا تو پورے علاقہ میں ایک ہلچل مچ گئی اور لوگ سراسیمہ اور پریشان ہو گئے۔ ڈیوک تھیوڈومیر (تدمیر) اس علاقہ کا گورنر تھا۔ اس کا تعلق گاتھ خاندان سے تھا۔ وہ ان اجنبی حملہ آوروں کی کارروائیوں اور اندلس میں ان کی موجودگی سے سراسیمہ اور پریشان ہو گیا۔ اس نے اس فوج سے جبرالٹر کے قریب ہی مقابلہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اجنبی فوج اس کے مقابلہ میں جلد شکست کھا جائے گی، لیکن معاملہ برعکس نکلا اور تھیوڈومیر (Theodomir) پہلے ہی حملہ میں ان اجنبی فوجیوں سے شکست کھا گیا۔ شاہ راڈرک ان دنوں شمالی علاقہ میں اپنے دشمنوں سے نبرد آزما تھا۔ تھیوڈومیر نے جب مسلمان مجاہدین سے شکست کھائی تو وہ اس قدر خوف زدہ ہو گیا کہ اسی خوف میں اس نے ایک تیز رفتار قاصد راڈرک کے پاس بھیجا اور ان اجنبی حملہ آوروں کی اطلاع اس کو ان الفاظ میں دی۔ خط کے ایک ایک لفظ سے خوف ٹپکتا تھا۔ اس نے لکھا:

''ہماری اس سرزمین پر ایک قوم اتر پڑی ہے کہ نہ ان کا وطن معلوم ہے اور نہ اصلیت۔ معلوم نہیں یہ کہاں سے آئے ہیں، زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اترے ہیں، کاؤنٹ جولین ان حملہ آوروں کا دلیل راہ ہے۔''

اس خط کے ملنے پر راڈرک کو سخت پریشانی ہوئی۔ وہ اس وقت بلیلونہ میں مقیم تھا۔ یہ خط پڑھ کر اس نے بلیلونہ کی مہم ملتوی کر دی اور مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ ملک میں عام فوجی بھرتی کا اعلان کرایا گیا اور لوگوں سے اپیل کی گئی کہ ان اجنبی فوجوں کو فوراً ملک سے نکال باہر کیا

Marfat.com

جائے۔ راڈرک کا دارالحکومت طلیطلہ تھا۔ وہ بلبلونہ سے گھبراہٹ میں قرطبہ چلا آیا اور طلیطلہ کے بجائے اب اس کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

اس نے حملہ آوروں کو سرزمین اندلس سے نکالنے کی جو عام اپیل کی تھی عوام نے اس کا مثبت جواب دیا، باوجود اس بات کے کہ وہ راڈرک سے سخت نالاں تھے، لیکن اجنبی فوجوں کو برداشت کرنا ان کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ لوگ جوق در جوق قرطبہ آ کر فوج میں شریک ہونا شروع ہو گئے۔ راڈرک نے چونکہ گاتھ خاندان کی حکومت پر ناجائز قبضہ کیا تھا اس وجہ سے اس کے مخالفین بھی بہت تھے، لیکن اس نازک موقع پر اس نے دل کڑا کر کے اپنے مخالفین سے بھی ملاقات کی اور ان کو مذہب، وطن اور قوم کے نام پر مادر وطن کی حفاظت کی اپیل کی۔ اس کی اس اپیل کا یہ اثر ہوا کہ گاتھ خاندان کے تین شہزادے بھی اپنے حلقہ اثر سے فوج اکٹھا کر کے دارالحکومت قرطبہ کی طرف چل پڑے، لیکن انھیں راڈرک پر کوئی بھروسہ اور اعتماد نہ تھا، اس لیے انہوں نے شہر میں داخل ہونے سے گریز کیا اور قرطبہ سے باہر وادی کبیر کے اس پار مقام ثقندہ میں فوج کے ساتھ اترے۔ ان شہزادوں کی فوج کو دیکھ کر دوسرے لوگ جو جنگ کی نیت سے آئے تھے وہ بھی یہیں ٹھہر گئے۔ اور رفتہ رفتہ یہی مقام فوجی چھاؤنی بن گیا اور راڈرک کا لشکر ایک لاکھ کی تعداد تک پہنچ گیا جو کہ اس وقت کے لحاظ سے ایک بہت بڑا لشکر تھا۔

طارق بن زیاد نے جب دشمن کی اتنی بڑی فوج کے اکٹھے ہونے کا حال سنا تو کچھ پریشان سا ہوا کیونکہ اجنبی ملک میں ہر طرف دشمن اور پیچھے گہرا سمندر، اب حالت یہ تھی کہ ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔'' اس لیے پریشان ہونا ایک فطری بات تھی۔ انہوں نے موسیٰ بن نصیر کو اس بارے میں مطلع کیا اور کچھ کمک طلب کی۔ موسیٰ بھی غافل نہ تھے۔ وہ کمک کے لیے پہلے سے کشتیاں تیار کروا رہے تھے۔ چنانچہ جونہی طارق نے کمک طلب کی تو انہوں نے فوری طور پر پانچ ہزار فوج بھیج دی۔ اب اسلامی لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہوگئی۔ لیکن ایک لاکھ کی فوج کے مقابلہ میں بارہ ہزار فوج کی کیا حیثیت تھی۔ لیکن مسلمانوں کا اعتماد اسلحہ اور فوج کی تعداد پر تھوڑا ہی تھا، وہ تو دنیا میں اپنے کو اللہ تعالیٰ کا نمائندہ سمجھتے ہوئے لڑتے تھے اور اسی ایمانی جذبہ کے تحت وہ سمندر پار کر کے ایک اجنبی ملک میں وارد ہوئے تھے۔

طارق کی تعلیم و تربیت موسیٰ بن نصیر ایسے ماہر حرب اور عظیم سپہ سالار کی زیر نگرانی ہوئی تھی اور فن سپاہ گری میں طارق کا ایک نہایت بلند مقام تھا۔ اس کی جنگی چالوں اور بہادری کے چرچے دور دور تک تھے۔ وہ جنگی منصوبہ بندی میں بڑا ماہر تھا اور غیر معمولی ذہین، دوربین اور مستعد قائد تھا۔ انہی قابلیتوں کے باعث اندلس پر حملہ آور ہونے سے قبل طارق کو طنجہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔

طارق بن زیاد نے جنگ کے لیے ایسی جگہ منتخب کی جو فوجی لحاظ سے اسلامی لشکر کے لیے محفوظ تھی۔ اس کے قریب پانی اور سامان رسد کی سہولتیں موجود تھیں۔ یہ جگہ وادی رباط کے کنارے تھے (جس کا دوسرا نام

Marfat.com

وادی بکر ہے) اور اسلامی لشکر کے عقب میں جھیل لا جندا (La Janda) تھی جسے البحیرہ کہنے لگے تھے۔ اس اثناء میں راڈرک بھی کوچ کرتا ہوا جنوبی اندلس کی طرف چلا۔ دونوں فوجوں کا سامنا گواڈالیٹ کے داہنے کنارے بحرمحیط کے ساحل سے قریباً سات میل کے فاصلہ پر مقام شریش میں ہوا۔ دونوں فوجوں نے آمنے سامنے ڈیرے ڈال دیے اور طرفین لڑائی کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

راڈرک کی یہ ایک لاکھ کی فوج گھوڑوں اور قیمتی اور جدید اسلحہ سے آراستہ تھی جب کہ مجاہدین اسلام صرف بارہ ہزار تھے۔ اگرچہ یہ بڑے قوی ہیکل، جنگ جو، بہادر اور عزم و ہمت کے مجسمہ تھے لیکن ان کے پاس نہ گھوڑے تھے اور نہ پورا اسلحہ، ہاتھوں میں صرف برہنہ شمشیریں تھیں اور بعضوں کے پاس صرف نیزے تھے تلوار بھی نہ تھی لیکن ع

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اور کافر کو اپنے اسلحہ اور شمشیر پر بھی بھروسہ ہوتا ہے۔ فوج کی تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے ان دونوں فوجوں میں کوئی مقابلہ نہیں تھا خصوصاً اس لیے کہ اندلسی لشکر میں وطن اور مذہب کی مدافعت کا جذبہ کارفرما تھا اور اسی جذبہ کے تحت اندلس کے گوشہ گوشہ سے چیدہ چیدہ سپاہی اکٹھے ہو کر آئے تھے کہ غیر ملکی فوجوں کو اپنے وطن اور خطے سے نکال باہر کریں گے، لیکن مسلمان فوج دلوں میں ایمان کے نور کی روشنی لے کر اور اللہ پر توکل کر کے، اللہ کے دین کی اشاعت کے لیے سمندر پار سے آئی تھی اس لیے وطن کی حفاظت کا جذبہ ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اللہ کے دین کے پرچارک اور اس کے رسول ﷺ کا نمائندہ بن کر اس ملک میں آئے تھے۔ نہ مال غنیمت اور نہ کشور کشائی ان کا مقصد زندگی تھا اس لیے اللہ کی تائید و نصرت ان کے ساتھ تھی۔

نصرت خداوندی اور مدد ایزدی سے ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی جس نے راڈرک کی قوت میں ضعف اور اضمحلال پیدا کر دیا۔ ہوا یہ کہ کاؤنٹ جولین اسلامی لشکر کے ہم رکاب تھا بلکہ اس کا دلیل راہ تھا۔ وہ اس خطہ کے ہر شخص سے آشنا اور ان لوگوں کی ہر چال سے واقف تھا۔ چنانچہ جب طرفین کے لشکر آمنے سامنے خیمہ زن تھے تو جولین کے آدمی دشمن کے فوجیوں میں مل جل گئے تھے، انہوں نے جاسوسی اور فتنہ اندازی کی حکمت عملی اختیار کی کیونکہ اس میں طارق کی فوج کا بہت فائدہ تھا۔ اسی اثناء میں کاؤنٹ جولین اپنا کمند گاتھ شہزادوں پر پھینکنے میں کامیاب ہو گیا جو اس لشکر میں وطن و قوم کی حفاظت کے جذبہ کے تحت راڈرک جیسے غدار قوم و وطن کے ساتھ آئے تھے۔ حالانکہ وہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے ہمارے آبا ؤاجداد اور خاندان کی حکومت پر ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے، لیکن مسلمان چونکہ دوسرے وطن سے آئے تھے اس لیے یہ شہزادے اپنے لشکر کے ساتھ وطن کی حفاظت کرنے اور وطن کو اجنبی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے راڈرک کے ساتھ تھے۔ جولین نے ان شہزادوں کو ان کی کھوئی ہوئی عظمت یاد دلا کر مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لینے اور درخشاں مستقبل کی یاد دلائی۔ شہزادوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ راڈرک اس اجنبی فوج سے ہمارے لیے زیادہ خطرناک

Marfat.com

ہے۔ دوسرے مسلمان ایک با اصول قوم اور وعدہ کی سچی ہے جو معاہدہ ہم ان کے ساتھ کریں گے وہ اس کو ضرور پورا کریں گے جب کہ راڈرک ایک غاصب اور غدار شخص ہے۔ یہ وقتی طور پر ہم سے وعدہ وعید کر رہا ہے، وقت گزرنے کے بعد یہ اپنے کسی وعدہ کو پورا نہیں کرے گا۔ اس نے پہلے بھی ہمارے خاندان کو نقصان پہنچایا اور اگر یہ مسلمانوں کے مقابلہ میں فتح مند اور کامیاب ہو گیا تو پھر اس سے کسی خیر کی توقع رکھنا عبث اور فضول ہے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہمیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ چنانچہ گاتھ شہزادوں نے اپنے قاصد اور پیام بر کے ذریعہ راڈرک کی حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر لینے اور ان لوگوں کا اپنے حقوق سے دست بردار ہونے سے مطلع کیا، اور اپنی موروثی جاگیریں اندلس میں واگزار رکھنے کی شرط پر اسلامی لشکر کی مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ شاہی جاگیریں اندلس کے نہایت ہی زرخیز علاقوں میں تین ہزار کی تعداد میں تھیں۔ طارق بن زیاد نے ان کی اس شرط کو منظور کر لیا اور دونوں فریقوں میں یہ عہد و پیمان خفیہ طور پر طے پا گیا۔

ادھر یہ خفیہ عہد و پیمان طے پایا تو دوسری طرف راڈرک کے لشکر میں یہ خیالات پھیلائے گئے کہ راڈرک سلطنت اندلس کا غاصب اور غدار ہے۔ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کو کامیاب و کامران بنانے کے لیے کوئی اپنی تباہی و بربادی کیوں مول لی جائے کیونکہ اس سے کسی قسم کی کوئی اچھی توقع ہو ہی نہیں سکتی۔ باقی رہے مسلمان تو یہ چلتی پھرتی قوم ہے۔ یہ سمندر پار سے آئی ہے۔ اسے اس سرزمین سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے صرف مال غنیمت چاہیے، مال غنیمت حاصل ہو جانے کے بعد انھیں اس ملک میں رہنے کی کوئی ضرورت اور حاجت نہیں۔ یہ مال غنیمت لے کر جب افریقہ روانہ ہوں گے تو یہ وطن ہمارا ہے۔ ہم خود اندلس کے شاہی تخت و تاج کے لیے کسی کو منتخب کر لیں گے۔

راڈرک اس رازدارانہ عہد و پیمان اور لشکر میں ان باغیانہ خیالات کی نشر و اشاعت سے یک قلم بے خبر تھا۔ وہ مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی مختلف قسم کی جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کے جاسوس بھی اسلامی لشکر کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ انھیں بھی اس بات کا مطلق علم نہیں تھا کہ ان کے اپنے لشکر میں کس قسم کے باغیانہ خیالات کی نشر و اشاعت ہو رہی ہے۔ یہ اس کے جاسوسی کے محکمہ کی ناکامی تھی۔ پھر جن جاسوسوں کو اس نے مسلمانوں کی عام حالت کا اندازہ لگانے کے لیے بعض جری اور معتبر آدمیوں کو بھیجا تھا، وہ اپنے کو مسلمانوں سے نہ چھپا سکے، لہٰذا وہ جاسوسی کرنے میں بالکل کامیاب نہ ہوئے، لیکن یہ ان کی خوش بختی تھی کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان جاسوسوں نے واپسی پر اپنے جو تاثرات راڈرک سے بیان کیے وہ اس کے لیے اور زیادہ حوصلہ شکن ثابت ہوئے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ انہوں نے راڈرک سے کہا:

"بادشاہ! یہ وہی صورتیں ہیں جو اس طلسمی صندوق میں دکھائی گئی تھیں۔ ان سے مقابلہ آسان کام نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یا تو اپنی موت کے خواہاں ہیں یا اس زمین کے جو آپ کے قدموں کے نیچے ہے۔ انہوں نے واپس اپنے وطن جانے کے خیال کو یک قلم مٹانے کے لیے اپنے جہازوں کو بھی جلا

Marfat.com

کر رکھ کر دیا ہے اور وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ آپ کے مقابل صف آرا ہو گئے ہیں۔ ان کے لیے ہماری اس سرزمین پر کوئی ایسا مقام نہیں جہاں وہ بھاگ کر پناہ لے سکیں، لہٰذا انھیں یا تخت چاہیے یا تختہ، تیسری شے ان کے لیے اور کچھ نہیں ہے۔'' (مقری: ۱/۱۲۱)

جاسوسوں کی یہ رپورٹ راڈرک کے لیے نہایت حوصلہ شکن اور اس کے اوسان خطا کرنے والی تھی، لہٰذا اس سے اس کی فوج میں ایک خاصا اضطراب و انتشار پھیل گیا، لیکن دوسری طرف مسلمان سپاہی بھی دشمن کی کثرت تعداد اور اس کے قیمتی اور اعلیٰ قسم کے سامان جنگ کو دیکھ کر مرعوب ہو رہے تھے جو ایک اچھی بات نہ تھی۔ ایسی مرعوبیت حوصلوں کو پست اور عزم کو ضعیف کرتی ہیں، لیکن اسلامی لشکر کا سپہ سالار طارق بن زیاد اس سے بے خبر نہ تھا، مگر وہ جلد ہی فوج کے اس خوف و ہراس کو دور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ اس رات کو جس کی صبح کو لڑائی شروع ہوئی تھی، مسلمانوں میں جوش و ولولہ اور عزم و استقامت کی روح پھونکنے کے لیے اس نے ان کے سامنے ایک بڑی پرزور اور ولولہ انگیز تقریر کی جس نے مسلمانوں کے پست ہوتے ہوئے حوصلوں کو بلند اور ان کے ڈوبے ہوئے دلوں کو سنبھال لیا بلکہ مضبوط کر دیا اور وہ لڑنے مرنے اور فتح مندی اور کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ طارق کی یہ تقریر مختلف تاریخوں میں تھوڑے تھوڑے اختلاف کے ساتھ مذکور ہے۔ ہم نے ان تاریخوں سے جستہ جستہ فقرات نقل کیے ہیں اور اس ترجمہ میں اصل تسلسل اور ترتیب کو قائم رکھ کر ان فقروں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ طارق بن زیاد نے حمد وثنا کے بعد کہا:

''مسلمانو! یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ اب تمہارے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے سامنے۔ بخدا! اب سوائے عزم و ہمت، جرأت و بہادری اور پامردی و استقلال کے تمہارے لیے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا۔ یہی دونوں طاقتیں ہیں جو مغلوب نہیں ہوسکتیں۔ یہی دونوں فتح مند قوتیں ہیں جنہیں فوج کی قلت تعداد اور نقصان نہیں پہنچا سکتی اور نہ کسی فوج کی کثرت، بزدلی، سستی، نامردی، اختلاف اور غرور کے ساتھ کسی کو فائدہ پہنچا سکتی۔ یہ بات سمجھ لو! تم اس جزیرہ میں ایسے ہو جیسے یغمائی بخیلوں کے دسترخوانوں پر ہوتے ہیں۔ تمہارے دشمن اپنی فوج اور قیمتی سامان جنگ کے ساتھ تمہارے سامنے آ چکے ہیں۔ ان کے پاس سامان رسد کا ذخیرہ بھی وافر ہے لیکن تمہارے پاس کوئی سامان نہیں، بجز تمہاری تلواروں کے تمہارے لیے کوئی رسد نہیں سوا اس کے کہ تم اپنے دشمنوں کے ہاتھوں سے چھین کر حاصل کر لو۔ اگر تم نے اس معاملہ میں ذرہ برابر بھی کوئی کوتاہی کی اور کچھ حاصل نہ کیا تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور تمہارے دشمنوں کے دلوں میں تمہارا رعب پیدا ہونے کے بجائے تم سے مقابلہ کرنے کی ہمت اور جرأت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے تم اپنے آپ کو کسی ایسی رسوائی میں پڑنے سے اس سرکش (راڈرک) کو اپنے زیر کر کے بچا لو جو اس قلعہ بند شہر سے تمہارے مقابلے کے لیے نکلا ہے۔ اگر تم بہادری کر کے اپنی جانوں پر

Marfat.com

کھیل جاؤ تو کامیابی تمہارے قدم چومنے کے لیے فرش راہ ہے اور کامرانی تمہارے استقبال کے لیے کھڑی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ میں تمھیں ایسی کوئی دعوت نہیں دیتا جس کو میں خود قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ میں تمھیں ایسے مقام پر لایا ہوں جہاں سب سے سستی چیز انسانوں کی جانیں ہیں، اور سب سے پہلے میں اپنے آپ سے شروع کرتا ہوں کہ اپنی جان اللہ کے راستہ میں قربان کرنے کے لیے نکلوں۔ اس بات کا اچھی طرح یقین رکھو کہ اگر تھوڑی دیر کی تکلیف اٹھا لو گے تو اس کے بدلہ میں ایک زمانہ دراز اور مدت طویل تک عیش و راحت اٹھاؤ گے اور آئندہ آنے والی نسلیں تمھیں اچھے نام سے یاد کریں گی۔ تم اپنی جانوں کو میری جان سے زیادہ قیمتی نہ بناؤ۔ تمہارا اور میرا حصہ برابر ہے۔ اس وقت جو کچھ جزیرہ میں ہے وہ سب کچھ تمہارا ہے۔ یہیں وہ حوروش اور خوبصورت یونانی لڑکیاں ہیں جو موتی اور مرجان سے مزین، سنہرے لباس میں ملبوس اور امراء اور ملوک کے محلات کی زینت اور ان کے لیے سامان عیش ہیں۔ امیر المؤمنین ولید بن عبدالملک نے تم جیسے بہادروں اور حوصلہ مندوں کو اس لیے منتخب کیا ہے کہ تم اس جزیرہ کے تاجداروں اور رئیسوں کے داماد بن جاؤ۔ یہاں کے بہادروں اور شہ سواروں سے دو دو ہاتھ کر لو۔ تم اس جزیرہ میں اللہ کے کلمہ اور اس کے دین کو سر بلند کرنے کے لیے آئے ہو اور تم اس کا اجر عظیم پاؤ گے۔ یہاں کا مال غنیمت صرف اور صرف تمہارے ہی واسطے ہے۔ تم جس عزم پر استوار اور جس ارادے پر پختہ اور مضبوط رہو گے، اللہ اس میں تمھاری مدد اور نصرت کرے گا اور دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں تمہارا نام باقی رہ جائے گا۔''

یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں تمھیں جو دعوت دے رہا ہوں اس کو قبول کرنے والا سب سے پہلا شخص میں ہی ہوں۔ مجھے تم لوگ جو کچھ کرتے دیکھو اسی کی پیروی اور اتباع کرو۔ اگر میں حملہ کروں تو تم بھی ٹوٹ پڑو، اگر میں رک جاؤں تو تم بھی ٹھٹھک کر رک جاؤ۔ جنگ کے میدان میں سب مل کر ایک شخص واحد کی ہیئت اختیار کر لو۔ جس وقت دونوں فوجیں آپس میں برسر پیکار ہوں اور تلواریں تلواروں سے ٹکرائیں اس وقت میں خاص طور پر اس سرکش (راڈرک) کی طرف رخ کروں گا۔ اگر میں اس سرکش اور اللہ کے باغی کا کام تمام کرنے کے بعد مارا جاؤں تو میں تمہارے کام کو پورا کر جاؤں گا۔ تم لوگ بہادر اور عقل مند ہو، اس کے بعد تم اپنے کاموں کو خود سنبھال سکتے اور ان کا انتظام کر سکتے ہو۔ اگر میں اس تک پہنچنے سے قبل ہی کام آ جاؤں اور دشمن کے ہاتھوں مارا جاؤں تو تم خود میرے اس عزم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دینا اور اس پر شدت سے حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دینا اور اس جزیرہ کی فتح کو مکمل کر لینا، کیونکہ اس کے قتل کے بعد ان کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی اور ان کے ارادے کمزور اور نحیف ہو جائیں گے۔

Marfat.com

''یہ بات بھی نہایت غور اور توجہ سے سن لو کہ اگر میں مارا جاؤں تو کچھ غم نہ کرنا، رنج و ملال کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دینا اور نہ ہی آپس میں الجھ کر ایک دوسرے سے لڑنے لگنا، ورنہ تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی اور دشمنوں کے لیے تم پیٹھ پھیر دو گے اور قتل یا گرفتار ہو کر برباد اور پامال ہو جاؤ گے۔ خبردار! خبردار! پستی اور ذلت کو قبول نہ کرنا اور اپنے کو دشمنوں کے حوالے نہ کر دینا۔ تمہارے لیے مشقت اور جفاکشی کے ذریعہ شرف وعزت، راحت و آرام اور حصول شہادت کے ذریعہ ثواب آخرت مقدر کیا گیا ہے۔ ان سعادتوں کے حصول کے لیے آگے بڑھو۔ اگر تم نے یہ سب کچھ کر لیا تو اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان تمہارے ساتھ ہے۔ وہ تمہارے آئندہ ہونے والے بڑے خسارے سے اور کل اپنے جاننے والے مسلمانوں کے درمیان برے لفظوں سے یاد کیے جانے سے بچائے گا۔ پس اب میں حملہ آور ہوں گا اور اس پر چھا جاؤں گا۔ میرے حملہ آور ہوتے ہی بہادرو تم بھی بھوکے باز کی طرح دشمن پر جھپٹ پڑنا کیونکہ اسی میں قوموں کی زندگی مستور اور مخفی ہوتی ہے۔''

(الامامۃ والسیاسۃ: ۶۰/۲، نفح الطیب: ۱۱۲/۱)

یہ تقریر کیا تھی؟ ایک بارود تھا جس نے فوج میں عزم و ہمت، جوش وخروش اور فتح وظفر کا جذبہ کچھ اس طرح پیدا کیا کہ پوری فوج مرنے مارنے پر تیار ہو گئی۔ ان میں سے بعض نوجوان آگے بڑھے اور انہوں نے اپنے جرنیل کی جوابی تقریر میں اپنے عزم و ہمت اور اطاعت وانقیاد کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''اگر اب سے پہلے ہمارے دلوں میں کوئی بات اس کے برخلاف تھی جس کا آپ نے اپنی تقریر میں اظہار فرمایا ہے تو یقین جان لیں کہ اب ہم نے اس کو اپنے دلوں سے یک قلم دور کر دیا ہے۔ اب آپ قدم بڑھائیں پوری فوج کے قدم بقدم آپ کے ساتھ اور آپ کے حکم کے تابع ہیں۔ اس بارے میں آپ کوئی فکر نہ کریں۔ ہم اللہ کے دین کی خاطر اپنے جسم کے خون کا ایک ایک قطرہ بہانے کے لیے تیار ہیں۔''

طارق بن زیاد کی اس تقریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ چنانچہ اس تقریر کے بعد فوج کے نہ صرف نوجوانوں بلکہ بڑی عمر کے لوگوں میں بھی ایک ولولۂ خاص اور جذبۂ اخلاص پیدا ہوا جس سے ہر شخص عزم و ہمت اور بہادری و جانبازی کا پیکر بن گیا۔ اسی جوش وخروش میں انہوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ جب سپیدۂ صبح نمودار ہوا اور عروس شمس نے حجلۂ مشرق سے جھانکا تو طبل جنگ بجایا گیا۔ یہ ۲۷ رمضان المبارک سنہ ۹۲ھ مطابق ۱۹ جولائی سنہ ۷۱۱ء کی مبارک صبح تھی جب یہ دونوں فوجیں حق و باطل کا فیصلہ کرنے کے لیے میدان جنگ میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں جن کی تعداد میں قریباً ایک اور نو کی نسبت تھی، لیکن ایک طرف ایمان کی روشنی تھی تو دوسری طرف کفر کا اندھیرا، ایک طرف دین اسلام کی سربلندی اور کلمۃ اللہ کی سرفرازی تھی جب کہ دوسری طرف تاج وتخت کا تحفظ اور وطن کی مدافعت۔

Marfat.com

اسی واقعہ کے بارے میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ نے پیام مشرق میں کہا ہے

طارق چو برکنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا ست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم؟
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

طبل جنگ بجنے کے بعد مسلمانوں نے اپنی صفیں درست کیں۔ ایک تو ان کی صفیں ہی کتنی تھیں؟ لیکن ان کا جرنیل ایک منجھا ہوا اور مختلف جنگوں کے نشیب و فراز سے آشنا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیا کے ایک نہایت تجربہ کار اور بہادر جرنیل موسیٰ بن نصیر کا تربیت یافتہ تھا۔ اس نے نہایت اچھے اور احسن طریق سے اپنی فوج کی صفوں کو درست کیا۔ دوسری طرف راڈرک نے بھی میدان جنگ میں فوج کی صفیں درست کیں۔ وہ فوج کے اندرونی حالات سے یک قلم ناواقف تھا۔ اس وجہ سے اس نے شہزادوں کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہوئے میمنہ اور میسرہ ان کے سپرد کر دیا اور فوج کے قلب کی کمان خود اس کے اپنے ہاتھ میں تھی۔ وہ بڑی شان و شوکت عظمت و جلال سے قلب فوج میں دو گھوڑوں کے تخت رواں پر سوار موتی، یاقوت اور زبرجد سے مرصع چتر شاہی کے زیر سایہ قیمتی لعل و جواہر سے مزین لباس میں ملبوس کھڑا تھا۔ اس کے جلو میں مسلح پاسبان اور زرق برق لباسوں اور خیرہ کن ہتھیاروں سے آراستہ و پیراستہ جاگیردار اور امراء صف آرا تھے۔

طارق بن زیاد کی فوج میں یہ غرور و نخوت اور ظاہری عظمت و شان نہ تھی۔ یہاں یہ شان تھی کہ طارق اپنے ساتھیوں کے ساتھ فوج میں آگے آگے تھا۔ اسلامی لشکر زرہیں پہنے، سفید عمامے باندھے، ہاتھوں میں عربی کمانیں لیے، کمروں میں تلواریں حمائل کیے اور بغلوں میں نیزے دبائے ہوئے تھے۔ راڈرک نے جب اسلامی لشکر کو ایک نظر دیکھا تو اس کو اس ہیئت میں دیکھتے ہی پکار اٹھا:

"خدا کی قسم! یہ تو وہی صورتیں ہیں جن کو ہم اپنے شہر کے بیت الحکمت میں دیکھ چکے ہیں۔"

مسلمانوں کی اس ہیئت نے بھی اس کے اوسان خطا کر دیے لیکن کیا کرتا کیونکہ اب جنگ کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے لشکر کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ مسلمان تو پہلے ہی تلواریں سونتے مقابلہ کرنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ چنانچہ اندلسیوں کی حملہ میں پیش قدمی کے لیے مسلمان بھی آگے بڑھے اور دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ ایک طرف ایک لاکھ انسانوں کا جنگل جو ہر طرح کے جدید اور قیمتی اسلحہ سے آراستہ تھا۔ اس میں ملک کے نامور قائد، جرنیل، شہ سوار، بہادر اور جاگیردار اپنی اپنی فوجوں کے قائد اور سرخیل بن کر میدان میں موجود تھے۔ اپنی سرزمین تھی جس کی حفاظت کرنی تھی۔ مادر وطن کی حفاظت

Marfat.com

تو ان کا جزو ایمان تھا، اور اگر چہ اندلس گزشتہ تین سال سے قحط کی مصیبت میں مبتلا تھا، لیکن سامان رسد کا وافر ذخیرہ فوج کے ساتھ تھا، اور وہ سارے ذرائع موجود تھے جو فوج میں آسانی پیدا کرتے ہیں۔ پھر یہ ہے کہ کوئی کمانڈر اور جرنیل نہیں بلکہ شہنشاہ راڈرک خود فوج کی کمان کر رہا تھا۔ وہ خود قلب فوج میں موجود تھا ہر جرنیل اور کمانڈر پر اس کی نظر تھی، لیکن اس کی بدقسمتی یہ کہ ایک لاکھ کی فوج میں میمنہ اور میسرہ یعنی دائیں اور بائیں بازوؤں کے جرنیلوں نے طارق ابن زیاد سے خفیہ طور پر عہد و پیمان کر لیے تھے۔ علاوہ ازیں امراء اور جاگیرداروں کا بھی ایک بہت بڑا طبقہ بادشاہ سے ناخوش تھا، اور جو عام کسان فوج میں آئے تھے وہ بھی بادشاہ کی پالیسیوں سے بددل تھے۔ پھر اندلس کا شہنشاہ راڈرک غاصب سلطنت تھا۔ سلطنت کے حقیقی وارث اور دعویدار لشکر کے میمنہ اور میسرہ کے کمانڈر تھے، اور یہ سمجھ کر کہ یہ حملہ آور مال غنیمت لے کر واپس جائیں یا یہیں سکونت پذیر ہوں، وہ ان کی سرسبز و شاداب جاگیروں سے انھیں محروم نہیں کریں گے، وہ حملہ آوروں سے عہد و پیمان کر چکے تھے۔ یہودیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی بادشاہ سے ناراض تھی کیونکہ جو لوگ اصطباغ لینے سے انکار کرتے تھے۔ ان کے خلاف وحشیانہ قسم کے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے۔ ان سختیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مسلمانوں نے اندلس پر چڑھائی کی تو یہودیوں نے مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ جن شہروں کو عرب فتح کر چکے تھے ان کی حفاظت کے لیے سپاہ کا کام دیا اور جن شہروں کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، ان کے دروازے ان کے لیے کھول دیے۔ (مقریزی: ۲۸۰/۲) چنانچہ اس لشکر میں جتنے یہودی شامل تھے، وہ اندر سے راڈرک کے خلاف اور مسلمانوں کے حامی تھے۔

اسی طرح اس لشکر میں جتنے بھی غلام تھے، وہ بھی اندر سے مسلمان فوج کے حامی تھے، اس لیے کہ قوطی حکومت میں ان کی حالت بڑی خستہ اور ناگفتہ بہ تھی، اور انھیں عیسائیت کا علم بھی سطحی تھا، اس لیے اپنی قسمت کو مسلمانوں کے ساتھ وابستہ کرنے میں ان کو آزادی کے علاوہ جو اور فوائد حاصل ہونے تھے، ان کے مقابلے میں ان کے لیے عیسائیت کوئی وقعت اور حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے جب مسلمانوں کو اندلس میں مختلف محاذوں پر فتح ہوئی تو ان غلاموں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور ملک میں جو بت پرست تھے، انہوں نے غلاموں کی پیروی کرتے ہوئے اسلام کی آواز پر لبیک کہا اور حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(تاریخ مسلمانان اندلس، ڈوزی: ۴۴/۴)

یہ تو ایک لاکھ عیسائی لشکر کا حال تھا جو "تحسبهم جميعاً وقلوبهم شتى" کی مثال تھا۔ اس کی ایک لاکھ فوج میں صرف چند ہزار شخص بادشاہ کے حامی اور مددگار تھے۔ دوسری طرف صرف بارہ ہزار کا اسلامی لشکر تھا جو اس ملک میں بالکل پردیسی تھا۔ ان کے پاس نہ تو سواری کے لیے زیادہ گھوڑے تھے اور نہ ہی لڑنے کے لیے بہترین اور قیمتی سامان جنگ تھا۔ غذائی رسد بھی ان کے پاس نہ ہونے کے برابر تھی بلکہ انھیں انھی دشمنوں سے چھین کر اپنے لیے دوسرے وقت کی رسد اور خوارک مہیا کرنی تھی۔ ملک اجنبی، مقام اجنبی، زبان

Marfat.com

اجنبی اور راستے نہ معلوم تھے۔ پھر وہ فیصلہ کن عزم کے ساتھ اپنی کشتیاں جلا چکے تھے۔ اب انھیں انسانوں کے اسی جنگل کو کاٹ کر اپنے لیے راستہ بنانا تھا۔ انھیں اب اسی ملک میں اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام گزارنے تھے، فاتح بن کر یا مفتوح بن کر، لیکن وہ عیسائیوں کے مفتوح کسی صورت بننا نہیں چاہتے تھے، اس میں ان کے لیے دین و دنیا کی رسوائی تھی، لہٰذا وہ اس ہمت و استقلال سے اس عزم و یقین کے ساتھ ایک آہنی اور سیسہ پلائی دیوار بن کر اس میدان میں کھڑے تھے کہ یا تو وہ اس ملک اور جزیرے کے مالک بن کر رہیں گے، یا ان کا ہر فرد جام شہادت نوش کر کے اسی زمین کی خاک میں ہمیشہ کے لیے سو رہے گا۔ وہ موت سے ڈرتے نہیں تھے بلکہ انھیں موت ایسے مرغوب تھی جیسے اندلس کے رہنے والوں کو شراب مرغوب تھی وہ:

باللیل رهبان وبالنهار فرسان

''یعنی وہ راتوں کو راہب (عبادت گزار) اور دن میں شہسوار تھے۔''

ان کی زندگی کا مقصد بلکہ اس جنگ کا مقصد دنیا کے تمام فوجی نظاموں کے مقاصد سے مختلف تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو سیلاب کی طرح بڑھے اور موج کی طرح تمام افریقہ پر پھیل گئے۔ افریقہ اور دوسری مفتوح قوموں نے اس سیلاب کی زد میں بھی ظلم و درندگی کی لہروں کو دیکھنا چاہا جو ہمیشہ فوجوں کے طوفان میں اٹھتی رہی ہیں، لیکن ذوق نظارہ کامیاب ہو کر گوشۂ چشم میں چھپ گیا۔ دنیا نے دیکھا کہ یہ بارہ ہزار مجاہدین فوج کے اس دستہ سے ہیں جو مختلف مادی طاقتوں سے ٹکرایا، بڑے بڑے قلعوں سے ٹکر لی، عظیم الشان پہاڑوں کو ٹھوکر لگائی اور بالآخر کرۂ ارض کو اچھال کر رکھ دیا، تاہم نہ تو کسی جھونپڑی کو اجاڑا، نہ کسی گھر کو آگ لگائی اور نہ کسی عظیم الشان محل کو برباد کیا، نہ تمدن کی یادگاریں مٹائیں اور نہ ہی تہذیب کے آثار قدیمہ منہدم کیے۔ یہ لوگ وہ تھے جو فاتحانہ جوش میں سیلاب کی طرح بڑھے لیکن جب ممالک مفتوحہ میں داخل ہوئے تو گرداب کی طرح سمٹ گئے۔ وہ اللہ کی راہ میں حق و صداقت کے عشق میں اللہ کا نام لے کر اٹھے اور قوموں اور فوجوں کے بے شمار نسلی اور ملکی مقصد کی جگہ صرف ایک مقصد اپنے سامنے رکھا:

﴿لتكون كلمة الله هي العليا﴾

''تا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ سر بلند ہو۔''

جب دونوں طرف سے زور کا رن پڑا اور گھمسان کی جنگ شروع ہوئی تو یہ بارہ ہزار سربکف مجاہد ایک لاکھ ٹڈی دل فوج پر بھاری ہوئے۔ عیسائی لشکر کے میمنہ اور میسرہ پر زوردار حملہ ہوا تو کماندار شہزادے پسپا ہونا شروع ہو گئے یہاں تک کہ دونوں بازو کمزور ہو گئے اور پھر گاتھ شہزادے حسب معاہدہ گھوڑے بڑھاتے ہوئے طارق بن زیاد سے آ ملے۔ ان شہزادوں کا علیحدہ ہونا تھا کہ دائیں اور بائیں بازو کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور پھر ان کے پیچھے کے سپاہیوں نے اگلی صفوں کو خالی اور اپنے جرنیلوں کو موجود نہ پا کر لڑنے سے انکار کر دیا۔ مگر راڈرک پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ نہایت ثابت قدمی کے ساتھ قلب لشکر میں مقابلہ کرتا رہا۔ یہ لڑائی ۲۷

Marfat.com

رمضان المبارک سنہ ۹۲ھ سے ۵ شوال تک جاری رہی۔ اس جنگ کا فیصلہ طارق بن زیاد کی فیصلہ کن تلوار ہی سے ہوا۔ وہ اس طرح کہ وہ اپنا گھوڑا بڑھائے قلب لشکر میں گھس گیا اور جیسا کہ اس نے اپنی تقریر میں کہا تھا اس کے مجاہدین نے اس کے نقش قدم کی پیروی کی۔ یہ حملہ کیا تھا ایک آہنی طوفان تھا جس میں تلواریں تلواروں سے ٹکرائیں۔ نیزوں کی انیاں انسانوں کے آر پار ہوگئیں۔ اس حملہ نے لشکر کے قلب میں ابتری پھیلا دی اور راڈرک کے سامنے کی گارڈ نے جگہ خالی کر دی اور وہ بالکل غیر محفوظ ہو گیا۔ اب راڈرک کا تخت رواں مسلمانوں کے بالکل سامنے تھا۔ طارق بن زیاد راڈرک کو دیکھتے ہی للکارا اور اس کی طرف یہ کہتے ہوئے جھپٹا کہ عیسائیوں کا بادشاہ یہی ہے۔ طارق تخت رواں تک پہنچا تھا کہ راڈرک اس تیزی سے فرار ہوا کہ مسلمان اس کا تعاقب کرنے کے باوجود اس کو نہ پا سکے۔ کچھ دور آگے جا کر دریا کے کنارے اس کا سفید گھوڑا جس پر یاقوت و زبرجد سے مرصع ساز کسا ہوا تھا، دلدل میں پھنسا ہوا ملا، وہیں پر اس کے ایک پاؤں کا سنہرا موزہ بھی پڑا ہوا تھا جس میں زبرجد، یاقوت اور موتی لگے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں ایک زرتار حلہ جو بیش قیمت جواہرات سے مرصع تھا، اسی کے پاس گرا ہوا تھا۔ راڈرک کہاں گیا؟ مر گیا یا کسی دوسرے ملک میں بھاگ گیا؟ تاریخ کے صفحات اس بارے میں خاموش ہیں، لیکن دریا کے کنارے اس کی جو نشانیاں ملیں ان سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دلدل میں گھوڑے کے پھنس جانے کی وجہ سے اس پر سے اتر کر دریا میں کود گیا ہوگا اور گوڈالیٹ کی طوفانی لہروں نے اس کو اپنی آغوش میں چھپا لیا ہوگا، لیکن مؤرخین کے بیان کے مطابق اس کی لاش بھی کسی کو نہیں ملی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ طارق بن زیاد کی خارا شگاف تلوار نے اس کا سر قلم کر دیا اور پھر اس کے سر کو موسیٰ بن نصیر کے پاس بھیجا گیا، لیکن یہ روایت درست نہیں ہے۔

راڈرک کو فرار ہوتے دیکھ کر ساری فوج کے حوصلے پست ہو گئے، اور بھاگ اٹھے، بھاگتے دشمن کی ایک کثیر تعداد کو مسلمانوں نے اپنی تلواروں پر لے لیا اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ مقولین کی لاشیں ہر طرف میدان میں پڑی تھیں، میدان لاشوں سے ایک خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ اس جنگ میں تین ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا جب کہ دشمن کے مقتولین کی تعداد بے شمار تھی۔ ان میں امراء، متوسط حال اور غلام تینوں طبقوں کے لوگ تھے جو سونے، چاندی اور لوہے کی انگوٹھیوں سے پہچانے جا سکتے تھے۔ مسلمان شہداء کی تکفین و تدفین کے بعد مال غنیمت کو اکٹھا کرایا گیا۔ کچھ قیدی بھی ہاتھ آئے۔ مال غنیمت اور قیدیوں کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا۔ باقی ماندہ عیسائی جدھر منہ اٹھا، فرار ہو گئے اور مختلف شہروں اور قلعوں میں پناہ گزین ہو گئے۔

اسلام کے ان مجاہدین کی فتح کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے اندلس میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔ اب اندلس کا تخت بالکل خالی تھا کیونکہ اس پر بیٹھنے والا بادشاہ مارا جا چکا تھا۔ لہٰذا اب ایک انارکی کی کیفیت پورے ملک میں پیدا ہوگئی۔ جو جس شہر یا قلعہ میں تھا، وہ وہاں کا مالک اور اس کا رکھوالا تھا۔ اب ایک بادشاہ کے بجائے ہر شہر کا الگ الگ بادشاہ تھا۔ ہر گورنر نے اپنے علاقہ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ملک

Marfat.com

تشتت وانتشار کا شکار ہو گیا۔ ان میں ایک گورنر تھیوڈومر (Theodomir) کو زیادہ امتیاز حاصل تھا۔ اس نے بڑی محنت اور جانفشانی سے جزیرہ کے عیسائیوں کی تنظیم کی اور ان کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لی اور اس بات کی پوری پوری کوشش کی کہ کسی طریقے سے وہ اندلس کو اپنے زیر علم لا سکے اور اس انتشار کو پھر اتحاد کی شکل دے سکے۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔ اس جنگ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ عیسائی فوج اس کے بعد پھر کبھی بھی اتنی بڑی تعداد میں جمع نہ ہو سکی، لیکن مسلمانوں کو ایک ایک شہر اور ایک ایک قلعہ کو الگ الگ فتح کرنا تھا، اس لیے ان کو سلطنت اندلس کا شیرازہ بکھر جانے کے باوجود اسپین کے چپہ چپہ کے لیے لڑنا اور ہر شہر کی محافظ فوج اور عیسائی عوام کو زیر کرنا تھا۔

اندلس میں مسلمانوں کی اس فتح سے لوگوں کے حوصلے پست ہو گئے لیکن جب یہ خبر افریقہ میں پہنچی اور مال غنیمت کی کثرت وفراوانی کی داستانیں بھی لوگوں نے سنیں تو ان کے حوصلے بہت بلند ہو گئے۔ اور مسلمانوں کے لیے یہ ایک نیک فال چیز تھی۔ چنانچہ لوگ ذوق وشوق سے جوق در جوق افریقہ سے اندلس پہنچ کر طارق بن زیاد کی فوج میں شریک ہوتے گئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ گوڈالیٹ کی جنگ کی اس فتح نے مسلمانوں کے لیے پورے جزیرہ نما اندلس کو فتح کرنے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ فوج کا مورال اب بہت بلند تھا اور یہ آئندہ کی فتح یابیوں اور کامرانیوں کی ایک بہت بڑی دلیل تھی۔ اب وہ یہ سمجھنے لگے کہ ہم جوں جوں آگے بڑھیں گے فتح وکامرانی ہمارے قدم چومنے کے لیے راہ میں آنکھیں بچھائے گی۔ اور یہ خیال ان کا بہت حد تک درست بھی تھا۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن اثیر: ۴/۴۴۴، طبری حوادث سنہ ۹۲ھ، ابن خلدون: ۴/۱۱۷، نفح الطیب: ۱/۱۰۶، افتتاح الاندلس ابن القوطیہ: ص ۳ تا ۹، ابن خلکان: ۳/۱۸ تا ۲۷، اخبار الاندلس ترجمہ خلیل الرحمٰن: ۱/۲۰۹، ۲۲۴، تاریخ مسلمانان اندلس، ڈوزی: ۴/۴۴-۴۸)

عیسائی مؤرخین نے لکھا ہے کہ طارق بن زیاد کی اس فتح کے وقت قوطی قوم کے حکمرانوں کے قدیم اخلاق واوصاف میں زوال اور انحطاط آ چکا تھا اور اس کی جگہ عیش پسندی اور بداعمالی نے لے لی تھی، چنانچہ انہوں نے اسلامی حکومت کو گویا ایک قہر خداوندی اور عذاب الٰہی سمجھا جو گمراہ اور بداعمال لوگوں پر بطور عقوبت اور سزا نازل ہوا تھا۔ چنانچہ سینٹیونی فاس نے ۷۴۵ء میں اپنے مکتوب نمبر ۶۲ میں یوں لکھا ہے:

''پس ایسا ہی ہوا۔ اسپین اور جنوبی فرانس اور برگنڈی کے باشندوں کے حق میں جنہوں نے خدا کی اطاعت سے اعراض اور روگردانی کی تھی یہاں تک کہ خدائے قادر نے جو ان کے گناہوں کو دیکھ رہا تھا، ان پر عذاب بھیجا اور یہ عذاب قانون الٰہی سے لاعلمی کی صورت میں اور عربوں کی شکل میں نازل ہوا تا کہ ان کو نیست ونابود کر دے۔''

وہ پھر مزید لکھتا ہے:

Marfat.com

''یہ ہماری گنہگاری کا نتیجہ ہے کہ اسپین کی حکومت عربوں کے قبضہ میں آ گئی۔''

اسی طرح الوار لکھتا ہے:

''میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ عذاب ہم پر ہمارے ہی قصور کے سبب سے نازل ہوا۔ ہاں بھائیو! یہ ہماری سہل انگاری، ہماری ناپاکی، ہمارے تلون اور ہمارے ہی اخلاق کی خرابی ہے جس نے ہمیں مصائب سے دو چار کیا ہے۔ پس خدا نے جو انصاف کو عزیز رکھتا ہے اور جس کا چہرہ عدل دکھلاتا ہے، ہمیں جانور کے حوالے کر دیا تا کہ وہ ہم کو نگل جائے۔'' (ص ۵۳۱)

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ مسلمانان اندلس، ڈوزی: ۱/۱۵۔۲۰،۲/۴۴۔۴۶ وغیرہ)

جنوبی اندلس کے چند اور شہروں پر قبضہ:

کچھ روز آرام کرنے کے بعد طارق بن زیاد نے اندلس کے جنوب مغربی علاقے کا رخ کیا ان اطراف میں گاتھ شہزادوں کے ہمدردوں کی تعداد زیادہ تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو کامیابی میں آسانی ہوئی۔ چنانچہ سب سے پہلے صوبہ قادس کے مشہور شہر شزونہ (Sidonia) کی شہر پناہ کے نیچے پہنچا۔ مسلمانوں کی فوج کو دیکھ کر اہل شہر محصور ہو گئے۔ لیکن چند دنوں کے محاصرہ کے بعد بالآخر انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔

اس کے بعد شہر قرطبہ سے مغرب میں ایک شہر حصن المدور (Almadovar) کی طرف گئے وہ بھی قبضہ میں آ گیا، کیونکہ مسلمانوں کی بہادری اور جرأت کا رعب عیسائیوں کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا۔ پھر مجاہدین کا یہ لشکر صوبہ اشبیلیہ کی طرف مڑ گیا۔ اشبیلیہ سے ۲۵ میل مغرب میں شہر قرمونہ (Carmona) آباد تھا وہ بھی زیر نگین ہو گیا۔ اس کے بعد مسلمان اسپین کے تاریخی شہر اشبیلیہ کی دیواروں کے نیچے پہنچ گئے۔ شہر والوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ جزیہ دینا قبول کر لیا۔ پھر معلوم ہوا کہ راڈرک کی فوج کے کچھ شکست خوردہ سپاہی استجہ (Astija) (Ecija) میں جمع ہوئے ہیں۔ یہ شہر بھی صوبہ اشبیلیہ ہی میں واقع ہے۔ طارق کو جب سپاہیوں کے اکٹھا ہونے کی یہ خبر ملی تو اس نے اس شہر کا رخ کیا۔ ان لوگوں نے شہر والوں سے مل کر مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ گوڈالیٹ کے میدان کے بعد ابتدائی فتوحات کے سلسلہ میں اس سے بڑی اور سخت کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ طارق شہر کا محاصرہ کیے رہا۔ ایک روز اتفاقاً شہر والوں میں سے ایک شخص کسی ضرورت سے دریائے شنیل (The Xenil) کے کنارے آیا۔ استجہ اس دریا کے بائیں کنارے آباد ہے۔ طارق کی نظر اس پر پڑی۔ وہ شخص دریا میں اتر چکا تھا۔ طارق نے جست مار کر پانی ہی میں اس کو دبوچ لیا اور اس کو دریا سے نکال کر چھاؤنی میں لے آیا۔ شکل و شباہت سے وہ معززین شہر میں سے معلوم ہوتا تھا۔ طارق نے جب اسے کریدا اور مختلف قسم کے سوالات اس سے کیے تو معلوم ہوا وہی اس شہر کا والی ہے۔ طارق نے اس سے اپنی منشا کے مطابق شرطیں قبول کرائیں۔ جزیہ کی رقم مقرر ہوئی اور شہر کے دروازے کھل گئے اور مسلمان فوج

Marfat.com

فاتحانہ طور پر اس شہر میں داخل ہوگئی۔ یہ گورنر جب تک زندہ رہا ان شرائط کا پابند رہا۔

(ابن اثیر: ۴/۴۴۵، نفح الطیب: ۱/۱۲۲)

مؤرخین نے لکھا ہے کہ استجہ میں مقیم بیٹھے اور شیریں پانی کی قلت تھی۔ طارق بن زیاد نے شہر میں پانی پہنچانے کا انتظام کیا۔ وہ یہ کہ استجہ سے چار میل کے فاصلہ پر ایک دریا بہتا تھا طارق اس سے نہر نکال کر شہر میں لایا۔ وہ نہر ''عین الطارق'' کے نام سے موسوم ہوئی۔ (ملاحظہ ہو مجموعہ اخبار اندلس: ص ۹)

استجہ کے مقابلہ میں اندلسیوں کو بڑی امیدیں تھیں کہ ہم مسلمانوں کو شکست دے کر اپنے ملک کو محفوظ کرالیں گے لیکن استجہ کی فتح نے ان کی ان امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اب اندلس کے امراء، جاگیردار اور عوام اپنے مستقبل کی امیدوں سے مایوس ہوگئے اور ان میں اس قدر خوف و ہراس پیدا ہوگیا اور ان کے حوصلے اس قدر پست ہوگئے کہ عوام میدانی علاقوں کی آبادیوں کو چھوڑ چھاڑ کر پہاڑی علاقوں میں چلے گئے اور امراء اور جاگیردار اپنے قیمتی ذخیروں کو لیے طلیطلہ میں جا کر پناہ گزین ہوگئے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس کی مضبوط فصیل اور شہر پناہ شاید ان کی اور ان کے مال و دولت کی حفاظت کر سکے۔

کاؤنٹ جولین کا ایک مشورہ:

ان تمام فتوحات میں کاؤنٹ جولین مسلمانوں کے ساتھ رہا۔ اگرچہ اس نے خود کسی لڑائی میں حصہ نہیں لیا لیکن دلیل راہ کے طور پر مسلمانوں کی راہ نمائی کرتا رہا اور وقتاً فوقتاً ان کو مفید مشورے بھی دیتا رہا۔ چنانچہ کاؤنٹ جولین نے طارق بن زیاد کو استجہ کی فتح کے بعد مشورہ دیا کہ اس وقت اندلسیوں پر رعب چھایا ہوا ہے۔ ان کے حوصلے پست ہوگئے ہیں۔ اب ان کے لیے کسی بڑی فوج کی ضرورت نہیں۔ فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے مختلف صوبوں میں پھیلا دیے جائیں۔ وہ لائق اعتماد راہ نما اور گائیڈ ان دستوں کے ساتھ کر دے گا جو راہ کی دشواریوں اور صعوبتوں کو ان کے لیے آسان کر دیں گے اور مختلف مقامات کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائیں گے۔ اور خود طارق بن زیاد فوج لے کر دار السلطنت طلیطلہ پر حملہ کر دے تاکہ اس سے قبل کہ اندلسی آپس میں مل کر کوئی متحدہ محاذ بنائیں یا کسی کو راڈرک کا جانشین منتخب کریں، اور ان میں کوئی شیرازہ بندی پیدا ہو، انھیں اس تشتت و انتشار کی حالت میں زیرنگین کرلیا جائے اور مختلف صوبوں کے اہم مرکزوں اور دار الحکومتوں پر قبضہ کرلیا جائے۔ اس وقت جب کہ اندلسی سراسیمگی اور پریشانی کی حالت میں ہیں، یہ قبضہ نہایت آسان ہے۔

طارق بن زیاد ایک نہایت منجھا ہوا اور تجربے کار جرنیل تھا۔ اسے کاؤنٹ جولین کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ چنانچہ اس نے ایک طرف تو ان فتوحات کی تفصیلات موسیٰ بن نصیر کے پاس لکھ بھیجیں اور دوسری طرف عملی قدم اٹھانے کے لیے استجہ کو اپنا صدر مقام اور ہیڈ کوارٹر قرار دیا، اور یہاں سے فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے

Marfat.com

تیار کر کے مختلف اہم شہروں قرطبہ، غرناطہ، مالقہ اور تدمیر وغیرہ کی طرف بھیجے، اور خود فوج لے کر دارالسلطنت طلیطلہ روانہ ہو گیا۔ طارق نے نہایت سمجھ سوچ کر یہ اسٹریٹجی تیار کی۔

موسیٰ بن نصیر کا اختلاف:

طارق بن زیاد نے موسیٰ کو جو خط لکھا تھا، جس میں اندلس میں پیش قدمی کی اجازت طلب کی تھی اس اثناء میں افریقہ سے اس کا جواب آ گیا۔ بدقسمتی سے موسیٰ نے اپنے جواب میں طارق کی تجویز سے اتفاق نہ کیا اور اس نے طارق کو پیش قدمی جاری رکھنے سے روک دیا اور لکھا کہ جہاں ہو وہیں رک جاؤ کیونکہ میں جلد ہی امدادی لشکر لے کر اندلس آ رہا ہوں۔ میں خود حالات کا جائزہ لوں گا۔ اگر مناسب ہوا تو پیش قدمی شروع کی جائے گی۔ طارق اس جواب سے نہایت پریشان ہوا کیونکہ طارق اندلس کے موجودہ حالات سے پوری طرح مطمئن تھا جب کہ موسیٰ ان حالات سے بے خبر ہو کر پیش قدمی روک رہا تھا۔ اس وجہ سے طارق گورنر افریقہ کے اس حکم پر عمل کرنے کے لیے تیار نہ ہوا اور اس نے اس خیال سے پیش قدمی جاری رکھی کہ جب موسیٰ آئے گا تو اس کو صورت حال سمجھا کر مطمئن کر دیا جائے گا۔ چنانچہ طارق اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتا گیا اور اس نے کئی اور چھوٹے بڑے شہر فتح کر لیے، لیکن گورنر افریقہ موسیٰ بن نصیر کو طارق کی یہ حکم عدولی سخت ناگوار گزری اور اسی حکم عدولی کے جوش انتقام میں اس نے آگے چل کر طارق کی سیاسی زندگی کو تباہ کر دیا جو کہ موسیٰ کی ایک سخت غلطی تھی لیکن شاید اسی کے بدلہ میں خود موسیٰ کی نہ صرف سیاسی زندگی بلکہ عام سماجی زندگی بھی ختم ہو گئی۔

طلیطلہ کی طرف پیش قدمی:

باوجود اس بات کے کہ موسیٰ بن نصیر نے طارق کو پیش قدمی سے روکا، طارق نے اپنی مرضی سے پیش قدمی جاری رکھی اور خود فوج کا ایک دستہ لے کر طلیطلہ کو فتح کیا۔ طلیطلہ (Teledo) اس زمانہ میں راڈرک کا دارالسلطنت تھا اسی وجہ سے اس کی بہت اہمیت تھی۔ یہ شہر میڈرڈ (Madrid) سے کوئی ساٹھ میل جنوب مشرق میں سنگ خارا کی ایک پہاڑی پر سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فٹ کی بلندی پر تعمیر ہوا تھا اور وہ تینوں طرف سے دریائے تاجہ (Tagas) کے ایک موڑ سے گھرا ہوا ہے۔ اس شہر کی بڑی فوجی اہمیت تھی۔ ابوالفداء نے اس شہر کی خوبصورتی اور اس کے باغوں کی بڑی تعریف کی ہے اور بقول یاقوت حموی اس شہر کے نواح میں جو اناج پیدا ہوتا تھا وہ گلے سڑے بغیر ستر سال تک کام دے سکتا تھا، اور یہاں کی زعفران اعلیٰ قسم کی ہوتی تھی۔

طلیطلہ ہی کا شہر تھا جس میں شاہ راڈرک اور سبتہ (Sebuta) کے کاؤنٹ جولین کی بیٹی فلورنڈا (Florinda) کی روایتی داستان شروع ہوئی جو بعد میں مسلمانوں کے فتح اندلس پر منتج ہوئی۔ دریائے تاجہ (Tagas) کے کنارے پر ایک جگہ (جواب تک بتائی جاتی ہے) وہ غسل کر رہی تھی کہ قوطی بادشاہ کی اس پر نظر

Marfat.com

پڑی اور وہ اس پر عاشق ہو گیا۔ طارق بن زیاد نے سنہ ۹۲ھ/سنہ ۷۱۱ء میں اس شہر پر حملہ کیا لیکن اس کو بالکل خالی پایا۔ یہاں صرف چند یہودی رہ گئے تھے جنہیں طارق نے اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ بعد میں جلد ہی وہ فوج بھی اس سے آملی جسے اس نے غرناطہ اور مریسیہ (Murcia) کو فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اسی طلیطلہ کے بارے میں مسلمان مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہاں طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کی باہمی ملاقات ہوئی۔ عرب سردار یہاں ایک قلیل عرصہ کے لیے قیام پذیر ہوا اور اس نے اس جزیرہ نما کے شمال کی طرف اپنی چڑھائی جاری رکھی۔ وہ سرقسطہ (Saragossa) تک گیا جسے اس نے فتح کر لیا۔ قریباً تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ طلیطلہ کی فتح کے وقت بے شمار دولت مسلمان حملہ آوروں کے ہاتھ لگی۔ اور یہ بات صحیح بھی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ شہر راڈرک کا دارالحکومت تھا اور اس کی پوری دولت یہیں تھی۔

قرطبہ کی فتح:

قرطبہ کو انگریزی میں (Cardoba) اور جرمن میں (Cordova) کہتے ہیں۔ یہ اس وقت اندلس کے اہم شہروں میں سے تھا۔ راڈرک نے یہیں بیٹھ کر مسلمانوں سے مقابلہ کی تیاریاں کی تھیں۔ طارق بن زیاد نے امیر المؤمنین ولید بن عبدالملک کے ایک تجربہ کار غلام مغیث الرومی کی سرکردگی میں سات سو سواروں پر مشتمل ایک دستہ اس کی فتح کے لیے بھیجا۔ مغیث دریائے شقندہ کے کنارے ترائی کی جھاڑیوں میں چھپ گیا اور اپنے جاسوسوں کو تحقیقات کے لیے شہر کی طرف بھیجا۔ وہ ایک چرواہے کو پکڑ لائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرطبہ کے امراء، رؤسا اور جاگیردار شہر کو چھوڑ کر طلیطلہ چلے گئے ہیں۔ شہر کا والی صرف چار سو سپاہیوں اور تھوڑے سے شہریوں کے ساتھ شہر کی حفاظت کے لیے شہر میں رہ گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ شہر کی فصیل بڑی مستحکم، سنگین اور اچھی خاصی بلند ہے، لیکن یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مقام پر جہاں انجیر کا درخت لگا ہوا ہے ایک روزن موجود ہے، اس سے اس موقع پر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

چرواہا کی یہ معلومات نہایت مفید ثابت ہوئیں۔ مسلمان رات کی تاریکی میں اسی چرواہے کی راہ نمائی میں قرطبہ کی طرف بڑھے۔ اتفاق سے بارش ہو گئی تھی جس کی وجہ سے زمین نرم اور گیلی ہو گئی تھی، اس لیے گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز اہل شہر اور محافظین شہر کو سنائی نہ دی۔ مسلمانوں نے نہایت خاموشی سے قرطبہ کو عبور کر لیا۔ فصیل کی دیوار دریا کے کنارے سے قریباً تیس گز کے فاصلہ پر تھی۔ مسلمانوں نے پہلے فصیل پر چڑھنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اس روزن اور سوراخ کا پتہ چلایا گیا جو انجیر کے درخت کے قریب تھا اور چرواہے نے اس کے بارے میں پتہ دیا تھا۔ انجیر کے درخت کی شاخیں دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ایک آدمی اس درخت کے سہارے اوپر چڑھ گیا۔ پھر پگڑیوں کی کمند بنا کر چند سپاہیوں کو اوپر کھینچ لیا گیا۔ پھر اس طریقہ اور تدبیر سے فصیل کی دوسری طرف شہر میں اترے۔ دیکھا کہ فصیل کے پاسبان بے خبر سو رہے ہیں۔ ان سپاہیوں نے انھیں قتل کر

Marfat.com

کے شہر کا پھاٹک کھول دیا۔ مغیث پھاٹک کے بالکل سامنے فوج لیے کھڑا تھا۔ پھاٹک کھلتے ہی اسلامی لشکر شہر میں گھس گیا اور شاہی محل کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ تو بالکل سنسان پڑا ہے۔ حاکم شہر چار سو سپاہیوں کے ساتھ ایک قلعہ بند کلیسا سینٹ جارج میں جو شہر کے مغربی کنارہ میں ایک باغ میں واقع ہے، محصور ہو گیا ہے۔ اس کلیسا کے اندر قریب کی ایک پہاڑی سے زمین دوز راستہ سے پانی آتا تھا۔ تین ماہ محاصرہ میں گزر گئے لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مغیث نے اپنے جاسوس ہر جگہ پھیلا رکھے تھے۔ ان میں ایک حبشی غلام رباح اپنی حماقت سے کلیسا کے باغ کے ایک درخت پر چڑھ کر پھل توڑ کر کھانے لگا۔ اہل کلیسا نے اسے پھل توڑتے دیکھ لیا۔ وہ اس کو پکڑ کر قلعہ میں لے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اہل کلیسا نے اس سے قبل کسی حبشی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھے کہ اس نے اپنے جسم پر سیاہی ملی ہوئی ہے، لہٰذا وہ اس کے جسم کی سیاہی کو دھونے کے لیے اس چشمہ پر لے آئے جس میں پانی آکر اکٹھا ہوتا تھا۔ اس طرح سے رباح نے پانی کے اس ذخیرہ اور اس کے راستہ کو دیکھ لیا۔ جب ان لوگوں کو اس کے جسم کی سیاہی کے قدرتی ہونے کا یقین ہو گیا تو انہوں نے اسے کلیسا میں لے جا کر قید کر دیا، لیکن وہ اتفاق سے کسی طرح قید سے نکل بھاگا۔ ساتویں روز وہ مغیث کے پاس پہنچا اور اس نے کلیسا اور اس کے چشمہ کے چشم دید حالات بیان کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نہ کسی ذریعہ اور طریقہ سے مغیث کو کلیسا کے اندر پانی پہنچنے کے راستہ کا سراغ مل گیا۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر اس زمین دوز نہر کے راستہ کو روک دیا۔ نہر کے پانی کو روکنے کی وجہ سے کلیسا کے اندر پانی جانا بند ہو گیا اور کلیسا کے محصورین کو اپنی ہلاکت و بربادی کا یقین ہو گیا، لہٰذا انہوں نے اسلامی لشکر کے امیر سے مصالحت کرنے کی کوشش کی۔

مغیث نے اسلام یا جزیہ قبول کرنے کی شرط پیش کی، لیکن کلیسا والے راسخ العقیدہ (Orthodox) غیور عیسائی تھے۔ انہوں نے ان دونوں شرطوں کو قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے بھی محاصرہ ختم نہ کیا۔ اس گفتگو کی ناکامی کے بعد حاکم شہر کے پائے استقلال میں لغزش پیدا ہو گئی اور وہ ایک رات کلیسا سے تنہا بھاگ نکلا۔ مغیث کے جاسوسوں نے اس کو اطلاع کر دی۔ چنانچہ اس نے اس کے تعاقب میں اپنا گھوڑا سرپٹ ڈال دیا۔ تطلیرہ کے مقام کے قریب حاکم شہر گھوڑے پر نظر آیا۔ دونوں بے تحاشا گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ اتفاقاً حاکم شہر کا گھوڑا ایک تالاب پھاندنے میں ٹھوکر کھا کر گرا اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اب وہ چلنے کے قابل نہ رہے۔ حاکم شہر پریشانی کے عالم میں اپنی ڈھال پر بیٹھ گیا۔ مغیث بجلی کی طرح کوندتا ہوا سر پر آ گیا اور آتے ہی ہتھیار چھین کر اس کو گرفتار کر لیا۔ اہل کلیسا کو جب اس ساری کارروائی کا پتہ چلا اور انھیں علم ہوا کہ حاکم شہر مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہے، انہوں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ اگرچہ اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ بالآخر مغیث نے انھیں زیر کرنے کی سخت سے سخت تدبیر اختیار کی یعنی انھیں ڈرانے دھمکانے کے لیے کلیسا کے گرد آگ جلوا دی جس سے مجبور ہو کر وہ مطیع و منقاد ہو گئے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ کلیسا کے محصورین آخر دم تک قلعہ بند رہے اور انہوں نے مسلمانوں کی

Marfat.com

اطاعت کرنے سے کلیتاً انکار کر دیا، یہاں تک کہ وہ آگ میں جل کر خاکستر ہو گئے۔ اس وجہ سے عیسائیوں میں ان کا بہت احترام قائم ہو گیا اور انھیں ''کلیسائے سوختہ'' کے لقب سے یاد کیا جاتا رہا، اور ان کی یاد منائی جاتی، لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت بالکل غلط ہے کیونکہ لین پول اور اسکاٹ عیسائی ہونے کے باوجود اس واقعہ کا اپنی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں کرتے۔ اگر یہ واقعہ درست ہوتا تو مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے یہ دونوں مستشرقین اس کو اپنی کتابوں میں ضرور ذکر کرتے۔ ان دونوں نے یہ لکھا ہے کہ ان محصورین نے اطاعت قبول کر لی تھی اور معاہدہ کے مطابق کچھ لوگ آزاد کر دیے گئے اور کچھ غلام بنا لیے گئے۔

جونہی یہ قلعہ فتح ہوا مغیث نے فوری طور پر طارق بن زیاد کو اس کی فتح کی خوشخبری بھیجی اور اپنے ساتھ کے سواروں کو اس شہر میں بسا دیا۔ اس کے علاوہ صوبہ قرطبہ کے یہودیوں کو جو عیسائیوں کے ہاتھوں پورے اندلس میں نہایت تلخ زندگی گزار رہے تھے، یہاں آباد ہونے کی دعوت دی۔

اس جزیرہ نما میں عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان نہایت دیرینہ چپقلش اور کشمکش قائم تھی۔ وہ اس موقع پر اپنا انتقام لینے کے لیے مسلمان فاتحین کے بڑے جان نثار اور وفادار دوست ثابت ہوئے اور بڑی تعداد میں آ کر یہاں آباد ہو گئے۔ مغیث نے اپنا قیام قرطبہ کے شاہی محل میں رکھا اور اسی وقت سے قرطبہ اندلس کے ممتاز اسلامی شہروں میں شمار کیا جانے لگا۔ قرطبہ پر مسلمانوں کا حملہ شوال سنہ ۹۲ھ/ اگست سنہ ۷۱۱ء میں ہوا اور محرم سنہ ۹۳ھ/ اکتوبر، نومبر سنہ ۷۱۱ء سے یہ اسلامی شہروں میں شمار کیا جانے لگا۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نفح الطیب: ۱/۲۱۱، ابن اثیر: ۴/۴۴۶، افتتاح الاندلس: ص ۸-۹، مجموعہ اخبار اندلس: ص ۱۰-۱۱-۱۴۰، الادریسی، صفتہ المغرب: ص ۲۰۸-۲۱۴، معجم البلدان: ۴/۵۸-۶۱، القزوینی، آثار البلاد: ص ۳۷۰ وغیرہ)

مالقہ اور تدمیر وغیرہ کی فتح:

طارق بن زیاد نے مالقہ شہر کو فتح کرنے کے لیے جو دستہ بھیجا تھا وہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب و کامران ہوا۔ جب اس دستہ نے شہر پر حملہ کیا تو اہل شہر، شہر کو چھوڑ کر دشوار گزار پہاڑیوں میں جا چھپے تھے۔ مسلمانوں نے یہاں بھی طرح اقامت ڈالی اور فوج کے ایک حصہ کو آگے بڑھایا جس نے شہر البیرہ کا رخ کیا، جہاں آگے چل کر شہر غرناطہ کی بنیاد پڑی اور اس نے بڑا نام حاصل کیا۔ اس شہر کے فتح ہونے کے بعد شہر ریہ بھی فتح ہو کر اسلامی عمل داری میں شامل ہو گیا۔ اور آگے بڑھ کر اسلامی لشکر اریولہ میں قیام پذیر ہوا۔ اس سلسلہ مہم میں اس سمت میں اسلامی دستوں کی آخری منزل یہی تھی کیونکہ یہیں پہنچ کر اس علاقہ کے عیسائی حاکم تھیوڈومر سے صلح کی سلسلہ جنبانی ہوئی۔

تھیوڈومر راڈرک کے زمانہ میں صوبہ اندلس کا گورنر تھا۔ مسلمانوں کے غلبہ حاصل کرنے کے بعد وہ صوبہ مرسیہ میں چلا گیا اور یہاں گاتھک لشکر کو اکٹھا کر کے مسلمانوں سے مقابلہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ریہ میں

Marfat.com

شکست کھانے کے بعد وہ اریولہ میں آ کر پناہ گزین ہو گیا تھا۔ جب مغیث نے اس شہر کا محاصرہ کیا تو تھیوڈومر نے جم کر اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا، لیکن اس کے بہت سے سپاہی کام آ چکے تھے اور لڑنے والوں کی تعداد اس کے پاس زیادہ باقی نہیں رہ گئی تھی، اس نے اب ایک چال چلی کہ مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے اس نے عورتوں کو سپاہیانہ لباس پہنا کر اور اسلحہ سے آراستہ کر کے فصیل کی دیوار پر کھڑا کر دیا۔ دور سے عورتوں اور مردوں میں امتیاز کرنا مشکل تھا، اور ان عورتوں کے آگے بچے کھچے سپاہیوں کو ہتھیاروں سے آراستہ اور مسلح کر کے کھڑا کر دیا گیا، اور پھر صلح کا جھنڈا لہراتا ہوا خود اسلامی لشکر کے کیمپ میں چلا آیا۔ مسلمانوں کو دور سے فوج کی تعداد زیادہ نظر آئی اور وہ فریب میں آ گئے اور آسان شرطوں پر صلح کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ تھیوڈومر نے صلح کے بعد اپنا تعارف کرایا۔ صلح کے بعد جب مسلمان شہر میں داخل ہوئے اور شہر میں عورتوں اور بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد اور سپاہیوں کو ایک قلیل تعداد میں دیکھا تو اس وقت انھیں تھیوڈومر کے فریب جنگ کا اندازہ ہوا، اور آسان شرائط قبول کر لینے پر کف افسوس ملنے لگے، لیکن صلح کی جو شرائط طے پا چکی تھیں، ان پر قائم رہے۔ یہ علاقہ تھیوڈومر کے قبضۂ اختیار میں باقی رکھا گیا اور طارق بن زیاد نے بھی اپنے جرنیل مغیث کے معاہدہ کی توثیق کرتے ہوئے اسے صوبہ مرسیہ کا گورنر تسلیم کیا، اور یہ پورا علاقہ آگے چل کر تھیوڈومر کے نام پر ''تدمیر'' سے موسوم ہوا۔

عورتوں کو مردوں کے کپڑے پہنا کر مسلمانوں کو دھوکہ دینا اور پھر نرم شرائط پر صلح کرنا، یہ مسلمانوں کے ساتھ پہلی دفعہ نہیں ہوا بلکہ اس سے قبل جنگ یمامہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ مسیلمہ کذاب کے قتل کے بعد سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج نے مفرورین کا تعاقب کرنا شروع کر دیا تا کہ دشمن کی پوری طاقت کو تباہ کر دیا جائے اور اس کے سارے کس بل نکال دیے جائیں تا کہ اس کو دوبارہ سر اٹھانے کی ہمت و جرأت نہ ہو سکے۔ مجاعہ بن مرارہ جس کی دلی ہمدردیاں مسیلمہ کذاب کے ساتھ تھیں لیکن اپنی کچھ باتوں کی وجہ سے وہ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ایک قابل اعتماد مشیر بن گیا تھا، جب مسلمان فوج مسیلمہ کے قلعوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھی تو مجاعہ نے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے بنو حنیفہ پر مکمل فتح پا لی ہے اور ان کے جھوٹے نبی مسیلمہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، لیکن مسیلمہ کے ساتھ جو لوگ آئے تھے وہ جلد باز تھے ورنہ بنو حنیفہ کے بہادروں اور جنگ جو لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد تو ابھی یمامہ کے قلعوں میں موجود ہے اور وہاں انہوں نے بہت سا اسلحہ بھی چھپا رکھا ہے۔ یہ بہت سخت جان لوگ ہیں اور کسی بھی وقت قلعوں سے باہر نکل کر مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اگر آپ لڑائی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو کچھ دیر کے لیے مجھے یمامہ میں جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں تا کہ میں ان سے مصالحت کی بات چیت کر سکوں، اس کی یہ پیش کش یقیناً دھوکہ اور فریب تھی۔

سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج بھی چونکہ مسلسل جنگ سے تنگ آ چکی تھی اور یہ جنگ تو ویسے ہی بڑی خون ریز اور خون چکاں ثابت ہوئی۔ مسلمان فوج کا اس میں اس قدر نقصان ہوا تھا کہ اس سے پہلے کسی جنگ

Marfat.com

میں کبھی اتنا نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کا بھی خیال تھا کہ فساد کی جڑ مسیلمہ تو قتل ہو چکا ہے اور بنو حنیفہ پر ہم نے فتح پالی ہے، لہٰذا اب اسی پر اکتفا کیا جائے اور جنگ کا سلسلہ مزید آگے نہ بڑھایا جائے۔ چنانچہ مجاعہ کو یمامہ میں جا کر قلعوں میں بیٹھی ہوئی فوجوں کے ساتھ بات چیت کرنے کی اجازت دے دی گئی، لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اگر بنو حنیفہ مصالحت کے لیے یہ شرط پیش کریں کہ انھیں غلام نہ بنایا جائے تو یہ شرط ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔

مجاعہ نے چونکہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کو پوری طرح اعتماد میں لیا ہوا تھا، اس لیے وہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ سے گفتگو کرنے کے بعد شہر میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا کہ پورے شہر میں ایک ہو کا عالم طاری ہے۔ جہاں کبھی نوجوانوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں بیٹھی رہتی تھیں وہاں سوائے عورتوں اور بوڑھے مردوں کے اور کوئی نہ تھا، اور وہ بھی اپنے گھروں میں سہمے بیٹھے تھے۔ تمام نوجوان قتل ہو چکے تھے یا حدیقۃ الموت سے بھاگ کر دور ونزدیک کی بستیوں میں جہاں سر چھپانے کی جگہ ملی، چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ مجاعہ شہر کی یہ ویرانی دیکھ کر حیران رہ گیا اور پریشان بھی ہوا۔ اس نے عورتوں اور بوڑھے مردوں سے کہا کہ وہ زرہیں پہن کر اور اسلحہ سے مسلح ہو کر قلعہ کی فصیل پر آ جائیں تاکہ مسلمان انھیں دیکھ کر یہ سمجھیں کہ شہر میں مسیلمہ کے سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم مسلمانوں کو مرعوب کر کے اپنی مرضی کے مطابق ان سے شرائط طے کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ سب عورتوں اور بوڑھوں نے مجاعہ کی اس بات پر عمل کیا اور زرہیں پہن کر ہاتھ میں نیزے اور تلواریں لے کر شہر کی فصیل پر بیٹھ گئے۔

سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اور مسلمان جب شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ شہر کی فصیل پر مسلح سپاہی کھڑے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہ حیران رہ گئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ مجاعہ نے درست ہی کہا تھا کہ بنو حنیفہ کی ایک بہت بڑی تعداد بھی شہر میں موجود ہے۔ مجاعہ نے خالد رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں سے کہا: ''میری قوم کے لوگ آپ کی پیش کردہ شرائط پر صلح کرنے کے لیے تیار نہیں، لہٰذا انہوں نے مجاعہ سے کہا کہ ہم آدھا مال واسباب اور آدھے مزرعہ باغات اور آدھے قیدی چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔ تم اپنی قوم کو سمجھاؤ کہ وہ اپنے آپ کو مزید جنگ میں جھونک کر ہلاک نہ کرے، پہلے ہی ان کا بہت جانی اور مالی نقصان ہو چکا ہے۔ وہ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ کر کہنے لگا کہ یہ لوگ آدھے مال واسباب پر رضامند نہیں، البتہ تین تہائی مال اگر آپ چھوڑ دیں تو اس پر میں انھیں راضی کر لوں گا اور وہ آپ سے صلح کر لیں گے۔ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے مجاعہ کی شرط مان لی اور فریقین میں صلح نامہ تحریر ہو گیا۔ صلح کے بعد سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اور مسلمان فوجی جب شہر کے گلی کوچوں میں داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ مجاعہ نے ان سے دھوکہ کیا ہے۔ شہر میں ایک بھی جوان مرد نہ تھا۔ صرف بوڑھے مرد، عورتیں اور بچے تھے جن کو زرہیں پہنچا کر اور اسلحہ دے کر شہر کی فصیل پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اب سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے مجاعہ سے کہا:

''تم نے مجھ سے دھوکہ اور فریب کیا ہے۔''

Marfat.com

مجاعہ نے کہا: ''اگر میں ایسا فریب نہ کرتا تو میری قوم جو پہلے ہی آپ لوگوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو چکی ہے، بالکل ختم ہو جاتی۔ مجھ پر ضروری تھا کہ میں اپنی قوم کو بچاتا اور اس کی صرف یہی ایک صورت تھی جو میں نے اختیار کی اور وہ کامیاب رہی۔''

سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کو اگرچہ مجاعہ پر بہت غصہ تھا لیکن انہوں نے دھوکہ کے باوجود صلح نامہ برقرار رکھا اور مجاعہ کو کچھ نہ کہا۔ اگرچہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس معاہدہ کی سخت مخالفت کی کیونکہ مجاعہ نے دھوکہ دے کر یہ معاہدہ کیا تھا لیکن سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے پھر بھی اس کو توڑنا اسلام کے مزاج کے خلاف سمجھا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصد تھا کہ ایک مسلمان جس طرح خود جھوٹ نہیں بولتا اسی طرح وہ دوسروں سے بھی یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ اس کے ساتھ جھوٹ بولیں گے لیکن اگر کوئی شخص جھوٹ اور فریب سے کسی مسلمان سے کوئی معاہدہ کر لے تو مسلمان پھر اس کو توڑتا نہیں خواہ اسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے۔ ایسے ہی تھیوڈومر نے مسلمانوں سے دھوکہ، جھوٹ اور فریب سے معاہدہ کیا لیکن مسلمانوں نے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کی طرح اس معاہدہ کی پاسداری کی اگرچہ انھیں اس معاہدہ میں کافی نقصان ہوا۔

طلیطلہ کی فتح:

طلیطلہ اندلس کا ایک نہایت مشہور شہر اور شاہان گاتھ کا پایہ تخت تھا۔ طارق بن زیاد کاؤنٹ جولین کے مشورہ سے خود اپنی قیادت میں فوج لے کر طلیطلہ گیا، لیکن اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے اندلس کے امراء اور عام باشندے اس شہر کو بھی خالی کر کے کوہ طلیطلہ کی پشت پر واقع دوسری آبادیوں میں منتقل ہو گئے تھے اور طلیطلہ کے کلیسا کا اسقف اعظم یعنی لاٹ پادری ملک چھوڑ کر روما چلا گیا تھا اور جس قدر نوادرات اور خزائن وہ اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے، لے جا چکے تھے۔ اس لیے طارق بن زیاد جب طلیطلہ پہنچا تو شہر کا دروازہ کھلا ہوا پایا، اور وہ بلا مزاحمت اور بغیر کشت وخون کے اس اہم تاریخی شہر میں داخل ہو گیا۔ طلیطلہ کے قیمتی اور تاریخی ذخائر اگرچہ یہاں سے ہٹائے یا لے جائے جا چکے تھے، پھر بھی طارق کو یہاں مال و دولت کا اتنا بڑا انبار ہاتھ لگا جو اس سے قبل اس ملک میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ اسی میں شاہان اندلس کے چوبیس (۲۴) زرنگار تاج بھی ایک کلیسا میں ہاتھ لگے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اندلس کے بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنے دور حکومت میں اپنا قیمتی تاج کلیسا میں نذر چڑھاتے تھے۔ اس میں ان کا نام، عمر، تاریخ تخت نشینی اور پھر بعد میں تاریخ وفات لکھ دی جاتی تھی۔ اس طرح ایک بہت بڑی تعداد میں نقرئی، طلائی اور لعل و جواہر سے آراستہ ظروف ہاتھ آئے۔ طارق نے مسلمانوں کو اس شہر میں آباد کیا اور ان کے ساتھ ان کے حلیف یہود بھی بسائے گئے اور قوطی شہزادہ اوپاس کو طلیطلہ کا گورنر بنا دیا۔

(نفح الطیب مقری: ۱/۱۱۲_۱۱۳، ابن اثیر: ۴/۴۴۶، ابن قوطیہ: ص ۱۰۰۹، ڈوزی، تاریخ مسلمانان اندلس: ۱/۳۵۲، مجموعہ اخبار اندلس: ص ۱۰_۱۱، ص ۲۴۰ وغیرہ)

Marfat.com

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اسی شہر طلیطلہ کی ایک وسیع عمارت میں جو غالباً کلیسا سے متعلق ہوگی، طارق بن زیاد کو ۱۷۰ تاج (عرب تاریخوں میں ۲۷ اور ۲۴ درج ہے) طلیطلہ کے بادشاہوں کے ملے تھے۔ اسی رعایت سے عربی مؤرخین نے اس عمارت کا نام ''بیت الملوک'' بیان کیا ہے۔ ڈون پاسکل نے اپنے ترجمہ نفح الطیب کے ضمیمہ میں کتاب الامامۃ والسیاسۃ کی ایک عبارت ترجمہ کی ہے جس میں قوطی بادشاہوں کے تاجوں کا ذکر ہے۔ برنرڈ اور ایل ولیشا اپنی کتاب ''عرب اسپین'' کے صفحہ ۳۸۷۔۳۸۹ میں لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۸۵۸ء سے پہلے قوطی بادشاہوں کے تاجوں کے بارے میں یہ بیان یورپ والوں کو عربوں کی ایک گڑھت معلوم ہوتی تھی، لیکن جب صوبہ طلیطلہ کے ایک چھوٹے سے شہر کے قریب ایک مقام سے چند تاج اور کلیسائی اشیاء برآمد ہوئیں تو یقین ہو گیا کہ عربوں نے ان شاہی تاجوں کے بارے میں سچ کے سوا جو کچھ لکھا ہے وہ بہت قلیل ہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں صوبہ طلیطلہ کے ایک چھوٹے سے شہر گواداموور کے قریب ایک ندی گوارازر میں سخت طغیانی آئی۔ پانی اتر گیا تو اس ندی کے کنارے ایک پرانے قوطی گرجا کے کھنڈر میں ایک جگہ مٹی میں کچھ چیزیں چمکتی نظر آئیں۔ سب سے پہلے ایک غریب کسان کی بیوی کی نظر اس پر پڑی، اور اس نے اور اس کے خاوند نے ان قیمتی چیزوں کو وہاں سے نکال لیا۔ ان کو کیا معلوم کہ یہ خزانہ وہ ہے جو بارہ سو سال سے زمین میں دبا پڑا ہے۔ مدرسہ کے معلم نے ان میں سے ایک چیز کسان یا اس کی بیوی کے ہاتھ میں دیکھ لی۔ اس نے حکام کو اطلاع دی اور جو چیزیں سونار کی بھٹی کے حوالہ نہیں ہوئی تھیں وہ بچ گئیں۔ اگر یہ اتفاق پیش نہ آتا تو ساتویں صدی عیسوی کے کلیسائی زیورات کے ایک پورے مجموعہ سے دنیا محروم ہو جاتی۔

یہ تمام قیمتی اشیاء آج کل میڈرڈ (Madrid) اور کلونی (Cluny) کے عجائب خانوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ ان تاجوں پر ایک قوطی بادشاہ کے نام جواہرات کے جڑاؤ حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ ان تاجوں کے ساتھ صلیب بھی تھی جس پر نام کندہ تھا۔ ان کے علاوہ اور کلیسائی اشیاء تھیں جن پر ان کے نذر کرنے والوں کے نام مٹ گئے تھے۔ تھیوڈوسیس کے سونے کے تاج پر ایک عبارت اس مضمون کی کندہ تھی کہ ''اسٹیفانو تھیوڈوسیس'' یہ نذر پیش کرتا ہے۔ بادشاہوں کے تاجوں پر صرف ان کے نام اور ''پیش کش شاہی'' کے الفاظ نقش تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عربی مؤرخین کا یہ بیان کہ نذرانے کے تاجوں پر قوطی بادشاہوں کے نام کندہ تھے۔ یہ بالکل درست ہے کہ اس پر کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے کہ عرب جو لاطینی زبان نہ جانتے تھے انہوں نے ایسی کندہ عبارتوں کی طرف نسبت جو کسی قدر بڑی تھیں، یہ سمجھا کہ جس شخص کا تاج ہے اس پر نام کے علاوہ اس کے خاندانی حالات بھی درج ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ وہ تاج نہ تھے جو قوطی بادشاہ اپنی زندگی میں پہنتے تھے بلکہ یہ تاج وہ تھے جن کو بادشاہ اپنے زمانہ حکومت میں ہی کلیسا کو پیش کراتے تھے۔ ہر پابند مذہب قوطی بادشاہ دو تاج بنوایا کرتا تھا۔ ایک وہ خود پہنتا تھا اور دوسرا کلیسا کو نذر کرتا تھا۔ یہ دستور ایسا تھا جس سے اس امر کی تصریح آسانی سے ہو جاتی ہے کہ اس قسم کی قیمتی چیزیں مسلمانوں کو فتح اندلس کے وقت بہ کثرت کیسے مل سکیں۔'' (تاریخی جغرافیہ، مولوی عنایت اللہ: ص ۳۰۲۔۳۰۳ ملخصاً)

Marfat.com

طلیطلہ چونکہ دارالحکومت بھی تھا اس وجہ سے یہاں شاہی خزانہ بھی تھا۔ طارق بن زیاد نے طلیطلہ کو خالی پا کر مفرور عیسائیوں اور جرنیلوں کے تعاقب میں جہاں طلیطلہ اور جبال الشارات کو عبور کر کے خود فوج لے کر گیا اور ایک قائد محمد بن الیاس مغیلی کی زیر قیادت فوج کا ایک دستہ دوسری سمت روانہ کیا تاکہ طلیطلہ کے شاہی خزانہ کو قبضہ میں لایا جا سکے۔

وادی الحجاز کی فتح:

محمد بن الیاس مغیلی کو طارق نے جس سمت روانہ کیا تھا اس کی راہ میں ایک شہر وادی الحجاز Gudda Lajare پڑتا تھا۔ مغیلی نے اس کو فتح کر لیا اور یہاں کے کلیسا کے بیش قیمت طلائی اور نقرئی ظروف و زیورات بے شمار تعداد میں حاصل ہوئے۔ مسلمانوں نے اس علاقہ کو وادی الحجارہ (پتھروں والا دریا) کا نام دیا شہر میہ یا امامیہ جہاں انیسویں صدی میں زمین سے شاہی تاج برآمد ہوئے تھے، اسی کے آس پاس تھا۔

مدینہ مائدہ کی فتح:

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ طارق عیسائی مفرورین کے تعاقب میں خود ایک فوجی دستہ لے کر گیا طلیطلہ سے قریباً ۵۵ میل سے کچھ آگے مقام قلعۃ النہر کے قریب ایک آبادی میں پہنچا جہاں طلیطلہ کے سب سے زیادہ بیش قیمت خزانے چھپا کر رکھے گئے تھے۔ طارق نے اس شہر پر حملہ کر کے اس کو نہایت آسانی سے فتح کر لیا اور وہ بے شمار مال و دولت اس کے ہاتھ آ گیا جو قوطیوں نے چھپا کر رکھی تھی جس میں تاریخی مائدہ (کھانے کی میز) بھی تھا جس کو یہود سیدنا سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف منسوب کرتے چلے آتے تھے، اور ان کے بیان کے مطابق بعض شاہان اندلس اس کو بیت المقدس کی فتح کے بعد اندلس لائے تھے۔ اور بعض دوسری روایات کے مطابق وہ اندلس کے بادشاہوں ہی میں سے کسی کا بنوایا ہوا تھا۔ یہ تاریخی مائدہ ٹھوس سونے کی میز کی شکل کا تھا۔ یہ مسطح میز ۳۶۵ پایوں پر قائم تھی، اور یہ بیش قیمت جواہرات یاقوت، زبرجد اور موتیوں سے مرصع تھی۔ مسلمان اس میز کی مناسبت سے اس آبادی کو مدینۃ المائدہ (میز والا شہر) کہنے لگے تھے۔

شمالی اندلس کی فتح:

اب طارق نے اندلس کے شمالی علاقہ کی طرف توجہ دی کیونکہ طلیطلہ وغیرہ سے اندلسی اپنے مال و دولت سمیت بھاگ کر شمالی اندلس کی طرف آ رہے تھے چنانچہ طارق بن زیاد نے جب شمالی اندلس کا رخ کیا تو صوبہ لیون میں ہو کر امترقہ یا اشتورقہ پر اسلامی علم لہرایا اور اس کے بعد شمال مغربی گوشہ میں صوبہ جلیقیہ کی سمت بڑھا۔ یہاں بھی بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ لگا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ شمالی اندلس کی یہ مہمات

Marfat.com

مستقل قبضہ کے لیے نہیں بھیجی گئی تھیں بلکہ صرف اس لیے بھیجی گئی تھیں کہ اندلس کے امراء ہر طرف سے سمٹ سمٹا کا طلیطلہ میں آ گئے تھے۔ اور جب یہ شہر بھی حملہ آوروں کی زد میں آ کر فتح ہو گیا تو پھر بہت سے امراء اور متمول لوگ اپنے خزانوں کے ساتھ جلیقیہ چلے گئے تھے۔ اس لیے ان علاقوں میں نہ مسلمانوں کی کوئی آبادی قائم ہوئی اور نہ یہاں ان مہموں کے پائیدار نقوش ثبت ہوئے بلکہ مجاہدین اسلام نے دشمن کی اقتصادی طور پر کمر توڑنے کے لیے ان علاقوں کو تاخت و تاراج کیا اور بے حد و بے شمار مال غنیمت سے لدے پھندے طلیطلہ واپس آ گئے۔ اگرچہ طارق بن زیاد نے وہاں نہ تو اپنے فوجی چھوڑے اور نہ ہی وہاں مسلمانوں کو آباد کیا۔ صرف مال و دولت سمیٹ کر طلیطلہ لے آئے۔ یہ بات بھی اندلس حکومت کے لیے بڑی نقصان دہ ہوئی کیونکہ وہ اقتصادی طور پر مفلوج ہو گئی اور آئندہ ان علاقوں کی فتح مسلمانوں کے لیے آسان ہو گئی۔

مفتوحہ علاقوں کا انتظام و انصرام:

طارق بن زیاد اس کے ساتھیوں کو اندلس میں آئے ہوئے قریباً ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس اثناء میں انہوں نے جنوبی اور وسط اندلس میں بلکہ تھوڑا سا شمالی اندلس میں اپنا کامل اقتدار جما لیا تھا۔ قادس، اشبیلیہ، مالقہ، طلیطلہ وغیرہ کے اہم صوبے جن میں کئی مرکزی شہر جزیرۂ خضراء، غرناطہ، تدمیر، مالقہ اور طلیطلہ وغیرہ آباد تھے، اسلامی حدود و ثغور میں داخل ہو گئے تھے۔ ان صوبوں میں مسلمان اور اندلس کے یہودی جو عیسائیوں سے سخت بغض و عناد رکھتے تھے کیونکہ عیسائی ان پر بڑا ظلم و تشدد کرتے، بسائے جا چکے تھے۔ مختلف صوبوں اور شہروں کو جن جرنیلوں نے فتح کیا تھا، وہ وہاں کے امیر بنا دیے گئے، اور ان دستوں کے سپاہی وہاں کے عام باشندے بن چکے تھے اور خود طارق بن زیاد کا مستقر طلیطلہ قرار پا چکا تھا جو اس وقت عملاً مسلمانوں کا دارالحکومت تھا۔ لیکن طارق بن زیاد کے امیر موسیٰ بن نصیر کے حکم کے خلاف ان علاقوں کو فتح کیا گیا اور اندلس میں پیش قدمی جاری رکھی گئی۔ یہ موسیٰ کے حکم کی نافرمانی تھی۔ اگرچہ طارق نے اپنی جگہ پر یہ کام بالکل درست کیا اور مستقبل کا مؤرخ بھی اسے درست ہی کہتا ہے لیکن یہ سب کچھ اطاعت امیر کے جذبہ کے خلاف تھا۔ مگر ہمارے نقطۂ نظر سے طارق نے جو کچھ کیا بالکل درست اور صحیح کیا کیونکہ موسیٰ بن نصیر سمندر پار ہونے کی وجہ سے اندلس کے حالات سے بالکل بے خبر تھا اور طارق اور لحاظ سے باخبر اور آشنا تھا۔ طارق بن زیاد اگر موسیٰ بن نصیر کے کہنے پر اپنی پیش قدمی روک دیتے تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ اندلس کے عیسائی جلد از جلد ایک متحدہ محاذ بنا کر مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرتے اور طارق بن زیاد کی سب کوششیں رائیگاں چلی جاتیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ جنگ کی پیش قدمی جاری رکھی جاتی جو طارق بن زیاد نے حالات کے تقاضا کے تحت جاری رکھی۔

اندازہ فرمائیں کہ طارق جب اندلس میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ صرف ۱۲ ہزار فوج تھی۔ سات ہزار وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور ۵ ہزار بعد میں موسیٰ بن نصیر نے اسے بھیجی تھی۔ جب کہ گوڈالیٹ کی جنگ میں دشمن

Marfat.com

کی فوج ایک لاکھ یا اس سے زائد تھی۔ یہ طارق بن زیاد کی جنگی حکمت عملی تھی کہ دشمن کو اس جنگ میں جو شکست فاش ہوئی اس میں اس کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست ہو گئے۔ ملک میں جو انارکی کی کیفیت طاری تھی وہ بھی مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ یہودیوں پر عیسائیت کے ظلم وستم نے یہودیوں کو مسلمانوں کا بہی خواہ بنا دیا اور انہوں نے مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھا اور واقعی وہ ان کے نجات دہندہ ثابت ہوئے۔ مسلمانوں کے اندلس میں داخل ہونے سے قبل طلیطلہ کی چھٹی مجلس نے یہ ضابطہ بنایا تھا کہ تمام حکمرانوں سے یہ حلف لینا چاہیے کہ وہ سوائے کیتھولک مذہب کے کسی اور مذہب کی پیروی کی اجازت نہیں دیں گے اور ان لوگوں کے خلاف نہایت سختی سے قانون کا نفاذ کریں گے جو دین مسیحی سے انحراف کریں گے۔ اس کے بعد ایک اور قانون وضع ہوا کہ جو شخص مقدس کیتھولک یا بائیبل کے احکام، مذہبی پیشواؤں کے ارشادات، کلیسا کے فتاویٰ اور دینی رسومات پر شک یا اعتراض کرے گا، اس کی جائیداد مکمل طور پر ضبط کر لی جائے گی اور اسے حبس دوام (عمر قید) کی سزا دی جائے گی۔ ارباب کلیسا نے اپنی جماعت کے لیے امور سلطنت میں بڑا اثر ورسوخ حاصل کر لیا تھا، چنانچہ جو قومی مجالس مملکت کے نہایت اہم امور کے انتظام و انصرام کے لیے منعقد ہوتی تھیں، پادری اور کلیسا کے اعلیٰ عہدیداران ان میں شریک بھی ہوتے تھے۔ امور سلطنت میں ان پادریوں کے اثر ورسوخ کا نتیجہ تھا کہ ہر قوطی بادشاہ دو تاج بنواتا ایک پہننے کے لیے اور دوسرا کلیسا کی نذر کرنے کے لیے۔ پھر ان کلیساؤں میں نذر و نیاز کے نام پر بڑے بڑے امراء نے طلائی اور نقرئی ظروف اور زیوارت رکھے ہوئے تھے جو ان پادریوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے جن پر فتح کے بعد طارق بن زیاد نے قبضہ کیا۔

عیسائی پادریوں کی زندگی اس زمانہ میں نہایت گندی اور عیش وعشرت سے بھرپور تھی اور ہلیفرچ (Helfferick) نے لکھا ہے کہ پوپ باڈرین کے ایک نمائندہ اجیلا نے اندلس کے پادریوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ شادی شدہ عورتوں سے آشنائی پیدا کرتے ہیں۔ شاہ لوئی کے دور حکومت میں فرانس کے دربار میں بودو نامی ایک پادری تھا جو سنہ ۸۳۸ء میں یہودی ہو گیا تا کہ وہ اپنی گنہگار زندگی کو چھوڑ کر شریعت خداوندی کا سختی کے ساتھ پابند ہو سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی رہ کر شریعت خداوندی کا پابند ہونا اس زمانہ میں نہایت مشکل تھا۔

ان ملکی حالات میں طارق بن زیاد نے اندلس پر قبضہ کیا، لیکن اس سے یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیے کہ چونکہ پادریوں اور عام رعایا میں ایک کھینچا تانی اور کشمکش کا عالم تھا۔ رعایا کا ہر طبقہ خواہ وہ یہودی ہو یا کسان اور مزدور اور غلام، سب صاحبان اقتدار اور کلیسا کے ارباب سے نالاں اور تنگ تھے، اس لیے طارق کا اس ملک کو فتح کرنا نہایت آسان تھا، یہ بات بالکل غلط ہے۔ وہ اگرچہ آپس میں دست وگریباں تھے لیکن اجنبی لوگوں کے مقابلہ میں وہ اپنے سب گلے شکوے بھول کر باہم اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اسی وجہ گوڈالیٹ کی جنگ میں ایک غاصب بادشاہ کی اپیل پر سارا اندلس اکٹھا ہو گیا اور ہر شخص غاصب بادشاہ راڈرک کی حمایت اور اندلس کے تحفظ کے لیے میدان میں آ گیا۔ یہ تو کاؤنٹ جولین کی حکمت عملی تھی جس نے ان کے درمیان نفاق اور تشتت وانتشار

Marfat.com

پیدا کر کے راڈرک کو شکست فاش سے ہم کنار کیا۔

اسلام نے اگر فتوحات کی اجازت دی ہے تو ساتھ یہ بھی تاکید کی کہ کسی ملک میں نہ تو بدانتظامی ہو جس سے انارکی پھیلے اور نہ ہی کسی مفتوح پر ظلم وستم ہو کیونکہ ظلم اللہ تعالیٰ کو کسی حال میں بھی پسند نہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمانوں نے لاکھوں مربع میل علاقہ فتح کیا۔ یہ فتوحات مسلمانوں نے نہایت بے سروسامانی کے عالم میں کیں۔ ان کے پاس اس وقت کا کوئی قیمتی اور جدید اسلحہ نہیں تھا۔ مسلمان سپاہیوں کے پاس صرف ایک زرہ ہوتی تھی جس کو وہ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلہ میں اپنی حفاظت کے لیے پہنتے تھے اور وہ بھی اکثر لوہے کے بجائے چمڑے کی ہوتی تھی۔ ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی تلواریں اور تیر اتنے کم حیثیت اور چھوٹے ہوتے تھے کہ ایرانی انھیں دیکھ کر حقارت سے ''تکلے'' کہتے تھے۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں ان لوگوں نے دنیا کی دو سپر پاورز (Super Powers) کو ایسی شکست دی کہ چشم آفتاب ابھی تک حیران ہے، اور خود ان حکومتوں کے سربراہ بھی پریشان تھے کہ مٹھی بھر بے سروسامان عربوں نے ان کی لاکھوں کی تعداد میں ہر قسم کے آلات حرب وضرب سے لیس فوج کو اس طرح شکست دی کہ آج تک کسی شہنشاہ کی فوج نے ایسی شکست نہیں دی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ جنگ اسلحہ سے نہیں جیتی جاتی بلکہ صبر واستقلال اور عزم ویقین کے ساتھ جیتی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں یہ ساری صفات موجود تھیں جب کہ ان کی مخالف فوجیں ان سب خوبیوں سے یک قلم عاری تھیں۔ پھر مسلمانوں کی جنگ کا مقصد کوئی دنیوی منفعت نہ تھی بلکہ وہ اپنے گھروں سے اس لیے نکلے تھے کہ اللہ کا کلمہ دنیا میں بلند ہو (لتکون کلمة الله هی العلیا) جب کہ ان کی مخالف فوجیں صرف دنیوی غرض اور منفعت کے لیے برسرپیکار تھیں۔ جب مسلمان فوجی اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑتے تھے تو میدان جنگ میں ہر مشکل میں اللہ کی مدد کی آواز لگاتے تھے، اور اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد فرماتا تھا، اور جن لوگوں کی اللہ مدد کرے وہ دنیا میں کبھی ناکام نہیں ہوتے۔

ایک اور چیز جس نے فتوحات میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ مدد کی وہ ان کی راست بازی اور دیانت داری تھی۔ ان دونوں خوبیوں نے ان کے مخالفوں کو بھی ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ یرموک کی جنگ کے لیے جب مسلمان شام کے اضلاع سے نکلے تو تمام عیسائی رعایا ان کے لیے دست بدعا تھی کہ ''خدا تم کو پھر اس ملک میں واپس لائے۔'' اور یہودیوں نے تورات ہاتھ میں لے کر کہا کہ ہمارے جیتے جی اب قیصر روم یہاں نہیں آسکتا۔ پھر ایک اور موقع پر جب جنگی مصلحت کی وجہ سے مسلمانوں کو ایک شہر خالی کرنا پڑا تو انہوں نے جزیہ کی وہ تمام رقم اہل شہر کو واپس کر دی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ رقم تم ہمیں کیوں واپس لوٹا رہے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ جزیہ کی یہ رقم تمھاری حفاظت کے لیے ہم نے تم سے لی تھی۔ اب جب کہ ہم اس شہر کو خالی کر رہے ہیں ہم تمھاری حفاظت سے معذور ہیں، لہٰذا اب یہ رقم ہم تمھیں واپس کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے

Marfat.com

منہ سے یہ جواب سن کر اہل شہر کی آنکھیں نمناک ہوگئیں اور ان کے دلوں سے ان کے لیے دعا کی سوغاتیں نکلنے لگیں اور وہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں جلد اس شہر میں واپس لائے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب (Preaching of Islam) میں لکھا ہے کہ رومیوں کے مقابلہ میں سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنی منتشر افواج کو اکٹھا ہونے کے لیے کہا۔ چنانچہ تمام اطراف سے آئی ہوئی افواج کا اجتماع دمشق میں ہوا۔ دمشق میں اکٹھا ہونے کے لیے انھیں کئی مفتوحہ علاقوں کو خالی کرنا پڑا، لہٰذا انہوں نے جزیہ کی وہ تمام رقم جو اپنی عیسائی رعایا کی حفاظت کے لیے ان سے لی ہوئی تھی، اہل شہر کو واپس کر دی۔ اس بات کا عیسائی رعایا پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے رو رو کر ان فاتحین کو رخصت کیا اور ان کی واپسی کی دعائیں مانگیں۔

مسلمانوں نے اپنی کثرت تعداد سے نہیں بلکہ ہمیشہ قلت تعداد سے دشمن پر فتح حاصل کی ہے۔ جنگ یرموک میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۲۵ ہزار تھی اور دشمن کی تعداد دو لاکھ کے قریب تھی۔ چنانچہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دشمن کی کثرت تعداد کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے جواب جو دیا وہ یہ تھا:

''تم ایک جگہ ہو کر ایک لشکر بنا لو اور اپنی قلت تعداد کا غم نہ کرو۔ تم اللہ کے دین کے مددگار ہو۔ وہ ضرور تمھاری مدد کرے گا، اور تم سب یرموک میں جمع ہو جاؤ۔''

پھر جب اسی جنگ میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کی صف آرائی فرما رہے تھے تو ایک شخص نے کہا: ''بازنطینی کتنے زیادہ اور مسلمان کتنے کم ہیں۔'' سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا تو فرمایا:

''مسلمان کتنے زیادہ اور بازنطینی کتنے کم ہیں۔ مسلمانو! یاد رکھو، فوجیں تعداد کی کثرت سے نہیں ہمت اور جرأت کی وجہ سے کم یا زیادہ ہوتی ہیں۔ خدا کی مدد ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے جو بہادر اور جرأت مند ہو۔ الحمدللہ! ہم بہادر بھی ہیں اور جرأت مند بھی اور صاحب ایمان بھی۔ ہم سے کون مقابلہ کرے گا۔''

یہ ہمت اور جرأت اور عزم و یقین کن لوگوں میں ہوتا ہے؟ یہ ان لوگوں میں ہوتا ہے جو صاحب ایمان ہوں اور جن کے کریکٹر اور اخلاق کا دامن بددیانتی اور خیانت کے بدنما دھبوں سے داغ دار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جہاں بھی گئے لوگوں نے نہ صرف ان کی حکومت کو قبول کیا بلکہ ان کے دین کی دعوت کو بھی لبیک کہا جس نے ان میں یہ خوبیاں پیدا کی تھیں۔

دنیا کے مؤرخین اور مستشرقین کو یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ مسلمانوں نے اتنی جلدی اور اس قدر زیادہ فتوحات کیسے کر لیں؟ جب مستشرقین سے ان فتوحات کا کوئی جواب نہ بن سکا تو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی فتوحات کا اسکندر مقدونی اور چنگیز خان کی فتوحات سے موازنہ کرنا شروع کر دیا، حالانکہ ان دونوں کی فتوحات سے مسلمانوں کی فتوحات کا کوئی مقابلہ اور موازنہ نہیں، کیونکہ ان دونوں نے اپنی فتوحات میں مفتوح ممالک کے باشندوں پر

Marfat.com

جو جو ظلم وستم کیے وہ سفاکیت آپ کو مسلمانوں کی فتوحات میں بالکل نظر نہیں آئے گی۔ مسلمانوں کی حکومت میں قانون کی حکمرانی تھی جب کہ چنگیز خان، بخت نصر، اسکندر مقدونی اور تیمور لنگ کی فتوحات میں سفاکیت اور خون ریزی اپنے نقطہ عروج پر تھی۔ مسلمانوں کی حکومتوں میں آپ کو یہ سفاکیت ہرگز نہ ملے گی۔ آدمیوں کا قتل عام تو بہت بڑی چیز ہے وہاں تو فوج کو درختوں تک کے کاٹنے سے روک دیا گیا تھا۔ وہاں تو یہ حکم تھا کہ صرف میدان کارزار میں اپنے مدمقابل کو قتل کرنے کی اجازت ہے، اور جو لوگ جنگ میں تمہارے مدمقابل ہیں، ان کو دھوکہ نہیں دینا، کسی کی ناک اور کان کو نہیں کاٹنا اور نہ ہی کسی بچے کو قتل کرنا ہے۔ (کتاب الخراج: ص ۱۳۰) جو لوگ مطیع ہو کر پھر باغی ہو جاتے تھے، ان کے دوبارہ اقرار پر ان سے درگزر کی جاتی تھی۔ ان چیزوں کے علاوہ مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو جو رعائتیں اور سہولتیں مسلمانوں نے دی تھیں، وہ غیر مسلم فاتحین نے کبھی نہیں دیں۔

پھر اسکندر مقدونی اور چنگیز خان نے صرف فتوحات کیں، لوگوں کا قتل وغارت کیا۔ وہ آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح چلے گئے۔ انہوں نے اپنے مفتوحہ ملکوں اور شہروں کو کوئی نظام حکومت نہیں دیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان فاتحین کے چلے جانے کے بعد ان کی وہ حکومتیں ختم ہو گئیں، لیکن مسلمانوں کے زمانہ میں جو ممالک فتح ہوئے خصوصی طور پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جس قدر شہر یا ممالک فتح ہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی مسلمانوں ہی کے قبضہ میں ہیں، اور کئی سو سال تک ان میں وہی نظام حکومت جاری وساری رہا جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں جاری کیا تھا۔ اسی وجہ سے مستشرقین کے مطابق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فتوحات پوری دنیا میں انوکھی ہیں، اور تاریخ کے اوراق میں کسی اور فاتح کا نام نہیں بتایا جا سکتا جس نے ساڑھے دس سال کے قلیل عرصہ میں اتنے شہر فتح کیے ہوں۔ اور جن حکومتوں سے ان کی فوجوں نے مقابلہ کیا وہ اپنے زمانہ کی سپر پاورز تھیں۔ اسی وجہ سے ہر شخص کو اس بات کا اقرار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ دنیا میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسا فاتح آج تک اور کوئی نہیں گزرا۔

طارق بن زیاد اور اس کے ساتھیوں میں یہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک مسلمان حملہ آور میں ہونی چاہئیں جیسا کہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔ اس وجہ سے ایک سال کے عرصہ میں انہوں نے جس قدر علاقہ فتح کیا وہاں کا انتظام وانصرام بھی انہوں نے شریعت اسلامیہ کے مطابق کیا۔ اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر تو انہوں نے طلیطلہ کو بنایا اور وہاں بیٹھ کر وہ اپنے تمام مفتوحہ علاقوں کی نگرانی کرتے تھے، اور جہاں بھی انتظام میں کوئی جھول دیکھتے اس کو فوری طور پر ٹھیک اور درست کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ رعایا کی اکثریت ان سے نہایت خوش تھی سوائے ان راسخ العقیدہ عیسائیوں کے جن کی گھٹی میں مسلم دشمنی تھی۔ یہودی کسان اور غلام تو مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔

طارق بن زیاد نے ان مفتوحہ علاقوں میں جو نظام سلطنت قائم کیا وہ اسلامی بنیادوں پر قائم تھا اور اس کے نتائج بڑے خوشگوار ثابت ہوئے۔ اس سے لوگوں میں حکومت سے تعاون کا جذبہ بیدار ہوا۔ اور وہ بہ

Marfat.com

طیب خاطر اسلامی فوجوں کی دعوت جنگ پر لبیک کہہ کر ان میں شامل ہو گئے جس سے فوج کو بڑا فائدہ ہوا۔ اسی لیے طارق نے جہاں جہاں شہروں میں مسلمانوں کو آباد کیا وہاں یہودیوں کو بھی آباد کیا۔ طارق کا ذہن وسیع، ظرف اعلیٰ و بلند اور نگاہ نہایت دور رس تھی۔ اس نے اندلس میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ رعایا اور حکمران دونوں قانون کا احترام کریں۔ جو حکم نافذ ہو اس کی تعمیل و اطاعت میں کسی قسم کا تساہل و تکاسل نہ ہو۔ طارق کا خیال تھا کہ قوانین کی کثرت کی ضرورت نہیں بلکہ اصل شئے قوانین کا نفاذ، ان کا احترام اور ان کی پابندی ہوتی ہے۔ حیلے بہانوں سے قوانین کو غیر مؤثر بنانے اور ان کی پابندی نہ کرنے والوں اور غرض کے بندوں کے ہتھکنڈوں کے دروازے بند کر دیے جائیں تو حکم عدولی اور غیر قانونی حرکتوں کا خاتمہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

فرد اور جماعت میں چولی دامن کا تعلق ہوتا ہے۔ جماعت فرد کے لیے نعمت اور فرد جماعت کی بنیاد اور اساس ہوتی ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ

''تو جماعت کے ساتھ رہے گا تو تجھے خیر و بھلائی ملے گی۔''

اسی طرح ایک اور ارشاد ہے کہ

''جماعت رحمت ہے تو تفرقہ عذاب۔''

اسی اصول کی بنا پر مخلص مسلمانوں نے ذاتی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر جماعتی مفاد کی حفاظت کی۔ بسا اوقات بڑی مشکلات بھی برداشت کیں لیکن جماعت کا التزام رکھا۔ طارق بن زیاد نے بھی اسی اصول کو اپنایا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں فتح و کامرانی سے ہم کنار کیا۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا آئیڈیل (Ideal) بنایا اور اپنی زندگی کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرح گزاری اور نظام حکومت میں بھی وہی اصلاحات کیں جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کی تھیں۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نفح الطیب: ۱/۱۲۴، ۱۲۲، کتاب الامامۃ والسیاسۃ: ۲/۶، مجموعہ اخبار الاندلس: ص ۱۰-۱۱، ص ۲۴۰، ڈوزی، تاریخ مسلمانان اندلس: ۱/۳۵۲)

گاتھ شہزادے اور ان کا انجام:

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ جنگ گوڈالیٹ میں تین گاتھ شہزادے باوجود اس بات کے کہ وہ راڈرک سے سخت ناراض تھے کیونکہ وہ ان کی سلطنت کا غاصب تھا اور اس نے تین ہزار جاگیریں ضبط کی ہوئی تھیں، پھر وہ اجنبی فوجوں سے اپنے ملک کی حفاظت کے لیے راڈرک کی حمایت میں اپنے لشکر کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور قرطبہ میں وادی کبیر کے اس پار آ گئے۔ کاؤنٹ جولین کی کوششوں اور یقین دہانی کی وجہ سے یہ خفیہ طور پر طارق بن زیاد سے مل گئے۔ شرط یہ تھی کہ اگر طارق کامیاب ہو گیا تو وہ ان کی جاگیریں ان کے حق میں واگزار کر دے گا۔ طارق نے ان کے اس مطالبہ کو منظور کر لیا۔ جنگ کے وقت فوج کے میمنہ اور میسرہ نے

Marfat.com

پسپا ہونا شروع کیا جو مسلمانوں کے لیے ایک بڑی خوش آئند بات تھی۔اس جنگ میں طارق کو فتح ہوئی اور راڈرک دریائے گوڈالیٹ کی لہروں کی نذر ہو کر مارا گیا۔اس لحاظ سے یہ گاتھ شہزادے اندلس میں مسلمانوں کے قدم جمانے میں بڑے مدد معاون ثابت ہوئے، لیکن ان کی جاگیروں کا معاملہ ابھی تک معلق تھا۔ان کو ان جاگیروں کا قبضہ نہیں ملا تھا۔اگرچہ طارق نے ان سے ان کی جاگیریں واگزار کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن طارق کی حیثیت صرف ایک جرنیل یا کمانڈر کی تھی، چیف ایگزیکٹو کی نہیں تھی کہ ان کو وہ جاگیریں دے دیتا۔اس لیے وہ اپنی معذوری کے باعث معاملہ کو ٹال رہا تھا لیکن اسلام کے حربی اصولوں کے مطابق اگر ایک سپاہی بھی کسی کو امان دے دے یا کوئی وعدہ کر لے تو فوج کے چیف کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ اس کے وعدہ کو وفا کرے۔اور یہاں تو سپاہی نے نہیں بلکہ ایک جرنیل نے وعدہ کیا ہوا تھا جس کا ایفا ضروری تھا۔لیکن طارق شاید اس معاملہ میں کچھ معذوری سمجھ رہا تھا یا وہ ان کو کچھ زیادہ انعام دلوانا چاہتا تھا۔

یہ گاتھ شہزادے تین بھائی تھے اور عرب مؤرخین نے ان کے نام المند، رملہ یا رقلہ اور ارطباس لکھے ہیں۔تین ہزار جاگیریں ان کی خاص تھیں۔معاہدہ کے مطابق ان کو ان جاگیروں پر قابض ہونا تھا۔گو کہ طارق اپنے معاہدہ کا پابند تھا لیکن یہ شرطیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسی اہم تھیں کہ ان پر عمل درآمد دربار خلافت کی منظوری کے بعد ہی کیا جا سکتا تھا۔اس بات کا اندازہ ان شہزادوں کو بھی ہو گیا۔آخر امور جہانداری کو وہ بھی جانتے تھے،اور ہر شخص اور عہدے دار کے اختیارات سے وہ بھی واقف و آشنا تھے۔چنانچہ ایک روز وہ طارق بن زیاد کے پاس آئے اور نہایت لجاجت سے اس سے پوچھا کہ وہ خود امیر ہے یا اس کے اوپر کوئی امیر اور حاکم ہے۔طارق نے ان کو ساری صورت حال سمجھائی اور اپنی پوزیشن کو واضح کیا کہ وہ والی افریقہ موسیٰ بن نصیر کے ماتحت ہے اور وہ امیر المؤمنین کا نائب ہے۔ان شہزادوں نے طارق سے موسیٰ بن نصیر کے پاس جا کر اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور طارق سے ایک تعارفی مکتوب طلب کیا۔طارق نے انھیں ایک خط لکھ کر دیا جس میں ان کا مکمل تعارف، اسلامی لشکر کے لیے ان کی خدمات اور اس معاہدہ کا بھی ذکر کیا جو طارق نے ان سے کیا تھا۔گاتھ شہزادے یہ خط لے کر موسیٰ کی ملاقات کے لیے چل پڑے۔

اس اثناء میں موسیٰ بن نصیر خود اندلس آنے کے لیے تیار تھا اور دار الحکومت قیروان سے چل کر بربر کے علاقہ میں مقیم تھا۔یہ گاتھ شہزادے طارق بن زیاد کا خط لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔موسیٰ نے ان کی عرض داشت کو بغور سنا اور اس سے اتفاق کرتے ہوئے ایک مفصل مکتوب ان کے حوالہ کیا اور انھیں کہا کہ وہ اس خط کے ساتھ دربار خلافت دمشق میں حاضر ہوں کیونکہ یہ کام انہی کے کرنے کا ہے۔شہزادے موسیٰ کا خط لے کر ولید بن عبدالملک کے دربار میں حاضر ہوئے۔ولید ان کے ساتھ غیر معمولی حسن اخلاق سے پیش آیا کیونکہ یہ بھی اسلام ہی کی تعلیم ہے کہ ﴿کلموا الناس علی قدر منازلهم﴾ (لوگوں سے ان کے درجات کے مطابق بات کرو) اور انھیں شاہانہ اعزاز و اکرام سے دربار میں جگہ دی۔ان کی باتوں کو نہایت دل جمعی اور توجہ سے سنا۔

Marfat.com

موسیٰ بن نصیر کا مفصل مکتوب بھی پڑھا، اور نہایت کشادہ دلی سے ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ فرمان دیا جن میں شاہانہ بخششوں کا ذکر تھا، اور وہ تمام جاگیریں ان کی ملکیت قرار پائی تھیں جو شاہان اندلس کی ذاتی جائدادیں تھیں اور جن کے بارے میں طارق نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ نیز ان فرمانوں میں ان کی قدیم شاہانہ عظمت کو برقرار رکھنے کا حکم دیا گیا تھا، اور انھیں آداب شاہی بجالانے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ ان میں اس بات کی صراحت بھی تھی کہ جب عرب اور بربر سرداران سے ملنے جائیں تو انھیں کھڑے ہو کر ان کی تعظیم بجالانے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔ دربار سے رخصت ہونے کے وقت انھیں شاہی عطایا اور تحائف سے بھی سرفراز کیا گیا۔

یہ تینوں شہزادے اپنی جاگیروں کا قبالہ لے کر دمشق کے دارالخلافت سے واپس اندلس آئے۔ اور اپنی اپنی جاگیروں کا قبضہ لے لیا اور ان کو باہمی رضامندی سے آپس میں تقسیم کر لیا۔ ہر ایک بھائی کے حصہ میں ایک ایک ہزار جاگیر آئی۔ بڑے شہزادے المند نے مغربی اندلس کی جاگیریں لیں، اس لیے اس نے اشبیلیہ میں قیام اختیار کیا، منجھلے شہزادے ارطباش نے وسط اندلس میں اپنی جاگیروں کا حصہ لیا اور وہ قرطبہ میں مقیم ہو گیا۔ سب سے چھوٹے رقلہ یا رملہ کی جاگیریں شرقی اندلس میں تھیں، اس لیے اس نے طلیطلہ کے شہر کو اپنے قیام کے لیے پسند کیا۔

یہ تینوں شہزادے اندلس کے مختلف حصوں میں سکونت پذیر ہو گئے اور نہایت اعزاز اور امن و عافیت سے اپنی باقی ماندہ زندگی کے دن گزارنے لگے۔ ان کی عزت و منزلت میں کبھی کوئی فرق نہ آیا۔ یہ اندلس کے معززین اور مرفہ حال امراء اور شرفاء میں شمار کیے جاتے رہے۔ عوام اور حکومت میں دونوں جگہ ان کا احترام و اکرام کیا جاتا تھا بلکہ یہ لوگ اندلس کے حکمرانوں کی نگاہ میں غیر معمولی عزت و منزلت کے حامل تھے۔

ولید بن عبدالملک کے دور خلافت کے کارنامے:

ولید بن عبدالملک بنو امیہ کے نہایت اچھے خلفاء میں سے ایک تھا۔ اپنی اسی نیکی اور اسلام دوستی کی وجہ سے اس نے گاتھ شہزادوں کی جاگیروں کو واگزار کیا اور انھیں اس وقت کی سوشل زندگی میں ایک نہایت اعلیٰ مقام دلوایا جب کہ اس سے قبل وہ ایک اچھی اقتصادی زندگی نہیں گزار رہے تھے۔ یہ سب کچھ اس کی نیک طینتی اور اچھی سرشت کی وجہ سے بھی تھا۔ اسی وجہ سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ولید کا دور تمدنی ترقیوں کے اعتبار سے بنو امیہ کا ممتاز ترین دور تھا۔ اس کے دور خلافت میں مسلمانوں کی قوت ایک مقصد پر متحد ہو گئی اور مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا تھا جس سے ملک کو بڑا فائدہ ہوا اور اسلامی حکومت کا رقبہ ہندوستان اور چین سے لے کر فرانس کی سرحد تک وسیع ہو گیا، اور مفتوحہ علاقوں سے جو دولت ہاتھ لگی اس سے ملک کی تمدنی ترقی میں بڑا اضافہ ہوا۔

ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں فوجی نظام میں بڑی وسعت و ترقی ہوئی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو

Marfat.com

سکتا ہے کہ ایک وقت میں کئی کئی محاذوں پر جیسے ہندوستان، وسط ایشیا اور یورپ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی اور سب میں کامیابی ہوئی۔ فوج کی جزوی ضروریات کی فراہمی کا اتنا اہتمام تھا کہ سندھ کی فوج کشی میں حجاج نے سوئی دھاگا تک ساتھ کر دیا تھا۔ خوردونوش کے سامان کا اتنا مکمل انتظام تھا کہ روئی سرکہ میں بھگو کر خشک کر کے ساتھ کر دی تھی کہ ضرورت کے وقت پانی میں بھگو کر سرکہ تیار کر لیا جائے۔ (فتوح البلدان: ص۲۴۲)

حکومت کے مختلف شعبوں میں ترقی کے علاوہ رفاہ عام کے اتنے کام ہوئے اور رعایا کی راحت اور آسائش کے اتنے سامان مہیا کیے گئے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ کے علاوہ اس کی نظیر نہیں ملتی بلکہ ولید کے بعض کارنامے اس دور سے بڑھ گئے۔

جہاز سازی کے کارخانے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت ہی میں قائم ہو گئے تھے۔ ولید کے زمانہ میں جب بحری قوت میں اضافہ ہوا تو نئے کارخانے کھولے گئے۔ چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے تیونس میں ایک کارخانہ قائم کیا جس میں صرف اس کے زمانہ میں ایک سو جہاز تیار ہوئے تھے۔ (کتاب المونس: ص۳۳)

سنہ ۸۸ھ میں یعنی مسند خلافت پر بیٹھنے کے صرف تین سال بعد تمام ممالک محروسہ میں سڑکیں درست کرائیں اوران پر میل نصب کیے۔ (کتاب العیون والحدائق: ص۳) تمام راستوں پر کنویں بنوائے اور نہریں جاری کرائیں۔ (کتاب العیون والحدائق: ص۴)

ولید سے پہلے اسلامی حکومت میں مختلف قسم کی ترقیاں ہوئی تھیں لیکن اب تک حفظان صحت اور ہسپتالوں کی ترقی (Development) کا کوئی انتظام حکومت کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ ولید بن عبدالملک نے تمام ممالک محروسہ میں ہسپتال اور شفاخانے قائم کیے۔ (یعقوبی: ۲/۳۴۸)

ولید کا ایک وہ کارنامہ ہے جس سے آج کی متمدن حکومتیں بھی عاجز ہیں وہ یہ کہ اس نے تمام ممالک محروسہ کے معذور، ناکارہ، اپاہج اور اسپیشل بچوں اور جوانوں کے لیے روزینے مقرر کر کے انھیں مستقل طور پر بھیک مانگنے سے نجات دلا دی۔ اندھوں کی راہ نمائی اور اپاہجوں (Handicapped) کے لیے آدمی مقرر کیے جو ان کی خدمت کرتے۔ (تاریخ الخلفاء: ص۲۲۴ وطبری) پھر یتامیٰ کی کفالت اوران کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔

(تاریخ الخلفاء: ص۲۲۴)

ایک اچھے حاکم اور خلیفہ کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ اشیاء کے نرخوں کی نگرانی کرے۔ یہ رعایا کی ایک بہت بڑی خدمت ہے کیونکہ اگر بازار میں مہنگائی ہو گئی تو ایک غریب آدمی کی زندگی اجیرن ہو جائے اور آج کل کی طرح لوگ خودکشی پر اتر آئیں گے۔ طبری نے لکھا ہے کہ خلیفہ خود بازار میں جا کر چیزوں کی قیمتیں دریافت کرتا اور اگر وہ زیادہ ہوتیں تو ان کو کم کراتا تا کہ ایک عام آدمی کی معاشی اور اقتصادی زندگی میں ناہمواری پیدا نہ ہو۔

اسلام نے تعلیم پر بہت زور دیا ہے کیونکہ تعلیم ہی کسی قوم کی ترقی کی ضمانت ہوتی ہے اور اسلام نے تو

Marfat.com

تعلیم کو ویسے ہی بہت اہمیت دی ہے، اسی وجہ سے اسلام کی سب سے پہلی وحی کا پہلا لفظ ہی ''اقراء'' نازل ہوا تھا۔ چنانچہ اس وحی کی روشنی میں مسلمانوں نے تعلیم کی نشر و اشاعت پر بہت زور دیا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل مکہ میں صرف سترہ اشخاص لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اس دور میں مسلمانوں کی تعلیم و تعلم کا مرکز دین ہی تھا اور اس کی بنیاد کلام الٰہی پر تھی، اس لیے ان کی تعلیم و تعلم کا دائرہ اسی تک محدود تھا اور قرآن و حدیث کے علوم ان کی زندگی کا مقصد وحید تھا۔ ولید نے قرآن حکیم اور سنت نبوی کی جانب بڑی توجہ کی اور وہ ہمیشہ لوگوں کو قرآن و سنت کے حصول کی ترغیب دیتا رہتا تھا۔ وہ حفظ قرآن پر عطیات دیتا تھا اور جو لوگ اس سے غفلت برتتے تھے انھیں سزا دیتا تھا۔ (طبری) اس کے ایک گورنر حجاج نے اہل عجم کی تعلیمی سہولت کے لیے قرآن حکیم پر نقطے اور اعراب لگوائے تا کہ وہ آسانی سے قرآن حکیم کو پڑھ سکیں۔ (فہرست ابن ندیم: ص۶) اور علماء اور فقہاء کے وظائف مقرر کیے تا کہ وہ دل جمعی اور یک سوئی کے ساتھ علم کی خدمت کر سکیں۔ (تاریخ الخلفاء: ص۲۲۴)

ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہ جہان کی طرح ولید بن عبدالملک کو بھی تعمیرات کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے عہد خلافت میں عظیم الشان عمارتیں بنوائیں۔ صاحب آداب السلطانیہ نے لکھا ہے:

''كان شديدالتكلف بالعمارات والابنية والاتخاذالمصانع والضياع''

(آداب السلطانیہ: ص۱۱۴)

ولید کے ذوق تعمیر کی وجہ سے عوام میں بھی یہ ذوق پیدا ہو گیا، اور عربی کا محاورہ ہے کہ ''الناس علی دین ملوکھم'' چنانچہ ولید کے ذوق تعمیر اور اس کے عہد خلافت کی تعمیرات کی وجہ سے یہ مذاق کچھ اتنا عام ہو گیا تھا کہ جب لوگ آپس میں ملتے تھے تو تعمیرات ہی پر گفتگو ہوتی تھی۔ (طبری: ۸/۱۲۷۳)

ولید کا دور فتوحات کی کثرت، دولت کی فراوانی اور امن و رفاہیت کی ارزانی اور دوسری ملکی اور تمدنی ترقی کے اعتبار سے ایک زریں دور ہے۔ اس کے عہد خلافت میں اس کے جرنیلوں نے ایک طرف سندھ کو فتح کیا تو دوسری طرف سرزمین اندلس پر بھی قبضہ کیا اور یہاں کے عوام کو ظالم، سفاک اور ظلم و تعدی کرنے والے حاکموں سے نجات دلا کر ان کی کایا پلٹ دی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں جو ملک فتح ہوئے وہ دفعتاً پستی کی حالت سے ابھر کر بلندی کے زینہ پر آ گئے اور ان کے عہد میں محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد اور قتیبہ بن مسلم جیسے جرنیل پیدا ہوئے جنھوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، ضرار بن ازور رضی اللہ عنہ، شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے بڑے جرنیلوں اور کمانڈروں کے بعد فن سپاہ گری میں اپنی سیادت کا سکہ منوایا۔ خصوصی طور پر اندلس کی پستی اور علمی تاریکی کا حال ناقابل بیان ہے۔ اس کا کچھ تذکرہ تو ہم نے گذشتہ صفحات میں کر دیا ہے۔ لیکن ایک یورپین مؤرخ نے اندلس میں مسلمانوں کے داخلہ سے قبل اور داخلہ کے بعد دونوں حالتوں کا موازنہ کر کے بتایا ہے کہ آج یورپ میں جو علم و سائنس کی روشنی پھیل ہوئی ہے یہ مسلمانوں ہی کے دم قدم اور اندلس سے یورپ میں داخل ہوئی جس کی کچھ تفصیل ہم نے اپنی

Marfat.com

کتاب (Islam & Civilization) میں کر دی ہے۔

ایک مستشرق نے اندلس میں مسلمانوں کے داخلہ سے اندلس کی پستی اور تاریکی کا جو حال لکھا ہے وہ کچھ یوں ہے:

''ساتویں صدی کے اواخر اور آٹھویں صدی کے اوائل کی تاریخ اسپین غیر معمولی طور پر ظلمات کے دھندلکے میں پھنسی ہوئی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں سیاسی اور تمدنی مصائب ملک بھر پر پڑے ہوئے تھے۔ آٹھویں صدی کے اوائل میں سلطنت وزی گاتھ بظاہر زوروں پر تھی اور نہایت مرفہ الحال مگر اس کی اصلی اور واقعی کمزوری اہالی کلیسا کی شان وشوکت اور درباشاہی کے تکلفات اور رعب میں چھپی ہوئی تھی جنہوں نے اس سلطنت کے معائب اور زیادتیوں پر بیہودہ سا نقاب ڈال رکھا تھا۔ خواہشات نفسانی کے غلام بادشاہان وزی گاتھ میں سے اپنے اجداد کی خوبیاں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ ریکارڈ اور ویمبا کے جانشین ایسے کمزور مگر ظالم تھے کہ ان پر لفظ بادشاہ کا اطلاق متنازعہ فیہ امر ہے، ان کی نفسانیت نے رسوم مہمان نوازی کو قائم رکھا اور نہ حقوق دوستی کو ملحوظ، نہ اپنے مرتبہ کو برقرار رکھ سکے اور نہ اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے میں سن وسال کی پروا کی۔''

(اخبار الاندلس، ایس، پی اسکاٹ: ۲۰۶/۱، مترجمہ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب)

''تمام کارکنان درباشاہی ایک ہی حمام میں ننگے تھے۔ عیش ونشاط اور شہوت رانی کا زور تھا۔ کلیسا کی نہایت مقدس روایات کی خلاف ورزی تو ہوتی ہی تھی، غضب تو یہ ہے کہ تعدد ازواج اور کنیزوں کا رکھنا بھی جائز قرار دے دیا گیا۔ دین دار لوگ ان عیش کے بندوں کی زیادتیوں سے تنگ آ گئے تھے، نہ ان خراباتیوں سے گرجاؤں اور کلیساؤں کی قربان گاہیں محفوظ تھیں نہ اقبال گناہ کے منبر۔'' (ایضاً)

''ملک کو منہیات میں منہمک دیکھ کر چھوٹے بڑے تمام پادری انہی خرابیوں میں پڑے ہوئے تھے۔ اسقف اعظم کے محل میں ہر روز فساد وعناد کے تماشے نظر آتے تھے، اور ہر رات کو شور وشغب کی آوازیں وہاں سے بلند ہوتی تھیں۔ عوام الناس پہلے ہی کہاں کے معصوم تھے، اس کیفیت کو دیکھ کر اور بھی خراب ہوتے چلے جاتے تھے۔ پادریوں اور مقتدایان مذہبی کے گھروں کی شرابیں ضرب المثل تھیں، ان کے مکان نہ تھے بلکہ پری خانے تھے۔ اگر حسن وجمال کہیں ملتا تھا تو یہیں...... پادریوں کا اصلی فرض تو یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک رحم مجسم ہستی کے نائب ہو کر فیاضی اور ایثار نفسی دکھائیں، مگر وہ اتنے گرے ہوئے تھے کہ سازش کنندہ اور معاملات سیاست میں دخل دینے والا فرقہ بن گئے تھے۔ امراء وارا کین سلطنت نے مردہ بدست زندہ بن کر اپنے آپ کو ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا، اور تمام نظم ونسق سلطنت ان کے سپرد کر دیا تھا، اور خود بطریق مداہنت عابدوں کا نمونہ بن گئے تھے۔ اگر ان کی خانگی زندگی کو دیکھا جاتا تو کیا پادری اور کیا امراء وجاگیردار سب عیوب اور گناہوں کے

Marfat.com

ڈھیر تھے۔'' (اخبار الاندلس، ایس، پی اسکاٹ: ۱/۱۹۸)

''مزارعین کی حالت بالکل چوب مسجد کی سی تھی۔ وہ تمام عمر بلکہ اولاد در اولاد ایک ہی جاگیر کے ہو رہتے تھے اور کہیں اور نہ منتقل ہو سکتے تھے۔ ان کی حالت بالکل غلاموں کی سی ہوتی تھی، گو از روئے قانون گاتھ ان کو ان بدقسمتوں سے بہتر ہونا چاہیے تھا جو بازاروں میں عام جانوروں کی طرح فروخت ہو سکتے تھے۔ آخر زمانہ گاتھ میں جو قانون وضع ہوئے تھے، ان کے موافق غلاموں کی حالت اس سے بھی بدتر ہو گئی تھی جو رومیوں کے زمانہ میں تھی۔ آخر گاتھ بادشاہوں نے کچھ نرمی کر دی تھی، لیکن بہر کیف یہ خدمت جبریہ تھی، اور نسلاً بعد نسل اس سے رہائی ہو سکتی تھی۔ اس سے لوگوں کی حالت اور بھی نازک ہوتی چلی جاتی تھی۔ شادی بیان کے متعلق قیود تھیں۔ اہل وعیال کو الگ رکھنا پڑتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جرائم پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان اسباب سے ان کی ذلتیں اور بڑھتی جاتی تھیں۔'' (اخبار الاندلس: ۱/۱۹۹)

''پادریوں کی جاگیروں پر ہزاروں غلام تعینات تھے، نہ صرف اس لیے کہ زراعت کریں بلکہ اس واسطے کہ بہترین اشیاء پیدا کر سکیں جو اس زمانہ میں مل سکتی تھیں، اور وہی ان جاگیرداروں کے تکلفات کو بڑھا سکتی تھیں۔ ان بدقسمت مزدوروں کی مشقت روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی اور آزادی کی امیدیں جس کا وہ نسلوں سے انتظار کرتے چلے آتے تھے، گھٹتی جاتی تھیں، بلکہ اب تو بالکل ہی نہ رہ گئی تھیں، اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ جو ناقابل برداشت بوجھ ان پر ڈالا جا چکا ہے، وہ قیامت تک ہلکا ہونے والا نہیں۔'' (اخبار الاندلس: ۱/۲۰۱)

''غلاموں کا ایک جم غفیر تھا کہ وہ باوجود اپنے آقاؤں کے چابکوں کے ابھی تک زمانہ آزادی کی روایات کو نہیں بھولے تھے، اور ایک ذرا سی تحریک پر بلوہ کرنے کو تیار تھے، اور اس دن کا نہایت بے صبری سے انتظار کر رہے تھے جس دن ان کو آزادئ کامل حاصل ہو جائے۔'' (اخبار الاندلس: ۱/۲۱۲)

''مزارعین اور غلاموں کے علاوہ ایک اور فرقہ تھا جس کی تعداد دونوں سے کم تھی لیکن از روئے اصل و نسل اور از روئے قانون وہ دوامی غلام تھے۔ اتنی بات ان میں زیادہ تھی کہ وہ دونوں سے زیادہ عقیل وفہیم اور ہوشیاری اور چالاکی میں دونوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ یہ فرقہ یہودیوں کا تھا۔ سترھویں دینی کونسل کے ایک حکم ناطق کے موافق ان کی تمام جائدادیں ضبط کر لی گئی تھیں، اور ان کو بامشقت غلامی کی سزا دی گئی تھی۔ یہودی تھے کہ دونوں فریق (امراء اور مذہبی پیشوا پادری وغیرہ) کے ہاتھوں سے نہایت تنگ تھے۔ کون سی سختی اور تشدد تھا کہ ان پر نہ کیا جاتا ہو۔ وہ ہر وقت پریشانی بلکہ مصیبت میں گرفتار رہتے تھے۔'' (اخبار الاندلس: ص ۲۰۱، ۲۱۲)

یہ تو تھی مسلمانوں کی اندلس میں داخل ہونے سے قبل کی حالت، ان کے داخلہ کے بعد اندلس کی

Marfat.com

حالت میں یک قلم تبدیلی آئی۔ چنانچہ اسی مصنف ایس، پی اسکاٹ نے لکھا ہے کہ

''فاتحین (یعنی مسلمانوں) نے پرانے زمانہ کے قوانین کا احترام قائم رکھا۔ صرف اتنا فرق ہوا کہ اس کے دستور العمل اپنے قوانین کے تابع کر دیے۔ مفتوحین پر وہی قانون قابل نفاذ تھا مگر اسی حد تک کہ شرع اسلام کے خلاف نہ پڑے۔ اپنے عدل و انصاف، مساحت و مراسم خسروانہ سے اس نئی سلطنت نے بہت ہی جلد دلوں میں گھر کر لیا۔ یہودی مرفہ الحال ہو گئے (جب کہ اس سے قبل وہ پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں تھے۔) عیسائی اپنے تعصبات یک قلم بھول گئے۔ غلاموں نے وہ کلمہ پڑھ لیا جس سے ان کا داغ غلامی ہمیشہ کے لیے مٹ گیا اور وہ بادشاہوں کے برابر ہو گئے۔'' (اخبار الاندلس: ۲۵۸/۱)

''ذمیوں کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کا پورا پورا ایفا کیا گیا۔ ذات، جائداد اور مذہبی آزادی کا جو عہد کیا گیا تھا وہ بہر حال پورا کیا گیا۔ عوام الناس تو اس سے بہت ہی خوش تھے، اگر ناراض تھے تو وہ مذہبی دیوانے جنہوں نے ایسے فیاض اور سخاوت شعار دشمنوں کو گالیاں دیں، حالانکہ ان کی مراعات سے وہ فائدہ اٹھاتے تھے اور انہی کا نمک کھاتے تھے۔'' (اخبار الاندلس: ۲۵۷/۱)

لیبان نے مسلمانوں کے داخلہ کے بعد اندلس (موجود اسپین) کی حالت کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے:

''فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد ہی عربوں نے ترقی شروع کر دی تھی۔ ایک صدی کے اندر اندر مزروعہ زمینیں کاشت ہونے لگیں۔ اجاڑ بستیاں آباد ہو گئیں۔ ملک میں بڑی بڑی عمارتیں بن گئیں اور دوسری اقوام سے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے، اس کے بعد ہی عربوں نے علوم و ادب کی طرف توجہ کی اور یونانی اور لاطینی کتابوں کے ترجمے کرائے اور دار العلوم قائم کیے جو مدت تک یورپ میں علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔'' (تمدن عرب لیبان: ص ۲۴۷)

یہ سب کچھ ولید بن عبد الملک کے عہد خلافت میں ہوا کہ سلطنت کی حدود و ثغور میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ علم و فن کے میدان میں بھی بہت ترقی ہوئی۔ اگرچہ ولید بذات خود علم و فن سے یک قلم ناآشنا اور بیگانہ تھا۔ وہ عربی زبان تک غلط بولتا تھا۔ اس کے باپ عبد الملک بن مروان نے اس کے اس نقص اور اس کمی کا ازالہ کرنے کی از حد کوشش کی۔ اس کے لیے اس زمانہ کے بہترین اور خاص معلم متقرر کیے، لیکن تعلیم کا الٹا اثر ہوا، اس لیے عبد الملک نے اس کو معذور سمجھ کر چھوڑ دیا۔ (ابن اثیر: ۴/۵) کہا جاتا ہے کہ ولید ان تمام خوبیوں کے باوجود ایک نقص اپنے اندر رکھتا تھا۔ وہ یہ کہ وہ بڑا سخت گیر تھا اس سخت گیری کی وجہ سے ہزاروں دشمن قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سخت گیری کی کوئی خاص وجہ ہو، کیونکہ سخت گیر ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن ناجائز سخت گیر ہونا ایک بہت بڑا عیب ہے۔

Marfat.com

گاتھ شہزادہ المند اور اس کی اولاد:

یہ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر ولید بن عبدالملک کا کچھ ذکر ہو گیا جس سے بتانا یہ مقصود تھا کہ تینوں گاتھ شہزادوں کو جب موسیٰ بن نصیر نے دمشق میں امیر المومنین ولید بن عبدالملک کے پاس بھیجا تو ولید نے ان کو ان کی شان کے مطابق پروٹوکول دیا اور ان کو طارق بن زیاد کے وعدہ اور معاہدہ کے مطابق ان کی تین ہزار جاگیریں اور واگزار کر دیں جن کو انہوں نے اپنے حالات کے مطابق باہم تقسیم کر لیا۔ ہر ایک کے حصہ میں ایک ایک ہزار جاگیر آئی اور وہ نہایت مرفہ حالی اور آسودگی سے بلکہ امیرانہ طریقہ سے اپنی زندگی بسر کرنے لگے کچھ عرصہ کے بعد امیر المومنین ولید کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا۔ پھر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسند خلافت پر بیٹھے۔ سنہ ۱۰۵ھ میں ہشام بن عبدالملک خلیفہ ہوا اور وہ سنہ ۱۲۵ھ تک خلیفہ رہا۔ اس کے دور خلافت میں گاتھ شہزادہ المند کا انتقال ہو گیا۔ اس کے دو خورد سال لڑکے مطروہل اور عباس اور لڑکی سارہ جو قوطیہ کے نام سے مشہور تھی اس کی جاگیروں کے وارث بنے۔ یہ تینوں المند کی وفات کے وقت نابالغ تھے۔ ان کی نابالغی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے منجھلے چچا ارطباس نے ان کی جاگیروں پر قبضہ کرنا چاہا۔ سارہ اپنے بھائیوں سے بڑی اور ہوش مند تھی۔ اس نے اپنی فریاد کے لیے براہ راست دارالحکومت کو منتخب کیا کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ بارگاہ خلافت سے جو فیصلہ ہو گا وہی آخری فیصلہ ہے، لہٰذا وہ اپنے دونوں بھائیوں کو ساتھ لے کر ایک بحری جہاز کے ذریعہ اندلس سے دمشق کے لیے روانہ ہوئی۔ عسقلانی کے مقام پر وہ جہاز سے اتر کر دمشق پہنچی۔ اس وقت ہشام بن عبدالملک کی خلافت کا دور تھا۔ خلیفہ ہشام نے اس کو اس کے مناسب حال پروٹوکول دیا اور اس کا بہت اعزاز و اکرام کیا جس طرح خلیفہ ولید نے ان کے باپ المند اور اس کے دونوں بھائیوں کا اعزاز و اکرام کیا تھا۔ پوری توجہ سے سارہ اور اس کے دونوں بھائیوں کی معروضات کو سنا اور مناسب ہدایات اور احکام کے ساتھ امیر افریقہ حنظلہ بن صفوان کے نام ایک فرمان لکھ کر سارہ کو دیا۔ اس فرمان کو وہ لے کر امیر افریقہ حنظلہ بن صفوان کے پاس افریقہ آئی۔ حنظلہ نے خلیفہ ہشام کا فرمان پڑھا اور اس پر عمل درآمد کے لیے والی اندلس ابوالخطا حسان بن ضرار کلبی کے نام ایک حکم نامہ لکھ دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ سارہ اور اس کے بھائیوں کی جاگیریں ان کے چچا سے واپس لے کر ان کو دلائی جائیں۔ سارہ اس حکم نامے کو لے کر اندلس آئی اور وہ حکم نامہ ابوالخطا حسان بن ضرار کلبی کو دیا۔ حسان نے اس کو بغور پڑھا۔ حسان نے اس خیال سے کہ ایک عورت زاد کے لیے اتنی بڑی جائداد کا تنہا سنبھالنا بہت مشکل ہو گا۔ اس نے سارہ کی رضا مندی اور مرضی سے اس کا عقد ایک معزز عرب قائد عیسیٰ بن مزاحم سے کر دیا اور اس کی تمام جاگیروں کا قبضہ دلا دیا۔ عیسیٰ بن مزاحم ایک نہایت سمجھ دار اور دانش مند عرب جرنیل تھا۔ اس نے سارہ کی جاگیر کا مناسب انتظام کیا اور وہ اور اس کے بھائی نہایت خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ عیسیٰ بن مزاحم سے سارہ کے دو

Marfat.com

بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام ابراہیم اور دوسرے کا نام اسحاق تھا۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے جب کہ یہ گاتھ شہزادے المندر، رملہ یا رقلہ اور ارطباس (جس کو ڈوزی نے اوپاس کے نام سے یاد کیا ہے) اپنی جاگیروں کی واپسی کے لیے اندلس اور پھر افریقہ اور پھر وہاں سے موسیٰ بن نصیر کے کہنے پر دمشق گئے اور خلیفہ ولید بن عبدالملک ان کے ساتھ جس حسن اخلاق سے پیش آیا اور دربار خلافت میں ان کا جو اعزاز واکرام کیا گیا اور پھر ان کو تین ہزار جاگیروں کی واگزاری کا پروانہ دے کر انھیں واپس بھیجا گیا، خلیفہ ولید اور دوسرے عمائدین سلطنت کے حسن اخلاق سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ واپس اندلس آنے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور مسلمانوں کے دل و جان سے ساتھی بن گئے۔ پھر المندر کی بیٹی سارہ ہوسکتا ہے کہ اسی وجہ سے اندلس سے دمشق گئی ہو کہ وہاں میرے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو میرے باپ سے ہوا تھا اور تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے سارہ کی حسب حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ کیا۔ پھر جب واپس اندلس آئی تو وہاں کے امیر حسان بن ضرار کلبی نے اس کی ایک عرب مسلمان سے شادی کر دی۔ اندلس کی مشہور تاریخ افتتاح الاندلس کا مصنف ابن القوطیہ سارہ کے بیٹے ابراہیم کی اولاد میں سے ہے۔ ابن القوطیہ کا نام محمد اور کنیت ابوبکر تھی۔ باپ کا نام عمر تھا اور دادا کا نام عبدالعزیز اور پردادا کا نام ابراہیم بن عیسیٰ بن مزاحم تھا۔ ابن القوطیہ کا انتقال سنہ ۳۹۶ھ میں ہوا۔

سارہ کا اموی دربار میں اہم مقام:

دمشق کے اموی دربار میں سارہ کی جو عزت اور جو احترام ہوا وہ تو تھا ہی، لیکن جب سنہ ۱۳۸ھ/سنہ ۷۵۵ء میں اندلس میں امویوں کی مستقل حکومت قائم ہوئی اور عبدالرحمٰن الداخل سب سے پہلا اموی خلیفہ اندلس کی مسند خلافت پر بیٹھا تو سارہ اس وقت زندہ تھی۔ وہ ایک روز دربار میں عبدالرحمٰن الداخل کے پاس گئی تو اس نے سارہ کے دربار خلافت میں بھی تمام شاہی آداب ملحوظ رکھے۔ سارہ جب ہشام بن عبدالملک کے دربار میں اپنی جاگیروں کے سلسلہ میں گئی تھی، اس وقت عبدالرحمٰن الداخل نہایت خورد سال اور چھوٹی عمر کا تھا۔ وہ اس وقت ہشام بن عبدالملک کے پاس بیٹھا ہوتا تھا اور سارہ نے اسے کئی مرتبہ ہشام کے پاس بیٹھے دیکھا تھا۔ سارہ نے عبدالرحمٰن کو یہ واقعات سنائے اور اسے یاد دلائے۔ اب اس نے بھی سارہ کو پہچان لیا اور اس سے بہنوں جیسی محبت کرنے لگا۔ اور دونوں کے درمیان محبت اور پیار کے رشتے مضبوط ہو گئے جس کا اثر یہ ہوا کہ سارہ کو عبدالرحمٰن الداخل کے گھر میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہ تھی۔ وہ بے روک ٹوک قصر شاہی کے زنان خانے میں آتی جاتی تھی۔ اور رفتہ رفتہ شاہی خاندان کے ارکان وافراد سے اس کے مراسم بڑھ گئے تھے۔ اسی عبدالرحمٰن الداخل کے زمانہ میں سارہ کے شوہر عیسیٰ بن مزاحم کا انتقال ہوا تو دو عرب معززین جرہ بن ملاس مذحجی اور عمیر بن سعید لخمی سارہ کو اپنے حبالۂ عقد میں لانے کے خواستگار ہوئے۔ عبدالرحمٰن نے ثعلبہ بن عبید جذامی کی سفارش اور

Marfat.com

سارہ کی رضامندی سے عمیر بن سعید سے اس کی شادی کر دی۔ اس نکاح سے حبیب بن عمیر پیدا ہوا جو اندلس کے بنو حجاج، بنو سلمہ، اور بنو جزر کا جد اعلیٰ تھا۔ اندلس کے عہد اسلامی کے آخر تک حبیب بن عمیر کا خاندان اندلس کے مشہور شہر اشبیلیہ کے ممتاز معززین میں شمار کیا گیا ہے۔

سارہ کا چچا ارطباس اور اوپاس:

گاتھ شہزادے المند کا بھائی اور سارہ کا چچا ارطباس اور بقول ڈوزی اوپاس بھی نہایت شان وشوکت اور شاہانہ جاہ وحشم سے زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے تعلقات عرب اور بربر عمائدین سے جو حکومت کی کلیدی آسامیوں پر تعینات تھے، نہایت شگفتہ تھے کیونکہ پورے اندلس میں ولید بن عبدالملک خلیفہ مسلمین کے حکم سے ان تینوں بھائیوں کو پورا شاہی پروٹوکول ملا ہوا تھا اور ہر معزز شہری اور حکومت کا ہر عہدیدار انھیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ اگرچہ بھائی کی وراثت کے لیے بھتیجوں سے لڑا بھی، لیکن تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ طبعاً وہ سیر چشم تھا۔ اس کی داد ودہش اور سخاوت اور بردباری کے واقعات جو شہزادوں ہی کے شایان شان ہو سکتے ہیں وہ اس کی زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ آخر یہ گاتھ خاندان کا ایک شہزادہ تھا اور زندگی کے گرم وسرد واقعات اور نشیب وفراز نے انھیں نہایت معقول، بردبار اور ایک اچھے اخلاق والا انسان بنا دیا تھا۔ اور عربی کا یہ مقولہ ان پر بالکل درست ثابت ہوتا تھا: "الدھر نعم الادیب" زمانہ ایک بہترین ادیب ہے۔

ارطباس مسلمان علماء، صلحاء اور زہاد کی بڑی قدر کرتا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ بھی ہو کہ اس نے اپنے بچپن میں بڑے بڑے عیسائی پادریوں کو دیکھا ہوا تھا جو نہایت اخلاق باختہ اور خوشامد پسند ہوتے تھے۔ عمائدین سلطنت کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے گہرے ہوتے تھے اور ان کی خوشامد کرنا ان پادریوں کے آئے روز کا معمول ہوتا تھا۔ ان کی پوری زندگی عیش وعشرت اور گناہوں اور اللہ کے احکام کی نافرمانی میں گزرتی تھی، اس کے برعکس مسلمان علماء، صلحاء دنیا کے بکھیڑوں سے آزاد صرف اللہ کو خوش کرنے کے لیے ہر کام کرتے تھے۔ ان کے پاس جو شخص بیٹھتا اس کو خدا یاد آ جاتا تھا۔ ان کے پاس بیٹھنے سے انسان کے دل میں اللہ کی محبت کے جذبات و خیالات پیدا ہوتے لہٰذا ارطباس کا ان سے محبت کرنا اور ان کی قدر افزائی کرنا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ چند معززین شاہی اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اندلس کے مشہور عابد وزاہد میمون بن لبانہ اس کے پاس آتے دکھائی دیے۔ یہ انھیں دیکھتے ہی ان کے اعزاز اور تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور اپنی مرصع نقرئی کرسی یا مسند پر بیٹھانا چاہا، لیکن وہ قلبی طور پر ایسی چیزوں کو پسند نہ کرتے تھے اس لیے معذرت کر کے فرش پر بیٹھ گئے۔ جب یہ فرش پر بیٹھے تو ارطباس بھی پاس ادب سے اپنی کرسی پر نہ بیٹھا بلکہ وہاں سے اٹھ کر ان کے پاس فرش پر بیٹھ گیا، اور نہایت ادب واحترام سے ان کی تشریف آوری کی غرض وغایت پوچھی۔ انہوں نے نہایت سادگی اور بے تکلفی سے جواب دیا۔ میں چند روز کے لیے اندلس آیا تھا۔ مشرق کا حال آپ کو معلوم ہے۔ اب وہاں میرا گزر نہیں، لہٰذا

Marfat.com

یہیں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں وسعت اور فراخی عطا فرمائی ہے۔ میری خواہش ہے کہ تمھاری جاگیروں میں سے ایک جاگیر لوں اور اس پر زراعت کروں۔ تمہارا حق تمھیں دوں اور اپنا حق لے کر اس سے زندگی کے باقی ماندہ ایام راحت اور سکون سے گزار دوں۔ ان کی یہ بات سن کر ارطباس نے جواب میں عرض کیا: ''اللہ کی قسم! جو موضع بھی ہوگا وہ تمام وکمال آپ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دوں گا۔ وہ حق کاشت کاری پر نہ ہوگا کہ میرا حق بھی اس سے متعلق رہے گا، بلکہ یہ ایک آباد گاؤں ہوگا جس سے میرا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ چنانچہ اسی وقت ایک موضع کا ہبہ نامہ مع مویشیوں کے ان کے نام لکھ دیا اور وہ گاؤں ایک عرصہ تک میمون بن لبانہ کے خاندان میں وراثتاً آتا رہا۔ اس سے ارطباس کی دلی سخاوت اور داد و دہش کا پتہ چلتا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ شامی عربوں میں جمیل نام کا ایک جاہل سردار تھا۔ اس کو ارطباس کے اس حسن اخلاق پر نہایت تعجب ہوا، حالانکہ یہ کوئی باعث تعجب بات نہ تھی۔ ارطباس ایک شاہی خاندان کا شہزادہ تھا اور شہزادوں کو تو حسن اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پھر کچھ خاندانی روایات بھی ہوتی ہیں، لیکن جہلاء یا وہ لوگ جو حسن اخلاق سے خود عاری ہوں ان کا تعجب کرنا ایک قدرتی بات ہے۔ اس جاہل شامی نے گستاخی کے انداز میں کہا کہ ہم آپ کے پاس آتے ہیں، مگر آپ اس سے زیادہ ہماری عزت نہیں کرتے کہ ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کی عزت دے دیں۔ اور یہ سائل آپ کے پاس آیا اور آپ اس سے اس قسم کے حسن اخلاق سے پیش آئے۔ اس کی بات سن کر اور بات کے لہجے کو دیکھ کر ارطباس نے کہا:

''تم ادب شناس نہیں ہو، تمہارا احترام میں صرف دنیوی حیثیت سے کرتا ہوں کہ تمہارا تعلق حکمران طبقہ سے ہے، لیکن میمون کی میں نے اس لیے عزت افزائی کی کہ اللہ کی مخلوق اس کی عزت کرتی ہے اور وہ ایک خدا رسیدہ شخصیت ہے، اور سیدنا مسیح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ کی مخلوق میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی عزت کرتا ہے۔''

پھر ان سرداروں نے جب اس کے سامنے اپنا دست سوال دراز کیا اور دنیا کے بارے میں اس سے کچھ طلب کیا تو اس نے ان سے کہا:

''تم اہل دنیا میں سے ہو، تم لوگ تھوڑے پر راضی نہیں ہو سکتے۔ تمہارے لیے دس دس گاؤں نذر کرتا ہوں۔''

یہ ایک کتنا بڑا عطیہ اور سخاوت کا کتنا بڑا مظاہرہ تھا جو اس نے کیا کہ کمال سیر چشمی میں صرف ایک مجلس میں سو مواضعات ان سرداروں میں تقسیم کر دیے۔

ارطباس شاہی عتاب میں:

ارطباس نہایت اچھے طریقے سے اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا کہ عبدالرحمٰن الداخل کے زمانہ میں

Marfat.com

اس کے تعلقات حکومت سے کچھ اچھے نہ رہے اور وہ شاہی عتاب میں آ گیا۔ اگرچہ خلیفہ عبدالرحمٰن الداخل صاحب علم و فضل تھا۔ خود شاعر تھا، خود صاحب عتاب رہا تھا، اور ابن اثیر نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ

''وہ نہایت فصیح زبان آور، شاعر، بردبار، عالم، ہوش مند، خروج کرنے والوں پر عجلت سے اٹھتا تھا، آرام نہ لیتا تھا، ان تھک تھا، اپنے کاموں کو دوسروں پر نہ چھوڑتا تھا، اپنی رایوں پر مصر رہتا تھا، بہادر سخی اور فیاض تھا، اکثر سفید لباس پسند کرتا تھا۔'' (ابن اثیر: ۶/۷۷)

اس کی نیکی کی بہت سی داستانیں تاریخ کے اوراق میں موجود ہیں۔ نفح الطیب میں ہے کہ جب وہ جہاز سے اندلس کی سرزمین پر اترا تو اس کے سامنے شراب پیش کی گئی۔ اس نے یہ کہہ کر شراب کا جام واپس کر دیا کہ

''مجھے ایسی چیز چاہیے جو عقل کو بڑھائے نہ کہ کم کرے۔''

ایسے ہی ایک اور موقع پر ایک خوبصورت کنیز پیش کی گئی تو اس نے کہا:

''یہ دل اور آنکھوں کی طراوت ہے۔ اگر میں اس میں مشغول ہو جاؤں تو اپنے مطلوب و مقصود کو چھوڑ دوں گا۔ اور اگر مطلوب کی فکر میں رہا تو اس کنیز پر ظلم ہوگا، اس لیے تم لوگ اس کو واپس لے جاؤ۔''

مقری کا بیان ہے کہ وہ عام لوگوں کی طرح بیٹھتا تھا، ان کی شکایات سنتا تھا، ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتا تھا۔ کھانے کے وقت مجلس میں جتنے لوگ موجود ہوتے سب کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتا تھا۔ پھر اس نے ابن حیان کا قول نقل کیا ہے کہ

''عبدالرحمٰن الداخل بردبار، بہترین علم دوست اور اعلیٰ ذہن والا، پختہ ارادے کا مالک، اپنے عزم کو پورا کرنے والا، عجز سے بے نیاز، جلد کوچ کرنے والا، مستقل حرکت میں رہنے والا، تکلیف پر نہ گھبرانے والا، اپنے کاموں کو دوسروں پر نہ چھوڑنے والا، اَن تھک اور آرام کو پسند نہ کرنے والا، ہر کام کو پورا کرنے والا، بہادر، ہر معاملہ میں غور و فکر کرنے والا، فصیح و بلیغ گفتگو کرنے والا، بلند آواز شاعر، احسان کرنے والا، فیاض اور زبان آور تھا۔ وہ سفید لباس پہنتا اور سفید عمامہ باندھتا تھا اور اس لباس کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کے دوست اور دشمن سب اس سے ڈرتے تھے، لوگوں کے جنازہ کے ساتھ جاتا، جمعہ اور عیدین میں آتا اور امامت خود کراتا تھا، منبر پر اور بڑے اجتماعات میں خطبے دیتا اور لوگوں سے میل جول رکھ کر انھیں اپنی طرف مائل رکھتا تھا۔'' (نفح الطیب: ۲/۶۸-۶۹، ۱/۱۵۶)

لیکن ان سب باتوں کے باوجود تھا تو بادشاہ، اور بادشاہ لوگ نازک مزاج ہوتے ہیں وہ بعض دفعہ سچی بات پر تنگ جاتے ہیں اور اس کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اور بقول شیخ سعدی: ''گاہے بدشنامے خلعت دہند و گاہے بسلامے برنجند'' کبھی ان کو برا بھلا بھی کہا جائے تو ان کو انعام و اکرام کی بارش برسا دیتے ہیں اور کبھی سلام کرنے پر رنجیدہ ہو کر تختۂ دار پر لٹکا دیتے ہیں۔ اس کے بارے میں مقری ہی نے نقل کیا ہے کہ جب وہ قبائل بربر میں روپوش تھا تو ایک نازک موقع پر ایک بربری عورت نے اس کو اپنے دامن میں پناہ دی تھی۔

Marfat.com

جب یہ تخت پر بیٹھا تو وہ اندلس آئی اور عبدالرحمٰن سے ملی۔ عبدالرحمٰن نے ازراہ مزاح کہا:

''جب میں تیرے دامن میں روپوش تھا تو اس وقت سخت بدبو آ رہی تھی۔''

اس عورت نے برجستہ جواب دیا:

''اے امیر! وہ خود تیری بدبو تھی، پریشانی میں تجھ کو اپنی خبر نہیں ہوئی۔''

یہ جواب سن کر وہ کچھ نہیں بولا، ہوسکتا ہے کہ پسند نہ آیا ہو لیکن اس نے پھر کبھی اس عورت کو اپنے سامنے نہیں آنے دیا۔

اسی طرح ارطباس اگرچہ نہایت خوش خلق تھا لیکن کسی وجہ سے عبدالرحمٰن الداخل سے اس کے تعلقات خوشگوار اور اچھے نہ ہو سکے۔ اس کا سبب عبدالرحمٰن الداخل اور سارہ کے دیرینہ تعلقات بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ عبدالرحمٰن سارہ کا بڑا احترام کرتا تھا اور وہ اس کی گھریلو زندگی میں بھی دخل انداز تھی، اور ظاہر ہے کہ سارہ اور ارطباس کے تعلقات خاندانی نزاع کی وجہ سے کشیدہ تھے اور اپنی جاگیر کا قبضہ لینے کے لیے اسے دمشق جانا پڑا اور کارکنان اقتدار کے ذریعہ اس نے قبضہ حاصل کیا۔ سارہ کی آمدورفت شاہی محل میں اکثر و بیشتر ہوتی تھی، لہٰذا ارطباس کے دل میں بدگمانی پیدا ہونے کے قوی امکانات تھے کہ عبدالرحمٰن الداخل شاید سارہ کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبدالرحمٰن الداخل کسی فوجی مہم سے واپس آ رہا تھا اس نے ارطباس کے خیمہ کے اردگرد قیمتی تحائف کا انبار لگا ہوا دیکھا۔ عبدالرحمٰن یہ انبار دیکھ کر ضبط نہ کر سکا اور اس نے ارطباس کی جاگیروں کی ضبطی کا حکم دے دیا کیونکہ یہ شاہی مزاج لوگ کسی بات میں اپنا مدمقابل نہیں دیکھ سکتے۔ اس ضبطی کے حکم کے بعد اس کی غیرت نے تقاضا نہ کیا کہ وہ عبدالرحمٰن سے اپنی جاگیروں کی واگزاری کی درخواست کرے۔ یہ اس کی عزت نفس کے خلاف تھا۔ چنانچہ وہ نہایت خاموشی سے اپنے بھتیجوں کے پاس چلا گیا اور انھیں کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزارنے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد ارطباس قرطبہ آیا۔ یہ عبدالرحمٰن الداخل کے زمانہ میں دارالخلافہ تھا۔ یہ قصر شاہی میں عبدالرحمٰن سے ملنے کے لیے گیا۔ اگرچہ یہ اس زمانہ میں شاہی عتاب میں تھا، لیکن اس نے اپنی شاہانہ خودداری قائم رکھی۔ آخر یہ بھی شہزادہ تھا اور شاہی خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ شہزادگی اور شاہی کی ہوا دماغ سے نہیں نکلتی۔ اس نے حاجب کو بلا کر طنزیہ پیغام بھیجا کہ میں ''امیر المومنین عبدالرحمٰن سے ملنا چاہتا ہوں تاکہ ان سے رخصتی سلام عرض کرلوں۔ دربان نے عبدالرحمٰن کو ارطباس کا پیغام دیا تو عبدالرحمٰن نے اسے دربار ہی میں بلا بھیجا۔ چنانچہ ارطباس کی ہیئت کذائی اب پہلے جیسی نہ تھی کیونکہ اس کی جاگیر خلیفہ نے ضبط کرلی ہوئی تھی۔ آمدن کا اور کوئی خاص ذریعہ نہ تھا۔ جو کچھ پاس تھا وہ جودوسخا کی عادت کی نذر ہو گیا تھا کیونکہ ایک سخی ناداری اور قلاشی میں بھی سخی اور صاحب جودوسخا ہی رہتا ہے۔ مال ودولت کی کمی بیشی ان کی جودوسخا کی عادت کو تبدیل نہیں کر سکتی، لہٰذا اس میں وہ پہلے والا شاہانہ کروفر نہ تھا۔ کپڑے بھی اس طرح کے نہیں پہنے ہوئے تھے جس طرح وہ پہلے

Marfat.com

پہنا کرتا تھا۔ اس کی ہیئت کذائی سے بدحالی اور قلاشی ٹپک رہی تھی۔ عبدالرحمٰن نے اس کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر پوچھا: ''ارطباس! اس حال میں کیسے پہنچے؟ پہلے تو بڑے شاہانہ کروفر ہوا کرتے تھے اور تمہارے خیمے کے باہر تحائف کا ایک انبار لگا رہتا تھا۔ ارطباس کو عبدالرحمٰن کے اس سوال سے اپنے دل کی بات کہنے کا موقع مل گیا، اس لیے اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برجستہ جواب دیا: ''آپ ہی نے تو مجھے اس حال کو پہنچایا ہے کیونکہ آپ میرے اور میری جاگیروں کے درمیان حائل ہو گئے ہیں، اور ان تمام معاہدات کو جن کو آپ کے آباء واجداد نے کیا تھا، میرے کسی قصور اور جرم کی پاداش کے بغیر یک قلم توڑ دیے۔ عبدالرحمٰن اس جواب سے کچھ پریشان سا ہو گیا، لہٰذا اس نے بات بدل کر طنزیہ لہجہ میں کہا: ''تم تو اس وقت مجھ سے رخصت ہونے کے لیے آئے ہو؟ میں سمجھتا ہوں کہ تم کو روم جانا ہے؟'' ارطباس جواب سے کب چوکنے والا تھا، اس نے برجستہ جواب دیا: ''نہیں تو، مجھ کو یہ پتہ چلا ہے کہ آپ شام جانے کا ارادہ فرما رہے ہیں'۔ عبدالرحمٰن نے اس کے جواب میں کہا: ''مجھے یہاں سے کون نکال سکتا ہے کہ میں شام جاؤں، وہاں سے تو میں بزور شمشیر نکالا جا چکا ہوں۔'' ارطباس نے کہا: ''عالی جاہ! آپ اس مقام پر جہاں کہ آپ اس وقت موجود ہیں، کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس کو اپنے بعد اپنی اولاد کے لیے بھی چھوڑ جائیں یا پھر اسی طرح اس کو واپس لے لیا جائے جیسے کہ آپ نے اس کو لیا ہے۔'' عبدالرحمٰن الداخل نے کہا: ''بالکل نہیں، بخدا! میرا اس کے سوا کوئی ارادہ نہیں کہ اس کو اپنے یا اپنی اولاد کے لیے مستحکم کر جاؤں۔'' عبدالرحمٰن کے منہ سے یہ بات سن کر ارطباس نے نہایت صفائی سے کہا: ''امیر المؤمنین! پھر اپنے طرز عمل پر غور کریں اور اس کا جائزہ لیں۔'' پھر اس نے اس کے بعد مختلف قسم کے واقعات، خیالات اور جذبات عبدالرحمٰن الداخل کے سامنے بیان کیے جو اس وقت عبدالرحمٰن کی ذات اور اس کے طرز حکومت کے بارے میں لوگوں میں پھیل رہے تھے اور پیدا ہو رہے تھے۔ عبدالرحمٰن ایک نہایت سمجھ دار، جہان دیدہ اور دانش ور شخص تھا۔ اس نے ارطباس کی باتوں پر غور و خوض کرتے ہوئے بجائے اس بات کے کہ ناراض ہوتا، اس نے نہایت خوشی اور مسرت کا اظہار کیا اور ارطباس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے بروقت اسے صحیح حالات سے آشنا اور آگاہ کیا۔ اسی خوشی و مسرت میں اس کی تمام جاگیروں کو واگزار کر کے واپس کرنے کا حکم دیا اور پھر نئے سرے سے اسے خلعت فاخرہ سے سرفراز فرمایا اور اس کے ساتھ اس کو اندلس کے عہدۂ قماست پر فائز کیا۔ چنانچہ اسلامی حکومت کی طرف سے یہ اندلس میں سب سے پہلا قومس نامزد کیا گیا۔ (افتتاح الاندلس ابن القوطیہ: ص ۲۶-۴۰)

تاریخ کی کتابوں میں ان کے تیسرے بھائی کے حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی اس کی اولاد کے حالات کہیں ملتے ہیں۔

Marfat.com

موسیٰ بن نصیر کا اندلس میں ورود

طارق ابن زیاد نے سلطنت اسلامیہ کے نائب رئیس اور گورنر افریقہ موسیٰ بن نصیر کے روکنے کے باوجود اندلس میں اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور اس کی ممانعت کے باوجود اندلس کے کئی شہروں کو اپنی تلوار خار شگاف سے فتح کر لیا، لیکن اندلس میں طارق کی پیش قدمیوں کا جاری رہنا موسیٰ کو سخت ناپسند تھا کیونکہ ایک تو یہ اس کی حکم عدولی تھی کہ طارق نے اس کے منع کرنے کے باوجود اندلس کے آخری شمالی اور شمال مغربی علاقوں تک تاخت کی اور کسی جگہ بھی اندلسی فوج نے اس کا منظم ہو کر اور ڈٹ کر مقابلہ نہیں کیا سوائے استجہ کے بقیۃ السیف سپاہیوں کے اور صوبہ مرسیہ میں تھیوڈومر کی فوج کے۔ طارق کی اس پالیسی سے معلوم ہوتا ہے کہ طارق کی یہ کوئی ایسی غلطی نہ تھی جو قابل معافی نہ ہو کیونکہ جن علاقوں کو طارق نے موسیٰ کی ممانعت کے بعد فتح کیا، وہ علاقے نہایت آسانی کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گئے۔ دشمن کا جانی اور مالی نقصان ہوا جب کہ مسلمان ان دونوں نقصانوں سے یک قلم محفوظ و مصئون رہے، لیکن موسیٰ بن نصیر ایک عرب جرنیل تھا اور طارق اس کا ماتحت۔ نظام حکومت میں ہر ماتحت کو اپنے اعلیٰ افسر کا حکم ماننا ضروری ہوتا ہے خصوصی طور پر فوجی نظام میں۔ اس وجہ سے طارق اصولی طور پر اپنے افسر کے حکم کی نافرمانی کا مرتکب ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں ہر معاملہ میں مشورہ کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ ایک فوجی افسر کو بھی اپنے ماتحت افسروں سے مشورہ کر کے حکم صادر کرنا چاہیے کیونکہ ایک افسر خواہ وہ کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو، اس کا ایک ہی دماغ ہوتا ہے، اور ایک کے ساتھ جب دوسرا ایک مل جائے تو پھر یہ گیارہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے اسلام کی تعلیمات میں ہے کہ "اپنے امور کو باہمی مشورہ سے طے کرو۔" اور مشورہ میں اللہ تعالیٰ کی برکت بھی ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر موسیٰ نے طارق کے خط کے جواب میں اس کو مزید پیش قدمی سے روک دیا تھا تو طارق کو اسے دلائل سے قائل کرنا چاہیے تھا، خواہ اسے خود ہی افریقہ کیوں نہ جانا پڑتا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ طارق، موسیٰ کو دلائل سے قائل کرنے میں مزید وقت ضائع کرتا جبکہ اس اجنبی ملک میں سوائے اس لشکر کے جو اس کے ساتھ بربروں کا گیا تھا، اور کوئی ان کا حامی نہیں تھا۔ موسیٰ بن نصیر کو ان تمام حالات سے بالکل آشنائی نہیں تھی۔ وہ تو سمندر پار افریقہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ سچ کہا ہے ؎

Marfat.com

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کے چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

مختصر یہ کہ بات کوئی اتنی بڑی نہیں تھی اور حکم عدولی کوئی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ پھر اس حکم عدولی میں طارق کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا بلکہ اس میں ملک وملت کا فائدہ تھا، لیکن موسیٰ بن نصیر نے اس حکم عدولی کو بہت زیادہ محسوس کیا اور طارق کی اس آئینی خطا اور غلطی کو معاف نہ کیا۔ چنانچہ اس نے طارق کو سزا دینے اور اندلس کی حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ سے چھیننے کے لیے خود اندلس جانے کا ارادہ کیا۔ اس نے اندلس کی اس فوجی مہم کے لیے اٹھارہ ہزار فوجی اکٹھے کیے جن میں عرب اور بربر قبائل کے مختلف قائدین اور معززین شامل تھے۔ موسیٰ نے افریقہ میں اپنے بیٹے عبداللہ کو اپنا قائم بنایا اور خود یہ اٹھارہ ہزار افراد پر مشتمل فوج لے کر افریقہ روانہ ہو گئے۔

موسیٰ بن نصیر کون تھے؟

ذہنوں میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ موسیٰ بن نصیر کون تھے؟ اور افریقہ میں ان کا کیا عہدہ اور مقام تھا؟ مؤرخین نے لکھا ہے کہ موسیٰ بن نصیر بن عبدالرحمٰن بن زید لخمی تابعین میں سے تھے۔ انھوں نے مشہور صحابی رسول ﷺ سیدنا تمیم داری رضی اللہ عنہ سے کئی روایات حدیث نقل کی ہیں۔ بنوامیہ سے ان کا دیرینہ تعلق تھا۔ ان کے والد نصیر بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بنوامیہ کے موالی میں سے تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ عربی النسل تھے اور ان کا تعلق بنولخم سے تھا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ نصیر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جبل جلیل میں گرفتار کیے گئے اور بنوامیہ نے ان کو آزاد کر دیا۔ اس وجہ سے یہ موالی میں شمار ہوتے ہیں۔ آزادی کے بعد یہ سیدنا امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے دامن سے وابستہ ہو گئے، لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے باہمی تنازعہ میں یہ غیر جانبدار رہے۔

روایات کے مطابق موسیٰ کی ولادت شام کے ایک گاؤں کفردی میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت سنہ ۱۹ھ میں ہوئی۔ اس گاؤں میں آپ نے اپنے بچپن اور جوانی کی منزلوں کو طے کیا، اور خلیفہ عبدالملک بن مروان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ آپ نہایت ذہین وفطین نوجوان تھے۔ ہر کام کو نہایت محنت سے انجام دیتے۔ ان کی اسی ذہانت وفطانت کی وجہ سے امیر المؤمنین عبدالملک بن مروان رضی اللہ عنہ نے انھیں بصرہ کا ٹیکس کلکٹر یا خراج وصول کرنے کا افسر مقرر کیا۔ اس منصب کو آپ نے نہایت محنت اور دلی لگن سے ادا کیا اور اپنی محنت اور کوشش سے روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ بالآخر سنہ ۸۷ھ میں افریقہ اور بلاد مغرب کے گورنر بنا دیئے گئے۔ اپنی گورنرشپ میں آپ نے اپنی اور اپنے لڑکوں عبداللہ اور عبدالعزیز کی قیادت میں افریقہ اور بلاد مغرب کے بہت بڑے علاقہ کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں

Marfat.com

شامل کرلیا۔ بربر قوم ابتداء ہی سے کچھ سرکش واقع ہوئی تھی لیکن تمام بربر قبائل کو اپنی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ جو علاقے انھوں نے فتح کیے اس کے مختلف حصوں پر اپنے منتظم اور حاکم مقرر کیے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں طارق بن زیاد کو طنجہ کا حاکم اور والی مقرر کیا۔ طارق نے اپنی حسن کارکردگی سے موسیٰ بن نصیر کے دل میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا، اور موسیٰ کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ طارق بھی اپنے دل و جان سے موسیٰ سے محبت کرتے تھے اور ہر ممکن کوشش کرتے تھے کہ ہر معاملہ میں ان کی اطاعت اور ان کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ چنانچہ جب سنہ ۹۱ھ میں کاؤنٹ جولین کے کہنے پر اندلس کی مہم درپیش ہوئی تو طارق بن زیاد کو اپنا نہایت قابل اعتماد آدمی سمجھتے ہوئے اور اس مہم کے لیے موزوں ترین شخص خیال کرتے ہوئے سات ہزار بربر قبائل پر مشتمل لشکر ان کی قیادت میں اندلس روانہ کیا۔ اندلس روانہ کرنے سے قبل موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں، طارق نے اپنی حسن کارکردگی سے ان سب امیدوں کو پورا کیا، اور اندلس پہنچنے کے تھوڑا عرصہ بعد انھوں نے گوڈالیٹ کی جنگ میں راڈرک کو ایک عبرتناک شکست دی۔ راڈرک خود تو مارا گیا لیکن اس کی فوج تشتت و انتشار کا شکار ہوگئی اور پھر اسے کوئی ایسا قائد نہ ملا جو اس فوج کو اکٹھا کر کے طارق کا کسی اور میدان میں مقابلہ کر سکے۔ طارق اندلسی فوج کے اس انتشار سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، لیکن ان سے ایک غلطی یہ ہوگئی کہ وہ موسیٰ بن نصیر کو اپنی پیش قدمی کے بارے میں مطلع کر بیٹھے۔ معلوم نہیں موسیٰ نے کس خیال سے انھیں مزید پیش قدمی سے روک دیا، لیکن حالات کے تقاضا کے تحت طارق نے اپنے امیر کے اس حکم کی نافرمانی کی اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ یہ پیش قدمی موسیٰ بن نصیر کے منشا اور مرضی کے مطابق نہ تھی، لیکن طارق نے حکم عدولی کر کے اندلس کے آخری شمالی اور شمال مغربی علاقوں تک اپنے حملے جاری رکھے اور ان تمام علاقوں کو فتح کر لیا۔

کچھ تو طارق بن زیاد کو اس کی حکم عدولی کی سزا دینے کے لیے اور کچھ وہاں کے حالات سے آشنائی حاصل کر کے باقی ماندہ اندلس کو فتح اور فتح کے راستہ کی تمام مزاحمتوں کو دور کرنے کے لیے موسیٰ بن نصیر اٹھارہ ہزار فوجیوں پر مشتمل لشکر کو ساتھ لے کر اندلس میں جزیرہ خضراء کے پاس ایک پہاڑی کے قریب لنگر انداز ہوئے۔ یہ پہاڑی جبل موسیٰ کے نام سے موسوم کی گئی۔ کچھ روز یہاں ٹھہرنے کے بعد وہ جزیرۂ خضراء میں آئے۔ اس سفر میں کاؤنٹ جولین آپ کے ہمراہ تھا اور اہم مسائل میں ان کا مشیر خاص تھا کیونکہ اسی نے سب سے پہلے موسیٰ بن نصیر کو اندلس آنے کی دعوت دی تھی اور اس کی اس دعوت کے جواب میں موسیٰ نے طارق بن زیاد کو بھیجا تھا اور اب موسیٰ خود اس کی دعوت کے جواب میں آگئے تھے، اس وجہ سے جولین موسیٰ کے اہم مشیروں میں سے تھا کیونکہ اس کی مشاورت ابھی تک مسلمانوں کے لیے اہم کامیابیوں کا زینہ رہی تھی۔ طارق بن زیاد نے جتنا علاقہ اندلس کا ابھی تک فتح کیا تھا اس میں بھی اکثر و بیشتر اسی جولین کے مشوروں کو دخل تھا۔

اس سے قبل جب طارق بن زیاد اندلس کی سرزمین پر اترا تو اس کی سب سے پہلی بڑی جنگ گوڈالیٹ کے میدان میں راڈرک کے ساتھ ہوئی جو ایک لاکھ فوج کے ساتھ میدان میں اترا ہوا تھا۔ راڈرک کو

Marfat.com

شکست ہوئی اور بارہ ہزار فوج مظفر و منصور ہو کر میدان سے لوٹی۔ اب موسیٰ بن نصیر جب اندلس میں وارد ہوا تو اس کے پاس اٹھارہ ہزار آزمودہ کار اور جرأت مند سپاہی تھے۔ یہ اسی لیے آئے تھے تاکہ اپنی تجربہ کاری اور بہادری کے جوہر دکھائیں۔ لیکن اب راڈرک تو کام آچکا تھا۔ اس کی فوج شرمناک اور عبرت ناک شکست کی وجہ سے تتر بتر ہو چکی تھی۔ اب اس اٹھارہ ہزار کے لشکر کو کسی نئے میدان کی تلاش تھی۔ خود موسیٰ بن نصیر بھی دنیا کا ایک بہترین جرنیل تھا۔ اس کی بہادری اور جرأت کے چرچے افریقہ اور مسلم دنیا کے اور علاقوں میں بھی زبان زد عام و خاص تھے۔ اندلس میں تو وہ پہلی دفعہ وارد ہوا تھا۔ اس کا حوصلہ نہایت بلند تھا۔ اس کی بڑی خواہش اور تمنا تھی کہ وہ اندلس میں بھی اسی طرح کا کوئی کارنامہ سرانجام دے جس طرح کے کارنامے وہ دوسری دنیا میں سرانجام دیتا رہا ہے۔ اور یہاں وہ اپنی فتوحات کو اس طرح اور اس قدر وسعت دے کہ وہ اندلس سے قسطنطنیہ ہو کر ارض شام میں داخل ہو سکیں۔ اس کی خواہش تھی کہ نہ صرف اندلس بلکہ فرانس سے ترکی تک کا پورا علاقہ اس کی فتوحات کی آماجگاہ ہو۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ دارالخلافہ دمشق کو خشکی کے راستہ اندلس سے ملا دے۔ اس کی یہ خواہش اور امید بڑی اچھی اور حوصلہ افزا تھی، لیکن اس کو بروئے کار لانے کے لیے چند باتیں نہایت ضروری تھیں۔ ایک تو اندلس کے عیسائیوں کو آسان شرطوں پر مطیع و منقاد کر کے سرزمین اندلس میں امن و امان کی فضا قائم کرنا اور انھیں اپنا ہمنوا بنا کر اسلامی فتوحات کے دائرہ کو وسعت دینا اور اس طریقہ سے مفتوحہ ممالک اور علاقوں میں اسلامی آبادیاں قائم کرنا تاکہ بغاوت اور سرکشی کا خطرہ نہ رہے۔ اس طریقہ سے اندلس سے دمشق تک کا علاقہ سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی بن جائے اور اس پورے علاقہ میں امن و امان کی ایک ایسی فضا قائم ہو کہ کسی سفر کرنے والے کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے کام کے لیے اور اس ذہنی نقشہ کو عملی شکل میں لانے کے لیے امیر المومنین کی منظوری کی ضرورت تھی۔ آخری احکام اور اجازت خلیفۂ وقت کی تھی۔ موسیٰ تو اس کے ایک علاقے کا گورنر تھا، اس لیے موسیٰ نے اپنی مفصل تجویز اور اس کے اہم نتائج لکھ کر ایک قاصد کے ذریعہ دمشق بھیج دیے اور خود اندلس میں اس کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

طارق بن زیاد ان دنوں طلیطلہ میں تھے، لیکن موسیٰ بن نصیر نے وہاں جانا پسند نہ کیا کیونکہ وہ طارق سے دلی طور پر ناراض تھے اور ناراضگی کی وجہ طارق کی حکم عدولی تھی۔ بات معمولی تھی لیکن موسیٰ نے اس کو کچھ زیادہ محسوس کر لیا تھا۔ تاریخ میں صرف اتنا ہی ہے کہ وادی لکہ کے معرکہ سے پہلے طارق بن زیاد نے موسیٰ بن نصیر کو اندلسیوں کی یورش کی اطلاع دی اور امداد طلب کی۔ ان کی اطلاع کے الفاظ کچھ یہ تھے کہ ''اندلسی ہر سمت سے امنڈ آئے ہیں، اور مجھ میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔'' اس اطلاع پر موسیٰ نے فوراً پانچ ہزار فوج روانہ کر دی تھی لیکن معرکہ کی اہمیت کے خیال سے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ''میں عنقریب پہنچتا ہوں، بغیر میرے آئے ہوئے آگے بڑھنے کا قصد نہ کرنا۔'' (الامامة والسياسة: ۲/۶۰، نفح الطيب: ۱/۱۲۶) لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ طارق اس حکم کی تعمیل نہ کر سکے۔ اپنی نیت کی کسی خرابی کی وجہ سے انھوں نے حکم عدولی نہیں کی تھی۔ موسیٰ بن

Marfat.com

نصیر جونہی اندلس پہنچے تو اگرچہ جولین ان کا دلیل راہ تھا اور وہ ہر بات میں ان کو صحیح مشورہ دیتا، مگر موسیٰ بن نصیر ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کیونکہ ایک طرف وہ طارق سے خوش نہ تھے، ایک تو ان کی حکم عدولی کی وجہ سے اور دوسرے انھوں نے فتوحات اور مال غنیمت کے حصول میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، وہ موسیٰ کے پلان کے خلاف تھا جس پلان کے تحت وہ اس علاقہ میں پیش قدمی کرنا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ ان کی ذہنی کھنچاؤ (Tension) کی یہ تھی کہ وہ دارالخلافہ کی منظوری کے بغیر اپنی پیش قدمی جاری نہیں رکھ سکتے تھے، اس لیے وہ ایک انتظار کی حالت میں تھے اور انتظار کی حالت بڑی پریشان کن ہوتی ہے۔ چنانچہ اس حالت میں وہ طارق بن زیاد سے بھی ملنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ان کی طرف ان کا دل صاف نہ تھا۔ اس کشمکش اور انتظار میں وہ نہ تو طلیطلہ گئے اور نہ کسی اور جگہ، بلکہ یہ سارا وقت انھوں نے مغربی اندلس میں گزارا، کچھ اس لیے بھی کہ اس علاقہ میں ان کی فوجی مہمات کے لیے وسیع میدان موجود تھا اور ان کی خواہش تھی کہ میں خود اندلس میں وسیع پیمانہ پر فتوحات کا سلسلہ جاری کروں چنانچہ انھوں نے جولین کے مشورہ سے طارق کے مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر غیر مفتوحہ علاقوں کا رخ کیا، اور اس سلسلہ میں جنوبی اندلس کے کچھ شہروں کی باری پہلے آئی جن کو طارق بن زیاد پہلے فتح کر چکے تھے، لیکن بعد میں اہل شہر کی سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے اب اس کے قبضہ میں نہ تھے۔ چنانچہ موسیٰ نے جولین کے آدمیوں کے مشورہ سے سب سے پہلے شذونہ کو فتح کیا اور یہ علاقہ مستقل طور پر اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا۔

قرمونہ کی فتح:

قرمونہ اشبیلیہ سے مشرق کی جانب ۲۵ میل کے فاصلے پر اندلس کا ایک مشہور اور اہم شہر تھا جس کی آبادی آج کل ۲۶ ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ قدیم رومی شہر کارمو (Carmo) ہے، لیکن اس کا نام فینیقی لفظ کرم (تاکستان) سے ماخوذ نہیں سمجھنا چاہیے جیسا کہ بعض تخیل پسند اشتقاقیوں نے کیا۔ بلندی پر واقع ایک مستحکم قلعے کی حیثیت سے، جہاں سے وسیع میدانوں پر زد پڑتی تھی، اسے عہد قیصر میں ایک نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ چنانچہ بعد میں اسے اپنے سکے مضروب کرنے کا حق بھی مل گیا۔ یہ شہر استحکام اور مضبوطی کے لحاظ سے تمام اندلس میں مشہور تھا اور اس کی فتح کوئی آسان نہ تھی بلکہ جوئے شیر لانے کے مترادف تھی۔ شہر کی مضبوطی کے علاوہ یہاں عیسائیوں نے بڑی فوج جمع کر رکھی تھی۔ اگر شہر پر حملہ کیا جاتا تو کئی ماہ تک اس کا محاصرہ کرنا پڑتا کیونکہ فصیل مضبوط تھی اور شہر میں سامان خورد و نوش وافر مقدار میں موجود تھا، لہٰذا محاصرہ طوالت اختیار کر سکتا تھا۔ کاؤنٹ جولین کے آدمیوں نے جو موسیٰ کی راہ نمائی اور جاسوسی کے فرائض انجام دے رہے تھے، انھوں نے اس شہر کو فتح کرنے کی ایک تدبیر کی جس سے یہ شہر آسانی سے فتح ہو گیا۔ انھوں نے قرمونہ جا کر اپنے کو شکست خوردہ اندلسی ظاہر کیا۔ اہل قرمونہ نے ان پر ترس کھا کر انھیں پناہ دے دی۔ اب باہر موسیٰ کی فوج کھڑی تھی اور شہر کے دروازے اہل شہر نے بند کیے ہوئے تھے۔ جولین کے ان آدمیوں نے رات کو شہر پناہ کے پھاٹک کھول

Marfat.com

دیئے۔ باہر موسیٰ اور اس کے فوجی پہلے ہی اس انتظار میں تھے۔ وہ پھاٹک کھلتے ہی شہر میں داخل ہو گئے اور مسلمانوں کا بغیر کشت وخون کے نہایت آسانی کے ساتھ شہر پر قبضہ ہو گیا۔ اور ایک ممتاز شہر مسلمانوں کے زیر نگین ہو گیا۔ (نفح الطیب: ۱/۱۲۶)

اشبیلیہ کی فتح:

اشبیلیہ (Seville) اندلس کا ایک بڑا مشہور شہر تھا۔ اسی نام کے صوبے کا صدر مقام بھی ہے۔ یہ گاتھ خاندان سے قبل اندلس کا پایۂ تخت تھا۔ سطح سمندر سے اوسطاً پینتالیس فٹ کی بلندی پر ایک وسیع وعریض میدان میں دریائے وادی الکبیر کے بائیں کنارے پر واقع ہے جو اسے طریانہ کے مضافات سے الگ کرتا ہے۔ اشبیلیہ کا صوبہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں وادی الکبیر کی ساری نشیبی وادی پر مشتمل تھا اور نہایت ہی خوشحال علاقے میں تھا، جسے یہ دریائے اعظم سیراب کرتا تھا۔ مشرق کی طرف جبل الارک اور قادس تک اس مغرب کی سمت آنہ کی وادی تک پھیلا ہوا تھا۔ پایۂ تخت کے قریب ترین نواح میں جبل الشرف کی ڈھلانیں خاص مورد بخشائیں ہیں۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں انجیر اور زیتون کے باغات اپنے پھلوں کے لیے سارے اسلامی اندلس میں مشہور تھے۔ عرب جغرافیا نویس اس ملک کی قدرتی دولت وثروت کی فراوانی پر حیرت واستعجاب کے اظہار میں نہیں تھکتے۔ تمام جزیرہ نما میں صرف یہی ایک ضلع تھا جہاں کپاس پیدا ہوتی تھی جس کی برآمد بڑی اہم تھی، دوسری مخصوص پیداواریں زعفران اور نیشکر تھے۔ ملک کی آبادی نہایت گنجان تھی۔ الادریسی کے بیان کے مطابق کم از کم آٹھ ہزار گاؤں کسب معاش کے لیے پایۂ تخت کے مرہون منت تھے۔

سنہ ۹۴ھ/سنہ ۷۱۲ء کا موسم بہار تھا جب شذونہ اور قرمونہ کی تسخیر کے بعد موسیٰ بن نصیر نے اشبیلیہ کا رخ کیا۔ یہ شہر مستحکم قلعہ بندیوں سے محفوظ تھا اور اس کی شاندار عمارتوں میں امراء اور عمائدین حکومت سکونت پذیر تھے۔ اس وجہ سے یہاں کے کلیسا کو بھی سارے اندلس میں ایک مرکزی عظمت اور رفعت حاصل تھی۔ موسیٰ سے قبل طارق بن زیاد نے بھی اس پر حملہ کیا تھا لیکن یہاں کے باشندوں نے جزیہ کی شرط پر صلح کر لی تھی لیکن عملاً اطاعت قبول نہ کی تھی۔ جونہی موسیٰ بن نصیر اشبیلیہ پہنچے اہل شہر، شہر کے پھاٹک بند کر کے محصور ہو گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک ماہ کے محاصرے کے بعد مسلمانوں کا اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ تاہم اگر ایک گمنام مصنف کے تذکرے اخبار مجموعہ پر اعتماد کریں جس میں تسخیر شہر کے بارے میں زیادہ تفصیلی بیان ملتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ شہر کے فتح ہونے میں زیادہ وقت لگا تھا۔ عیسائی آبادی کے ایک حصہ نے باجہ (Beja) میں پناہ لی۔ آخر چند ماہ محاصرہ جاری رہنے کے بعد شہر والوں نے سپر ڈال دی۔ موسیٰ شہر میں فاتح کے طور پر داخل ہوئے اور شہر کی دولت اور املاک مسلمانوں کے قبضہ میں آئی۔ بعض تواریخ میں ہے باجہ میں جن لوگوں نے پناہ لی تھی وہ شہر کے رؤسا، امراء اور عمائدین تھے۔ موسیٰ نے مسلمانوں اور یہودیوں کو یہاں آباد کر دیا بلکہ یہودیوں کی ایک خاص بستی یہاں بنائی گئی۔

Marfat.com

ماردہ کی فتح:

اشبیلیہ کو فتح کرنے کے بعد موسیٰ بن نصیر بطلیوس پہنچے اور اس کے مشہور شہر ماردہ کا رخ کیا۔ یہ شہر مغربی اندلس کا ایک مشہور شہر ہے اور اپنی قدامت اور عظمت وشان کے لحاظ سے اندلس کا سب سے ممتاز شہر تھا اور یہ بھی ایک زمانہ میں اندلس کا پایۂ تخت رہ چکا تھا، اسے لیے یہاں بھی کثرت کے ساتھ قدیم آثار، محلات اور بڑے کلیسے اور پل تھے۔ شہر کے گرد نہایت مضبوط اور سنگین فصیل تھی۔

اہل ماردہ بڑے بہادر اور جنگ آزما تھے۔ جونہی مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کیا تو اہل شہر پہلے تو شہر بند ہو گئے، لیکن پھر شاید ان کی بہادری اور جرأت نے انھیں مجبور کیا کہ انھوں نے شہر سے نکل کر بڑی شجاعت اور بہادری سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ اس طرح دونوں طرف سے کئی خون ریز معرکے ہوئے جس میں مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچا اور ماردہ والوں نے انھیں آگے نہ بڑھنے دیا۔ یہ لوگ روزانہ شہر سے نکل کر لڑتے تھے اور شام کو واپس شہر میں چلے جاتے تھے اور شہر کے دروازے اندر سے بند کر دیتے تھے۔ چنانچہ اس طرح ایک طویل مدت گزر گئی۔ آخر موسیٰ بن نصیر نے شہر کے قریب عقب میں ایک پہاڑی کمین گاہ تیار کرائی اور اپنی فوج کے ایک حصہ کو وہاں چھپا دیا۔ صبح ہوئی تو حسب معمول ماردہ کی فوج شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں کے مقابلہ میں صف آرا ہوئی اور اسلامی لشکر سے ہر روز کی طرح مقابلہ کرنے لگی۔ ابھی جنگ شروع ہوئے تھوڑا وقت ہی گزرا تھا کہ کمین گاہ میں چھپی ہوئی مسلمان فوج غنیم کی فوج پر ٹوٹ پڑی اور ان پر عقب سے حملہ کر دیا۔ ماردہ کی فوج اس ناگہانی حملہ کی تاب نہ لا سکی اور ان کی ایک بہت بڑی تعداد قتل ہوئی، چنانچہ اس کی قوت نہایت کمزور ہو گئی اور وہ پسپا ہو کر شہر میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد پھر وہ باہر نہ نکلی اور قلعہ بند ہو کر لڑنا شروع کیا۔ اہل شہر چونکہ قلعہ کے اندر تھے اس وجہ سے مسلمانوں کی فوج کا ان پر کوئی بس نہ چلتا تھا۔ آخر کار موسیٰ نے لکڑی کا ایک دبابہ (موجودہ زمانے کے ٹینک کی طرح) بنوایا اور اس کی آڑ میں فصیل تک پہنچ گئے، اور پھر اس دبابہ میں بیٹھ کر فصیل میں نقب زنی کرنے لگے۔ لیکن شہر کی فصیل اتنی مضبوط اور سنگین تھی کہ مسلمانوں کے سارے قلعہ شکن آلات بے کار ہو گئے۔ محصورین نے جب دیکھا کہ مسلمان فوج شہر کی فصیل کی نقب زنی کر رہی ہے تو وہ بڑی تعداد میں نرغہ کر کے نکل پڑے۔ اہل ماردہ کا یہ حملہ ایسا اچانک تھا اور مسلمان اس حملہ سے بالکل غافل تھے اور وہ اس حملہ کا پوری طرح جواب نہ دے سکے، اس وجہ سے بہت سے مسلمان اس میں شہید ہو گئے۔ یہ لڑائی ایک برج کے پاس ہو رہی تھی، اس لیے مسلمانوں میں اس برج کا نام ''برج الشہداء'' پڑ گیا۔

اس محاصرہ میں مسلمانوں کا اگرچہ کافی جانی نقصان ہوا، لیکن ان کی ہمت پست نہ ہوئی اور انھوں نے محاصرہ نہ اٹھایا۔ ایک روایت کے مطابق موسیٰ نے اہل ماردہ کو صلح کا پیغام دیا۔ وہ بھی مدافعت کرتے کرتے تھک چکے تھے کیونکہ محاصرہ کو کئی ماہ گزر چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے صلح کے اس پیغام کو غنیمت سمجھا اور مصالحت

Marfat.com

کے بعد شہر کے دروازے کھول دیئے اور شوال سنہ ۹۴ھ میں موسیٰ بن نصیر مصالحانہ مارده شہر میں داخل ہو گئے۔ دوسری روایت میں ہے کہ خود شہر والوں نے صلح کا پیغام دیا اور اسلامی لشکر شوال سنہ ۹۴ھ/ جون سنہ ۷۱۳ء عید کے روز شہر میں داخل ہوا۔ صلح کی شرطوں کے مطابق شہر کے باہر کے معرکہ میں جس قدر اہل مارده مارے گئے یا جو جلیقیہ بھاگ گئے تھے، ان سب کا مال اور کلیسا کی کل دولت اور زیورات مسلمانوں کے قبضہ میں آئی۔ باقی دوسرے لوگوں کے مال و دولت سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔

(نفح الطیب: ۲۶۶/۱۔۲۷۱، مجموعہ اخبار فتح اندلس: ص ۱۶۔۱۸)

اشبیلیہ کی بغاوت:

موسیٰ بن نصیر ابھی مارده میں ہی تھے کہ انھیں اطلاع ملی کہ اہل اشبیلیہ نے بغاوت کر دی ہے۔ اشبیلیہ کے گرد و نواح کے دو شہروں لبلہ اور باجہ کے باشندوں سے مل کر اشبیلیہ میں آباد اسی (۸۰) مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ باقی بھاگ کر مارده پہنچے اور موسیٰ کو اس بارے میں اطلاع دی۔ موسیٰ خود چونکہ مارده میں مصروف تھے اس وجہ سے انھوں نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اشبیلیہ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ اندلس میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ اس سے پہلے اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ جن یہودیوں کو مسلمانوں نے یہاں آباد کیا تھا، انھوں نے بھی مسلمانوں کی کوئی مدد نہ کی۔ موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز نے اس شہر کو دوبارہ فتح کر کے سارے باغیوں کا قلع قمع کر دیا، ان کا مال و متاع اور جائدادیں ضبط کر لیں اور پھر مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ وہ خود اس شہر میں سکونت پذیر ہو گیا۔ جب اس کا والد موسیٰ بن نصیر مشرق کی طرف چلا گیا تو عبدالعزیز اسلامی اندلس کا گورنر بن گیا اور اس نے اشبیلیہ کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ وہاں اس نے قوطی بادشاہ راڈرک (Roderick) کی بیوہ اجلونہ (Egilona) سے جسے عام مؤرخین ایلو اور ام عاصم لکھتے ہیں، شادی کر لی۔ اس نے سینٹ روفینا (St. Rufina) کے قدیم گرجے کو اپنا مستقر بنایا اور اس کے بالمقابل ایک مسجد تعمیر کرائی۔ یہی مقام تھا جہاں اس کے سپاہیوں نے خلیفہ دمشق سلیمان بن عبدالملک کا اشارہ پا کر اسے رجب سنہ ۹۷ھ/ مارچ سنہ ۷۱۶ء میں قتل کر دیا۔

لبلہ اور باجہ کی فتح:

عبدالعزیز نے صرف اشبیلیہ کی بغاوت ہی فرو نہ کی بلکہ اسے جب پتہ چلا کہ لبلہ اور باجہ کے لوگوں نے بھی اس بغاوت میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور اشبیلیہ والوں کی پوری پوری مدد کی ہے تو اس نے ان دونوں شہروں پر بھی فوج کشی کر دی اور ان دونوں شہر کو بھی فتح کر لیا۔ یہاں کے امراء اور عمائدین شہر سے نکال دیئے گئے کیونکہ انھوں نے اس بغاوت میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ جن امراء اور عمائد کو شہر سے نکالا گیا ان کے

Marfat.com

محلات، مکانوں، جائدادوں کو مسلمانوں کی ملکیت میں دے دیا گیا۔ پھر مارده کے گردونواح میں فوج کے دستے بھیجے گئے جنھوں نے گردونواح کا پورا علاقہ فتح کر کے اپنا مطیع ومنقاد بنالیا۔

طارق اور موسیٰ بن نصیر کی ملاقات:

موسیٰ بن نصیر جب اندلس آیا تھا وہ طارق بن زیاد سے نہیں ملا تھا۔ موسیٰ تو طارق سے ناراض تھے۔ وہ شاید ملنا نہیں چاہتے تھے لیکن طارق تو ان کا ماتحت افسر تھا اس کو تو ضرور ملنا چاہیے تھا، لیکن موسیٰ کی اندلس میں آمد کی اطلاع ملنے کے باوجود طارق بھی موسیٰ سے نہ ملے۔ مارده فتح کرنے کے بعد ماہ شوال سنہ ۹۴ھ کے آخر میں موسیٰ طلیطلہ روانہ ہو گئے۔ طارق کو جب موسیٰ کی آمد کی اطلاع ملی تو انھوں نے طلیطلہ سے باہر نکل کر طلبیرہ میں پہنچے اور وہاں موسیٰ کا استقبال کیا۔ موسیٰ طارق کی حکم عدولی سے سخت برہم تھا، چنانچہ موسیٰ طارق کو دیکھتے ہی برس پڑے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ طارق کی نافرمانی کی پاداش میں اس کو کوڑے بھی لگائے۔ اس سلسلہ میں مؤرخین نے بڑی بے سروپا باتیں لکھی ہیں۔ بعض عیسائی مؤرخین نے طارق کے قید کیے جانے اور پھر اس کے قتل کا ارادہ رکھنے اور دارالخلافہ دمشق سے ان کی رہائی کا پروانہ آ جانے کا افسانہ بھی لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک اس قسم کے سارے افسانے غلط ہیں۔ زیادہ صحیح روایت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ موسیٰ طارق کو معمولی تنبیہ کے بعد راضی ہو گئے چنانچہ مقری کے الفاظ ہیں:

"اصطلح مع طارق واظهر الرضاعنه" (نفح الطیب: ۱/۱۲۸)

''موسیٰ نے طارق سے صلح کر لی اور اس سے اپنی خوشنودی ظاہر کی۔''

اور ابن اثیر نے لکھا ہے:

''موسیٰ بن نصیر طارق کے پاس گئے۔ طارق نے اسے راضی کیا اور وہ راضی ہو گئے اور طارق کے عذر کو قبول کر لیا۔'' (کامل لابن اثیر: ۴/۴۵۶)

علامہ بلاذری نے بھی یہی لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتوح البلدان: ص ۲۳۰)

اور یہی روایت درست بھی ہے کیونکہ طارق بن زیاد سے کوئی اتنی بڑی غلطی نہیں ہوئی تھی کہ اس پر اس کو اتنی بڑی سزا دی جاتی جیسا کہ عیسائی مؤرخین نے لکھا ہے۔ بہر حال ان دونوں کی یہ پہلی ملاقات خوشگوار رہی اور موسیٰ بن نصیر کے دل میں طارق کے بارے میں جو رنجش کے جذبات تھے وہ نکل گئے، اور موسیٰ نے انھیں اپنے منصب پر برقرار رکھا اور اندلس کے ہراول دستوں کا قائد بنا دیا اور وہ اپنے سپہ سالاری کے عہدہ پر برقرار رہے۔ طلیطلہ جا کر موسیٰ نے مال غنیمت کا جائزہ لیا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ طلیطلہ کی فتح میں اتنا سونا چاندی اور مختلف قسم کا دوسرا ساز و سامان ملا تھا کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی میں شاہانہ گاتھ کے تاج بھی تھے۔

(الامامۃ والسیاسۃ: ۲/۶۱)

Marfat.com

شمالی اندلس کی فتوحات:

طلیطلہ پہنچنے کے بعد موسیٰ نے اندلس کے باقی حصوں پر فوج کشی کے انتظامات کیے اور طارق کو مقدمۃ الجیش کے طور پر شمالی اندلس کی طرف اپنے آگے روانہ کر دیا۔ طارق متعین مقامات پر جاتے اور موسیٰ پورا اسلامی لشکر اس کے پیچھے پیچھے لے کر جاتے اور اس طرح نئے نئے شہر اسلامی مملکت کے دائرہ میں داخل ہوتے جاتے۔

تاریخوں میں موسیٰ بن نصیر کے طلیطلہ پہنچنے تک کے واقعات سلسلہ وار ہیں لیکن اس کے بعد واقعات کی ترتیب اور تفصیل قائم نہیں رہتی۔ بہر حال دونوں دنیا کے بہترین سپہ سالار آگے پیچھے روانہ ہوئے اور طلیطلہ سے سرقوسہ تک کا علاقہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ مقری کا بیان ہے کہ اندلسیوں پر مسلمانوں کی اس قدر ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ ان کو روکنے والا اور ان کی پیش قدمی میں کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں تھا۔ طارق بن زیاد جدھر رخ کرتے فتح و کامرانی ان کے ہم رکاب ہوتے تھے۔ اندلسی خود پیش قدمی کر کے مصالحت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ طارق آگے آگے فتح کرتے جاتے اور موسیٰ پیچھے پیچھے صلح ناموں اور معاہدوں کی تصدیق کرتے جاتے۔ (نفح الطیب :۱/۱۲۸)

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ یہ ساری مہمات شمالی اندلس کی تھیں۔ موسیٰ نے دربار خلافت میں فتح اندلس کے بارے میں ایک تجویز منظوری کے لیے بھیجی ہوئی تھی۔ وہ اس کی منظوری کے انتظار میں تھے۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ وہ اندلس، فرانس، اطالیہ (اٹلی) یوگوسلاویہ اور بلغاریہ سے گزر کر قسطنطنیہ میں داخل ہو اور پھر یہاں سے اناطولیہ سے گزر کر شام میں آجائے، ان تمام مہمات میں انھوں نے اپنی اس تجویز کو ذہن میں رکھا۔ چنانچہ مقری نے لکھا ہے:

''اس نے (موسیٰ بن نصیر) نے یہ ارادہ کیا کہ قسطنطنیہ کی طرف سے مشرق (یعنی دمشق) میں آئے اور دروب شام اور دروب اندلس کی طرف بڑھے۔ اور ان دونوں دروب کے درمیان جو عجمی نصرانی قوتیں ہیں، ان میں گھس کر ان سے جہاد کرے اور ان کو شکار بنائے یہاں تک کہ دارالخلافہ سے مل جائے۔''

مقری نے ایک مقام پر لکھا ہے:

''اور وہ (موسیٰ بن نصیر) یہ امید رکھتا تھا کہ فرنگیوں کے جو شہر باقی رہ گئے ہیں ان کو چیر کر (یعنی فتح کر کے) ارض کبیرہ میں گھس جائے یہاں تک کہ شام تک لوگوں سے مل جائے۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ اس سرزمین کو چیر کر اس نے جو شگاف پیدا کر دیا ہے، اس کو ایک وسیع راستہ بنا دے جس پر اہل اندلس مشرق کی طرف آمد و رفت کرنے میں خشکی پر چل سکیں اور سمندر سے ہو کر نہ گزریں۔''

(نفح الطیب :۱/۱۲۸، ۱۳۱)

Marfat.com

موسیٰ نے یہ مہم اپنے اسی نقطۂ نظر سے شروع کی تھی، اس وجہ سے وہ ان مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے غیر معمولی حسن سلوک اور نرمی سے پیش آنا چاہتا تھا تاکہ مفتوحہ شہروں کے لوگوں کے دلوں میں مسلمانوں سے نفرت پیدا نہ ہو اور حسن معاملہ سے ان کو مسلمانوں پر ایسا اعتماد حاصل ہو کہ اسلامی اقتدار ان کو بار محسوس نہ ہو۔ اور ان مفتوحہ علاقوں میں امن و امان قائم رہے، رعایا میں بغاوت کے جذبات پیدا نہ ہوں اور مسلمان نہایت اچھے طریقہ سے ان پر تادیر حکومت کرتے رہیں۔

اس تجویز کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ اندلس سے شام تک کے علاقہ کو جب خشکی کی شاہراہ مل جاتی تو پھر غیر معمولی تمدنی، اقتصادی اور رفاہی فوائد حاصل ہو سکتے تھے اور اس پورے علاقہ کی اقتصادی حالت بہتر ہوتی کیونکہ ہر زمانہ ہی میں اقتصادی مضبوطی ملک کی تمدنی ترقی کا باعث رہی ہے۔ چنانچہ موسیٰ نے اس مہم پر روانہ ہونے سے قبل فوج کو چند امور کی تلقین خاص طور پر کی اور اس کی خلاف ورزی پر سنگین سزا مقرر کی۔ وہ امور حسب ذیل ہیں:

① جس شہر کو فتح کیا جائے اس کو تاخت وتاراج نہ کیا جائے۔
② حملے فوجی طریقہ کے مطابق ہوں اور صرف ملک گیری کے لیے ہوں۔
③ مفتوحہ شہروں کے لوگوں کے مذہبی جذبات کا پورا احترام کیا جائے۔
④ لوٹ مار یا کسی اور کسی قسم کی زیادتی یا ظلم نہ کیا جائے۔
⑤ حکم عدولی کی صورت میں مسلمان سپاہیوں کو موت کی سزا دی جائے گی۔

فوج کو ان ہدایات اور ذہن میں اس پلاننگ کو رکھتے ہوئے اسلامی لشکر نے مزید فتوحات کے لیے طلیطلہ سے باہر قدم نکالا اور سرزمین اندلس میں ان کو غیر معمولی آسانی کے ساتھ فتوحات حاصل ہوتی رہیں۔ ان مہمات میں طارق بن زیاد مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے آگے اور موسیٰ بن نصیر اپنی پوری فوج کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے شہر فتح کرتے جا رہے تھے۔ انھوں نے شمالی اندلس کی جانب سے فتوحات شروع کیں اور کسی جگہ بھی کسی منظم جماعت نے ان کا کوئی قابل ذکر مقابلہ نہیں کیا یہاں تک کہ وہ اس صوبہ کے صدر مقام سرقوسہ (سرقسطہ) تک نہایت آسانی سے پہنچ گئے، اور اس شہر کا بھی محاصرہ کر کے نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ اس شہر کے فتح ہونے کے ساتھ ہی گویا پورا شمالی اندلس مسلمانوں کے زیر اقتدار آ گیا۔ یہاں کے گردونواح جو چھوٹے موٹے قلعے تھے ان پر فوجی دستے بھیجے گئے اور ان کے دروازے بغیر کسی مزاحمت کے کھلتے گئے۔ اسی طرح آس پاس کی آبادیوں اور قصبوں کی طرف فوج کشی کی گئی، جب مسلمانوں کے اس فوجی سیلاب کے سامنے اندلس کے بڑے بڑے شہر نہ ٹھہر سکے تو ان چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں کی کیا حیثیت تھی کہ وہ مزاحمت کرتے لہٰذا جہاں جہاں مسلمان فوجیں گئیں وہ علاقے آسانی سے فتح ہوتے گئے۔ بلکہ کئی علاقے ایسے تھے جہاں صرف طارق بن زیاد کا مقدمۃ الجیش گیا اور علاقہ اور شہر فتح ہو گیا، موسیٰ کے لشکر کی وہاں ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی۔ بعض شہروں

Marfat.com

کے رہنے والے طارق بن زیاد یا موسیٰ بن نصیر کے پاس خود مصالحت کے لیے آ گئے اور مسلمانوں کو ان شہروں کی طرف جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ مسلمانوں نے ان لوگوں کو معقول شرطوں پر امان دے دی۔ طارق جہاں جہاں جو شرطیں لوگوں سے طے کرتے تھے، موسیٰ بن نصیر وہاں پہنچ کر ان شرطوں کی تصدیق کر دیتے تھے۔ اس طریقہ سے شمال مشرقی اندلس کا پورا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگین ہو گیا، اور اتنے علاقہ کو فتح کرنے میں زیادہ وقت بھی نہ لگا۔

اس صوبہ کو فتح کرنے کے بعد سرقسطہ کو دارالحکومت قرار دے کر اسلامی حکومت کی تاسیس نو عمل میں لائی گئی اور اس کا پہلا گورنر عبداللہ بن حنش کو بنایا گیا۔ بہت سے افریقی مسلمانوں کو اس علاقہ میں آباد کیا گیا۔ ان کے ساتھ یہودیوں کی بھی ایک بستی یہاں آباد کی گئی۔ مسلمانوں نے جب اس علاقہ کو فتح کیا اس وقت سے لے کر عبدالرحمٰن الداخل کے یہاں قبضہ کرنے تک یعنی ۴۶ برس تک مختلف گورنر یہاں بھیجے گئے۔ یہ سب گورنرز والیٔ اندلس کے ماتحت ہوتے تھے اور والیٔ اندلس شام کی حکومت کے تحت ہوتا تھا۔ مگر ہر زمانہ میں اور صوبوں کے گورنرز کے مقابلہ میں اس صوبے کے گورنر کو ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی۔

شمال مشرقی اندلس پر قبضہ:

شمالی اندلس کے شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد اب ان دونوں جرنیلوں نے اندلس کے شمال مشرقی علاقوں کی طرف رخ کیا۔ چنانچہ اس علاقہ کے مشہور ساحلی شہر برشلونہ کو فتح کیا۔ یہ شہر بحر متوسطہ کے ساحل پر جو فرانس کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ پھر اور آگے بڑھ کر فرانس کی سرحد کے بالکل قریب دریائے روڈ ونہ تک پہنچ گئے اور ابونہ، حصن انبیون، طرکونہ اور جرندہ کے شہروں کو اسلامی حکومت میں داخل کیا۔ ان مقامات میں بھی مسلمانوں کو بسایا گیا۔ شروع میں یہ علاقہ بھی سرقسطہ کے گورنر کے ماتحت رکھا گیا اور ان شہروں کو صوبہ سرقسطہ کی حدود میں داخل کر دیا گیا۔ اس سے قبل یہ دوسرے صوبہ کی حدود میں تھا۔

جنوبی فرانس کے شہروں پر قبضہ:

اندلس کے شہروں کی فتح نے اہل فرانس کو چونکا دیا تھا۔ دوسرے اب مسلمان فوجیں حدود فرانس کے بالکل قریب تھیں۔ ادھر مسلمانوں کی بھی فرانس کی طرف نگاہ اٹھی اور موسیٰ بن نصیر نے جو تجویز خلیفۂ اسلام کو لکھ کر دمشق بھیجی ہوئی تھی اس میں بھی فرانس کی فتح شامل تھی۔ چنانچہ شمال مشرقی اندلس کو فتح کر کے موسیٰ بن نصیر نے اب جنوبی فرانس کی طرف پیش قدمی کی۔ مسلمانوں کی فرانس کی طرف پیش قدمی سے اہل فرانس کو بے چینی اور پریشانی لاحق ہو گئی۔ (یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ عربی تواریخ میں ارض الکبیر اور افرنجہ کا لفظ آیا ہے جس سے مراد جبل البرانس کے اس پار کے تمام یورپین ممالک ہیں، لیکن اس موقع پر اس سے مراد اندلس سے ملا ہوا

Marfat.com

فرانس کا علاقہ ہے) اہل فرانس کی اس بے چینی کو دیکھ کر وہاں کا بادشاہ قارلہ ایک لشکر جرار کے ساتھ مسلمانوں کی مزاحمت کے لیے آگے بڑھا۔ مسلمان اس وقت حصن لوڈون تک پہنچ چکے تھے، لیکن ان کے ساتھ کوئی بڑی قوت نہ تھی، اس لیے قارلہ کی فوجوں کی کثرت کا حال سن کر وہ اربونہ واپس چلے گئے اور اس کے قریب ایک پہاڑی کے دامن میں خیمہ زن ہو گئے۔

''قارلہ'' غالباً چارلس مائل کی تعریب ہے، اس لیے کہ اس زمانہ میں یہی فرانس کے تخت پر براجمان تھا، لیکن عام تاریخوں کے مطابق چارلس اور مسلمانوں کا پہلا مقابلہ سنہ ۱۱۴ھ/سنہ ۷۳۲ء میں ہوا۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہت پہلے طارق سے مقابلہ ہوا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قارلہ فرانس کی جنوبی سرحد پر چارلس مائل کوئی صوبے داریا حاکم رہا ہو۔ بہر حال اتنا یقینی ہے کہ مسلمان فرانس کی حدود میں سب سے پہلے اسی زمانہ میں داخل ہوئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''قارلہ'' کی شخصیت مشہور رہی ہے اور غالباً یہ ''کارلنگین'' کی تعریب ہے۔

بہر حال مسلمان فوجیں فرانس کی فوجوں کی کثرت دیکھ کر واپس اربونہ آ گئے، لیکن ابھی وہ اربونہ میں داخل نہ ہوئے تھے کہ قارلہ اپنی فوجوں کے ساتھ دفعتاً پہنچ گیا۔ مسلمانوں کو اس کی نقل وحرکت کی کچھ خبر نہ تھی اور انھیں اس حملہ کی کوئی توقع بھی نہ تھی، لیکن پھر بھی انھوں نے مقابلہ کیا۔ چونکہ مسلمان پہلے سے تیار نہ تھے اور حملہ اچانک ہوا تھا اس وجہ سے بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور کچھ لڑتے بھڑتے نکل گئے اور اربونہ شہر میں داخل ہو کر قلعہ بند ہو گئے۔ اندلسی فوج نے بڑی سختی سے اربونہ کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمان بھی جم کر محاصرہ کو توڑنے کی کوشش کرتے رہے اور کبھی کبھی شہر سے باہر نکل کر حملہ آور ہو کر فرانسیسیوں کو تہ تیغ کرتے۔ جب محاصرہ طویل ہوا تو انھیں مسلمانوں کی کمک آ جانے کا خطرہ لاحق ہوا، اس لیے چند دنوں کے بعد قارلہ محاصرہ اٹھا کر واپس چلا گیا، اور وادیٔ رودونہ میں قلعہ اور چھاؤنیاں قائم کر کے فوجیں متعین کر دیں تا کہ مسلمان فرانس کی حدود کی طرف نہ بڑھ سکیں۔

بعض تواریخ میں ہے کہ موسیٰ بن نصیر نے جنوبی فرانس کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور پہلا حملہ جنوبی فرانس کے مشہور ساحلی شہر اربونہ جس کو انگریزی میں ناربون (Norbonna) کہتے ہیں، پر کیا گیا اور وہ اسلامی قلمرو میں داخل کر لیا گیا۔ پھر اس شہر کو فوجی چھاؤنی بنا کر فرانس کے مختلف شہروں پر حملہ کیا گیا۔ پھر وہ مشرقی فرانس کے مشہور شہر حصن لوذون پہنچے۔ پھر وہاں سے اوینوں کا رخ کیا۔ مسلمان ابھی راستہ ہی میں تھے کہ انھیں اہل اندلس کے ایک بہت بڑے لشکر کے اکٹھا ہونے کی اطلاع ملی، لیکن مسلمان فوج نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور اوینوں کے شہر میں داخل ہو گئے۔ اس طرح سے مشرقی فرانس کے تین اہم شہر اربونہ، حصن لوذون اور اوینوں مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے۔ مسلمانوں کے فرانس میں داخل ہونے سے عیسائی حکمرانوں میں بے چینی پھیل گئی اور وہ نہایت پریشان ہو گئے اور اندلس کی حالت کے پیش نظر فرانس والے بھی

Marfat.com

اپنے کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ اس زمانہ میں فرانس میں نوابوں (Counts) کی حکومت ہوتی تھی اور ان نوابوں کی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم تھیں۔ ان میں سے پیپن آف ہرسٹل (Pepin of Heristal) اپنے زور بازو سے مرکزی فرانس کے تخت پر قابض ہو چکا تھا، اور وہی شخص فرانس کے فرمان روا خاندان کارالیکین (Caralingion) کا بانی تھا، اس کو عرب مؤرخین قارلہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ پیپن آف ہرسٹل نے تمام نوابوں کو اکٹھا کر کے فرانس کو مسلمانوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر تشکیل دیا۔ اس لشکر کے بارے میں جب مسلمانوں کو اطلاع ملی تو انھیں بہت تشویش ہوئی کیونکہ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے پاس بڑی فوج نہ تھی۔ مسلمان اس وقت اوینون میں تھے، لیکن اس شہر کی فصیل اتنی مضبوط اور مستحکم نہ تھی کہ اس شہر میں رہ کر مسلمان اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کر سکتے۔ لہٰذا جرنیلوں کے مشورہ کے بعد انھوں نے اوینوں کو چھوڑ کر اربونہ واپس آنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اربونہ کی قلعہ بندی نہایت مضبوط اور سنگین تھی، چنانچہ جب مسلمانوں کا لشکر اوینوں کو چھوڑ کر اربونہ آیا تو اس نے دیکھا کہ فرانسیسی لشکر شہر کا محاصرہ کیے ہوئے ہے اور انھوں نے شہر میں داخل ہونے کا راستہ بند کر رکھا ہے۔ مسلمان اس صورت حال سے پریشان ہوئے وہ شہر میں تو داخل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے انھوں نے اربونہ کے سامنے ایک پہاڑی کے دامن میں اپنے مورچے بنا لیے۔ پیپن (Pepin) دفعتاً حملہ آور ہوا۔ مسلمانوں کی جنگی پوزیشن مناسب نہ تھی اور دشمن نے ہر طرف سے ان کو گھیرا ہوا تھا اس وجہ سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے، لیکن انھوں نے اپنی ہمت نہ ہاری اور غنیم سے لڑتے بھڑتے کسی طرح شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ان کا بہت بڑا جرأت مندانہ کام تھا۔ شہر میں داخل ہو کر انھوں نے شہر کے پھاٹک بند کر لیے۔ فرانسیسی فوج کو اندر جانے کی جرأت تو نہ ہوئی لیکن پیپن نے اربونہ کا بڑی سختی سے محاصرہ کر لیا۔ مسلمان اربونہ کے محاصرہ کو توڑنے کی پوری پوری کوشش کرتے رہے، کبھی شہر سے باہر نکل کر دشمن پر حملہ آور ہوتے اور ان کو موت کے گھاٹ اتارتے لیکن وہ محاصرہ ان سے نہ ٹوٹا۔ جب محاصرہ لمبا ہو گیا۔ فرانسیسی فوج بھی تنگ آ چکی تھی اور اس کے دلوں پر مسلمان فوج کا قدرتی طور پر کچھ رعب بھی تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ طارق اور موسیٰ کی فوجیں ایک دوسرے سے علیحدہ تھیں اور ہر وقت خطرہ تھا کہ مسلمانوں کو کہیں نہ کہیں سے کمک پہنچ جائے گی جس کی وجہ سے فرانسیسی فوج کو سخت جانی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس اندیشہ سے فرانسیسی فوج کچھ عرصہ کے بعد محاصرہ اٹھا کر چلی گئی۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الامامۃ والسیاسۃ، نفح الطیب: ۱۲۸/۱، ابن اثیر: ۴۴۷/۴ وغیرہ)

یورپی حکمرانوں کی مجلس مشاورت:

پیپن اربونہ کا محاصرہ ختم کر کے واپس تو آ گیا، لیکن اسے اس بات کی بڑی فکر تھی کہ مسلمانوں نے جس طرح اندلس کے ایک بہت بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا ہے اسی طرح ایک روز وہ فرانس پر حملہ کر کے قبضہ کر

Marfat.com

لیں گے اور فرانس کی حدود میں داخل ہو کر وہ دو تین شہر تو پہلے ہی فتح کر چکے ہیں۔ لیکن وہ اکیلا مسلمانوں کے اس حملہ کا سد باب نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کے پاس مسلمانوں کے مقابلہ کی طاقت تھی۔ اس کی فوج پر مسلمانوں کی ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے سے کترا رہی ہے۔ خود اس کے اپنے دل پر بھی اسلامی فوج کا رعب طاری تھا۔ ان سب چیزوں کے پیش نظر اربونہ کا محاصرہ ختم کر کے جب وہ واپس آ گیا تو اس نے یورپ کے تمام حکمرانوں کا ایک اجتماع اپنی سرکردگی میں بلایا جس میں یورپ پر اسلامی حملے اور اس سے آئندہ ہونے والے حالات پر غور و فکر کرنے کے لیے کہا گیا۔ تمام حکمرانوں نے آپس میں اس بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ چند ہزار بے سروسامان سپاہیوں کا ایک آبنائے کو عبور کر کے یورپ میں سیلاب کی مانند گھستے چلے آنا اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ لوگ انسان نہیں بلکہ عام انسانوں سے کوئی مافوق مخلوق ہے۔ ان کے پیچھے سمندر ہے اور آگے غنیم لیکن یہ جس عزم و حوصلہ اور جوش و خروش سے بڑھتے رہے، ان کا راستہ روکنا یا ان کی مزاحمت کرنا اور ان کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ان کو اسی حال پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ ان کی مزاحمت نہ کی جائے۔ یہ لوگ صرف مال و دولت اکٹھا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ جب ان کے دامن مال و دولت سے بھر جائیں گے اور ان میں مال و دولت کے حصول میں مسابقت اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو گا تو اس باہمی آویزش سے ان کی یہ سلطنت جس کو وہ اس جرأت و ہمت سے فتح کر رہے ہیں، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ اس وقت ان کی سلطنت کو ختم کرنا نہایت آسان ہو گا اور پھر یورپ کی سرزمین سے ان کے نام و نشان کو مٹا دینا بھی نہایت آسان ہو گا۔

یورپ کے ان حکمرانوں کی یہ اجتماعی سوچ اور فکر بالکل درست اور صحیح تھی کیونکہ وہ مال و دولت کی خرابیاں دیکھ رہے تھے مال کے اس جذبۂ مسابقت نے انھیں اس مقام پر پہنچایا تھا کہ چند ہزار اجنبی فوجیوں نے یورپ کے ایک بہت بڑے ملک اندلس پر قبضہ کر لیا اور اب وہ فرانس پر قبضہ کی سوچ رہے تھے۔ انھیں پتہ تھا کہ مال و دولت کی محبت آدمی کو ذلت و خواری کی گہری غار میں لے جاتی ہے، لہٰذا یورپ کے حکمرانوں کی اس مجلس مشاورت نے یورپ میں مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور اثر کے متعلق جو فیصلہ کیا وہ درست تھا اور متفقہ تھا۔ چنانچہ اس فیصلہ کے بموجب آئندہ کی کارروائیاں جاری رہیں۔ اس وجہ سے پپین نے اب یورپ کی عیسائی حکومتوں کے متحدہ جارحانہ حملہ کا ارادہ ترک کر دیا حالانکہ حکمرانوں کی وہ مجلس مشاورت اسی غرض کے لیے بلائی گئی تھی۔ اب اس نے صرف اپنی حکومت کی حدود میں دریائے رول کے کنارے کنارے نہایت مضبوط اور مستحکم فوجی چوکیاں تعمیر کر لیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فرانس کے جتنے شہر مسلمانوں نے فتح کر لیے تھے، اس نے ان کو مسلمانوں کی حکومت کی حدود میں عملی طور پر تسلیم کر لیا۔ آگے چل کر حالات کے نشیب و فراز اور روز و شب کی کروٹوں نے یہ ثابت کر دیا کہ پپین آف ہرسٹل نے سرحد کی تعیین کے لیے جو فوجی چوکیاں تعمیر کیں وہی سرزمین فرانس میں مسلمانوں کا آخری مستقر قرار پائیں اور مستقبل میں مسلمانوں کو ان سے آگے بڑھنے کی

Marfat.com

ضرورت ہی پیش نہ آئی کیونکہ دارالخلافت دمشق سے موسیٰ بن نصیر کا وہ پلان جو انھوں نے دربارخلافت میں منظوری کے لیے بھیجا تھا، یک قلم رد ہوگیا تھا۔ جس کا انھیں بہت افسوس تھا کہ مستقبل کے واقعات نے اس کی منظوری نہ دینے کو غلط ثابت کر دیا۔ اگر وہ منظوری مل جاتی تو آج یورپ کے حالات وہ نہ ہوتے جو آج ہیں۔ لیکن وہی ہوتا ہے جو حق تعالیٰ شانہ کو منظور ہوتا ہے۔

موسیٰ بن نصیر کی تجویز کا رد ہونا:

موسیٰ بن نصیر کی تجویز جو ہمارے خیال میں نہایت اعلیٰ تھی اور قابل عمل بھی، وہ دربار خلافت سے مسترد ہوگئی، اور اس کے مسترد ہونے کی ایک بڑی وجہ مسلمانوں کی اربونہ میں ناکامی بھی تھی جب اس شہر میں مسلمانوں کے شہید ہونے اور غیر معمولی مصائب برداشت کرنے کا تذکرہ اور اس کی تفصیلات دمشق پہنچیں تو ولید بن عبدالملک نہایت پریشان ہوا۔ اس زمانہ میں حالات ایسے نہیں تھے بلکہ اس وقت مسلمانوں کے خون کی قدر و قیمت تھی۔ آج تو امریکہ بھی مسلمانوں کو مار رہا ہے، روس بھی مار رہا ہے اور دوسرے غیر مسلم ممالک بھی مار رہے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ خود مسلمان ملک بھی مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ اس زمانہ میں خون مسلم کی اتنی ارزانی نہ تھی جتنی آج ہے۔ اربونہ میں مسلمانوں کے شہید ہونے کی خبر نے مرکزی حکومت کو پریشان کر دیا۔ چنانچہ خلیفہ نے اندلس کی سفارت کے لیے مغیث کو منتخب کیا جو قرطبہ کو فتح کرنے کی مہم انجام دے کر اندلس سے مشرق چلا گیا تھا۔ (نفح الطیب: ۲: ۵۵/، ابن اثیر: ۴/۴۴۷) اور اس کو ہدایت کی کہ وہ موسیٰ کو اپنے پلان پر عمل کرنے سے پوری طرح روکے۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنی مزید پیش قدمیوں کو روک دے بلکہ اندلس کی حکومت کا انتظام و انصرام کر کے بلا تاخیر دربار خلافت دمشق میں پہنچ جائے۔ ولید بن عبدالملک کو موسیٰ کی کارروائیوں سے یہ بھی شبہ ہوا کہ شاید وہ اس حکم کی تعمیل میں لیت و لعل کرے، اس لیے قاصد کو در پردہ ہدایت کر دی گئی کہ اگر موسیٰ بن نصیر کی طرف سے اس فرمان کی تعمیل میں کوئی تذبذب ظاہر ہو تو وہ عام سپاہیوں کو خود پیش قدمی کرنے سے روک دے اور اپنی حدود میں واپس چلے آنے کی ہدایت کرے۔ اس تاکیدی حکم کے ساتھ مغیث کو واپس اندلس بھیجا گیا اور اس کو جلدی پہنچنے کی تاکید بھی کی گئی۔

ایک عجیب نکتہ کی دریافت:

مغیث، فرمان خلافت کے مطابق منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا واپس اندلس گیا، ابھی وہ اندلس پہنچا نہیں تھا کہ فرانس کے میدان میں حملہ آور مسلمانوں کو عربی زبان میں ایک کتبہ ملا جس پر لکھی ہوئی عربی عبارت نے فوج کے اکثر سپاہیوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہ کتبہ ایک جگہ نصب کیا ہوا ملا جس پر حسب ذیل عبارت عربی زبان میں کندہ تھی:

Marfat.com

"بنو اسماعیل! یہ تمھاری آخری حد ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔"

یہ کتبہ ضعیف الاعتقاد بربری قبائل کے ارادوں کو متزلزل کر دینے میں کامیاب ہوا۔ موسیٰ بن نصیر نے جب اپنی فوج کے طور واطوار دیکھے اور انھیں کتبہ کی اس عبارت سے متاثر ہوتے دیکھا تو فرانس کی طرف اس نے پیش قدمی روک دی اور جہاں تک مسلمان فوجیں پہنچ چکی تھیں، اس کو اپنی آخری سرحد قرار دے کر اپنی فوج کا رخ اندلس کے غیر مفتوحہ علاقہ صوبہ جلیقیہ کی طرف پھیر دیا۔

کتبہ کی یہ روایت مختلف عربی تواریخ میں موجود ہے۔ اگر یہ روایت درست ہے اور اس کی سند اور موسیٰ کا عمل اس کے صحیح ہونے کی تائید کرتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتبہ کہاں سے آیا؟ ہمارے خیال میں یہ ایک منظم سازش کا نتیجہ تھا۔ یا تو فرانس کے بادشاہ نے سرحدی قلعوں کی تعمیر کے وقت مسلمانوں کے عزم و حوصلہ کو پست اور ان کے ارادوں کو پست کرنے کے لیے کسی پادری سے اس کو تیار کرا کر نصب کرایا ہوگا، یا پھر ولید بن عبدالملک کے قاصد مغیث نے ولید کے خفیہ اشارہ کی تعمیل کے لیے یہ کارروائی کی ہوگی تاکہ فوج کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موسیٰ کو لشکر واپس لے جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ بہرحال جس نے یہ سازش کی وہ اپنی اس سازش میں کامیاب ہو گیا اور موسیٰ کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنی فوج کو فرانس سے ہٹا کر اندلس کی طرف لے آئے۔ ہمارا اپنا زیادہ رجحان یہ ہے کہ یہ شاہ فرانس کی سازش تھی جو کسی عربی دان پادری سے مل کر اس نے کی۔ موسیٰ کی پیش قدمی جلیقیہ کی طرف جاری تھی کہ راستہ میں ولید بن عبدالملک کا قاصد اس سے آکر ملا، اور خلیفہ کا مکتوب زبانی ہدایات کے ساتھ پلان کو اس خط میں مسترد کر دیا گیا تھا، لیکن اس حکم کی وہ نافرمانی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف جلیقیہ کی مہم بھی سر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے خط پڑھ کر مغیث کو حالات وواقعات کے نشیب وفراز سمجھا کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ٹھہر کر جلیقیہ کی مہم کے سر ہونے کا انتظار کرے۔

اسی اثناء میں موسیٰ بن نصیر کو غرناطہ کے علاقہ میں کسی عیسائی قائد کے سر اٹھانے کی اطلاع موصول ہوئی۔ موسیٰ نے اپنے لڑکے عبدالاعلیٰ کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ عبدالاعلیٰ فوری طور پر غرناطہ کے علاقہ میں فوج کا ایک دستہ لے کر گیا۔ اس باغی قائد کو شکست فاش دی اور اسے گرفتار کر کے پا بجولاں اپنے ساتھ لایا۔

مغربی صوبوں کی فتوحات:

اب موسیٰ کے لیے فرانس کی حدود میں آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ موسیٰ فرانس سے بخط مستقیم مغرب میں چلے اور خلیج بشکنس کے کنارے کنارے شمال مغربی صوبوں بشکنس، ستورنس اور جلیقیہ کی طرف بڑھے۔ یہ پورا علاقہ پہاڑی تھا، لہٰذا اس کی تفصیل معلوم نہیں ہوتی کہ ان صوبوں میں کون کون سے مقام فتح کیے گئے۔ ابن قتیبہ کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ بشکنس میں بڑے خون ریز معرکے ہوئے اور ہر

Marfat.com

معرکہ میں کامیابی مسلمانوں کے ہم رکاب رہی۔

استورنس اور جلیقیہ کے بعض حصے بھی فتح ہوئے۔ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ جلیقیہ والوں نے آگے بڑھ کر اطاعت قبول کر لی تھی۔ بہرحال اس فوج کشی میں پورا شمال مغربی علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں ہو گیا اور سب نے جزیہ دے کر اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر لی۔ اب موسیٰ نے شہر لک میں قیام پذیر ہو کر مختلف اطراف میں اپنے فوجی دستے بھیجے، اور وہ جہاں جہاں گئے وہاں انھیں کامیاب و کامرانی سے ہمکنار ہونا پڑا۔ چنانچہ لک کے شمال میں خلیج بسکے کے کنارے صخرۂ بلائی اور اس سے جنوبی گوشہ پر پرتگال کے مشہور شہر بیزو یا بازو کو عرب مؤرخین نے مفتوح شہروں میں دکھایا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے شہروں پر حملے کیے جن کے ناموں کی تصریح مؤرخین نے ذکر نہیں کی۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ موسیٰ کا یہ لشکر جہاں جہاں گیا فتح و کامرانی نے ان کے قدم چومے اور عیسائیوں نے ان کی اطاعت قبول کر لی۔ جن شہروں کو عیسائیوں نے خالی کر دیا تھا وہاں مسلمان عرب اور بربر بسائے گئے اور بعض شہروں میں یہودی بھی آباد کیے گئے۔ ان حملوں میں بے شمار مال و دولت حاصل ہوا، اور لوگوں نے جزیہ کی ادائیگی کی شرط پر صلح کر لی۔ اس طرح اندلس کا شمال مغرب علاقوں کا ایک بہت بڑا حصہ مسلمانوں کے زیر نگیں ہو گیا اور وہاں مسلمانوں اور اسلام کے اثرات قائم ہونا شروع ہو گئے۔

دمشق سے ایک اور قاصد کا ورود:

بارگاہِ خلافت سے پہلے مغیث قاصد بن کر آئے تھے جن کو موسیٰ بن نصیر نے کچھ عرصہ کے لیے روک لیا تھا تاکہ وہ اندلس کے شمال مغربی علاقہ کو طارق بن زیاد کی مدد سے فتح کر سکیں۔ چنانچہ مغیث نے ان کی بات مانتے ہوئے توقف کیا اور کچھ عرصہ اندلس میں ٹھہر گئے، لیکن ابھی اس علاقہ میں اسلامی فتوحات کی تکمیل نہیں ہونے پائی تھی کہ بارگاہِ خلافت سے ایک اور قاصد ابونصر اندلس آیا، اور موسیٰ بن نصیر سے ملنے کے لیے لک پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت موسیٰ ایک خچر پر سوار تھے۔ قاصد ابونصر نے آکر ان کے خچر کی لگام پکڑ لی اور دربار خلافت سے فوری واپس آنے کا فرمان پیش کیا۔ موسیٰ نے اس کو بھی وہ کچھ کہا جو انھوں نے مغیث سے کہا تھا۔ مغیث تو ان کی بات مان گیا تھا اور وہ کچھ عرصہ کے لیے موسیٰ بن نصیر کے پاس ٹھہر گیا اور اس عرصہ میں موسیٰ نے اندلس کا بہت سا شمال مغربی علاقہ فتح کر لیا۔ ادھر بارگاہِ خلافت میں مغیث کا انتظار ہو رہا تھا جب وہ کئی ماہ تک واپس نہ گیا تو ابونصر نامی دوسرا قاصد روانہ کیا گیا۔ شاید امیر المؤمنین کی طرف سے اسے یہ تاکید کی گئی ہو کہ موسیٰ کو جلد از جلد دمشق بھیجو۔ اس لیے ابونصر نے موسیٰ کو جب خچر پر سوار دیکھا تو خچر کی لگام پکڑ کر انھیں فوری واپسی کا فرمان پیش کیا۔ اب تاخیر کا کوئی موقع باقی نہیں رہا تھا۔ اب موسیٰ مجبور ہو گئے۔ انھوں نے لشکر کو واپسی کا حکم دیا اور شمال مغربی مہم کو نامکمل چھوڑ کر دمشق روانگی کے لیے جنوب کی سمت روانہ ہو گئے۔ دوسری طرف طارق کو موسیٰ نے مشرقی علاقہ کی مہم پر بھیجا تھا۔ وہ اس علاقہ کو فتح کر کے واپس آ رہے تھے کہ ادھر موسیٰ بن نصیر پہاڑی سلسلہ

Marfat.com

کے ایک درہ سے گزرے اوراس مقام پر طارق کالشکران سے آملا اوراس درہ کا نام ''فج موسیٰ'' قرار پایا۔خیال کیا جاتا ہے کہ وہ کوہ وادی رملہ میں واقع ہے۔ پھر موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد دونوں جنوبی اندلس کی جانب روانہ ہو گئے۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ موسیٰ بن نصیر کو اندلس کی فتح کو مکمل کرنے کی بڑی تمنا اور خواہش تھی۔اب جب کہ وہ اس کو نامکمل چھوڑ کر جا رہے تھے تو انھیں اس بات کا سخت قلق اور پریشانی تھی۔یہ درست ہے کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کو موسیٰ کے اس پلان سے اتفاق نہ تھا جو انھوں نے لکھ کر بذریعہ قاصد ان کے دربار میں بھیجا اور جس کا وہ مہینوں انتظار کرتے رہے،اور جب مہینوں کے انتظار کے بعد اس کا جواب آیا تو وہ نفی میں تھا جس کا انھیں نہایت صدمہ تھا لیکن وہ پھر بھی اپنی کوشش سے اندلس کو فتح کرتے رہے اوراس بات کی کوشش کرتے رہے کہ اندلس کے ہر شہر میں وہ اسلامی پرچم لہرا دیں کیونکہ اس وقت حالات بہت سازگار تھے۔مسلمانوں کی ہیبت عیسائیوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔وہ جہاں بھی جاتے اور جس شہر کا رخ بھی کرتے کامیابی ان کے ہم رکاب ہوتی۔اکثر و بیشتر عیسائی خود ان سے مصالحت کی التجا کرتے اور جہاں انھیں جنگ بھی کرنا پڑی وہاں اتنی سخت جنگ نہ ہوئی جیسی کہ ان کو توقع تھی۔پھر شاہ فرانس نے جو مشاورت کے لیے یورپ کے بادشاہوں کو اکٹھا کیا تاکہ مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے کوئی متحدہ محاذ بنایا جائے،لیکن وہ متحدہ محاذ نہ بن سکا جس مرکزی خیال پر متحد و متفق نہ ہوسکنا تشتت و انتشار کی علامت ہوتا ہے۔یورپی بادشاہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے پر جب متفق نہ ہوئے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ خیالات کے لحاظ سے آپس میں منتشر ہیں۔ان میں اتحاد و اتفاق نہیں،اور یہ بات مسلمانوں کے لیے بڑی مفید اور نفع بخش تھی،چنانچہ اس کے بعد مسلمان فوجیں خواہ وہ طارق بن زیاد کی زیر قیادت ہوں یا موسیٰ بن نصیر کی سرکردگی میں،جس طرف کا رخ کرتیں فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی۔نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسلامی فوجوں نے اندلس کا بہت سا علاقہ فتح کرلیا اوران کی بہادری اور شجاعت کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہوگئیں۔موسیٰ بن نصیر کی یہ تمنا تھی کہ ابھی مجھے دربار خلافت سے مزید بلاوا نہ آئے لیکن ابونصر کی شکل میں بلاوا آگیا اور موسیٰ کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا اوراس کی تمام تمنائیں ناتمام رہ گئیں۔جو حالات اس وقت تھے وہ مسلمانوں کے لیے نہایت سازگار تھے لیکن بعد میں وہ حالات موجود نہ رہے کیونکہ آگے چل کر اندلس کے عیسائیوں نے اپنی قوت متحد کر کے اور اپنی اجتماعی طاقت بنا کر مسلمانوں کی افواج کے مقابلہ میں تیار ہو گئے۔اب اندلس کی حالت یہ ہوگئی کہ اگر ایک طرف مسلمانوں کی حکومت تھی تو دوسری طرف عیسائیوں کی حکومت تھی یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کی متوازی حکومتیں بن گئیں اور یہ دونوں مضبوط اور مستحکم تھیں۔جب موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد اندلس کو فتح کرنا چاہتے تھے اس وقت مسلمانوں کی حکومت متحد اور مضبوط تھی جب کہ عیسائی حکومت تشتت و انتشار کا شکار اور کمزور تھی۔عیسائیوں کی اجتماعی طاقت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ان حالات میں اگر اندلس پر مکمل قبضہ کرلیا جاتا تو شاید

Marfat.com

اندلس کی مستقبل کی تاریخ یہ نہ ہوتی جو ہوئی کہ عیسائی اپنی طاقت اور قوت کو مجتمع کر کے اسلامی حکومت کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے اور چشم آفتاب نے دیکھا کہ چند صدیوں کے بعد عیسائی حکومت اسلامی حکومت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئی، اور دنیا نے وہ وقت بھی دیکھا کہ اندلس پر آٹھ سو سال حکومت کرنے کے باوجود پورے اندلس میں ایک مسلمان بھی نظر نہیں آتا تھا۔

اندلس دمشق سے بہت دور تھا کہ دمشق کے صاحب اقتدار لوگ اور خلیفہ ولید بن عبدالملک یہاں کے حالات سے بے تعلق بھی تھے اور ناواقف بھی، لہٰذا انھیں صحیح اندازہ نہ ہو سکا جس طرح موسیٰ بن نصیر افریقہ میں رہتے ہوئے اندلس کے حالات سے ناآشنا تھے اسی لیے تو انھوں نے طارق بن زیادہ کو اندلس میں پیش قدمی کی اجازت نہیں دی تھی۔ بالکل یہی حالت یہاں تھی۔ ولید بن عبدالملک نے دور ہونے کی وجہ سے وہاں کے حالات سے گہری آشنائی نہ رکھنے کے باعث موسیٰ بن نصیر کے پلان کو مسترد کر دیا۔ اور اب ان کو بزور واپس بلایا جا رہا تھا۔ خلیفہ ولید کیا جانتا تھا کہ موسیٰ کے واپس آنے سے اسلامی حکومت اور مسلمانوں کو کس قدر نقصان ہو گا۔ پھر قائدین لشکر کے باہمی مسابقت اور چپقلش اور ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیوں سے بھی اندلس کی فتح کی تکمیل نہ ہو سکی، لیکن اس ناکامی اور فتح کی تکمیل نہ ہونے کی ساری ذمہ داری طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر پر نہیں ہے بلکہ دمشق کی مرکزی حکومت پر ہے جس کی غیر دانشمندانہ پالیسیوں کی وجہ سے اس فتح کی تکمیل نہ ہو سکی۔ اس بات کو ان الفاظ میں بیان کرنا زیادہ مناسب ہے کہ

''اگر طارق بن زیاد موسیٰ بن نصیر کی غیر دانشمندانہ مداخلت سے آزاد رہتا، اور موسیٰ بن نصیر کو ولید بن عبدالملک کے احکام کی پابندی نہ ہوتی تو نہ صرف اندلس کی تاریخ کچھ اور ہوتی بلکہ یورپ کی دوسری حکومتوں کا نقشہ بھی آج کچھ اور دکھائی دیتا، اور فرانس میں جو صنعتی انقلاب آیا تھا وہ وہاں نہ آتا بلکہ اسلامی حکومت میں آتا اور آج مسلمان دنیا میں اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود امریکی اور یورپی طاقتوں کے مغلوب و مقہور نہ ہوتے بلکہ دنیا میں واحد سپر پاور ہوتے۔''

جب اندلس میں مسلمانوں کی حکومت تھی تو نویں صدی عیسوی تک پادری اور عام دنیا دار عیسائی عربوں کا سا لباس پہنتے تھے۔ اکثر عیسائیوں نے عربی نام رکھ لیے تھے اور ظاہری رسم و رواج میں بھی ایک حد تک اپنے مسلمان ہمسائیوں کی تقلید کرتے تھے، مثلاً بہت سے عیسائی ختنہ کراتے تھے اور کھانے پینے کے معاملہ میں بھی انھوں نے مسلمانوں کی عادات اختیار کر لی تھیں۔ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) لکھتا ہے کہ اس قسم کے مناظر اندلس میں اکثر دیکھنے میں آتے تھے کہ

''ایک پادری گرجے میں اتوار کے روز خطبہ (Sermon) دے رہا ہوتا اور اس کی عبا پر قرآنی آیات کاڑھی ہوئی ہوتیں۔'' (تشکیل انسانیت: ص ۲۴۹)

ایک اور یورپی دانشور ول ڈیوران لکھتا ہے:

Marfat.com

''اندلس پر عربوں کی حکومت اس قدر عادلانہ، عاقلانہ اور مشفقانہ تھی کہ اس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کے جج نہایت قابل تھے۔ عیسائیوں کے فیصلے عیسائی جج کیا کرتے تھے۔ پولیس کا انتظام نہایت اعلیٰ تھا۔ بازار میں ناپ تول کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ عوام کے لیے عربوں کی حکومت رومیوں کی حکومت کے مقابلہ میں ایک نعمت تھی۔ انھوں نے بڑے بڑے زمینداروں کی زمینیں مزارعین میں تقسیم کر دی تھیں۔'' (Age of Faith, P.297)

اندلس کے عیسائی جو اندلس کی اسلامی حکومت کے زیر سایہ رہتے تھے اور جنھوں نے عربوں کے رسوم و آداب اختیار کر لیے تھے، مستعرب کہلاتے تھے۔ اس نام سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں عیسائیوں کا میلان طبع کس طرف تھا۔ عربی زبان نے ملک بھر میں بہت جلد لاطینی کی جگہ لے لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس زبان میں عیسائیوں کا علم دین مدون تھا، اس کو عیسائی رفتہ رفتہ بھولنے لگے اور اس کی طرف سے غفلت اور اعراض برتنے لگے حتیٰ کہ کلیسا کے بعض بلند مرتبہ عہدے دار بھی صحیح لاطینی سے ایسے نابلد ہو گئے کہ ان پر اہل علم کو ہنسی آتی تھی۔ ان حالات میں عوام الناس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس معاملہ میں وہ ارباب کلیسا سے زیادہ سرگرمی دکھائیں گے۔ چنانچہ سنہ ۸۵۴ء میں اندلس کے ایک مصنف یعنی قرطبہ کے پادری الوارد نے اپنے عیسائی ہم وطنوں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے، اور اسلام اور علوم اسلامیہ کی طرف ان کے میلان پر انھیں ندامت اور عار دلائی ہے، اور کہا ہے کہ

''جب ہم مسلمانوں کے شرعی احکام کی تحقیق کرتے ہیں اور ان کے حکماء کے مطالعہ کے لیے جمع ہوتے ہیں تو ہم اپنی مقدس کتابوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ اب عیسائیوں میں ایسے ذی علم کہاں جو مقدس کتابیں پڑھنے میں انہماک رکھتے ہوں اور لاطینی علمائے دین کی کتابوں پر نگاہ ڈالنے کی پروا کرتے ہوں؟ ہمارے عیسائی نوجوان جو اطوار کی شستگی اور چرب زبانی سے متصف ہیں، اپنے لباس اور چال ڈھال کی نمائش کرتے ہیں اور مسلمانوں کے علوم میں شہرت رکھتے ہیں۔ وہ عربی بلاغت کے نشے میں سرشار ہیں اور مسلمانوں کی کتابوں کو اٹھائے پھرتے ہیں اور بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ ان پر بحث کرتے ہیں، اور ان کی تعریف وتوصیف میں علم خطابت کے سارے صنائع و بدائع صرف کر دیتے ہیں، اور پھر ان کا خوب چرچا کرتے ہیں، لیکن کلیسا کی کتابوں کی خوبیوں سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ اور کلیسا کے چشموں کو جن کا منبع بہشت ہے، حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افسوس! عیسائی لوگ اپنی شریعت سے ایسے ناآشنا ہیں اور لاطینی لوگ اپنی زبان سے ایسے لاپروا ہو گئے ہیں کہ تمام عیسائی امت میں ہزار اشخاص میں سے بمشکل ایک شخص ایسا ملے گا جو لاطینی زبان میں اپنے کسی دوست کو مزاج پرسی کا ایک خط بھی لکھ سکے، البتہ ایسے عیسائی بے شمار ہیں جو عربی زبان کے رنگین جملے بڑے طمطراق سے بولتے ہیں، بلکہ وہ ایسی عربی بھی لکھ سکتے ہیں جس کا ہر شعر ردیف کے

Marfat.com

ایک ہی حرف پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں اس کے حسن خیال کی اعلیٰ پرواز کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے لکھنے میں وہ عربوں سے بھی بڑھ کر وزن اور بحر کی پابندی کرتے ہیں۔ فی الواقع لاطینی زبان کو اندلس کے ایک حصے میں اس قدر تنزل ہوا کہ سپین (اندلس) کے کلیسا کے قدیم قوانین اور بائبل کو عیسائیوں کے مطالعہ کے لیے عربی میں ترجمہ کرنا پڑا۔''

اندلس میں عیسائیوں کا مسلمانوں کے ساتھ اتنا گہرا تعلق اور رابطہ تھا اور وہ ان کے ادب (لٹریچر) کا اس ذوق وشوق اور محنت سے مطالعہ کرتے تھے کہ اسلام کے متعصب دشمن بشپ الوارد کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ قرآن حکیم ایسی بلیغ اور دل کش زبان میں لکھا گیا ہے کہ عیسائی بھی اس کو پڑھ کر اس کی تحسین کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مختصر یہ کہ اسلام نے عیسائیوں کے عقائد، اخلاق اور تہذیب و معاشرت کو کافی حد تک متاثر کیا اور نو مسلموں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ یہ تعداد لاکھوں میں پہنچ گئی۔

ذرا غور فرمائیں کہ جو کچھ پادری الوارد نے اس زمانہ میں عیسائیوں کے بارے میں کہا کہ یہ اپنی زبان بھول گئے ہیں، اپنا لباس بھول گئے ہیں، اپنے دین کی بنیادی چیزوں کو فراموش کر گئے ہیں اور اپنے دین کے بارے میں انھیں وہ واقفیت نہیں جو ہونی چاہیے بلکہ اپنی مذہبی کتابوں سے زیادہ انھیں مسلمانوں کی کتابوں سے واقفیت ہے، بالکل یہی حالت آج مسلمانوں کی پوری دنیا میں ہو چکی ہے کہ اپنی زبان سے زیادہ انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس کی ایک زندہ مثال ہمارے سامنے پاکستان کی ہے۔ قائداعظم اور دوسرے مسلم لیگی لیڈروں نے کہا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ اسی بات پر مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا کیونکہ اسے اردو کا قومی زبان ہونا منظور نہیں تھا اور سب سے پہلے وہ اسی بات پر مغربی پاکستان کے خلاف ہوئے تھے کیونکہ وہ ٹیگور اور نذر الاسلام کو چھوڑ کر اقبال کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کی قیمت ہمیں ادا کرنا پڑی کہ مشرقی پاکستان ہم سے بغاوت کر کے بنگلہ دیش بن گیا، اور میں نے وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اب صحیح معنوں میں ان کی قومی زبان بنگالی ہے۔ ان کی ہر کتاب بنگالی زبان میں ہے یہاں تک کہ ان کی دکانوں کے بورڈ بھی۔ لیکن گزشتہ انہتر سال سے نعرہ تو ہم اردو کے قومی زبان ہونے کا لگاتے ہیں اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہماری بڑی عدالتوں کی ہر بحث انگریزی میں ہوتی، ہر فیصلہ انگریزی میں لکھا جاتا، ہماری اسمبلیوں میں انگریزی بولی جاتی ہے البتہ وہ لوگ اردو میں بات کرتے ہیں جنھیں انگریزی نہیں آتی۔ ہمارے سیمینارز میں انگریزی میں تقریریں ہوتی ہیں یہاں تک کہ ہماری ٹیلی فون ڈائریکٹری تک انگریزی زبان میں ہے۔ اسی طرح انگریزوں کے لباس کو ہم بڑے فخر ومباہات سے پہنتے ہیں، ان کی سی شکل وصورت بنانے، ان کے سے طور طریقے اور رسم ورواج اپنانے میں ہم بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب علامہ ابن خلدون الاندلسی نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

''یہ دنیا کا دستور ہے کہ مغلوب قومیں غالب اور فاتح قوم کی ہر شئے اپنانے میں فخر محسوس کرتی ہیں حتیٰ کہ

Marfat.com

اس کی برائیوں کو بھی اپنے اندر سمونے کو اپنے بڑے ہونے کی علامت سمجھتی ہیں۔"

جب اندلس پر مسلمانوں کا غلبہ تھا تو پورا اندلس ان کے لباس، ان کی زبان اور ان کے طور طریقوں کو اپنانا اپنے لیے باعث افتخار سمجھتا تھا۔ آج یہ گوری اقوام دنیا میں غالب ہیں اور ان کا مقولہ ہے Dignity is White (عزت سفید رنگ کی ہے) اس وجہ سے دنیا کی کالی قومیں ان کی زبان، لباس اور طور طریقوں بلکہ رسم و رواج کو اپنانے میں اپنا بڑا ہونا سمجھتی ہیں، حالانکہ بڑائی اخلاق و تہذیب سے ہے نہ کہ زبان و لباس سے۔ اسی بات پر اقبال نے کہا تھا ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

اور اسی بات کا رونا اسد ملتانی نے ان الفاظ میں رویا ہے ؎

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر
یہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

یہ جو کچھ آج پوری اسلامی دنیا میں ہو رہا ہے یہ "تخریب خود تعمیر غیر" کے نظریہ کے تحت ہو رہا ہے۔ کبھی یہ مقام دنیا میں مسلمانوں کو حاصل تھا کہ ان کے رسم و رواج، ان کی زبان اور ان کے لباس اور طور طریقوں کو اپنانا غیر قومیں خصوصی طور پر عیسائی دنیا اپنے لیے باعث فخر و مباہات سمجھتی تھیں۔ آج معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

بہرحال یہ تو درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر کچھ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ بتا یہ رہا تھا کہ ولید بن عبدالملک کی غیر دانشمندانہ پالیسیوں نے نہ صرف اندلس کی بلکہ پورے یورپ کی سلطنتوں کا نقشہ بدل دیا اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا۔ خلیفہ ولید کو ان دونوں جرنیلوں (طارق اور موسیٰ) کے مشوروں سے اندلس میں فتوحات کی پالیسی بنانی چاہیے تھی نہ کہ ان بزرجمہروں کے مشورہ سے جنھوں نے وہاں کے محاذ، ان کے ماحول اور فضا کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اور اگر خلیفہ ولید نے خود یہ پالیسی بنائی تھی کہ اندلس میں مسلمانوں کی فوجی پیش قدمی کو روک دیا جائے اور موسیٰ بن نصیر کو جو اس محاذ کے لیے ایک موزوں ترین شخص تھا، واپس بلا لیا جائے اور اس کو مختلف ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی جائیں، تو یہ اس کی ایک بہت بڑی حماقت اور اصول جہاں بانی و جہاں گیری بلکہ اسلامی اصولوں سے بھی ناآشنائی تھی۔ بہرحال موسیٰ محاذ جنگ سے واپس طلیطلہ آئے۔ یہاں مال غنیمت کو اکٹھا کیا، پھر یہاں سے اشبیلیہ روانہ ہوئے اور واپسی کے انتظامات میں مصروف ہو گئے اور محاذ جنگ سے ان کی توجہ یک قلم ہٹ گئی۔

Marfat.com

موسیٰ کا جانشین عبدالعزیز:

اشبیلیہ پہنچ کر موسیٰ بن نصیر نے جہاں واپسی کے انتظامات کیے وہاں اپنے بیٹے عبدالعزیز کو صوبہ اشبیلیہ کا حکمران مقرر کیا تا کہ اس کی غیر حاضری میں مفتوحہ شہروں کا انتظام ہو سکے۔ گویا اشبیلیہ اندلس میں اسلامی حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ اشبیلیہ سمندر کے قریب جتنے شہر واقع تھے ان سب میں سب سے زیادہ مضبوط فصیل کا حامل تھا۔ اور عیسائیوں کے حملہ کی صورت میں یہ سب سے زیادہ محفوظ شہر تھا۔ دوسرے اندلس کی مسلم حکومت کا ہیڈ کوارٹر دراصل افریقہ تھا، اس لیے اس شہر کو دارالحکومت بنانے میں افریقہ سے رسل ورسائل کی آسانیاں بھی حاصل تھیں۔ اس وجہ سے اسلامی حکومت کے لیے اس سے بہتر اور کوئی دارالحکومت نہیں ہوسکتا تھا۔

دمشق میں بلایا تو صرف موسیٰ بن نصیر کو گیا تھا لیکن ایک غلطی یہاں یہ ہوگئی کہ موسیٰ کے ساتھ طارق بن زیاد نے بھی دمشق جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ یہ قصد طارق نے خود کیا ہمارے خیال میں تب بھی غلطی تھی اور اگر موسیٰ بن نصیر اس کو اپنی مرضی سے ساتھ لے گئے تب بھی یہ فیصلہ غلط تھا۔ اگر موسیٰ واپس مشرق جا رہے تھے تو طارق کو ضرور اندلس میں رہنا چاہیے تھے۔ اس سے ایک تو مزید فتوحات ہوتیں اور دوسرے عبدالعزیز کو طارق بن زیاد کی شکل میں ایک مضبوط سہارا ملتا۔ بہر حال موسیٰ کے ساتھ طارق نے بھی دربار خلافت میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ اب اندلس میں سیاہ وسفید کا مالک موسیٰ بن نصیر کا بیٹا عبدالعزیز تھا۔

موسیٰ اور طارق کے کارنامے:

موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد دونوں ذی الحجہ سنہ ۹۵ھ میں اندلس سے دمشق (شام) کے لیے روانہ ہوئے۔ اندلس میں طارق کا قیام تین سال چار ماہ اور موسیٰ بن نصیر کا قیام دو سال چار ماہ رہا۔ اس قلیل عرصہ میں انھوں نے اندلس کا وسیع علاقہ فتح کیا اور وہاں اسلامی حکومت قائم کی۔ اس فتح کا اصل کارنامہ طارق بن زیاد کا ہے کیونکہ جب وہ اندلس میں وارد ہوئے تو اس وقت ایک علاقہ بھی فتح نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکل اجنبی سرزمین میں وارد ہوئے۔ ہر طرف ان کے دشمن ہی دشمن تھے اور ایک طرف سمندر تھا۔ صرف سات ہزار فوج ان کے ساتھ تھی وہ بھی اس علاقہ میں اجنبی تھی۔ وہاں کے نشیب وفراز سے بالکل ناآشنا اور ناواقف۔ صرف ایک کاؤنٹ جولین طارق کا حامی تھا، لیکن ابھی اس کی حمایت کی پرکھ نہیں ہوئی تھی کہ وہ کہاں تک مخلص ہے۔ ان حالات میں طارق وہاں پہنچے اور جاتے ہی ایک لاکھ سے زائد فوج کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوگیا جو وہاں کی رہنے والی اور ہر قسم کا جدید اور قیمتی اسلحہ اس کے پاس تھا۔ طارق نے تو واپسی کی کشتیاں بھی جلا دی تھیں اور وہ اس نظریہ کے تحت دشمن سے جنگ کر رہا تھا۔

خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

Marfat.com

اس نظریہ پر اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد سے اس نے اندلسی بادشاہ راڈرک کو ایک ایسی عبرتناک شکست دی کہ وہ تو بھاگتے ہوئے دریا میں ڈوب کر مر گیا اور اس کی فوج کو بھی طارق کی واپسی تک اکٹھا ہونے کا موقع نہ ملا۔ پھر ایک سال بعد موسیٰ بن نصیر مزید فوج لے کر اندلس میں وارد ہوئے لیکن ان کی بھی تمام فتوحات ایک لحاظ سے طارق بن زیاد کی مرہون منت ہیں کیونکہ ان کی فوج کا ہراول دستہ طارق بن زیاد ہی تھے، وہ جس شہر میں جاتے وہاں کے باشندے ان سے صلح کا معاہدہ کرتے اور بعد میں موسیٰ بن نصیر اسی معاہدہ کی تصدیق (Confirmmation) کرتے جو طارق نے کیا ہوتا۔ آج یہ دونوں واپس دربار خلافت میں جا رہے تھے اور ان کو بالکل خبر نہیں تھی کہ انھوں نے واپس آنا ہے کہ نہیں؟ چنانچہ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ وہ پھر اندلس میں واپس نہ آئے۔

موسیٰ اور طارق نے مل کر جو اسلامی حکومت قائم کی تھی، اب اس کا سربراہ اور امیر موسیٰ کا بیٹا عبدالعزیز تھا۔ وہ بھی ایک بہادر جرنیل تھا۔ وہ کچھ عرصہ یہاں امیر رہا۔ پھر وقتاً فوقتاً کبھی افریقہ سے اور کبھی دمشق سے امراء نامزد ہو کر آتے رہے اور کبھی ضرورت کے تحت یہیں منتخب کر لیے جاتے اور ان کی امارت کی تصدیق افریقہ یا دمشق سے آ جاتی۔ ان کے جانے کے بعد قریباً ۴۴ سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ جو امیر بھی آتا وہ سلطنت کا دائرہ وسیع کرتا اور لوگوں اور ملک کی فلاح اور ترقی میں مصروف رہتا۔ بالآخر سنہ ۱۳۸ھ میں عبدالرحمٰن الداخل جو بنوامیہ کا چشم و چراغ تھا اس ملک میں وارد ہوا اور اس نے اس ملک کا اقتدار سنبھالا اور بنوامیہ کی ایک مستقل حکومت قائم کی جب کہ مشرق میں عباسیوں نے بنوامیہ کی حکومت کو بالکل ختم کر دیا تھا۔

مال غنیمت کی واپسی:

دربار خلافت میں موسیٰ بن نصیر کی طلبی کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہاں کے مال غنیمت کو دمشق منگایا جائے کیونکہ مختلف حلقوں میں یہاں کے مال غنیمت کے بارے میں بہت سی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں کہ وہاں ڈھیروں مال غنیمت ملا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مال کی اس محبت کی وجہ سے خلیفہ ولید بن عبدالملک نے موسیٰ بن نصیر کو نہایت اصرار سے دمشق طلب کیا تھا۔

کبھی وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مال کی محبت مسلمانوں کے دلوں سے بالکل نکال دی تھی اور مسلمانوں کے نزدیک مال کی کوئی حیثیت نہ رہی تھی حالانکہ مال کا مطلب ہی یہ ہے کہ "مایمیل الیه القلب" یعنی جس کی طرف قلب مائل ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ڈھیروں مال کو بھی پرکاہ کی حیثیت نہیں دیتے تھے۔ سیدنا عمیر بن سعد انصاری رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی تھے۔ قبیلہ اوس سے ان کا تعلق تھا۔ ملک شام میں بازنطینی حکومت کے ساتھ سب لڑائیوں میں شریک رہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں انھیں حمص کا گورنر مقرر فرمایا۔ آپ اس قدر عابد و زاہد تھے کہ ان کی عبادت و ریاضت اور ان کا

Marfat.com

زہد وتقویٰ حد کرامت کو پہنچا ہوا تھا۔

کنز العمال وغیرہ میں ہے کہ جن دنوں یہ حمص کے گورنر تھے، ان کے پاس امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا خط پہنچا جس میں لکھا تھا:

''اے عمیر! ہم نے تم کو ایک اہم عہدہ سپرد کر کے حمص بھیجا تھا مگر کچھ پتہ نہیں کہ تم اپنا یہ عہدہ خوش اسلوبی سے چلا رہے ہو کہ نہیں؟ لہٰذا جس وقت میرا یہ خط تمھارے پاس پہنچے، فوراً جس قدر مال غنیمت تمھارے بیت المال میں جمع ہے، سب کو اونٹوں پر لاد کر اپنے ساتھ لے کر مدینہ طیبہ میرے پاس حاضر ہو۔''

دربار خلافت کا یہ فرمان پڑھ کر عمیر اسی وقت کھڑے ہو گئے اور اپنی لاٹھی میں اپنی چھوٹی سی پانی کی مشک اور خوراک کی تھیلی اور ایک بڑا سا پیالہ لٹکا کر لاٹھی کندھے پر رکھی اور ملک شام سے پیدل مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب دربار خلافت میں پہنچے تو امیر المؤمنین ان کی خستہ حالی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے کہ حمص کا گورنر اور یہ خستہ حالی۔ فرمایا:

''اے عمیر! تمھارا حال اتنا خراب کیوں ہے؟ کیا تم بیمار ہو گئے تھے؟ یا تمھارا شہر بدترین شہر ہے؟ یا پھر تم نے مجھے دھوکہ دینے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے؟''

امیر المؤمنین کے ان سوالوں کو سن کر سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا:

''امیر المؤمنین! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسلمانوں کے پوشیدہ حالات کی جاسوسی سے منع نہیں فرمایا؟ آپ نے یہ کیوں فرمایا کہ میرا حال خراب ہے؟ کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ میں بالکل تندرست اور توانا ہوں، اور اپنی پوری دنیا کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے آپ کے سامنے حاضر ہوں۔''

امیر المؤمنین نے فرمایا:

''عمیر! تم دنیا کا کون سا سامان لے کر آئے ہو؟ میں تو تمھارے ساتھ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا۔''

سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''امیر المؤمنین! دیکھیے یہ میری خوراک کی تھیلی ہے، یہ میرا مشکیزہ ہے جس سے میں وضو کرتا ہوں اور اسی میں اپنے پینے کا پانی رکھتا ہوں، اور یہ میرا پیالہ ہے، اور یہ میری لاٹھی ہے جس سے میں اپنے دشمنوں سے بوقت ضرورت جنگ بھی کرتا ہوں اور سانپ وغیرہ زہریلے جانوروں کو بھی مار لیتا ہوں۔ یہ سارا سامان میری دنیا نہیں تو اور کیا ہے؟''

یہ سن کر امیر المؤمنین نے فرمایا:

''عمیر! اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے، تم تو عجیب آدمی ہو۔''

پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے رعایا کا حال دریافت کیا اور مسلمانوں کی دینی زندگی اور ذمیوں کے

Marfat.com

بارے میں پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا:

''الحمدللہ! میری حکومت کا ہر مسلمان ارکان اسلام کا پورا پورا پابند ہے اور اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اور میں ذمیوں سے جزیہ لے کر ان کی پوری پوری حفاظت کرتا ہوں، اور میں اپنے عہدہ کی ذمہ داریوں کو نباہنے کی بھرپور کوشش کرتا رہا ہوں۔''

پھر امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے خزانہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں لائے؟ میں نے تو تمھیں اس کے لانے کے لیے بھی کہا تھا۔ اس صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا وہ سننے کے قابل ہے۔ عرض کیا:

''امیر المؤمنین! خزانہ کیسا؟ میں ہمیشہ مال دار مسلمانوں سے زکوٰۃ اور صدقات وصول کر کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دیا کرتا ہوں۔ اگر میرے پاس فاضل مال بچتا تو میں ضرور اس کو آپ کے پاس بھیج دیتا۔''

کیسا ذمہ دارانہ جواب دیا سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ نے۔ یہ نہیں کہا کہ میں زکوٰۃ وصدقات اور ملکی ٹیکسوں کو ہارس ٹریڈنگ یا غیر ملکی دوروں جن میں ایک پوری ٹیم میرے ساتھ ہوتی ہے، یا اپنی پارٹی اور جیالوں کی فلاح وبہبود کے لیے یا اگلے الیکشن کی تیاری کے لیے خرچ کرتا ہوں، بلکہ یہ جواب دیا کہ میں اس رقم کو فقراء اور مساکین کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا ہوں، ان کی محتاجی کو دور کرنے کے لیے خرچ کرتا ہوں۔

پھر امیر المؤمنین نے پوچھا:

''عمیر! تم حمص (شام) سے مدینہ منورہ تک پیدل سفر کر کے آئے ہو، کیا تمھارے پاس سواری نہیں تھی؟ اور اگر سواری نہیں تھی تو کیا تمھاری سلطنت کی حدود میں مسلمانوں اور ذمیوں میں کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جو تمھیں سواری کا ایک جانور دے دیتا؟''

عمیر نے عرض کیا:

امیر المؤمنین! میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ میری امت میں کچھ ایسے حاکم ہوں گے کہ اگر رعایا خاموش رہے گی تو یہ حکام انھیں برباد کر دیں گے، اور اگر رعایا فریاد کرے گی تو یہ ان کی گردنیں اڑا دیں گے۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی سنا ہے کہ تم لوگ اچھی باتوں کا حکم دیتے رہو اور بری باتوں سے منع کرتے رہو، ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو بدترین انسان ہوں گے۔ اس وقت نیکوں کی دعائیں بھی قبول نہ ہوں گی۔ اے امیر المؤمنین! میں ان برے حاکموں میں سے ہونا پسند نہیں کرتا، اس لیے مجھے پیدل چلنا گوارا ہے، لیکن اپنی رعایا سے کچھ طلب کرنا یا اس کے عطیوں کو قبول کرنا ہرگز پسند نہیں ہے۔''

سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب سن کر امیر المؤمنین نے فرمایا:

Marfat.com

''عمیر! میں تمھاری کارگزاریوں سے بہت خوش ہوا ہوں، لہٰذا تم واپس حمص جا کر اپنی گورنری کے فرائض انجام دیتے رہو۔''

آج کل سفارش کروا کر اور رشوتیں دے کر عہدے حاصل کیے جاتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے دولت اکٹھی کی جائے۔ آج کل کی یہ جمہوریت اور عوامی نمائندگی تو نرا فراڈ اور دھوکہ ہے۔ یہ امیروں نے غریبوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے نظام بنایا ہوا ہے۔ اس میں عوام کو صدائے احتجاج بلند کرنے کا بھی موقع نہیں دیا جاتا۔ عوام جب کبھی کسی بات پر احتجاج کرتے ہیں تو انھیں یہ کہہ کر غفلت کی نیند سلا دیا جاتا ہے کہ یہ حکومت ہی تمھاری ہے۔ ہم تو تمھارے خادم ہیں، تمھیں نے تو ہمیں ووٹ دے کر پارلیمنٹ میں بھیجا ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری
خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اسلامی حکومت میں حال یہ ہے کہ عہدے دیئے جاتے ہیں، لیے نہیں جاتے، اور جن کو عہدے دیے جاتے ہیں وہ انھیں قبول نہیں کرتے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اس پیش کش پر سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ نے نہایت لجاجت سے گڑگڑا کر کہا:

''امیر المؤمنین! میں آپ کو خدا کا واسطہ دے کر اس عہدہ کے قبول کرنے سے معافی کا طلب گار ہوں، اب میں کبھی بھی اس عہدہ کو قبول نہیں کر سکتا، لہٰذا آپ مجھے اس سے معاف فرما دیجیے۔''

آج کل اگر کسی کو کوئی عہدہ مل جائے یا کوئی پارلیمنٹ کا ممبر ہو جائے یا وزیر با تدبیر ہو جائے تو پھر وہ اس سے ایسا چمٹتا ہے کہ اس کو چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ بلکہ یہ لوگ اپنی قیمت لگواتے ہیں۔ اسی لیے ان کا نام لوٹے رکھا گیا ہے۔

اسلام لوٹے پیدا نہیں کرتا بلکہ عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ جیسے لوگ پیدا کرتا ہے۔ سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ کے جواب نے امیر المؤمنین کو لاجواب کر دیا۔ لہٰذا فرمایا:

''عمیر! اگر تم اس عہدہ کو قبول نہیں کر سکتے تو پھر میری طرف سے اجازت ہے کہ تم اپنے گھر والوں کے ساتھ رہو۔''

چنانچہ وہ مدینہ منورہ سے تین روز کی مسافت کی دوری پر ایک بستی میں جہاں ان کے اہل وعیال مقیم تھے، سکونت پذیر ہو گئے۔

کچھ روز کے بعد امیر المؤمنین نے ایک سو دینار ایک تھیلی میں بند کر کے اپنے ایک ساتھی حبیب رضی اللہ عنہ

Marfat.com

کو یہ کہہ کر دی کہ تم عمیر رضی اللہ عنہ کے مکان پر تین روز تک مہمان بن کر رہو۔ پھر تیسرے روز یہ تھیلی میری طرف سے ان کی خدمت میں پیش کر کے کہہ دینا کہ وہ ان اشرفیوں کو اپنی ضروریات میں خرچ کریں۔

حبیب رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین کی ہدایات کے مطابق اشرفیوں کی تھیلی کو لے کر سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ کے مکان پر پہنچے اور امیر المؤمنین کا سلام عرض کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دینے کے بعد امیر المؤمنین کی خیریت پوچھی اور ان کی حکمرانی کے بارے میں دریافت کیا، اور پھر امیر المؤمنین کے لیے ڈھیروں دعائیں کیں۔

سیدنا حبیب رضی اللہ عنہ تین روز تک ان کے مکان پر بطور مہمان مقیم رہے اور ہر روز کھانے میں دونوں وقت انھیں ایک روٹی اور زیتون کا تیل ملتا رہا۔ تیسرے روز سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ نے انھیں فرمایا:

''حبیب! اب تمھاری مہمانی کی مدت ختم ہوگئی، لہٰذا آج تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔ ہمارے گھر میں اتنا ہی خوراک کا سامان تھا جو ہم نے خود بھوکے رہ کر آپ کو کھلا دیا۔''

یہ سن کر حبیب رضی اللہ عنہ نے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق اشرفیوں کی تھیلی انھیں پیش کر دی اور کہا:

''امیر المؤمنین نے آپ کے خانگی اخراجات کے لیے یہ تھوڑی سی رقم بھیجی ہے۔''

آپ نے تھیلی ہاتھ میں لے کر ارشاد فرمایا:

''حبیب! میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے سرفراز ہوا، لیکن اس وقت سے دنیا کی دولت سے میرا دامن کبھی داغدار نہیں ہوا۔ پھر میں نے امیر المؤمنین سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت اٹھائی لیکن ان کے عہد میں بھی دولت دنیا کی آلودگیوں سے میں محفوظ رہا، مگر یہ زمانہ میرے لیے بدترین دور ثابت ہوا کہ میں امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے مجبور ہو کر بادل نخواستہ حمص کا گورنر بنا، اور اب امیر المؤمنین نے یہ دنیا کی دولت میرے گھر بھیج دی ہے۔''

ابھی اتنے الفاظ ہی کہے تھے کہ ان کی آواز بھرا گئی اور پھر زار و قطار رونے لگے۔ ان کے آنسوؤں کی دھاران کے رخساروں پر بہنے لگی اور انھوں نے اشرفیوں کی وہ تھیلی حبیب رضی اللہ عنہ کو واپس کر دی۔ یہ دیکھ کر ان کی اہلیہ نے آواز دی کہ اس تھیلی کو واپس نہ کیجیے کیونکہ یہ خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم عمر رضی اللہ عنہ کا عطیہ ہے۔ اس کو رد کر دینے سے امیر المؤمنین کی دل شکنی ہوگی، اور یہ آپ کی شان کے لائق نہیں ہے کہ آپ امیر المؤمنین کے لیے دلی صدمہ اور دل شکنی کا باعث بنیں، اس لیے اس تھیلی کو لے کر حاجت مندوں کو دے دیجیے۔ اہلیہ کے مخلصانہ مشورے کو قبول فرماتے ہوئے آپ نے تھیلی اپنے پاس رکھ لی اور اسی وقت فقراء اور مساکین کو بلا کر تمام اشرفیاں تقسیم کر دیں اور اس میں سے ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا حالانکہ وہ خود سب سے زیادہ محتاج تھے۔

حبیب رضی اللہ عنہ اس منظر کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور مدینہ طیبہ پہنچ کر جب انھوں نے امیر المؤمنین کو یہ سارا واقعہ سنایا تو امیر المؤمنین پر بھی رقت طاری ہوگئی اور وہ پھوٹ کر رونے لگے اور دیر تک روتے رہے۔ پھر جب

Marfat.com

آنسو تھمے تو فوراً سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ کو طلبی کے لیے ایک فرمان لکھا اور ایک قاصد کے ذریعہ یہ فرمان ان کے گھر بھیجا۔

فرمان خلافت پڑھ کر فرمایا کہ امیر المؤمنین کے حکم کی تعمیل مجھ پر واجب ہے۔ اور اسی وقت پیدل مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے۔ تین روز کا سفر کر کے دربار خلافت میں حاضر ہوئے۔ امیر المؤمنین نے پوچھا: ''جو اشرفیاں میں نے تمھیں بھیجی تھیں ان کا کیا ہوا؟'' عرض کی: ''امیر المؤمنین! میں نے اسی وقت سب اشرفیاں اللہ کے راستے میں خرچ کر دیں۔''

امیر المؤمنین حیرت سے ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ پھر اپنے بیٹے عبداللہ سے فرمایا: ''کہ تم بیت المال سے دو کپڑے لا کر عمیر رضی اللہ عنہ کو پہنا دو اور ایک اونٹ پر کھجوریں لاد کر ان کو دے دو۔'' آپ نے عرض کی:

''امیر المؤمنین! کپڑوں کو تو میں قبول کر لیتا ہوں کیونکہ کپڑے میرے پاس نہیں ہیں، لیکن کھجوریں میں ہرگز نہیں لوں گا کیونکہ میں ایک صاع کھجوریں اپنے مکان پر رکھ آیا ہوں جو میری واپسی تک میرے اہل وعیال کے لیے کافی ہیں۔''

پھر عمیر رضی اللہ عنہ واپس آ گئے اور چند ہی روز کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ جب امیر المؤمنین کو ان کے انتقال کی خبر ملی تو بہت روئے اور فرمایا:

''کاش عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ جیسے صاف باطن اور پاک باز اور پیکر اخلاق چند مسلمان مجھے مل جاتے تو ان سے مسلمانوں کے کاموں میں مدد لیتا۔''

صرف عمیر رضی اللہ عنہ ہی ایسے زاہد ومخلص نہ تھے بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کا قریباً ہر عہدے دار اسی طرح کا مخلص اور زاہد تھا۔ دنیا کے مال کی طرف اسے کوئی رغبت نہ تھی۔ ہر عہدیدار کو ایک تو اللہ کا خوف ہوتا تھا اور دوسرے امیر المؤمنین کے محاسبہ کا ڈر۔

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہیں۔ عشرہ مبشرہ کے صحابی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اس امت کا امین'' یعنی "امین ھذہ الامة" کا خطاب دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے محبوب، بہترین جرنیل غرضیکہ کون کون سی خوبیاں تھیں جو اللہ تعالیٰ نے ان میں نہ رکھی تھیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ان سے از حد محبت تھی۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب طاعون عمواس پھوٹی تو اس طاعون میں ۲۵ ہزار مسلمان لقمۂ اجل بن گئے جن میں بڑے بڑے جرنیل بھی تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بہت فکر تھی۔ آخر ''امین الامت'' تھے۔ لہٰذا آپ نے سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو وبا کے گرداب سے نکالنے کے لیے خط لکھا، جس کے الفاظ یہ تھے:

''سلام کے بعد! مجھے ایک ضرورت پیش آ گئی ہے جس کے بارے میں آپ سے زبانی بات کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا سخت تاکید کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ جونہی آپ کو میرا یہ خط موصول ہو تو فوراً میری طرف روانہ ہو جائیں۔''

Marfat.com

سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ایک مارشل آدمی تھے۔ آپ ساری عمر اطاعت امیر کے پابند رہے، لیکن اس خط کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ صرف اس لیے مدینہ بلا رہے ہیں کہ مجھے اس طاعون زدہ علاقہ سے نکالا جا سکے۔ چنانچہ خط پڑھ کر انھوں نے ساتھیوں سے فرمایا کہ ''میں امیر المؤمنین کی ضرورت جان گیا ہوں۔ وہ ایک ایسے شخص کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو باقی رہنے والا نہیں۔'' یہ کہہ کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو یہ جواب لکھا:

''امیر المؤمنین! آپ نے مجھے جس ضرورت کے لیے بلایا ہے وہ مجھے پتہ چل گئی ہے، لیکن میں مسلمانوں کے ایسے لشکر کے درمیان بیٹھا ہوں جس کے لیے میں اپنے قلب میں اعراض کا کوئی جذبہ نہیں پاتا، لہٰذا میں ان لوگوں کو تنہا چھوڑ کر اس وقت تک نہیں آنا چاہتا جب تک اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے بارے میں اپنی تقدیر کا حتمی فیصلہ نہیں فرما دیتا، اس لیے مجھے، اے امیر المؤمنین! اپنے اس تاکیدی حکم سے معاف فرمائیں، اور اپنے لشکر ہی میں رہنے دیں۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب اپنے خط کا یہ جواب پڑھا تو آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ پاس بیٹھے لوگوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جو آب دیدہ دیکھا تو پوچھا: ''کیا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہو گئی؟'' فرمایا: ''ہوئی تو نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہونے والی ہے۔'' (سیر اعلام النبلاء: ۱/۱۸۔۱۹، مستدرک حاکم: ۳/۲۶۳)

اس واقعہ سے بھی ان کی جلالت قدر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: ''میری خواہش ہے کہ میرا ایک گھر ہو جو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں سے بھرا ہوا ہو۔''

(سیر اعلام النبلاء: ۱/۱۴، طبقات ابن سعد: ۳/۳۰۰، حلیۃ الاولیاء: ۱/۲۶۲)

انہی سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب شام تشریف لے گئے تو وہاں کے امراء عظماء اور بڑے بڑے فوجی جرنیل آپ سے ملے۔ آپ نے ان میں سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو نہ دیکھ کر فرمایا:

''این اخی ابو عبیدہ؟''

''میرا بھائی ابوعبیدہ کہاں ہے؟''

انھوں نے جواب دیا: ''وہ ابھی آ رہے ہیں۔'' تھوڑی دیر بعد سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ایک اونٹنی پر سوار تشریف لائے جس کی نکیل ایک معمولی رسی کی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں سلام کیا۔ پھر لوگوں سے فرمایا: ''آپ حضرات تشریف لے جائیں۔'' آپ ان کے ساتھ ان کی رہائش گاہ پر تشریف لائے۔ انھیں دیکھ کر نہایت حیرت ہوئی کہ وہاں سوائے ڈھال، تلوار اور اونٹ کے کجاوے کے اور کچھ نہ تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ابوعبیدہ! کاش تم ضروری سامان تو اپنے گھر میں رکھ لیتے۔ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے نہایت بے نیازی سے جواب دیا: ''امیر المؤمنین! ہمارے لیے یہی کافی ہے۔''

(سیر اعلام النبلاء: ۱/۱۶، الاصابہ: ۵/۲۸۸، حلیۃ الاولیاء: ۱/۱۰۱، کتاب الزہد لاحمد بن حنبل: ص ۱۸۴)

Marfat.com

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ایک اور روایت اس سلسلہ میں نقل کی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب شام تشریف لے گئے تو آپ نے سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''میرے ساتھ اپنے گھر چلیں۔ (گویا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ امیر شام کے گھر کا مال واسباب کیا ہے؟ کتنے قالین اور کتنے صوفے ہیں؟) سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ میرے ہاں جا کر کیا کریں گے؟ آپ کو میرے گھر جا کر تکلیف ہوگی۔ آپ کی آنکھیں حیرانی سے کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اصرار تھا۔ چنانچہ وہ انھیں اپنی رہائش گاہ پر لے گئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ گھر بالکل خالی ہے۔ آپ نے نہایت تعجب سے پوچھا: ''ابوعبیدہ! آپ کا سامان کدھر ہے؟'' میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں صرف ایک پرانا گدا (سونے کے لیے) ایک پیالہ، ایک کمان ہے اور آپ شام کے امیر ہیں؟'' کیا تمھارے ہاں کچھ کھانے کا سامان بھی ہے؟'' سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں، اس مٹکے میں ہے۔'' چنانچہ آپ نے اس میں سے روٹی کے چند ٹکڑے دکھائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ انھیں دیکھ کر رو پڑے۔ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''امیر المومنین! میں نے پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ آپ میری رہائش گاہ کو دیکھ کر رو پڑیں گے۔ زندگی کے دن گزارنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔'' یہ سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"غیر تنا الدنیا کلنا غیرك یا ابا عبیده!"

''ہم سب کو دنیا نے دھوکے میں ڈال دیا سوائے تمھارے، اے ابوعبیدہ!'' (سیر اعلام النبلاء: ۱/۱۷)

یہ ہے زہد خالص کہ سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں۔ امیر شام ہیں لیکن گھر میں چند سوکھے ٹکڑے کھانے کے لیے ہیں۔

ایک مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں چار ہزار درہم یا چار سو دینار بھیجے اور قاصد سے فرمایا: ''کہ دیکھنا وہ اس رقم کا کیا کرتے ہیں؟'' قاصد کا بیان ہے کہ جونہی وہ رقم میں نے انھیں دی، انھوں نے ساری کی ساری راہِ خدا میں بانٹ دی۔ پھر اتنی ہی رقم سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ہاں بھیجی۔ انھوں نے بھی وہ ساری کی ساری راہِ خدا میں تقسیم کر دی اور ایک حبہ بھی پاس نہ رکھا۔ جب واپس آکر قاصد نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا تو آپ نے فرمایا:

"الحمدلله الذی جعل فی الاسلام من یصنع هذا"

''اللہ کا شکر ہے، اسلام میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔'' (سیر اعلام النبلاء: ۱/۱۷)

یہ تو زمانۂ نبوت کا حال تھا، لیکن جوں جوں زمانہ نبوت سے بُعد اور دوری ہوتی گئی زہد واتقاء اور دنیا کے مال و دولت کی محبت میں کچھ فرق آتا گیا۔ اسی طرح ولید بن عبدالملک چاہتا تھا کہ اندلس کی فتح کا وہ ڈھیروں مال غنیمت جلد از جلد اس کے پاس آئے کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اندلس میں بہت سا مال و دولت مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا یہاں دولت وثروت کے جو انبار مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے اس کی مثال اس سے پہلے کی جنگوں میں دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ شرعی حکم کے مطابق مال غنیمت لڑنے والے سپاہیوں اور حکومت

Marfat.com

وقت میں بحصہ رسدی تقسیم ہوتا تھا۔اس اصول کے مطابق عام سپاہیوں کو جو دولت وثروت ہاتھ لگی تھی اس سے اندلس کے عام شہری اور دیہی مسلمان باشندے معاشی حیثیت سے نہایت فارغ البال بلکہ متمول ہو گئے اور انھوں نے اپنی اسی دولت کے حصہ سے اندلس کے یہودیوں کو بھی مالا مال کر دیا۔انھوں نے کلیسا کے قیمتی ظروف اور زیورات یہودیوں کے ہاتھ فروخت کیے جس سے یہودی ایسے مرفہ الحال اور صاحب ثروت ہو گئے کہ بقول بعض عیسائی مؤرخین کے وہ اپنی اسی دولت اور ثروت کے اثر سے یورپ کے سیاسی اور مالی معاملات پر اپنا اثر واقتدار قائم کرنے میں کامیاب وکامران ہو گئے جن کے مٹانے کی کوششیں آج تک جاری ہیں۔

یہود پر اندلس میں مسلمانوں نے بہت احسانات کیے لیکن یہ قوم فطرتاً ایک احسان فراموش قوم ہے۔ ان کا ہیکل سلمانی سنہ ۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہیں تھا بلکہ ان کے معبد کھنڈر بنے ہوئے تھے۔اس لیے مسجد اقصیٰ اور قبہ صخرہ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی معبد کو مسمار کر کے مسلمانوں نے مسجدیں بنائی تھیں۔اور یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ رومیوں کے زمانہ میں فلسطین یہودیوں سے خالی کرا لیا گیا تھا اور دوسرے علاقوں سے بھی ان کا بیت المقدس میں داخلہ ممنوع تھا۔لیکن یہ مسلمانوں کا ان پر ایک بہت بڑا احسان تھا کہ انھوں نے پھر انھیں بیت المقدس میں رہنے اور بسنے کی اجازت دے دی۔اور تاریخ اس بات کی پوری پوری شہادت دیتی ہے کہ گزشتہ تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا ہے تو صرف مسلمان ملکوں میں، ورنہ دنیا کے ہر حصہ میں جہاں بھی عیسائیوں کی حکومت رہی، وہاں یہودی ظلم وستم کا نشانہ بنتے رہے۔ چنانچہ ان کے اپنے مؤرخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار دور وہ تھا جب وہ اندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے آباد تھے۔یہ دیوار گریہ جس کو آج یہودی اپنی سب سے بڑی یادگار سمجھتے ہیں، یہ بھی مسلمانوں کی عنایت سے انھیں ملی تھی۔ چنانچہ انھوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ دیوار گریہ پہلے ملبے اور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی اور اس کا نام ونشان تک باقی نہیں تھا اور نہ ہی لوگوں کو کوئی اس کا نشان معلوم تھا۔سولہویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو صاف کرا کر یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت عطا کی۔لیکن اس احسان فراموش قوم سے مسلمانوں کی شرافت اور فیاضی اور حسن سلوک کا بدلہ آج اس شکل میں ان کو دیا جا رہا ہے، اور آج اس ظالم قوم نے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے مسلمانوں کو ختم کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔

بات ہو رہی تھی مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں کہ مسلمانوں کو اندلس میں ڈھیروں مال غنیمت ملا اور فوجیوں میں شریعت کے مطابق جو تقسیم کیا گیا تو فوجی اس سے فارغ البال اور متمول ہو گئے اور جب انھوں نے سونے کے زیورات اور ظروف یہودیوں کے ہاتھ فروخت کیے تو وہ مرفہ الحال ہو گئے۔اب دوسری طرف مال غنیمت کا وہ حصہ جو شرعی طور پر مرکزی حکومت کے حصہ میں آیا، وہ بھی اتنا تھا کہ اس سے کبھی اتنا مرکزی

Marfat.com

حکومت کو نہ ملا تھا۔ مؤرخین اس کی قیمت کا اندازہ لگانا اور اس کی نوعیت کی تفصیل بتانا مشکل سمجھتے ہیں۔ البتہ تاریخ کی کتابوں میں جو تھوڑی بہت تفصیل آئی ہے وہ یہ ہے کہ جنگی قیدی جو غلام اور باندیاں بنا کر لے جائے گئے، وہ قریباً بیس ہزار تھے جن میں ہزاروں بے ماں باپ کی کنواری لڑکیاں بھی تھیں۔ زر و جواہرات اور سامان تعیش کی اس قدر کثرت تھی کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ صرف طلیطلہ اور اس کے گرد و نواح سے ستر (۷۰) طلائی مرصع تاج ملے جن میں زر و جواہرات لگے ہوئے تھے۔ اور ایک ہزار تلواریں ایسی ملی تھیں جن کے دستے زر و جواہرات سے مرصع تھے۔ اور زیورات، ظروف اور سامان تعیش میں ایسے بے شمار نوادرات تھے جو اپنی صنعت کے لحاظ سے اور اس زمانہ کے تمدن کے لحاظ سے نادرۂ روزگار تھے۔ ایک وسیع مرصع فرش بھی ملا جو اپنی ندرت میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس کا تانا بانا چاندی اور سونے کے تاروں کا تھا اور زبرجد، یاقوت اور دوسرے قیمتی جواہرات سے اس پر گل کاریاں کی گئی تھیں۔ اسی طرح زمردیں مائدہ سلیمانی کی قیمت کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا جو مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ بتایا یہ جاتا تھا کہ یہ میز سیدنا سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔ انبیاء علیہم السلام تو اس قسم کے زر و جواہر سے مرصع چیزیں نہیں بناتے، لیکن محققین کا خیال ہے کہ اندلس کے سلاطین بڑے راسخ الاعتقاد عیسائی تھے۔ بادشاہ اپنے تاج کلیسا کے لیے وقف کرتے تھے اور امراء و رؤسا مرتے وقت اپنے قیمتی ظروف اور زیورات اور زر و جواہر کلیسا کے نام وقف کر جاتے تھے، اور اندلس میں خصوصی طور پر اور پورے یورپ میں عمومی طور پر کیتھولک فرقہ کی حکمرانی تھی اور عیسائی پادریوں کا اتنا زور تھا کہ بادشاہِ وقت بھی ان کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتا تھا بلکہ پادری جس کو چاہتے بادشاہ بناتے اور جس کو چاہتے تخت و تاج سے محروم کر دیتے۔ انھوں نے امراء و رؤسا اور عوام الناس کی دولت و ثروت پر قبضہ کرنے کے لیے کلیسا کے نام نذر و نیاز کے بڑے ڈھونگ رچائے ہوئے تھے جیسے ہندوؤں کے پنڈتوں نے لوگوں کا مال و دولت سمیٹنے کے لیے سال کے ۳۶۵ دنوں میں ۳۶۰ تہوار بنائے ہوئے ہیں۔ اسی اندلس میں مرتے وقت وہاں کے امراء جو سونا چاندی اور زر و جواہر کلیسا کے نام وقف کرتے تھے، اس سونا چاندی اور جواہرات سے کوئی نہ کوئی استعمال کی چیز تیار کی جاتی تھی۔ یہ میز (مائدہ سلیمانی) بھی شروع میں کسی حکمران اور فرمان روا کی طرف سے بنائی گئی، پھر ہر نیا آنے والا فرمان روا اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا گیا، اور قیمتی جواہرات اس میں زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ فرمان رواؤں کی طرف سے بڑھتے گئے یہاں تک کہ یہ مائدہ سلیمانی اتنا قیمتی ہو گیا کہ اس کی قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔

اس مائدہ سلیمانی میں خالص سونے کے ۳۶۵ ٹھوس پائے تھے۔ گویا سال کے جس قدر دن ہیں اتنے ہی اس مائدہ کے پائے تھے۔ میز کی پٹیاں اور اس کے اوپر کا تختہ زبرجد کا تھا جس میں موتی، یاقوت، زمرد اور دوسرے نہایت قیمتی جواہرات الگ الگ حصوں میں لگے ہوئے تھے۔ یہ میز طلیطلہ کے کلیسا کی قربان گاہ پر رکھی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی تقریبوں اور تہواروں کے مواقع پر اس پر کتاب مقدس رکھ کر تلاوت کی جاتی تھی۔ طلیطلہ کی

Marfat.com

فتح کے موقع پر جب یہ مائدہ سلیمانی مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو ایک زمانہ دراز تک اس کا چرچا عام لوگوں کی زبانوں پر رہا کیونکہ یہ ایک نہایت قیمتی اور نادر روزگار شے تھی۔ طلیطلہ کی فتح کے موقع پر مال غنیمت میں ایک اور شے بھی مسلمانوں کے ہاتھ آئی وہ زبور مقدس کا ایک نادر الوجود نسخہ تھا۔ یہ نسخہ سونے کے ورقوں پر یاقوت کے پانی سے لکھا گیا تھا۔ ابن عذاری کا بیان ہے کہ یہ روشنائی ایسے طریقے سے بنائی گئی تھی کہ اب اس کا تیار کرنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو چکا ہے۔ علاوہ ان چیزوں کے اکسیر کیمیا سے بھرا ہوا ایک بڑا دیگ بھی ملا تھا۔

(ملاحظہ ہو نفح الطیب: ۱/۱۴۲، ابن عذاری، ترجمہ اردو: ص ۴۸، الامامۃ السیاسۃ: ۲/۶۵)

مال و دولت کے یہ انبار اس معاشرہ میں ہوتے ہیں جو خدا ناآشنا معاشرہ ہو، اور ذات پات کا تصور عام ہو، جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت ایران اور روم کی حالت تھی۔ ان دونوں سپر پاورز میں سے ایک کا سربراہ اپنے آپ کو خدا کے مقام پر سمجھتا تھا۔ ایران کی حالت روم سے زیادہ بدتر تھی اس کی ایک وجہ مزدکی تحریک تھی۔ یہ مزدک ۴۸۷ء میں پیدا ہوا۔ اس نے یہ دعوت دی کہ تمام انسان یکساں پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی تفریق نہیں، لہٰذا زن، زر اور زمین سب کی مشترک ہے۔ گویا یہ دنیا میں سب سے پہلا سوشلسٹ تھا جس نے ان تینوں کو ہر ایک کے لیے مشترک قرار دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ چونکہ مال اور عورت ہی دو ایسے عنصر ہیں جن کی حفاظت و نگرانی کا انسان اہتمام کرتا ہے، لہٰذا ان دونوں میں اشتراک اور مساوات سب سے زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ شہرستانی نے لکھا ہے:

"مزدک نے تمام عورتوں کو سب کے لیے حلال قرار دے دیا اور مال و زن کو آگ، پانی اور چارہ کی طرح سب کے لیے مشترک قرار دیا۔" (الملل والنحل: ص ۸۶)

قیروان میں جشن مسرت:

اندلس سے یہ مال غنیمت سیدھا شام نہیں لے جایا گیا بلکہ پہلے افریقہ کے فوجی ہیڈ کوارٹر قیروان میں لایا گیا۔ اندلس سے یہ سارا مال غنیمت جہازوں پر لاد کر طنجہ لایا گیا اور پھر ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں یہ سارا مال و متاع قیروان پہنچا۔ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بہت بڑی خوشی اور مسرت کا مقام تھا کہ مسلمان فوج کامرانی اور کامیابی کے ساتھ اندلس سے بہت بڑے مال غنیمت کے ساتھ واپس پہنچی تھی۔ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد دونوں جرنیل اپنی جمعیت کے ساتھ شہر سے باہر قصر الماس میں اترے اور پھر اسی قصر میں جشن مسرت منایا گیا۔ افریقہ کے اعیان و امراء، معززین شہر اور ممتاز عہدیداران کو اس میں شرکت کے لیے دعوت نامے بھیجے گئے اور انھوں نے بڑی خوشی سے اس میں شرکت کی۔ موسیٰ کا ایک صاحب زادہ مروان مغرب اقصیٰ کا گورنر تھا، وہ بھی اس جشن مسرت میں شریک ہوا۔ موسیٰ بن نصیر نے اس جشن میں تمام معززین اور شرکاء جشن کے سامنے ایک تقریر کی کہ

Marfat.com

''آج حق تعالیٰ شانہ کی تین بڑی نعمتیں حاصل ہیں۔ایک امیرالمؤمنین ولید بن عبدالملک کا مکتوب گرامی ہے جس میں میری خدمات کی تحسین کی گئی ہے اور شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے۔ دوسرے میرے بیٹے عبدالعزیز کا ایک تازہ مکتوب موصول ہوا ہے جس میں مزید فتوحات کا تذکرہ ہے جو میری غیر موجودگی میں اندلس میں اس نے حاصل کیں ان دونوں نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔''

ان دونوں نعمتوں کے تذکرہ پر تمام حاضرین جشن مسرت نے کھڑے ہو کر موسیٰ بن نصیر کی خدمات کو سراہا اور ان فتوحات پر انھیں مبارک باد دی۔ ان کی مبارک سننے کے بعد موسیٰ نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

''اور تیسری نعمت میں تم لوگوں کو ابھی دکھاتا ہوں۔''

موسیٰ یہ کہہ کر کھڑے ہوئے اور پردہ اٹھانے کا حکم دیا۔ پردہ کا اٹھنا تھا کہ پیکران حسن و جمال کا ایک جھرمٹ دکھائی دیا جو نہایت بیش قیمت لباسوں میں ملبوس اور زیورات و جواہرات سے آراستہ و پیراستہ پرا جمائے سامنے کھڑا تھا۔ ان پری پیکروں کو دیکھ کر اہل مجلس کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ لیث بن سعد کا بیان ہے کہ ''اندلس کی جنگ میں قیدیوں کی جتنی بڑی تعداد موسیٰ بن نصیر کو حاصل ہوئی اس کی تاریخ میں مثال اس سے قبل نہیں ملتی۔''

اس جشن مسرت کے بعد موسیٰ نے افریقہ روانہ ہونے سے قبل یہاں کے معززین شہر اور امراء اور اپنے دوست احباب میں تحائف اور ہدایا تقسیم کیے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ جوں جوں زمانہ نبوت سے دوری ہوتی گئی دوں دوں مسلمانوں میں دینی اقدار میں کمی آتی گئی۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں دینی اقدار کا جو احترام و اکرام تھا وہ بعد کے زمانوں میں نہ رہا۔ موسیٰ بن نصیر تابعین میں سے تھے، اس لیے وہ شریعت کے خلاف کوئی کام کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ جشن مسرت بھی انھوں نے اسی حد تک منایا جس حد تک شریعت اجازت دیتی ہے۔ یہ ہمارے آج کل کے جشن مسرت کی طرح نہیں جس میں رقص و سرود کی محفلیں جمائی جاتی ہیں اور شرابیں پی جاتی ہے اور بھنگڑے ڈالے جاتے ہیں۔ اسلام اس قسم کی محفلوں کی اجازت نہیں دیتا۔

کاؤنٹ جولین کو اس کی خدمات کا صلہ:

کتابوں میں لکھا ہے کہ موسیٰ بن نصیر نے اندلس سے اپنی روانگی سے قبل کاؤنٹ جولین کو اس کی ان خدمات کا صلہ دیا جو اس نے مسلمانوں کے لیے کی تھیں۔ وہ صلہ یہ دیا کہ اس کو صوبہ سبتہ اور اس کے آس پاس کے علاقہ کا حکمران بنا دیا۔ مذہباً وہ عیسائی تھا۔ سب سے پہلے اس کے تعلقات طارق بن زیاد کے ساتھ قائم اور

Marfat.com

استوار ہوئے۔ جولین نے اس کو اندلس پر حملہ کے لیے کہا۔ طارق نے جولین کو موسیٰ بن نصیر سے ملایا۔ موسیٰ نے اس کی اس پیشکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طارق کو اندلس پر حملہ کے لیے بھیجا۔ جولین نے طارق کی ہر ممکن مدد کی بلکہ راڈرک کے ساتھ جو جنگ ہوئی اور اس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اس فتح میں جولین کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ طارق کے ایک سال بعد موسیٰ بن نصیر خود اندلس آیا۔ جولین اس کا بھی دلیل راہ تھا اور ہر جگہ اس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ اس کی خدمات مسلمانوں کے لیے ناقابل فراموش ہیں، لیکن وہ شروع سے لے کر آخر تک عیسائی ہی رہا۔ ایک موقع پر بھی مسلمانوں نے اسے دائرہ اسلام میں آنے کے لیے نہیں کہا۔ کیونکہ اسلامی تعلیم ہے ''لا اکراہ فی الدین، دین میں کوئی جبر نہیں۔'' مسلمانوں نے ایک موقع پر بھی جبر کر کے اسے مسلمان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صبح و شام مسلمانوں کے اعمال و اخلاق کو دیکھتا تھا۔ مسلمانوں کے یہ اعمال و اخلاق ہی اس کے لیے ایک دعوت تھے جس کو اس نے موسیٰ اور طارق کے اندلس میں رہنے تک قبول نہیں کیا اور وہ برابر اپنے مذہب عیسائیت پر قائم رہا۔

یہاں ایک بات ذہن میں رکھیں کہ یہ جو مستشرقین نے اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ کیا ہے کہ مسلمانوں نے جبراً لوگوں کو جہاد کے ذریعہ مسلمان کیا، یہ بات سراسر غلط ہے۔ چنانچہ پروفیسر آرنلڈ نے عیسائیوں کے اس الزام کے خلاف ایک ضخیم کتاب پریچنگ آف اسلام کے نام سے لکھی، اور احقر کی بھی ایک کتاب ''اسلام کی دعوتی قوت'' اس موضوع پر چھپی ہوئی ہے جس میں دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام تلوار سے نہیں بلکہ دعوت سے پھیلا ہے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی ایک بہادر جرنیل اور سلطان تھا اور اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں اس نے ایک نمایاں کردار ادا کیا مگر اپنی زبان سے نہ کہ تلوار سے۔ اس کا معمول یہ تھا کہ وہ اسلام کی ترغیب دیتا تھا۔ سلطان صلاح الدین کی حسن سیرت اور شجاعت نے اس کے معاصرین کے دلوں پر ایک عجیب فسوں کیا ہوا تھا اور بعض عیسائی بہادروں کے لیے اس کی شخصیت میں اس قدر کشش اور جاذبیت تھی کہ وہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر دین اسلام میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ اس کی مثال ایک انگریز کی ہے جس کا نام رابرٹ (Robert) تھا اور جو سینٹ البنس کا رہنے والا تھا۔ اس نے سنہ ۱۱۸۵ء میں عیسائیت کو ترک کر کے اسلام قبول کر لیا اور بعد ازاں سلطان کی ایک نواسی سے شادی کر لی۔ اس زمانہ میں سلطان صلاح الدین اور طرابلس الشام کے حاکم ریمنڈ سوم کے مابین ایک معاہدہ ہوا تھا کہ ریمنڈ اپنے ماتحتوں کو مسیحی دین چھوڑ کر اسلام قبول کرنے کی ترغیب دے گا لیکن ریمنڈ کی اچانک موت کی وجہ سے اس منصوبہ پر عمل نہ ہو سکا۔ (روجر ہوڈن: ۲/۳۱۶۔۳۲۲)

جب بیت المقدس عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے ارض مقدس کی فتوحات حاصل کیں تو ان باتوں نے اہل یورپ کو تیسری صلیبی جنگ برپا کرنے پر برانگیختہ کیا۔ اس جنگ کا سب سے بڑا واقعہ شہر عکہ کا محاصرہ ہے جو سنہ ۱۱۸۹ء سے لے کر سنہ ۱۱۹۱ء تک جاری رہا۔ اس لڑائی میں

Marfat.com

قحط اور بیماری کی وجہ سے عیسائی لشکر کو جس ہولناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس سے مجبور ہو کر بہت سے عیسائیوں نے اپنے لشکر کو چھوڑ دیا اور فاقہ کشی سے نجات پانے کے لیے مسلمانوں کی لشکر گاہ میں چلے گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد بہت سے لوگ مسیحی حلقہ میں واپس آ گئے لیکن بہت سے لوگوں نے اپنی قسمت کو اہل اسلام کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ بعض نے مسلمانوں کی ملازمت اختیار کر لی لیکن وہ اپنے دین پر قائم رہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آقاؤں (مسلمانوں) سے بہت خوش تھے۔ اور بعض اسلام قبول کر کے اچھے اور نیک مسلمان ثابت ہوئے۔ اس عہد کے جو عیسائی اپنا دین چھوڑ کر گئے تھے ان کا ذکر بکثرت ان سیاحوں کی تحریروں میں ملتا ہے جنھوں نے ارض مقدس اور دوسرے مشرقی ملکوں کا سفر کیا تھا۔ جب لوئی شاہ فرانس گرفتار ہو گیا اور اس نے اپنی رہائی کے لیے سنہ ۱۲۵۰ء میں زرفدیہ ادا کرنے کا حلف اٹھایا تو اس موقع پر حلیفہ کلمات کے تجویز کرنے والے جو لوگ تھے وہ پہلے پادری تھے مگر اب مسلمان ہو چکے تھے۔

مصر میں اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد قبطیوں کو اپنی مذہبی زندگی میں ایسی آزادی حاصل ہوئی جو ان کو ایک صدی سے نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جزیہ کی وصولی کے بعد سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر نے ان کی عبادت گاہوں کو ان کے قبضہ میں رہنے دیا اور تمام مذہبی معاملات میں ان کو خود مختار بنا دیا اور گزشتہ حکومت کی مسلسل دست اندازی سے ان پر جو بار تھا، اس سے ان کو آزاد کر دیا۔ انھوں نے کلیسا کے اوقاف پر ہاتھ نہیں ڈالا اور نہ ہی کسی قسم کی اور غارت گری جائز رکھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت کے ابتدائی ایام میں قبطیوں کی حالت نہایت اچھی تھی، اور اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ قبطیوں کا اس کثرت کے ساتھ اسلام میں داخل ہونا مسلمان حکام کے جبر و اکراہ یا ناجائز دباؤ کا نتیجہ تھا۔ ابھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اور مصر کا دارالحکومت اسکندریہ عرب حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہا تھا کہ اکثر قبطیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ چنانچہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مصر کے محاصل کی مقدار ایک کروڑ بیس لاکھ تھی، لیکن مصر کے لوگ اس کثرت سے مسلمان ہوئے کہ چند سال بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یہ آمدنی پچاس لاکھ رہ گئی، اور سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یہ آمدنی اور بھی کم ہو گئی یہاں تک کہ مصر کے گورنر حیان بن شریح نے یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوں ان کو جزیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ نہ کیا جائے، لیکن سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اس تجویز کو منظور کرنے سے یک قلم انکار کر دیا اور فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی اسلام بنا کر بھیجا تھا ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔'' (طبقات ابن سعد: ۲۸۳/۵)

بعد میں حفص بن ولید نے ۷۴۴ء میں اعلان کیا کہ جو لوگ مسلمان ہو جائیں گے وہ جزیہ کی ادائیگی سے بری الذمہ ہوں گے، اس اعلان پر چوبیس ہزار عیسائی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(تاریخ بطارقۂ اسکندریہ از سادیروس: ص ۱۷۲)

Marfat.com

اسلامی عہد کی ابتداء میں مصر میں اسلام جس سرعت اور تیزی سے پھیلا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس کی اشاعت میں کوئی خاص کوشش کی گئی تھی بلکہ اس کا زیادہ تر سبب یہ تھا کہ عیسائی مذہب میں اب وہ کشش اور جاذبیت باقی نہ رہی تھی جس کی بدولت عیسائی لوگ اپنے مذہب پر ثابت قدم رہ سکتے۔ الٰہیات کے وہ مسائل جن کی بنا پر یعقوبی فرقے کی الگ بنیاد پڑی تھی اور جن کے ساتھ وہ مدت دراز تک بڑی جدوجہد سے قربانیاں دے کر وابستہ رہے تھے، اور نہایت دقیق اور عسیر الفہم تھے، لہٰذا بہت سے لوگوں نے ان غیر متناہی مباحثوں سے پریشان اور ملول ہو کر ایک ایسے دین کی طرف رخ کیا جس کی تعلیم کو خدا کی توحید اور محمد ﷺ کی رسالت جیسے سادہ اور آسان کلمے میں مختصر بیان کر دیا گیا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں قدیس انطونی خانقاہ میں جو اطفیح میں دریائے نیل کے کنارے پر واقع تھی، ایک راہب گزرا ہے جس کا نام بدوطس تھا۔ یہ عیسائی عقائد کا ایک بہت بڑا عالم تھا اور راہبانہ زندگی کے فرائض اور شریعت کے احکام پر پورا عبور رکھتا تھا۔ اس کے عقائد ان عقائد سے مختلف ہو گئے جن کو ۳۱۸ علماء کی مجلس نے نیقیہ میں منظور کیا تھا۔ اس نے بہت سے ایسے اشخاص کے خیالات تبدیل کر دیئے جنھوں نے صحیح عقائد کی تعلیم پائی تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ ہمارا خداوند یسوع مسیح بھی دوسرے پیغمبروں کی طرح ایک پیغمبر تھا۔ وہ اپنی ملت کے رذیل ترین طبقے کے ساتھ میل ملاپ رکھتا تھا۔ اکثر راہب کا لباس پہنتا تھا۔ جب اس سے اس کے مذہب اور عقیدہ کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ میں خدا کی وحدانیت کا قائل ہوں، اور اس کے عقائد ایک عرصہ تک شائع رہے جن کا خاتمہ ۱۱۲۳ء میں ہوا جب اس نے وفات پائی تو اس کی یاد ہمیشہ کے لیے فراموش ہو گئی۔" (مصر کے گرجے اور خانقاہیں از ابو صالح: ص ۱۶۳-۱۶۴)

اس کے علاوہ عیسائی زندگی کے ایک ایسے نظریے میں جس کا بلند ترین مظہر ایک نہایت مذموم قسم کی رہبانیت تھی۔ اسلام کے نظام اخلاق کے مقابلہ میں جس کی بنیاد اسلامی فطرت پر ہے، لوگوں کے لیے بہت کم کشش اور جاذبیت تھی۔ اس وجہ سے بھی مصر کے لوگ نہایت سرعت کے ساتھ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کے عہد حکومت میں مصر کے عیسائی اس کی رواداری کے باعث بہت خوش تھے اور رواداری کے باعث کئی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حبشہ میں اسلام کے فروغ کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ حبشہ کے عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمان اخلاقی برتری رکھتے تھے، چنانچہ جب کسی خالی نشست کے لیے کسی دیانت دار اور قابل اعتماد شخص کو منتخب کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی تو اس کے لیے ہمیشہ کسی مسلمان کا انتخاب عمل میں آتا تھا کیونکہ عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمان زیادہ دیانت دار، امین اور چست و چالاک تھے۔

غرض کہ ہر دور اور ہر علاقہ میں اسلام صرف اخلاق اور دعوت سے پھیلا۔ تاتاری جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک اودھم مچایا اور اپنی پوری سفاکی اور سفارت گری سے تمام شہروں کے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی، لیکن ایک صدی کے اندر اندر بالآخر وہ بھی مسلمانوں کے دین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اوکتائی خان کے عہد حکومت میں فارس کا ایک گورنر گزرا تھا، وہ پہلے بدھ مت کا پیرو کار تھا لیکن جب

Marfat.com

وہاں روحانی اطمینان حاصل نہ ہوا تو بدھ مت کو ترک کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ تیمور خان کے عہد میں آنندا جو قبلائی خان کا پوتا اور صوبہ کانسو کا حاکم تھا، ایک پر جوش مسلمان ثابت ہوا، چنانچہ اس نے تان گوت میں بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا اور جو لشکر اس کے زیر فرمان تھا، اس کی ایک کثیر تعداد نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس کو دربار میں طلب کیا گیا اور اس بات کی پوری پوری کوشش کی گئی کہ وہ بدھ مت اختیار کر لے۔ جب اس نے اسلام کو ترک کرنے سے انکار کیا تو اسے پس دیوار زندان کر دیا گیا، لیکن پھر اسے جلد ہی رہا کر دیا گیا کیونکہ اس بات کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ تنکوت کے باشندے جو اس کے ساتھ بہت عقیدت رکھتے تھے، بغاوت کر دیں گے۔

منتخب التواریخ کے مصنف کا بیان ہے کہ آنندا نے خان بالغ (چین کے دارالحکومت پیکنگ کو تاتاری ''خان بالغ'' کہتے تھے جس کے معنی ہیں ''خان کا شہر'') میں چار مسجدیں تعمیر کروائیں تھیں جن میں جمعہ کے روز دس لاکھ افراد نماز ادا کر سکتے تھے، لیکن چین میں اسلام کی اشاعت کے بارے میں اس قسم کی روایات کو معتبر نہیں سمجھا جاتا کیونکہ ان میں آنندا کو تیمور خان کا جانشین بتایا ہے۔

تاتاریوں کا پہلا فرمان روا جو مسلمان ہوا وہ ''برکہ خان'' تھا جو آلتون اردو کا حکمران تھا جس نے سنہ ۱۲۵۶ء سے ۱۲۶۷ء تک حکومت کی تھی۔ ابوالغازی کا بیان ہے کہ برکہ خان نے اپنی تخت نشینی کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ روایات میں ہے کہ ایک روز وہ ایک قافلہ میں گیا جو بخارا سے آیا تھا اور اس میں سے وہ دو تاجروں کو الگ لے گیا اور ان سے اسلام کے بارہ میں کچھ سوالات کیے۔ انھوں نے اسلام کے عقائد اس خوبی سے اس کے سامنے بیان کیے کہ ''برکہ خان'' صدق دل اور خلوص قلب سے حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ اس نے اس کا ذکر سب سے پہلے اپنے چھوٹے بھائی سے کیا اور اسے بھی اسلام لانے کی ترغیب دی۔ اس کے بعد اس نے اپنے مسلمان ہونے کا برملا اعلان کر دیا۔ لیکن جوزجانی کی روایت یہ ہے کہ برکہ خان کی تربیت بچپن سے ہی ایک مسلمان کی طرح ہوئی تھی اور جب وہ بڑا ہو کر لکھنے پڑھنے کے قابل ہوا تو خواص نجند کے ایک عالم سے قرآن حکیم پڑھا۔ (جوزجانی: ص ۴۴۷) اسی مصنف نے لکھا ہے کہ اس کا تمام لشکر مسلمان تھا۔ معتبر اشخاص نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کی فوج کے ہر سوار کے پاس ایک سجادہ (جائے نماز) ہوتا تھا تاکہ جب نماز کا وقت آئے تو وہ نماز پڑھ سکے۔ اس کی ساری فوج میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو شراب پیتا ہو۔ بڑے جلیل القدر علماء یعنی مفسر، محدث فقیہہ اور مناظر اس کی صحبت میں رہتے تھے۔ اس کے دربار میں ہمیشہ دینی مسائل پر بحث ہوتی تھی اور بحیثیت مسلمان وہ اپنے مذہب میں بڑا پختہ اور صحیح العقیدہ تھا۔ (تاریخ جوزجانی: ص ۱۲۸۵۔۱۲۸۶)

تاتاریوں کی درمیانی مملکت چغتائی اور اس کے جانشینوں کے حصہ میں آئی۔ اس میں اسلام کی دعوت و اشاعت کیسے ہوئی؟ اس بارے میں یوں کہا جاتا ہے کہ چغتائی نے مسلمانوں پر ایسی پابندیاں عائد کر دی تھیں جو ان کے لیے تکلیف و آزار کا باعث تھیں۔ جوزجانی کا بیان ہے کہ تمام تاتاری حکمرانوں میں چغتائی اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا اور اس کے سامنے کوئی شخص اسلام کا نام بغیر تحقیر اور مذمت کے نہیں لے سکتا تھا (جوزجانی: ص ۳۸۱،۳۷۹)۔

Marfat.com

لیکن اس کے پوتے اور جانشین قرابلاکو کی بیگم ارغنہ نے اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت اسلامی طریقے پر کی تھی اور اس نے سنہ ۱۲۶۴ء میں مبارک شاہ کے نام سے چغتائی مملکت کے تخت کا دعویٰ کیا تھا، لیکن اس کے چچازاد بھائی براق خان نے اسے جلد ہی تخت و تاج سے محروم کر دیا، لیکن اس براق خان کو اپنی وفات (سنہ ۱۲۷۰ء) سے چند روز قبل نور اسلام حاصل کرنے کی توفیق نصیب ہوئی تھی اور اس نے سلطان غیاث الدین کا نام اختیار کیا تھا۔

(ابوالغازی: ۲/۱۹۵)

لیکن اس کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقے پر نہیں بلکہ تاتاریوں کے قدیم دستور کے مطابق ہوئی تھی۔ جو تاتاری اس کے عہد میں مسلمان ہوئے تھے، اس کی وفات کے بعد وہ قدیم مذہب کی طرف لوٹ گئے۔

چغتائی مملکت کے زوال کے بعد کاشغر کے جس پہلے مسلمان حکمران نے ایک الگ مملکت قائم کی، تاریخ میں اس کا نام تو قلق تیمور خان تھا۔ اس نے بخارا کے ایک بزرگ جمال الدین کی دعوت و تبلیغ سے اسلام قبول کیا تھا۔ روایت میں ہے کہ یہ شیخ چند مسافروں کے ساتھ نادانستہ طور پر تو قلق خان تیمور کی چراگاہ میں داخل ہو گیا اور خان نے حکم دیا کہ اس کی مشکیں باندھ کر اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔ جب شیخ جمال الدین کو حاضر کیا گیا تو تو قلق خان نے ان سے غضب ناک ہو کر پوچھا کہ تم لوگوں نے ہمارے شکار میں خلل ڈالنے کی کیسے جرأت کی؟ شیخ جمال الدین نے جواب دیا کہ ہم بالکل اجنبی ہیں اور اس بات سے مطلق ناآشنا ہیں کہ ہم ایک ممنوعہ علاقہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ جب تو قلق خان کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایک ایرانی سے تو ایک کتا بھی بہتر ہوتا ہے۔ شیخ نے جواب دیا کہ ہاں یہ سچ ہے۔ اگر ہم دین برحق پر نہ ہوتے تو اس صورت میں ہم یقیناً کتوں سے بھی بدتر تھے۔ شیخ کے اس جواب سے تو قلق خان بہت متاثر ہوا اور اس نے حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو اس جرأت مند ایرانی کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ شیخ کو خان کی واپسی پر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ خان نے شیخ کو الگ لے جا کر پوچھا کہ ''دین برحق کیا چیز ہے؟ اور اس سے تمھاری کیا مراد ہے؟'' یہ سن کر شیخ نے اسلام کے عقائد ایسے دینی ولولے سے بیان کیے کہ تو قلق خان کا دل جو پتھر کی طرح سخت تھا، موم کی مانند پگھل گیا۔ پھر شیخ نے حالت کفر کا ایسا ہیبت ناک نقشہ کھینچا کہ خان کو اپنے گمراہ اور بے بصیرت ہونے کا مکمل یقین ہو گیا، لیکن اس نے کہا کہ اگر میں اس وقت دین اسلام کا اظہار کروں تو میں اپنی رعایا کو راہ راست پر نہ لا سکوں گا، لہٰذا تم ابھی صبر و تحمل سے کام لو۔ جب میں اپنے باپ دادا کی سلطنت کا مالک بنوں گا تو اس وقت میرے پاس پھر آنا۔

اس زمانہ میں چغتائی سلطنت پارہ پارہ ہو کر چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور کئی برسوں کے بعد تو قلق تیمور تمام سلطنت کو اکٹھا کرنے اور اس پر اپنی حکمرانی قائم کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس اثناء میں شیخ جمال الدین اپنے ملک کو واپس جا چکے تھے۔ وطن پہنچ کر وہ سخت بیمار ہو گئے۔ اور جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے بیٹے رشید الدین کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا:

Marfat.com

''توقلق تیمور ایک روز بڑا بادشاہ بننے والا ہے۔ اس وقت اس کے پاس ضرور جانا اور اس کو میرا اسلام پہنچانا اور اسے بے خوف وخطر وعدہ یاد دلانا جو اس نے مجھ سے کیا تھا۔''

چند سالوں کے بعد جب توقلق تیمور اپنے باپ دادا کے تخت وتاج کا وارث بنا تو رشید الدین اپنے باپ شیخ جمال الدین کی وصیت کے مطابق توقلق تیمور خان کے لشکر میں جا پہنچا، لیکن اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ خان کے دربار میں کامیاب نہ ہو سکا آخر کار مجبور ہو کر اس نے یہ تدبیر کی کہ ایک روز صبح سویرے خان کے خیمے کے پاس اذان دینی شروع کر دی۔ جب اس طرح توقلق خان کی نیند خراب ہوئی تو اس نے غضب ناک ہو کر رشید الدین کو اپنے پاس بلایا۔ رشید الدین نے خان کے سامنے حاضر ہو کر اسے اپنے باپ کا پیغام پہنچایا۔ توقلق شیخ جمال الدین سے اپنا وعدہ بھولا نہیں تھا، چنانچہ اس نے کہا کہ جب سے میں تخت پر بیٹھا ہوں، جو وعدہ میں نے کیا تھا وہ میرے کوزۂ ذہن میں محفوظ تھا لیکن جس شخص سے میں نے وعدہ کیا تھا وہ میرے ذہن میں نہیں تھا کیونکہ وہ پھر کبھی نہ آیا۔ بہرحال اب میں تمھارا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس کے بعد توقلق خان نے کلمۂ شہادت پڑھا اور مشرف باسلام ہو گیا، اور بقول ابوالغازی ''اس صبح آفتاب اقبال نے توفیق الٰہی کے افق سے طلوع کیا اور کفر کی شب دیجور کافور ہو گئی'' اس کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ تبلیغ اسلام کے لیے مغل شہزادوں سے فرداً فرداً گفتگو کرنی چاہیے۔ جو لوگ اسلام قبول کریں تو یہ بات ان کے حق میں اچھی ہو گی۔

جس شخص سے سب سے پہلے پوچھا گیا وہ امیر تولک تھا۔ خان نے اس سے پوچھا: ''کیا تم اسلام قبول کرو گے؟'' اس پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہنے لگا کہ تین سال ہوئے جب کاشغر کے چند مقدس لوگوں نے میرے سامنے اسلام کی تبلیغ کی اور اس سے متاثر ہو کر میں دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا، لیکن آپ کے خوف کی وجہ سے میں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ سن کر توقلق خان اٹھا اور اس کو گلے لگا لیا اور پھر تینوں اکٹھے بیٹھ گئے۔ اسی طرح سے انھوں نے سب شہزادوں سے یکے بعد دیگرے گفتگو کی اور ان سب نے اسلام قبول کر لیا سوائے ایک شخص کے جس کا نام جراس تھا۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ شیخ اور اس کے ملازم کے مابین زور آزمائی کا مقابلہ ہونا چاہیے۔ اس کا ملازم ایک بڑا قد آور کافر تھا۔ وہ اس قدر طاقت ور تھا کہ دو سال کے اونٹ کو اٹھا سکتا تھا۔ شیخ رشید الدین نے اس مقابلہ کو منظور کر لیا اور اس سے کہا کہ اگر میں تمھارے ملازم کو گرا نہ سکا تو میں تمھیں مسلمان ہونے کے لیے نہیں کہوں گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہے کہ مغل لوگ مشرف باسلام ہوں تو وہ مجھے بے شک اس آدمی کو مغلوب کرنے کے لیے کافی طاقت بخشے گا۔ توقلق خان اور دوسرے مسلمانوں نے شیخ کو سمجھانے اور باز رکھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن شیخ اپنے ارادے میں پختہ رہے۔ اس مقابلہ کو دیکھنے کے لیے ایک انبوہ کثیر اکٹھا ہو گیا اور اس کافر ملازم کو مقابلے کے لیے اندر لے آئے، اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ ملازم جس کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا، بڑے پر غرور انداز میں آگے بڑھا۔ شیخ اس کے سامنے بہت چھوٹے اور کمزور دکھائی دیتے تھے۔ جب وہ ایک دوسرے کو گھونسے مارنے لگے تو شیخ نے ملازم

Marfat.com

کے سینے پر اس زور سے ضرب لگائی کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ہوش میں آیا تو وہ اٹھا اور شیخ کے قدموں میں گر کر کلمۂ شہادت پڑھنے لگا۔ لوگوں نے آفریں اور ستائش کے نعرے بلند کیے اور اس روز ایک لاکھ ساٹھ ہزار تاتاریوں نے اپنے سروں کی بودیاں کٹوا دیں اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اور نور اسلام کی برکت سے تاریکیاں دور ہو گئیں۔ (ابوالغازی: ۱۸۶/۲۔۱۸۸) اس وقت سے اسلام ان تمام شہروں میں مضبوطی سے قائم ہو گیا جو چغتائی خان کے جانشینوں کے زیر نگین تھا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے کبھی کسی غیر مسلم پر اسلام قبول کرنے کے لیے جبر نہیں کیا اور نہ ہی کسی غیر مسلم نے جبراً اسلام کو قبول کیا ہے۔ کاؤنٹ جولین نے مسلمانوں کی مدد کی لیکن مسلمانوں نے اس کو اسلام کے دائرہ میں داخل کرنے کے لیے نہ تو کوئی ترغیب دی اور نہ ہی ترہیب سے کام لیا بلکہ اس کو اس کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیا۔ بعض عیسائی مؤرخین نے کاؤنٹ جولین کے بارے میں یہ کہا کہ ع

قومے فروختند چہ ارزاں فروختند

یعنی انھوں نے جولین پر عیسائیت اور اندلس سے غداری کرنے اور اس کے صلہ میں حکومت حاصل کرنے کا الزام لگایا ہے۔ ان مؤرخین کو یہ بات اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کاؤنٹ جولین نے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ فتح اندلس میں مسلمانوں کی مدد کی یا اس نے مسلمانوں کو اندلس پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی، لیکن اس نے یہ سب کچھ مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے نہیں کیا تھا بلکہ اس کا مقصد اپنے نفس کو تسکین دینا تھا اور راڈرک کی انسانیت سوز حرکت کی وجہ سے اس سے اپنا ذاتی انتقام لینا تھا۔ جب سے اس کی بیٹی فلورنڈا نے اس کو راڈرک کی اس حرکت کے بارے میں بتایا تھا اسی وقت سے اس کے دل میں آتش انتقام کا لاوا ابل رہا تھا۔ انتقام کی اس آتش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا، چنانچہ اس میں اس کی ذاتی طمع اور ذاتی فائدہ مضمر تھا۔ ورنہ اندلس کی فلاح و بہبود اور اندلس کی عیسائی حکومت کی خیر خواہی کے لیے وہ بہت کوششیں کر چکا تھا۔ چنانچہ جس وقت عقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے اندلس پر حملہ آوری کا ارادہ کیا تھا اس وقت اس کو اس سے باز رکھ کر اس نے انھیں بربر قبائل کی طرف پیش قدمی کا مشورہ دے دیا تھا۔ اس طرح سے اس نے کئی موقعوں پر اسلامی حملوں کی مدافعت کی تھی۔ لیکن راڈرک کے اس واقعہ کی وجہ سے وہ سخت انتقام پر اتر آیا اور مسلمانوں کی جرأت و بہادری کی وجہ سے اس کا یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ لیکن پھر بھی اس کے توسط سے مسلمانوں کو جو فائدہ ہوا، مسلمانوں نے اس کا صلہ اور انعام اس کو دے دیا کہ وہ اپنی پوری زندگی سبتہ کا حکمران رہا۔ پھر اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کافی عرصہ تک نسلاً بعد نسل اس صوبہ کی حکمران رہی اور وہ لوگ بھی اپنے آبائی دین عیسائیت پر قائم رہے۔ مسلمانوں نے کبھی بھی دین کے بارے میں ان سے مزاحمت نہیں کی۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ جولین کے پوتوں اور پڑپوتوں نے خود بغیر کسی جبر کے اسلام کو قبول کیا۔ چنانچہ ابوسلیمان ایوب چوتھی صدی ہجری میں اس خاندان کے ذی علم فقیہ گزرے ہیں۔

Marfat.com

موسیٰ بن نصیر ایک دوراہے پر:

ادھر موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد اپنے سپاہیوں اور مال غنیمت کے ساتھ دمشق کی طرف روانہ ہوئے ادھر دارالخلافہ میں ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک بستر مرگ پر لیٹا تھا اور دوسری طرف سلیمان بن عبدالملک مسند خلافت پر براجمان ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ سلیمان بن عبدالملک نے ایک تیز رو قاصد موسیٰ بن نصیر کے پاس بھیجا کہ وہ اپنے سفر کی رفتار کو سست کر دیں کیونکہ خلیفہ ولید ایسے مرض میں مبتلا ہے جس سے اس کا جانبر ہونا ناممکن ہے، اس لیے وہ سلیمان کی تخت نشینی کے بعد اس سارے مال و متاع کے ساتھ دمشق میں داخل ہو۔ لیکن دوسری طرف خود خلیفہ ولید بن عبدالملک کا پیغام موسیٰ کو یہ ملا کہ وہ سفر کی منزلیں عجلت سے طے کر کے جلد از جلد دمشق پہنچے کیونکہ امیر المؤمنین بستر مرگ پر لیٹے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ امیر المؤمنین کی زیارت سے محروم رہ جائیں۔

موسیٰ کے لیے یہ صورت نہایت پریشان کن تھی اور وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا، گویا اس کی یہ حالت تھی ؂

اک طرف کعبہ ہے مرا اک طرف ایمان ہے کس کو رکھوں کس کو چھوڑوں کشمکش میں جان ہے

بالآخر موسیٰ نے طارق بن زیاد کے مشورہ سے یا بذات خود یہ فیصلہ کیا کہ ان دونوں میں سے کسی کی بات نہ مانی جائے۔ نہ تو بالقصد عجلت سے سفر کیا جائے جیسا کہ ولید کا پیغام تھا اور نہ عمداً تاخیر کی جائے جیسا کہ سلیمان چاہتا تھا۔ چنانچہ ان دونوں پیاموں کو مسترد کرتے ہوئے موسیٰ نے اپنے قافلے کی وہی رفتار قائم رکھی جس رفتار سے وہ قیروان (افریقہ) سے چلے تھے، تاہم ان کی دلی تمنا اور خواہش تھی کہ وہ اپنے آقائے ولی نعمت امیر المؤمنین ولید بن عبدالملک کی زیارت سے محروم نہ رہ جائیں اور ان کی خدمات کے ثمرات جو کچھ وہ ساتھ لے جا رہے تھے، ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزر سکیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ ولید کی زندگی ہی میں دارالخلافہ دمشق میں داخل ہو گئے۔ ولید کو موسیٰ اور طارق بن زیاد کی آمد کا پتہ چلا تو اس نے بیمار ہونے کے باوجود نہایت تزک و احتشام سے ان کا خیر مقدم کیا۔ شہر کو سجایا گیا۔ دربار میں جشن مسرت کا سامان پیدا کیا گیا اور اندلس کے وہ غنائم جن کے خیرہ کن نظارے سے سلیمان بن عبدالملک اپنے دربار کی رونق بڑھانا چاہتا تھا، وہ سب ولید ہی کے سامنے پیش کیے گئے اور اس نے بستر مرگ پر لیٹے لیٹے اپنی مرضی کے مطابق احکام صادر فرمائے اور جس طور پر تقسیم کرنا چاہتا تھا، ان غنائم کو تقسیم کر دیا۔

زندگی اور موت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ موسیٰ کو کیا پتہ تھا کہ میرے دمشق پہنچنے تک ولید زندہ رہے گا۔ لیکن جب وہ دمشق پہنچا تو ولید زندہ تھا اور اس کا بھائی سلیمان ابھی تخت خلافت پر نہیں بیٹھا تھا، اس لیے اس کے مقدر میں اس بے کراں دولت کی نمائش نہ تھی بلکہ ولید کے مقدر میں تھی۔ روایات میں ہے کہ اندلس

Marfat.com

کی اس ڈھیروں دولت اور مال غنیمت کی دوسری چیزوں کی نمائش دمشق کی جامع مسجد میں کی گئی۔ موسیٰ نے خود اس کی نمائش کا خاص اہتمام فرمایا تھا کیونکہ وہ بھی اپنی خدمات کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور خلیفہ اور عوام سے داد تحسین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ موسیٰ نے قیدیوں میں سے تیس نوجوانوں کو شاہی حلوں سے آراستہ کر کے ان کے سروں پر وہ تاج شاہی رکھے جو اندلس کے بادشاہوں کے مال غنیمت میں حاصل ہوئے تھے۔ اس طرح بربری قبائل کے امراء، جزائر بحر روم کے فرمان رواؤں اور حکمرانوں کے لڑکوں اور دوسرے ممتاز مغربیوں کو مرصع لباسوں سے آراستہ کیا۔ ان لوگوں کو جواہرات، یاقوت، زمرد، زبرجد، موتی، زردوزی کے ملبوسات، مرصع زیورات، زرنگار فرش اور تاریخی مائدہ سلیمانی جس کی مغرب کے چار دانگ میں شہرت تھی اور خود مسلمان بھی اس کی صنعت سے حیران تھے، ان سب چیزوں کو ایک جلوس کی شکل میں ولید بن عبدالملک کے محل کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ پھر موسیٰ اور طارق زرق برق لباسوں میں ملبوس، تاجپوش نوجوانوں کے جلو میں مسجد میں داخل ہوئے۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک فرط مسرت سے اپنی شدید علالت کے باوجود موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور اس کے دوسرے افسروں کے استقبال کے لیے جامع مسجد میں چلا آیا تھا۔ ولید خطبہ کے لیے منبر پر تشریف فرما ہو چکا تھا کہ موسیٰ اپنی جماعت کے ساتھ مسجد میں داخل ہوئے۔ مسجد میں موجود تمام حضرات اس حیرت زا نظارے کو دیکھ کر بحر استعجاب میں ڈوب گئے۔ موسیٰ کی تحسین و آفرین کے ڈونگروں سے مسجد کی فضا گونج اٹھی۔ اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور عظمت کے ترانے گائے جانے لگے جس نے اپنے اور مسلمانوں کے دشمنوں پر فتح عطا فرمائی اور اس بیش قیمت اور بے کراں مال غنیمت سے نوازا۔ موسیٰ خلیفہ کے سامنے آئے اور مؤدبانہ سلام کیا اور وہ تیس نوجوان جو سلاطین وقت کی ہیئت کذائی اور شکل و صورت بنائے ہوئے تھے، خلیفہ ولید کے دائیں بائیں نہایت ادب سے سر جھکائے کھڑے ہو گئے۔ نوجوانوں کے اس شاہی ہیئت کذائی میں کھڑے ہونے کی وجہ سے ایک ایسا دل کش منظر پیدا ہو گیا جو اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ تمام حاضرین مسجد اس منظر سے بہت محظوظ ہوئے کیونکہ یہ دلکش نظارہ مسلمانوں کی عظمت و آن اور جاہ و جلال کی ایک شان بن گیا۔

ولید بن عبدالملک میں بیماری کی وجہ سے اٹھنے کی طاقت نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود اس خوشی اور مسرت کے موقع پر سہارے کے ساتھ وہ منبر پر بیٹھا، حق تعالیٰ شانہ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد اندلس کی اس فتح و کامرانی پر اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت جس کی وجہ سے اس اجنبی ملک میں کم فوج کے باوجود فتح و نصرت نے مسلمانوں کے قدم چومے، اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لایا۔ پھر اس نے خوشی و مسرت کے جوش ہی سے وہ تقریر کی جو اس سے قبل اس کے منہ سے کبھی نہ سنی گئی تھی۔ شاید وہ کوئی الہامی جملے تھے جو اس کے منہ سے نکلے، حالانکہ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علم و فن سے یکسر بیگانہ تھا۔ عبدالملک خود ایک جید عالم اور بہت بڑا محدث وقت تھا۔ اس نے اپنے اس بیٹے کی تعلیم کے لیے بڑی کوشش کی لیکن ولید کی طبیعت علم کی تحصیل کی طرف راغب نہ ہوئی۔ وہ عربی تک غلط بولتا تھا۔ عبدالملک نے اس کے اس نقص کو دور کرنے کی بڑی کوشش کی، اس کے لیے

Marfat.com

خاص معلم رکھے لیکن ''تہی دستان قسمت راچہ سود از راہبر کامل'' والا معاملہ ہوا۔ اس لیے عبدالملک نے معذور سمجھ کر چھوڑ دیا۔ (ابن اثیر: ۵/۴) گو وہ علم سے بیگانہ تھا لیکن جہان بانی اور جہان رانی کے تمام اوصاف اور خوبیاں اس میں بدرجہ کمال پائی جاتی تھیں۔

ولید بن عبدالملک نہایت خوش قسمت خلیفہ تھے کہ ان کے زمانہ میں چار بہادر جرنیلوں نے دنیا کا ایک بہت بڑا علاقہ فتح کرلیا۔ آج اندلس کو فتح کر کے اور ڈھیروں دولت سمیٹ کر اس کے بہادر جرنیل موسیٰ بن نصیر اور بہادر جرنیل طارق بن زیاد اس کے پاس کھڑے تھے اور ولید سخت بیماری کے باوجود جامع مسجد دمشق میں وفور جوش و مسرت سے تقریر کر رہے تھے۔ ان جرنیلوں کے سنہری کارناموں نے اس میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ جوانوں اور صحت مند لوگوں کی طرح تقریر کر رہا تھا اور خطبہ بھی اس نے ایسا دیا کہ اس سے قبل اس نے ایسا خطبہ نہیں دیا تھا۔ جمعہ کا یہ خطبہ اتنا طویل ہو گیا کہ اندیشہ ہو گیا کہ کہیں نماز کا وقت نہ چلا جائے۔ جمعہ کی نماز کے بعد ولید نے موسیٰ کو اپنے سامنے بلا کر بٹھایا اور تین تین مرتبہ شاہانہ خلعت سے سرفراز کیا۔

اب موسیٰ نے غنائم کا انبار جو وہ اندلس سے اپنے ساتھ لائے تھے ولید کے قدموں پر رکھا۔ یہ ایک نہایت حیرت زا اور دلچسپ نظارا تھا جس کو دیکھ کر اہل دمشق اور عمائدین سلطنت محو حیرت ہو گئے۔ زرنگار فرش اور مائدہ سلیمانی کو ادھیڑ کر زر جواہرات جمع کیے گئے۔ مختلف قسموں کا مال جب الگ الگ ہو گیا تو اس کی تقسیم کی باری آئی۔ ولید نے اس مال کا بڑا حصہ بیت اللہ پر وقف کیا۔ پھر جس جس کو جو دینا تھا وہ دیا۔ اس موقع پر بھی ولید نے موسیٰ کی غیر معمولی قدر افزائی کی کہ اس کو پچاس ہزار اشرفیاں بطور انعام دیں اور خلعت فاخرہ سے دوبارہ سرفراز کیا۔ اس کے لڑکوں کے وظیفے مقرر کیے۔ اسی طرح اس کے پانچ سو موالی کے وظائف علیحدہ مقرر کیے۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو اب موسیٰ نے بربر، رومی اور اندلسی قائدین، جرنیلوں اور حکمران خاندانوں کے افراد کو ولید کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ وہ سب لوگ تھے جو موسیٰ کے ساتھ اندلس اور افریقہ سے آئے تھے۔ ولید نے ان کے مراتب کے لحاظ سے ان کی قدر و منزلت کی، خلعتوں سے نوازا، تحائف اور انعامات دیے اور ان کے مستقل وظائف جاری کر دیے۔ گویا جتنی ان کی قدر افزائی ہو سکتی تھی وہ کی گئی۔ ان مراسم کے بعد یہ مجلس اپنے اختتام کو پہنچی۔ یہ مجلس گویا موسیٰ بن نصیر اور اس کے جرنیلوں اور ساتھیوں کی قدر افزائی کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ کسی سلطان وقت کے دربار میں کسی بڑے سے بڑے رکن سلطنت کی جو بڑی سے بڑی قدر افزائی ہو سکتی تھی وہ اس مجلس میں موسیٰ بن نصیر اور ان کے جرنیلوں طارق بن زیاد وغیرہ اور اس کے ساتھ آئے ہوئے قبائل کے سرداروں وغیرہ کی کی گئی۔ یہ قدر افزائی دراصل موسیٰ بن نصیر کی تھی اس کے جرنیلوں اور ساتھیوں کی قدر افزائی تو اسی کی وجہ سے تھی۔ ان مراسم کے اختتام کے بعد موسیٰ اور اس کے ساتھی نہایت خوش تھے اور اس مجلس کے ختم ہونے کے بعد ولید پھر بستر پر لیٹ گیا۔

Marfat.com

مسلمہ بن عبدالملک کی فتوحات:

قسطنطنیہ کی حکومت مسلمانوں کی سب سے بڑی حریف تھی خصوصاً شام کی مغربی سرحد جہاں جزیرۂ کروستان، ارمنستان اور ایشیائے کوچک کی سرحدیں ملتی تھیں۔ دونوں کا نہایت اہم محاذ تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں اس کی حفاظت کا بڑا اہتمام کیا تھا لیکن بعد میں اندرونی اختلافات اور انقلابات کے باعث یہ انتظام قائم نہ رہ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبدالملک کے زمانہ میں قیصر نے مصیصہ پر حملہ کر دیا اور عبدالملک کو روپیہ دے کر اس سے صلح کرنا پڑی، اس لیے ولید نے اپنے عہد خلافت میں پھر یہاں مستقل مورچہ قائم کر کے اپنے بھائی مسلمہ اور لڑکے عباس بن ولید کو اس کی حفاظت پر متعین کیا۔ انہوں نے اس علاقہ کے بہت سے مقامات پر جو جنگی نقطۂ نظر سے نہایت اہم تھے، فتح کیے۔ سنہ ۸۷ھ میں مسلمہ نے مصیصہ کے علاقہ میں حصن بولق، حصن اخرم اور حصن بولس فتح کیے۔ (ابن خلدون: ۲/۷۰) پھر سنہ ۸۸ھ میں مسلمہ اور عباس بن ولید نے جزیرہ کے راستہ سے فوج کشی کی اور طوانہ کے قریب رومیوں کا مقابلہ کیا۔ پہلے معرکہ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی لیکن پھر عباس کی ہمت و جرأت اور ثبات قدمی نے رومیوں کو پسپا کر دیا، اور وہ طوانہ میں قلعہ بند ہو گئے۔ عباس بن ولید نے محاصرہ کر کے طوانہ کو فتح کر لیا۔

سنہ ۸۹ھ میں مسلمہ نے حصن عموریہ اور نواح آذربائیجان کے بعض شہر اور عباس نے دو یعہ فتح کیے۔ سنہ ۹۰ھ میں مسلمہ نے سوریہ کے پانچ قلعے فتح کیے اور عباس ارمنی علاقہ میں اردن تک بڑھتے چلے گئے اور باب کے کئی مقام فتح کیے۔ سنہ ۹۳ھ میں عباس نے طرسوس اور سنہ ۹۴ھ میں انطاکیہ فتح کیا۔ یہ دونوں مقام شام کی سرحد کے اہم مورچے تھے۔ طرسوس ایشیائے کوچک کی سمت بحر روم کے ساحل پر ہے۔ سنہ ۹۵ھ میں مسلمہ نے ایک اور قلعہ فتح کیا۔

بحر روم کے ساحل پر خصوصاً شمالی افریقہ میں مسلمانوں کے اتنے مقبوضات تھے کہ بحری استحکام کے بغیر ان کی حفاظت نہایت مشکل تھی۔ شمالی افریقہ کے بربریوں کی اکثر بغاوت میں بحر روم کے ان جزائر کے باشندوں کا بھی ہاتھ ہوتا تھا، اس وجہ سے ولید کے زمانہ میں حکومت کی ادھر توجہ ہوئی اور سنہ ۸۸ھ میں جزیرہ میورقہ اور منورقہ فتح ہوئے۔ (دول الاسلام ذہبی: ۱/۴۵)

اندلس کی فوج کشی کے سلسلہ میں سنہ ۹۲ھ میں موسیٰ بن نصیر نے ایک فوج جزیرہ سروانیہ بھیجی۔ یہ جزیرہ صقلیہ کے بعد بحر روم کے تمام جزائر میں نہایت سرسبز و شاداب، زرخیز، دولت مند اور رقبہ میں بہت وسیع تھا۔ اندلس جیسے وسیع و عریض ملک کا انجام دیکھنے کے بعد یہاں کے باشندوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے کو بے بس اور بے ہمت سمجھتے ہوئے مسلمانوں سے مقابلہ کی ضرورت محسوس نہ کی اور بغیر کسی مزاحمت کے ان کو جزیرہ پر قبضہ کرنے دیا۔ البتہ اپنی کل دولت سمیٹ کر محفوظ کر دی۔ طلائی اور نقرئی سامانوں کو جمع کر کے بندرگاہ

Marfat.com

کے پایاب حصہ میں ڈبو دیا اور نقدی کو ایک بڑے کلیسا کی دوہری چھت کے درمیان چھپا دیا۔ اتفاق سے ایک مسلمان اس بندرگاہ میں نہا رہا تھا۔ نہاتے ہوئے اس کے پاؤں میں کوئی چیز لگی۔ اس نے اسے نکال کر دیکھا تو وہ چاندی کا برتن تھا۔ اب اس میں جستجو پیدا ہوئی کہ یہ برتن کہاں سے آیا۔ چنانچہ اس نے تلاش شروع کر دی تو سارا سامان نکل آیا۔ اسی طریقہ سے کلیسا کی نقد دولت کا بھی اتفاق سے پتہ چل گیا۔ یہ تمام دولت لے کر مسلمان واپس آ گئے۔ اسی زمانہ میں بحرہ روم کے سب سے بڑے جزیرہ سسلی پر حملہ ہوا۔ (المونس: ص ۳۲)

ان فتوحات کے علاوہ شمالی افریقہ وغیرہ میں بھی کئی فتوحات حاصل ہوئیں۔ لیکن وہ چنداں لائق ذکر نہیں ہیں۔

ایک کامیاب حکمران کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے ملک کی خارجہ پالیسی کے ساتھ ساتھ داخلہ پالیسی بھی صحیح اور درست ہو اور ملک میں امن و آشتی کا دور دورہ ہو۔ ولید کے زمانہ میں ملک میں کوئی خلفشار اور انتشار نہیں تھا بلکہ پورے ملک میں کامل امن و امان کا دور دورہ تھا۔ ایک آدھ بار خوارج ضرور اٹھے لیکن پھر معمولی سرزنش کے بعد خاموش ہو گئے۔

حجاج بن یوسف کی وفات:

شوال سنہ ۸۵ھ میں حجاج بن یوسف ثقفی کا انتقال ہو گیا۔ وہ اموی حکومت کا ایک بہت بڑا ستون اور قوت بازو تھا۔ اس کے دوبارہ قیام اور استحکام میں حجاج کی کوششوں کو بڑا دخل ہے اور اسی نے تمام مخالف قوتوں کا خاتمہ اور عراق کو جو بنو امیہ کی مخالفت میں سب سے آگے تھا، قابو میں کیا۔

تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے سخت گیر ہاتھوں نے بنو امیہ کے ایوان عظمت کی تعمیر میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ بیس سال تک بصرہ و کوفہ اور ان سے متعلقہ ممالک کا وائسرائے رہا۔ اس نے اپنے دور حکومت میں عراق کو جو بنو امیہ کے مخالفین کا مرکز تھا، شورش پسندوں کی فتنہ پردازیوں سے پاک و صاف کر دیا۔

عراقیوں پر حجاج کی سختی کو عذاب الٰہی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بددعا کا اثر سمجھنا چاہیے جو اہل عراق کی تاریخی بداعمالیوں کی بدولت ان پر نازل ہوا۔ سیدنا حسن بصری نے فرمایا: ''میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو جامع مسجد کے منبر پر یہ دعا مانگتے سنا:

> ''اے اللہ! میں نے ان لوگوں کو راز دار بنایا مگر انھوں نے میرے ساتھ خیانت کی۔ میں نے ان لوگوں کی خیر خواہی کی مگر انھوں نے مجھے دھوکہ دیا۔ اے اللہ! ان پر بنو ثقیف کے کسی غلام کو مسلط کر دے جو ان کے مالوں اور جانوں کا فیصلہ جاہلیت کے طرز پر کرے۔''

سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''واللہ! سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس سختی کرنے والے کی جو صفات

Marfat.com

بیان کی تھیں وہ سب حجاج میں موجود ہیں۔'' (ابن اثیر:۲۲۳/۴)

صاحب روضۃ الصفا نے لکھا ہے کہ جب کوفیوں کے بارے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ دعا مانگی تھی اسی رات حجاج بن یوسف ثقفی پیدا ہوا ''واز دبہ کوفیاں رسید آنچہ رسید'' اور اس سے کوفیوں کو وہ اذیت پہنچی جو کہ پہنچی۔

حجاج اگرچہ بڑا منتقم تھا لیکن اس میں بعض اچھی صفات بھی تھیں۔ وہ بڑا فصیح و بلیغ مقرر تھا۔ اس کی بعض تقریریں عربی بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ قرآن حکیم کا ایک بہت اچھا قاری تھا۔ قرآن حکیم پر سب سے پہلے اسی نے عراب لگوائے تا کہ غیر عربی لوگوں کے لیے اس کا پڑھنا آسان ہو۔

(فہرست لابن ندیم: ص ۶۱، ابن خلکان تذکرہ حجاج بن یوسف)

سندھ کی فتح بھی اس کی یادگار ہے۔ اگرچہ اس کا فاتح اس کا چچیرا بھائی محمد بن قاسم ہے لیکن اول تو حجاج ہی نے اسے اس مہم پر بھیجا تھا اور پھر آخر وقت تک اس کی نگرانی اور ہر قسم کی مدد کرتا رہا اور اسے مشورے وغیرہ بھی دیتا رہا، جو اس کے لیے بڑے مفید اور سندھ کی فتح میں بڑے معاون اور کارآمد ثابت ہوئے، اس لیے سندھ کی فتح درحقیقت اسی کی توجہ کا نتیجہ تھا۔

ولید کا انتقال:

موسیٰ بن نصیر کو دمشق آئے ہوئے ابھی چالیس روز ہی گزرے تھے اور موسیٰ کو خلعت فاخرہ اور انعام ملے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ اس کے محسن اور ولی نعمت ولید بن عبدالملک کے انتقال کا سانحہ پیش آیا۔ جمادی الآخرہ سنہ ۹۶ھ کو ولید کا انتقال ہوا اور اسی سال حجاج بن یوسف کا بھی انتقال ہو گیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور باب صغیر دمشق کے باہر اسے دفن کیا گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۴۲۔۴۶ سال تھی۔ (باختلاف روایات) اور مدت خلافت نو سال اور چند ماہ تھی۔

اولاد:

وفات کے وقت ولید نے انیس (۱۹) اولاد نرینہ چھوڑیں۔ بعض کے نام یہ ہیں:

سلیمان O محمد O عباس O عمر O بشر O روح O خالد O تمام O مبشر O حرب O یزید O عبدالرحمٰن O ابراہیم O یحییٰ O ابوعبیدہ O مسرور اور صدقہ۔

Marfat.com

ولیدی عہد پر تبصرہ

ولید بن عبدالملک کا عہد بنو امیہ کا ایک سنہری عہد تھا جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے عہد میں مسلمہ بن عبدالملک، محمد بن قاسم، قتیبہ بن مسلم، طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر نے سلطنت کی پہنائیوں میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اس کے عہد پر بعض مؤرخین نے بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔ ہم ان میں سے ایک مؤرخ کا تبصرہ یہاں نقل کر رہے ہیں جس سے اس کے عہد پر کافی حد تک روشنی پڑتی ہے۔

ولید کا دور فتوحات کی کثرت، دولت کی فروانی، امن و رفاہیت کی ارزانی اور دوسری ملکی اور تمدنی ترقیوں کے لحاظ سے بنی امیہ کا عہد زریں ہے۔

فتوحات پر تبصرہ:

لیکن کسی ملک کا فتح کر لینا نہ انسانیت کی کوئی خدمت ہے، نہ تمدن کی، بلکہ آج کل کے نقطۂ نظر سے اس کو سلب آزادی سے تعبیر کیا جائے گا۔

ولیدی دور کی فتوحات کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے زمانہ میں جو جو ملک فتح ہوئے ان کی کایا پلٹ گئی، اور وہ دفعتہً پستی کی حالت سے ابھر کر بلند سطح پر آ گئے، اس کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ اندلس کی فتح ہے۔

ایک یورپین مؤرخ کی زبان سے مسلمانوں کے داخلہ سے پہلے اندلس کی پستی اور تاریکی کا یہ حال تھا:

اسپین کی عام حالت:

اواخر صدی ہفتم اور اوائل صدی ہشتم کی تاریخ اسپین غیر معمولی طور پر ظلمات کے دھندلکے میں پھنسی ہوئی تھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں سیاسی اور تمدنی مصائب بھرے پڑے ہوئے تھے۔

(اخبار الاندلس، ایس پی اسکاٹ: ۲۰۳/۱، ترجمہ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب)

Marfat.com

حکومت کی حالت:

آٹھویں صدی کے شروع میں سلطنت ویز گاتھ بظاہر زوروں پر تھی اور نہایت مرفہ الحال مگر اس کی اصلی اور واقعی کمزوری اہالی کلیسا کی شان وشوکت اور دربار شاہی کے تکلفات اور رعب میں چھپی ہوئی تھی جنھوں، نے اس سلطنت کے معائب اور زیادتیوں پر بے بود سا نقاب ڈال رکھا تھا، خواہشات نفسانی کے غلام بادشاہان ویز گاتھ میں سے اپنے اجداد کی خوبیاں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ ریکارڈ اور ویمیا کے جانشین ایسے کمزور مگر ظالم تھے کہ ان پر لفظ بادشاہ کا اطلاق متنازع فیہ امر ہے، ان کی نفسانیت نے نہ رسوم مہمان نوازی کو قائم رکھا، نہ حقوق دوستی کو ملحوظ، نہ اپنے رتبہ کو برقرار رکھ سکے، نہ اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے میں سن وسال کی پروا کی۔ (اخبار الاندلس ایس پی اسکاٹ: ۱/۲۰۶، ترجمہ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب)

دربار شاہی میں تعیش کا دور:

تمام دربار شاہی ایک ہی حمام میں تھے، عیش ونشاط وشہوت رانی کا زور تھا، کلیسا کی نہایت مقدس روایات کی خلاف ورزی تو ہوتی ہی تھی، غضب تو یہ ہے کہ تعدد ازدواج اور کنیزوں کا رکھنا بھی جائز قرار دیا گیا تھا۔ دیندار لوگ ان عیش کے بندوں کی زیادتیوں سے تنگ آ گئے تھے، نہ ان خراباتیوں سے گرجاؤں کی قربان گاہیں محفوظ تھیں، نہ اقبال گناہ کے منبر۔ (اخبار الاندلس ایس پی اسکاٹ، ترجمہ: مولوی خلیل الرحمٰن صاحب: ص ۲۰۸)

مذہبی پیشواؤں کی حالت:

بادشاہ کو منہمک منہیات دیکھ کر چھوٹے بڑے تمام پادری انہی خرابیوں میں پڑے ہوئے تھے، اسقف کے محل میں ہر روز فساد وعناد کے تماشے نظر آتے تھے، اور ہر رات کو شور وشغب کی آوازیں وہاں سے بلند ہوتی تھیں، عوام الناس پہلے ہی کہاں کے معصوم تھے، اس کیفیت کو دیکھ کر اور بھی خراب ہوتے چلے جاتے تھے، پادریوں اور مقتدایان مذہبی کے گھروں کی شرابیں ضرب المثل تھیں، ان کے مکان نہ تھے پری خانے تھے، اگر حسن وجمال کہیں ملتا تھا تو یہیں۔ پادریوں کا اصلی فرض تو یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک رحم مجسم ہستی کے نائب ہو کر فیاض اور ایثار نفسی دکھائیں، مگر وہ اتنے گرے ہوئے تھے کہ سازش کنندہ اور معاملاتِ سیاست میں دخل دینے والا فرقہ بن گئے تھے، امراء وارکین سلطنت نے مردہ بدست زندہ بن کر اپنے آپ کو ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا، اور تمام نظم ونسق سلطنت ان کے سپرد کر دیا تھا، اور خود بطریق مداہنت عابدوں کا نمود بن گئے تھے، اگر ان کی خانگی زندگی کو دیکھا جاتا تو کیا پادری اور کیا امراء عیوب اور گناہوں کے ڈھیر تھے۔

(اخبار الاندلس ایس، پی اسکاٹ، ترجمہ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب: ۱/۱۹۸)

Marfat.com

کسانوں، مزدوروں، غلاموں، رعایا کے دوسرے طبقوں کی حالت:

مزارعین کی حالت بالکل چوب مسجد کی سی تھی، وہ تمام عمر بلکہ اولاد در اولاد ایک ہی جاگیردار کے ہو رہتے تھے، اور کہیں اور نہ منتقل ہو سکتے تھے، ان کی حالت بالکل غلاموں کی سی ہوتی تھی، گو ازروئے قانون گاتھ ان کو ان بدقسمتوں سے بہتر ہونا چاہیے تھا، جو بازاروں میں عام جانوروں کی طرح فروخت ہو سکتے تھے۔ آخر زمانۂ گاتھ میں جو قانون وضع ہوئے تھے، ان کے موافق غلاموں کی حالت اس سے بھی بدتر ہوگئی تھی جو رومیوں کے زمانہ میں تھی۔ آخر کے گاتھ بادشاہوں نے کچھ نرمی کر دی تھی، لیکن بہرکیف یہ خدمت جبریہ تھی، اور نسلاً بعد نسل اس سے رہائی نہ ہو سکتی تھی، اس سے لوگوں کی حالت اور بھی نازک ہوتی چلی جاتی تھی، شادی بیاہ کے متعلق قیود تھیں، اہل و عیال کو الگ رکھنا پڑتا تھا، چھوٹے چھوٹے جرائم پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں، ان اسباب سے ان کی ذلتیں اور بڑھتی جاتی تھیں۔ (ایضاً: ص ۱۹۹)

پادریوں کی جاگیروں پر ہزاروں غلام تعینات تھے، نہ صرف اس لیے کہ زراعت کریں بلکہ اس واسطے کہ بہترین اشیاء پیدا کریں جو اس زمانہ میں مل سکتی تھیں، اور وہی ان جاگیروں کے تکلفات کو بڑھا سکتی تھیں، ان بدقسمت مزدوروں کی مشقت روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی، اور آزادی کی امیدیں جس کا وہ نسلوں سے انتظار کرتے چلے آتے تھے گھٹتی جاتی تھیں، بلکہ اب تو بالکل ہی نہ رہ گئی تھیں، اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ جو ناقابل برداشت بوجھ ان پر ڈالا جا چکا ہے وہ قیامت تک ہلکا ہونے والا نہیں۔ (اخبار الاندلس: ۱/۲۰۱)

غلاموں کا ایک جم غفیر تھا کہ باوجود اپنے آقاؤں کے چابکوں کے ابھی تک زمانۂ آزادی کی روایات کو نہیں بھولے تھے، اور ایک ذرا سی تحریک پر بلوہ کرنے کو تیار تھے، اور اس دن کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے جس دن ان کو آزادی کامل حاصل ہو جائے۔ (ایضاً: ص ۲۱۲)

یہودیوں کی حالت:

مزارعین اور غلاموں کے علاوہ ایک فرقہ تھا جس کی تعداد دونوں سے کم تھی، لیکن ازروئے اصل و نسل و ازروئے قانون وہ دوامی غلام تھے، اتنی بات ان میں زیادہ تھی کہ وہ دونوں سے زیادہ عقیل و فہیم اور ہوشیاری و چالاکی میں دونوں سے بڑھے ہوئے تھے، یہ فرقہ یہودیوں کا تھا، سترہویں دینی کونسل کے ایک حکم ناطق کے موافق ان کی تمام جائدادیں ضبط کر لی گئی تھیں، اور ان کو بامشقت غلامی کی سزا دی گئی تھی، یہودی دونوں فریق (امراء و مذہبی پیشوا) کے ہاتھ سے تنگ تھے، کون سی سختی و تشدد تھا کہ ان پر نہ کیا جاتا ہو، وہ ہر وقت پریشانی بلکہ مصیبت میں گرفتار رہتے تھے۔ (ایضاً: ص ۲۱۲)

مسلمانوں کے داخلہ کے قبل اُندلس کا یہ نقشہ تھا، ان کے داخلہ کے بعد دفعۃً حالت بدل گئی چنانچہ یہی مؤرخ لکھتا ہے:

Marfat.com

''فاتحین (مسلمانوں) نے اپنے پرانے زمانہ کے قوانین کا احترام قائم رکھا، صرف فرق اتنا ہوا کہ اس کے دستور العمل اپنے قوانین کے تابع کر دیے، مفتوحین پر وہی قانون قابل نفاذ تھا، مگر اسی حد تک کہ شرع اسلام کے خلاف نہ پڑے، اپنے عدل وانصاف، مسامحت ومراحم خسروانہ سے اس نئی سلطنت نے بہت ہی جلد دلوں کو گھیر لیا، یہودی مرفہ الحال ہو گئے۔ عیسائی اپنے تعصبات مذہبی بھول گئے، غلاموں نے وہ کلمہ پڑھ لیا جس سے ان کا داغ غلامی ہمیشہ کے لیے مٹ گیا، اور وہ بادشاہوں کے مساوی ہو گئے (اخبار الاندلس: ۲۵۸/۱) ذمیوں کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کا ایفا کیا گیا، ذات، جائداد اور مذہبی آزادی کا جو عہد کیا گیا تھا وہ بہر حال پورا کیا گیا۔ عوام الناس تو اس سے بہت ہی خوش ہو رہے تھے، اگر ناراض تھے تو وہ مذہبی دیوانے جنھوں نے ایسے فیاض اور سخاوت شعار دشمنوں کو گالیاں دیں، حالانکہ ان کی مراعات سے وہ فائدہ اٹھاتے تھے، اور انہی کا نمک کھاتے تھے۔'' (تمدن عرب لیبان: ص ۲۴۷)

لیبان نے مسلمانوں کے داخلہ سے پہلے اسپین کی حالت کا یہ نقشہ کھینچا ہے:

''عربوں کی فوج کشی کے زمانہ میں گاتھ اور اطالیہ کی اقوام کا باہمی میل جول امراء ہی میں ہوا تھا اور عامۂ خلائق غلامی کی حالت میں تھی۔'' (ایضاً)

اسپین میں تمدنی تفرقیں، اندرونی نا اتفاقیاں، فوجی جوش کا نہ ہونا، رعایا کی بے توجہی، ان کا بندۂ زراعت ہونا، یہ حالت تھی گاتھوں کی سلطنت کی جس وقت عرب ملک میں پہنچے ہیں، آپس کی نا اتفاقی اور رقابت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ دو بڑے امراء اندلس یعنی کاونٹ جولین اور اشبیلیہ کا رئیس الاساقفہ عربوں کی فوج کشی میں معاون تھے۔

عربوں کے داخلہ کے بعد ہی یہ نقشہ ہو گیا:

''فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد ہی عربوں نے ترقی شروع کر دی، ایک صدی کے اندر اندر غیر مزروعہ زمینیں کاشت ہونے لگیں، اجاڑ بستیاں آباد ہو گئیں، بڑی بڑی عمارتیں بن گئیں، اور دوسری اقوام سے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے، اس کے بعد ہی عربوں نے علوم وادب کی طرف توجہ کی اور یونانی اور لاطینی کتابوں کے ترجمے کرائے اور دار العلوم قائم کیے، جو مدت تک یورپ میں علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔'' (تمدن عرب لیبان: ص ۲۴۷)

مسلمانوں نے اندلس کو تہذیب وترقی کی جس معراج کمال تک پہنچایا اس سے تاریخیں معمور ہیں یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ بنی امیہ ہی نے اسے فتح کیا، اور انہی نے اسے کمال اوج تک پہنچایا۔

اس دور کے اور مفتوحہ ممالک کی ترقی کا بھی یہی حال تھا، محمد بن قاسم نے سندھ میں جو نظام قائم کیا تھا اس کے جستہ جستہ حالات چچ نامہ وغیرہ میں ملتے ہیں لیکن ان سب کی تفصیل بہت طویل ہے۔

Marfat.com

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ ولید کا دور تمدنی ترقیوں کے اعتبار سے بھی بنی امیہ کا ممتاز ترین دور ہے، آئندہ سطور میں اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے، اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مسلمانوں کی جو قوت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو رہی تھی، وہ ایک مقصد پر متحد ہو گئی، اس سے کم از کم ولید کے زمانہ میں خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا، جس سے ملک کو بڑا فائدہ پہنچا، اسلامی حکومت کا رقبہ ہندوستان اور چین سے لے کر فرانس کی سرحد تک وسیع ہو گیا، اور مفتوحہ ملکوں سے جو دولت ہاتھ آئی اس سے ملک کی تمدنی ترقی میں بڑا اضافہ ہوا۔

فوجی نظام میں وسعت و ترقی:

فوجی نظام میں بڑی وسعت و ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک وقت میں کئی کئی محاذوں، ہندوستان، وسط ایشیا اور یورپ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی، اور سب میں کامیابی ہوئی، فوج کی جزوی ضروریات کی فراہمی کا اتنا اہتمام تھا کہ سندھ کی فوج کشی میں حجاج نے سوئی دھاگہ تک ساتھ کر دیا تھا، خورد و نوش کے سامان کا اتنا مکمل انتظام تھا کہ روئی سرکہ میں بھگو کر خشک کر کے ساتھ کر دی تھی، کہ ضرورت کے وقت پانی میں بھگو کر سرکہ تیار کر لیا جائے۔ (فتوح البلدان بلاذری: ص ۴۴۲)

جہاز سازی کے کارخانے:

جہاز سازی کے کارخانے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کے زمانہ سے قائم ہو گئے تھے، ولید کے زمانہ میں جب بحری قوت میں اور اضافہ ہوا تو نئے کارخانے کھولے گئے، چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے تونس میں ایک کارخانہ قائم کیا جس میں صرف اس کے زمانہ میں سو جہاز تیار ہوئے تھے۔ (کتاب المونس: ص ۳۳)

رفاہ عام کے کام:

حکومت کے شعبوں میں ترقی کے علاوہ رفاہ عام کے اتنے کام ہوئے اور رعایا کی راحت و آسائش کے اتنے سامان مہیا کیے گئے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ کے علاوہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ بلکہ ولید کے بعض کارنامے اس دور سے بھی بڑھ گئے۔

سڑکوں کی تعمیر:

تخت نشینی کے تیسرے سال یعنی سنہ ۸۸ھ میں تمام ممالک محروسہ میں سڑکیں درست کرائیں اور ان پر میل نصب کرائے۔ (طبری: ص ۱۹۵ و کتاب العیون والحدائق: ص ۳)

Marfat.com

نہروں اور کنوؤں کی تعمیر:

تمام راستوں پر کنویں بنوائے اور نہریں جاری کرائیں۔

مہمان خانے:

مسافروں کی سہولت کے لیے جا بجا مہمان خانے قائم کیے۔

شفاخانے:

ولید سے پہلے اسلامی حکومت میں مختلف قسم کی ترقیاں ہوئی تھیں، لیکن اب تک حفظان صحت اور شفاخانوں کا کوئی انتظام نہ تھا، ولید نے سارے ممالک محروسہ میں شفاخانے قائم کیے۔ (یعقوبی: ۲/۳۴۸)

معذوروں کی کفالت کا انتظام:

یہ ولید کا قابل فخر کارنامہ ہے کہ اس نے تمام ممالک محروسہ کے معذور، ناکارہ اور اپاہج لوگوں کے روزینے مقرر کر کے انھیں بھیک مانگنے کی ممانعت کر دی، اندھوں کی رہنمائی اور اپاہجوں کی خدمت کے لیے آدمی مقرر کیے۔ (تاریخ الخلفاء: ص ۲۲۴ و طبری: ۸/۱۲۷)

یہ وہ کارنامہ ہے جس سے آج کی تمدنی حکومتیں بھی عاجز ہیں۔

یتیموں کی پرورش و پرداخت:

یتیموں کی کفالت اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ (تاریخ الخلفاء: ص ۲۲۴)

بازار کے نرخ کی نگرانی:

اشیاء کے نرخ کی نگرانی بھی رعایا کی بڑی خدمت ہے، ولید خود بازاروں میں جا کر چیزوں کی قیمت دریافت کر کے ان کو کم کراتا تھا۔ (طبری: ۸/۱۲۷)

روزہ داروں کے لیے کھانا:

رمضان میں تمام مسجدوں میں روزہ داروں کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔

(کتاب العیون والحدائق: ص ۱۷)

Marfat.com

علمی و تعلیمی خدمات:

اس دور میں مسلمانوں کی تعلیم و تعلم کا مرکز مذہب ہی تھا، اور اس کی بنیاد کلام الٰہی پر تھی، اس لیے ان کی تعلیم و تعلم کا دائرہ اسی تک محدود تھا۔

قرآن کی تعلیم کی جانب ولید کی بڑی توجہ تھی، وہ ہمیشہ لوگوں کو اس کی ترغیب دیتا رہتا تھا، حفظ قرآن پر عطیے دیتا تھا، اور جو لوگ اس سے غفلت کرتے تھے انھیں سزا دیتا تھا۔ (طبری: ۸۲۷/۸)

حجاج نے اہل عجم کی تعلیمی سہولت کے لیے کلام اللہ پر نقطے اور اعراب لگوائے۔ (فہرست ابن ندیم) ولید نے یکسوئی کے ساتھ علم کی خدمت اور تعلیم و تعلم میں سہولت کے لیے علماء و فقہاء کے وظائف مقرر کیے۔

(تاریخ الخلفاء: ص۲۲۴)

تعمیرات:

ولید کو تعمیرات کا بڑا ذوق و شوق تھا، اس نے بہت سی عظیم الشان عمارتیں بنوائیں "کان شدید التکلف بالعمارات والابنیة والاتخاذ المصانع والضیاع" (آداب السلطانیہ: ص۱۱۴) ولید کے ذوق تعمیر اور اس کے عہد کی تعمیرات کی وجہ سے یہ مذاق اتنا عام ہو گیا تھا کہ جب لوگ آپس میں ملتے تھے، تو عمارات ہی پر گفتگو ہوتی تھی۔ (طبری: ۱۲۷۳/۸)

مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر:

یوں تو ولید نے بکثرت عمارتیں بنوائیں، لیکن اس کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ مسجد نبوی اور جامع دمشق کی تعمیر اور اس کی تزئین و آرائش ہے، ان دونوں مسجدوں کو اس نے بڑے حوصلے سے تعمیر کرایا، اور ان کی تعمیر پر بے دریغ دولت صرف کی، اور ان کی آرائش میں اس زمانہ کی تمام صناعیاں ختم کر دیں۔

سنہ ۸۸ھ میں اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو جو اس زمانہ میں مدینہ کے گورنر تھے لکھا کہ مسجد نبوی ﷺ کی پرانی عمارت کو گرا کر از سر نو تعمیر کیا جائے اور مسجد سے متصل امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے جو حجرے اور دوسرے مکانات ہیں انھیں خرید کر مسجد کی عمارت میں شامل کر لیا جائے۔ جو لوگ مکان بیچنے میں تامل کریں ان سے زبردستی لے کر ان کی قیمت ادا کر دی جائے۔ جو قیمت نہ لے اس کی قیمت خیرات کر دی جائے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی پوری تعمیل کی، طبری کا بیان ہے کہ اس کار خیر میں کسی کو تامل نہیں ہوا، سب نے قیمت لے کر مکانات دے دیے۔ "فاجاب القوم الی الثمن فاعطاھم ایاہ"

(طبری: ۱۳۱۳/۸ و خلاصۃ الوفا)

Marfat.com

لیکن بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مکانات کے لینے میں جبر سے کام لینا پڑا۔

مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر کے ارادے کے ساتھ ہی ولید نے قیصر روم کو لکھا کہ ہم اپنے نبی ﷺ کی مسجد بنوانا چاہتے ہیں، تم سے جو سامان ہو سکے بھیجو، اس خط پر اس نے ایک لاکھ مثقال سونا، چالیس گٹھے مبنت کاری کا سامان اور بہت سے کاریگر بھیجے، اس کے علاوہ مدائن سے نقش و نگار کا سامان منگایا گیا۔

(خلاصۃ الوفا: ص ۱۳۹)

تعمیر کا سامان مہیا ہونے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے قاسم بن محمد بن ابی بکر، سالم بن عبداللہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، عبیداللہ بن عبداللہ، خارجہ بن زید اور عبداللہ بن عبداللہ بن عمر وغیرہ علمائے مدینہ کی موجودگی میں پرانی عمارت گرا کر ان بزرگوں کے ہاتھوں سے نئی عمارت کی داغ بیل ڈلوائی۔ (طبری: ۱۲۷/۸) اور بڑے اہتمام اور ذوق وشوق سے تعمیر کا کام شروع کرایا، ایک ایک جھاڑ کے نقش پر کاریگر کو مزدوری کے علاوہ ۳۰ درہم انعام دیتے تھے۔ (خلاصۃ الوفا: ص ۱۳۹) صرف قبلہ رخ کی دیوار اور اس کے طلائی کام پر پینتالیس ہزار اشرفی صرف آیا تھا۔ (ایضاً: ص ۱۳۹۔۱۴۰) اس سے پوری عمارت کے مصارف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پوری عمارت پتھر کی تھی، تمام در و دیوار اور چھت پر طلائی کام اور اعلیٰ درجہ کی مینار کاری تھی، مسجد سے متعلق ایک فوارہ بھی تعمیر کیا گیا تھا، تین سال میں عمارت بن کر تیار ہوئی، سنہ ۹۱ھ میں ولید خود اس کے ملاحظہ کے لیے مدینہ گیا، اور عمارت دیکھ کر خوشنودی ظاہر کی، فوارہ بہت پسند کیا، اس کی نگرانی کے لیے خدام مقرر کیے، اور اہل مسجد کو اس کا پانی استعمال کرنے کا حکم دیا۔ (ابن اثیر: ۲۰۴/۴) اور اس تعمیر کی خوشی میں اہل مدینہ میں نقد روپیہ اور طلائی اور نقرئی ظروف تقسیم کیے۔ (کتاب العیون والحدائق: ص ۱۱)

جامع دمشق کی تعمیر:

دوسری اہم تعمیر جامع اموی یا جامع دمشق ہے، اس کی تعمیر نہ صرف ولید کا بلکہ اس دور کا عظیم الشان تعمیری کارنامہ ہے، اس کی تعمیر میں بے دریغ دولت صرف ہوئی، مؤرخین کا بیان ہے کہ ملک شام کا پورا سات برس کا خراج صرف ہوا تھا (احسن التقاسیم بشاری: ص ۱۵۸) نقد کے حساب سے چھپن لاکھ اشرفی اس کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ (سالک الابصار: ۱۸۰/۱)

اس کی تعمیر کے لیے ہندوستان، فارس، مغرب اور روم وغیرہ مختلف ملکوں سے کاریگر اور تعمیر کا سامان منگایا گیا تھا، صرف جزیرۂ قبرص سے اٹھارہ جہازوں پر سونا اور چاندی آیا تھا، قیصر روم نے علیحدہ منبت کاری کا سامان بھیجا تھا۔ (احسن التقاسیم: ص ۱۵۸)

سنگ مرمر اور سنگ سماق وغیرہ جن جن مقاموں کا مشہور تھا، وہاں سے منگایا گیا تھا، یہ سامان اتنا قیمتی تھا کہ پتھر کے بعض بعض ستونوں کی قیمت کئی کئی سو اشرفی تھی۔ (مسالک الابصار: ۱۸۸/۱)

Marfat.com

بارہ ہزار مزدور کام کرتے تھے، اور پورے آٹھ یا نو سال میں عمارت بن کر تیار ہوئی۔

(ایضاً و کتاب البلدان: ص ۱۰۷)

یہ اتنی وسیع تھی کہ بیک وقت بیس ہزار آدمی سما سکتے تھے، پوری عمارت سنگ مرمر کی تھی جس میں مختلف رنگ کے پتھروں سے بوقلمونی پیدا کی گئی تھی، درو دیوار پر طلائی اور لاجوردی کام اور مختلف رنگوں کی منبت کاری تھی، نقش و نگار اور طغرے صنعتی نزاکت و نفاست کا بہترین نمونہ تھے، محرابوں میں تناسب کے ساتھ بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے، چھت منقش ساج کی تھی اوپر سے سیسہ کی چادر چڑھی ہوئی تھی۔

(مسالک الابصار اصطخری: ص ۶۰ و کتاب البلدان: ص ۱۰۸)

خارجی تزئین و آرائش کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ صرف چھ سو قندیلیں سونے کی زنجیروں میں آویزاں تھیں۔ (کتاب البلدان: ص ۱۰۷)

غرض یہ عمارت عظمت و شان اور آرائش و زیبائش ہر لحاظ سے اس دور کے عجائبات میں تھی، اور دنیا کی بڑی عمارتوں میں اس کا پانچواں نمبر شمار کیا جاتا تھا۔ (مسالک الابصار: ۱/۱۸۶)

دور دور سے لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے تھے، اور متحیر ہوتے تھے، یہ مسجد سر سے پاؤں تک سونے چاندی اور جواہرات سے سجی ہوئی تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ میں اسے صرف بیجا سمجھ کر کل بیش قیمت سامان نکلوا کر بیت المال میں داخل کر دینے کا ارادہ کیا، اتفاق سے اسی زمانہ میں روم کے قاصد آئے ہوئے تھے، انھوں نے جامع دمشق کو دیکھ کر کہا کہ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا عروج چند روزہ ہے لیکن اس عمارت کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ مسلمان ایک زندہ رہنے والی قوم ہے، یہ سن کر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنا ارادہ ترک کر دیا (کتاب البلدان: ص ۱۰۸) مؤرخین اور جغرافیہ نویسوں نے اس مسجد کے عجائب و نوادر کی بڑی طویل تفصیل لکھی ہے۔

دوسری مسجدیں:

ان دونوں مسجدوں کے علاوہ ولید نے مکہ، مدینہ اور بیت المقدس وغیرہ مقدس مقامات کی پرانی مسجدوں کی توسیع کرائی، اور نئی مسجدیں تعمیر کرائیں (کتاب العیون والحدائق: ص ۷ و کتاب البلدان: ص ۱۰۷) اسی زمانہ میں قرہ بن شریک نائب السلطنۃ مصر نے جامع مصر تعمیر کرائی اور اسے آراستہ و پیراستہ کیا۔ (تاریخ الاسلام ذہبی: ۱/۸)

روضہ نبوی ﷺ کی مرمت:

اس وقت روضۂ مبارک کی کوئی بڑی عمارت نہ تھی، مزار مبارک صرف چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ ولید کے زمانہ میں یہ دیواریں شکستہ ہو چکی تھیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے چاروں طرف دوہری دیوار تعمیر کرادی، کہ اگر ایک کو صدمہ پہنچے تو دوسرے سے پردہ قائم رہے۔ (کتاب العیون والحدائق: ص ۹)

Marfat.com

ایک ناخوش گوار واقعہ:

غرض ہر اعتبار سے ولید کا دور نہایت کامیاب تھا، البتہ حجاج کی فطری سختی کی وجہ سے مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ایک ناگوار واقعہ پیش آیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابن اشعث کی بغاوت میں جو عبدالملک کے زمانہ میں حجاج کے خلاف ہوئی تھی بعض دوسرے اکابر کی طرح حضرت ابن جبیر نے بھی ابن اشعث کا ساتھ دیا۔ بغاوت فرو ہونے کے بعد اور بزرگوں کے ساتھ وہ بھی گرفتار ہوئے۔ ان میں سے جن لوگوں نے معذرت کی، حجاج نے انھیں چھوڑ دیا، لیکن ابن جبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس فعل سے معذرت نہ کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حجاج نے سنہ ۹۴ھ میں ان کو شہید کر دیا۔ (اس واقعہ کی تفصیلات ابن سعد: ۱۸۴/۶۔۱۸۵ اور ابن خلکان: ۲۰۵/۱۔۲۰۶ میں موجود ہیں اور مولانا محمد اسحاق سندیلوی رحمہ اللہ نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے) اگر حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ بھی امام شعبی کی طرح مصلحت وقت کا لحاظ کر کے خاموش رہتے تو ممکن تھا وہ انھیں بھی رہا کر دیتا، لیکن انھوں نے اپنی غلطی کا احساس نہ کیا اور بغاوت کے جرم میں انھیں شہید کر دیا گیا، اگرچہ اس واقعہ کو براہ راست ولید سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن چونکہ اسی کے دور میں پیش آیا اس لیے اس کا دامن بھی اس کی ذمہ داری سے بری نہیں ہے۔

Marfat.com

سلیمان بن عبدالملک

سنہ۹۶ھ تا سنہ۹۹ھ

سلیمان بن عبدالملک ولید کا حقیقی بھائی تھا۔ مدینہ منورہ میں محل بنی جذیلہ میں سنہ۵۴ھ میں پیدا ہوا تھا اور ملک شام میں اپنے باپ عبدالملک کے پاس تعلیم و تربیت پائی تھی۔ یہ راوئ حدیث بھی تھا۔ اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ولید کے انتقال کے بعد ۱۵ جمادی الآخرہ سنہ ۹۶ھ کو رملہ میں مسند خلافت پر بیٹھا۔ سلیمان فطرتاً نیک اور سعید تھا اور عمر بن عبدالعزیز اس کے ہم جلیس اور مشیر تھے۔ ان کی ہم جلیسی اور صحبت نے اس کو اور سنوار دیا تھا، اس وجہ سے کئی لحاظ سے یہ اپنے پیشروؤں سے زیادہ بہتر حکمران ثابت ہوا۔ چنانچہ اس کے مسند خلافت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی اموی حکومت کی سیاسی پالیسی بدل گئی۔ جس کا اندازہ سلیمان کی پہلی تقریر ہی سے ہوسکتا ہے۔ جس میں اس نے اپنی حکومت کی سیاست اور موقف کو صاف الفاظ میں بیان کیا۔ اس نے کہا:

''لوگو! دنیا دھوکے کی جگہ اور باطل کا گھروندہ ہے۔ یہ رونے والوں کو ہنساتی ہے اور ہنسنے والوں کو رلاتی ہے۔ بے خوف کو خوف زدہ کرتی ہے اور خوف زدہ کو امن دیتی ہے۔ دولت مند کو محتاج اور بے دست و پا کرتی ہے اور محتاج کو دولت مند اور متمول بناتی ہے۔ اہل دنیا کو اپنی طرف مائل کرنے والی، دھوکا دینے والی اور ان کے ساتھ کھیلنے والی ہے۔''

اللہ کے بندو! اللہ کی کتاب کو اپنا پیشوا اور امام بناؤ اور اس کے فیصلہ کے سامنے سرتسلیم خم کردو۔ اسے اپنا راہ نما تسلیم کرو کیونکہ وہ اپنے سے پہلے نازل شدہ کتابوں کی ناسخ ہے، اور خود اس کو کسی کتاب نے منسوخ نہیں کیا''

''اللہ کے بندو! یہ قرآن حکیم شیطان کے مکر کو اس طرح کھول دیتا ہے جس طرح صبح صادق کی روشنی رات کی تاریکی کو دور کردیتی ہے۔'' (مسعودی:۲/۱۶۰، التبیین والبیان:۱/۱۶۶)

اس خطبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن حکیم کی سیاست کا قائل تھا اور ملک میں اس کو صحیح معنوں میں نافذ کرنے والا تھا۔ پھر عمر بن عبدالعزیز اس کے مشیر تھے اس لیے عملی طور پر اس کی بعض خوبیوں کا ظہور بھی ہوا۔

Marfat.com

چنانچہ اس نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی ولید کے زمانہ کے تمام قیدیوں کو جو ناحق اور سیاسی اختلاف کے باعث قید کیے گئے تھے، رہا کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں جیل خانے بالکل خالی ہو گئے۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود سلیمان میں انتقام کا مادہ بہت زیادہ تھا جس کی وجہ سے اس نے نامور سپہ سالار کو نہایت ذلت کی موت مارا اور ان کے رشتہ داروں اور ساتھیوں سے بھی بری طرح انتقام لیا۔ اس کے اس انتقام کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اس کے نفس کو کچھ تسلی ہوئی ہو لیکن اسلام کو اس سے بہت زیادہ نقصان ہوا، اور نہ صرف ملکی فتوحات کو نقصان پہنچا بلکہ اندرون ملک بھی لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوئے۔ اول تو جن جن لوگوں سے اس کو ولی عہدی کے زمانہ میں کسی قسم کی شکایت تھی، ان لوگوں سے اس نے خلیفہ بنتے ہی انتقام لینا شروع کر دیا جن میں بعض بڑے فاتحین اور اموی حکومت کے ستون تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی عسکری قوت کو سخت نقصان پہنچا۔ اسی وجہ سے مؤرخین کو یہ کہنا پڑا کہ "سلیمان کی صبح حکومت کا دامن بعض نامور سپہ سالاروں کے شفق گوں خون سے رنگین ہے۔"

ولید نے اپنی وصیت کے برعکس سلیمان کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد بنانا چاہا۔ امرائے حکومت میں سے حجاج بن یوسف اور قتیبہ بن مسلم نے اس کی اس رائے کی غیر شعوری تائید کی، لیکن دوسرے امرائے حکومت کے اختلاف اور موت کی پیش دستی کے سبب یہ کام انجام نہ پا سکا۔ چنانچہ ولید کے انتقال کے بعد جب سلیمان خلیفہ ہوا تو اب اسے کوئی انتقام لینے سے روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ اس نے اب ایک ایک شخص جس کے بارے میں اسے معلوم ہوا کہ اس نے کسی بارے میں میری مخالفت کی تھی، اس سے انتقام لیا۔

قتیبہ بن مسلم کا قتل:

قتیبہ بن مسلم حاکم خراسان اور فاتح ترکستان حجاج بن یوسف کا ساختہ پرداختہ تھا۔ سلیمان کی ولی عہدی میں وہ بھی مزاحم ہوا تھا۔ اس لیے اس کی تخت نشینی کے بعد اسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں سلیمان اس سے انتقام نہ لے کیونکہ وہ سلیمان کی منتقمانہ طبیعت سے پہلے ہی واقف تھا۔ چنانچہ اس نے پیش بندی کے طور پر ایک قاصد سلیمان کے پاس بھیجا اور اسے سلیمان کے نام تین خط دیئے۔ پہلے خط میں اس نے سلیمان کو مسند خلافت پر بیٹھنے کی مبارک باد دی اور عبدالملک اور ولید سے اپنی وفاداری کا تذکرہ کیا تھا، پھر لکھا کہ وہ سلیمان کا بھی اسی طرح وفادار اور حلقہ بگوش رہے گا اگر وہ اسے معزول نہ کرے۔

دوسرے خط میں اس نے خراسان اور ترکستان کے لوگوں کے دلوں میں اپنے رعب اور دبدبہ کا حال لکھا تھا۔ نیز لکھا تھا کہ اگر اسے خراسان سے معزول کر کے اس کے حریف یزید بن مہلب کو اس کا جانشین بنایا گیا تو وہ خلیفہ کی بیعت توڑنے پر مجبور ہو گا۔ اور تیسرے خط میں اس نے سلیمان بن عبدالملک کی بیعت توڑنے کا اعلان کیا تھا۔

Marfat.com

یہ تینوں خط اکٹھے قاصد کو دیئے اور کہا کہ پہلے پہلا خط سلیمان کو دینا، اگر وہ اسے پڑھ کر یزید بن مہلب کی طرف بڑھا دے تو پھر دوسرا خط دینا، اور اگر وہ اسے بھی پڑھ کر یزید بن مہلب کے حوالے کر دے تو پھر تیسرا خط دینا۔

قتیبہ بن مسلم کا قاصد جب خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوا تو توقع کے مطابق یزید بن مہلب اس وقت وہاں موجود تھا۔ چنانچہ قاصد نے پہلا خط سلیمان کو دیا۔ سلیمان نے اسے پڑھ کر یزید کے حوالے کر دیا۔ اب قاصد نے دوسرا خط خلیفہ کے حوالے کیا۔ سلیمان نے اسے بھی پڑھ کر یزید بن مہلب کے حوالے کر دیا۔ اب قاصد نے قتیبہ کے ترکش کا آخری تیر نکالا اور سلیمان کی طرف بڑھایا۔ سلیمان اس خط کو پڑھ کر لال پیلا ہو گیا اور غصہ سے تڑپ اٹھا۔ تاہم اس نے عاقبت اندیشی سے کام لیا۔ قاصد کو انعام واکرام سے نوازا اور قتیبہ کی ولایت خراسان کا پروانہ دے کر اسے رخصت کر دیا، لیکن قتیبہ ایک جرنیل تھا اور نہایت بہترین جرنیل جس نے ترکستان میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی لیکن وہ امور جہاں بانی کے نشیب و فراز سے واقف نہ تھے، اس لیے جلد بازی سے کام لے کر اس نے بنا بنایا کام خراب کر دیا۔

سلیمان ولیدی دور کے تمام جابر عمال خصوصاً حجاج بن یوسف اور اس کے ماتحت جتنے حکام تھے جن میں ایک قتیبہ بن مسلم بھی تھا، سخت خلاف تھا۔ حجاج ولید ہی کے دور میں انتقال کر گیا لہٰذا اس سے تو انتقام نہیں لیا جا سکتا تھا البتہ اس کے ماتحت حکام اور قتیبہ ابھی باقی تھے، چنانچہ جب سلیمان نے حجاج کے زمانہ کے مظالم کی اصلاح اور تلافی کی طرف توجہ کی تو اس کے ماتحت حکام کی دارو گیر شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں اب تک سلیمان نے قتیبہ سے کوئی مواخذہ نہیں کیا تھا، لیکن قتیبہ کے دل میں ایک تو خود چور تھا کیونکہ حجاج کے ماتحت ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ اس نے بھی بعض امور میں حد سے تجاوز کیا ہو، لہٰذا سلیمان کا رخ دیکھ کر قتیبہ کے دل میں خود ایک خوف سا پیدا ہو گیا، اور اسے سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ سلیمان اسے خراسان کی گورنری سے معزول کر کے اس کے حریف اور مدمقابل یزید بن مہلب کو جسے وہ (سلیمان) بہت مانتا تھا، خراسان کا گورنر نہ بنا دے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اس نے سلیمان کو وہ تین خط لکھے جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے، اور ان تینوں میں سے ایک خط میں اس کو علم بغاوت بلند کرنے کی دھمکی بھی دی۔ سلیمان نے اس دھمکی سے اس کے خلاف کوئی ایکشن نہ لیا حالانکہ مشہور ہے ''نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد'' لیکن قتیبہ کے دل میں سلیمان کے بارے میں بدگمانی رہی۔ اس کے ذہن میں تھا کہ میرے تمام ماتحت قبائل ہر معاملہ میں میرا ساتھ دیں گے۔ اسی زعم میں اس نے سلیمان کی طرف سے اپنے ان خطوط کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے ماتحت قبائل کو حکومت کے خلاف بغاوت پر برانگیختہ کیا، لیکن قتیبہ کی توقع کے خلاف کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ خراسان کی تمام موجودہ فوج اور سرداران لشکر کو اکٹھا کر کے اس نے انھیں حکومت کے خلاف بغاوت پر ابھارا اور انھیں نہایت زور دے کر کہا کہ ہمیں سلیمان بن عبدالملک کی خلافت سے انکار کرنا چاہیے قتیبہ کی فوج میں

Marfat.com

ایک بہت بڑا حصہ بنوتمیم کا تھا۔ بنوتمیم کا سردار وکیع بن الاسود تھا۔ وکیع نے قتیبہ کا حکومت کے خلاف یہ رویہ دیکھ کر لوگوں سے سلیمان کی بیعت خلافت لینی شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ یہ خبر تمام لشکر میں پھیل گئی اور بنوتمیم کے علاوہ بھی دوسرے قبائل وکیع کے گرد جمع ہو گئے۔ قتیبہ نے ہر چند کوشش کی کہ لوگ اس کی باتیں سنیں اور اس سے افہام و تفہیم کریں لیکن کوئی شخص اس کے قریب نہ گیا بلکہ علانیہ اس کی گستاخیاں کرنے اور اس کے بارے میں نفرت آمیز اور حقارت آمیز باتیں کرنے لگے۔ قتیبہ کے ساتھ اس کے بھائی، بیٹے اور اعزاء و اقرباء شریک رہے۔ آخر کار لشکریوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور قتیبہ کی ہر چیز کو لوٹنا اور جلانا شروع کر دیا۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ قتیبہ کے اعزاء و اقرباء نے اس کے خیمہ کی حفاظت کرنا چاہی لیکن وہ سب لشکریوں کے ہاتھوں مارے گئے، اور بالآخر قتیبہ بھی بہت سے زخم کھا کر بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اور لشکریوں نے اسے قتل کر دیا۔
ایک روایت میں ہے کہ قتیبہ نے جب لشکریوں کو سلیمان کی بیعت فسخ کرنے کے لیے کہا تو بنوتمیم نے جن کی لشکر میں اکثریت تھے، قتیبہ کی اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا جس پر اس نے بنوتمیم پر نہایت برہمی کا اظہار کیا۔ اس برہمی کا الٹا اثر ہوا اور قبیلہ بنوتمیم اس سے بگڑ گیا اور انھوں نے وکیع بن الاسود کو اپنا سردار بنا کر قتیبہ سے مقابلہ کیا۔ کئی ہزار اہل عجم نے بھی بنوتمیم کا ساتھ دیا۔ دونوں میں بڑی خون ریز جنگ ہوئی۔ قتیبہ کی قوت نہایت کمزور تھی۔ اس لیے اس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ خود اس کے بھائی اور اس کے لڑکے جنگ میں کام آئے۔ قتیبہ کا سر کاٹ کر سلیمان کے پاس بھجوا دیا گیا۔ قتیبہ کے بھائیوں میں سے صرف ایک شخص عروہ بن مسلم صرف اس لیے زندہ بچ گیا کہ اس کی ماں قبیلہ بنوتمیم سے تھی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وکیع بن الاسود نے قتیبہ کا سر کاٹ کر اور اس کی انگوٹھی سلیمان بن عبدالملک کے پاس بھجوا دی۔ قتیبہ بن مسلم بنوامیہ کے سرداروں میں سے نہایت زبردست، فتح مند، نامور اور کامیاب سردار تھا جس نے بنوامیہ کی حکومت کی مضبوطی اور استحکام کے لیے ایک مضبوط ستون کا کام کیا اور اپنی ساری توانائیاں اس حکومت کے لیے صرف کر دیں۔ اس قسم کے زبردست اور جرأت مند جرنیل کی ایسی موت ایک نہایت افسوس ناک حادثہ ہے، لیکن اس نے حکومت کے خلاف بغاوت کرنے میں نہایت جلد بازی اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا تھا، اس لیے ہمارے خیال میں اس کے قتل پر سلیمان کا براہ راست کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اس قتل کا الزام اس کو دیا جا سکتا ہے، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ قتیبہ بن مسلم جیسا فاتح اسلام جس سے شاہان عجم و ترکستان لرزہ براندام تھے، آپس کی مخالفت اور بدگمانی کی نظر ہو گیا۔

ایک خراسانی نے اس کے قتل کی خبر سن کر کہا:

”خدا کی قسم! اگر قتیبہ جیسا فاتح ہم میں ہوتا اور وہ مر جاتا تو ہم اسے تابوت میں رکھتے اور دشمنوں کے مقابلہ کے وقت اس تابوت کی برکت سے فتح طلب کرتے۔“

اگرچہ قتیبہ کے قتل میں سلیمان کا کوئی دوش اور قصور نہ تھا لیکن سلیمان کی منتقم مزاجی نے اتنے بڑے

Marfat.com

جرنیل کو اس خوف سے دو چار کر دیا جس کی وجہ سے وہ بغاوت پر اتر آیا۔ اگر سلیمان میں انتقام کا مادہ نہ ہوتا تو اتنا بڑا جرنیل اپنی ہی فوج کے ہاتھوں قتل نہ ہوتا جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے سخت باعث نقصان ہوا۔

محمد بن قاسم کی گرفتاری اور اس کا قتل:

محمد بن قاسم اس وقت سندھ کی مہمات میں مشغول تھا۔ چنانچہ ملتان کی فتح کے بعد اس نے بیلمان اور سرست (سورت) کے علاقوں کو مطیع و منقاد کیا اور کیرج (جے پور) کے راجہ کو شکست فاش دی۔

(فتوح البلدان: ص ۴۴۵)

محمد بن قاسم پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حجاج کا چچا زاد بھائی اور داماد تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کو اگر حجاج سے عداوت اور دشمنی تھی تو اس دشمنی کو حجاج کے اعزاء و اقرباء تک بلا وجہ وسیع نہیں ہو جانا چاہیے تھا، لیکن افسوس ہے کہ سلیمان نے محمد بن قاسم کو بھی اسی طرح گردن زدنی سمجھا جس طرح وہ حجاج کو سمجھتا تھا۔ محمد بن قاسم نہایت سمجھ دار، بہادر، صالح، مستقل مزاج، نیک طینت اور نہایت درویش صفت نوجوان تھا۔ اس نوجوان نے سندھ و ہند کی فتوحات میں ایک طرف اپنے آپ کو رستم و سکندر سے بڑھ کر ثابت کیا تو دوسری طرف وہ نوشیرواں عادل سے بڑھ کر عادل و منصف اور رعایا پرور تھا۔ اس جرأت مند اور فتح یاب نوجوان نے سلیمان کے خلاف قطعاً کبھی کوئی حرکت نہ کی تھی۔ اس کا سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ اس کے دل میں اسلام کی ایک لگن تھی اور اسلامی ریاست کی پہنائیوں اور حدود و ثغور میں وسعت کا ایک جذبہ تھا۔ اسی مقصد کے لیے وہ حجاج کے کہنے پر ہندوستان آیا اور یہاں کے راجے مہاراجوں کو عرب شجاعت و بہادری کے وہ مظاہرے دکھائے کہ ہر ایک راجہ اس کے آگے سرنگوں ہو کر اس کا باجگزار ہو گیا جس کا سلطنت کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا۔

حجاج کا انتقال اسی سال ہوا جس سال سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہوا۔ حجاج کی وفات کے بعد بھی محمد بن قاسم اسی طرح فتوحات اور ملک داری میں مصروف رہا جیسا کہ حجاج کی زندگی میں تھا۔ اس کے پاس جس قدر فوج تھی وہ سب کی سب دل و جان سے فدا اور اس کے ہر ایک حکم کی تعمیل کو بسر و چشم موجود تھی، اور یہ بھی اس بات کی سب سے بڑی دلیل تھی کہ محمد بن قاسم نہایت اعلیٰ درجہ کا قابل سپہ سالار تھا۔ ایسے نوجوان کی جس کی ابتدا ایسی عظیم الشان تھی، اگر تربیت کی جاتی اور اس سے کام لیا جاتا تو وہ سلیمان بن عبدالملک کے لیے تمام براعظم ایشیا کو چین و جاپان تک فتح کر دیتا، لیکن سلیمان نے جذبۂ عداوت سے مغلوب ہو کر یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا والی بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے بھیج دو، اور سلیمان کا یہ حکم درحقیقت تمام کام گذار اور فتح مند سپہ سالاروں کو بددل بنا دینے کا ایک زبردست اعلان تھا۔ کسی خلیفہ یا سلطان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی قابل شرم بات نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے سرداروں کے عظیم الشان اور قابل تعریف کاموں کا صلہ بجائے تحسین و آفرین اور عزت افزائی کے قید و گرفتاری سے دے۔

Marfat.com

یزید بن ابی کبشہ سندھ میں آ کر زور وقوت کے ذریعے محمد بن قاسم کو ہرگز ہرگز مغلوب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ فوج میں اس کا ایک خاص اثر تھا اور وہ اس کے ایک اشارۂ ابرو پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار تھے۔ محمد بن قاسم کے ساتھیوں اور ہمراہیوں کو خلیفہ کے اس نامعقول حکم کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے محمد بن قاسم سے کہا کہ آپ اس حکم کی تعمیل ہرگز نہ کریں۔ ہم آپ کو اپنا امیر جانتے اور آپ کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت کیے ہوئے ہیں۔ خلیفہ سلیمان کا ہاتھ ہرگز آپ تک نہیں پہنچ سکتا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ محمد بن قاسم کو مغلوب کرنے کے لیے خلیفہ سلیمان کو اپنی خلافت کا پورا زور لگانا پڑتا کیونکہ یہاں محمد بن قاسم کے پاس اس کی ہر دل عزیزی کے باعث ایسے ذرائع موجود تھے کہ سندھ کے ریگستان کا ہر ایک ذرہ اس کی اعانت و امداد کے لیے کوشاں ہوتا لیکن اس صالح اور نیک دل نوجوان نے فوراً اور بلا توقف اپنے آپ کو ابن ابی کبشہ کے سپرد کر دیا اور کہا کہ خلیفہ وقت کے حکم کی نافرمانی کا جرم مجھ سے ہرگز سرزد نہیں ہوگا۔ چنانچہ محمد بن قاسم کو گرفتار کرنے کے بعد ابن ابی کبشہ نے اسے دمشق روانہ کر دیا۔ وہاں سلیمان بن عبدالملک کے حکم سے وہ واسط کے جیل خانہ میں قید کر دیا گیا اور صالح بن عبدالرحمٰن کو اس پر مسلط کر دیا جس نے اس کو جیل میں بہت تکالیف دیں۔ محمد بن قاسم کے ساتھ یہ سب کچھ صرف اس لیے کیا گیا کہ حجاج بن یوسف کا رشتہ دار تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے سیدھا عراق بھیج دیا گیا۔ وہاں کا گورنر صالح بن عبدالرحمٰن تھا۔ اس کے بھائی آدم کو جو خارجی تھا، حجاج نے قتل کیا تھا۔ صالح نے اپنے اس بھائی کا انتقام محمد بن قاسم سے لیا۔ پہلے تو قید خانہ میں اس کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ پھر اسے قتل کر دیا گیا۔ اہل سندھ پر محمد بن قاسم کی خوبیوں کا اس قدر اثر تھا کہ وہ اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے۔ اہل کیراج نے اظہار عقیدت کے لیے اس کی تصاویر بنا کر رکھیں۔

(فتوح البلدان: ۴۴۶)

ابن اثیر کا بیان ہے کہ اہل سندھ نے اس کی مظلومانہ شہادت پر آنسو بہائے اور انھوں نے اس کا ایک بت بنا کر اپنے مندر میں رکھا۔

حمزہ بن بیض حنفی نے محمد بن قاسم کا ان الفاظ میں ماتم کیا ہے:

''بہادری، نرم دلی اور سخاوت محمد بن قاسم بن محمد کے لیے مقدر ہو چکی تھی۔ سترہ سال کی عمر میں ہی اس نے لشکروں کی سالاری کی اور اس کی سرداری کس قدر کم عمر میں تھی۔''

یہاں یہ بات بھی قابل غور وفکر ہے کہ سلیمان بن عبدالملک کی حجاج سے مخالفت کی وجہ کیا تھی؟ ایک وجہ تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ حجاج نے سلیمان کی ولی عہدی کے معاملہ میں اس کی مخالفت کی تھی۔ سلیمان عمر بن عبدالعزیز کی پارٹی کا آدمی تھا اور عمر بن عبدالعزیز اور حجاج کی طرز سیاست میں بعد المشرقین تھا۔ حجاج کی رائے یہ تھی کہ عراق میں آپ کی شمشیر ہی فتنہ وفساد کی آگ کو فرو کر سکتی ہے اور عمر بن عبدالعزیز خون مسلم کی ارزانی کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ اختلاف صرف نظری ہی نہیں بلکہ عملی بھی تھا، چنانچہ اس بارے میں کئی مرتبہ عمر بن

Marfat.com

عبدالعزیز اور حجاج بن یوسف میں ٹکر ہوئی۔ جب سلیمان بن عبدالملک کے ہاتھ میں عنان حکومت آئی تو حجاج تو قید حیات سے آزاد ہو چکا تھا لیکن اس کے خاندان کو اس کے جبر کا کفارہ ادا کرنا پڑا۔ سلیمان نے بنوعقیل کو جن میں محمد بن قاسم بھی تھا، صالح بن عبدالرحمٰن کے حوالے کر دیا۔ صالح نے حجاج سے اپنی خاندانی چشمک اور کاوش کی بنا پر محمد بن قاسم کو قتل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حجاج کے مظالم کتنے ہی ناحق کیوں نہ ہوں، محمد بن قاسم جیسے صالح، نیک طینت اور عادل نوجوان سے ان کا انتقام لینا کسی طرح حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا پھر اس پر قابل تعجب بات یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے سلیمان کو محمد بن قاسم کی گرفتاری اور اس کے قتل سے کیوں نہیں روکا جب وہ ابن عبدالعزیز کے زیر اثر تھا۔ اس کا جواب تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتا، اور نہ ہی محمد بن قاسم اور اس کی طرح کے دوسرے بے گناہوں کے قتل پر سلیمان سے عمر بن عبدالعزیز کے اظہار ناراضگی کا ذکر ملتا ہے۔

موسیٰ بن نصیر سلیمانی عتاب کی زد میں:

اس سے بھی زیادہ افسوس ناک واقعہ موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس کا ہے۔ جونہی ولید کا انتقال ہوا موسیٰ کی تباہی و بربادی اور ادبار و تنزل کے دن شروع ہو گئے۔ سلیمان بن عبدالملک نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی موسیٰ بن نصیر کو مختلف معاملات میں گھسیٹنا شروع کر دیا۔ سلیمان ولید کے زمانہ ہی سے موسیٰ سے خار کھائے بیٹھا تھا کیونکہ اس نے اس کی اس بارے میں حکم عدولی کی تھی کہ وہ اپنے سفر میں سستی نہ کر سکا، اور جو غنیمت کا مال ولید کے زمانہ میں وہ دمشق سے لے آیا تھا وہ سلیمان کے عہد خلافت میں اسے لانا چاہیے تھا۔ جس وقت سلیمان کا قاصد موسیٰ کی طرف سے مایوس کن جواب لے کر آیا تھا، تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ سلیمان نے اسی وقت قسم کھائی تھی کہ وہ برسر اقتدار آ کر موسیٰ کو سخت سے سخت سزا دے گا۔ پھر ولید نے جامع مسجد دمشق میں موسیٰ کی جس طرح قدر افزائی کی اور جس طور پر مال غنیمت تقسیم کیا، وہ سلیمان کو ایک آنکھ نہ بھایا بلکہ اس جشن مسرت نے سلیمان کے غصہ میں اور اضافہ کر دیا۔ چنانچہ اس نے مسند خلافت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی موسیٰ بن نصیر کو دربار میں طلب کیا اور اس کی جواب طلبی کی جس سے ان دونوں میں تلخ کلامی ہو گئی۔ سلیمان نے نہایت غصہ سے موسیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"تمھیں یہ کیسے جرأت و ہمت ہو گئی کہ تم میرے حکم کی خلاف ورزی سے باز نہ آئے۔ بخدا! میں تمھاری تعداد کم کروں گا، تمھاری جمعیت منتشر کر دوں گا اور تمھاری ساری دولت و ثروت اور املاک و جائیداد کو برباد اور تباہ کر دوں گا یا بحق سرکار ضبط کر لوں گا۔"

موسیٰ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے اپنے زمانہ کے محترم شیوخ اور معززین میں سے تھے۔ یہ درست ہے کہ جس شخص نے اس سے یہ بات کہی تھی وہ وقت کا امیرالمؤمنین تھا۔ چین سے لے کر سندھ تک اور اندلس اور براعظم افریقہ اس کے ماتحت تھے۔ اس وجہ سے موسیٰ بن نصیر نے دلائل کے ساتھ یوں عذر خواہی کی، اور کہا:

Marfat.com

''امیر المومنین! میری غلطی اور خطا اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ آپ کے پیش رو خلیفہ کے حکم کی تعمیل کی۔ باقی رہا مجھ کو ذلیل و رسوا کرنا، میری جمعیت کو تباہ و برباد کرنا اور مال و دولت کا چھین لینا یا تباہ کر دینا تو یہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کی طرف لوٹتا ہے۔ وہی ذات ہے جس نے مجھ پر اپنی نعمتوں کا احسان فرمایا میں اسی سے مدد کا خواستگار ہوں اور امیر المومنین کے غصہ اور عتاب سے بچنے کے لیے اسی کی پناہ تلاش کرتا ہوں۔''

موسیٰ نے جو کچھ کہا بالکل درست اور صحیح کہا۔ ہر شئے اللہ تعالیٰ کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ جس کو چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت سے دوچار کرتا ہے۔ ایک مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے۔ لیکن موسیٰ کا یہ جواب سلیمان کے طیش وغضب اور غصہ کو فرو نہ کر سکا بلکہ اس میں اضافہ کا باعث بنا۔ اس کے بعد ان دونوں میں نہایت تیز و تند اور تلخ قسم کی گفتگو ہوئی۔ سلیمان نے افریقہ، مغرب، اندلس وغیرہ کے نظم و نسق کے بارے میں موسیٰ سے سوالات کیے تو انھوں نے جواب میں کہا: ایک لڑکا عبداللہ شمالی افریقہ کا گورنر ہے، دوسرا مروان طنجہ اور مغرب اقصیٰ کا اور تیسرا عبدالعزیز جو ولایت اندلس پر مامور ہے۔

موسیٰ کا ایک لڑکا عبدالعزیز اندلس کا اور دوسرا لڑکا عبداللہ شمالی افریقہ کا والی اور گورنر تھا۔ سلیمان کو سیاسی نقطۂ نظر سے ایک ہی گھر میں شمالی افریقہ سے لے کر فرانس کی سرحد تک کی حکومت پسند نہ آئی۔ اس پر موسیٰ سے اس نے یہ سوال کیا کہ کیا اب تم اتنے معزز ہو گئے ہو یعنی تمھارے بیٹوں کے علاوہ اور کوئی حکومت کا اہل ہی نہ تھا۔

موسیٰ کے منہ سے یہ سن کر سلیمان کا غصہ اور بھڑکا اور اس نے طنزیہ انداز میں کہا: ''اب تو تم بہت معزز ہو گئے۔'' معزز تو وہ تھے ہی کیونکہ انھوں نے اپنی قوت بازو اور جرأت ایمانی سے افریقہ اور اندلس کو فتح کر کے اللہ اور مسلمانوں کے دشمنوں کے دلوں پر اسلام کی دھاک بٹھا دی تھی۔ کفران کی تیغ براں کے سامنے اس طرح بھاگتا پھرتا تھا جس طرح شیر کے سامنے گدھے بھاگتے ہیں۔ موسیٰ سلیمان کا یہ طنز کیسے برداشت کر سکتے تھے، لہٰذا انھوں نے اسی انداز میں جواب دیا:

''انہی لڑکوں نے اپنی قوت و طاقت اور زور و بازو سے ان مقامات کو فتح کیا، لہٰذا یہ بات کیا کم باعث اعزاز ہے؟ پھر امیر المومنین! غور سے سن لیں مجھ سے زیادہ کون معزز ہے؟''

اس جواب نے سلیمان کو برافروختہ کر دیا اور اس کا غصہ پارے کی طرح چڑھ گیا، اب اس نے گرج دار آواز اور غصب آلود لہجہ میں موسیٰ سے پوچھا:

''اور نہ امیر المومنین تم سے زیادہ معزز ہیں؟''

اب موسیٰ کو ہوش آیا کہ میرے الفاظ کے کیا معانی لیے جا رہے ہیں۔ عزت کا اسلامی معیار تو ایمان اور ایک مسلمان کے اخلاق اور کارنامے ہیں۔ اور اصل میں عزت تو اللہ اس کے رسول ﷺ کے لیے ہے۔

Marfat.com

سلیمان کو سمجھ جانا چاہیے تھا کہ موسیٰ کے اس جملہ کے کیا معنی ہیں۔ اس نے موسیٰ سے اپنا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ امیر المؤمنین سلیمان کا یہ سوال سن کر موسیٰ نے نہایت عاجزی اور لجاجت کے لہجے میں عرض کیا:

''میرا امیر المؤمنین سے کیا مقابلہ؟ امیر المؤمنین کی تو وہ شان ہے جس سے بلند کوئی دوسری شان نہیں۔ حکومت کے ارکان اور عمائدین کی سب شانیں کتنی بھی بلند اور اونچی ہو جائیں، پھر بھی وہ امیر المؤمنین کی شان سے پست اور نیچے ہیں کیونکہ ہر ایک کو اونچی اور بلند شان امیر المؤمنین کے توسط اور فرمان ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔''

موسیٰ بن نصیر کا جواب نہایت معقول تھا اور اس میں امیر المؤمنین کی بلندی شان بھی مضمر تھی لیکن ''نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد'' اس جواب سے سلیمان کے دل میں کوئی نرمی پیدا نہ ہوئی، لہٰذا فرط غضب سے فرمان شاہی ہوا جس کی رو سے موسیٰ کو گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں مجرموں کی طرح سزا کے طور پر کھڑا کر دیا گیا یہاں تک کہ موسیٰ کے جسم کا بال بال عرق آلود ہو گیا۔ جب دھوپ کی تمازت اور تپش برداشت نہ ہو سکی تو فاتح افریقہ واندلس بے ہوش ہو کر نیچے زمین پر گر پڑے۔ یہ تھا حشر اس جلیل القدر جرنیل، قائد اسلام کا جس کی تیغ براں نے اندلس اور افریقہ کو فتح کیا تھا۔ اور افریقہ سے فرانس تک کے علاقہ کو زیر نگین کیا، اور ایسے کارنامے انجام دیئے جن کو دنیا کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ علاوہ ازیں وہ کروڑوں اربوں کا مال غنیمت دربار خلافت میں لایا۔ آج اس کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے اور وہ آفتاب کی تمازت اور دھوپ کی گرمی سے بے ہوش ہو کر زمین پر گرا پڑا ہے۔ یہ ہیں زمانے کی نیرنگیاں۔ سلیمان نے موسیٰ کی تمام گزشتہ خدمات جو انھوں نے ملک وملت کے لیے کی تھیں، ان سب کو یک قلم فراموش کر دیا اور صرف ایک معمولی سی حکم عدولی جو کہ حکم عدولی بھی نہیں کہلائی جا سکتی کیونکہ سلیمان اس وقت ابھی امیر المؤمنین نہیں بنا تھا، یہ سزا دی جا رہی تھی جو ایک بہت بڑے باغی اور مجرم کو دی جاتی ہے۔ موسیٰ بن نصیر کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ ان کا تعلق لخمی قبیلہ سے تھا اور وہ جلیل القدر تابعین میں سے تھے۔ خاندان بنو امیہ سے ان کے نہایت دیرینہ تعلقات تھے، لیکن سلیمان نے ان میں کسی تعلق کا لحاظ نہ رکھا۔ موسیٰ کی خطا صرف اتنی تھی کہ سلیمان کے مزاج کے خلاف موسیٰ کی عزت افزائی ہوئی۔ اس کو خلعت فاخرہ امیر المؤمنین ولید نے عطا کی اور دوسری طرف اس داد و دہش کو جو ولید نے دمشق کی جامع مسجد میں موسیٰ اور اس کے ساتھیوں اور موالی کو دی تھیں، اس میں اندلس کے مال غنیمت کا معتد بہ حصہ صرف ہو گیا۔

موسیٰ کو سلیمان نے ذہنی طور پر نہایت پریشان کیا۔ ابھی چند روز قبل سلیمان کے بھائی ولید نے اس بہادر جرنیل کی بڑی عزت افزائی کی۔ پچاس ہزار اشرفیوں کا گراں قدر انعام دیا، تین خلعت عطا کیے۔ اس کے پانچ سو غلاموں کو عطیات دیئے اور اس کے ساتھیوں کی بھی قدر افزائی کی گئی تھی، آج اس موسیٰ بن نصیر کو سزا کے طور پر چلچلاتی دھوپ میں اس وقت کھڑا کر دیا گیا جب تک کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔

عمر بن عبدالعزیز اس مجلس میں تشریف فرما تھے۔ وہ موسیٰ کی جلالت قدر سے بخوبی آشنا تھے۔ وہ یہ

Marfat.com

سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ سلیمان کی غضب آلود نگاہیں اب تک ان سے چار نہیں ہوئی تھیں۔ سلیمان جو کچھ موسیٰ سے کر رہا تھا وہ اس کو نظر استحسان سے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ وہ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا رہے تھے اگرچہ وہ سلیمان کے بہنوئی اور اس کے چچازاد بھائی تھے اور سلیمان کو کچھ ان کا ہی لحاظ کرنا چاہیے تھا، لیکن فرماتے ہیں کہ مجھ پر اس سے زیادہ سخت دن اور کوئی نہیں گزرا اور نہ اس سے زیادہ کرب میں نے کسی روز اٹھایا۔ اب جب سلیمان ان کی طرف متوجہ ہوا تو انھیں لب کشائی کی جرأت ہوئی۔ انھوں نے سفارش کی۔ سلیمان کا غصہ کچھ فرو اور ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے موسیٰ کو ضمانت پر رہا کرنا چاہا۔ یزید بن مہلب نے ان کی ضمانت قبول کرلی، اور موسیٰ بن نصیر کو اسی وقت تمام صوبوں اور ولایتوں سے معزولی کا فرمان سنا دیا گیا۔

موسیٰ کی ولایتوں سے معزولی کی طرح کا ایک اور واقعہ اس سے قبل بھی ہو چکا تھا لیکن اس واقعہ کی نوعیت کچھ اور طرح کی تھی۔ اس میں معزول کرنے والی شخصیت کسی ذاتی غصہ کی وجہ سے اسلام کے ایک بہت بڑے جرنیل کو معزول نہیں کر رہی تھی، بلکہ وہاں سب کچھ دین کی وجہ سے ہو رہا تھا اور یہاں موسیٰ کی معزولی اپنی ذاتی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کی جا رہی تھی۔ سنہ ۱۷ھ میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس وقت معزول کیا جب وہ شہروں پر شہر فتح کر رہے تھے۔ عراق اور شام کی فتوحات میں ان کی تلوار کی دھاک لوگوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جنگ یرموک، جنگ حمص، جنگ قنسرین اور جنگ خراض وغیرہ میں انھوں نے دنیا کے بڑے بڑے جرنیلوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ حلب، حماۃ اور انطاکیہ کی بغاوتوں کو فرو کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا، لیکن ان سب باتوں کے باوجود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا اہم اور تاریخی فیصلہ کرلیا۔ مختلف اہل قلم اور مؤرخین نے اس پر اپنے اپنے انداز میں نقد وجرح بھی کی ہے۔ بعض نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی مورد الزام ٹھہرایا اور بعض نے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کے بعض کاموں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ لیکن ہمارا یہ مقام نہیں کہ ہم ان دو عظیم اور نابغۂ روزگار ہستیوں کا موازنہ اور مقابلہ کریں۔ آج کل کے بعض حضرات اختلاف رائے کو دشمنی اور عداوت پر محمول کرتے ہیں حالانکہ ان دونوں کے معنوں میں بہت فرق ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک دوسرے کی دشمنی نہیں تھی البتہ بعض حالات میں ان میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ انھوں نے کبھی اپنی ذاتی اغراض کے تحت ایک دوسرے سے اختلاف نہیں کیا تھا کیونکہ یہ بات ان کے رتبہ اور درجہ سے فروتر تھی۔

روایات میں آتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ سے بعض معاملات میں اپنا اسلوب تبدیل کرنے کے لیے کہا۔ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق بنو مخزوم سے تھا جو کہ تمام عرب میں امیر اور متمول قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کے والد ولید بن مغیرہ مخزومی زمانہ جاہلیت ہی سے ایک امیر کبیر شخص تھے اور فوج کی سپہ سالاری اور فوجی کیمپ کے انتظام کا عہدہ ان کے خاندان میں تھا۔ (عقد الفرید: ۱۲۶/۲) اور ظہور اسلام کے وقت سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اس معزز عہدہ پر فائز

Marfat.com

تھے۔(استیعاب: ۱/۱۵۷) چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کا جو دستہ مسلمانوں کی نقل وحرکت کا پتہ لگانے آیا تھا، اس کے قائد اور سردار سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے۔ (بخاری، کتاب المغازی، باب الشروط فی الجہاد) اور جنگ احد کے موقع پر مشرکین مکہ کے اکھڑے ہوئے قدم انھیں کی ہمت سے دوبارہ جمے اور مسلمانوں کے شدید نقصان کا باعث بنے۔ اس وجہ سے بچپن ہی سے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اپنی رائے کو مبنی برصواب سمجھتے تھے اور اکثر معاملات میں خصوصی طور پر لڑائی میں ان کی رائے صحیح اور درست بھی ہوتی تھی، لیکن چونکہ وہ فوجی اور مارشل قسم کے آدمی تھے، لہٰذا بعض معاملات میں کچھ غیر شعوری طور پر ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو ایک منتظم شخص کے نزدیک درست نہیں ہوتی تھیں۔ جنگ موتہ کے موقع پر ان کی اسی فوجی جرأت اور بہادری کے صلہ میں انھیں "سیف اللہ المسلول" (اللہ تعالیٰ کی سونتی ہوئی تلوار) کا خطاب ملا جو بارگاہِ نبوت کی طرف سے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

دوسری طرف ان کو معزول کرنے والے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی عظمت ورفعت کے آفتاب عالم تاب تھے۔ اللہ کی زمین کو انھوں نے عدل وانصاف اور امن وامان کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ گویا کہ دونوں حضرات ہی اپنے اپنے مقام پر بلند وبالا تھے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی تنقیص دونوں کی تنقیص ہوگی۔ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے ہر لحاظ پر سپہ سالاری کا حق ادا کر دیا۔ فتنہ ارتداد کا قلع قمع صرف انھی نے کیا۔ چنانچہ طبری نے لکھا ہے کہ

"ان الفتوح فی اھل الردۃ کلھا کانت لخالد بن ولید وغیرہ"

"یعنی ارتداد میں جتنی فتوحات ہوئیں وہ سب سیدنا خالد کا کارنامہ ہے۔"

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف مواقع پر سیدنا خالد رضی اللہ عنہ سے جو نسبی رشتہ میں ان کے ماموں لگتے تھے، کیونکہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی والدہ حنتمہ کے سگے چچازاد بھائی تھے، یہ کہا کہ وہ اپنا اسلوب تبدیل کریں، لیکن سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں اپنی طبیعت کے ہاتھوں معذور بلکہ مجبور تھے۔ ان کی نہاد ذہنی ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ وقت پر بجائے کسی سے مشورہ لینے کے فوری طور پر خود فیصلہ کر لیتے تھے۔ بعض دفعہ ان کے فیصلے غلط بھی ہوتے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ان سے سختی سے باز پرس نہیں کی، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس روش پر چلتے ہوئے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ہر موقع پر ان کے غلط فیصلوں کو عفو کے دامن سے چھپالیا، چنانچہ مالک بن نویرہ کے قتل میں سیدنا خالدؓ کا موقف یہ تھا کہ انھوں نے ایک مرتد کو قتل کیا ہے، لیکن بعض حضرات جن میں سیدنا ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے، اس قتل سے نہایت برہم تھے۔ اس وقت بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے تھی کہ خالد رضی اللہ عنہ کو فوری طور پر معزول کر دیا جائے، لیکن سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ اگر مالک بن نویرہ کا قتل حالت اسلام میں ہوا ہے تو بھی یہ قتل عمد نہیں بلکہ قتل خطا ہے، اس لیے آپ نے خالد رضی اللہ عنہ کی طرف سے دیت اور خون بہا ادا کر دیا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ایک اپنی شان تھی اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اپنی ایک شان۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی ہر بات میں اسوۂ رسول کی اتباع ان کی فطرت اور طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ

Marfat.com

انسانی فطرت کی کمزوریوں سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ اور دوسری طرف سیاست اور فوجی تدابیر کا جو مقتضا تھا اس سے بھی وہ پوری طرح واقف تھے، اس لیے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے میں اگرچہ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ سے کسی غلطی کا ارتکاب ہوا بھی تھا تو بہرحال وہ اتنی بڑی غلطی ہرگز نہ تھی جس کی پاداش میں سیدنا خالد رضی اللہ عنہ جیسے مدبر جرنیل اور بہادر کمانڈر اور دوراندیش سپہ سالار کی قیادت سے اسلامی لشکر کو محروم کر دیا جائے اور اس طریقہ سے اسلامی محاذ جنگ کو خطرہ میں ڈال دیا جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اگرچہ عہد صدیقی میں بھی اپنی ایک رائے رکھتے تھے لیکن سیدنا ابوبکرؓ کے فیصلہ کے سامنے ان کی گردن جھک جاتی تھی۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں متمم بن نویرہ نے حاضر ہو کر سیدنا خالد رضی اللہ عنہ بن ولید سے قصاص کا مطالبہ کیا، جس کے جواب میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ابوبکر رضی اللہ عنہ جو کر گئے ہیں میں اس کو رد نہیں کروں گا۔'' (خزانۃ الادب: ۲/ ۳۳۸)

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کو بخوبی جانتے اور مانتے تھے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ذاتی خواہشات سے متاثر ہو کر کبھی فیصلے نہیں کرتے بلکہ ان کے پیش نظر رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ نے بعض وہ فیصلے بھی کیے جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہیں کیے تھے، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان فیصلوں پر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا جس کی مثالیں کتابوں میں ملتی ہیں۔

موسیٰ کو جو سلیمان نے معزول کیا وہ بالکل ذاتی پرخاش اور ذاتی انتقام کی وجہ سے کیا تھا۔ اور جس طریقہ سے کیا وہ اتنے بڑے جرنیل بلکہ خود خلیفہ کے لیے باعث شرم تھا۔ سلیمان کا ان کو معزول کرنا سلیمان کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے کہ اتنا بڑا فاتح اور اتنا عظیم جرنیل ایک ذرا سی حکم عدولی پر ہرگز ہرگز اس توہین آمیز سلوک کا مستحق نہ تھا۔ مؤرخین نے یہی واقعہ موسیٰ کی معزولی کا باعث لکھا ہے کہ سلیمان نے موسیٰ کو جب وہ افریقہ سے دمشق آرہے تھے، یہ لکھا کہ امیر المؤمنین کا دم واپسیں ہے، لہٰذا تم ایسی رفتار سے سفر کرو کہ خلیفہ کے انتقال کے بعد دمشق پہنچو۔ موسیٰ کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنے آقائے ولی نعمت کی زندگی میں دمشق پہنچیں تاکہ وہ اس کی کارگزاری اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اس لیے وہ عام رفتار سے دمشق پہنچے۔ لیکن اس وقت خلیفہ زندہ تھا اور اس نے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے باوجود موسیٰ کی خدمات کو خوب سراہا اور اس کی بڑی قدر افزائی کی۔ یہ تھی سلیمان کی حکم عدولی جس کی پاداش میں موسیٰ بن نصیر جیسے جرنیل کے ساتھ نہایت توہین آمیز سلوک کیا گیا، برسرعام اس کی سخت تحقیر کی گئی، اور پھر دھوپ میں مجرموں کی طرح انھیں کھڑا کر دیا گیا یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ سلیمان نے یہ سب کچھ دین یا مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ اپنے اندر کی آتش انتقام کو بجھانے، اپنی انا کو مطمئن کرنے اور اپنے نفس کی تسکین کے لیے کیا تھا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ گو ولید کے عتاب کا بنیادی سبب یہی واقعہ تھا، لیکن اس کے ساتھ اور بھی کچھ اسباب اور وجوہ پیدا ہو گئے تھے۔

① ان اسباب میں سے ایک سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ سلیمان کے علی الرغم ولید نے موسیٰ بن نصیر کی

Marfat.com

بڑی عزت افزائی اور قدر دانی کی۔ تین خلعت عطا فرمائے، پچاس ہزار اشرفیوں کا گراں قدر انعام دیا، موسیٰ کے لڑکوں کے مراتب بڑھا دیئے، پانچ سو غلاموں کو عطیات دیئے اور جو معززین، عمائدین اور جرنیل اندلس کی مہم میں شریک جہاد ہوئے ان سب کی قدر افزائی کی۔ (کتاب الامامۃ والسیاسۃ: ۷۲/۱)

اس میں ایک تو سلیمان کے مزاج کے خلاف ہوا دوسری اس داد و دہش میں اندلس کے مال غنیمت کا ایک بہت بڑا حصہ صرف ہو گیا جس کا سلیمان کو بہت افسوس تھا۔ معلوم نہیں یہ صاحب اقتدار لوگ لوگوں کے ٹیکسوں سے جو رقم جبر کے ساتھ اکٹھی کرتے ہیں جب اس رقم کو عوام کی فلاح و بہبود پر صرف کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ عوام کی دی ہوئی رقم عوام پر اس طرح صرف کرتے ہیں جیسے وہ اپنے باپ کی کمائی سے صدقہ یا قرض دے رہے ہوں، اور عوام پر پھر اتنا احسان چڑھاتے ہیں کہ ایک قرض دینے والا بھی اتنا احسان نہیں چڑھاتا۔

(۲) سلیمان اور موسیٰ میں جو گفتگو ہوئی وہ کچھ خوشگوار نہ تھی۔ سلیمان دمشق میں بیٹھا اپنے کو عبدالملک خلیفہ کا بیٹا سمجھتے ہوئے کچھ عجب اور کبر سے موسیٰ سے باتیں کر رہا تھا جیسے موسیٰ خلیفہ کا زرخرید غلام ہے۔ وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی تھے جن کے سامنے سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے اپنی معزولی کے بعد بڑے دھڑلے سے باتیں کی تھیں، لیکن یہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بجائے سلیمان بن عبدالملک تھا جو ایک خلیفہ کا بیٹا اور ایک خلیفہ کا بھائی تھا، وہ موسیٰ بن نصیر کی جرأت مندانہ باتیں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

موسیٰ نے اپنے ایک لڑکے عبدالعزیز کو اندلس کا اور دوسرے لڑکے عبداللہ کو پورے شمالی افریقہ کا گورنر بنا دیا تھا۔ سلیمان اس کو بھی برداشت نہ کر سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شمالی افریقہ سے لے کر فرانس تک کی حکومت سیاسی نقطۂ نظر سے ایک ہی گھرانہ میں اچھی نہیں ہوتی لہٰذا اس نے موسیٰ کو معزز ہونے کا طنز کیا، اور اس کو بتایا کہ تمہارے نزدیک تمہارے بیٹوں کے علاوہ اور کوئی حکومت کا اہل نہیں تھا، تبھی تو تم نے حکومت کو اپنے خاندان میں محدود کر دیا۔ موسیٰ اس کا نہایت اچھا جواب دے سکتے تھے کہ آپ نے بھی تو خلافت کو اپنے خاندان میں محدود کر دیا ہے۔ لیکن انھوں نے سلیمان کی سیاسی حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ جواب نہیں دیا بلکہ جواب میں یہ کہا: ''امیر المومنین! میرے لڑکوں نے اندلس، میورقہ، منورقہ، سردانیہ اور سوس کو اپنے زور بازو سے زیر نگین کیا ہے اس لیے مجھ سے زیادہ معزز کون ہو سکتا ہے۔ سلیمان کو اس کا یہ جواب بھی سخت ناگوار ہوا، اور اس کے غصہ میں اور اضافہ ہو گیا۔

(۳) بعض روایات میں ہے کہ طارق بن زیاد کو موسیٰ بن نصیر سے شکایت تھی، ہو سکتا ہے کہ اس وقت یہ شکایت پیدا ہوئی ہو جب موسیٰ نے طارق کو اندلس میں پیش قدمی سے روکا تھا اور اس نے حالات کے تقاضا کے پیش نظر پیش قدمی جاری رکھی جس سے موسیٰ ناراض ہو گئے۔ طارق نے سلیمان کو اس کے خلاف خیانت کا الزام لگا کر مشتعل کیا۔ موسیٰ بن نصیر بڑا متدین، نیک اور صالح امیر تھا، اس کے

Marfat.com

متعلق کسی خیانت کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن اس بارے میں طارق جیسے شخص کی شہادت جو اندلس کی مہمات میں برابر موسیٰ کے ساتھ رہا تھا، نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ پھر موسیٰ کی زندگی بڑی رئیسانہ اور امیرانہ تھی۔ اس کے ہزاروں غلام تھے۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سلیمان کے دل میں پہلے سے اس کے بارے میں غبار تھا، مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر اس کے دل میں موسیٰ کے بارے میں اور زیادہ بدگمانی اور سوء ظنی پیدا ہو گئی۔ (نفح الطیب: ۱۳۲/۱)

بہر حال سلیمان کے دامن پر یہ دھبہ ضرور رہے گا کہ اس نے موسیٰ بن نصیر پر بڑی زیادتی کی۔ سلیمان کی بریت کے لاکھ عذر پیش کیے جائیں لیکن سلیمان کی زیادتی کو مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

موسیٰ کی زندگی کا تنزل:

موسیٰ کو دھوپ میں کھڑا کر کے اور اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے سلیمان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا اور اس نے اب مسلسل اس پر زیادتیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ گویا سلیمان کی حکومت کی ابتداء موسیٰ کے تنزل کا نقطۂ آغاز تھا۔ اب موسیٰ تیزی سے تنزل کی طرف جا رہا تھا۔ اب کسی میں یہ جرأت و ہمت نہیں تھی کہ اس غریب آفت زدہ کو سلیمان کے غصہ سے اور اس کی زیادتیوں کے تسلسل سے بچا سکے۔ موسیٰ کوئی معمولی شخص نہیں تھے بے شمار دولت انھیں مال غنیمت میں ملی تھی اور وہ عزت و جاہ اور حشم و منزلت میں امرائے دولت میں ایک ممتاز ترین حیثیت کے حامل تھے، لیکن اب سلیمان کے عہد خلافت میں ان کے اس جاہ وحشمت کا باقی رہنا ناممکن اور محال تھا اور شمالی افریقہ سے لے کر فرانس کی سرحدوں تک کا علاقہ اب ان کے خاندان کے زیر حکومت نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ موسیٰ پر فرضی خیانت کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا۔ موسیٰ مجرم قرار پائے اور عدالت کی طرف سے تین لاکھ دینار ان پر جرمانہ کیا گیا۔ موسیٰ نے اپنی ساری املاک اور جائیدادوں کو فروخت کر کے ایک لاکھ دینار ادا کیے۔ دو لاکھ دینار اب بھی ان کے ذمہ باقی تھے۔ اب نوبت یہاں تک آ گئی کہ موسیٰ نے بنو لخم اور دمشق کے دوسرے معززین کے سامنے دست سوال دراز کیا۔ لیکن جرمانہ پھر بھی ادا نہ ہوا۔ پھر سلیمان نے یزید بن مہلب کی سفارش سے باقی ماندہ جرمانہ معاف کر دیا۔ اب وہ ایک ستم زدہ مفلس شہری تھے۔ خدم و حشم اور موالی سب رخصت ہو چکے تھے۔ صرف ایک غلام نے اپنے آقا کا ساتھ نہ چھوڑا۔ موسیٰ کی زندگی کے باقی ماندہ دنوں میں وہ ان کے ساتھ رہا۔

بعض روایات میں ہے کہ سلیمان بن عبدالملک نے موسیٰ پر عتاب کیا، اس کے تمام اموال ضبط کر لیے اور اس پر بھاری (تین لاکھ دینار) جرمانہ عائد کیا۔ یزید بن مہلب نے موسیٰ بن نصیر پر کیے گئے جرمانہ کی ادائیگی کی ضمانت دی اور موسیٰ وہاں سے یزید بن مہلب کے پاس چلے گئے۔ جس نے موسیٰ کا بہت اعزاز و اکرام کیا۔ بعد ازاں سلیمان کو اپنے کیے پر پشیمانی ہوئی تو اس نے جرمانے کی باقی ماندہ رقم معاف کر دی اور موسیٰ کو سلیمان

Marfat.com

کے ہاں بڑی قدرومنزلت حاصل رہی (الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ:۲/۹۷-۱۰۰) ابن عبدالحکم کا بیان ہے کہ یزید بن مہلب کی سفارش پر سلیمان نے نہ صرف موسیٰ کا خون معاف کردیا بلکہ جرمانہ بھی معاف کردیا اور ان پر کوئی چیز عائد نہیں کی۔ سنہ ۹۷ھ میں جب سلیمان حج پر گیا تو موسیٰ کو بھی بڑی عزت واحترام کے ساتھ اپنے ساتھ لے گیا اور موسیٰ نے اس کے ساتھ حج کیا۔ (الامامۃ والسیاسۃ:۲/۱۷۴، ابن خلکان، وفیات الاعیان)

یزید بن مہلب کون تھا؟

یہ شخص جو بعض روایات کے مطابق موسیٰ بن نصیر کے جرمانہ کی معافی کا باعث بنا کون تھا؟ یہ خراسان کے گورنر مہلب کا بیٹا تھا۔ سنہ ۵۳ھ میں پیدا ہوا اور سنہ ۸۲ھ کے آخر میں اس کو اپنے باپ المہلب کی وفات کے بعد خراسان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اپنے طاقتور نسبتی بھائی حجاج بن یوسف سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ چنانچہ سنہ ۸۵ھ میں خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کسی قدر تامل اور غور وفکر کے بعد حجاج کی تحریک پر یزید بن مہلب کو اس کے عہدہ سے معزول کردیا۔ یہ عہدہ پہلے اس کے بھائی مفضل بن مہلب کو دیا گیا تھا، لیکن چند ماہ بعد اس پر قتیبہ بن مسلم ایسے قابل انسان کو فائز کیا گیا۔ اگلے سال خلیفہ عبدالملک وفات پا گئے اور ان کا بیٹا ولید بن عبدالملک ان کا جانشین ہوا۔ اس سال حجاج نے یزید کو قید خانہ میں ڈال دیا جہاں اسے طرح طرح کی ذلتیں برداشت کرنا پڑیں، اور جب اس کی بہن یعنی حجاج کی بیوی ہند نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تو حجاج نے اسے طلاق دے دی۔ سنہ ۹۰ھ میں یزید قید خانے سے فرار ہوکر رملہ چلا گیا جہاں خلیفہ ولید کے بھائی سلیمان کا قیام تھا۔ سلیمان نے اسے پناہ دی اور ولید سے اس کی سفارش کی۔ اب حجاج بھی مجبور ہوگیا کہ اسے امن وچین سے زندگی بسر کرنے دے۔ سلیمان کی جانشینی کے بعد جو سنہ ۹۶ھ میں ہوئی، یزید عراق کا گورنر مقرر ہوا اور اس نے واسط میں اپنا قیام رکھا۔ اب حجاج کے حامیوں کو جو خود اس دوران فوت ہو چکا تھا، اس ظلم وستم کا حساب دینا پڑا جو یزید نے ان کے ہاتھوں اٹھائے تھے۔ پھر جب یزید نے خلیفہ سے درخواست کی کہ اسے محصولات کے انتظام سے سبکدوش کردیا جائے تو سلیمان نے خزانے کے ایک عہدہ دار صالح بن عبدالرحمٰن کو دیوان وزارت کا افسر اعلیٰ مقرر کردیا، لیکن جب یزید نے دیکھا کہ اسے بیت المال سے اس کے حد سے زیادہ بڑھتے ہوئے مطالبات پورے کرنے سے انکار ہے تو اس کی توجہ خراسان کے متصل صوبے کی طرف منعطف ہوئی اور بالآخر وہ خراسان کا گورنر مقرر ہونے میں کامیاب ہوگیا اور عراق کی زمام حکومت بھی اس کے ہاتھ میں رہی۔ خراسان میں اپنی آمد کے فوراً بعد اس نے قتیبہ بن مسلم کے رشتہ داروں اور مقرر کردہ عمال حکومت پر ظلم وستم اور جبر وتعدی کرنا شروع کردیا اور اگلے سال جرجان اور طبرستان کے خلاف ایک مہم کی ابتداء کی۔

جرجان کے باشندوں نے تو کچھ رقم دے کر اپنی جان چھڑالی، لیکن آگے چل کر جب یزید کو بھاری نقصانات اٹھانے پڑے تو انھوں نے بغاوت کردی اور مسلمانوں کے ان محافظ دستوں پر ٹوٹ پڑے جن کو یزید

Marfat.com

اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا، لہٰذا اسے حاکم طبرستان سے صلح کرنا پڑی، البتہ جرجان کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے اس نے وہاں کے باشندوں سے بڑا خوفناک انتقام لیا۔ استحصال بالجبر کی بنا پر اس کو اپنے صوبہ میں نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور کہتے ہیں کہ اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے اس کے احتساب کے لیے کسی شخص کو خراسان بھیجنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ جب سیدنا عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے (صفر ۹۹ھ/ستمبر، اکتوبر ۷۱۷ء) تو یزید کو جرجان اور طبرستان کے خمس کی عدم ادائیگی کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا جس کی مقدار کو اس نے اپنی خودرائی میں خوب بڑھ چڑھ کر بیان کیا تھا۔ خلیفہ کی وفات سے کچھ دن پہلے یا بعد میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ وہ قید خانے سے بھاگ کر بصرہ چلا گیا۔ اور عامل عراق عدی بن اوطاہ فزاری سے گفت و شنید شروع کر دی لیکن گفت و شنید کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا جس کی اس نے خود ہی ابتداء کی تھی تو فیصلہ مسلح قوت پر چھوڑنا پڑا۔ پہلی ہی مڈبھیڑ میں عدی نے بھاگ کر قلعہ میں پناہ لی جسے حملہ کر کے فتح کر لیا گیا اور عدی کو قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد یزید کھلم کھلا امویوں کے خلاف جنگ کی دعوت دینے لگا اور تھوڑی ہی مدت میں واسطہ پر قابض ہو گیا۔ لیکن صفر سنہ ۱۰۲ھ/اگست سنہ ۷۲۰ء کو مسلمہ بن عبدالملک نے جو شام سے ایک بڑی فوج لے کر آیا تھا، اس کو واسطہ کے نزدیک العقر کے مقام پر شکست دی۔ یزید مارا گیا اور اس کے رشتہ دار جہاں کہیں پائے گئے کچل دیئے گئے۔

(ابن خلکان: ۴/۱۶۴، ابن اثیر: ۵/۴، یعقوبی: ۲/۳۶۰، ۳۶۱، ۳۴۴، مسعودی، مروج الذہب: ۵/۴۱۱، ۴۵۳، فتوح البلدان: ص ۱۶۸، ۲۳۱، ۳۳۵)

موسیٰ بن نصیر کی اولاد سے انتقام:

سلیمان نے نہ صرف موسیٰ بن نصیر ہی سے انتقام لیا بلکہ اس کی اولاد کو بھی اپنے انتقام کا نشانہ بنایا اور انھیں تمام حکومتوں سے معزول کر دیا۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں یہ بتایا گیا کہ موسیٰ جب شام آئے تو اندلس میں اپنے بیٹے عبدالعزیز کو حکومت سپرد کر کے آئے تھے۔ عبدالعزیز اندلس کا وہ پہلا حکمران تھا جس نے اندلس میں اسلامی دور میں کشوری نظام حکومت کی بنیاد ڈالی اور جنگوں کے خوفناک اور ہیبت ناک اثرات کو دور کیا۔ ملک میں امن و امان کی فضا پیدا کی۔ عیسائیوں اور دوسری رعایا کے ساتھ حسن سلوک کیا اور حکومت کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک شوریٰ تشکیل دی۔ محاصل کی وصولی کے لیے محصل نامزد کیے اور عدالتی نظام کو نہایت مضبوط بنیادوں پر چلایا۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کے لیے قاضی مقرر کیے۔ غیر مسلم رعایا کے مقدمات ان کے مذہب کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ زراعت کی ترقی کے لیے پوری کوشش کی اور زمینوں کو زرخیز بنانے کے لیے زراعت کے محکمہ کی تجدید کی اور مختلف وسائل اختیار کیے گئے۔ ملک کے دفاع کے لیے جگہ جگہ فوجی چوکیاں اور قلعے تعمیر کرائے اور ملک کی تجارت اور درآمد و برآمد نے اس دور میں بہت ترقی کی۔

جہاں تک حکومت کے انتظام کا تعلق تھا وہ نہایت اعلیٰ طور پر ترتیب دیا گیا۔ اندلس کے مفتوحہ علاقہ کو

Marfat.com

مختلف صوبوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر صوبہ کے گورنر مقرر کیے جو اپنے اپنے صوبوں کے انتظام وانصرام کے مکمل طور پر ذمہ دار تھے۔ پھر اندلس کے غیر مفتوحہ علاقوں میں فوجی پیش قدمیاں جاری رکھی گئیں اور موجودہ پرتگال وسطی اور جنوبی علاقہ کو اسلامی حدود میں داخل کیا گیا۔ بعض شہروں کی بغاوتوں کو فرو کیا اور پھر شمال مغرب میں عبدالعزیز نے اپنی جارحانہ پیش قدمیاں جاری رکھیں۔ چنانچہ عرب مؤرخین نے لکھا ہے:

''اس کی حکومت کے دور میں اندلس کے بہت سے شہر فتح ہوئے اور اس کے حسن تدبیر سے اسلامی سطوت وعظمت کا سکہ جم گیا۔'' (نفح الطیب: ۱/۱۳۲، اخبار الاندلس: ۱/۱۶۲)

عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کی ان مدبرانہ پالیسیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت سمجھ دار اور منتظم حکمران تھا اور اندلس میں اس نے حکومت کو ایک نئی جہت دی۔ یہ سنہ ۹۵ھ میں حکمران ہوا اور سنہ ۹۷ھ میں قتل کر دیا گیا، اس وجہ سے اس کو اندلس پر زیادہ عرصہ حکمرانی کا موقع نہ مل سکا کیونکہ بدقسمتی سے وہ بھی اپنے باپ موسیٰ کی طرح سلیمان بن عبدالملک کا معتوب تھا۔ موسیٰ نے افریقہ، مغرب اور اندلس میں اپنے تینوں بیٹوں کو حکمران بنا دیا تھا، اور وہ تینوں حکمران بننے کے مستحق تھے کیونکہ انھوں نے اپنے علاقوں میں نہایت احسن طریق سے نظام حکومت چلایا، لیکن سلیمان بن عبدالملک یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ ایک خاندان کے تین نوجوان اور وہ بھی معتوب موسیٰ کے بیٹے اتنے وسیع علاقوں کے حکمران ہوں۔ لہٰذا جونہی وہ موسیٰ بن نصیر پر غضبناک ہوا اس نے موسیٰ کے بیٹوں کو بھی معزول کرنے کی ٹھان لی، لیکن ایک مشکل یہ تھی کہ اتنے دور دراز ملکوں کے گورنروں کو جو دسترس سے باہر ہوں، بغیر کسی ظاہری سبب اور اہم وجہ کے معزول کرنا آسان کام نہ تھا جب کہ موسیٰ کے بارے میں سلیمان کے عناد اور اس سے انتقام کی خبر تمام اسلامی دنیا میں مشہور ہو چکی تھی۔ اس لیے سلیمان نے افریقہ اور اندلس کے ممتاز سرداروں سے در پردہ سازش کی اور اس قسم کی خفیہ سازشوں کے ذریعہ ان کو قتل کرانے کا فیصلہ کیا گیا اور ہر جگہ اس کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ عبدالعزیز کو قتل کرانے کے لیے پانچ عرب سرداروں سے ساز باز کی جن میں سے حبیب بن ابی عبیدہ فہری اور زیاد بن نابغہ تمیمی کے نام تاریخ میں موجود ہیں۔

عبدالعزیز بن موسیٰ کے خلاف پراپیگنڈہ:

ہوا یہ کہ ان عرب سرداروں کو عبدالعزیز کے خلاف اندلس کے مسلمانوں کو ایک حیلہ کے ذریعہ برانگیختہ کیا گیا۔ اتفاق سے اندلس کے سابق حاکم راڈرک کی ملکہ ایجیلونا عبدالعزیز کے نکاح میں تھی۔ اندلس پر طارق بن زیاد کے حملہ کے وقت اس ملکہ نے اپنی جان و مال کی بخشش کے بدلہ میں جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔ اس صلح کی وجہ سے اس کی دولت و ثروت اور اعزاز و اکرام میں کوئی زوال نہ آیا تھا۔ علاوہ ازیں اپنی آئندہ اور مستقبل کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے عیسائی مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس نے عبدالعزیز امیر اندلس کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اس نکاح سے ایک لڑکا بھی اس کے بطن سے پیدا ہوا جس کا نام عاصم رکھا گیا اور عرب

Marfat.com

مؤرخین اینجیلونا کو ام عاصم کی کنیت سے یاد کرنے لگے۔

اینجیلونا آخر اندلس کی ملکہ تھی۔ اور عبدالعزیز اس کے حسن و جمال پر فریفتہ اور مفتون تھا۔ اور اشبیلیہ سے باہر کلیسائے ابینہ میں دونوں سکونت پذیر تھے۔ ان عرب سرداروں نے پہلے تو ان دونوں کی الفت و محبت کی داستان کا خوب پراپیگنڈہ کیا اور پھر دو واقعات کی خوب تشہیر کر کے لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ عبدالعزیز عیسائی ہو گیا ہے۔

ایک واقعہ کچھ یوں مشہور کیا گیا کہ ملکہ اینجیلونا نے عبدالعزیز سے ایک روز کہا کہ جب تک سلاطین کے سر پر تاج نہ ہو وہ صحیح معنوں میں بادشاہ نہیں ہوتے کیونکہ جس ماحول میں اس نے آنکھ کھولی تھی وہاں تو تاج پہننے کا رواج تھا۔ پھر راڈرک کی ملکہ تھی اور راڈرک کو اس نے تاج پہنتے ہوئے دیکھا تھا۔ ممکن ہے اس ناطے سے اس نے عبدالعزیز سے ایسا کہا ہو۔ جب یہ بات اس نے کی تو اس کے ساتھ ملکہ نے عبدالعزیز سے یہ بھی کہا کہ میرے پاس جواہرات موجود ہیں۔ ان جواہرات سے میں تمھارے لیے کیوں نہ ایک تاج تیار کرا دوں۔ عبدالعزیز نے اینجیلونا سے کہا کہ یہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں۔ ہمارے ہاں بادشاہ اور حکمران تاج نہیں پہنا کرتے، لیکن اینجیلونا نے اس بارے میں بہت اصرار کیا یہاں تک کہ وہ اس پر حاوی ہو گئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اینجیلونا تاج بنوائے گی۔ وہ تاج دربار میں نہیں پہنا جائے گا بلکہ اینجیلونا نے ایک تاج اپنے پاس سے بنوا کر خود اس کے سر پر اپنے ہاتھوں سے رکھا اور وہ صرف اس کے دل کو خوش کرنے کے لیے دربار میں نہیں بلکہ محل میں خلوت میں اس کے سامنے پہنا کرتا تھا۔ اتفاق سے محل میں ایک تقریب منعقد ہوئی اس میں زیاد بن نابغہ تمیمی کی بیوی گئی، اس نے عبدالعزیز کو مرصع تاج پہنے ہوئے دیکھ لیا اور واپس آ کر اس نے اپنے خاوند زیاد سے اس کا تذکرہ کیا۔ زیاد نے فوج کے افسروں اور جوانوں میں اس بات کا اس طرح پراپیگنڈہ کیا کہ ہر شخص اس تاج سے آشنا ہو گیا۔

دوسرا واقعہ یہ بتایا جاتا ہے اور معلوم نہیں کہ اس میں کس قدر صداقت ہے، لیکن تاج کے رپورٹر یہ بتاتے ہیں کہ ملکہ اینجیلونا نے ایک روز عبدالعزیز سے نہایت تعجب سے پوچھا کہ حکومت کے امراء، عہدہ دار اور افسر جو دربار میں آتے ہیں وہ شاہی آداب بجا نہیں لاتے، کیونکہ ہمارے جو لوگ راڈرک یا کسی اور اندلسی بادشاہ کے پاس دربار میں آتے تھے وہ رسم کے مطابق شاہ اندلس کو سجدہ کرتے تھے۔ یہ رواج اکثر عیسائی ملکوں میں تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے سرداروں اور رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، اور یا رسول اللہ! آپ تو اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم میری قبر سے گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں۔'' فرمایا: ''تو جیتے جی بھی سجدہ نہ کرنا چاہیے۔'' (ابوداؤد)

Marfat.com

لہٰذا ممکن ہے کہ ملکہ نے ایسا کہا ہو لیکن عبدالعزیز نے اس کو بہت سمجھایا کہ اسلام میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے بلکہ شرک ہے کیونکہ سجدہ عبادت ہے اور عبادت سوائے اللہ کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ لیکن عبدالعزیز کی یہ بات ملکہ کے دل میں نہ اتر سکی۔ عبدالعزیز ملکہ پر وارفتہ اور فریفتہ تو تھا ہی اس نے اس کی دلداری اور دل دہی کے لیے اس محل کے دروازہ کو اتنا چھوٹا کر دیا کہ لوگوں کو اس میں گردن جھکا کر داخل ہونا پڑتا تھا۔ اس طرح ملکہ کے دل کی آرزو کسی حد تک پوری ہو گئی۔

یہ روایت معلوم نہیں صحیح ہیں یا غلط لیکن ان کا فوج میں نہایت تیزی کے ساتھ پراپیگنڈہ کیا گیا اور لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ عبدالعزیز بن موسیٰ اب مسلمان نہیں رہا بلکہ عیسائی ہو گیا ہے۔ فوج یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ موسیٰ بن نصیر جو فاتح افریقہ و اندلس ہے، اس کا بیٹا اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت کے دائرہ میں داخل ہو جائے۔ چنانچہ فوج کے ایک خاص دستہ جس کا قائد دربار حکومت کے معتمدین میں سے تھا، عبدالعزیز کے سخت خلاف ہو گیا۔ ایک روز جب کہ وہ صبح کی نماز اس مسجد میں جس کو کلیسائے ابینہ کے پہلو میں اس نے تعمیر کرایا تھا، نماز پڑھ رہا تھا، اور سورۃ الفاتحہ ختم کر کے سورۃ الواقعہ کی قرأت شروع کی تھی کہ سازش کرنے والے ایک دم تلواریں سونت کر آگے بڑھے اور عبدالعزیز کے سر کو اس کے تن سے جدا کر دیا۔ یہ حادثہ رجب سنہ ۹۷ھ/ مارچ سنہ ۷۱۶ء کو رونما ہوا۔

روایات میں ہے کہ حبیب بن ابی عبیدہ نے اس کے سر کو سلیمان کے پاس دمشق بھیج دیا۔ سلیمان نے موسیٰ کو بلا بھیجا اور مقتول کے سر کو طشت میں رکھ کر اس کے سامنے اس طرح پیش کیا جس طرح انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے بچوں کے سر اس کے سامنے رکھے تھے۔ موسیٰ نے اس سر کو دیکھا۔ آخر باپ تھا۔ دل و جگر پر ایک قیامت گزر گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ سلیمان یہاں تک بڑھ جائے گا۔ لیکن موسیٰ بھی ایک بہادر جرنیل تھا۔ اس کی تلوار سے ہزاروں قتل ہوئے اور میدان جنگ میں ہزاروں نہیں لاکھوں قتل ہوتے اس نے دیکھے اور لاکھوں لاشوں کو اس نے زمین پر تڑپتے دیکھا تھا، بیٹے کا سر دیکھ کر وہ رویا نہیں، لیکن غم و غصہ آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپکتا ضرور ہے، اس نے اپنے آنسو ضبط کیے اور نہایت غم زدہ اور کربناک آواز میں کہا:

"هنياله بالشهادة فقد قتلتموه، صواماً قواماً"

''اس کو شہادت نوش کرنا مبارک ہو، بخدا! یہ قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔''

ابن اثیر نے اس واقعہ کے بارے میں لکھا ہے:

"كانوا يعدونها من زلات سليمان"

''عبدالعزیز کے اس قتل کے واقعہ کو لوگ سلیمان کی لغزشوں میں سے ایک لغزش شمار کرتے ہیں۔''

(ابن اثیر: ۲۲/۵ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نفح الطیب: ۱۳۱/۱، اخبار الاندلس: ۲۶۲/۱، افتتاح الاندلس ابن القوطیہ: ص ۱۱ وغیرہ)

بعض روایات میں عبدالعزیز کے قتل کا ذمہ دار انہی عرب سرداروں کو قرار دیا گیا ہے اور سلیمان کے

Marfat.com

دامن کو اس قتل کے چھینٹوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا ہے کہ سلیمان کو جب اس قتل کا علم ہوا تو اس نے قاتلوں کو گرفتار کرایا اور مقدمہ کی تفتیش جاری تھی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں ہر والی نے اس مقدمہ کی تفتیش کا حکم دیا، لیکن اس بارے میں تفتیش نامکمل ہی رہی۔ یہ روایت ہمیں درست معلوم نہیں ہوتی۔ اس زمانہ میں موجودہ زمانہ کی طرح کے لوگ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ حکومت خود ہی کسی بڑی شخصیت کو قتل کروا کر پھر خود ہی اس کے مقدمہ کی تفتیش کرانا شروع کر دیتی۔ اس میں بے گناہ لوگ مرتے اور پکڑے جاتے ہیں لیکن اصل قاتل نہیں ملتے۔

باقی رہے وہ الزامات جو عبدالعزیز بن موسیٰ پر لگائے گئے، ہمارے خیال میں وہ بھی درست نہیں۔ ایک ایسے قائم اللیل اور صائم النہار شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ

"فقالوا تنصر ثم هجموا عليه فقتلوه" (البیان المغرب: ۱/۵۴)

"یہ کہا کہ وہ عیسائی ہو گیا ہے، پھر لوگ اس پر پل پڑے اور اس کو قتل کر دیا۔"

ایک بنائی ہوئی کہانی ہے اور غلط پراپیگنڈے کے تحت لوگوں کو اس کے خلاف کیا گیا۔ یہ سب ان عرب سرداروں کا کام تھا اور ان کے پیچھے وقت کے حاکم کا ہاتھ۔ یہ درست ہے کہ سلیمان بن عبدالملک اخلاقی طور پر ایک اچھا آدمی تھا۔ اور اس کے زمانہ میں اموی حکومت رقبہ کی وسعت اور ترقی کے لحاظ سے اپنے بام عروج پر تھی، اور سلیمان اصلاح کی طرف اپنی توجہ منعطف رکھتا تھا، لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل اصلاح خود اموی عمال تھے جنھوں نے اپنی مطلق العنانی اور مظالم کی وجہ سے اموی خلفاء کو بدنام کر رکھا تھا۔ خود اموی خلفاء کچھ ایسے ظالم اور جابر نہ تھے بلکہ عام دنیوی حکمرانوں کی طرح ان میں اچھے بھی تھے اور برے بھی، لیکن بعد والے حکمرانوں سے یہ بدرجہا بہتر اور اچھے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان سے کچھ ظالمانہ افعال سرزد ہوئے ہوں لیکن ظلم ان کی خصوصیت نہ تھی اس شہرت کا اصل سبب ان کے بعض عمال اور کچھ ان کے ماتحت حکام ظالم اور مطلق العنان تھے اور اموی خلفاء ان کی مطلق العنانی کا وہ تدارک نہ کر سکے جو انھیں کرنا چاہیے تھے۔ سلیمان نے تخت نشین ہوتے ہی اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ اس لیے تخت نشینی کے ساتھ ہی اس نے عمال اور گورنروں کا مواخذہ اور احتساب کرنا شروع کر دیا۔ اس کی خلافت سے پہلے جو لوگ ناحق ان لوگوں نے قید کیے تھے، ان سب کو رہا کر دیا، جلاوطن اشخاص کو واپسی کی اجازت دی۔ اس سلسلہ میں تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ اتنے قیدی رہا ہوئے کہ جیل خانے خالی ہو گئے۔ حجاج بن یوسف خود تو مر چکا تھا لیکن اس کے ماتحت حکام زندہ تھے۔ سلیمان نے ان میں سے اکثر کو معزول کر کے ان کا محاسبہ شروع کر دیا اور بعض کو سزائیں بھی دیں۔ اس میں اس نے اتنی وسعت اور شدت برتی کہ اچھے اور برے عمال میں بھی امتیاز نہیں کیا۔ چنانچہ حجاج کے متعلقین کے سلسلہ میں محمد بن قاسم جیسا نیک اور فاتح جرنیل بھی ناکردہ گناہ کی زد میں آ گیا۔

Marfat.com

موسیٰ بن نصیر کی وفات:

موسیٰ بن نصیر سلیمان کے معتوب ہونے کے بعد اپنی مجاہدانہ زندگی سے یک قلم سبکدوش ہو چکے تھے اور نہایت کسمپرسی اور خلوت کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی۔ آخر سنہ ۹۷ھ میں حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے جا رہے تھے کہ راستہ ہی میں وادی القریٰ میں بیمار پڑ گئے۔ اسی سال کہتے ہیں کہ سلیمان بن عبدالملک بھی اپنے خدم وحشم کے ساتھ حج کے لیے دمشق سے نکلا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ بھی اسی قافلہ کے ساتھ تھے، اور انھیں اپنی وفات کا ایک روز پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اہل قافلہ سے ایک روز پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ''کل ہمارے قافلہ سے ایک شخص اس دنیا سے کوچ کر جائے گا جس کا نام اور کارنامہ مشرق ومغرب میں گونج رہا ہے۔'' یہ سلیمان کی عقل کے لیے موسیٰ کا آخری معنی خیز جواب تھا۔ چنانچہ موسیٰ بیمار ہو گئے اور ان کی یہ بیماری مرض الموت ثابت ہوئی۔ اور اپنے کہنے کے مطابق دوسرے روز ۷۸ برس کی عمر میں ماہ ذی الحجہ سنہ ۹۷ھ میں انھوں نے اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہا۔ موسیٰ بن نصیر اگرچہ جسمانی طور پر اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن اس کے کارنامے زندہ ہیں اور رہیں گے، اور آج بھی ان کے کارناموں کو مشرق ومغرب کی تاریخ لوگوں کے سامنے بیان کرتی ہے۔ گویا کہ موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم جیسے لوگوں کا نام جریدہ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا ہے۔ وہ خود مر گئے لیکن ان کے کارنامے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

طارق بن زیاد کی گمنامی:

طارق بن زیاد موسیٰ کے ساتھ اندلس سے دمشق آئے تھے۔ موسیٰ تو خلافت اموی کے معتوب ہو گئے اور پھر گوشۂ گمنامی میں رہتے ہوئے سنہ ۹۷ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ روایات میں ہے کہ سلیمان کو موسیٰ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا لیکن

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

لیکن اب سلیمان کو پشیمانی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ موسیٰ کی وفات کے بعد اندلس کی ولایت کے لیے سلیمان کی توجہ طارق کی طرف مبذول ہوئی کیونکہ اس قدر فتح کیا ہوا علاقہ خالی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس مفتوحہ علاقہ کے اردگرد تمام عیسائی حکومتیں تھیں، خود اندلس کے عیسائی بھی اندر سے مسلمانوں کی اس حکومت کے سخت خلاف تھے، لہٰذا ضروری تھا کہ وہاں موسیٰ کے بعد کوئی اس جیسا آدمی بھیجا جائے تاکہ وہ مفتوحہ علاقہ کی حفاظت کرے اور غیر مفتوحہ علاقہ کو فتح کرے۔ اس کے لیے طارق سے بہتر اور کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور طارق سے زیادہ موزوں آدمی اور کوئی تھا بھی نہیں کیونکہ اصل میں فاتح اندلس وہی تھا، موسیٰ بن نصیر تو ایک سال

Marfat.com

بعد اندلس گیا تھا جب تک طارق نے اندلس کے کافی اہم شہر فتح کر لیے ہوئے تھے۔ سلیمان ہوسکتا ہے کہ طارق کی ان خوبیوں سے آشنا نہ ہو، اس لیے اس نے مغیث سے رائے طلب کی۔ مغیث اندلس میں طارق کے ماتحت رہ چکا تھا، کچھ اس وجہ سے اسے طارق سے کوئی شکررنجی اور ناراضی تھی۔ اس لیے اس نے ایسا ذومعنی جملہ بولا کہ سلیمان کو طارق کو اندلس بھیجنے کے بارے میں اپنا خیال بدلنا پڑا۔ مغیث نے طارق کے بارے میں کہا:

''طارق کو اندلس میں اس قدر مقبولیت حاصل ہے کہ اگر وہ قبلہ رخ کو چھوڑ کر کسی اور سمت میں نماز پڑھنے کا حکم دے تو لوگ اس کا حکم ماننے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔'' ارباب اقتدار کو اپنے سوا کسی اور کی اتنی مقبولیت برداشت نہیں ہوتی، لہٰذا تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ سلیمان بن عبدالملک نے اس کو واپس اندلس بھیجنے کا اپنا خیال بدل لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طارق کی پوری زندگی گمنامی میں گزر گئی۔ اور پھر وہ پوری زندگی اندلس نہیں آیا لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کی اولاد اندلس ہی میں پھلی پھولی اور اس کی حیثیت یہاں معززین کی رہی لیکن طارق جیسے بہادر جرنیل سے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ طارق گوشۂ خمولت میں بیٹھ گیا اور مؤرخین کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس سال انتقال کر گیا۔

Marfat.com

موسیٰ بن نصیر کے بعد اندلس

موسیٰ بن نصیر شام آتے وقت اپنے لڑکے عبدالعزیز کو اندلس کا والی بنا کر آیا تھا۔ موسیٰ کے معتوب ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس کو بھی سلیمان نے عرب سرداروں کے توسط سے قتل کروا دیا۔ عبدالعزیز بھی اندلس میں ایک حکمران کی حیثیت سے بہت مقبول تھا۔ اس کے قتل کے بعد مشرق میں حکومت بنوامیہ کے خاتمہ تک اندلس کے حکمران کبھی دمشق سے مقرر اور نامزد ہو کر آتے اور کبھی خلافت امویہ کا گورنر افریقہ اس کو اپنی طرف سے نامزد کرتا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اندلس کے مختلف معززین خود ہی کسی کو منتخب کر لیتے اور دمشق یا افریقہ سے اس کی تصدیق آ جاتی۔ چنانچہ عبدالعزیز کے قتل کے بعد اندلس چند دنوں تک کسی والی کے بغیر رہا۔ پھر مسلمانان اندلس نے اتفاق رائے سے موسیٰ بن نصیر کے بھانجے ایوب بن حبیب کو ذی الحجہ سنہ ۹۷ھ/ اگست سنہ ۱۶ ۷ء میں اندلس کا حکمران بنایا۔ ایوب کا تعلق بھی موسیٰ کی طرح لخمی قبیلہ سے تھا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ ایوب نہایت دین دار اور نیک آدمی تھا۔ اس کے عہد حکومت کا اہم واقعہ یہ ہے کہ اس نے اشبیلیہ کو حکومت کا پایہ تخت ختم کر کے قرطبہ کو پایہ تخت بنایا کیونکہ کہتے ہیں کہ ایوب لخمی کو قرطبہ سے کوئی خاص دلی تعلق تھا۔ لیکن اس نے اپنی رائے سے پایہ تخت تبدیل نہیں کیا تھا بلکہ مسلمانان اندلس کے مشورے سے ایسا کیا تھا۔ اس نے اندلس کی حکومت کو صحیح شریعت اسلامیہ کے مطابق چلانے کی کوشش کی، نظم ونسق کو درست کرنے کے لیے تمام مفتوحہ علاقوں کا دورہ کیا۔ بدعنوانیوں کی اصلاح کی، مختلف شہروں کے عاملوں میں ردوبدل کیا۔ جہاں عیسائیوں کی تعداد زیادہ نظر آئی وہاں مسلمانوں اور یہودیوں کو آباد کیا اور سرحدوں پر قلعوں کو مستحکم کیا تا کہ کوئی بیرونی دشمن ملک پر حملہ اور نہ ہو سکے۔ ایوب نے جس نہج پر یہ کام شروع کیا تھا اس سے اندلس کو غیر معمولی فائدہ پہنچتا لیکن دمشق کے ارباب اقتدار موسیٰ بن نصیر کے کسی عزیز اور رشتہ دار اور لخمی خاندان کے کسی فرد کو اندلس میں برسر اقتدار دیکھنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا ایوب بن حبیب کو حکومت کی باگ دوڑ سنبھالے ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ بارگاہ خلافت سے ایوب کی معزولی اور حر بن عبداللہ ثقفی کو حکمرانی کا پروانہ دے دیا گیا۔ جس نے ایوب سے زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ (نفح الطیب: ۵۶/۲، اخبار الاندلس: ۲۶۵/۱)

Marfat.com

حر بن عبدالرحمٰن کی ناکامی اور عیسائیوں کا متحدہ محاذ:

حر بن عبدالرحمٰن اپنی تقرری کا پروانہ لے کر آ تو گیا، لیکن وہ ایک کامیاب حکمران ثابت نہ ہو سکا بلکہ اس کے طرز عمل سے لوگ بددل ہو گئے اور عوام خواہ وہ مسلم تھے یا عیسائی اس سے گلوخلاصی کی کوششیں کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے نظم و نسق میں انارکی اور اتنی جلدی جلدی حکمرانوں کی تبدیلی نے عیسائیوں کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ اپنی قوت فراہم کریں اور اندلس کو مسلمان حکمرانوں سے نجات دلائیں۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے مقبوضہ اور آباد علاقوں سے بہت دور ایک ایسے خطے کو اپنے مرکز کے لیے منتخب کر لیا جس کا جغرافیائی اور قدرتی ماحول ان کے لیے نہایت سازگار تھا۔ اس علاقہ میں پہاڑیوں کی قدرتی قلعہ بندیوں اور غاروں سے فائدہ اٹھا کر عیسائیوں نے ایک خفیہ تنظیم شروع کر دی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں راڈرک کی فوج کا ایک آزمودہ کار گاتھک افسر پلایو (Pelayo) بھی اس علاقہ میں چلا آیا۔ وہ گاتھ کے شاہی خاندان سے تھا۔ اس نے صرف تین سو عیسائیوں کی ایک جماعت تیار کی اور اس مختصر جماعت کے ساتھ پہاڑ کی کھوہ میں جس کا نام کوادونگا (Couadonaga) تھا، پناہ گزین ہو گیا، اور مسلمانوں کے ساتھ خفیہ ریشہ دوانیاں کرنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ عیسائیوں کی تنظیم کو مستحکم کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس جماعت کی خبر جب دوسرے عیسائیوں کو ہوئی تو ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا، اور دوسرے علاقوں کے عیسائی مذہبی جوش و خروش سے سرشار اس علاقہ میں اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ پھر کلیساؤں کے مفرور پادری بھی اپنے کلیسائی تبرکات اپنے ساتھ لیے یہاں آ گئے، اور یہ علاقہ اندلس میں عیسائیوں کا ایک آزاد مرکز بن گیا۔ مسلمانوں کی بے خبری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پلایو کی قیادت میں یہاں عیسائی بہادروں کی ایک اچھی خاصی تعداد اکٹھی ہو گئی۔ عیسائیوں کے اس اجتماع کی خبر سن کر اس علاقہ کے مسلمان حکمران نے ان کو منتشر کرنے کے لیے فوج کشی کی، لیکن جونہی اسلامی لشکر پہاڑی سلسلہ کو عبور کر کے اس وادی میں پہنچا تو پلایو جو پہاڑ کی کمین گاہوں میں چھپا بیٹھا تھا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں کی کمین گاہوں سے نکل آیا اور مسلمانوں پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ اس وادی کے دوسری سمت ایک دریا بہتا تھا، مسلمانوں کے لیے ادھر بھاگنے کا موقع نہ تھا، لہٰذا تیروں کی اس بارش سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ اس لڑائی میں فتح کے بعد پلایو کی تخت نشینی کی رسم انجام پائی اور یہ اسلامی اندلس میں اس نوزائیدہ عیسائی سلطنت کا پہلا فرمانروا قرار پایا۔

عیسائی مؤرخین نے تو اس واقعہ کو بڑی اہمیت دی ہے، لیکن عرب مؤرخین نے اس کو اتنی اہمیت نہیں دی۔ (ملاحظہ ہو نفح الطیب: ۵۱۲/۲، اخبار الاندلس: ۳۴۹/۱) لیکن اس سے انکار نہیں کہ اس حکومت میں ''حکومت آسٹریا'' کی بنیاد قائم ہو گئی جس کی حدود حکومت بقول مسٹر اسکاٹ ابتداءً پانچ میل طویل اور تین میل عریض قطعہ زمین میں تھی۔ (اخبار الاندلس: ۳۴۵/۱)

Marfat.com

حر بن عبدالرحمٰن کے طرز حکومت سے عوام خوش نہ تھے، اس لیے انھوں نے اس کی معزولی کی درخواست دمشق بھیجی جو عمر بن عبدالعزیز نے منظور کر لی اور اس کی جگہ ایک تجربہ کار اور متدین شخص سمح بن مالک خولانی کو رمضان سنہ ۱۰۰ھ میں گورنر بنا کر اندلس بھیجا جس نے اندلس پہنچ کر زمام خلافت ہاتھ میں لی۔

(نفح الطیب: ۵۶/۲، ابن اثیر: ۲۳/۵)

سمح بن مالک خولانی نہایت قابل سپہ سالار تھے۔ افریقہ کا بہت سا علاقہ انھوں نے فتح کیا تھا۔ سلیمان بن عبدالملک انتقال کر چکے تھے اور ان کی جگہ عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر جلوہ افروز تھے۔ انھوں نے سمح بن مالک خولانی کا گورنر کے طور پر تقرر کیا تھا۔ اور دمشق سے ان کو اندلس روانہ کرتے وقت کچھ ہدایات دیں اور انھیں تاکید کی کہ وہ اندلس پہنچ کر اپنی تحقیقات اور مشاہدات سے مرکزی حکومت کو مطلع کریں۔

① اندلس کی زمینیں جن جن نوعیتوں سے فتح ہوئی ہوں، ان کی تفصیلات مرکزی حکومت کو مہیا کریں تاکہ ان زمینوں کے عشر اور خراج کا فیصلہ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں کیا جائے۔

② سرزمین اندلس مرکزی حکومت سے بہت دور ہے اور اسلامی ملکوں سے بھی بہت فاصلہ پر ہے، لہٰذا یہاں کے مسلمانوں کی اجتماعی طاقت اور اس کے استحکام اور تحفظ پر نظر ڈالی جائے۔ اگر مسلمانوں کے لیے وہاں حالات سازگار نہ ہوں تو مسلمان وہاں کی سکونت چھوڑ کر واپس اسلامی ملکوں میں چلے آئیں، اور اندلس کو ان کے قدیم باشندوں کو سپرد کر دیا جائے۔

سمح بن مالک خولانی نے ان دونوں باتوں کے بارے میں سیدنا عمر بن عبدالعزیز کو تفصیل سے لکھا اور اندلس کے حالات سے خود مطمئن ہونے کے بعد سیدنا عمر بن عبدالعزیز کو اندلس میں مسلمانوں کی فوجی و اجتماعی طاقت، آبادی کی کثرت، شہروں کی زیادتی اور ان میں مسلمانوں کی سربلندی، فصیلوں کی مضبوطی اور یہاں کے قلعوں کے استحکامات کی تمام تفصیلات لکھ کر بھیجیں اور مشورہ یہ دیا کہ یہاں کے حالات نہایت اطمینان بخش اور اچھے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے یہاں سے سکونت ترک کرنے کا مشورہ نہیں دینا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے مشورہ کی تحسین فرمائی اور ان کی رائے کو قبول کیا۔ سمح بن مالک نے اندلس میں حکومت کے انتظام و انصرام میں بڑی اصلاحات کیں۔ مالیات کا بہترین انتظام قائم کیا، غیر آباد علاقوں کو بربروں کو افریقہ سے بلا کر یہاں آباد کیا اور ان کو آباد کرانے میں بہت سی مراعات دیں، مختلف شہروں کی پیداوار کی تفصیل، تجارت کے وسائل، سامان تجارت کی فہرست اور بندرگاہوں معدنی اور زرعی صلاحیتوں کی تمام تفصیلات قلم بند کرائیں۔

موسیٰ بن نصیر کے بعد سمح بن مالک خولانی نے فرانس پر دوسرا حملہ کیا۔ فرانس کی سرزمین مسلمان گھوڑوں کی ٹاپوں اور مسلمان فاتحین کے قدم پہلے ہی چوم چکی تھی۔ اب یہ حملہ دوسرا تھا۔ اس حملہ میں سمح نے جنوبی فرانس کے علاقہ ناربونین سس پر تاخت کی۔ یہ علاقہ اس دور کے ممتاز متمدنی ترقیوں سے بھی اونچا دکھایا ہے۔ اس کے علاوہ فرانس کے اور بھی کئی شہروں کو فتح کیا۔ سمح بن مالک اندلس سے چل کر اربونہ پہنچے۔ یہ شہر

Marfat.com

موسیٰ کے زمانہ میں چند دنوں کے لیے مسلمانوں کے قبضہ میں رہ چکا تھا۔ موسیٰ بن نصیر کے واپس دمشق جانے کے بعد اندلس کے لوگوں نے اس پر پھر قبضہ کرلیا تھا۔ اس مرتبہ بھی یہ شہر نہایت آسانی سے فتح ہوگیا۔ موسیٰ کی نرم حکمت عملی کی وجہ سے گزشتہ مرتبہ یہاں کی دولت و ثروت کو ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا، لیکن اس مرتبہ مجاہدین کلیسا ہی دولت کے مرکز ہوتے تھے پھر آس پاس کے چند قلعوں پر قبضہ کیا۔ اور شہر کی فصیل اور قلعوں کی مرمت کر کے مستقل اقامت اختیار کی۔ یہ شہر اسی (۸۰) برس تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ اس عرصہ میں فرانسیسی فرمان رواؤں نے کئی بار اس شہر پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے حملے کیے لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی اور ہر مرتبہ پسپا ہونا پڑا۔

اس علاقہ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے والی طاقت صرف ڈیوک آف ایکوٹین کی تھی۔ اس لیے سمح بن مالک نے دوسرے شہروں کو اپنے حال پر چھوڑ کر مغربی علاقہ میں صوبہ اکوتانیہ (ایکوٹین) کا رخ کیا۔ اس کا پایہ تخت طلوشہ تھا۔ سمح نے طلوشہ کی دیوار کے نیچے پہنچ کر سختی سے محاصرہ کرلیا۔ اتفاق کی بات ان دنوں ڈیوک آف ایکوٹین کسی مہم میں فوج لے کر باہر گیا ہوا تھا۔ وہ بے خبری میں اپنے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کی پشت پر آ گیا۔ اب مقابلہ سخت تھا۔ چنانچہ دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ امیر سمح بن مالک نے اس جنگ میں جام شہادت نوش کیا۔ ان کے شہید ہوتے ہی مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ باقی ماندہ سپاہیوں نے فوج کے ایک ممتاز قائد عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی کو اپنا امیر بنالیا۔ عبدالرحمٰن غافقی اگرچہ فنون سپاہ گری میں ماہر تھے اور اس دور کے ممتاز اہل علم میں سے تھے، لیکن اس وقت مسلمان طلوشہ میں بری طرح گھرے ہوئے تھے اور عبدالرحمٰن کے لیے بھی اس محاصرہ کو توڑنا از حد مشکل تھا۔ لیکن جب سمح کی شہادت اور مسلمانوں کے گھر جانے کی اطلاع قرطبہ پہنچی تو قائم مقام والیٔ قرطبہ نے فوری طور پر ایک امدادی لشکر بھیجا لیکن وہ منزل تک نہ پہنچ سکا، اور عبدالرحمٰن غافقی اپنی دانائی اور تدبر سے اس لشکر کو گھیرے سے نکال لائے۔ اور اسلامی لشکر طلوشہ سے اربونہ واپس آ گیا، لیکن جونہی جنوبی فرانس کے لوگوں کو مسلمانوں کی اس شکست کا علم ہوا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ اربونہ کے آس پاس کے چھوٹے شہر اور قلعے خودسر ہو کر باغی ہو گئے، لیکن غافقی نہایت تجربہ کار جرنیل تھے۔ انھوں نے پیش قدمی کر کے ان بغاوتوں کی سرکوبی کی۔

مختصر یہ کہ سنہ ۹۷ھ میں عبدالعزیز بن موسیٰ کو قتل کرنے کے بعد اندلس کی حکومت تشتت و انتشار کا شکار رہی اور سنہ ۱۳۹ھ تک اس کو سیاسی استحکام نصیب نہ ہوسکا۔ اس عرصہ میں قریباً ۱۴ حکمران آئے لیکن سال دو سال سے زیادہ کوئی بھی حکومت نہ کرسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو خود مسلمانوں میں سر پھٹول شروع ہوگئی۔ اور دوسرے ملکی نظم و نسق ڈھیلا ہونے کی وجہ سے ملک میں عیسائیوں میں بھی بغاوت کے آثار پیدا ہوگئے۔

عرب اور بربر دونوں طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کے ساتھ اندلس گئے تھے۔ ان کے بعد بھی افریقہ سے یہی لوگ امدادی فوج کی شکل میں اندلس جاتے۔ بربر طبعاً آزادی پسند تھے، بدویت کے تمام

Marfat.com

خصائل ان میں موجود تھے۔ ان کا مرکز افریقہ اور مغرب تھا، اور یہ جابرانہ حکومت کو کسی حال میں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ افریقہ میں بربروں کو تلوار کی طاقت سے فتح نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آخر کار ان کے دلوں کو اسلام کی تعلیمات کو پیش کر کے مسخر کیا گیا، اس لیے ان میں مساوات کا صحیح تصور بھی پیدا ہو چکا تھا جو معاشرتی زندگی کے لیے اسلام کا جوہر ہے۔ اس وجہ سے بربر کسی صورت بھی اپنے اوپر عربوں کا تفوق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ معاشرتی زندگی اور حکومتی زندگی میں مساوات کے طلب گار تھے۔ لیکن قیسی اور کلبی عرب قبائل ان کے ساتھ ایک طرح سے رعایا کا سا برتاؤ کرتے تھے جس سے ان کے دل کو ٹھیس لگتی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سرکشی کے جذبات پنپنے لگے اور آخر کار وہ خوفناک اور ہیبت ناک بغاوت ہوئی کہ افریقہ کا چپہ چپہ عربوں اور بربوں کے خون سے رنگین ہو گیا۔ اس ہنگامہ نے عربوں کے اقتدار کو ختم کر دیا۔ اندلس بھی چونکہ افریقہ کے ماتحت تھا۔ یہاں بھی بربر اور عرب قبائل آباد تھے لہٰذا اس چپقلش کا اثر یہاں بھی پہنچا اور یہاں بھی بربروں اور عربوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی اور ایسی بدامنی پھیلی کہ مسلمانوں کی ساری ترقیاں یک دم رک گئیں اور لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور ان باہمی خانہ جنگیوں کا سلسلہ ایسا جاری ہوا جو دراصل عبدالرحمٰن الداخل کے اندلس میں ورود سے پہلے ختم نہ ہو سکا۔ اس سے اندلس کی اسلامی حکومت کو سخت نقصان پہنچا۔

اندلس کے اردگرد کی عیسائی حکومتیں اسلامی حکومت کے سیاسی عدم استحکام سے پوری طرح آشنا تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کیونکہ ملک میں مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف ایک ہیجانی کیفیت تھی۔ چنانچہ سنہ ۷۳۷ء میں چارلس مارٹل نے پرووینس کی باجگزار اسلامی ریاست پر فوج کشی کی۔ یوسف نے اس کا مقابلہ لیا لیکن ناکام رہا اور وہ ریاست اسلامی حلقہ اطاعت سے باہر ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے قبضۂ اقتدار سے نکل گئی۔

اندلس میں یہ سیاسی ہیجان اپنے پورے عروج پر تھا کہ افریقہ کے والی نے ایک دوسری ستم ظریفی یہ کی کہ عقبہ بن حجاج سلولی جیسے دوراندیش، ہوش مند اور تجربہ کار گورنر کی خدمات سے اس کو محروم کر دیا اور اس کو افریقہ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے افریقہ بلا لیا۔ اندلس سے عقبہ کا ہٹنا تھا کہ یہاں کے حالات پہلے سے بھی زیادہ دگرگوں ہو گئے۔ بربروں نے اندلس میں بھی بغاوت کر کے اس کا رشتہ افریقہ سے منقطع کر دیا اور ایک مدنی قائد عبدالملک بن قطن فہری کو سنہ ۱۲۱ھ میں اپنا والی بنا کر اندلس کی آزاد حکومت کی تاسیس کا اعلان کر دیا۔

مسلمانوں کی اس باہمی خانہ جنگی سے اسلامی اندلس کو پہلا نقصان تو سرزمین فرانس میں چارلس مارٹل کے ہاتھوں پہنچا۔ دوسری پلایو کے جانشینوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ پلایو تو خود نامرادی کے عالم میں سنہ ۱۱۹ھ مطابق ۷۳۷ء میں مر گیا لیکن اس کے بعد اس کا بیٹا فاویلا (Favila) اس کا جانشین مقرر ہوا۔ فاویلا ایک سور کا شکار کرتے ہوئے سور کے حملہ میں ۷۳۹ء میں مارا گیا۔ اس کے لڑکے تو ابھی چھوٹے تھے، اس لیے اس کی جانشینی کے لیے نظر انتخاب الفانسو (Alphanso) پر پڑی جو پلایو کا داماد اور ڈیوک آف کنٹبریا کا بیٹا

Marfat.com

تھا۔ الفانسو نے اس زمانہ میں جب گورنر عقبہ کو افریقہ بلایا گیا اور اسلامی اندلس میں زبردست انتشار پیدا ہوا تو اس نے جلیقیہ پر قابض ہو کر موجودہ پرتگال کے بعض شہروں پر بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ اور بادشاہ کا لقب اختیار کر کے حکومت کرنے لگا۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: ۱/۷۴۲)

مختصر یہ کہ سنہ ۱۳۸ھ تک موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز کے قتل کے بعد ایک خلفشار اور انتشار کی حکومت تھی جس سے حکومت اسلامی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

یہ تھی وہ مختصر داستان جو موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے اندلس چھوڑنے کے بعد پیش آئی۔ پھر ۱۳۸ھ میں عبدالرحمٰن الداخل اندلس میں وارد ہوا اور اس نے یہاں کے حالات کو درست کیا اور سنہ ۱۷۱ھ تک بلاشرکت غیرے اندلس پر حکومت کی۔ اس نے شارلمین کی قوت کو ختم کیا، عام بغاوتوں کا استیصال کیا، عیسائی حکومتیں جو شمالی اندلس میں تھیں، انھوں نے اطاعت قبول نہیں کی تھی اور شمال میں پہاڑیوں کے لمبے سلسلہ کو اپنا مسکن بنا لیا تھا، ان کو اطاعت پر مجبور کیا۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے عبدالرحمٰن نہ صرف اندلس کی عظیم الشان اسلامی سلطنت کا بانی بنا بلکہ مغرب میں ایک ایسی نئی تہذیب وتمدن کی بنیاد ڈالنے والا ثابت ہوا جو قرون وسطیٰ میں دنیا کی معیاری تہذیب کی حیثیت سے تسلیم کی گئی، جس کی تفصیل جلد چہارم میں آ رہی ہے۔

Marfat.com

فتوحات

سلیمان بن عبدالملک کے دور میں جہاں دنیا کے بہترین جرنیلوں کو ناحق اپنے انتقام کا نشانہ بنایا گیا وہاں بعض فتوحات بھی ہوئیں۔ جرجان اور طبرستان کے علاقے پہاڑی اور دشوار گزار تھے۔ کوئی ان پر فوج کشی کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک اولوالعزم، جرأت منداور بہادر جرنیل سیدنا سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے فوج کشی کی تھی لیکن وہ انھیں فتح کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ البتہ مصالحت کے ذریعہ خراج وصول کرلیا تھا لیکن ادھر عرصہ سے دونوں علاقوں نے خراج روک کر خراسان کا راستہ بند کر دیا تھا۔

قتیبہ کے بعد جب یزید بن مہلب خراسان کی گورنری پر مامور ہوا تو سنہ ۹۸ھ میں اس نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ جرجان پر فوج کشی کی اور سب سے پہلے قہستان کا محاصرہ کیا۔ یہ علاقہ پہاڑی تھا۔ قہستانی پہاڑی قلعوں سے نکل کر لڑتے تھے اور جب وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کمزور پڑنے لگتے تو پھر پہاڑیوں میں گھس جاتے۔ اس لیے یہ مسلمان فوج کے لیے دردسر بنے ہوئے تھے۔ یزید نے ناکہ بندی کر کے ان کی رسد پہنچنے کا راستہ بند کر دیا۔ رسد بند ہونے کے باعث یہ صلح پر مجبور ہو گئے اور یزید بن مہلب نے شہر میں داخل ہو کر بہت سی دولت بھی حاصل کی اور بہت سے آدمیوں کو بھی گرفتار کر لیا۔

قہستان کو فتح کرنے کے بعد یزید بن مہلب نے جرجان کا رخ کیا۔ یہاں کے باشندے قہستان کا انجام دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ لہٰذا وہ جنگ نہیں چاہتے تھے اس وجہ سے انھوں نے خود پیش قدمی کر کے صلح کر لی اور سامان رسد سے اسلامی فوج کی بڑی مدد کی اور اس پہاڑی علاقے میں انھیں اس مدد کی ضرورت بھی تھی۔

ایک روایت یہ ہے کہ قہستان کو فتح کرنے اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ لگنے کے بعد یزید جرجان پہنچا۔ جرجان کے حکمران نے ویلم سے مدد مانگی۔ ویلم پوری قوت کے ساتھ اہل جرجان کی مدد کے لیے آیا اور دونوں فوجوں میں سخت معرکہ ہوا۔ اسلامی لشکر کے ایک بہادر ابن ابی سبرہ نے بڑی جواں مردی کا ثبوت دیا۔ ایک روز کسی ترک سردار سے ان کی مبارزت ہوئی۔ ترک نے ان کے سر پر تلوار کا وار کیا۔ اس کی تلوار ان کے خود میں الجھ کر رہ گئی۔ انھوں نے اسی حالت میں پلٹ کر ترک پر جوابی حملہ کیا اور اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس مبارزت سے فراغت کے بعد یہ اسلامی لشکر میں اس حال میں داخل ہوئے کہ ان کی تلوار سے خون کے

Marfat.com

قطرے ٹپک رہے تھے اور خون کی تلوار ان کی کلاہ افتخار کا طرۂ امتیاز بنی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر یزید بن مہلب کی زبان سے بے اختیار نکل گیا: ''میں نے اس سے بہتر منظر کبھی نہیں دیکھا، یہ کون بہادر ہے؟'' لوگوں نے بتایا کہ یہ ابن ابی سبرہ ہے۔ یزید نے کہا یہ شخص بہترین تھا اگر اسے شراب کی لت نہ ہوتی۔ آخر اسی بہادر نے شاہ دلیم کا سرتن سے جدا کیا۔ شاہ ویلم کے قتل سے حریف کے پاؤں اکھڑ گئے اور مجبوراً شاہ جرجان کو بیش قرار فدیہ دے کر سیدنا سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے زمانہ کی شرائط پر صلح کر لی۔

اس جنگ میں جو بیش قرار زر و جواہر مسلمانوں کے ہاتھ آیا اسی میں ایک مرصع تاج بھی تھا۔ یزید بن مہلب کی خدمت میں جب وہ تاج پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ کیا کوئی شخص ایسا بھی ہوسکتا ہے جسے یہ تاج دیا جائے اور وہ اسے نگاہ میں نہ لائے لوگوں نے کہا ایسا کون ہوسکتا ہے جو اس قدر قیمتی تاج کو نگاہ میں نہ لائے۔ یزید نے ایک رضا کار محمد بن واسع کو بلایا اور اس کو یہ تاج بطور عطیہ کے پیش کیا۔ محمد بن واسع نے جونہی یہ تاج دیکھا تو کہا کہ مجھے کی اس کی ضرورت نہیں۔ یزید بن مہلب نے قسم کھا کر کہا کہ تمھیں ضرور لینا ہوگا۔ محمد بن واسع نے تاج لے لیا اور اپنے خیمہ کی راہ لی۔ راستہ میں اسے ایک سائل ملا اور اس سے کچھ مانگا۔ محمد نے بے تکلف وہ تاج اس کے حوالے کر دیا۔ جب یزید کو یہ خبر ہوئی تو اس نے مال کثیر دے کر اس سائل سے تاج واپس لے لیا۔ (البدایہ والنہایہ: ۷۵/۹)

ان فتوحات نے یزید کے حوصلے کو بڑھاوا دیا اور وہ عبداللہ بن معمر یشکری کو چار ہزار مسلمانوں کے ساتھ جرجان میں چھوڑ کر طبرستان کی طرف بڑھا۔ یہاں کے حاکم نے بھی مقابلہ کی طاقت نہ پا کر مصالحت کا پیغام بھیجا، لیکن یزید پر فتح کا نشہ چھایا ہوا تھا اس لیے صلح سے انکار کر دیا اور خود طبرستان کی طرف بڑھ گیا اور اپنے بھائی ابو عیینہ اور اپنے لڑکوں کو فوج دے کر آگے روانہ کر دیا۔ حاکم طبرستان مجبور ہو کر مقابلہ میں آیا۔ پہاڑ کے دامن میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ ابو عیینہ نے ناعاقبت اندیشی سے پہاڑ کی چڑھائی پر تعاقب کیا۔ شکست خوردہ طبرستانیوں نے اوپر پہنچ کر تیر اور پتھر پھینکنے شروع کر دیے۔ مسلمان نیچے تھے اس لیے وہ ان کے پتھروں اور تیروں کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اور بہت سے آدمی پہاڑ سے گر کر ضائع ہوئے، بے شمار زخمی ہوئے اور جو بچ گئے وہ کسی نہ کسی طرح یزید کے پاس پہنچے۔

طبرستان والوں کے لیے یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس سارے علاقے میں مسلمانوں کی یہ پہلی ناکامی تھی۔ اس سے حاکم طبرستان کا دل بڑھ گیا اور اس نے حاکم جرجان کو بھی اس بارے میں بڑھاوا دیا اور خط و کتابت کر کے جرجان میں مسلمانوں کے خلاف بغاوت کرا دی۔ اہل جرجان نے شب خون مار کر چار ہزار مسلمانوں کو جو جرجان میں تھے، قتل کر دیا اور جرجان اور خراسان کے درمیان جو راستہ تھا اس کو بند کر دیا تاکہ مسلمانوں کو خراسان سے کسی قسم کی کوئی مدد نہ مل سکے۔ دوسری طرف طبرستان نے بھی ناکہ بندی کر دی اور مسلمان ہر طرف سے محصور ہو کر رہ گئے۔

Marfat.com

اسلامی فوج میں عجمی مسلمان بھی تھے حیان نبطی سے کہا گیا کہ اس مصیبت سے خلاصی اور رہائی کی تم ہی کوئی صورت نکالو اور طبرستان کے حاکم اور وہاں کے باشندوں کو کسی طرح مصالحت پر آمادہ کرو۔ وہ اگرچہ عجمی تھا لیکن تھا تو مسلمان اور مسلمانوں کا خیر اندیش تھا، لہٰذا اس نے طبرستان جا کر وہاں کے حاکم سے مصالحت کی گفتگو کی۔ اس نے حاکم طبرستان سے کہا کہ اگرچہ مذہب نے ہم دونوں کو جدا کر دیا ہے لیکن میں تمھاری قوم کا ہی ایک فرد، تمھارا خیر خواہ اور خیر اندیش ہوں۔ یزید نے خراسان سے فوجیں طلب کی ہیں جن کا مقابلہ تمھارے بس سے باہر ہے۔ اس لیے تم لوگوں کو میرا یہ خیر خواہانہ مشورہ ہے کہ فوراً مسلمانوں سے صلح کر لو۔ اس سے تم لوگ محفوظ ہو جاؤ گے اور یزید کے انتقام کا رخ تمھارے بجائے جرجان کی طرف پھر جائے گا۔ حاکم طبرستان نے اس موقع کو غنیمت جانا کیونکہ اس کو یہ فتح حادثۃً ہوئی تھی۔ اس میں اس کی فوج کی شجاعت اور بہادری کو کوئی دخل نہیں بلکہ ابن عیینہ کی حماقت اور ناعاقبت اندیشی کو دخل تھا اس لیے حاکم طبرستان نے بھی اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے بہت سا نقد مال اور جنس دے کر صلح کر لی۔

طبرستان کی طرف سے یزید بن مہلب کو جب اطمینان ہو گیا تو اب اس نے جرجان کا رخ کیا۔ جرجان پہنچ کر اس نے جرجان کے باغیوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ لوگ حسب دستور پہاڑیوں سے نکل کر مقابلہ کرتے تھے اور جب کمزور پڑتے تو قلعوں میں گھس جاتے۔ مسلمان فوجیوں کو قلعوں تک پہنچنے کا راستہ معلوم نہ تھا، اس لیے کئی ماہ تک کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ پھر حسن اتفاق سے اسی نواح کا ایک واقف کار اور آشنا مل گیا۔ اس نے مسلمانوں کو قلعہ کا راستہ بتایا بلکہ قلعہ تک لے گیا۔ یہاں تک پہنچتے ہی ایک طرف سے یزید بن مہلب نے اور دوسری طرف سے خالد بن یزید نے حملہ کر دیا۔ اہل قلعہ بالکل مطمئن بیٹھے ہوئے تھے۔ حملہ کا معاملہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس ناگہانی حملہ کی وہ تاب نہ لا سکے اور پسپا ہو کر قلعہ میں گھس گئے۔ یزید نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ جب محصورین کے لیے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہ گیا تو انھوں نے مجبوراً سپر ڈال دی، یزید نے ان سے چار ہزار مسلمانوں کے قتل اور ان کی عسکری قوت کی کمر بالکل توڑ کر رکھ دی۔ اور بغاوت کے خطرہ کے انسداد کے لیے شہر جرجان میں مسلمانوں کی ایک پوری بستی جو چھاؤنی کی حیثیت رکھتی تھی قائم کی۔ اور جہم بن قیس کو یہاں کا حاکم بنا کر یزید خراسان واپس آ گیا۔ (ابن اثیر: ۳۱۰/۵)

قسطنطنیہ پر حملہ:

سلیمان بن عبدالملک کے دور کا ایک اہم واقعہ بازنطینی حکومت کے پایۂ تخت قسطنطنیہ پر حملہ ہے۔ یہ حکومت سرکار دو عالم ﷺ کے زمانہ سے لے کر اب تک مسلمانوں کی سب سے بڑی حریف چلی آ رہی تھی۔ مشرق وسطیٰ سے تو اس حکومت کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانوں سے نکال دیا گیا تھا۔ اب یہ سمٹ سمٹا کر یورپ میں رہ گئی تھی اور اب اس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ چلا آ رہا تھا۔ قسطنطنیہ ایک نہایت محفوظ شہر تھا کیونکہ اس

Marfat.com

کے اردگرد ایک نہایت پختہ اور مضبوط فصیل تھی جو اس قسم کے خطرات میں اہل شہر کی حفاظت کرتی تھی۔ دونوں حکومتوں کی سرحدیں بعض مقامات پر آپس میں ملتی تھیں۔ مسلمانوں کے بہت سے علاقے بحر روم کے ساحل پر تھے، اس لیے ان دونوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی سرحد پر معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں اس کے مقابلہ کے لیے ''صائفہ'' کے نام سے ایک مستقل فوج قائم کر دی تھی جو ہر سال گرمیوں کے موسم میں رومیوں سے برسر پیکار رہتی تھی۔ انہی کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے رومیوں کی قوت توڑ دی جائے اور مسلمانوں کے لیے براعظم یورپ کا دروازہ کھول دیا جائے۔ چنانچہ سنہ ۴۹ھ اور بعض روایات کے مطابق سنہ ۵۰ھ میں انھوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا لیکن یہ مہم ناکام رہی حالانکہ اس مہم میں بڑے بڑے صحابہ سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ وغیرہ بھی شامل تھے۔ اس کے بعد کسی خلیفہ نے ادھر توجہ نہ کی لیکن رومیوں سے آویزش کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

جس زمانہ میں سلیمان بن عبدالملک مسند خلافت پر بیٹھا اس زمانہ میں قسطنطنیہ کی اندرونی حالت خراب تھی۔ نسطاط دوم کے زمانہ سے جو خانہ جنگی طوائف الملوکی اور انارکی بپا ہوگئی تھی، اس کا سلسلہ شیدوس سوم تک برابر قائم رہا۔ اس اندرونی انارکی کے باعث سلیمان بن عبدالملک کو پھر قسطنطنیہ پر حملے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ سنہ ۹۰ھ میں اس نے بڑے اہتمام سے فوج کشی کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ ساری تیاریاں قسطنطنیہ کے اندرونی خلفشار، افراتفری اور انارکی کے باعث ہو رہی تھیں کیونکہ ۲۰ سال کے اندر چھ قیصر تخت نشین ہو کر معزول ہو چکے تھے۔ انھیں کسی مدبر و منتظم بادشاہ کی ضرورت تھی جو اس وقت رومی قوم کے بیڑے کو اسلامی حملہ کے طوفان سے صحیح وسلامت لے کر نکل جائے۔

قسطنطنیہ پر حملے کے لیے بہت زیادہ فوج اکٹھی کی گئی۔ تمام ممالک محروسہ سے فوجیں جمع کی گئیں اور ہر طرح کے آلات حرب وضرب، قلعہ اور فصیل شکن اسلحہ، آتش گیر مادے اور سامان رسد کے ذخیرے فراہم کر کے سلیمان نے اپنے بھائی مسلمہ کو ایک لشکر جرار جس کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے، یہ ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر خشکی کی راہ سے اور اسی تعداد کا دوسرا لشکر سمندر کے راستہ سے قسطنطنیہ کی طرف بڑھا۔ خشکی کے راستہ جانے والے لشکر کو سلیمان قنسرین تک پہنچانے کے لیے وہ خود گیا۔ اور مسلمہ کو رخصت کرنے کے بعد فوج کی خبر گیری اور امداد کے لیے وہ وابق میں ٹھہر گیا اور اس مہم کے انجام تک وہ یہیں مقیم رہا۔ مسلمہ بری اور بحری دونوں سمتوں سے قسطنطنیہ کی طرف بڑھا۔ بحری بیڑا بحر اسود کی سمت روانہ ہوا، اور خود مسلمہ خشکی کی راہ سے ایشیائے کوچک سے ہوتا ہوا بڑھا۔ عموریہ میں لیون سوم (Leon III) جو آگے چل کر قسطنطنیہ کے تاج وتخت کا مالک ہوا، اس سے ملا اور وعدہ کیا کہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ کرا دے گا۔ چنانچہ مسلمہ بن عبدالملک عموریہ سے اس کی راہ نمائی میں قسطنطنیہ پہنچا۔ اس درمیان میں بحری بیڑا بھی پہنچ گیا تھا۔ مسلمہ نے بحری اور بری دونوں طرف سے محاصرہ کر کے قسطنطنیہ کا راستہ بند کر دیا تاکہ باہر سے اہل شہر کو کوئی امداد اور رسد وغیرہ نہ پہنچنے پائے اور وہ

Marfat.com

مجبور ہو کر مطیع و منقاد ہو جائیں۔

مسلمہ اس عزم کے ساتھ آیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ کو فتح کیے بغیر واپس نہ جائے گا، اس لیے وہ سامان رسد کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ساتھ لایا تھا۔ پھر بھی اس نے آس پاس کی افتادہ زمینوں میں کھیتی کرادی تا کہ اگر محاصرہ طویل ہو جائے تو فوج کو سامان رسد کی قلت پیدا نہ ہو۔ اس اہتمام کے ساتھ کئی ماہ تک محاصرہ قائم رہا۔ اس دوران میں بحری اور بری جھڑپیں بھی ہوتی رہیں۔ اہل قسطنطنیہ کچھ دنوں تک تو مدافعت کرتے رہے۔ پھر مسلمانوں کے عزم صمیم کو دیکھ کر مصالحت پر آمادہ ہو گئے لیکن مسلمہ نے مصالحت سے یک قلم انکار کر دیا۔

تیدوس سوم بالکل نا اہل تھا۔ حکومت کا اندرونی نظام سنبھالنے کی اس میں کوئی اہلیت نہیں تھی۔ اس لیے قسطنطنیہ کے باشندوں نے مجبور ہو کر لیون سے جس کی شجاعت اور بہادری کا کافی شہرہ ہو چکا تھا، مدد طلب کی۔ ایک روایت یہ ہے کہ لیون نے خود انھیں کہلا بھیجا کہ اگر تاج و تخت اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ مسلمانوں کو قسطنطنیہ سے ہٹا دے گا۔ دوسری طرف اس نے مسلمہ کو یقین دلا رکھا تھا کہ اگر اسے قسطنطنیہ کی حکومت مل گئی تو وہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لے گا، اور وہ قسطنطنیہ کا خزانہ بھی اس کے حوالے کر دے گا اس لیے مسلمہ اس کے اور اہل قسطنطنیہ کے درمیان نامہ و پیام میں مزاحم نہ ہوا بلکہ اس کی ہر طرح سے حمایت کی۔ تیدوس سوم کی نا اہلی کے باعث اہل قسطنطنیہ نے لیون کی یہ شرط منظور کر لی اور اسے بلا کر حکومت اس کے حوالے کر دی۔ (ابن اثیر: ۴/۱۰۱، کتاب العیون والحدائق: ص ۳۳)

لیون کون تھا؟

قبل اس کے کہ ہم قسطنطنیہ کی اس مہم کے بارے میں کچھ مزید بیان کریں پہلے یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ لیون کون تھا؟ لیون اناطولیہ کا ایک معمولی باشندہ تھا۔ وہ شام میں پیدا ہوا۔ عرب مؤرخین نے اسے عموریہ کا بطریق لکھا ہے۔ جس زمانہ میں قسطنطنیہ میں انارکی اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، یہ شخص قسطنطنیہ پہنچا۔ آدمی دلیر اور حوصلہ مند تھا اور کئی کارناموں میں اس نے بڑا نام پیدا کیا تھا، اور نسطاس کے زمانہ میں مشرقی فوجوں کا سپہ سالار بنا دیا گیا تھا۔ پھر تیدوس کے پر آشوب اور انارکی کے دور میں اسے تخت و تاج کی طمع پیدا ہوئی لیکن شاہی خاندان سے چونکہ اس کا کوئی تعلق نہ تھا اس وجہ سے وہ تاج و تخت حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اس کی آرزو کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے مسلمہ کو برانگیختہ کیا اور اسے قسطنطنیہ پر قبضہ کرا دینے کا وعدہ کیا۔ تیدوس سوم چونکہ ایک نکما اور نا اہل شخص تھا اور وہ اپنے ملک کے اندرونی نظام کو سنبھال نہیں سکتا تھا اس لیے مسلمہ کے حملہ کی صورت میں اس کی کامیابی کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔ انگریز مؤرخین نے لیون کی یہ ساری سرگزشت نہیں لکھی۔ انھوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ مسلمہ کے قسطنطنیہ کے حملہ کے وقت وہاں کا حاکم لیون تھا اور اسی نے مسلمان فوج کی مدافعت کی تھی۔ ایک روایت یہ ہے کہ لیون عشی مسلمہ کی فوج میں ایک بہادر

Marfat.com

اور چالاک سردار تھا جو قسطنطنیہ کی اس مہم میں مسلمہ کا مشیر کار اور معتمد علیہ تھا۔ رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان نامہ و پیام بھی اس کے ذریعہ ہوتا تھا۔ رومیوں نے اس سے خفیہ طور پر معاہدہ کرلیا کہ اگر وہ مسلمانوں کو ناکام لوٹا دے تو وہ اسے رومی بازنطینی حکومت کا فرماں روا تسلیم کرلیں گے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب وہ مسلمہ کے ایلچی کی حیثیت سے قسطنطنیہ سے واپس آیا تو اس نے مسلمہ سے کہا:

''رومی قسطنطنیہ کو چھوڑنے کے لیے تیار ہیں مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ لشکر اسلامی محاصرہ اٹھا کر دور چلا جائے تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ اپنا ساز و سامان لے کر شہر سے چلے جائیں۔ مسلمہ نے کسی قدر تامل کے بعد لیون عشی کے اعتماد پر اس تجویز کو قبول کرلیا۔''

اسلامی فوجوں کے ہٹتے ہی رومیوں نے مسلمانوں کی خوراک کے تمام ذخائر کو راتوں رات شہر میں منتقل کرلیا اور فصیل بھی جہاں جہاں سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی تھی، اس کی مرمت کرلی اور لیون کو اپنا حاکم بنا کر مسلمانوں کے مقابلے پر نئے سرے سے صف آرا ہوگئے۔

لیون عشی نے مسلمہ سے بہت بڑا فراڈ کیا اور اس طریقہ سے اس نے ایک طرف تو مسلمان فوج کو سخت نقصان پہنچایا اور دوسری طرف قسطنطنیہ میں تخت نشین ہوگیا۔ لیون کی خوش قسمتی سمجھیے کہ تخت نشینی کے بعد ہی قدرت کی جانب سے مسلمانوں کی شکست کے اسباب پیدا ہوگئے کیونکہ قسطنطنیہ کی فتح سلطان محمد فاتح کے مقدر میں تھی نہ کہ مسلمہ بن عبدالملک کی قسمت میں۔ عرب یورپ کی سردی کے عادی نہ تھے۔ اتفاق سے اس سال غیر معمولی برف باری اور سردی پڑی جس کو مسلمان برداشت نہ کرسکے اور ہزاروں آدمی نمونیہ کا شکار ہوکر مر گئے۔ محاصرہ کی طوالت کے باعث سامان رسد بھی ختم ہونے کے قریب تھا اور جو تھا وہ رومیوں نے مسلمانوں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر قبضہ کرلیا۔ مسلمان فوجوں نے اپنے قیام کے اردگرد کی زمینوں پر جو کھیتی کی تھی، وہ برف باری کی کثرت نے برباد کردی اور کچھ جنگ کی مصروفیت کے باعث مسلمان اس کی دیکھ بھال نہ کرسکے۔ اس وجہ سے سامان رسد کا سخت قحط پڑ گیا اور مسلمان بھوکے مرنے لگے۔ سلیمان بن عبدالملک ایشیائے کوچک کی سرحد پر موجود تھا لیکن برف باری کی کثرت کے باعث وہ بھی مدد نہ کرسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں مسلمان لقمۂ اجل ہوگئے۔ یہ سب کچھ سپہ سالار فوج کی ایک معمولی سی غلطی کی وجہ سے ہوا۔ وہ غلطی یہ تھی کہ جب مسلمانوں نے عزم و ہمت اور استقلال کے ساتھ محاصرہ کیا تو اس محاصرہ کے باعث اہل قسطنطنیہ سخت پریشان ہوئے۔ وہ بہرصورت مسلمانوں سے صلح کرنا چاہتے تھے لیکن مسلمہ نے صلح سے انکار کردیا۔ انھوں نے لیون کو کہا کہ اگر تم مسلمانوں کا محاصرہ اٹھوا دو اور ان کو یہاں سے رخصت کردو تو ہم آدھا ملک تم کو دے دیں گے۔ لیون اس پر رضامند ہوگیا۔ وہ مسلمہ کا معتمد علیہ تھا۔ اس نے مسلمہ کو مشورہ دیا کہ اگر تم اپنے غلہ کے انباروں اور کھیتوں کو آگ لگا دو گے تو رومی لوگ یہ سمجھیں گے کہ اب مسلمان فیصلہ کن جنگ کرنے پر تیار ہوگئے ہیں، لہٰذا امید ہے کہ وہ فوراً شہر آپ کے سپرد کردیں گے۔ مسلمہ لیون کے اس چکمے میں آگیا حالانکہ اس سے

Marfat.com

پیشتر رومی مسلمہ کے پاس یہ پیغام بھیج چکے تھے کہ ہم سے فی کس ایک اشرفی کے حساب سے جزیہ لے لو اور محاصرہ اٹھا کر چلے جاؤ لیکن مسلمہ ان کی اس درخواست کو رد کر چکا تھا۔ چند روز اور محاصرہ جاری رہتا تو قسطنطنیہ کے فتح ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کو ابھی منظور نہ تھا کہ مسلمان قسطنطنیہ پر قابض ہوں۔ چنانچہ مسلمہ نے غلہ کے انباروں اور کھیتوں کو آگ لگا دی جس پر رومی بہت خوش اور مدافعت پر دلیر ہو گئے اور لیون لشکر اسلام سے جدا ہو کر رومیوں سے جا ملا۔ اس مصیبت پر مستزاد یہ ہوا کہ بلقانیوں نے ایڈریانوپل کی مسلمان فوج کو برباد کر دیا۔ لیکن ان سب مصائب کے باوجود مسلمان فوج کے عزم واستقلال میں فرق نہ آیا اور وہ ان مصائب میں محصور ہو کر بھی دشمن سے جنگ کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ جو لوگ باقی بچے وہ طرح طرح کے مصائب کا شکار ہوئے۔ سلیمان بن عبدالملک جو اسلامی لشکر کی مدد کے لیے مرج دابق میں مقیم تھا، اسی دوران میں اس کا انتقال ہو گیا۔ عمر بن عبدالعزیز اس کے جانشین منتخب ہوئے۔ آپ نے مسلمہ کو واپسی کا حکم دیا۔ چنانچہ اسلامی لشکر جان و مال کے کثیر نقصانات اٹھا کرنا کام واپس آ گیا۔

ولی عہدی:

سلیمان بن عبدالملک نے اپنے بیٹے ایوب کو اپنا ولی عہد بنایا تھا لیکن جب ایوب فوت ہو گیا اور سلیمان مرج دابق کے مقام پر علیل ہوا تو اس نے مشہور محدث رجاء بن حیوہ سے مشورہ کیا کہ میں کس کو اپنی جانشینی کے لیے نامزد کروں۔ پہلے تو سلیمان نے اپنے بیٹے داؤد کا نام لیا۔ رجاء بن حیوہ نے کہا کہ وہ تو قسطنطنیہ کے محاصرہ میں مصروف اور کفار سے نبرد آزما ہے۔ عرصہ سے وہاں کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اللہ جانے وہ زندہ ہے یا شہید ہو گیا ہے۔ ادھر فاصلہ زیادہ ہے۔ ایسے شخص کو ولی عہد بنانے کا مشورہ میں نہیں دے سکتا۔ پھر سلیمان نے کہا کہ میں اپنے چھوٹے بیٹے کو ولی عہد بنا دوں۔ رجاء بن حیوہ نے کہا کہ وہ صغیر السن ہے۔ وہ اس قابل نہیں کہ خلافت کا بار گراں اٹھا سکے۔ سلیمان نے کہا کہ پھر تم بتاؤ کہ میں کس کو اپنا ولی عہد اور جانشین بنا کر جاؤں۔ رجاء بن حیوہ نے کہا کہ مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور آپ کی نیک و پاک باطنی اور دین داری کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ آپ اپنے چچازاد بھائی عمر بن عبدالعزیز کو اپنا ولی عہد بنائیں کیونکہ اس سے بہتر کوئی شخص آپ کو نہیں مل سکتا۔ نیز وہ آپ کے وزیر اعظم ہونے کے باعث امور مملکت کے بارے میں ہر نشیب و فراز سے واقف اور ہر قسم کا کافی تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ سلیمان نے محدث رجاء کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ میں عمر بن عبدالعزیز کو سب سے بہتر سمجھتا ہوں لیکن مجھے خدشہ یہ ہے کہ میرے بھائی اس پر راضی نہ ہوں گے اور وہ عمر بن عبدالعزیز کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوں گے اور عمر کو کاروبار حکومت چلانا مشکل ہو جائے گا۔

رجاء بن حیوہ نے کہا کہ آپ عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ بنا کر ساتھ ہی یہ بھی وصیت کر دیجیے کہ ان کے

Marfat.com

بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوگا۔ سلیمان نے اس مشورہ کو بہت پسند کیا اور عمر بن عبدالعزیز کے لیے ولی عہدی کا فرمان لکھ کر اس پر اپنی مہر لگا دی۔ اس کاغذ کو ایک لفافہ میں بند کر کے اس لفافہ کو بھی سربمہر کر دیا اور رجاء بن حیوہ کو دے کر کہا کہ باہر جاؤ اور یہ لفافہ دکھا کر کہو کہ امیر المؤمنین نے اس لفافہ میں اپنے بعد خلیفہ ہونے والے شخص کو تقرر کر دیا اور فرمان لکھ کر رکھ دیا ہے۔ جس شخص کا نام اس فرمان میں ہے اس کے لیے بیعت کرو۔ جب رجاء بن حیوہ نے باہر جا کر لوگوں کو اکٹھا کر کے یہ حکم سنایا تو لوگوں نے کہا کہ ہم بیعت اس وقت کریں گے جب کہ ہم کو اس شخص کا نام بتایا جائے۔ رجاء بن حیوہ نے آ کر سلیمان سے یہ کیفیت بیان کی۔ سلیمان نے اسی وقت حکم دیا کہ کوتوال شہر اور پولیس کو بلا کر حکم دو کہ لوگوں سے میرے حکم کے مطابق بیعت لیں اور جو شخص انکار کرے اس کی گردن اڑا دیں۔ یہ حکم سنتے ہی سب نے بیعت کر لی اور کسی نے کوئی چوں وچرا نہ کی۔

بعض روایات میں ہے کہ سلیمان کو یہ خیال تھا کہ لوگ اور خصوصی طور پر میرے خاندان والے عمر بن عبدالعزیز کی جانشینی کو ہرگز تسلیم نہیں کریں۔ لیکن رجاء بن حیوہ نے اسے یقین دلایا کہ لوگ عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کو مان لیں گے۔ چنانچہ اسی وقت سلیمان نے خود اپنے قلم سے یہ وصیت نامہ لکھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ تحریر اللہ کے بندے امیر المؤمنین سلیمان کی جانب سے عمر بن عبدالعزیز کے لیے ہے۔ میں نے اپنے بعد تم کو خلیفہ بنایا اور تمھارے بعد یزید بن عبدالملک کو۔

مسلمانو! ان کا کہنا سننا اور ان کی اطاعت کرنا، اللہ سے ڈرنا، آپس میں اختلاف پیدا نہ کرنا کہ دوسرے تم پر حرص وطمع کی نگاہ ڈالیں۔''

اس وصیت نامہ پر مہر لگا کر رجاء کے سپرد کیا اور یہ حکم دیا کہ اہل خاندان کو اکٹھا کر کے بغیر نام ظاہر کیے ہوئے ان سے نامزد کردہ خلیفہ کی بیعت لے لیں۔ انھوں نے فوراً اس کی تعمیل کی۔ سب نے بالاتفاق ''سمعنا واطعنا'' کہا، اس کے بعد پھر سب کے سب سلیمان کو دیکھنے کے لیے گئے اور ان کے سامنے سب نے فرداً فرداً بیعت کی۔'' اس مرحلہ سے فراغت کے بعد سلیمان کا انتقال ہو گیا۔

رجاء بن حیوہ جب بیعت لے کر واپس آ رہے تھے تو راستہ میں ہشام بن عبدالملک ملا اور اس نے کہا کہ مجھ کو یہ خوف معلوم ہوتا ہے کہ امیر المؤمنین نے کہیں مجھ کو محروم ہی نہ رکھا ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھے بتا دو تا کہ میں اپنا کچھ انتظام کر لوں۔ رجاء نے کہا کہ امیر المؤمنین نے مجھ کو سربمہر لفافہ دیا ہے اور سب سے اس بات کو پوشیدہ رکھا ہے، لہٰذا میں تمھاری بات کا کیا جواب دے سکتا ہوں۔ آگے چل کر اتفاقاً عمر بن عبدالعزیز مل گئے۔ انھوں نے کہا کہ مجھ کو بڑا ہی خوف معلوم ہو رہا ہے کہ کہیں سلیمان نے ولی عہدی کے لیے میرا ہی نام نہ لکھ دیا ہو۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو مجھے بتا دو تا کہ میں کوشش کر کے اس مصیبت کو ٹالوں اور خلافت کے اس بارگراں سے سبک دوشی حاصل کروں۔ رجاء نے ان کو بھی وہی جواب دیا جو ہشام بن عبدالملک کو دیا تھا۔

Marfat.com

وفات:

سلیمان بن عبدالملک سنہ ۹۸ھ میں دمشق سے جہاد کے ارادے سے نکلا اور قسطنطنیہ کی طرف فوج روانہ کر کے خود مقام وابق میں مقیم رہ کر اس مہم کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتا رہا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک کی حالت جہاد ہی میں موت آئی۔ ۱۰ ماہ صفر المظفر سنہ ۹۹ھ بروز جمعہ سلیمان نے وابق کے مقام متصل قنسرین پر وفات پائی۔ اس نے قریباً پونے تین سال (یعنی دو سال آٹھ ماہ) کاروبار خلافت چلایا اور ۴۵ سال کی عمر پائی۔ بنوامیہ کے اس خلیفہ کے زمانہ میں بھی ولید کی طرح مسلمانوں کو ملکی فتوحات حاصل ہوئیں۔ خلاف شرع کاموں کا رواج ختم ہوا۔ حجاج کے عاملوں اور متوسلوں کو جہاں کہیں وہ مامور تھے، موقوف اور معزول کر دیا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد بن قاسم کے ساتھ جو معاملہ ہوا، اس میں سلیمان سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے نزدیک قابل مواخذہ ہے۔ سلیمان بن عبدالملک کے قابل تعریف کاموں اور عظیم الشان کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین بنایا۔ اس ایک نیکی کے مقابلہ میں سلیمان بن عبدالملک کی تمام غلطیوں اور لغزشوں کو بڑی آسانی سے گلدستہ طاق نسیان بنایا جا سکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس عظیم الشان کام کے باعث وہ مدح و ستائش کا مستحق ہے۔

اولاد:

انتقال کے بعد دس لڑکے یادگار چھوڑے۔ یزید، قاسم، سعید، عثمان، عبداللہ، عبدالواحد، حارث، عمرو، عمر اور عبدالرحمٰن۔

Marfat.com

سلیمانی دور خلافت پر تبصرہ

سلیمان بن عبدالملک کا دور خلافت اگرچہ بیرونی فتوحات کے لحاظ سے زیادہ کامیاب نہیں تھا لیکن اندرونی اصلاحات اور ترقی کے لحاظ سے سابقہ اموی خلفاء سے بہت ممتاز تھا۔ پھر وہ اپنے ذاتی اوصاف و خصائل کے لحاظ سے بھی دوسرے خلفاء کے مقابلہ میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل تھا۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ تھا، دین داری، نیکی، حق پرستی اور اہل علم کی محبت کی طرف اس کی طبیعت کا میلان تھا اور کتاب و سنت کا اتباع اور احکام شریعت کا اجراء اس کی زندگی کا مطمح نظر تھا۔

وہ ظلم کے سخت خلاف تھا اگرچہ غیر شعوری طور پر اس سے بھی بعض فعل ایسے سرزد ہو گئے جن میں ظلم کی جھلکیاں عیاں تھیں۔ اس نے حکومت پر بیٹھتے ہی ان تمام قیدیوں کی رہائی کے لیے احکام جاری کر دیئے۔ جن کو ولید نے بعض معمولی اور بعض ناکردہ گناہوں کی وجہ سے پس دیوار زنداں کیا ہوا تھا۔ چنانچہ تمام جیل خانے قیدیوں سے خالی ہو گئے۔ وہ اپنی رعایا کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا تھا اور تمام جابر، ظالم اور رعایا سے بدسلوکی کرنے والے حکام کو اس نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی معزول کر دیا۔ اس کے ان نیک کارناموں کے باعث لوگ اسے "مفتاح الخیر" (یعنی خیر کی کنجی) کے نام سے یاد کرتے تھے۔

سلیمان کے عہد خلافت میں اگرچہ ریاست کی پنہائیوں اور حدود و ثغور میں اتنا اضافہ نہیں ہوا لیکن ریاست میں اندرونی ترقی اتنی ہوئی جو ناقابل بیان ہے بلکہ مال و دولت کی اس فراوانی کے ساتھ جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں ان کی طرف توجہ کی ضرورت تھی، اس لیے سلیمان کی توجہ زیادہ تر اسی جانب رہی۔ اس کے اپنے خیالات بھی مصلحانہ تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ عمر بن عبدالعزیز جیسا پاک طینت اور پاک سیرت وزیر و مشیر اسے مل گیا۔ اس لیے مسند خلافت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی اس نے اصلاح کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو اس نے قیدیوں کو جیلوں سے رہا کیا۔ چنانچہ ان کی رہائی سے تمام جیلیں خالی ہو گئیں اور حکومت اور فوائد کے علاوہ مالی لحاظ سے بھی بہت فائدہ ہوا۔ اس سلسلہ میں دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ اموی عمال کی اصلاح کی طرف توجہ کی کیونکہ انھوں نے مطلق العنانی کے باعث عوام پر ظلم و تشدد کر کے اموی خلفاء کو بدنام کر رکھا تھا حالانکہ وہ خلفاء خود ظالم نہ تھے۔ ان میں اگرچہ برے بھی تھے لیکن اچھے بھی تھے۔ اور انسان ہونے کے ناطے ممکن ہے ان

Marfat.com

سے کچھ شعوری اور غیر شعوری طور پر کچھ ظالمانہ افعال سرزد بھی ہوئے ہوں لیکن حجاج بن یوسف، عبیداللہ بن زیاد اور ان کے ماتحت سخت گیر حکام نے ان خلفاء کو کچھ زیادہ ہی بدنام کر رکھا تھا، اور ظالم و جابر حکام اور عمال کے مظالم بھی ان خلفاء کی طرف منسوب ہوتے تھے۔

سلیمان بن عبدالملک نے مسند خلافت پر بیٹھنے سے قبل ہی اس حقیقت کو جان لیا تھا، لہٰذا اس نے خلافت کی مسند پر بیٹھتے ہی ان عمال اور حکام کا مواخذہ اور محاسبہ شروع کر دیا۔ ان لوگوں کے ناحق قید کیے گئے لوگوں کو رہا کیا اور جو لوگ جلاوطن کیے گئے تھے ان کو وطن واپس آنے کی اجازت دے دی۔ البتہ حجاج کے متعلقین کے سلسلہ میں محمد بن قاسم جو نہایت نیک سرشت اور نیک طینت نوجوان تھا، ناکردہ گناہ کی زد میں آ گیا۔ موسیٰ بن نصیر پر جو عتاب ہوا وہ بھی دراصل اس کی مطلق العنانی کے باعث ہوا کیونکہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کافی حد تک مطلق العنان ہو چکا تھا۔ ولید تو اس کی مطلق العنانی کو برداشت کرتا رہا لیکن سلیمان برداشت نہ کر سکا اور اس کا سخت محاسبہ اور مواخذہ کیا۔ کیونکہ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بڑے بڑے فاتحین روپے پیسے کے صرف کرنے میں حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور وہ احتیاط نہیں برتتے جو کہ مال و دولت کے خرچ کرنے میں برتنی چاہیے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر بھی اسی وجہ سے گرفت کی تھی۔ سلیمان نے موسیٰ بن نصیر سے افریقہ کے خراج کے بقایا کا مطالبہ کیا، اور جب وہ اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکا تو اسے نظر بند کر دیا۔ یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ سلیمان کے اس برتاؤ میں اس کے جذبۂ انتقام کو بھی دخل ہو، لیکن اصولی اعتبار سے جو کچھ کیا گیا وہ اپنی جگہ بالکل درست اور صحیح تھا۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ عام مؤرخین نے سلیمان بن عبدالملک کے اس محاسبہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ مغربی مؤرخین کے معاندانہ بیانات پر مبنی ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے صرف اس قدر لکھا ہے:

''سلیمان موسیٰ بن نصیر سے ناراض تھا اس لیے اس نے اسے نظر بند کر دیا اور اس سے کثیر رقم کا مطالبہ کیا۔ موسیٰ اس نظر بندی کی حالت میں سفر حج میں سلیمان کے ساتھ تھا کہ اس نے ۸۰ سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔'' (البدایہ والنہایہ: ۱۷۴/۹)

پھر موسیٰ اگرچہ نظر بند تھا پھر بھی وہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا معتمد علیہ اور قابل بھروسہ آدمی تھا اور اہم امور میں وہ اس سے مشورے کرتا رہتا تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کا دور خلافت کا سب سے اہم کارنامہ غزوہ قسطنطنیہ سارا اسی کے مشوروں کا رہین منت ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''غزوہ قسطنطنیہ کے یہ تمام انتظامات موسیٰ بن نصیر کے مشورہ سے جب وہ بلاد مغرب سے واپس آیا تھا، عمل میں آئے۔'' (البدایہ والنہایہ: ۱۷۹/۹)

حیرت کا مقام ہے کہ ایک طرف حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بقول سلیمان موسیٰ کی رائے پر دو لاکھ چالیس ہزار مسلمانوں کی جانوں کی بازی لگا دیتا ہے اور خود بھی مستقر خلافت سے مرج دابق میں زندگی کے آخری لمحات

Marfat.com

پورے کرتا ہے اور دوسری طرف بقول ایس پی سکاٹ موسیٰ کی اس کے دربار میں پوزیشن یہ ہے کہ
''موسیٰ کی جائداد ضبط ہوتی ہے۔ دو لاکھ دینار جرمانہ کیا جاتا ہے۔ پھر اسے دھوپ میں پابہ زنجیر کھڑا کرنے کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ وہ دربار خلافت میں کبھی نہ پھٹکے۔ اس کے بعد وہ اپنے ایک غلام کو ساتھ لے کر اپنے وطن چلا جاتا ہے، جہاں وہ بدوؤں سے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی گمنامی کے پردہ میں ختم ہو جاتی ہے۔'' (اخبار الاندلس، سکاٹ: ۱۴۹/۱)

کس کا یقین کیجیے کس کا یقین نہ کیجیے
لائے ہیں بزم یار سے دونوں خبر الگ الگ

نماز اول وقت میں:

فوجی جرنیلوں اور گورنروں سے احتساب اور مواخذہ کے لیے جو کہ ایک نہایت اچھا اقدام تھا، سلیمان نے کچھ مذہبی اصلاحات بھی کیں جن میں ایک نماز کا اول وقت میں پڑھنا تھا۔ اموی خلفاء عموماً نماز تاخیر سے پڑھا کرتے تھے، سلیمان نے اول وقت نماز پڑھنے کا اہتمام کیا۔

مکہ مکرمہ میں چشمہ کا اجراء:

ان اصلاحات کے علاوہ سلیمان نے اور بہت سے مفید اور رفاہِ عام کے کام کیے۔ مکہ مکرمہ میں میٹھے پانی کی بڑی قلت تھی۔ سلیمان نے میٹھے پانی کا ایک چشمہ جاری کرایا۔ یہ چشمہ خالد بن عبداللہ گورنر مکہ کی زیرنگرانی جاری کرایا گیا۔ اس کے لیے کوہِ ثبیر کے دامن میں ایک بڑا تالاب بنایا گیا تھا اور اس سے سیسہ کے نل کے ذریعہ حرم میں پانی لایا گیا تھا جو زمزم کے کنویں کے درمیان سنگ رخام کے فوارے میں گرتا تھا۔ اس کے افتتاح کی تقریب میں گورنر مکہ خالد بن عبداللہ نے تمام اہل مدینہ کی دعوت کی۔ اس چشمہ کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں آب شیریں کی افراط ہوگئی۔ لیکن زم زم کے مقام میں اس کی مقبولیت نہ ہوئی۔ (یعقوبی: ۵۳۵/۲)

شام میں ایک شہر رملہ آباد کیا۔ ولید کے زمانہ میں جب کہ سلیمان فلسطین کا گورنر تھا۔ اسے رملہ کی جائے وقوع اور اس کی آب و ہوا بہت پسند آئی۔ اس زمانہ میں اس نے اپنے قیام کے لیے وہاں چند عمارتیں تعمیر کروائیں۔ جب وہ مسند خلافت پر بیٹھا تو اس رملہ شہر کو بڑی ترقی دی۔ وہاں بہت سی عمارتیں، جامع مسجد، تالاب وغیرہ بنوائے۔ اس شہر کی آبادی کو بڑھانے کے لیے وہاں لوگوں کو منتقل ہونے کی ترغیب دی۔ کچھ سرکاری عمارتیں بھی بنوائیں اور جو لوگ وہاں منتقل ہوئے انھوں نے بھی اپنی رہائش کے لیے وہاں بہت سے مکانات بنوائے جس سے یہ اچھا خاصہ شہر بن گیا۔ سلیمان خود اکثر و بیشتر رملہ ہی میں رہتا تھا، اس لیے اسے دارالخلافہ کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ (معجم البلدان، یاقوت حموی ذکر رملہ)

Marfat.com

سلیمان کا طرز عمل اہل مدینہ اور قریش کے ساتھ نہایت فیاضانہ تھا۔ سنہ ۹۷ھ میں جب وہ حج بیت اللہ کے سلسلہ میں مدینہ منورہ گیا تو اس نے اہل مدینہ میں بہت سا مال تقسیم کیا، اور خاندان قریش میں چار ہزار وظائف مقرر کیے لیکن ان کے حلیفوں اور موالی کو نظر انداز کر دیا۔ قریش نے کہا کہ ہمارے موالی اور حلیف ہم سے زیادہ مقدم ہیں اس لیے ہمارے یہ وظائف ان کی طرف منتقل کر دیے جائیں۔ اس بات پر سلیمان نے ان کے وظائف تو برقرار رکھے البتہ ان کے موالی اور حلیفوں کے وظیفے علیحدہ مقرر کر دیے۔ (یعقوبی: ۲/۳۵۲)

سب سے بڑا کارنامہ:

یہ سب کارنامے ایک طرف، اگرچہ یہ بھی بڑے کارنامے تھے لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ عمر بن عبدالعزیز کی ولی عہدی تھی جنھوں نے خلافت کو پھر خلافت راشدہ کے قالب میں ڈھال دیا۔ اس نیکی اور سعادت میں سلیمان کا بھی ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

Marfat.com

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ

ابتدائی حالات:

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا تعلق خاندان بنو امیہ سے تھا۔ نام عمر، کنیت ابوحفص اور باپ کی طرف سے نسب نامہ یہ ہے: عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن الحکم بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی بن کلاب۔ ان کی والدہ ام عاصم بنت عاصم بن عمر بن خطاب تھیں۔

(سیر اعلام النبلاء، ذہبی: ۱۱۴/۵۔۱۱۱۵، البدایہ والنہایہ: ۱۹۲/۹، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال لمزی: ۴۳۳/۲۱)

گویا سیدنا عمر رحمہ اللہ کی رگوں میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا خون بھی شامل تھا، اسی وجہ سے ان کے عہد خلافت میں فاروقی اصلاحات بہت ہوئیں اور آپ نے حکمت انھیں بنیادوں اور اسی نہج پر چلانی شروع کی جو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قائم کی تھیں اور مرور زمانہ کے باعث بعض لوگوں نے ان کو پامال کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے عہد خلافت میں خلافتی اصولوں کی تجدید کی۔ اس وجہ سے آپ مجدد ملت بھی ہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صداقت، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی عدالت، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی حیا اور سیدنا علی کا زہد آپ کی خلافت کے اجزائے ترکیبی تھے۔ آپ کے عہد خلافت میں خلافت راشدہ کا دور پھر واپس آیا جس کے بنیادی اصول سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے وضع کیے تھے۔

پیدائش:

روایات کے مطابق آپ کی پیدائش ۶۱ھ میں یزید بن معاویہ کے عہد خلافت میں مدینہ منورہ میں ہوئی (سیر اعلام النبلاء: ۱۱۵/۵، حسن المحاضرہ للسیوطی: ۲۰۴/۲) اگرچہ بعض حضرات نے سن پیدائش میں اختلاف کیا ہے لیکن زیادہ معتبر روایت یہی ہے۔ علامہ مزی نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن داؤد فرماتے ہیں: طلحہ بن یحییٰ رحمہ اللہ، اعمش رحمہ اللہ، ہشام بن عروہ رحمہ اللہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سنہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے میدان کربلا میں جام شہادت نوش فرمایا تھا اور خلیفہ بن خیاط نے بھی اپنی تاریخ ص ۲۳۵ میں لکھا ہے کہ آپ سنہ ۶۱ھ

Marfat.com

میں پیدا ہوئے۔ (تہذیب الکمال:۲۱/۴۳۶) آپ کے والد عبدالعزیز کو مروان رضی اللہ عنہ نے عبدالملک کے بعد اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کا خلیفہ ہونا منظور نہیں تھا اس وجہ سے وہ عبدالملک کی زندگی ہی میں اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرما گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عبدالعزیز کو بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ اپنے خاندانی اوصاف و کمالات کے حامل تھے اور مختلف مہمات میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ والد کے دست راست اور سائے کی طرح ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ باپ کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد سیدنا مروان رضی اللہ عنہ نے جب مصر پر لشکر کشی کی تو عبدالعزیز کو ایلہ پر متعین کیا۔ مصر پر قبضہ کرنے کے بعد سیدنا مروان رضی اللہ عنہ یہاں دو ماہ مقیم رہے۔ دو ماہ کے بعد آپ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو یہاں کا گورنر بنا کر خود شام واپس آ گئے۔ (کتاب الولاۃ کندی:۴۷،۵۴،۵۵) عبدالعزیز نے نہایت اچھے طریقے سے مصر کا انتظام کیا۔ لوگ ان سے نہایت خوش تھے۔ اس وجہ سے سیدنا مروان رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے عبدالملک بن مروان نے ان کو مصر کی گورنری کے عہدہ پر برقرار رکھا اور انھوں نے یہاں ۲۱ سال گورنری کرنے کے بعد ۸۶ھ میں انتقال فرمایا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اتنی طویل گورنری مصر میں کسی اور کو کم ہی نصیب ہوئی ہے۔

عبدالعزیز کو اسلام اور اسلامی اقدار اور اسلامی شعائر سے بہت محبت تھی۔ رعایا کے ساتھ آپ کا نہایت اچھا سلوک تھا۔ اہل علم و دانش اور علماء و فقہاء اور ارباب کمال کی نہایت قدر کرتے تھے۔ قاضی عبدالرحمن بن حجیرہ خولانی جو اس زمانہ کے علماء میں ایک نامور شخصیت تھے، ان کا ایک ہزار دینار سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ دوسرے ارباب فضل و کمال کو بھی اپنی داد و دہش سے نوازا۔ شعراء کرام کو بھی بڑے بڑے عطیات دیے یہاں تک کہ بعض شعراء نے ان کے بعد شاعری ہی کو خیرباد کہہ دیا۔ کثیر سے کسی نے پوچھا کہ "تم اب شعر کیوں نہیں کہتے۔ جواب دیا کہ عبدالعزیز کے بعد داد و دہش اور صلہ کی توقع کس سے کی جائے۔ (حسن المحاضرہ:۲/۲۴۰)

عبدالعزیز نے نہ صرف رعایا اور ارباب علم و دانش کے ساتھ ہی نیک سلوک کیا بلکہ مصر اور حلوان میں اپنی حکومت کی بہت سی یادگاریں چھوڑیں جن کو لوگ مدتوں دیکھتے رہے اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ انھوں نے ایک زرنگار محل تعمیر کرایا۔ حلوان میں کئی مسجدیں اور محلات تعمیر کرائے۔ مصر کی اس وقت کی جامع مسجد منہدم کرا کر اس کو از سر نو نہایت خوبصورت تعمیر کرایا۔ خلیج مصر پر پل بنوائے اور ان کے علاوہ اور کئی محلات اور عمارتیں بنوائیں۔ انگور اور خرمے کے باغات لگوائے جن سے لوگ مدتوں مستفید ہوتے رہے۔

(حسن المحاضرہ سیوطی:۲/۲۰۴، کتاب الولاۃ:۵۵)

ان خوبیوں والے باپ کے ہاں آپ کی پیدائش ہوئی، اس وجہ سے باپ نے اپنے بیٹے میں اوصاف حمیدہ اور مرد خود آشنا اور خدا آگاہ کی خوبیاں پیدا کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرا بیٹا صداقت، عدالت، سخاوت اور حکمت کا پیکر ہو، مفسر، معلم، مجاہد، صوفی اور حکمران ہو، سیدنا عبداللہ بن

Marfat.com

عباس رضی اللہ عنہ جیسا ترجمان القرآن، حبر الامتہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسا محدث وفقیہ، سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جیسا قاضی ومجتہد، سیدنا ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ جیسا مسیح الامت، سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جیسا امین الامتہ، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسا صاحب فقر وغنا، سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسا سیف اللہ اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جیسا قاری ہو۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کا بچپن مصر ہی میں گزرا اور غالباً ابتدائی تعلیم بھی وہیں مصر میں حاصل کی۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱۰۵/۱)

روایات میں ہے کہ ام عاصم کے ہاں چار بیٹے ابوبکر، عمر، محمد اور عاصم پیدا ہوئے لیکن والدین کی صفات اور خوبیاں عمر رحمہ اللہ کو ورثہ میں ملیں یعنی والدین کی مجموعی صفات بھی اور والد اور والدہ کی منفرد صفات بھی۔ باپ کی طرف سے علم کا بلند پایہ ذوق اور ماں کی طرف سے حدت طبع اور فصاحت و بلاغت وغیرہ۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ام عاصم میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حدت مزاج زیادہ تھی بہ نسبت ان کے بیٹے عاصم کے، اس وجہ سے ام عاصم لغزش اور غلطی کا سخت محاسبہ کرتیں۔ اگر شوہر سے بھی غلطی ہو جاتی تو اس سے بھی باز پرس ہوتی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خواب کی تعبیر:

روایات میں ہے کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک خواب دیکھا تھا۔ خواب دیکھتے ہی آپ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پوچھا گیا کہ آپ نے خواب میں کیا دیکھا ہے؟ فرمایا! میری اولاد میں سے ایک شخص ہوگا جس کے چہرے پر زخم کا نشان ہوگا، وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا۔ خواب دیکھنے کے بعد آپ فرمایا کرتے تھے: کون ہے جو میری اولاد میں اشج (زخمی) ہوگا۔ یہ ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ کون زخمی ہوگا۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی پیدائش سے یہ امید پیدا ہوگئی کہ اس خواب کی تعبیر آپ ہیں کیونکہ آپ کے اخلاق، عادات وحرکات سے اس خواب کی تعبیر کے آثار جھلکنے لگے۔ پھر یہ خواب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی شکل میں متحرک نظر آنے لگا۔

یہ ایک خواب تھا جو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دیکھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا خواب ایسے نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی کوئی تعبیر نہ ہو لیکن آپ کو تعجب تھا کیونکہ آپ نے اپنی تمام اولاد کو خلافت سے محروم کر دیا تھا آپ اپنی اولاد کے کندھوں پر امت کا بوجھ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ میری اولاد کو زندگی گزارنے کے لیے بقدر کفایت دنیا ملتی رہے۔ دنیا نہ ان کے لیے موجب وبال ہو اور نہ ہی موجب عیش وعشرت۔ جب سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر والوں کو یہ خواب سنایا تو خوشی ومسرت انھیں بھی ہوئی لیکن تعبیر سمجھ میں نہ آئی مگر وہ تعبیر کے انتظار میں رہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ عنہ تو اکثر اپنے والد کا یہ قول دہراتے رہتے تھے۔

Marfat.com

''کاش مجھے معلوم ہوتا کہ عمر رضی اللہ عنہ کی اولاد میں کون ہے جس کے چہرے پر زخم کا نشان ہوگا اور وہ میری سیرت اپنائے گا اور زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔''

(کتاب المعارف لابن قتیبہ: ۱۵۸، سیرۃ ابن جوزی: ۷)

زمانہ کے شب و روز گزرتے گئے۔ گزرنے والے دن مہینوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ خواب دیکھنے والے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی جام شہادت نوش کر کے اس دار فانی سے دار باقی کو انتقال فرما گئے لیکن آپ کی یہ بات زبان بہ زبان نطق ہوتی چلی گئی۔ ہر ایک اس زخمی چہرے والے کا منتظر رہنے لگا کیونکہ ہر ایک کو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خواب کی صداقت کا پورا پورا یقین تھا جیسا کہ بعض روایات کے مطابق حجاج بن یوسف ثقفی بھی اس شخصیت کے انتظار کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم: ۱۴۲)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ابھی بچہ ہی تھے کہ اپنے والد سے ملنے مصر گئے۔ جب حلوان پہنچے تو اپنی عادت کے مطابق اٹھلا اٹھلا کر چلنے لگے۔ ایک روز آپ اپنے اخیافی بھائی اصبغ کے ساتھ سیر کے لیے نکلے۔ سیر کرتے کرتے دونوں گھوڑوں کے اصطبل تک پہنچ گئے۔ عمر رحمہ اللہ بے خبر ہو کر گھوڑوں کے پیچھے سے گزر رہے تھے کہ ایک خچر نے آپ کو دولتی ماری جو آپ کی پیشانی پر پڑی۔ پیشانی سے خون کا فوارہ نکلا اور ایک گہرا زخم ہو گیا۔ اصبغ نے خون ابلتے دیکھا تو بجائے پریشان ہونے کے ہنسنے لگا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: ''اللہ اکبر! یہ بنی مروان کا اشج ہے جو حکمران ہوگا'' گویا آپ کے بھائی نے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے خواب کی تعبیر بتا دی۔

عمر رحمہ اللہ کا خچر کی دولتی سے خون بہ رہا تھا۔ پیشانی خون سے شرابور تھی، زخم کی گہرائی سخت تکلیف دہ تھی۔ عمر رحمہ اللہ رو رہے تھے لیکن اصبغ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ برابر ہنس رہے تھے اور چیخ چیخ کر یہ کہہ رہے تھے کہ میرا یہ بھائی بنو مروان کا اشج ہے۔ عمر رحمہ اللہ میں سیدنا فاروق اعظم رحمہ اللہ کی جھلکیاں تو سب گھر والوں کو پہلے ہی نظر آ رہی تھیں لیکن جب خچر نے دولتی ماری اور آپ زخمی ہو گئے تو اصبغ سے صبر نہ ہو سکا اور وہ ظہور تعبیر کے یقین کی وجہ سے ہنستے ہوئے اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے خواب کی تعبیر کے ظہور کا اعلان کر رہے تھے لیکن عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میرا بھائی کیوں خوش ہے اور چیخ چیخ کر اللہ اکبر کے نعرے کیوں لگا رہا ہے۔

جونہی یہ خبر آپ کی والدہ ام عاصم کو ملی تو وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی آئیں اور اپنے نور نظر کو سینے سے چمٹا لیا، چہرے سے خون کو صاف کیا۔ بچے کو تسلی دی۔ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا لیکن پھر جب انھیں پتہ چلا کہ میرے بچے کی چوٹ پر اس کا بڑا بھائی ہنس رہا ہے تو سخت پریشان ہوئیں اور اپنے شوہر عبدالعزیز سے اصبغ کی شکایت کی اور خود بھی اصبغ کو ڈانٹا کہ تم میرے لال کو اصطبل کیوں لے گئے اور پھر جب وہ خچر کی دولتی سے زخمی ہوا تو اس پر برابر کیوں ہنستے رہے؟ عبدالعزیز بھی بیوی کی شکایت سن کر پہلے تو اپنے لخت جگر عمر رحمہ اللہ کی پیشانی سے خون پونچھنے لگے اور پھر اصبغ پر ناراض ہونے لگے۔ یہ تمھارا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کی پیشانی لہولہان

Marfat.com

ہوگئی اور وہ تکلیف سے رونے لگا اور تم اس کی تکلیف سے خوش ہو کر نعرے لگاتے رہے اور ہنستے رہے، ہنسنے کا یہ کون سا موقع تھا؟ اصبغ نے باپ کی ڈانٹ سن کر کہا: ابا! یہ بات نہیں، مجھے اس وجہ سے ہنسی نہیں آئی کہ میرا بھائی گرا اور میں اس کی تکلیف سے خوش ہوا، بلکہ میں خوش اس وجہ سے ہوا کہ میں اپنے اس بھائی میں زخم کے نشان کے علاوہ تمام علامتیں دیکھتا تھا جو خواب میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دیکھی تھیں۔ پھر جب یہ گر کر زخمی ہوگیا تو مجھے اس زخم سے خوشی اور مسرت ہوئی کیونکہ اس میں تمام علامات مکمل ہوگئی تھیں اور اللہ کی قسم! یہ بنوامیہ کے اشج ہیں۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم:ص۲۰) اصبغ کی یہ بات سن کر عبدالعزیز خاموش ہوگئے اور آپ کے زخم کو دوبارہ نہایت غور سے دیکھنے لگے۔ پھر اپنی بیوی ام عاصم سے کہا: دیکھو، تمھارا بیٹا بنو مروان کا اشج ہے اور واقعی اس کی پیشانی سے سعادت جھلکتی ہے۔ (سیرۃ ابن جوزی:۷، سیرۃ ابن عبدالحکم:۱۹، کتاب الاغانی:۱۴۹/۸) اس زخم کی وجہ سے لوگ عمر رحمہ اللہ کو اشج بنی مروان کہنے لگے اور امرائے بنی امیہ عموماً اور عبدالملک کے فرزند خصوصاً اس علامت کی وجہ سے آپ کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے۔ لیکن روایات میں ہے عبدالملک بن مروانن نے اپنے اس بھتیجے کو بچپن ہی سے نہایت محبت کی نگاہ سے دیکھتے، اپنے قریب بٹھاتے اور آپ کے سر پر دست شفقت پھیرا کرتے تھے اور جب کبھی عمر رحمہ اللہ ان کے پاس جاتے تو عبدالملک انھیں اونچی جگہ بٹھاتے۔ اور جب کبھی کوئی ان کی اس بات پر اعتراض کرتا تو فرماتے: ”تمھیں کیا پتہ کہ اس بچے کا کیا مقام ہے۔ یہ سریر آرائے خلافت ہوں گے کیونکہ یہ اشج بنی مروان ہیں اور سیدنا فاروق اعظم رحمہ اللہ کے خواب کی تعبیر ہیں کہ جب زمین جور وتشدد سے بھر جائے گی تو یہ اسے عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ پھر میں اس کو مقرب اور محبوب کیوں نہ بناؤں۔

(کتاب الاغانی:۱۶۷/۸)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اگرچہ ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے اور لباس اور خورد ونوش میں ان کا معیار سب لوگوں سے الگ تھا لیکن فطرت نہایت سلیم اور طبع نہایت مستقیم تھی۔ اس وجہ سے بچپن ہی سے آپ کا دل اولاد عمر رضی اللہ عنہ جو رشتہ میں آپ کے ماموں تھے، کی طرف مائل تھا۔ خصوصی طور پر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جو آپ کے آئیڈیل تھے اور جب آپ نے ان سے ملاقات کی تو پھر تو ہر وقت دل میں وہی سمائے رہتے تھے اور آپ اکثر اپنی والدہ محترمہ سیدہ ام عاصم سے یہ کہتے: امی جان! میں اپنے ماموں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرح بننا چاہتا ہوں۔ ان کی والدہ ان کی یہ بات سن کر مسکرا دیتیں اور کہا کرتیں: بیٹا! ان کی طرح بننا بڑا مشکل ہے۔

تحصیل علم:

عمر رحمہ اللہ جب بچپن سے لڑکپن کی منزل میں پہنچے اور ہوش سنبھالا تو باپ نے ان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے مدینۃ الرسول بھیج دیا جو اس زمانہ میں مہبط وحی ہونے کی وجہ سے علم اور علماء کا مرکز تھا اور چار دانگ عالم سے لوگ

Marfat.com

وہاں حدیث وفقہ کی تعلیم کے لیے جاتے تھے۔ عمر رحمہ اللہ یہاں حفظ قرآن سے فارغ ہوئے تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین سے روایت کرنے لگے۔ چنانچہ آپ عبداللہ بن جعفر رحمہ اللہ، انس بن مالک رحمہ اللہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن اور عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے احادیث بیان کرتے۔ آپ کی ابن عتبہ سے کثرت سے روایات ہیں۔ (سیرۃ ابن الجوزی:۸) اس زمانہ میں محدث صالح بن کیسان رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں مرکزیت کا مقام حاصل تھا۔ گورنر عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان کی نگرانی اور سرپرستی میں ان کی تعلیم وتربیت کی۔ صالح بن کیسان رحمہ اللہ نے نہایت احسن طریق سے ان کی تعلیم وتربیت کی اور ایک مربی ہونے کے ناطے نہایت دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ ان کی دینی اور اخلاقی نگرانی کرتے رہے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ علم بغیر عمل کے وبال جان اور عمل بغیر علم کے سراسر گمراہی ہوتا ہے، لہٰذا انھوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھا۔ چنانچہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے نماز میں دیر کردی اور مسجد میں جماعت ہوجانے کے بعد آئے۔ صالح بن کیسان نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو عمر رحمہ اللہ کا جواب تھا کہ ”بال سنوارنے میں دیر ہوگئی۔“ شاگرد کے جواب نے استاد کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا اور وہ سمجھے کہ شاگرد کے دل میں بالوں کی اہمیت نماز باجماعت کی اہمیت سے زیادہ ہے کیونکہ بالوں کی آرائش میں شغف کو نماز پر ترجیح دی گئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً عمر رحمہ اللہ کے باپ عبدالعزیز کو یہ واقعہ اور شاگرد کا یہ جواب لکھ کر بھیجا۔ انھوں نے فوری طور پر ایک شخص روانہ کیا۔ جس نے مدینہ میں داخل ہونے کے ساتھ پہلے عمر رحمہ اللہ کے بال مونڈھے اور بعد میں کسی سے بات کی۔ (سیر اعلام النبلاء:۱۱۶/۵، سیرۃ ابن الجوزی:۹، البدایہ والنہایہ:۹۳/۹)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ایک اور استاد عبیداللہ بن عبداللہ تھے۔ عمر رحمہ اللہ کو ان سے بڑی محبت تھی اور آپ ان کو سب پر ترجیح دیتے تھے اور ان کی مجلس میں کثرت سے آتے جاتے تھے۔ کیونکہ آپ علم کا ایک بے پایاں سمندر تھے۔ (صفۃ الصفوۃ:۵۷/۲) اس استاد کا اثر آپ پر پوری زندگی رہا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنی اہلیہ سے فرمایا! جب مجھے غصہ آتا ہے تو گویا میں اپنے سامنے عبیداللہ کو کھڑا پاتا ہوں کہ آپ مجھ سے مخاطب ہیں اور مجھے غصہ سے منع فرما رہے ہیں۔ (صفۃ الصفوۃ:۵۵/۲) عمر رحمہ اللہ ان سے علم حاصل کرتے بعض وقت مسائل میں اختلاف بھی کرتے تھے۔ ان عبیداللہ کو پتہ چلا کہ عمر رحمہ اللہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ انھوں نے عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور پوچھا: آپ کو کب پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ اہل بدر پر راضی ہونے کے بعد غصہ ہوگئے تھے؟ اس فقرہ سے عمر رحمہ اللہ سمجھ گئے کہ استاد کا اس سوال سے کیا مقصد ہے۔ فوری طور پر اللہ تعالیٰ اور عبیداللہ سے معذرت کی اور وعدہ کیا کہ میں آئندہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسی بات ہرگز نہیں کہوں گا اور پھر اس وعدہ کو پوری زندگی نبھایا اور کسی نے بھی پھر کوئی ایسا کلمہ ان کے منہ سے نہ سنا جس سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارہ میں کوئی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو۔ (البدایہ والنہایہ:۱۹۳/۹، سیر اعلام النبلاء:۱۱۷/۵)

بعض روایات میں ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ باپ بیٹے کو شدید محبت کرنے

Marfat.com

کے باوجود مصر سے مدینہ تحصیل علم کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔ بیٹے کو بھی باپ کے اس ارادے کا علم ہو گیا۔ انھوں نے والد سے پوچھا: ''اس کے علاوہ آپ کی کوئی اور خواہش؟'' باپ نے جواب دیا: ''اور تو کوئی خواہش نہیں، بس یہی آرزو ہے کہ تو مدینہ جائے اور وہاں کے علماء وفقہاء سے تحصیل علم کرے، ان سے زمانے میں رہنے کے ادب وآداب سیکھے، امید ہے کہ یہ بات تیرے اور میرے دونوں کے لیے مفید اور نفع بخش ہو گی۔'' بیٹا باپ کے ان جذبات کو سن کر مدینہ کی طرف چل پڑا اور عنفوان شباب ہی میں علم ودانش اور حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کر لی۔ اسی اثناء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو ان کے تایا ابا عبدالملک بن مروان نے ان کی طرف ایک آدمی بھیجا اور انھیں اپنے بچوں میں شامل کر لیا اور بعد میں اپنی بیٹی فاطمہ کو ان کے حبالہ عقد میں دے دیا جس کی شان کے بارہ میں کسی شاعر نے یہ کہا تھا۔

بنت الخليفة، والخليفة جدها　　　اخت الخلفاء والخليفة زوجها

''یعنی وہ ایک خلیفہ کی بیٹی اور اس کا دادا بھی خلیفہ تھا، وہ خلفاء کی بہن تھی اور ایک خلیفہ کی زوجہ محترمہ تھی۔'' (سیر اعلام النبلاء: ۵/۱۱۷، البدایہ والنہایہ: ۹/۱۹۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے والد اور آپ کے تایا ابا عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ نے جو خود بھی ایک بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے، بڑی توجہ اور کوشش سے آپ کی تعلیم وتربیت کی اور آپ میں ہر قسم کے اوصاف حمیدہ اور شمائل محمودہ پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی، لیکن حالات کے نشیب وفراز بتاتے ہیں کہ آپ کو خود بھی تحصیل علم کا ذوق وشوق تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ میں مدینہ کے لڑکوں میں سے ایک لڑکا تھا پھر عربی ادب اور شعر وشاعری کا ذوق پیدا ہوا جو اس زمانہ میں ایک بہت بڑا شوق سمجھا جاتا تھا۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۹)

مختصر یہ کہ آپ نے نہایت ذوق وشوق کے ساتھ علم کی تحصیل کی۔ علم کی یہ طلب انھیں صرف طالب علمی کے زمانے ہی میں نہ تھی بلکہ فقہاء کے ساتھ آپ کی علمی صحبتیں اور علمی بحث ومباحثے اکثر رہتے تھے اور یہ علمی بحث ومباحثے تحصیل علم کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھے۔ ان علمی صحبتوں نے انھیں امام وقت اور فقیہ روزگار بنا دیا۔ خود فرماتے ہیں کہ میں جب مدینہ سے نکلا تو اس وقت مجھ سے بڑا عالم اور کوئی نہ تھا۔

(تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۰۶)

بعض روایات میں ہے کہ عبدالعزیز جب مصر کے گورنر تھے تو انھوں نے اپنی اہلیہ ام عاصم کو لکھا کہ اپنے بیٹے عمر کو اپنے ساتھ لے کر حلوان مصر آ جاؤ۔ انھوں نے اپنے تایا سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے اس بارہ میں مشورہ کیا۔ انھوں نے فرمایا: تم تنہا مصر چلی جاؤ اور عمر کو یہیں مدینہ میں رہنے دو تا کہ اسے مدینہ کی پر فضا علمی آب وہوا میں تعلیم وتربیت کے لحاظ سے آراستہ کیا جا سکے۔ عمر رحمہ اللہ اپنے نانا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مشابہت کی وجہ سے آل خطاب کی محبت وشفقت کا مرکز تھے، چنانچہ ام عاصم اپنے بیٹے عمر کو مدینہ میں چھوڑ کر تنہا حلوان مصر

Marfat.com

چلی گئیں۔ جب وہ مصر پہنچیں تو عبدالعزیز نے ان سے پوچھا: ''عمر کہاں ہے؟'' انھوں نے کہا کہ میں اسے تعلیم وتربیت کے لیے مدینہ کی خوشگوار علمی فضا میں چھوڑ آئی ہوں۔ اس سے عبدالعزیز کو بڑی خوشی ہوئی کہ میرا بیٹا اپنے ماموؤں کے سایہ عاطفت وشفقت میں تعلیم وتربیت حاصل کرلے گا۔ چنانچہ عبدالعزیز نے خود بھی فوری طور پر اپنے بیٹے کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دی اور اپنے بھائی خلیفہ عبدالملک بن مروان کو بھی دمشق میں اس بارہ میں ایک خط لکھا۔ خط پڑھ کر عبدالملک کو بہت خوشی ہوئی۔ اس نے اپنے بھتیجے کی تعلیم وغیرہ کے لیے ایک ہزار دینار ماہانہ جاری کردیا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تعلیم وتربیت مدینہ طیبہ کی علمی فضا اور ماحول میں جودوکرم کے نعمت کدوں میں ہوئی اور چچاؤں کے مال ودولت اور ماموؤں کی شفقتوں کے زیرسایہ ہوئی۔

عمر غصہ میں غضب ناک ہوجایا کرتے تھے۔ مزاج کی یہ حدت اور شدت ویسے تو آپ کو اپنی والدہ سے ورثہ میں ملی تھی لیکن یہ دراصل فاروقی مزاج کی ایک فرع تھی۔ غصہ سے فوری طور پر بھڑک اٹھنے سے آپ کو کئی مرتبہ نقصان بھی اٹھانا پڑا، لیکن آپ کی اس عادت سے آپ کے غلام ہروقت سہمے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک حبشی غلام کو بہت مارا۔ اس وقت آپ کا عنفوان شباب تھا۔ جب غلام خوب مار کھاچکا تو اس نے دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ عمر کے مزاج کی تیزی کو ختم کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک روز اس نے اس وقت جب کہ آپ خوشگوار موڈ میں تھے آپ سے پوچھا: ''آپ نے کبھی کوئی ایسا قصور کیا ہے جس سے آپ کا آقا آپ سے ناراض ہوگیا ہو اور آپ کو فوری سزا دی ہو؟'' انھوں نے کہا: نہیں۔ غلام نے کہا: پھر آپ مجھے کیوں فوری سزا دیتے ہیں جب کہ آپ کو فوراً سزا نہیں دی گئی۔ یہ جملہ سن کر عمر ندامت وخجالت سے پانی پانی ہوگئے۔ قلب پر رقت طاری ہوگئی اور فرمایا: ''تو اللہ کی رضا کے لیے آزاد ہے۔''

مدینہ طیبہ کی گورنری:

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے محدثین وفقہاء مدینہ سے تحصیل علم کرکے ایک نہایت اونچا مقام حاصل کرلیا تھا۔ علماء میں ان کا ایک نہایت اعلیٰ مقام ہوگیا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ وہ شاہی خاندان کے ایک فرد ہونے کے ناطے ایوان حکومت میں براجمان ہوگئے اور علم کی وہ خدمت نہ کرسکے جو ان کا حق تھا۔ بڑے بڑے علماء اور فقہاء سے وہ علم وفقہ میں ممتاز تھے، لیکن حکومت کی مصروفیات نے انھیں علم کی خدمت سے روکے رکھا۔ چنانچہ تحصیل علم کے بعد وہ سب سے پہلے خناصرہ کے عامل مقرر ہوئے اور بعد میں عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ولید بن عبدالملک نے ان کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا۔ ولید نے گورنر تو مقرر کردیا لیکن آپ کا مزاج حکومت کرنے کے خلاف تھا۔ لہٰذا قبول کرنے میں تامل ہوا۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک بار خلیفہ عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ کچھ ساتھیوں کے سامان پیچھے رہ گئے اس وجہ سے شاہی سواری پیچھے ٹھہر گئی۔ جن کے سامان روانہ ہوچکے تھے وہ آرہے تھے لیکن جن کے سامان روانہ نہیں ہوئے

Marfat.com

تھے ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ بس اتنی سی بات پر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو آخرت یاد آ گئی اور آپ فرط تاثر سے رو پڑے۔ خلیفہ عبدالملک رحمہ اللہ نے رونے کا سبب پوچھا؟ فرمایا: ''کل قیامت کے روز بھی ایسا ہی ہوگا جس نے یہاں سے کچھ بھیجا ہوگا اسے تو وہاں ملے گا اور جس نے نہ بھیجا ہوگا وہ محروم رہے گا۔'' بس اسی فکر نے ان کی دنیا تبدیل کر دی تھی اور پھر موت تک آخرت کی یاد سامنے رہی۔

جس شخص کی نہاد ذہنی آخرت کی زندگی ہو وہ حکومت کے عہدہ کو کیسے قبول کر سکتا ہے، لہٰذا تقرری کے باوجود آپ مدینہ نہیں جا رہے تھے۔ ولید نے حاجب سے پوچھا: عمر جا کیوں نہیں رہے؟'' اس نے کہا ''ان کی کچھ شرائط ہیں، جب تک وہ پوری نہ ہوں وہ اپنے عہدے کا چارج نہیں لیں گے۔ ولید نے آپ کو بلا کر پوچھا تو فرمایا: ''مجھے پہلے گورنروں کی طرح جبر پر مجبور نہ کیا جائے۔'' ولید نے ان کی یہ شرط فوری طور پر منظور کرتے ہوئے کہا: ''تم حق پر عمل کرنا خواہ ایک درہم بھی شاہی خزانہ میں نہ آئے۔'' (یعقوبی: ۲/۳۳۹)

چونکہ عبدالملک بن مروان کو عمر بن عبدالعزیز سے انتہائی محبت تھی، اس لیے ولید بھی ان سے انتہائی محبت کرتا تھا اور ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھا۔ پھر ولید کی ہمشیرہ فاطمہ بھی عمر رحمہ اللہ کے نکاح میں تھی۔ اس لحاظ سے عمر کا سسرالی تعلق بھی تھا۔ پھر جب ولید خلیفہ ہوا تو عمر رحمہ اللہ کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی۔ ان تمام تعلقات اور رشتوں کی وجہ سے ولید نے انھیں مدینہ کا گورنر بنایا لیکن جب انھیں مدینہ کی گورنری کے تقرر کا خط ملا تو انھوں نے اس کو قبول کرنے میں پس و پیش سے کام لیا کیونکہ انھیں مدینہ کے لوگوں پر ہشام کے جبر معلوم تھے۔ ولید نے معلوم کرایا کہ عمر رحمہ اللہ کیوں اس عہدہ کو قبول نہیں کر رہے۔ پتہ چلا کہ تین باتوں کی وجہ سے عمر رحمہ اللہ یہ عہدہ قبول نہیں کر رہے۔ ولید نے ان کی تمام شرائط منظور کر لیں اور کہا کہ آپ اس عہدہ کو ضرور قبول کریں اگرچہ آپ ہمیں ایک درہم بھیجیں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی: ۳۲)

جب ولید بن عبدالملک نے آپ کی یہ شرائط مان لیں تو عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ طیبہ کے لیے رخت سفر باندھا۔ اس وقت کے عمر بن عبدالعزیز وہ نہ تھے جو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز تھے۔ جب وہ خلیفہ اور امیر المومنین ہوئے تو تاریخ کے اوراق اور ان کا کردار دونوں اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ امیر المومنین نہیں اجیر المومنین تھے، وہ رئیس نہیں بلکہ درویش تھے، امیر نہیں بلکہ فقیر تھے، حاکم نہیں بلکہ رعایا کے اموال اور بیت المال کے کسٹوڈین تھے۔ لیکن جب وہ گورنر ہو کر مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوئے تو اس وقت وہ دوسرے گورنروں کی طرح ایک رئیس تھے جن کے خدم و چشم بھی تھے اور جن کا ذاتی سامان کثیر تعداد میں تھا۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ جب وہ مدینہ جا رہے تھے تو ان کا ذاتی سامان تیس اونٹوں پر بار تھا کیونکہ وہ شان و شکوہ والے شاہی خاندان کے ایک اہم رکن تھے۔ خلیفہ وقت کے چچا زاد بھائی اور ایک خلیفہ کے داماد، لیکن آپ کی فطرت سلیم تھی۔ حالات کے نشیب و فراز کے گرد و غبار نے ان کی سلیم فطرت کو ڈھانپ رکھا تھا جس کو اگر کوئی حادثہ صاف کر دے تو وہ سچے پکے شیدائی اسلام تھے۔

Marfat.com

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جونہی گورنر کی حیثیت سے مدینہ منورہ پہنچے تو سب سے پہلا کام جو آپ نے یہاں کیا، وہ یہ تھا کہ وہاں کے دس بڑے فقہاء اور علماء کو اپنے ہاں بلایا۔ ان علماء کے نام یہ ہیں:

① عروہ بن زبیر رحمہ اللہ	② عبیداللہ بن عبداللہ رحمہ اللہ
③ سلیمان بن یسار رحمہ اللہ	④ قاسم بن محمد بن ابی بکر رحمہ اللہ
⑤ سالم بن عبداللہ رحمہ اللہ	⑥ خارجہ بن زید رحمہ اللہ
⑦ ابوبکر بن عبدالرحمن رحمہ اللہ	⑧ ابوبکر بن سلیمان بن ابی حثمہ رحمہ اللہ
⑨ عبداللہ بن عامر بن ربیعہ رحمہ اللہ	⑩ سعید بن مسیب رحمہ اللہ

ذہبی نے لکھا ہے کہ نماز ظہر پڑھ کر ان کو بلایا اور ان کو ایک مختصر سا خطاب کیا۔ فرمایا کہ ''میں نے آپ حضرات کو ایک ایسے کام کے لیے بلایا ہے جس میں ایک تو آپ ماجور ہوں گے اور دوسرے آپ کو حق کا ساتھی ہونے کا انعام ملے گا۔ میں آپ حضرات سے مشورہ کیے بغیر کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔ پس آپ کے ذمہ لازم ہے کہ جب آپ حضرات کسی کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں یا آپ کو کسی عامل کے ظلم کی اطلاع ملے تو میں آپ کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ آپ اس کی مجھے ضرور اطلاع دیں۔'' ایک گورنر کے منہ سے یہ کلمات سن کر ان حضرات کو حیرانی بھی ہوئی اور خوشی اور مسرت بھی کیونکہ انھوں نے آج تک کسی گورنر کے منہ سے ایسی بات نہیں سنی تھی، لہٰذا یہ فقہاء ان کو دعائیں دیتے ہوئے واپس اپنے گھروں کو چلے گئے۔''

(سیر اعلام النبلاء: ۱۱۸/۵، طبقات ابن سعد: ۲۴۶/۶، البدایہ والنہایہ: ۱۹۴/۹، تہذیب الکمال: ۴۳۹/۲۱)

اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سعید بن مسیب رحمہ اللہ کسی خلیفہ کے پاس نہیں جاتے تھے۔ سوائے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ان کی ہر بات پر عمل کرتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ: ۱۹۴/۹)

مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں آپ قضا کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اور ربیعہ فرماتے ہیں کہ آپ نے فیصلوں میں کبھی غلطی نہیں کی تھی۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۱۸/۵)

ابوبکر بن عیاش کا بیان ہے کہ آپ نے کئی حج بھی اس زمانہ میں کیے اور سب سے پہلا حج آپ نے ۸۹ھ میں کیا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۱۷/۵)

سہیل بن ابی صالح کا بیان ہے کہ عرفہ کی صبح میں اپنے باپ کے ساتھ عرفات میں کھڑا تھا اور سیدنا عمر ثانی رحمہ اللہ امیر الحج تھے۔ میں نے اپنے والد سے کہا کہ میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جونہی میں نے انھیں دیکھا تو میں نے اپنے والد سے کہا کہ جب بھی کوئی شخص انھیں دیکھتا ہے تو اس کے دل میں ان کی محبت پیوست ہو جاتی ہے اور آپ نے تو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ جب کسی شخص سے محبت فرماتے ہیں تو جبریئل سے فرماتے ہیں کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں پس تم بھی اس سے محبت کرو۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۱۹/۵)

Marfat.com

عمر رحمہ اللہ نے ان علماء کو اس لیے بلایا تھا کہ یہ عمر کی کاروبار حکومت میں اعانت کریں اور انھیں صحیح مشورہ دیں۔ چنانچہ علماء مجلس شوریٰ میں آ کر بیٹھ جاتے۔ عمر رحمہ اللہ انھیں اپنے عزائم سے آگاہ کرتے اور فرماتے کہ میں آپ سب حضرات کے مشورہ کے بعد ہی کسی کام کا فیصلہ کر سکتا ہوں، لہٰذا آپ حضرات مظالم کی چھان بین کریں۔

مسجد نبوی کی تعمیر نو:

ولید بن عبدالملک نے بہت سی مساجد اور عمارتیں بنوائیں کیونکہ انھیں تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس کے بارہ میں کتابوں میں لکھا ہے۔

"كان شديد التكلف بالعمارت والابنية والاتخاذ المصانع والضياع"

(آداب السلطانیہ:۱۱۴)

عربی کا ایک مشہور جملہ ہے کہ "الناس علی دین ملوکھم" لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ جب صدر مملکت عمارتوں کی تعمیر کا شوقین ہو تو رعایا میں بھی ذوق وشوق سرایت کر جاتا ہے۔ چنانچہ ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ ولید کے عہد کی تعمیرات کی وجہ سے یہ ذوق اتنا عام ہو گیا تھا کہ جب لوگ اپنی عام مجلسوں میں آپس میں بات کرتے تو وہ گفتگو اکثر و بیشتر عمارات ہی کے بارہ میں ہوتی تھی۔ (طبری:۸/۲۷۳) ولید نے یوں تو کئی عمارتیں تعمیر کیں لیکن اس کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ دو مسجدیں ہیں۔ ایک مسجد نبوی اور دوسری جامع الاموی، دمشق۔ تعمیر کے بعد ان دونوں مسجدوں کی تزئین و آرائش پر بھی اس نے بڑے حوصلے سے مال خرچ کیا اور ان کی آرائش میں اس زمانہ کی تمام صناعیاں اور کاریگریاں ختم کر دیں۔ اگرچہ ان سے قبل سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مسجد نبوی کی توسیع اور تعمیر کی کیونکہ اسلام کی روز افزوں ترقی کے باعث اہل اسلام کی تعداد میں چونکہ برابر اضافہ ہو رہا تھا اور مسجد کی تنگ دامانی شکوہ سنج تھی۔ اس لیے آپ نے مسجد کی توسیع اور اس کی پہلی عمارت کو گرا کر پوری عمارت کو از سر نو تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس کے لیے آپ نے اردگرد میں رہنے والوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے مکانات حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں تا کہ مسجد کی توسیع کی جا سکے۔ آپ نے انھیں کافی معاوضہ بھی پیش کیا لیکن وہ کسی صورت اپنے مکانات فروخت کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ آپ نے انھیں اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر کی لیکن ہر تدبیر بے سود رہی۔ لہٰذا توسیع و تعمیر کا معاملہ پانچ سال تک معطل والتوا میں رہا۔ جب آپ نے اپنے اس ارادے کو پورا ہوتے نہ دیکھا تو ایک جمعہ کو آپ نے نہایت موثر خطبہ دیا اور لوگوں کو نمازیوں کی کثرت اور مسجد کی تنگ دامانی کی طرف نہایت دردانگیز لہجے میں توجہ دلائی۔ جمعہ کی مبارک گھڑی اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے دردانگیز لہجے نے حاضرین پر خاص اثر کیا اور وہ سب لوگ جو ابھی تک اپنے مکانات حکومت کے ہاتھ فروخت کرنے پر راضی نہ ہوئے تھے فوراً اپنے مکانات

Marfat.com

فروخت کرنے پر راضی ہو گئے۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو اس بات کی بڑی مسرت ہوئی چنانچہ انھیں منہ مانگے دام دے کر سارے مکانات خرید لیے۔

عثمان بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کا ایک مکان مسجد نبوی کے قریب واقع تھا۔ مسجد کی توسیع کے لیے اس کا خریدنا بھی نہایت ضروری تھا، لیکن وہ مکان فروخت کرنے پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ آخر آپ نے انھیں اس مکان کے بدلہ میں بصرہ میں نہر کے کنارے وہ مکان دے کر راضی کر لیا جو ''شط عثمان'' کے نام سے مشہور ہے۔

اب سیدنا عثمان نے مسجد کو منہدم کروایا اور اس کو اس طریقے سے پختہ بنوانا شروع کیا جس میں تزئین و آرائش کا پہلو بھی نمایاں ہو۔ مدینہ منورہ میں چونا نہیں ملتا تھا۔ وہ مدینہ طیبہ سے چند میل دور بطن نخلہ سے منگوایا۔ دیواروں کے لیے منقش پتھر منگوائے گئے۔ چھت کے لیے ساگوان کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ ابن اثیر کا بیان ہے۔

''چونا کو بطن نخلہ سے جو مدینہ کے قریب بصرہ کے راستہ پر ایک گاؤں ہے، لانے کا انتظام کیا گیا اور مسجد کو منقوش پتھروں سے بنایا گیا۔ اس کے ستون پتھر کے تھے جن میں سیسہ بھرا گیا تھا اور چھت ساگوان کی تھی۔'' (ابن اثیر:۳/۵۱، البدایہ والنہایہ:۷/۱۵۴)

مسجد کی تعمیر قریباً ۱۰ ماہ میں مکمل ہوئی۔ تعمیر کے دوران آپ اکثر اوقات وہاں رہتے اور بہ نفس نفیس کام کی نگرانی فرماتے، چنانچہ سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مسجد نبوی کی تعمیر کروا رہے تھے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ امیر المومنین:

''کام کی نگرانی کے لیے اپنے دونوں پاؤں پر کھڑے رہتے جب کہ کام کرنے والے مسجد میں کام کرتے ہوتے یہاں تک کہ نماز کا وقت آ جاتا۔ پھر آپ انھیں نماز پڑھاتے۔ بعض اوقات آپ گھر میں سو کر مسجد میں تشریف لے آتے اور بعض اوقات مسجد ہی میں سو جاتے۔'' (وفاء الوفاء:۲/۵۰۵)

اس دوران آپ صناعوں اور کاریگروں کو اپنی جیب خاص سے انعام و اکرام سے نوازتے اور کھانے اور کپڑے سے بھی ان کو خوش و خرم رکھتے تاکہ وہ کام میں گہری دلچسپی لیں۔ اس طریقے سے ربیع الاول ۲۹ھ سے محرم الحرام ۳۰ھ تک برابر کام کی نگرانی فرماتے رہے اور کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کے چھ دروازے رکھے۔ آپ نے بھی اتنے دروازے رکھوائے (ابن اثیر:۳/۵۱) سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مسجد کی جو توسیع فرمائی تھی اس کے بعد مسجد کی لمبائی ۱۴۰ ہاتھ چوڑائی ۱۲۰ ہاتھ ہو گیا۔

(ابن اثیر:۳/۵۱، البدایہ والنہایہ:۷/۱۵۴)

غرض کہ آپ نے شبانہ روز انتھک کوششوں سے اپنی نگرانی میں مسجد نبوی کی تعمیر نو اور توسیع کروائی اور اس کی تزئین و آرائش میں ذاتی دلچسپی لی۔ اس سے مسجد کی یہ عمارت اپنی مضبوطی، خوبصورتی اور تزئین و آرائش کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہو گئی تھی۔

ولید بن عبدالملک کے سامنے مسجد نبوی کی گزشتہ تعمیر کی یہ ساری باتیں تھیں۔ ان پچاس ساٹھ سالوں

Marfat.com

میں مدینہ کی آبادی بڑھ گئی تھی اور مسجد نبوی اپنی تنگ دامانی کی پھر شکوہ سنج تھی۔ چنانچہ ۸۸ھ میں سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جونہی مدینہ کے گورنر ہوئے، ولید نے انھیں لکھا کہ مسجد نبوی کی پرانی عمارت کو گرا کر از سر نو تعمیر کیا جائے اور مسجد سے متصل امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے حجرات کو اور اردگرد جو دوسرے مکانات ہیں انھیں بھی خرید کر مسجد میں شامل کرلیا جائے اور جو قیمت نہ لے اس کی قیمت خیرات کردی جائے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے نو حجرے تھے۔ ان کی چھتیں کھجور کی ٹہنیوں کی تھیں۔ جب امہات المومنین رضی اللہ عنہن انتقال فرما گئیں اور عبدالملک بن مروان نے ان کے حجرے مسجد میں شامل کرنے چاہے تو مدینہ والے پھوٹ پھوٹ کر روئے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ آخر کار عبدالملک اس ارادے سے باز آگئے اور اپنی رائے منسوخ کردی۔ (مسالک الابصار ۱/۱۲۶ للعمری) پھر ولید بن عبدالملک کے حکم سے عمر بن عبدالعزیز نے جب مسجد کی توسیع کرنا چاہی تو تمام حجروں کو گرا کر مسجد میں شامل کرلیا گیا اور مسجد کے چاروں طرف کی زمین خرید کر مسجد میں شامل کردی گئی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے معاونین کے ساتھ مسجد نبوی میں پہنچ کر مسجد کے طول و عرض کی نشاندہی کی اور اس کی بنیاد رکھی۔ (طبری: ۵/۲۲۲) مسجد کی توسیع کے ساتھ ساتھ جوف محراب کو آگے بڑھایا اور بلند مینارہ بنوایا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسجد میں محرابوں کی تجویف ایجاد کی (النجوم الزاہرہ: ۱/۲۱۵،۶۷) اور جب اذان دینے کا مینارہ بنایا گیا تو آپ کے بعد مسلمانوں کے شہروں میں بہت سے مینارے اذان کے لیے بنائے گئے اور شام کے میناروں کی نقل کی گئی۔

(تاریخ العرب المطول: ۲۳۱)

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے امیر المومنین ولید بن عبدالملک کے اس حکم کی پوری پوری تعمیل کی۔ جب انھوں نے مسجد نبوی کے اردگرد کے مکانات فروخت کرنے کے لیے لوگوں سے کہا تو انھیں اس کار خیر میں کوئی تامل نہ ہوا۔ سب لوگوں نے منہ مانگی قیمت لے کر اپنے مکانات فروخت کردیئے، چنانچہ علامہ طبری نے لکھا ہے:

فاجاب القوم الی الثمن فاعطاهم اياه (طبری: ۸/۱۳۱۳)

لوگوں نے قیمت لے کر مکانات دینے کی رضامندی ظاہر کی جو انھیں دے دی گئی۔

لیکن بعض روایات میں ہے کہ بعض مکانات جبراً لیے گئے کیونکہ لوگ وہ مکانات دینے پر راضی نہ تھے۔ اگرچہ جبراً کسی شخص کی زمین اور مکان لینا جائز نہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ وقت کا تقاضا وہی ہو جو سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے کیا یا پھر یہ روایات مخدوش ہوں۔

جب یہ مکانات خرید کر مسمار کردیئے گئے تو ولید نے قیصر روم کو لکھا کہ ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد بنوانا چاہتے ہیں لہٰذا تم اس کے لیے جو سامان بھیج سکتے ہو وہ بھیجو۔ اس خط کے جواب میں اس نے ایک لاکھ مثقال سونا، چالیس گٹھے منبت کاری کا سامان اور بہت سے کاریگر اور انجینئر بھیجے۔ اس کے علاوہ مدائن سے تزئین و

Marfat.com

آرائش اور نقش ونگار کا سامان منگوایا گیا۔ (خلاصۃ الوفاء:۱۳۹)

جب تعمیر کا تمام سامان مہیا ہوگیا تو سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے خود نہیں بلکہ اپنے وقت کے بڑے علماء اور فقہاء کو جن میں قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ، سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰنؒ عبداللہ بن عبداللہ، خارجہ بن زید رحمۃ اللہ اور عبداللہ بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی موجودگی میں پرانی عمارت کو گرا کر ان بزرگوں اور فقہاء ومحدثین کے ہاتھوں نئی عمارت کی بنیاد رکھوائی۔ (طبری:۸/۱۲۷) اور جب انھوں نے بنیاد رکھ دی تو پھر نہایت ذوق وشوق اور وفور جذبات سے تعمیر کا کام شروع کرایا۔ کاریگروں نے بھی نہایت جانفشانی اور تندہی سے کام کیا اور آپ نے اس نظریہ کے پیش نظر کہ ''مزدور خوش دل کند کار بیش'' ان کو ہر قسم کی نوازشوں سے نوازا۔ روایات میں ہے کہ ایک ایک جھاڑ کے نقش پر کاریگر کو مزدوری کے علاوہ تیس درہم انعام کے طور پر عطا فرمائے (خلاصہ الوفا:۱۳۹) اسی کتاب میں ہے کہ صرف قبلہ کی دیوار اور اس کے طلائی کام پر پینتالیس (۴۵) ہزار دینار صرف ہوئے۔ (خلاصہ الوفاء:۱۴۰) جب ایک دیوار کے مصارف یہ تھے تو اس سے پوری مسجد کی عمارت کے مصارف پر طلائی کام اور اعلیٰ درجہ کی مینا کاری کی گئی۔ مسجد سے متعلق ایک فوارہ بھی تعمیر کیا گیا۔ غرضیکہ تین سال کی مدت میں مسجد کی تعمیر کی تکمیل ہوئی۔ جب مسجد مکمل ہوگئی۔ تو ۹۱ھ میں ولید خود اس کے افتتاح کے لیے دمشق سے مدینہ منورہ آیا۔ عمارت کو دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ فوارے کی تنصیب نے اس کی مسرت وشادمانی میں مزید اضافہ کیا۔ افتتاح کے بعد مسجد کی خدمت، نگرانی اور انتظام کے لیے خادم مقرر کیے اور اہل مسجد کو اس کا پانی استعمال کرنے کا حکم دیا۔ (ابن اثیر:۴/۲۰۴) اور روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کی خوشی میں اہل مدینہ میں نقد روپیہ اور طلائی ونقرئی ظروف تقسیم کیے۔ (کتاب العیون والحدائق:۱۱) ولید نے مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ کی خدمات کی بھی تعریف وتحسین کی۔

روضہ نبوی کی مرمت:

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ جب گورنر مدینہ تھے اس وقت روضہ نبوی کی کوئی بڑی عمارت نہ تھی۔ مزار مبارک صرف ایک چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں یہ دیواریں شکستہ ہوچکی تھیں۔ ولید نے ان کی مرمت کے لیے عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ سے کہا: آپ نے چاروں طرف دوہری دیوار تعمیر کرادی کہ ایک اگر منہدم ہو جائے تو دوسری سے روضہ مبارک کا پردہ قائم رہے۔ (کتاب العیون والحدائق:۹)

دیگر مساجد کی تعمیر:

اطراف مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں جہاں نمازیں پڑھی تھیں، مسلمانوں نے وہاں تبرک اور یادگار کے طور پر مسجدیں بنوالی تھیں۔ وہ مساجد معمولی تھیں۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے اپنی گورنری کے

Marfat.com

زمانہ میں اطراف مدینہ میں بہت سی مسجدیں بنوائیں۔ دوسرے ان یادگار مسجدوں کو مسمار کر کے منقش پتھروں سے انھیں تعمیر کرایا تا کہ یہ یادگار مسجدیں معمولی نہ رہیں۔ (فتح الباری: ۴۷۲/۱)

کنوؤں اور راستوں کی تعمیر:

خلیفہ مسلمین بھی چونکہ عمارتوں اور راستوں کی تعمیر کا خصوصی ذوق رکھتے تھے لہٰذا اس کے گورنر بھی رفاہ عامہ کے کاموں میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے رفاہ عامہ کے سلسلہ میں ولید بن عبدالملک کے حکم سے مدینہ میں اور اطراف مدینہ میں بہت سے کنوئیں کھدوائے تا کہ لوگوں کو پینے کے پانی کی سہولت ہو اور دشوار گزار پہاڑی راستوں کو درست کرایا۔ اس سے لوگوں کو سفر میں نہایت آسانی ہوگئی۔

بعض روایات میں ہے کہ ولید نے سیدنا عمر کو لکھا کہ گھاٹیاں آسان بنائی جائیں اور جگہ جگہ کنوئیں کھدوائے جائیں اور حاجیوں کے راستے میں ہوٹل اور سرائیں بنوائی جائیں اور خراسان کے راستہ میں سرائیں کثرت سے بنوائی جائیں۔ پھر فرمان بھیجا کہ مدینہ منورہ میں ایک فوارہ بنوایا جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان تمام احکامات کی تعمیل کی۔ فوارہ بھی بنوایا اس فوارہ میں جب پانی چھوڑا جاتا تو اس کا منظر دل خوش کن اور اپنی کاریگری میں حیرت زا اور مسرت انگیز ہوتا تھا۔ (طبری: ۲۲۲/۵)

پھر جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ان تمام کاموں سے فارغ ہوگئے تو ولید نے آپ کو ان کاموں کے صلہ میں مکہ اور طائف کا بھی گورنر بنا دیا۔ پھر سنہ ۹۰ھ میں آپ کو تمام صوبہ حجاز کا والی بنا دیا گیا۔

ولید بن عبدالملک کا حج کے لیے آنا:

سنہ ۹۰ھ میں جب مسجد نبوی کی توسیع کا کام مکمل ہوگیا تو سنہ ۹۱ھ میں ولید نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور اپنی آمد کے بارہ میں سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو آگاہ کیا۔ جب ولید حج کے لیے دمشق سے نکلا تو عمر رحمہ اللہ ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ خلیفہ کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ اس جلوس میں مدینہ منورہ کے اکابر میں سے بیس حضرات بھی شامل تھے۔ اس جلوس میں اونٹوں اور گھوڑوں پر لدا ہوا کافی سامان بھی تھا۔ یہ جلوس سویدا تک گیا۔ خلیفہ مسلمین سواری پر تھے، خلفاء کے آداب میں یہ بات بھی تھی کہ اگر لوگ سوار ہوں تو خلیفہ کو دیکھ کر وہ سواریوں سے اتر جائیں اور اگر بیٹھے ہوں تو کھڑے ہو جائیں لیکن اس جلوس کے لوگ خلیفہ کو دیکھ کر سواریوں سے نہ اترے (العقد الفرید: ۹۲/۴) ولید کے حاجب نے جب یہ دیکھا تو وہ تیزی سے آگے بڑھا اور لوگوں کے قریب آ کر اس نے کڑک دار آواز میں کہا: ''امیر المومنین کے آداب کے لیے اپنی سواریوں سے اتر جاؤ''۔ لوگ اس کی آواز سن کر سواریوں سے اتر پڑے لیکن ولید نے انھیں سوار ہونے کا اشارہ کیا، چنانچہ وہ پھر اپنی سواریوں پہ سوار ہوگئے۔ پھر ولید نے گورنر سیدنا عمر بن عبدالعزیز کو اپنے پاس بلایا اور ان کے ساتھ چلتا رہا حتیٰ کہ ذی خشب میں جو مدینہ سے ایک دن کے فاصلہ پر واقع ہے، اتر گیا (معجم البلدان: ۴۴۰/۳) پھر ولید نے

Marfat.com

مدینہ کے خواص و اکابر سے ملاقات کی اور تمام لوگوں کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔

ولید مدینہ میں جب داخل ہوا تو فوراً مسجد نبوی میں گیا تا کہ وہ مسجد کی توسیع کا معائنہ کرے۔ مسجد میں داخل ہو کر اس نے دیکھا کہ تمام مسجد لوگوں سے خالی ہے۔ صرف ایک شخص محراب کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ یہ مدینہ کے بہت بڑے عالم سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ تھے۔ ہوا یہ کہ خلیفہ ولید جب مسجد نبوی دیکھنے کے لیے آیا تو اس کی آمد سے قبل مسجد نبوی کو لوگوں سے خالی کرا لیا گیا۔ تمام لوگوں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مسجد خالی کر دی سوائے سیدنا سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کے۔ سعید رضی اللہ عنہ پہلی صف میں قبلہ رخ محراب کے قریب اپنی عادت کے مطابق بے پروائی سے بیٹھے رہے اور کسی پہرے دار کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ ان کو نکال سکے کیونکہ گزشتہ پچاس سالوں سے سعید رضی اللہ عنہ نے اپنی کسی نماز کی تکبیر تحریمہ بھی کبھی قضا نہ کی تھی سعید رضی اللہ عنہ اپنی معمولی دو چادریں اوڑھے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ بعض حضرات انھیں آ کر کہتے کہ مسجد خالی کر دیں حتیٰ کہ خلیفہ آ کر چلا جائے لیکن سیدنا سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کا یہ جواب تھا کہ جب تک میرے کھڑے ہونے کا وقت نہیں آئے گا میں کھڑا نہیں ہوں گا۔

ولید سیدنا سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے بخوبی واقف و آشنا تھا۔ اسے یاد تھا کہ سعید ایک مرتبہ میری بیعت سے انکار کر چکے ہیں۔ ولید کی تو یہ خواہش تھی کہ مسجد میں تمام حضرات ہوتے لیکن سعید رضی اللہ عنہ نہ ہوتے۔ اسی وجہ سے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ کاش خلیفہ ولید کی راہ سے سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ ہٹ جائیں یہاں تک کہ خلیفہ مسجد کا معائنہ کر کے چلا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تو تکار ہو جائے، لیکن عمر بن عبدالعزیز کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ولید مسجد میں آیا اور اس نے دیکھا کہ مسجد نبوی لوگوں سے بالکل خالی ہے۔ پھر اچانک اس کی سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ پر نگاہ پڑی کہ وہ محراب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ ولید جان گیا کہ سعید رضی اللہ عنہ نے مسجد سے نکلنے سے انکار کر دیا ہے۔ ولید محراب دیکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ محراب اور مینارہ اذان ولید اور عمر رحمہ اللہ دونوں کی جدت تھی اور یہ مینارہ شام کے میناروں کے مشابہ بنایا گیا تھا۔ ولید نے پوچھا: یہ شیخ کون ہیں؟ کیا یہ سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ ہیں؟ عمر رحمہ اللہ نے جواب دیا: ہاں۔ سیدنا عمر سعید رحمہ اللہ کی طرف سے عذر کرنے لگے کہ انھوں نے اٹھ کر آپ کو اس لیے سلام نہیں کیا کہ بڑھاپے نے ان کی نگاہ کو از حد کمزور کر دیا ہے۔ ولید نے یہ عذر سن کر کہا: ہمیں ان کا حال بخوبی معلوم ہے۔ ہم ہی ان کے پاس جاتے ہیں چنانچہ ولید مسجد میں گھوم گھام کر سعید رحمہ اللہ کے پاس گیا اور کہا ''شیخ! آپ کا کیا حال ہے؟'' سعید رحمہ اللہ نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی، وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا: الحمد للہ! خیریت سے ہوں۔ امیر المومنین کا کیا حال ہے؟

''ولید یہ کہتے ہوئے واپس آ گیا کہ لوگوں میں یہ باقی ہیں۔'' (النجوم الزاہرہ: ۲۲۳/۱، یعقوبی: ۱۹/۳، طبری: ۱۹/۵)

ولید نے مدینہ میں آج جو کچھ دیکھا وہ اس سے نہایت خوش ہوا۔ چنانچہ اس نے خوب داد و دہش کی۔ پھر کافی دیر تک ٹھہر کر وہ فوارہ دیکھا جو سیدنا عمر رحمہ اللہ کے ذہن و فکر کا نتیجہ تھا۔ اس نے فوارے کے پانی کا حوض

Marfat.com

بھی دیکھا اور اس میں سے پانی کے اچھلنے کا مشاہدہ بھی کیا جو اسے بہت پسند آیا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کی دیکھ بھال کے لیے ملازم رکھے جائیں اور مسجد والوں کو یہیں سے پانی پہنچایا جائے۔ (طبری: ۲۴/۵)

ولید مدینہ والوں کے خیالات معلوم کرنا چاہتا تھا جس کے لیے وہ جمعہ کا منتظر رہا۔ جمعہ کا روز آیا تو اس نے مسجد میں جا کر لوگوں کو نماز پڑھائی۔ پھر تقریر کی جس میں مدینہ کے لوگوں کو دھمکایا اور خطبہ سنت وعادت کے خلاف منبر پر بیٹھ کر دیا اور پھر جلد ہی مدینہ طیبہ سے واپس چلا گیا۔ ولید کے اس خطبہ نے اہل مدینہ کے جذبات کو بھڑکا دیا اور اب اہل مدینہ اس کو کھلم کھلا برا بھلا کہنے لگے کیونکہ اس نے خلاف سنت بیٹھ کر خطبہ دیا۔ اکابر مدینہ کو سواریوں سے اتارا اور انھیں اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کیا حتیٰ کہ لوگوں کو ذوخشب میں لے جا کر کھانا کھلایا اور اپنے آنے کے لیے لوگوں کو مسجد نبوی سے نکلوا دیا۔ اس لیے سیدنا سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کے مسجد سے نہ نکلنے کو خوب سراہا گیا اور ان کے لیے تحسین وآفرین کے ڈونگرے برسائے گئے۔

اہل مدینہ کے بھڑکنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ولید نے مدینہ میں جود وداد ودہش کی اور سخاوت کا جو بازار گرم کیا وہ صرف امراء اور بڑے بڑے روساء کے لیے تھا۔ اس نے فقراء ومساکین کو کچھ بھی نہ دیا۔ جس سے اہل مدینہ نے یہ سمجھا کہ اس کو غرباء وفقراء کی کچھ پروا نہیں، وہ صرف بڑے بڑے لوگوں کو خوش رکھنا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ مدینہ کے لوگوں کے غیظ وغضب کے شعلے بھڑک اٹھے اور مدینہ کے دروازے ان لوگوں کے لیے کھل گئے جن کو حجاج بن یوسف اپنی سختی اور جبر سے بھگا دیتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی لوگوں کے اس سیلاب میں بہہ گئے اور اہل مدینہ کی طرح حجاج سے ناراض ہو گئے اور مدینہ میں واپس آنے والوں کو ترحم اور شفقت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور ولید کو ان تمام مظالم کی اطلاع دی جو حجاج نے اہل مدینہ پر کیے تھے اور اہل عراق سے جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کے برے نتائج سے بھی ولید کو مطلع کیا۔ (النجوم الزاہر: ۲۲۶/۱)

اس دوران ایک حادثہ اور ہو گیا کہ سنہ ۹۲ھ میں ولید نے حجاج بن یوسف ثقفی کو امیر الحج بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ وہ مدینہ بھی جائے۔ جب یہ خبر مدینہ کے لوگوں کو پہنچی تو وہ جوش میں آ گئے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے لوگوں کے بھڑکے ہوئے جذبات دیکھ کر خلیفہ مسلمین کو لکھا کہ حجاج کو مدینہ ہرگز نہ بھیجا جائے۔ کیونکہ لوگوں کے جذبات اس کے سخت خلاف ہیں۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ کے خط سے ولید کو اندیشہ ہوا کہ کہیں معاملہ بگڑ نہ جائے اس لیے اس نے حجاج کو لکھا کہ مدینہ کے راستے سے ہٹ کر جائے اور سیدھا مکہ جائے مدینہ میں ہرگز نہ جائے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم: ۲۶۲) ولید نے اگرچہ حجاج کو مدینہ جانے سے روک دیا لیکن حجاج کو امارت حج پر برقرار رکھا۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ کے اس خط نے ولید کے دل میں ایک خلش پیدا کر دی اور وہ دل میں کچھ ناراضگی رکھنے لگا۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ کے اس خط کے بارہ میں حجاج بن یوسف کو بھی پتہ چل گیا لہٰذا وہ بھی عمر بن العزیز رحمہ اللہ کے بارہ میں اپنے دل میں کدورت رکھنے لگا۔ اس وجہ سے وہ وقتاً فوقتاً ولید سے سیدنا عمر رحمہ اللہ کے بارہ میں شکایات کرنے لگا اور جب بھی موقع ملتا اس کے کان بھرتا یہاں تک کہ ولید نے سیدنا

Marfat.com

عمر رحمہ اللہ کو مدینہ کی گورنری سے معزول کرنے کا عزم کر لیا۔

اب ولید نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو مختلف امور میں آزمانا شروع کیا کہ وہ میرے حکموں کی تعمیل کرتے ہیں کہ نہیں۔ اس نے حکم دیا کہ مدینہ طیبہ سے ایک دستہ ترتیب دے کر بھیجیں۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ نے اس کی فوری تعمیل کی اور دو ہزار جوانوں پر مشتمل ایک دستہ ترتیب دے کر محاذ جنگ پر بھیج دیا۔ پھر ولید نے یہ حکم دیا کہ فلاں شخص کو سو کوڑے مارے جائیں۔ عمر رحمہ اللہ نے اس حکم کی بھی فوری طور پر تعمیل کی بلکہ باوجود اس بات کے کہ وہ آپ کا ایک رفیق اور دوست تھا، آپ نے اس کو سزا دینے میں ذرا سی بھی رو رعایت نہ کی۔

اسی دوران ولید نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو مسجد نبوی کی توسیع کا حکم دیا اور یہ بھی لکھا کہ امہات المومنین کے حجرات کو گرا کر مسجد میں شامل کیا جائے۔ عمر رحمہ اللہ نے خلیفہ کے حکم کی فوراً تعمیل کی لیکن جب ان حجروں کو گرانا شروع کیا اس روز اہل مدینہ کو انتہائی صدمہ ہوا۔ اگرچہ سیدنا عمر رحمہ اللہ کے ساتھ بھی چوٹی کے علماء تھے جن کی رائے سے ان حجرات کو گرایا گیا لیکن خبیب بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، عمر رحمہ اللہ کے پاس آئے اور کہا کہ خدارا تم قرآن حکیم کی یہ آیت ﴿ان الذین ینادونك من وراء الحجرات اکثرهم لا یعقلون﴾ یعنی جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر عقل سے کورے ہیں، نہ مٹاؤ مطلب ان کا یہ تھا کہ ان حجروں کو باقی رکھا جائے لیکن ان کی یہ بات نہ مانی گئی، کیونکہ مدینہ کی گورنری کے زمانہ میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس قدر نیک دل نہ تھے بلکہ ایک عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والے نوجوان تھے۔ اس وقت آپ کا بدن شاداب اور موٹا تازہ تھا۔ چنانچہ یونس بن ابی شعیب کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے پیٹ کی سلوٹ میں آپ کے تہہ بند کا کنارا چھپا ہوا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۱۲)

ولید بن عبدالملک کو جب خبیب کی ان باتوں کا علم ہوا کہ اس نے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے حجرات کے انہدام پر احتجاج کیا ہے اور اہل مدینہ نے بھی ان کا ساتھ دیا ہے تو وہ بے قرار ہو گیا اور اس نے خبیب کے لیے یہ سزا تجویز کی کہ اسے سو کوڑے لگوائے جائیں پھر انھیں پس دیوار زندان کر دیا جائے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو اگر پتہ ہوتا کہ حجاج نے ولید کو انھیں معزول کرنے کا مشورہ دیا ہے تو وہ خبیب کو کبھی بھی خلیفہ کی تجویز کردہ سزا نہ دیتے۔ چنانچہ انھوں نے خبیب کو پٹوایا اور ان پر خلیفہ کی سزا جاری کرنے میں بے رحمی سے کام لیا کیونکہ انھیں علم تھا کہ خبیب شدت بخار میں مبتلا ہیں۔ انھیں بلایا گیا، ان کے لیے ایک گھڑے میں پانی ٹھنڈا کیا گیا اور موسم سرما کی ایک نہایت ٹھنڈی صبح کو مسجد کے آگے ان پر وہ ٹھنڈا پانی ڈالا گیا جس سے وہ ٹھٹھر گئے اور نزع کی حالت میں مبتلا ہو گئے اور اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو انتقال کر گئے۔ عمر بن عبدالعزیز کو جب ان کے انتقال کا علم ہوا تو مضطرب ہو گئے اور جو کچھ ہو گیا اس پر اظہار ندامت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز اس صدمہ کی وجہ سے خود ہلاکت کے قریب ہو گئے۔

Marfat.com

گورنری سے معزولی:

اگرچہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے گورنر مقرر ہونے سے قبل امیر المومنین سے یہ شرط کر لی تھی کہ وہ گزشتہ گورنروں کی طرح لوگوں پر کوئی زیادتی نہیں کریں گے نہ مالی اور نہ بدنی، لیکن بنوامیہ کے عہد میں نظام حکومت ہی کچھ ایسا بن گیا تھا کہ آپ کی یہ شرط قائم نہ رہ سکی تھی۔ اس لیے ایک روایت کے مطابق حجاج بن یوسف ثقفی کی شکایت پر آپ گورنری سے معزول کر دیئے گئے۔ (طبری: ۹۱/۵) اور دوسری روایت یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے خبیب رحمہ اللہ کو جو بنوامیہ کی حکومت کے سخت مخالف تھے، ولید نے انھیں سزا دینے کے لیے گورنر مدینہ کو لکھا۔ آپ دلی طور پر اس کو سزا نہیں دینا چاہتے تھے لیکن ولید کے حکم سے مجبور ہو کر اسے سزا دی جس سے وہ انتقال کر گئے۔ اس واقعہ کی ندامت کے طور پر آپ نے خود گورنری سے استعفیٰ دے دیا اور ساری زندگی اس واقعہ پر کف ندامت ملتے رہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آپ نے اسے کوڑے لگوائے اور سخت سردی میں کھڑے رکھا جس سے ان کا انتقال ہو گیا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۲۰/۵) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سنہ ۹۳ھ میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو مدینہ کی گورنری سے معزول کیا گیا جب آپ مدینہ شہر سے باہر نکلے تو رو پڑے اور فرمایا: ''معلوم ہوتا ہے کہ ہم مدینہ کی میل کچیل ہیں تبھی تو مدینہ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مدینہ میل کچیل کو اس طرح باہر نکال دیتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو نکال دیتی ہے پھر جب آپ دمشق پہنچے تو ایک روز سننے والوں نے آپ کو یہ فرماتے سنا کہ جب میں مدینہ میں تھا تو کوئی مجھ سے زیادہ عالم نہ تھا اور جب میں شام آیا تو سب کچھ گلدستہ طاق نسیان ہو گیا۔'' (البدایہ والنہایہ: ۱۹۵/۹)

سیدنا عمر بن بدالعزیز رحمہ اللہ کی معزولی چونکہ حجاج کی سازش کے تحت ہوئی تھی اس لیے حجاج نے حجاز کی گورنری کے لیے ولید کو دو شخصیات کی طرف اشارہ کیا جو سیدنا عمر رحمہ اللہ کے بعد حجاز کی گورنری کی اہلیت رکھتے تھے۔ مکہ کی گورنر کے لیے خالد بن عبداللہ قسری اور مدینہ کی امارت کے لیے عثمان بن حیان مری کا نام تجویز کیا۔ ولید نے حجاج کے مشورہ کے مطابق ان دونوں کو مکہ اور مدینہ کا گورنر لگا دیا۔

اہل مدینہ ولید سے پہلے ہی ناراض تھے۔ اب اس نئے گورنر عثمان بن حیان مری نے آتے ہی مدینہ والوں کو جو خطبہ دیا اس میں انھیں ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ میں نے تمھاری مجلسوں اور محفلوں میں اپنے جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں جو مجھے تمھاری ہر بات کی خبر دیتے ہیں۔ تم اپنے حاکموں پر عیب لگانا چھوڑ دو، وگرنہ تمھیں اس کی سخت سزا دی جائے گی۔ تم لوگ عراقیوں کو پناہ دینا چھوڑ دو۔ اگر تم میں سے کسی نے کسی عراقی کو اپنے مکان میں پناہ دی تو میں پناہ دینے والے کو قرار واقعی سزا دینے کے ساتھ ساتھ اس کے مکان کو بھی منہدم کر دوں گا۔ (طبری: ۲۵۸/۵۔۲۵۹)

Marfat.com

چنانچہ اس نے اپنے اس خطاب کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ اس نے اپنے جاسوس کو لوگوں کی تفتیش کے لیے تعین کر دیا۔ اگر وہ کسی کے ہاں کسی عراقی کو پاتے تو اس پر یکایک ٹوٹ پڑتے، اور پناہ دینے والے اور عراقی دونوں کو گرفتار کر کے پس دیوار زندان کر دیتے۔ عثمان بن حیان مری نے جو کچھ مدینہ منورہ میں لوگوں سے کیا، خالد قسری نے وہی کچھ اہل مکہ کے ساتھ کیا۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ دمشق کی راہ پر:

ادھر مکہ اور مدینہ میں لوگوں کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا تھا کہ ان کو ڈرا دھمکا کر ان پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا تھا۔ ادھر سابق گورنر حجاز سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ شعبان سنہ ۹۳ ھ کو اپنے ایک غلام مزاحم کے ساتھ رات کی تاریکی میں مدینہ سے نکلے۔ اس وقت اگرچہ پورا مدینہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن مدینہ اور مکہ کا یہ سابقہ گورنر جس کا سامان تیس اونٹوں پر مدینہ گیا تھا، اب صرف ایک غلام مزاحم کے ساتھ مدینہ سے نکلا تاکہ اس کے نکلنے کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ مدینہ سے نکلتے وقت انھیں دو احادیث نبوی ذہن میں آئیں۔ ایک یہ کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی مدینہ سے نہیں نکلے گا مگر اللہ تعالیٰ اس کے عوض اسے بہترین جگہ دے گا یا اس کے مثل کر دے گا اور دوسری حدیث یہ ذہن میں آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ بھٹی کی طرح ہے کہ وہ میل کچیل اور گندگی نکال باہر کرتا ہے۔ آپ نے نہایت بے چینی کی حالت میں اپنے غلام مزاحم سے فرمایا: مزاحم، ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں ہم ان میں سے نہ ہوں جن کو مدینہ نکال باہر کرتا ہے۔ (طبری: ۵/۵۶)

عمر اور ان کا غلام مزاحم دونوں اس شاہراہ پر جا رہے تھے جو ملک شام کو جاتی ہے حتیٰ کہ دونوں مقام سویدا پر پہنچے۔ یہاں عمر رحمہ اللہ کا ایک مکان تھا۔ وہ یہاں ٹھہر گئے اور خلوت کے ایام میں ان تمام واقعات کو یاد کر کے غور و فکر کرنے لگے جو مدینہ کی زندگی میں آپ پر گزرے۔ مدینہ آپ کے لیے نیا نہیں تھا یہیں آپ کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ یہیں کے اساتذہ سے آپ نے تربیت حاصل کی تھی اور یہیں گورنر کی حیثیت سے انھوں نے زندگی کے کئی سال گزارے۔ ان سب واقعات پر غور و فکر کرتے انھیں اپنے والد عبدالعزیز کی ایک نصیحت یاد آئی۔ انھوں نے کہا تھا: "بیٹا! ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا اور حسن تدبیر سے اپنے مال کی حفاظت کرنا، اپنے معاملات میں نرمی سے کام لینا کیونکہ جس میں نرمی نہیں ہوتی اس کی زندگی خوشگوار نہیں ہوتی اور اپنی خواہش کو مختصر رکھنا کیونکہ جو اپنی خواہش کو مختصر نہیں رکھتا وہ، صاحب عقل و دانش نہیں ہوتا۔" (الحکمۃ الخالدہ: ۱۸۵ المسکویہ)

اب عمر رحمہ اللہ نے اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا کہ اس نے اپنے والد کی اس نصیحت پر کہاں تک عمل کیا ہے؟ اسے پتہ چلا کہ اس نے حسن تدبیر سے اپنے مال کی کبھی حفاظت نہیں کی بلکہ اس نے اپنا تمام مال کپڑوں اور خوشبویات پر خرچ کر دیا ہے حالانکہ جو روپیہ اس نے اپنی ذات پر خرچ کیا ہے وہ اس کا حق

Marfat.com

نہیں ہے۔ پھر انھوں نے دوسری نصیحت پر غور وخوض کیا تو انھیں پتہ چلا کہ انھوں نے جن لوگوں سے معاملہ کیا ہے۔ ان سے نرمی کا سلوک نہیں کیا بلکہ سنگ دلی کی انتہا تک ان سے معاملہ کیا ہے۔ مدینہ پر لشکر بٹھا دیئے، خبیب بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو نہایت سنگ دلی سے قتل کر دیا۔ پھر سوچا تو پتہ چلا کہ انھوں نے اپنی ضرورتوں کو مختصر نہیں کیا اور اپنی خواہش کو بھی نہیں دبایا۔ قرظی کی نصیحت پر بھی عمل نہیں کیا جب انھوں نے دامن گھسیٹنے پر مجھے نصیحت کی تھی بلکہ ولید کو خوش کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دی لیکن خوش وہ بھی نہ ہوا۔

اب انھوں نے تصور کی آنکھ سے نہ صرف مدینہ منورہ کو بلکہ پوری اسلامی مملکت کو دیکھا تو پتہ چلا کہ تمام شہروں میں مظالم کی ایک ہولناک آگ بھڑک رہی ہے اور تمام لوگوں کو مصائب کی تاریکیوں نے ڈھانپا ہوا ہے اور پورا عالم اسلام ان مظالم اور مصائب سے بلبلا رہا ہے۔ امراء نے ولید کو خوش کرنے کے لیے تمام لوگوں کو مصائب کی تاریکیوں نے ڈھانپا ہوا ہے اور پورا عالم اسلام ان مظالم اور مصائب سے بلبلا رہا ہے۔ امراء ولید کو خوش کرنے کے لیے تمام لوگوں کو ناخوش کر رہے ہیں۔ ولید عمر رحمہ اللہ سے خوش نہیں ہوا جب کہ عمر رحمہ اللہ لوگوں کو اس کی خاطر ناراض کر چکا ہے۔ اب ولید کا ایک ایک ظلم ایک فلم کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا کہ اس نے شام میں اہل حمص پر اپنی اولاد کو مسلط کر رکھا ہے جو لوگوں کا مال ناحق کھا رہے ہیں۔ ان کی زمینیں لوٹ رہے ہیں اور ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر رہے ہیں۔ ولید کی اولاد نے ہر شہر کے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے اور حالت یہ ہے کہ ان کا باپ ان تمام ناپسندیدہ افعال پر ان کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ ولید نے نہ صرف اپنے حق میں بلکہ اپنی اولاد کے حق میں بھی برا کیا ہے اور ان کی راہ میں کانٹے بوئے ہیں۔ اپنی اولاد کو سرکش، مغرور اور نخوت پسند بنایا ہے اور نہ صرف عوام پر بلکہ فوجوں پر بھی اپنی نااہل اولاد کو مسلط کر رکھا ہے بلکہ فوجوں کا سپہ سالار بنا رکھا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ حجاج بن یوسف ثقفی جیسے سخت گیر شخص کو عراق اور اس کے علاوہ دوسرے علاقوں کا حاکم اور امیر بنا رکھا ہے جو مال غلط طریقوں سے جمع کر رہا ہے اور ناحق خونوں سے اپنے ہاتھوں کو رنگین کر رہا ہے اور لوگ آئے روز اس کے مظالم کا شکار رہتے ہیں۔

صرف حجاج ہی نہیں بلکہ ولید نے قرہ بن شریک کو جو ایک ٹھیٹھ دیہاتی اور اکھڑ گنوار ہے، مصر پر مسلط کر رکھا ہے جو مختلف قسم کے لہو ولعب میں مشغول رہ کر داد عیش دیتا ہے اور مصریوں کے اموال کو اپنے لیے حلال و طیب سمجھے ہوئے ہے اور یمن پر حجاج بن یوسف ثقفی کے بھائی محمد بن یوسف ثقفی کو گورنر بنا رکھا ہے۔ ان سب امراء اور حاکموں نے عوام کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا ہوا ہے اور ان کے مالوں کو اپنے عیش وعشرت کے لیے ناحق کھا رہے ہیں۔ (عیون الاخبار: ۱۸۲/۳ لابن قتیبہ الدینوری) مختصر یہ کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا جس شہر تک بھی تصور جاتا آپ دیکھتے کہ عوام وخواص ظالم حکمرانوں کے مظالم سے کراہ رہے ہیں اور کسی متنفس کو کوئی راحت نصیب نہیں ہو رہی۔ (النجوم الزاہرہ: ۲۱۸/۱، ۲۲۳) اس زمانہ میں چھوٹی بڑی زیادتیوں کو بھی ظلم ہی کہتے تھے۔

سویداء کے مقام پر تنہائی کے لمحوں میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے جب مسائل کا گہری نگاہ سے مطالعہ

Marfat.com

کیا تو انھیں پتہ چلا کہ اللہ کی زمین ان لوگوں کے مظالم سے بھرپور ہے اور ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے میں عاجز ہوں۔ ہاں اگر تخت خلافت پر کوئی ایسا شخص متمکن ہو جس کی سیرت سیدنا فاروق اعظم سے ملتی ہو اور وہ ظالم کو نہایت سختی سے روکے تو پھر حالات بہتر ہو سکتے ہیں ورگرنہ اللہ کی مخلوق اسی طرح کراہتی رہے گی۔ اب انھوں نے اپنے اندر جھانکا تو پتہ چلا کہ وہ کسی کے لیے نمونہ نہیں بن سکتے کیونکہ ان کے اپنے اندر وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جن کو ختم کرنے کا وہ عزم کیے ہوئے ہیں اور جب تک وہ خود اپنی اصلاح نہ کریں گے۔ دوسروں کی کوئی اصلاح نہیں کر سکتے۔ اب ان کے اندر خیر و صلاح کے جذبات پیدا ہوئے اور انھوں نے ان تمام خرابیوں سے توبہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا جو اب تک ان میں موجود تھیں۔ توبہ تو انھوں نے پہلے بھی کئی بار کی تھی لیکن مدینہ کی گورنری سے معزولی کے بعد انھوں نے جو توبہ کی وہ توبۃ النصوح ثابت ہوئی۔

اب انھوں نے ان مظالم کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے شروع کیے۔ اب ان کے دل میں خلافت کی تمنا پیدا ہوئی کہ کاش میں خلیفہ ہوتا اور اپنے نانا فاروق اعظم کی طرح ملک کی ساری خرابیاں دور کرسکتا اور اپنی عیش و عشرت کی زندگی سے دست بردار ہوتا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ میرا لباس اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے جس لباس پر کسی کی نگاہ پڑ جائے وہ بھی میرے نزدیک پرانا ہو جاتا ہے بیش قیمت اور عمدہ قسم کی غذا استعمال کرتا ہوں۔ مال و دولت کی میرے ہاں فراوانی ہے۔ خوشبویات کا استعمال میرے ہاں وافر ہے غرضیکہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پانی کی طرح روپیہ بہاتا ہوں لیکن اسی ملک میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کو عریانی کا لباس میسر ہے، دن رات فاقہ کرتے ہیں اور نان شبینہ کے محتاج ہیں، پینے کا پانی بھی صحیح طور پر انھیں میسر نہیں ہوتا۔ یہ ساری باتیں ذہن میں رکھ کر انھوں نے مستقبل کے منصوبے بنانے شروع کیے۔

عمر رحمہ اللہ چونکہ پختہ ارادے اور فہم و فراست کے مالک تھے لہٰذا انھوں نے سب سے پہلے اپنی اصلاح کا عزم کیا اور عیش و عشرت کی تمام اشیاء کو یک قلم ترک کر دیا۔ ارباب دانش و بینش بخوبی جانتے ہیں کہ انسان کا دفعتاً پارسا بن جانا کس قدر مشکل ہے لیکن عمر رحمہ اللہ نے فطری طریقہ اختیار کیا اور آہستہ آہستہ اپنے نفس کو بلند حوصلے اور عالی عزم کے ساتھ اعتدال اور عفت کا عادی بنانے لگے اور اس طرح انھوں نے غلط راستہ چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کی۔ مختصر یہ کہ خبیب بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قتل اور عمر رحمہ اللہ کی مدینہ کی گورنری سے معزولی ایک اچھا شگون ثابت ہوئی اور انھوں نے اپنا نفس عدالت و رحمت کے لیے تیار کرلیا۔ جب عمر رحمہ اللہ نے دیکھا کہ ان کا عزم درست ہو گیا ہے تو اب انھوں نے مزاحم کے ساتھ سویدا چھوڑنے کا ارادہ کیا اور چاہا کہ دمشق میں رہائش پذیر ہو کر دربار خلافت تک رسائی حاصل کریں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ولید کی مجلس میں گھس جایا کریں اور اس کے لیے مار آستین یا بغلی گھونسا ثابت ہوں۔ آپ کو یہ یقین تھا کہ دمشق میں رہ کر وہ ولید کے مقرب ہو جائیں گے کیونکہ آخرکار وہ اس کے عزیز اور بہنوئی ہیں۔ ولید نے عمر رحمہ اللہ سے پورے تعلقات ختم نہیں کیے تھے، صرف ان سے قدرے بگڑ گیا تھا اور عمر رحمہ اللہ نہ صرف گورنر تھے بلکہ ایک فقیہ، محدث اور مجتہد بھی تھے۔ شام کے

Marfat.com

علماء نے ان سے ملاقات کرنے کے بعد یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ علم میں آپ کے شاگرد ہیں۔ جس کی وجہ سے ولید نے انھیں مشیر و مفتی کی حیثیت سے اپنا مقرب بنالیا تھا۔ اور دربار خلافت میں ان کو پوری رسائی حاصل ہوگئی تھی۔

دارالخلافت دمشق میں آپ ولید کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن مقرر ہوگئے۔ چنانچہ اب حالت یہ تھی کہ عمر رحمہ اللہ کو جب بھی موقع ملتا تو آپ ولید کو اس کے عمال و حکام کے سلسلہ میں آڑے ہاتھوں لیتے اور "الدین النصیحۃ" کے طور پر اس کی خیر خواہی کرتے ہوئے اس کو بعض دفعہ ڈانٹ بھی لیتے۔ چنانچہ ایک روز ولید سے فرمایا: "امیر المومنین! میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا جب آپ کاروبار خلافت سے مکمل طور پر سکون و اطمینان کی حالت میں ہوں تو آپ مجھ سے وہ نصیحت معلوم کرلیں۔ ولید نے پوچھا: اب اس نصیحت سے کون سی شے مانع ہے۔ فرمایا، مانع تو کچھ نہیں لیکن آپ کا قلب چونکہ اس وقت سکون سے عاری ہے لہٰذا آپ اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ اس کو سن نہیں پائیں گے۔ ایک روز سیدنا عمر رحمہ اللہ شامیوں کی ایک جماعت کے ساتھ بارگاہ خلافت میں حاضر ہوئے۔ ولید نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: "ابوحفص! آپ وہ نصیحت فرمائیں۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ نے فرمایا: "امیر المومنین! سنیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ خون ناحق ہے۔ آپ کے گورنر اور امراء لوگوں کو ناحق قتل کرڈالتے ہیں اور آپ کو اس کا سچا جھوٹا جرم لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس گناہ عظیم کے بارہ میں آپ ہی سے باز پرس کرے گا۔ اللہ کے ہاں پکڑے آپ ہی جائیں گے کیونکہ آپ نے انھیں گورنر مقرر کیا ہے، لہٰذا آپ انھیں لکھ دیں کہ کوئی گورنر کسی کو قتل نہ کرے جب تک کہ اس جرم کی آپ کو اطلاع نہ دی جائے اور پھر اس کے اس جرم پر شرعی شہادت پیش نہ کی جائے۔ پھر آپ خود اس کے بارہ میں اپنا حکم صادر فرمائیں کہ وہ واجب القتل ہے یا نہیں۔ بات درست تھی لیکن نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد کے اصول کے تحت ولید کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ اپنا غصہ پی گیا اور بولا: "ابوحفص! اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی برکات نچھاور فرمائے۔"

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کوئی معمولی شخص نہ تھے۔ آخر ولید کے بہنوئی تھے، مروان کے پوتے اور علم و عمل کا کوہ گراں، لہٰذا ولید نے ان کی اس نصیحت کا تجربہ کرنا چاہا اور عمر رحمہ اللہ کی یہ نصیحت تمام شہروں کے حکام کو اور خصوصی طور پر حجاج بن یوسف ثقفی کو لکھ بھیجی۔ حجاج نے اس کے جواب میں ایک خارجی کو ولید کے پاس بھیجا جو بنوامیہ کے خلفاء کو گالیاں بکتا تھا یہاں تک کہ ولید بھی اس کی گالیوں اور سب و شتم سے محفوظ نہ تھا بلکہ ولید کو تو وہ دل کھول کر گالیاں دیتا تھا کیونکہ اس کی نگاہ میں ولید ان تمام خلفاء میں سب سے زیادہ ظالم اور ستم گر تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے حجاج جیسے ظالم شخص کو عراق کا گورنر مقرر کیا ہوا تھا۔

ولید نے عین دوپہر کے وقت خلاف معمول عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو بلوایا۔ جب وہ بارگاہ خلافت میں پہنچے تو دیکھا کہ خلیفہ کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے ہیں۔ ولید نے اشارہ کر کے انھیں اپنے قریب بٹھایا۔ عمر رحمہ اللہ نے دیکھا کہ ایک بے رحم جلاد خالد بن ریان برہنہ تلوار لیے ولید کے پاس کھڑا ہے۔ پھر ولید نے اس خارجی

Marfat.com

سے پوچھا جس کو حجاج نے ولید کے دربار میں بھیجا تھا کہ فلاں فلاں خلیفہ کے بارہ میں تیری کیا رائے ہے؟ خارجی نے ان خلفاء کی مذمت کرنا شروع کر دی۔ ولید نے پھر پوچھا کہ میرے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ اس خارجی نے صاف جواب دیا: تو ایک ظالم اور ستم گر شخص ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھ پر لعنت کرے۔ ولید نے اسی وقت جلاد خالد بن ریان کو حکم دیا کہ اس کا سر اس کے جسم سے جدا کر دیا جائے۔ جلاد نے اسی وقت حکم کی تعمیل کی۔ اب ولید نے عمر رحمہ اللہ سے پوچھا: جو لوگ خلفاء کو گالیاں دیتے ہیں۔ ان کو قتل کرنا چاہیے یا نہ؟ عمر رحمہ اللہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ دو تین دفعہ پوچھنے پر بھی عمر رحمہ اللہ خاموش ہی رہے۔ جب ولید نے بار بار پوچھا تو عمر رحمہ اللہ نے مہر خاموشی توڑتے ہوئے جواب دیا کہ اسے سزا دی جائے۔ اس جواب سے ولید کو سخت غصہ آیا، وہ عمر رحمہ اللہ کے منہ سے قتل کا فتویٰ کہلوانا چاہتا تھا۔ عمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں دربار خلافت سے واپس آ گیا لیکن نہایت ڈرا ہوا کہ شاید خلیفہ کی نازک مزاجی میرے متعلق بھی کوئی غلط حکم نہ دے دے۔ میں گھر آ کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ولید نے عمر رحمہ اللہ کو اپنے گھر بلوایا اور پھر اس خارجی کے بارہ میں ان کی رائے طلب کی کہ میں نے جو اس کے قتل کا حکم دیا تھا وہ درست تھا یا نہیں؟ اب عمر رحمہ اللہ نے جواب دیا: ''امیر المومنین! اس کا قتل درست نہیں تھا، البتہ اسے کوئی سزا دی جا سکتی تھی اور اگر آپ چاہتے تو اس کو معاف بھی کیا جا سکتا تھا ورنہ پھر قید کر دیتے۔'' ولید کی طبع نازک پر یہ بات گراں گزری وہ اپنے اس فعل کے جواز پر ان سے فتویٰ چاہتا تھا جو انھوں نے نہ دیا۔ لہٰذا وہ غصے سے بھڑک اٹھا۔ عمر رحمہ اللہ نے اس کے غصہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک مخلص و صادق خیر خواہ کے انداز سے اٹھ کر اپنے گھر کی طرف بڑھے۔ ان کے پیچھے پیچھے جلاد خالد بن ریان بھی نکلا جو اپنے آقا ولید کے غصہ کو کئی بار دیکھ چکا تھا اور اس کے سامنے عمر رحمہ اللہ کا فتویٰ بھی سن چکا تھا۔ وہ عمر رحمہ اللہ سے بولا: ''ابو حفص! اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔ آپ نے امیر المومنین سے بحث کی جس سے مجھے خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں امیر المومنین آپ کے بارہ میں بھی وہ حکم نہ دے دیں جو انھوں نے اس خارجی کے بارہ میں دیا تھا۔'' سیدنا عمر رحمہ اللہ کو جلاد کی یہ بات سخت ناگوار گزری لیکن آپ نے مصلحت کے پیش نظر اپنا غصہ ضبط کر لیا اور جلاد سے پوچھا: اگر امیر المومنین تجھے میرے قتل کا حکم دیتے تو کیا تو اس کی تعمیل کرتا؟ اس نے کڑک کر جواب دیا واللہ! ضرور تعمیل کرتا۔ عمر رحمہ اللہ اس کے جواب پر خاموش ہو گئے لیکن جلاد کی اس بات کو انھوں نے نہاں خانہ دل میں محفوظ کر لیا۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم: ۱۳۹)

اب ولید نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو ایک اور مسئلہ میں الجھانا چاہا۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے بھائی سلیمان کو ولی عہدی سے ہٹا کر اپنی اولاد کو خلافت منتقل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اسے عمر رحمہ اللہ کے تعاون کی ضرورت تھی۔ جب اس نے اس بارہ میں عمر رحمہ اللہ سے بات کی تو انھوں نے جواب دیا ''امیر المومنین! ہم نے آپ دونوں بھائیوں کی ایک ہی وقت میں بیعت کی تھی، لہٰذا آپ سلیمان کو کیسے الگ کر سکتے ہیں؟

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۴۱)

Marfat.com

اس بات نے ولید اور عمر رحمہ اللہ کے درمیان اختلافات کی خلیج کو اور زیادہ کر دیا اور دونوں طرف نفرت کے جذبات بڑھنے شروع ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ولید نے عمر رحمہ اللہ کو تین روز کے لیے نظر بند کر دیا، ان کا دانہ پانی بند کر دیا گیا۔ پھر حکم دیا کہ عمر رحمہ اللہ اگر زندہ ہوں تو رہا کر دیے جائیں۔ آپ کی اہلیہ جب اس مکان میں داخل ہوئیں تو عمر رحمہ اللہ کو زندہ پایا صرف گردن میں سخت درد تھا جو بعد میں علاج سے درست ہو گیا۔ (سیرۃ ابن جوزی: ۲۴۸)

ایک مہینہ میں دو گورنروں کی موت:

ادھر حالات اس طرح کروٹیں بدل رہے تھے ادھر سنہ ۹۵ھ میں حجاج موت کے آہنی شکنجہ میں جکڑا گیا۔ اس کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر قرہ بن شریک عبسی گورنر مصر بھی موت کی آغوش میں چلا گیا۔ ان دو ظالموں کی موت عوام کے لیے بڑی راحت کا سبب بنی۔ (ابن اثیر: ۵/۹) ان دونوں کی موت نہ صرف عمر رحمہ اللہ کے لیے بلکہ پورے ملک کے لیے مسرت کا باعث ہوئی۔ عمر رحمہ اللہ حجاج کے بارہ میں اس کے مظالم کی وجہ سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر قیامت کے روز دوسری قومیں اپنے سب سے زیادہ خبیث شخص کو پیش کریں گی تو ہم حجاج کو ان کے سامنے پیش کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان سب قوموں پر غالب آئیں گے۔ (سیرۃ ابن جوزی: ۸۹)

ادھر عوام میں ان دونوں ظالموں کی موت سے خوشی اور مسرت کے شادیانے بج رہے تھے، دوسری طرف ان دونوں کی موت ولید کے لیے سخت صدمے کا باعث بنی کیونکہ ان کی موت نے تخت خلافت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے لوگوں کے سامنے اپنا بھرم رکھنے کے لیے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اس عورت کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو، سر کھول کر منبر پر چڑھ گیا۔ اس نے پہلے تو لوگوں کو ان دونوں کی موت کی خبر دی۔ پھر کہا: ''بخدا! میں ان دونوں کی ایسی شفاعت کروں گا جو انھیں مفید اور نافع ہو گی۔'' ولید جب اس قسم کی باتیں کر رہا تھا تو عمر رحمہ اللہ جو حاضرین میں موجود تھے، اس کی ان لایعنی باتوں کو سن کر مسکرا رہے تھے اور اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں سے فرما رہے تھے: ''اس خبیث کو دیکھو، اللہ کرے اسے سرکار دو عالم ﷺ کی شفاعت نصیب نہ ہو، اور اللہ اسے بھی ان دونوں خبیثوں کے ساتھ ملا دے۔'' (النجوم الزاہرہ: ۱/۱۸) ولید جب یہ تعزیتی خطبہ دے کر منبر سے نیچے اترا تو لوگ اس سے تعزیت کے لیے آگے بڑھے کیونکہ اس کی سلطنت کے دو اہم ستون گر گئے تھے۔ لیکن عمر رحمہ اللہ تعزیت کے لیے کھڑے نہیں ہوئے۔ ولید نے عمر رحمہ اللہ سے تعزیت کے لیے کھڑے نہ ہونے کا سبب پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: ''امیر المومنین! حجاج ہمارا آدمی تھا لہٰذا اس کی تعزیت ہم سے کرنی چاہیے۔'' ولید نے کہا: ''ٹھیک کہتے ہو۔''

ولید کی موت:

ان دونوں گورنروں کو مرے ابھی تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ ولید فلسطین کے شہر رملہ گیا جہاں مسلمانوں

Marfat.com

کی فوج رہتی تھی۔ ولید وہاں بیمار ہوگیا اور چند ہی روز میں اس بیماری سے مرگیا۔ اس کے مرنے کے بعد حسب وصیت اس کا بھائی سلیمان سریر آرائے خلافت ہوا۔ سلیمان کے تخت نشین ہونے سے عمر رحمہ اللہ نہایت خوش ہوئے۔ چنانچہ دمشق میں انھوں نے خود کھڑے ہوکر لوگوں سے سلیمان کے بیعت لی۔ (تاریخ یعقوبی: ۳/۴۷)

ولید اور سلیمان اگرچہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ دونوں عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کے بیٹے تھے لیکن دونوں کی طبیعتوں میں بڑا فرق تھا۔ ولید میں بھی بڑی خوبیاں تھیں لیکن اس کی سنگدلی نے اس کی تمام صفات پر پانی پھیر دیا تھا۔ ولید کے مقابلہ میں سلیمان رحم دل، نرم طبع، صائب الرائے اور نصیحت کو بغور سننے والا تھا۔ ولید کی طرح وہ زود رنج نہیں تھا۔ سلیمان نے وزارت اور مشورے کے لیے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو اپنا مشیر منتخب کیا۔ عمر رحمہ اللہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ سلیمان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس کے دل کی مٹی بہت زرخیز ہے صرف نصیحت کی نمی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا انھوں نے بھی اس سے اپنا تعلق استوار رکھا۔ اس کی صحیح صحیح رہنمائی کی۔ سلیمان بھی عمر رحمہ اللہ کو اپنا خیر خواہ اور مخلص دوست سمجھتے تھے۔ پھر نہایت قریبی رشتہ داری کا تعلق بھی تھا اس وجہ سے وہ ان سے ہر مسئلہ میں مشورہ لیتے رہتے۔ سلیمان جب کسی وجہ سے غصہ میں آجاتا تو عمر رحمہ اللہ اپنی نصیحت اور مشورہ سے اس کے غصہ کی آگ کو بجھا دیتے۔

سلیمان بن عبدالملک کے مزاج میں اثر ورسوخ:

ولید عبدالملک کا بڑا لڑکا تھا۔ اس نے اس کی تعلیم کے لیے بڑی کوشش کی لیکن ولید کی طبیعت تحصیل علم کی جانب راغب نہ ہوئی۔ اس لیے اگرچہ وہ علم سے بے گانہ تھا لیکن جہاں بانی کے تمام اوصاف اس میں بدرجہ کمال موجود تھے اور وہ بنوامیہ کا ایک کامیاب ترین خلیفہ تھا جیسا کہ اس کے عہد خلافت کے کارناموں سے ظاہر ہے۔ اس کی دینی زندگی بھی بڑی اچھی تھی۔ تین روز میں ایک قرآن ختم کرتا تھا۔ (دول الاسلام ذہبی: ۱/۴۸) دوشنبہ اور پنج شنبہ کو باقاعدگی سے روزہ رکھتا تھا (یعقوبی: ۲/۳۴۸) پورا رمضان روزہ داروں کے لیے کھانا بھجواتا تھا (یعقوبی: ۲/۳۴۸) صلحاء، اخیار اور فقہاء ومحدثین میں روپیہ تقسیم کراتا تھا۔ (دول الاسلام: ۱/۴۸) اور یعقوبی نے لکھا ہے کہ اپنے دور حکومت میں اس نے دو مرتبہ حج کیا۔ (یعقوبی: ۲/۳۴۹) سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو گورنر مدینہ مقرر کرنا اس کی سلیم الفطرتی کی ایک واضح دلیل تھی۔ اس کا سلوک اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی نہایت مشفقانہ تھا اور وہ ان سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور ان کے حقوق کا بڑا لحاظ رکھتا تھا۔ (مروج الذہب مسعودی: ۲/۵۹۹) خوبیوں کے ساتھ اس میں ایک عیب یہ تھا کہ وہ بڑا سخت گیر تھا اور اپنی اس سخت گیری کی وجہ سے ہزاروں انسانوں کو قید وبند میں ڈال رکھا تھا۔

ولید کے بعد اس کا حقیقی بھائی سلیمان بن عبدالملک مسند خلافت پر بیٹھا۔ اس کو اس کے باپ عبدالملک نے ولید کے بعد خلافت کے لیے نامزد کیا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ ولید نے سلیمان کے بجائے اپنے لڑکے کو اپنا ولی عہد بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ بعض امراء نے اس کے اس ارادہ کی پرزور حمایت بھی

Marfat.com

کی کیونکہ بادشاہوں کو اپنے حمایتی اکثر مل جاتے ہیں لیکن وہ اپنے اس ارادہ سے باز آ گیا۔ ولید کی وفات کے بعد جمادی الآخرۃ ۹۶ھ میں سلیمان نے زمام خلافت ہاتھ میں لی۔ سلیمان فطری طور پر ایک صالح اور سعید شخص تھا اور اس کی صالحیت اور سعادت مندی پر ایک بین دلیل یہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس کے ہم جلیس اور مشیر تھے کیونکہ وہ اپنے نیک اوصاف، حسن اخلاق اور خصائل حمیدہ کے باعث اپنے پورے خاندان میں محبوب تھے۔ سلیمان بھی ان کا نہایت معتقد تھا۔ اس وجہ سے اس نے ان کو اپنا وزیر و مشیر بنا لیا تھا اور وہ امور خیر اور رفاہ عامہ کی اصلاحات میں ان کے مشوروں پر عمل کرتا تھا۔

''اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی انھیں ہر وقت رعایا اور عوام الناس کے بارہ میں قیامت کے روز جواب طلبی سے ڈراتے رہتے تھے۔ چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ سلیمان اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ایک مرتبہ دونوں منیٰ میں کھڑے تھے۔ حج کی وجہ سے لوگوں کا ایک ازدحام تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیدنا عمر رحمہ اللہ نے سلیمان سے کہا: ''یہ سب لوگ آپ کی رعایا ہیں، یہ اتنی تعداد میں ہیں کہ آپ لوگ انھیں گن نہیں سکتے، ان سب کے بارہ میں قیامت کے روز آپ سے پوچھا جائے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ یہ سب قیامت کے روز آپ کے دشمن ہوں گے اور آپ کے خلاف گواہی دیں گے۔ سلیمان یہ سن کر رونے لگا۔'' (البدایہ والنہایہ: ۱۹۵/۹۔۱۹۶)

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی عمر رحمہ اللہ اور سلیمان میں رنجش بھی ہو جاتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ عمر رحمہ اللہ اور سلیمان گرمی کے موسم میں جہاد کے لیے نکلے۔ اتفاقاً ان دونوں کے غلام پانی پر لڑ پڑے اور عمر رحمہ اللہ کے غلاموں نے سلیمان کے غلاموں کو پیٹا۔ سلیمان کے غلاموں نے اپنے آقا سے اس بارہ میں شکایت کی۔ سلیمان نے عمر رحمہ اللہ سے کہا کہ آپ کے غلاموں نے میرے غلاموں کو پیٹا ہے۔ عمر رحمہ اللہ نے کہا مجھے علم نہیں۔ سلیمان نے اس بارہ میں کچھ تلخ کلامی کی۔ اس پر عمر رحمہ اللہ ناراض ہو کر کہنے لگے کہ جب سے میں ہوشیار ہوا ہوں، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ پھر عمر یہ کہتے ہوئے سلیمان کی مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ''آپ کی مجلس سے خدا کی زمین وسیع ہے۔'' (سیرۃ ابن جوزی: ۳۶) اس کے ساتھ ہی آپ نے مصر جانے کی تیاری کر لی۔ جب سلیمان کو عمر رحمہ اللہ کے مصر جانے کا پتہ چلا تو انھیں ناگوار گزرا۔ بعد میں ان کی پھوپھی نے ان دونوں کی صلح کرا دی اور پھر پھوپھی کے کہنے پر عمر رحمہ اللہ سلیمان کے پاس چلے گئے۔ سلیمان نے ان سے معذرت کر لی اور کہا: ''ابو حفص! جب کبھی مجھے کوئی غم یا پریشانی لاحق ہوتی ہے تو مجھے آپ ہی یاد آتے ہیں۔'' چنانچہ سیدنا عمر رحمہ اللہ نے مصر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ (قصص العرب: ۲۳۲/۱ لجاد المولیٰ)

سنہ ۹۷ھ میں عمر رحمہ اللہ نے سلیمان کے ساتھ حج بیت اللہ کیا (ابن اثیر: ۱۲/۵) جب یہ دونوں عرفات پہنچے تو سلیمان نے دیکھا کہ حاجیوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ اتنے بڑے ہجوم کو دیکھ کر سلیمان فرط مسرت سے کھل گیا اور سمجھا کہ میرے عہد خلافت میں لوگ نہایت امن و سکون سے ہیں، لیکن عمر رحمہ اللہ حج میں

Marfat.com

لوگوں کی بھیڑ اور کعبہ کے پردہ کے پاس لوگوں کے آنسوؤں کا بہنا دیکھ چکے تھے۔عمر رحمہ اللہ ان سب چیزوں کو خلیفہ کی آنکھ سے نہیں کسی اور آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ لوگ ان ہولناک مظالم کے نیچے دبے ہوئے رو اور بلبلا رہے ہیں اور وہ طواف وسعی میں گڑگڑا کر اللہ سے دعا مانگ رہے ہیں کہ اللہ انھیں ان مظالم سے نجات دلائے۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ سلیمان کے عہد خلافت کی تمام اصلاحات اور امور خیر کے باعث مورخین کی نگاہ میں بعض حیثیتوں سے وہ اپنے پیش روؤں سے زیادہ بہتر حکمران ثابت ہوا۔اس کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اس کی نیک طبعی کے باعث اموی حکومت کی سیاست یک قلم تبدیل ہوگئی جس کا اندازہ اس کی اس تقریر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو اس نے مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد کی۔اس نے کہا:

''الحمدللہ! دنیا دھوکے کی جگہ اور باطل کا گھر ہے۔ یہ ایسی ہے کہ رونے والے کو ہنساتی ہے اور ہنسنے والے کو رولاتی ہے۔ بے خوف کو خوف زدہ اور خوف زدہ کو بے خوف کرتی ہے دولت مند کو محتاج اور محتاج کو مال و دولت سے مالا مال کرتی ہے۔ یہ ایسی ہے کہ اہل دنیا کو مائل کرنے والی۔ دھوکہ دینے والی اور اپنے چاہنے والے کے ساتھ کھیلنے والی ہے۔اے اللہ کے بندو! کتاب اللہ کو اپنا امام بناؤ اور اس کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کردو۔اسے اپنا رہنما مانو کیونکہ وہ اپنے سے پہلی کتابوں کی ناسخ ہے اور خود اس کو کسی کتاب اور صحیفہ نے منسوخ نہیں کیا۔اے اللہ کے بندو! قرآن حکیم شیطان کے مکروفریب کو اسی طرح کھول دیتا ہے جس طرح صبح صادق کی روشنی رات کی تاریکی کو کافور کردیتی ہے۔'' (مسعودی:۲/۲۶۰، البیان والتبیین :۱/۱۶۶)

یہ خطبہ اس کی طبیعت کی سلامتی اور فطرت کی پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے لیکن اس پر مستزاد یہ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس کے مشیر تھے، لہٰذا عملی طور پر بھی اس کے محاسن کا ظہور ہوا۔ چنانچہ مسند خلافت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی سب سے پہلا کام اس نے جو کیا وہ یہ تھا کہ ولید بن عبدالملک کے دور کے ان تمام لوگوں کو جن کو اس نے ناحق پس دیوار زنداں کر رکھا تھا، فوری طور پر رہا کردیا جس کا یہ اثر ہوا کہ تمام جیل خانے یک قلم خالی ہوگئے۔ اس سے ایک تو لوگوں کے دلوں میں سلیمان کی عزت و توقیر پیدا ہوئی اور دوسرے حکومت کے اخراجات میں کمی ہوئی۔

اگرچہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سلیمان کے مشیر خاص تھے، لیکن وہ ان کے کسی ایسے مشورہ کو نہیں مانتا تھا جو اس کی طبیعت کے خلاف ہو۔مورخین نے اس کے بارہ میں لکھا ہے "احسن السيرة والمظالم"۔ (ابوالفداء:۱/۲۰۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اس میں فطری طور پر کچھ خوبیاں تھیں وہاں کچھ مظالم اور برائیاں بھی نہاں تھیں۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ اس میں انتقام کا مادہ بہت زیادہ تھا۔وہ اپنی مخالفت کرنے والوں کو کبھی بھی انتقام لیے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ چنانچہ جن جن لوگوں سے ولی عہدی کے زمانہ میں اس کو کسی قسم کی شکایت

Marfat.com

تھی، مسند نشین خلافت ہونے کے بعد ان کا انجام اچھا نہ ہوا جن میں بعض بڑے بڑے فاتحین اور اموی حکومت کے ستون تھے جن کی شمشیر خارا شگاف نے اپنی عسکری مہارت کا نہ صرف لوہا منوایا بلکہ اموی حکومت کے تحفظ اور اس کی وسعت کا باعث بھی بنیں۔ چنانچہ اس نے مسند نشین ہوتے ہی فاتح ترکستان قتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم فاتح ہند کو قتل کروا دیا۔ فاتح اندلس موسیٰ بن نصیر اور اس کے بیٹے عبدالعزیز بن موسیٰ کو جو شجاعت و شہامت میں اپنے باپ موسیٰ کی طرح تھا، ذلیل اور قتل کرایا، لہٰذا سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو مشیر مقرر کرنے کے باوجود اس کی سیرت میں محاسن و مظالم دونوں کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ سلیمان کے عہد خلافت کی اصلاحات دراصل عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے مشورے کی مرہون منت ہیں۔

خلافت:

سلیمان بن عبدالملک دابق میں مقیم تھا کہ یہیں مرض الموت میں مبتلا ہو گیا۔ اس وقت تک ولی عہد کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی اور وہ زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے اپنے نابالغ بیٹے ایوب کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ اس وقت محدث رجاء بن حیوۃ کندی اس کے ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا: ''امیر المومنین! خلیفہ کسی صالح، نیک اور امین و دیانت دار شخص کو بنانا چاہیے تاکہ قبر میں امن اور قیامت کے روز خجالت نہ اٹھانی پڑے۔'' سلیمان چونکہ نیک فطرت اور سلیم الطبع شخص تھا لہٰذا محدث رجاء کی یہ بات اس کے قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں گھر کر گئی۔ وہ اس مسئلہ پر غور کرنے لگا۔ دو دن کے بعد اس نے اپنا وصیت نامہ چاک فکر ڈالا اور رجاء بن حیوۃ سے پوچھا: ''میرے لڑکے داؤد کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' انھوں نے کہا: ''وہ اس وقت قسطنطنیہ کی مہم پر ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔'' کیونکہ قسطنطنیہ کی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ ہلاک ہو گیا تھا اور داؤد کے بارے میں کوئی پتہ نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے یا وہ بھی ہلاک ہو گیا ہے۔'' سلیمان نے کہا: ''اب آپ کی کیا رائے ہے؟ کس کو خلیفہ نامزد کیا جائے؟'' رجاء نے کہا: ''امیر المومنین! نامزدگی تو آپ نے کرنی ہے لہٰذا اصل رائے تو آپ کی ہے۔ آپ نام لیجیے میں غور کروں گا۔'' سلیمان نے کہا ''عمر بن بعدالعزیز رحمہ اللہ کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' رجاء نے جواب دیا: ''میرے نزدیک وہ نہایت فاضل، نیک، سلیم الفطرت، دیانت دار اور برگزیدہ مسلمان ہیں۔'' سلیمان نے کہا: ''بخدا! میرا بھی ان کے بارے میں یہی خیال ہے لیکن اگر عبدالملک کی اولاد کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور ان کی بجائے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو خلیفہ بنا دیا گیا تو ایک بڑا فتنہ پیدا ہو جائے گا اور لوگ ان کو خلافت پر قائم نہ رہنے دیں گے۔ لہٰذا میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو خلیفہ اور ان کے بعد یزید بن عبدالملک کو ولی عہد نامزد کرتا ہوں۔ اس سے لوگ کافی حد تک مطمئن ہو جائیں گے اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت تسلیم کر لیں گے۔ بات کافی حد تک

Marfat.com

معقول تھی کیونکہ اس نظام حکومت میں عبدالملک کی اولاد اپنے کو عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ خلافت کا مستحق سمجھتی تھی۔ رجاء نے سلیمان کی اس بات کی تائید کی۔ چنانچہ اس وقت سلیمان نے خود اپنے ہاتھ سے یہ وصیت نامہ تحریر کیا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: یہ تحریر خدا کے بندے سلیمان بن عبدالملک امیر المومنین کی طرف سے عمر بن عبدالعزیز کے لیے ہے۔ میں اپنے بعد آپ کو خلیفہ بنا تا ہوں اور آپ کے بعد یزید بن عبدالملک کو۔ لہٰذا مسلمانو! ان کا کہنا سننا اور ان کے احکام کی اطاعت کرنا، اللہ تعالیٰ سے ہر حالت ڈرنا اور آپس میں اختلاف نہ کرنا کہ دوسرے لوگ آپ پر حرص و آز کی نگاہ ڈالیں۔''

یہ وصیت نامہ سربمہر کر کے محدث رجاء بن حیوۃ کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ وہ خاندان کے لوگوں کو اکٹھا کر کے بغیر نام کے ظاہر کیے ان سے نامزد خلیفہ کی بیعت لے لیں۔ چنانچہ انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ سب نے بالاتفاق سمعنا واطعنا کہا۔ اس کے بعد پھر سب اہل خاندان سلیمان کو دیکھنے کے لیے گئے اور ان کے سامنے سب نے فرداً فرداً بیعت کی۔ (یہ تمام تفصیلات طبقات ابن سعد:۵ میں مذکور ہیں) اس مرحلہ سے فراغت کے بعد ماہ صفر ۹۹ھ میں سلیمان اس دار فانی سے عالم باقی کو انتقال کر گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ جب خاندان کے لوگ سلیمان کو دیکھنے کے لیے گئے تو سلیمان نے وصیت نامہ کی طرف جو محدث رجاء بن حیوۃ کے ہاتھ میں تھا، اشارہ کر کے ان لوگوں سے کہا: ''اس وصیت نامہ میں، میں نے جس کو خلیفہ بنایا ہے اس کی بیعت کرو اور اس کی اطاعت کرتے رہو۔ سلیمان کے کہنے پر دوبارہ سب نے فرداً فرداً بیعت کی۔ (البدایہ والنہایہ:۹/۱۹۵)

بعض روایات میں ہے کہ موت جب سلیمان کو جھانکنے لگی اور اس کی بے قراری میں اضافہ ہوا تو اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میرے بچے میرے سامنے مسلح پیش کیے جائیں یعنی تلواریں لٹکی ہوئی ہوں، زرہیں پہنی ہوئی ہوں اور لڑائی کی چادریں اوڑھے ہوئے ہوں۔ شاید میں اپنے کسی بچے میں شجاعت کے آثار دیکھوں اور اسکے حق میں خلافت کی وصیت کر جاؤں۔ رجاء بن حیوۃ نے حکم کی فوری طور پر تعمیل کی اور اس کے سب بچے مسلح حالت میں اس کے سامنے پیش کیے گئے۔ سلیمان نے انھیں دیکھ کر کہا:

ان بنی صبیة صغار　　　افلح من کان له کبار

''میرے بچے چھوٹے ہیں، وہ کامیاب ہے جس کے بڑے ہوں۔''

اس وقت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ بولے:

"قد افلح من تزکی، وذکر اسم ربه فصلی"

وہ کامیاب ہوا جو پاک ہوا اور اس نے اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔

یہ آیت سن کر سلیمان تاڑ گیا۔ پھر اس نے اپنے دل میں کہا وہ خلافت کی گرہ اس طرح باندھے گا کہ اس میں شیطان کا حصہ نہ ہوگا۔ (سیرۃ ابن الحکم:۳۰)

Marfat.com

سیدنا عمر رحمہ اللہ اگرچہ خلافت کے خواہاں نہ تھے اور نہ انھوں نے اس کے لیے کوئی دوڑ دھوپ کی لیکن ان کا ظن غالب تھا کہ سلیمان انہی کو خلیفہ نامزد کریں گے۔ یہ گمان اسی روز سے تھا جس روز سلیمان خلیفہ بنے تھے۔نوروز اور مہرجان کے دن سلیمان کے پاس سونے کے برتنوں میں تحائف کی بھرمار ہوتی تھی۔ جب لوگ تحائف لے کر آتے اور عمر رحمہ اللہ وہاں موجود ہوتے تو جب بھی کوئی تحفہ لے کر گزرتا تو سلیمان پوچھتے ''عمر! کہو یہ کیسا ہے؟'' عمر رحمہ اللہ جواب دیتے: ''امیر المومنین! یہ تو دنیوی زندگی کی پونجی ہے۔ سلیمان پوچھتے: ''اچھا اگر تمھیں خلیفہ بنا دیا جائے تو تم ان کا کیا کرو گے؟'' عمر رحمہ اللہ جواب دیتے: ''امیر المومنین! اللہ گواہ ہے کہ میں انھیں بانٹ دوں گا اور ایک بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔'' (سیرۃ ابن عبدالحکم:۱۲۱)

بعض روایات میں ہے کہ سلیمان کی وفات کے بعد محدث رجاء بن حیوۃ اس اندیشے کے تحت کہ سلیمان کی وفات کی خبر سننے کے بعد کہیں اہل خاندان سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی بیعت میں کچھ لیت ولعل نہ کریں، موت کی خبر کو مخفی رکھا اور دوبارہ خاندان کے تمام افراد کو جمع کر کے ان سے امیر المومنین کے وصیت نامہ پر پھر فرداً فرداً بیعت لی اور اس طرح بیعت کو مستحکم کرنے کے بعد سلیمان کی موت کا اعلان کیا اور وصیت نامہ پڑھ کر سنایا۔سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی نامزدگی کا سن کر تمام افراد نے سمعنا و اطعنا کہا لیکن ہشام بن عبدالملک نے بیعت سے انکار کر دیا۔ رجاء نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ہشام سے کہا کہ خاموشی سے بیعت کر لو ورنہ تمھارا سر قلم کر دوں گا۔ اور عمر بن عبدالعزیز کا ہاتھ پکڑ کر انھیں منبر پر بٹھا دیا اور پھر کسی نے چون و چرا نہ کی۔ خلافت کا بارگراں سر پر آتے ہی عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی زندگی ہی بالکل بدل گئی۔ وہ عمر رحمہ اللہ جن کی گورنری پر تقرر کے وقت تیس اونٹ ان کا ذاتی سامان اٹھا کر لائے تھے۔ (یعقوبی:۲/۲۴۹) جن کی خوش لباسی اور نفاست طبعی کا یہ حال تھا کہ جس لباس پر ایک مرتبہ کسی کی نظر پڑ جاتی تھی پھر اسے زیب تن نہ فرماتے تھے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ لابن جوزی:۶۶) خوشبویات کے شوق کی وجہ سے داڑھی پر عنبر کا سفوف چھڑکتے تھے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز:۱۵۱) مورخین نے لکھا ہے کہ آپ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ خوش لباس آدمی تصور کیے جاتے تھے اور محدث رجاء بن حیوۃ کا بیان ہے کہ آپ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ خوش لباس، خوشبویات کے دلدادہ اور تفخر کی چال چلنے والے تھے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز:۱۵۱) لیکن جونہی خلافت کی ذمہ داریوں کا بوجھ پڑا اور مسند خلافت پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی سیدنا ابوذر غفاری رحمہ اللہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دیگر درویش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قالب اختیار کر لیا۔ دل کی دنیا بدلنے کے ساتھ ظاہری دنیا بھی بدل گئی۔ اب نہ وہ زرق برق کا لباس تھا اور نہ وہ مشک وعنبر کی خوشبویات تھیں۔ بار خلافت نے آخری ضرب لگائی تو یکا یک آنکھیں کھل گئیں اور اب دوسرے ہی عالم کی ہوش ربائیاں تھیں، نہ وہ آسمان تھا، نہ زمین تھی، نہ وہ آفاق تھا نہ انفس۔ انقلاب قوموں میں ہو یا افراد میں پہلے سطح پر نہیں بلکہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے اور دل و دماغ میں انقلاب آنے کے بعد پھر انسان یوں سمجھتا ہے کہ زندگی کا مزہ انہی کو ملتا ہے جو اس کی شیرینیوں کے

Marfat.com

ساتھ اس کی تلخیوں کے گھونٹ بھی لیتے رہتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پانے کا مزہ انھیں کو ملتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔ جنھوں نے کچھ کھویا نہیں انھیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ چنانچہ سلیمان بن عبدالملک رحمہ اللہ کی تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد حسب معمول جب آپ کو شاہی سواری پیش کی گئی تو آپ نے وہ واپس کر دی اور فرمایا: 'میرے لیے میرا خچر کافی ہے۔' (طبقات ابن سعد: ۲۴۷/۵، البدایہ والنہایہ: ۲۰۸/۹)

ابھی سلیمان کے اہل وعیال قصر خلافت ہی میں تھے اس وجہ سے آپ اپنے خیمہ میں فروکش ہو گئے۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۵۲)

گھر پہنچے تو اس بارگراں کی ذمہ داری سے چہرہ پریشان تھا کیونکہ اب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فکری، نظری اور عملی ہر لحاظ سے بدل چکے تھے۔ دلوں کی اقلیم میں منٹوں اور لمحوں کے اندر انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے انقلاب سے اس دنیا کے انقلابات وابستہ ہیں۔ قلب کی سرزمین میں امید وطلب کے بے شمار درخت اگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی ہو ان کے لیے بہار وخزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں، کوئی موسم بھی انھیں شادابی کا پیغام نہیں پہنچا سکتا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے قلب کی جڑیں مضبوط وتوانا تھیں اس وجہ سے خلافت کا بارگراں پڑتے ہی پریشانی اور رنج وغم کی گھنگور گھٹائیں قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں امنڈ آئیں اور اس کے آثار چہرہ پر بھی نظر آنے لگے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ اگرچہ نامزد تھے لیکن اپنے کو خلیفہ سمجھتے تھے۔ شخصی حکمران نہیں سمجھتے تھے جس کو نہ دنیا کی فکر ہوتی ہے اور نہ آخرت میں مسؤولیت کا کچھ خوف کیونکہ شخصی حکمرانوں کے سر پر تاج ہوتا ہے لیکن پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ اس کے تمام جذبات تاج کی حفاظت کے تحت ہوتے ہیں اور اس بارے میں وہ گویا انسان کی عام فطری جبلت کے علاوہ ایک ہی جنس خاص بن جاتے ہیں۔

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جونہی گھر پہنچے تو پریشان حال اور کبیدہ خاطر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کوہ گراں آپ پر ڈال دیا گیا ہے۔ خادمہ نے پوچھا: خیر ہے، آپ اس قدر متفکر کیوں ہیں۔ فرمایا! اس سے بڑھ کر فکر وتشویش کی کیا بات ہوگی کہ مشرق ومغرب میں رسول اللہ ﷺ کی امت کا کوئی ایسا فرد نہیں ہے۔ جس کا حق مجھ پر نہ ہو اور بغیر مطالبہ اور اطلاع کے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۵۲)

یہ سارے واقعات حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب سیر اعلام النبلاء: ۱۱۷/۵ سے ص ۱۲۶ تک نقل کیے ہیں۔

خلیفہ مقرر ہونے کے بعد یہی جذبات آپ کے ننھیالی جدامجد سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے تھے۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا اور ان کے وہ فرائض یاد دلائے جو ایک خلیفہ پر عائد ہوتے ہیں۔ پھر انھیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کی ترغیب دلائی اور

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرایا تاکہ بندہ اپنے اللہ سے رغبت بھی رکھے اور اس سے خوف بھی کھائے۔ پھر کچھ اور کارآمد اور ضروری وصیتیں کیں جن میں مملکت کے دستور العمل کے بارہ میں کچھ مفید باتیں بھی تھیں۔ جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ وصیتیں فرما چکے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے۔ گردن جھکی ہوئی تھی اور ذہن غور وفکر میں مصروف، شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ میں اس گراں بار ذمہ داری کے بار دوش سے کیسے سبک دوش ہوں گا اور کاش سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ صحت یاب ہو جائیں اور خلافت کی یہ عظیم ذمہ داری مجھ سے ٹل جائے لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ تو صحت یاب نہ ہوئے مگر یہ گرانبار ذمہ داری سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر پڑ گئی۔ وہ بڑی اہم اور غیر معمولی ذمہ داری تھی۔ جس کے اٹھانے سے بڑے بڑے دل گردے والے اعراض برتتے ہیں اگر ان کے دلوں میں اللہ کا خوف ہو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس بوجھ کو اس طرح اٹھایا اور آپ ان ذمہ داریوں سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ دنیا آج تک انگشت بدندان ہے۔ کچھ یہی حالت خلیفہ بننے کے بعد عمر ثانی رحمہ اللہ کی ہوئی کیونکہ وہ فطرتاً خلافت کی عظیم الشان اور گراں بار ذمہ داریوں سے گھبراتے تھے۔ پھر خلافت کے بارہ میں آپ کا جو نقطہ نظر تھا وہ وہی تھا جو خلفائے راشدین کا تھا۔ وہ شروع ہی سے خلافت کے اس بار عظیم کو اٹھانا چاہتے تھے اور ان کو اپنے بارہ میں قوی شبہ تھا کہ سلیمان انھیں ہی خلیفہ نامزد کرے گا۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ انھوں نے رجاء بن حیوۃ سے کہا کہ میرے اوپر سلیمان کی جو شفقتیں اور نوازشیں ہیں ان سے مجھے خطرہ ہے کہ انھوں نے خلافت کی وصیت میرے متعلق ہی نہ کردی ہو۔ اگر ایسا ہو تو براہ نوازش آپ مجھے بتا دیں تاکہ قبل اس کے کہ میں مجبور ہو جاؤں ابھی اس سے استعفا دے دوں لیکن محدث رجاء نے انھیں اس بارہ میں بتانے سے انکار کر دیا کیونکہ ایک روایت کے مطابق رجاء ہی نے ان کا نام خلافت کے لیے تجویز کیا تھا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۲۴/۵)

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ آپ کچھ اس وجہ سے بھی پریشان تھے کہ آپ کو نامزد کیا گیا تھا، شوریٰ نے آپ کو منتخب نہیں کیا تھا، لیکن یہ وجہ ہمارے نزدیک اتنی معتبر نہیں کیونکہ اسلام میں نامزدگی بھی جائز ہے۔ یہ شبہ بعض ذہنوں میں صرف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ آج کل لوگوں کے ذہنوں پر جمہوریت کا بھوت سوار ہے اور جمہوری ذہن رکھنے والے لوگ نامزدگی کو جائز نہیں سمجھتے۔ جب کہ اسلام میں جائز ہے۔

(ملاحظہ مقدمہ ابن خلدون: ۲۴۰)

سیدنا عمر بن بعد العزیز رحمہ اللہ میں جب زیادہ اضطراب پیدا ہوا تو آپ غور وفکر کے بعد اس سے دست برداری کے لیے آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ آنے والے لوگوں کو جمع کر کے ان سے فرمایا:

”لوگو! میری خواہش اور عوام الناس کی رائے لیے بغیر مجھ پر خلافت کی گرانبار ذمہ داریاں ڈال دی گئی ہیں، اس لیے میری بیعت کا جو طوق آپ حضرات کی گردن پر ہے میں اسے خود اتار دیتا ہوں۔ تم جسے چاہو اپنا خلیفہ منتخب کرلو۔“

یہ کلمات کہے تھے کہ لوگوں نے شور بلند کیا کہ ہم نے آپ کو خلیفہ بنایا ہے اور ہم سب آپ کی خلافت

Marfat.com

سے راضی ہیں۔ آپ اللہ کا نام لے کر امور خلافت کو انجام دیں۔ جب آپ کو اس بات کا پورا پورا یقین ہوگیا کہ کسی شخص کو آپ کی خلافت سے کوئی اختلاف نہیں اور ہر شخص میری خلافت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو آپ نے اس بارگراں کو قبول فرمالیا اور پھر مسلمانوں کے سامنے خطاب فرمایا جس میں انھیں تقویٰ اور یوم آخرت کے بارہ میں تلقین فرمائی اور پھر خلیفہ اسلام کی اصلی حیثیت اور حقیقت کو واضح فرمایا جسے بعض اموی فرماں رواؤں نے ملوکیت کے دبیز پردوں میں گم کردیا تھا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام کے بعد فرمایا:

''اے لوگو! تمھارے نبی کے بعد کوئی دوسرا رسول اور نبی آنے والا نہیں ہے اور جو کتاب اللہ تعالیٰ نے ان پر اتاری ہے اس کے بعد اب کوئی دوسری کتاب آنے والی نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے جو شے حلال کردی ہے وہ اب قیامت تک کے لیے حلال ہے اور جو حرام کردی ہے وہ قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے والا ہوں۔ خود اپنی طرف سے نئی بات پیدا کرنے والا نہیں ہوں بلکہ محض اتباع اور پیروی کرنیوالا ہوں۔ (ولست بمبتدع ولکنی متبع) کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ محض اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ میں تم میں سے کوئی ممتاز شخص نہیں ہوں بلکہ ایک معمولی فرد ہوں البتہ تمھارے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے زیادہ گراں بار کیا ہے۔''

(سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۱۰۸، سیر اعلام النبلاء: ۱۲۶/۵، البدایہ والنہایہ: ۱۹۹/۹، ۲۱۲، طبقات ابن سعد: ۲۵۰/۵۔۲۵۱)

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت دمشق میں سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی بیعت ہو رہی تھی اور لوگ ان کو اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنا خلیفہ تسلیم کر چکے تھے کیونکہ وہ ان کی نیکی اور طبیعت کی پاکیزگی سے بخوبی آشنا تھے اور سمجھتے تھے کہ ایسا شخص رعایا کے مفاد کو مدنظر رکھے گا نہ کہ اپنے ذاتی مفاد کو، اس وقت عبدالعزیز بن عبدالملک جو کہیں باہر تھا اور اس کو سلیمان کی عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بارے میں وصیت کا کوئی علم نہ تھا۔ اس نے سلیمان کی موت کی خبر سن کر اپنے ساتھیوں سے اپنی بیعت لے لی کیونکہ وہ بھی اپنے آپ کو خلافت کا ایک امیدوار سمجھتا تھا۔ ساتھیوں سے بیعت لے کر وہ دمشق کے ارادے سے بڑھا۔ راستہ میں اسے سلیمان کی وصیت اور سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی بیعت کا حال معلوم ہوگیا۔ یہ سن کر وہ سیدھا عمر ثانی رحمہ اللہ کے پاس پہنچا۔ ان کو اس کے بیعت لینے کی خبر ہو چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس سے کہا: مجھے پتہ چلا ہے کہ تم اپنی بیعت لے کر دمشق میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ عبدالعزیز نے کہا: مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ سلیمان نے آپ کو خلیفہ نامزد کردیا ہے۔ اس لیے مجھے اندیشہ تھا کہ لوگ خزانہ وغیرہ لوٹ لیں گے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر لوگ تمھارے ہاتھ پر بیعت کر لیتے اور تم بار خلافت کو سنبھال لیتے تو میں تم سے کوئی جھگڑا نہ کرتا اور

Marfat.com

خلافت کے باردوش سے سبکدوش ہو کر اپنے گھر میں بیٹھ جاتا۔ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے کہا: خدا گواہ ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے میں دوسرے کا خلیفہ ہونا پسند ہی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

سلیمان کی تجہیز و تکفین:

سلیمان انتقال کر گیا۔ اس کی تجہیز و تکفین کر دی گئی۔ جب تدفین کا وقت آیا تو لوگوں نے اس کی میت قبر تک پہنچائی اور انھیں دابق کے ٹیلہ سلیمان پر عبداللہ بن مسافع قریشی کے پاس دفن کر دیا گیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ سلیمان کی قبر میں اس کے تین بیٹے اور عمر رحمہ اللہ اترے۔ جب انھوں نے سلیمان کی میت دفن کے لیے اٹھائی تو ایسا محسوس ہوا کہ سلیمان اپنے ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ ان کا بیٹا بولا: اللہ کی قسم! میرے والد زندہ ہو گئے۔ عمر رحمہ اللہ بولے نہیں، نہیں لیکن آپ کے باپ سے جلدی کی گئی۔ امراء اور عوام نے عمر رحمہ اللہ کے بارہ میں یہ افواہ اڑا دی کہ انھوں نے سلیمان کو زندہ دفن کر دیا۔ کیونکہ موت اور دفن کی درمیانی مقررہ مدت نہیں گزری تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بے ہوش ہوں اور فوت نہ ہوئے ہوں، لیکن یہ سب کچھ عمر رحمہ اللہ کے خلاف ایک پراپیگنڈہ تھا۔

Marfat.com

خلافت علیٰ منہاج النبوت کا احیاء

خلافت کا احیاء:

آپ خلیفہ تو ہو گئے اور تمام خاندان اور ارباب حل وعقد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی، لیکن آپ ایسا خلیفہ نہیں بننا چاہتے تھے جیسے کہ بنو امیہ کے دوسرے خلفاء تھے۔ آپ خلافت کو شوریٰ کی بنیاد پر استوار کر کے چلانا چاہتے تھے کیونکہ عہد نبوت سے جوں جوں دوری ہوتی جارہی تھی دوں دوں خلافت میں مختلف خرابیاں پیدا ہوتی جارہی تھیں۔ اسلامی خلافت جس کو ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کی بنیادوں پر چلایا تھا اب شخصی حکومت کا قالب اختیار کر رہی تھی اور شخصی حکومت میں شخصی حکمرانوں کے سر پر تاج ہوتا ہے لیکن پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ ان کی ساری تگ ودو اور جدوجہد تاج کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے رعایا کی ترقی اور مرفہ حالی کے لیے نہیں ہوتی۔ چنانچہ تاریخ کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مستبد حکومت کی خرابیاں خلافت اسلامی میں دھیرے دھیرے پیدا ہو رہی تھیں۔ دینی روح کمزور ہوتی جارہی تھی، جمہور اور رعایا کی آواز دب گئی تھی۔ خلیفہ جو بیت المال کا کسٹوڈین ہوتا تھا، اب خلفاء کا ذاتی خزانہ بن چکا تھا، شاہی خاندان کے لوگوں کو جاگیریں دے دے کر انہیں ایک جاگیردار طبقہ بنا دیا گیا تھا، یہاں تک کہ خلیفہ بھی اپنے کو ان کا محتاج سمجھتا تھا۔ خلافت کی وہ سادگی اور فطری حیثیت جو ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے زمانوں میں تھی بالکل قصہ پارینہ ہو کر رہ گئی تھی جس کے نتیجہ میں اسلامی خلافت کی حقیقی روح دم واپسیں پر تھی۔ ان حالات میں سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا مطمح نظر اپنے پیش رووں سے بالکل مختلف تھا۔ آپ خلافت کے پورے نظام میں انقلاب لا کر خلفائے راشدین کا نظام خلافت لانا چاہتے تھے جس میں ایک بڑھیا بھی برسر عام خلیفہ وقت کو ٹوک سکتی ہے اور جس نظام میں رعایا کو اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کا پورا پورا تحفظ ہو۔ ان کی آواز سنی جائے، ان کے مسائل حل ہوں کیونکہ جو خلافت رعایا کی بہی خواہ نہ ہو وہ خلافت نہیں ایک مستبدانہ حکومت ہے۔ چنانچہ وہ ان تمام برائیوں کو جو خلافت کے نظام میں در آئی تھیں، ختم کر کے طرز جہاں بانی اور طریق حکمرانی میں اسے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قریب تر کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن ان حالات میں نظام حکومت کا یہ انقلاب جتنا اہم تھا اتنا ہی خطرناک اور نازک بھی تھا۔ مگر آپ نے ان تمام حالات اور مشکلات کو نظر انداز کر کے اپنا کام شروع کر دیا اور نتائج کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔

Marfat.com

اموی خلافت کی کوتاہیاں:

یہ درست ہے کہ اموی خلافت میں بہت سی کوتاہیاں اور خرابیاں واقع ہو گئی تھیں لیکن پھر بھی خلفاء اور رعایا میں بہت زیادہ دین داری تھی۔ جہاں تک عبدالملک بن مروان کا تعلق ہے تو جس وقت عبدالملک کے ہاتھ میں زمام حکومت آئی اس وقت ساری دنیائے اسلام پر آشوب ہو رہی تھی۔ لیکن عبدالملک نے اپنے عزم و استقلال اور تدبیر و شجاعت سے ان تمام مخالف حالات پر قابو پالیا۔ اپنے دور حکومت میں بے شمار نئی مساجد تعمیر کروائیں۔ پرانی مساجد کی توسیع و مرمت کی۔ ۶۵ھ میں جامع دمشق بنوائی اور صخرہ پر عظیم الشان گنبد بنوایا۔ نئے شہر آباد کیے پرانے شہروں کو جو ویران ہو چکے تھے دوبارہ آباد کروایا۔ علاوہ ازیں رفاہ عامہ کے بہت سے کام کیے جن سے لوگوں کو بڑا فائدہ ہوا۔

اور جہاں تک اس کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے تو لکھا ہے کہ عبدالملک عقل و دانش، تدبیر و سیاست، شجاعت و شہامت اور علم و فضل کے جملہ اوصاف میں کامل تھا۔ علم و فضل کے اعتبار سے اپنے عہد کے اکابر علماء میں سے تھا۔ اگر وہ حکومت کی آزمائشوں میں نہ پڑ گیا ہوتا تو مسند علم کی زینت ہوتا۔ اس کا شمار مدینہ کے ممتاز فقہاء میں سے تھا۔ (ابن اثیر: ۱۹۹/۴) کتاب البدء والتاریخ میں ہے کہ سیدنا زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے بعد مدینۃ الرسول کے منصب قضاء وافتا پر فائز ہوتا۔ اس عہد کے اکابر علماء اور ائمہ اس کے علمی کمالات کے معترف تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے آخری ایام میں لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم کس شخص کی طرف رجوع کریں؟ فرمایا: ''مروان کا بیٹا عبدالملک فقیہ ہے، اس سے پوچھنا (تاریخ الخلفاء سیوطی: ۲۱۶) امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں جن علماء سے ملا، عبدالملک کے سوا اپنے کو سب پر فائق پایا۔ اس سے جب حدیث یا شاعری وغیرہ پر گفتگو ہوتی تھی تو وہ معلومات میں کچھ اضافہ ہی کر دیتا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۱۷۴/۵)

ابن سعد ہی نے لکھا ہے کہ وہ بڑا متقی اور پرہیز گار تھا۔ دن رات عبادت و ریاضت اور تلاوت قرآن حکیم سے کام رکھتا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۱۷۴/۵) امام شعبی رحمہ اللہ جیسے عالم اس کے ہم نشین اور ہم جلیس تھے۔ امام زہری رحمہ اللہ اس کے عمل کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان سے کسی نے سونے کے تار سے دانت کسنے کے متعلق فتویٰ پوچھا۔ فرمایا: ''کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ عبدالملک ایسا کرتا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۱۷۴/۵)

اگر عبدالملک کی زندگی غیر مذہبی ہوتی تو امام زہری رحمہ اللہ اس کے فعل کو ہرگز سند جواز نہ بناتے۔

عبدالملک بن مروان کے بعد اس کا بڑا بیٹا ولید بن عبدالملک مسند خلافت پر بیٹھا اس کا دور فتوحات کی کثرت، دولت کی فراوانی، امن و رفاہیت کی ارزانی اور دوسری تمدنی اور ملکی ترقیوں کے لحاظ سے بنوامیہ کا عہد زریں تھا۔ اس کے زمانہ میں سندھ اور اسپین تک اسلام کا علم لہرانے لگا اس کے زمانہ میں جو جو ملک فتح ہوئے ان کی کایا پلٹ گئی اور وہ دفعتاً پستی کی حالت سے ابھر کر آسمان کی رفعتوں کو چھونے لگے۔ اس کی ذاتی

Marfat.com

زندگی بھی مذہبی تھی۔ تین دن میں قرآن ختم کرتا تھا۔ اگرچہ وہ خود عالم نہیں تھا لیکن علماء اور فقہاء سے اسے بہت محبت تھی۔ صلحاء واخیار میں خوب روپیہ تقسیم کرتا اور ان کو بڑے بڑے عطیات سے نوازتا۔ البتہ بڑا سخت گیر تھا۔

اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان جس کو عبدالملک نے ولید کے بعد ولی عہد بنایا تھا، تخت نشین ہوا۔ وہ فطرتاً صالح اور سعید تھا۔ اس کے زمانہ میں بھی حکومت کے رقبہ کی وسعت اور تمدنی ترقی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ وہ خود بھی مصلحانہ خیالات کا حامل تھا پھر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جیسا نیک شخص اس کا وزیر ومشیر تھا۔ چنانچہ سلیمان نے ان خرابیوں کی کافی حد تک اصلاح کی جو اموی خلفاء کی وجہ سے ان کے بعض عمال میں پیدا ہوگئی تھیں۔ اس نے تمام ناحق قید کیے گئے لوگوں کو رہا کر دیا۔ جلاوطن اشخاص کو واپسی کی اجازت دی۔ اس نے رعایا کی مرفہ حالی کے لیے بہت سے کام کیے، اور اس کا سب سے بڑا کارنامہ جو سیکڑوں کارناموں اور اصلاحوں سے بڑھ کر ہے، وہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی ولی عہدی ہے۔ جنھوں نے اموی خلافت کی خرابیوں کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ خود سلیمان کے بیٹے اور حقیقی بھائی موجود تھے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عہد خلافت میں جو بھی اصلاحات ہوئیں اس کی سعادت میں سلیمان کا بھی حصہ ہے۔

غصب شدہ اموال کی واپسی:

مسند خلافت پر بیٹھتے ہی آپ نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ غصب شدہ اموال اور جائیدادوں کی واپسی کا تھا۔ بعض اموی عمال نے غریبوں اور زیر دستوں کے جو اموال اور جائیدادیں غصب کر رکھی تھیں اور شاہی خاندان کے افراد، بعض اموی عمال اور عمائدین سلطنت نے غریبوں کی احیائے موات کو اپنی جاگیر بنالیا ہوا تھا۔ یہ کام دیکھنے میں تو نہایت آسان تھا لیکن دراصل یہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ سارے خاندان، عمائدین سلطنت اور عمال بنوامیہ سے مخالفت مول لینا تھا، لیکن تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اس نازک کام کو جو ایک کار خیر تھا اور زیر دستوں اور غریبوں کی دعائیں لینا تھا، آپ نے اپنی اصلاحات میں اس کو ایک نمبر پر رکھا۔ خود آپ کے پاس بڑی موروثی جاگیر تھی جس کے بارہ میں آپ سمجھتے تھے کہ اس کو اپنے پاس رکھنا میرے لیے جائز نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے جب اس کو واپس کرنے کا ارادہ کیا تو بعض خیر خواہوں اور دوستوں نے عرض کیا کہ اگر آپ جاگیر واپس کر دیں گے تو اپنی اولاد کے لیے کیا انتظام کریں گے۔ فرمایا! میں ان کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں۔'' (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۱۰۸)

روایات میں ہے کہ اس کے بعد آپ نے اپنے خاندان کے افراد کو جمع کیا اور فرمایا:

بنی مروان! تم کو شرف اور دولت کا ایک حظ وافر عطا ہوا ہے اور میرے خیال میں امت کا نصف یا دو تہائی مال تمھارے قبضہ میں ہے۔''

Marfat.com

یہ دراصل آپ نے ان لوگوں کو اشارتاً بتایا کہ تم غصب شدہ اموال اور جائیدادیں واپس کر دو۔ وہ لوگ آپ کے اس اشارہ کو سمجھ گئے اور کہا: ''خدا کی قسم! جب تک ہمارے سر ہمارے جسموں سے جدا نہ ہو جائیں اس وقت تک ہم یہ اموال اور جائیدادیں واپس نہیں کریں گے۔ خدا کی قسم! ہم نہ اپنے آباء واجداد کو کافر بنا سکتے ہیں اور نہ اپنی اولادوں کو مفلس۔'' (سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اپنے اسلاف کے افعال کو ناجائز اور حرام کہتے تھے) ان کا یہ جواب سن کر آپ نے فرمایا! خدا کی قسم! اگر اس معاملہ میں تم میری مدد نہیں کرو گے تو میں تم لوگوں کو ذلیل ورسوا کر دوں گا۔ میرے پاس سے چلے جاؤ۔'' (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۱۱۵)

اس کے بعد آپ نے عام مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا اور فرمایا!

''ان لوگوں (خلفاء بنی امیہ) نے ہمیں ایسی جاگیریں اور عطایا دیئے جو بخدا! انھیں دینے کا کوئی حق نہیں اور نہ ہمیں ان کے لینے کا۔ اب میں ان سب کو ان کے حقیقی اور اصلی حق داروں کو واپس کرتا ہوں۔ اور اس کام کو اپنی ذات اور اپنے خاندان سے شروع کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر اسنادشاہی کا رجسٹر منگوایا۔ مزاحم ان اسناد کو نکال کر پڑھ پڑھ کر سناتے جاتے اور سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ انھیں قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینکتے جاتے۔ صبح سے لے کا نماز ظہر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۲۰۸)

اور آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی ایک ایک جاگیر واپس کر دی حتیٰ کہ اپنے پاس ایک نگینہ تک نہ رہنے دیا۔ (طبقات ابن سعد: ۲۵۲/۵، البدایہ والنہایہ: ۲۰۰/۹)

آپ کی اہلیہ فاطمہ کو ان کے والد عبدالملک نے ایک بیش قیمت پتھر دیا تھا اس کے بارہ میں بھی آپ نے اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ اس کو بیت المال میں داخل کر دو یا پھر مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ کی اہلیہ اگرچہ ایک خلیفہ کی بیٹی تھی لیکن بڑی وفا شعار تھی۔ اس نے وہ ہیرا فوراً بیت المال میں داخل کر دیا۔

(تاریخ الخلفاء سیوطی: ۲۳۳، سیرۃ ابن الحکم: ۱۵۱)

روایات میں ہے کہ عمر رحمہ اللہ آندھی کی طرح چاروں طرف گھوم رہے تھے اور باطل کی جڑیں اکھاڑ رہے تھے اور غرور ونخوت کے آثار مٹا رہے تھے۔ آپ نے عزم کر لیا کہ ورثہ میں ملی ہوئی جائیدادیں اور جمع شدہ ناجائز مال لوگوں میں بانٹ دیں گے اور ہبہ کیے ہوئے قطعات اراضی عوام کو دے دیں گے تاکہ عوام کے دلوں میں حق کا رعب بٹھا دیا جائے جسے پہلے حکمران برباد کر گئے تھے۔ اور اسلامی تہذیب وتمدن کو نکھارا جائے جسے حوادث نے لوگوں کے دل ودماغ سے مٹا دیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ امت ایسی گندگیوں میں لتھڑی ہوئی ہے جن سے اس کو پاک کرنا مشکل ہے۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ نے سب سے پہلے اپنے کپڑے اتار پھینکے اور خوشبو دھو ڈالی اور آٹھ درہم قیمت کی چادر اوڑھ لی۔ پھر حکم فرمایا کہ میرے پاس جو برتنے کی اشیاء ہیں ان سب کو اور سواریوں اور کپڑوں کو اور عطر وغیرہ کو فروخت کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ سب اشیاء ۲۳ یا ۲۴ ہزار اشرفیوں میں فروخت ہوئیں

Marfat.com

اور وہ سارا روپیہ بیت المال میں جمع کرادیا گیا۔ گویا اصلاح کا عمل اپنے گھر سے شروع کیا۔

پھر خلافت کی سرکاری سواریوں کو لایا گیا۔ گھوڑے زین کسے ہوئے قطار در قطار کھڑے تھے اور ان پر سوار تلواریں سونتے ہوئے تھے۔ قناتیں تنی ہوئی اور خیمے گرے ہوئے تھے ان سب کے آگے محافظ دستہ کا افسر چل رہا تھا۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ نے اس سے کہا: مجھے تمھاری کوئی ضرورت نہیں، میں نے تم سب کو سبکدوش کر دیا۔

(صفتہ الصفوۃ:۲/۶۴، حیاۃ الحیوان:۱/۶۸)

پھر آپ اپنے خچر کی تلاش میں قطاروں میں گھس گئے اور اسے پکڑ کر اس پر سوار ہو گئے بہت سے پہرے داروں اور سپاہیوں کو فارغ کر دیا جن کی تعداد چھ سو سے زیادہ تھی۔ (سیرۃ ابن جوزی:۹۸)

پھر ان قناتوں اور فرشوں کو ٹھوکر مار کر اپنے راستہ سے ہٹا دیا۔ پھر اپنے غلام مزاحم کو بلا کر فرمایا: یہ خچر، گھوڑے اور قناتیں وغیرہ اور دیگر آرائشی سامان بیت المال میں جمع کرا آؤ۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم:۱۶۸)

اب حالت یہ تھی کہ خود سیدنا عمر رحمہ اللہ کے گھر میں غربی ناچنے لگی۔ ان کی اہلیہ فاطمہ بنت عبدالملک نے درخواست کی کہ اس کا اور اس کے بچوں کا ماہانہ مقرر کر دیا جائے، فرمایا: بیت المال میں گنجائش نہیں وہ بولی: آپ قبل از خلافت دوسروں سے کیوں لیا کرتے تھے۔ فرمایا: جب تو وہ مال میرے لیے حلال اور طیب تھا اس کا وبال اور گناہ انھیں پر تھا جنھوں نے اس کو ناجائز طریقے سے حاصل کیا لیکن خلیفہ بنائے جانے کے بعد میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس طرح عمر رحمہ اللہ اپنی اہلیہ کو برابر سمجھاتے رہے یہاں تک کہ وہ بھی اسی تقویٰ اور پرہیز گاری کے سانچے میں ڈھل گئی۔

بعض روایات میں ہے کہ عمر رحمہ اللہ خلیفہ ہونے کے بعد تین دن لوگوں سے غائب رہے۔ اس عرصہ میں عمر اپنے غلام مزاحم کے ساتھ دستاویزات جمع کرنے میں مصروف تھے۔ اپنی ذاتی جاگیروں اور جائیدادوں کی بھی اور امراء کی جائیدادوں اور عطیات کے اقرار نامے بھی۔ جب آپ نے تمام دستاویزات اور اقرار نامے جمع کر لیے تو منادی کر کے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو عمر رحمہ اللہ منبر پر چڑھ گئے۔ مزاحم آپ کے پیچھے تھے۔ آج عمر رحمہ اللہ نے زندگی میں پہلی بار معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے جن کی قیمت صرف ۱۲ درہم تھی۔ (وفیات الاعیان:۲/۶۱، صفتہ الصفوۃ:۲/۶۷) آپ نے بنو امیہ اور بنو مروان کے ممتاز حضرات اور فوج کے رؤسا سے فرمایا:

''لوگوں نے ہمیں عطیات دیئے جن کو قبول کرنا ہمارے لیے جائز نہ تھا اور نہ انھیں ان کا دینا جائز تھا۔ میرے خیال میں ان عطیات میں ہم سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حساب لینے والا نہیں۔ میں نے یہ کام اپنی اور اپنے گھر والوں کی ذاتی جائیداد سے شروع کیا ہے۔ مزاحم انھیں پڑھ کر سناؤ۔ مزاحم نے وہ سب کچھ پڑھ کر سنایا۔ پھر عمر رحمہ اللہ نے ان تمام کاغذات کو لیا اور قینچی لے کر اسے کتر کر پھینک دیا۔ آپ ظہر کی اذان تک یہی کام کرتے رہے۔'' (سیرۃ ابن جوزی:۱۰۶)

Marfat.com

کچھ جائیدادیں بغیر تحریر کے تھیں یعنی غصب شدہ تھیں ان کے بارہ میں اعلان کرا دیا کہ کوئی شخص غصب شدہ زمین سے فائدہ نہ اٹھائے۔ پھر آپ نے ظلم سے حاصل کیے ہوئے کھیت اور جاگیریں جس پر کسی کا مطالبہ تھا حق داروں کو دلوا دیں اور خود آپ کے قبضہ میں جس قدر کھیت، غلام اور لونڈیاں تھیں وہ سب آپ نے بیت المال میں دے دیں۔

آل بلال بن رباح نے عمر رحمہ اللہ کے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا کہ انھوں نے آپ کو ایک کھیت فروخت کیا تھا۔ پھر اس میں کانیں نکل آئیں۔ مقدمہ میں کہا گیا کہ ہم نے آپ کو کھیت فروخت کیا تھا کانیں نہیں کی تھیں، اور انھوں نے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی ایک تحریر دکھائی۔ عمر رحمہ اللہ نے لپک کر وہ تحریر چوم لی اور اسے اپنی آنکھوں سے لگایا اور اپنے منتظم سے فرمایا: اس کی آمدنی اور خرچ کا اندازہ لگاؤ۔ پھر آپ نے خرچ وضع کر کے باقی رقم انھیں دے دی۔ (فتوح البلدان:۲۲)

عمر رحمہ اللہ نے اپنی وہ زمین جو یمامہ میں تھی وہ بھی بیت المال میں لوٹا دی اور یمن میں مکیدس اور درس والے پہاڑ بھی بیت المال کو لوٹا دیئے اور جس اراضی کے آپ کے پاس کاغذات نہ تھے اس کا منافع بیت المال کو دے دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ کبھی بیت المال سے ایک حبہ بھی نہ لیں گے کیونکہ ان کے ذاتی اخراجات کے لیے کچھ زمین ہے کہ آمدنی دو سو دینار کے قریب ہو جاتی ہے جب آپ سے یہ کہا گیا کہ آپ بھی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی طرح بیت المال سے وظیفہ لے لیا کریں۔ تو فرمایا: میرے پاس مال ہے جو مجھے کافی ہے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس مال نہ تھا۔ (العقد الفرید:۴/۴۳۴، تذکرۃ الحفاظ:۱/۱۱۳)

فدک کا فیصلہ:

اس سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ فدک کا تھا جو رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد ہی سے خلفاء اور اہل بیت کے درمیان متنازعہ فیہ چلا آ رہا تھا۔ اب یہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے قبضہ میں تھا۔ اس بارہ میں انھوں نے وہی فیصلہ کیا جو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں کیا تھا۔

فدک کیا ہے؟

سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ فدک ہے کیا؟ کتابوں میں اس بارہ میں لکھا ہے کہ فدک مدینہ طیبہ سے دو یا تین دن کی مسافت پر واقع ایک باغ تھا جس میں چشمے اور کھجور کے درخت تھے اور رسول اللہ ﷺ نے لڑائی کے بغیر اس کو فتح کیا تھا۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری:۶/۱۴۰، مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنہ والبقاع:۶/۳۴۷، مجالس المومنین:۱/۴۸ اور معجم البلدان وغیرہ)

Marfat.com

لیکن ملا باقر مجلسی نے اس باغ کی جو حقیقت اور حدود اربعہ بیان کیا ہے، انسانی عقل اس کو سن کر دنگ رہ جاتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اس کا جو حدود اربعہ بیان کیا ہے۔ اس میں قریباً نصف کرۂ ارض آجاتا ہے۔ چنانچہ ملا باقر نے مناقب ابن شہر آشوب سے بڑی ثقاہت کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے سیدنا موسیٰ کاظم رحمہ اللہ سے کہا کہ میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ وہ ''فدک'' لے لیجیے (جس کے بارہ میں آپ اور آپ کے آباء واجداد یہ سمجھتے آئے ہیں کہ ہم سے غصب کر لیا گیا ہے) آپ نے ہارون الرشید کی اس استدعا کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ہارون الرشید نے کئی مرتبہ سیدنا موسیٰ کاظم رحمہ اللہ سے اس بارہ میں کہا لیکن آپ نے مثبت اور منفی میں اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ آخر جب ہارون الرشید نے اصرار کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں اسے ہرگز لینے کے لیے تیار نہیں ہوں جب تک کہ وہ مجھے صحیح حدود کے ساتھ نہ دیا جائے۔ ہارون الرشید نے کہا آپ مجھے اس کا حدود اربعہ بتائیے؟ سیدنا موسیٰ کاظم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر میں نے اس کے حدود بتلائے تو پھر آپ مجھے وہ ہرگز دینے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ ہارون الرشید نے حلفاً کہا کہ میں آپ کو وہ ضرور دوں گا۔ خلیفہ کے اس اقرار پر سیدنا موسیٰ کاظم رحمہ اللہ نے اس کے حدود بیان کیے کہ اس کی ایک حد عدن ہے۔ یہ سن کر ہارون الرشید کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ پھر دوسری حد سمرقند بتلائی۔ یہ سن کر ہارون الرشید کا چہرہ تمتمانے لگا۔ پھر سیدنا موسیٰ کاظم رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کی تیسری حد افریقہ ہے۔ موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر ہارون کا چہرہ سیاہ ہوگیا۔ پھر موسیٰ کاظم رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کی چوتھی حد سمندر کا وہ کنارے ہے جو آرمینیہ سے ملا ہوا ہے۔ تب ہارون الرشید نے کہا ''حضرت! آپ نے ہمارے لیے تو کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ سیدنا موسیٰ کاظم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا تھا کہ ''اگر میں تمھیں اس کے حدود بتاؤں گا تو تم وہ مجھے ہرگز نہیں دو گے۔'' اس پر ہارون الرشید نے سیدنا موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کے قتل کا ارادہ کر لیا۔

ملا باقر مجلسی نے لکھا ہے کہ ابن سباط نے لکھا ہے: فدک کی پہلی حد عریش مصر، دوسری دومۃ الجندل، تیسری اور چوتھی حد سمندر ہے۔ (بحار الانوار: ۲/۱۰۱، اصول کافی: ۱/۵۴۳، تہران)

یہ روایت نہایت عجیب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اتنا علاقہ فتح ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کو مال فئے شمار کر کے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا جاتا۔ یہ سارا علاقہ تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانوں میں فتح ہوا تھا۔ اس سارے علاقہ کا مطالبہ کرنا دوسروں معنوں میں یہی تھا کہ سیدنا موسیٰ کاظم رحمہ اللہ ہارون الرشید سے اس کی ساری سلطنت کا مطالبہ کر رہے تھے۔

یہ باغ فدک اصل میں مال فئے میں سے تھا اور مال فئے کیا ہوتا ہے؟ اس بارہ میں صاحب لسان العرب نے لکھا ہے۔

''فئے اس غنیمت اور خراج کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کو کفار سے جنگ اور جہاد کے بغیر حاصل ہو۔ فئے کے حقیقی معنی رجوع کے ہیں۔ گویا دراصل یہ مال مسلمانوں ہی کا تھا اور انھیں کی طرف لوٹ آیا۔ اسی

Marfat.com

وجہ سے فئے اس سایہ کو بھی کہتے ہیں جو زوال کے بعد ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی مغرب کی طرف سے مشرق کی طرف لوٹتا ہے۔'' (لسان العرب زیر لفظ فئے)۔

فئے کے یہی معنی فقہائے اسلام نے ذکر کیے ہیں۔ چنانچہ ابو عبید رحمہ اللہ نے کتاب الاموال: ۵۹، یحییٰ بن آدم رحمہ اللہ نے کتاب الخراج: ۲۷۔۲۸ اور امام یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الخراج: ۱۸ پر اس کو ذکر کیا ہے۔

علی بن الحسین رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا:

"أرأيت ابابكر و عمر هل ظلما كم من حقكم شئياً"

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ابو بکرؓ اور عمرؓ نے تمھارے حق میں کسی بارہ میں کسی قسم کی کوئی زیادتی یا ظلم کیا؟''

آپ نے جواب میں فرمایا:

''بالکل نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس نے اپنے بندے پر قرآن حکیم کو نازل فرمایا، ہمارے حق میں ان دونوں نے رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا۔''

پوچھنے والے نے پھر پوچھا کہ کیا میں ان سے دوستی اور محبت رکھوں؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ہاں۔ پھر فرمایا: ''تو ان دونوں کے ساتھ دنیا و آخرت دونوں میں محبت رکھ اور اگر کوئی وبال پیش آئے تو میری گردن پر ہوگا۔'' (ابن ابی الحدید: ۴/۱۱۳، وفاء الوفاء: ۱۱۰، فضائل ابی بکر عشاری ۵)

بعض روایات میں آتا ہے کہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بعض حضرات نے باغ فدک اولاد فاطمہ کو واپس کرنے کے لیے کہا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے نہایت عمدہ اور خوبصورت جواب دیا!

"انی لاستحیی من الله ان ارد شئیاً منع منه ابوبکر وامضاه عمر"

''مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ میں اس شے کو لوٹا دوں جس کو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے منع کیا اور عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس فرمان کو جاری رکھا۔'' (ابن ابی الحدید: ۴/۱۳۰)

اسی وجہ سے سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سیدنا محمد باقر رحمہ اللہ کے بھائی سیدنا زید بن علی بن الحسین رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔

"لوكنت مكان ابی بكر لحكمت بمثل ماحكم به ابی بكر فی فدك"

''اگر ابو بکر رضی اللہ عنہ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی فدک کے معاملہ میں وہی کچھ کرتا جو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔'' (البدایہ والنہایہ: ۵/۲۹۰، السنن الکبریٰ بیہقی: ۶/۳۰۲، ابن ابی الحدید: ۴/۱۱۳)

یہ تھا مختصر طور پر فدک کا معاملہ۔ فدک رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے لے کر اہل بیت نبوت کے قبضہ میں تھا۔ وہی اس کا تمام انتظام و انصرام کرتے تھے، لیکن بعض روایات کے مطابق بنو امیہ کے بعض خلفاء نے اس پر قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ اور وہ اب اس کی آمدن اپنے ذاتی اخراجات میں صرف کرتے تھے۔ اب یہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے قبضہ میں تھا اور اسی پر ان کی اور ان کے اہل و عیال کی گزران تھی۔ آپ نے اس کے بارہ

Marfat.com

میں تحقیقات کر کے آل مروان سے کہا کہ "فدک رسول اللہ ﷺ کا خالصہ تھا جس کی آمدن آپ اپنی اور بنو ہاشم کی ضرورت میں صرف فرماتے تھے۔ خود سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے زمانہ تک اسی پر عمل ہوتا رہا۔ آخر میں اموی خلیفہ نے اس کو اپنی جاگیر بنا لیا جو اب میرے قبضہ میں آیا ہے، لیکن میرا اس پر کوئی حق نہیں کیونکہ آپ نے یہ فدک تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دینے سے انکار فرمایا تھا، لہٰذا میں تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ فدک کی جو صورت رسول اللہ ﷺ اور خلفائے اربعہ کے زمانہ میں تھی اس کو اسی حالت پر لوٹاتا ہوں۔

(سیر اعلام النبلاء: ۱۲۸/۵، تہذیب الکمال: ۴۴۲/۲۱، طبقات ابن سعد تذکرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۲۵۰/۵ ابو داؤد حدیث نمبر ۲۹۷۲)

یہی وہ انقلاب ہے جو کبھی مٹی کے ذروں، اینٹ پتھر کے مکانوں اور انسانوں کے جسموں اور صورتوں کو بدل دیتا ہے۔ پھر یہ انقلاب روحوں اور دلوں کی کائنات کو منقلب کر ڈالتا ہے۔ درحقیقت یہی تغیرات دنیا کے اصلی انقلابات ہیں جن سے کائنات انسانیت کا نقشہ حیات و ممات بنتا اور بدلتا رہتا ہے اور جن کی بدولت دنیا کی سعادت و ہدایت کا قیام اور عالم انسانیت کی ابدیت روحانی اور امنیت قلبی کو بقاء ہے۔ اسی روحانی انقلاب کے تحت آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی غصب شدہ جاگیروں کو واپس کرایا۔

ان جاگیروں اور غصب شدہ اموال کی واپسی کے بعد آپ عام غصب شدہ مالوں کی طرف متوجہ ہوئے اور پورے اموی دور میں ظالمانہ طریقوں سے جس قدر غصب شدہ اموال اور جاگیریں تھیں وہ آپ نے بنوامیہ سے لے کر ان کے اصلی مالکوں کو واپس کر دیں۔ (طبقات ابن سعد: ۲۵۲/۵)

یہ اموال چونکہ مدتوں سے غصب شدہ تھے لہٰذا ان کی واپسی کے لیے بڑی دقتیں درپیش آنے کا اندیشہ تھا۔ آپ نے ان اموال کی واپسی کے لیے ہر طرح کی آسانیوں کا لحاظ رکھا۔ سب سے پہلی بات یہ کہ ملکیت کے ثبوت کے لیے کسی بڑی شہادت کی ضرورت نہ تھی بلکہ معمولی شہادت پر مال لوٹا دیا جاتا تھا۔

(طبقات ابن سعد: ۲۵۲/۵)

جو لوگ اس دنیا سے انتقال کر چکے تھے۔ ان کے اموال ان کے وارثان کو واپس کیے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے انتقال تک جاری رہا۔ (تہذیب الاسماء: ۲۰/۱، طبقات: ۲۵۱/۵)

خاندان کی برہمی:

آپ نے جو کام کیا وہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا، کیونکہ آپ نے نہ صرف اپنی اور اہل خاندان کی جاگیریں، اموال مغصوبہ چھین کر اصل مالکوں کو واپس کیے بلکہ بنوامیہ کے سرداروں، وڈیروں اور اصحاب جاہ وحشمت کے تمام امتیازات بھی چھین لیے اور اب وہ معاشرہ میں ایک عام آدمی کی طرح تھے جیسا کہ خلافت راشدہ میں دستور تھا۔ اس سے ان کا سابقہ تمام غرور و نخوت خاک میں مل گیا اور وہ ایسا محسوس

Marfat.com

کرنے لگے جیسے وہ افلاک کی بلندیوں سے زمین پر گر گئے ہیں۔ اس وجہ سے تمام خاندان میں ان کے خلاف سخت برہمی اور ناراضگی پائی جانے لگی اور وہ اس بات کی کوشش کرنے لگے کہ انھیں اس عادلانہ طریقے سے ہٹا دیا جائے کیونکہ اگر انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیے رکھا تو ان کا مصنوعی اور نام نہاد وقار خاک میں مل جائے گا۔

چنانچہ بنوامیہ کے ایک اہم شخص عمرو بن ولید نے آپ کو ایک نہایت غضب آلود خط لکھا جس کے ایک ایک لفظ سے برہمی اور غیظ وغضب کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نے لکھا:

''امیر المومنین! آپ نے گزشتہ خلفاء پر عیب لگایا ہے اور ان کی اور ان کی اولاد کی دشمنی اور عداوت میں ان کے خلاف روش اختیار کی ہے۔ آپ نے قریش کی دولت اور ان کی میراث ظلم و جور اور استبداد سے چھین کر بیت المال میں داخل کر لی ہے اور اس طرح آپ قطع رحمی کے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز خدا سے ڈرو اور اس کا خیال کرو کہ آپ نے اہل خاندان پر زیادتی کی ہے۔ آپ ابھی منبر پر اچھی طرح براجمان بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ نے اپنے خاندان والوں کو ظلم و جور کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ کو بہت سی خصوصیات سے مختص فرمایا:

''آپ اپنی اس حکومت کو جس کو آپ اپنے لیے آزمائش اور مصیبت کہتے ہیں، خدا سے بہت دور ہو گئے ہیں کیونکہ آپ ظلم واستبداد میں آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس وجہ سے اپنی خواہشات کو روکو اور اس کا یقین رکھو کہ آپ ایک جبار کی نگاہ کے سامنے اور اس کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اس حالت میں چھوڑے نہیں جا سکتے۔''

یہ اس خط کا خلاصہ ہے جو عمرو بن ولید نے آپ کو لکھا۔ خط کے ایک ایک لفظ سے سختی کا اظہار ہو رہا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کے سخت الفاظ سے اس خط کا جواب دیا۔

(سیرۃ عمر بن العزیز رحمہ اللہ: ۱۱۲)

بعض روایات میں ہے کہ عمر رحمہ اللہ جب ناجائز جاگیروں اور جائیدادوں کو بحق سرکار ضبط کر چکے جس کا انھوں نے خلیفہ ہوتے ہی اعلان کیا تھا تو آپ نے امراء اور رؤسا کو جمع کر کے اعلان فرمایا: ''سنو! اگر لوگوں کے حقوق تمھارے ذمہ ہیں تو ان کو ادا کرو اور مجھے اس بات پر مجبور نہ کرو جسے میں پسند نہیں کرتا اور میں تم سے وہ سلوک نہیں کرنا چاہتا جسے تم پسند نہیں کرتے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے۔ اس امت کا دو تہائی یا آدھا مال تمھارے قبضہ میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دولت تم لوگوں کے ہاتھوں میں آ کر سمٹ گئی ہے۔ یہ بات سن کر امراء خاموش ہو گئے اور ان سے عمر رحمہ اللہ کی بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ رؤساء کے پورے مجمع میں ہشام بن عبدالملک بولا: ''امیر المومنین! جو مال ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملا ہے وہ ہم کسی صورت نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ نہ تو ہم اپنے باپوں کی ناشکری کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہم اپنے بچوں کو نادار اور قلاش بنانا چاہتے ہیں۔''

سیدنا عمر رحمہ اللہ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں عوام ان کی معاونت نہ کریں۔ اس لیے آپ نے فرمایا: ''اگر یہ

Marfat.com

اندیشہ نہ ہوتا کہ عوام ان امراء کی میرے خلاف مدد کریں گے جن کے لیے میں اس حق کا مطالبہ کر رہا ہوں تو میں جلد ہی ان رخساروں کو مٹی میں ملا دیتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے زندہ رکھا تو میں انشاء اللہ ہر حق دار کو اس کا حق پہنچا کر رہوں گا۔'' (العقد الفرید: ۴/۴۳۷)

جونہی آپ نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ امراء میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور انھوں نے آپ کے بارہ میں عجیب وغریب افواہیں اڑانی شروع کر دیں۔ اعتراضات کی ایک تیز وتند آندھی چھا گئی۔ لیکن آپ نے نتائج سے بے پروا ہو کر اپنا کام شروع رکھا اور ان کے اعتراضات اور افواہوں پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنا دل مضبوط رکھا۔ امراء نے آپ میں کمزوری کی دراڑیں تلاش کرنا شروع کیں۔ لیکن انھیں ان میں کوئی کمزوری نظر نہ آئی کیونکہ یہ ان کے مقابلہ میں انتہائی مضبوط اور مستحکم تھے۔ اب امراء نے سازشوں کا جال بچھانا شروع کیا جب انھیں دوسرے راستوں سے کامیابی نظر نہ آئی تو سب سے پہلی یہ سازش کی گئی کہ ان کی پھوپھی فاطمہ کو ان کے خلاف مشتعل کیا گیا اور اس کے کان بھرے گئے۔ فاطمہ بنت مروان ایک بلند پایہ اور خود دار خاتون تھیں۔ جب سب امراء نے یک زبان ہو کر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے خلاف ان کے کان بھرے تو انھوں نے عمر رحمہ اللہ کے پاس پیغام بھیجا کہ میں ایک نہایت اہم کام کے سلسلہ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ یہ پیغام بھیج کر فاطمہ گھوڑے پر سوار ہو کر عمر رحمہ اللہ کے ہاں پہنچی۔ دربان آپ کو اندر لے گیا۔ یہاں تک کہ آپ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے خیمہ تک پہنچ گئیں۔ عمر رحمہ اللہ ان کے استقبال کے لیے خود اٹھے۔ گھوڑے سے اتارا اور نہایت احترام کے ساتھ بٹھایا۔ پھر مزاح کے طور پر پوچھا: کیا آپ نے دروازے پر پہرے دار نہیں دیکھے؟ فاطمہ بنت مروان نہایت خوددار اور سنجیدہ عورت تھی، اسے مزاح اور دل لگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے جواب دیا: کیوں نہیں، دیکھے ہیں، اور یہ دربان تو ان کے پاس بھی دیکھے ہیں جو تم سے بہتر تھے۔ آپ نے دیکھا کہ پھوپھی صاحبہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہیں۔ لہٰذا آپ نے مزید کوئی بات نہ کی اور ان کے تشریف لانے کا سبب پوچھا۔ فاطمہ بنت مروان نے اپنے آنے کا سبب بتایا۔ آپ نے جواب میں عرض کیا: پھوپھی صاحبہ! جب سرکار دو عالم ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو لوگوں کو ایک آباد گھاٹ پر چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ پھر اس امت کا منتظم ایک ایسا شخص ہوا جس نے اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی۔ پھر یکے بعد دیگرے مختلف حضرات اس امت کے منتظم ہوئے، لیکن بعد میں آنے والے کچھ منتظمین نے اس میں کمی بیشی کر دی۔ بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے زندگی عطا فرمائی تو میں اس انتظام کو سابقہ حالت پر لے آؤں گا۔ آپ کی بات سن کر پھوپھی صاحبہ نے کہا: پھر تو تمھارے نزدیک ان خلفاء کو برا نہ کہا جائے۔ آپ پھوپھی صاحبہ کی بات سے سمجھ گئے کہ یہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ آپ نے کہا: ''انھیں کون برا کہتا ہے؟ ایک شخص اپنا حق حاصل کرنے کیلئے میرے پاس آتا ہے تو میرے لیے ضروری ہے کہ میں اس کا حق دلواؤں۔ پھوپھی صاحبہ نے کہا: آپ کے اعزا واقربا آپ کا شکوہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے ان سے وہ چیزیں چھین لی ہیں جو پہلے خلفاء نے ان کو دی تھیں یا ان سے

Marfat.com

نہیں چھینی تھیں۔ عمر نے کہا: ''میں نے ان کا حق تو نہیں لیا؟'' بولیں: یہ درست ہے لیکن میں نے انھیں آپ کے خلاف سخت باتیں کرتے ہوئے سنا ہے اور مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ کوئی سخت دن آپ کے پاس نہ لے آئیں۔ یہ باتیں سن کر عمر رحمہ اللہ کو جوش آ گیا آپ نے اسی جوش میں فرمایا: مجھے ہر سخت دن کا ڈر ہو اور روز قیامت جیسے دن کا ڈر نہ ہو، ایسا ممکن نہیں۔ میں تو یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے قیامت کے دن کی سختی سے محفوظ فرمائے۔

عمر رحمہ اللہ کی یہ بات سن کر پھوپھی صاحبہ نے اٹھ کر آنا چاہا لیکن عمر رحمہ اللہ نے انھیں بٹھا لیا۔ اب آپ نے اپنی بات مزید پھوپھی صاحبہ کے ذہن میں اتارنے کے لیے ایک اشرفی اور آگ کا ایک انگارہ منگوایا۔ اس اشرفی کو اس انگارے پر رکھا۔ وہ اشرفی سرخ ہو کر پگھل گئی اور اس پر جو کچھ لکھا ہوا تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ پھر آپ نے فرمایا: پھوپھی جان! کیا آپ کو اپنے اس بھتیجے پہ اس جیسی اشرفی سے رحم نہیں آتا؟ یہ دیکھ سن کر پھوپھی صاحبہ خاموش کھڑی ہو گئیں اور عمر رحمہ اللہ کی یہ بات ان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئی۔ وہ خوف زدہ ہو گئیں۔ عمر رحمہ اللہ نے پھوپھی کی خاموشی کو دیکھ کر کہا: ''پھوپھی صاحبہ! بات کریں میں کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہا؟'' بولیں: ''عمر! میں تم سے تبادلہ خیالات کرنے کے لیے آئی تھی لیکن تیرا یہ انداز گفتگو سن کر مجھ میں بات کرنے کی ہمت نہیں رہی۔'' چنانچہ وہ اٹھ کر واپس چلی آئیں اور مزید کوئی بات نہ کر سکیں۔ واپسی تک ان کے ذہن میں سونے کی آگ بھڑک رہی تھی اور وہ سونے اور سونے والوں کے درمیان مقابلہ کر رہی تھیں۔ جب وہ واپس ان لوگوں کے پاس پہنچیں جنھوں نے انھیں مشتعل کر کے عمر رحمہ اللہ کے پاس بھیجا تھا تو ان کو اکٹھا کر کے کہنے لگیں: ''تم اپنے فرزند عبدالعزیز کا نکاح جب آل عمر میں کرتے ہو تو پھر جب اس کی اولاد وہ کچھ کرتی ہے جو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کیا تو بے صبری کا اظہار کرتے ہو؟ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جو کچھ کہہ رہے ہیں یا کر رہے ہیں اس پر صبر کر کے اپنے کام کے انجام کا ذائقہ چکھو۔''

(سیرۃ ابن جوزی: ۱۱۶، صفۃ الصفوۃ: ۲/۶۹، کتاب الاغانی: ۸/۱۴۷، البدایہ والنہایہ: ۹/)

پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ وہ ہنگامہ پھوٹ پڑا جس کے پھوٹنے کا خطرہ تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کا ایک لڑکا آیا جس کی زمین دستاویز نہ ہونے کی وجہ سے آپ نے ضبط کر لی تھی۔ اس نے آ کر کہا: ''امیر المومنین! آپ مجھے میری زمین واپس کیوں نہیں کرتے؟'' آپ نے فرمایا: ''معاذ اللہ! میں تم کو وہ زمین کیوں نہ لوٹاؤں اگر تمھارے پاس اس کی ملکیت کی کوئی دستاویز ہے؟'' اس نے اپنی آستین سے دستاویز نکال کر آپ کو دی۔ عمر رحمہ اللہ نے دستاویز کو دیکھا اور فرمایا: ''اس دستاویز کی زمین کس کی ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''فاسق ابن حجاج کی''۔ فرمایا: پھر تو مسلمان اس کے حق دار ہیں۔ اب اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے کہا: ''اچھا، آپ مجھے میری دستاویز واپس کر دیں۔'' سیدنا عمر رحمہ اللہ نے فرمایا: میں نے یہ دستاویز تم سے مانگی نہیں تھی، تم نے خود مجھے دی ہے، لہٰذا اب میں تمھیں یہ واپس کرنے کا نہیں تا کہ اب تم کبھی بھی یہ غلط مطالبہ نہ کر سکو۔ مختصر یہ کہ

Marfat.com

عمرؒ نے سلیمان کے اس بیٹے کے ساتھ سخت بے رخی کا اظہار کیا۔ وہ آپ کے سامنے اس جائیداد کے لیے رویا بھی، لیکن عمرؒ نے اس کے رونے کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور چلے گئے۔ آپ کے غلام مزاحم نے یہ سارا معاملہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اسے سلیمان کے اس بیٹے پر جس کے لیے وصیت بھی کی گئی تھی، ترس آ گیا۔ جب وہ چلا گیا تو مزاحم نے کہا: ''امیر المومنین! آپ سلیمان کے بیٹے کے ساتھ یہ برتاؤ کر رہے ہیں اور آپ کو اس کے رونے پر بھی ترس نہیں آیا؟'' آپ نے جواب میں فرمایا: ''میں سلیمان کے اس بیٹے کے لیے اسی قدر شفقت کے جذبات رکھتا ہوں جس قدر اپنی اولاد کے لیے رکھتا ہوں لیکن کیا کروں، معاملہ دین کا ہے، کل اللہ کو حساب میں نے دینا ہے۔'' (سیرۃ ابن جوزی: ۱۱۸)

عمر بن نباتہ کے بچپن میں ولید بن عبدالملک کو اس سے بڑی محبت تھی اور اس نے اس کو مسلمانوں کے ایک فوجی دستہ پر امیر مقرر کر دیا تھا اور اس دستہ پر اسی کا حکم چلتا تھا۔ جب عمر بن عبدالعزیزؒ ظلم و جبر سے حاصل کیے ہوئے مالوں کے حقوق حق داروں کو دلوا رہے تھے تو عمر بن نباتہ سخت غضب ناک ہوا اور اس نے سخت غصے میں عمرؒ کو ایک خط لکھا کہ آپ نے سابق خلفاء کو داغدار بنا دیا ہے اور ان کے طریقہ اور سیرت کو چھوڑ کر ایک نئی سیرت اختیار کر لی ہے اور ان کی اولاد کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ہے اور آپ نے اس رشتہ کو منقطع کر دیا ہے جس کو ملانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، کیونکہ آپ نے قریش کے اموال اور ان کی جائیدادیں سرکاری خزانے میں جمع کرا دیں ہیں۔ آپ کا یہ عمل ناقابل معافی ہے۔ اس خط کے جواب میں عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابن نباتہ کو لکھا:

''تیرا خط مجھے موصول ہوا۔ میں تجھے اس سے بہتر جواب دے رہا ہوں۔ اے ابن ولید! تیرا ابتدائی حال وہ ہے جس سے تو خود بخوبی آشنا ہے کیونکہ تیری ماں نباتہ قبیلہ سکون کی ایک لونڈی تھی وہ گاتی بجاتی اور رقص کرتی تھی۔ حمص کے بازاروں میں وہ دکان در دکان پھرتی تھی۔ اسے دیان نے مسلمانوں کے مال سے خرید لیا اور وہ بطور ہدیہ تیرے باپ کے پاس بھیج دی گئی۔ پھر ولید سے اس کے پیٹ میں تیرا حمل قرار پا گیا، لہٰذا اس سے پیدا ہونے والا بچہ بدترین بچہ ہے۔ پھر تیری پرورش ایک ظالم اور سرکش کے طور پر ہوئی۔ تو مجھے اس وجہ سے ظالم اور جابر کہتا ہے کہ میں نے تجھے اور تیرے گھرانے کو اللہ کے مال سے جس میں قرابت داروں، غریبوں، مسکینوں اور بیواؤں کا حصہ ہے، محروم کر دیا ہے۔ سن لو! سب سے بڑا ظالم وہ ہے جس نے تجھے جب کہ تو ایک نادان بچہ تھا، اسلامی فوج کے ایک دستہ کا حاکم بنایا تھا اور تو اس پر اپنی مرضی سے حکم چلاتا تھا، لہٰذا تیرے لیے بھی ویل اور تیرے باپ کے لیے بھی ویل ہے۔ قیامت کے روز کتنے لوگ تم دونوں باپ بیٹے سے جھگڑنے والے ہوں گے؟ اور مزید سن لو! وہ شخص انتہائی ظالم اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے والا ہے جس نے حجاج بن یوسف کو حاکم بنایا جب کہ وہ ناجائز خون ریزی کرتا اور حرام مال حاصل کرتا تھا اور جس نے

Marfat.com

قرہ بن شریک کو جو ایک ٹھٹھ گنوار شخص تھا، مصر جیسے صوبے کا حاکم بنا دیا اور اسے ہر قسم کے لہو ولعب اور شراب و کباب کی چھوٹ دے دی۔ ابن نباتہ! انتظار کر کہ جب میں تیرے لیے اور تیرے گھر والوں کے لیے فارغ ہو جاؤں اور ان کو ایک روشن راستہ پر رکھ دوں کیونکہ تم ایک طویل زمانہ سے حق کو چھوڑے ہوئے ہو اور فضولیات اور لہو ولعب میں مشغول ہو۔ ابن نباتہ! عنقریب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا کہ میں تجھے فروخت کر کے تیری قیمت یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں پر خرچ کر دوں گا جن کا حق تو آج تک کھاتا رہا ہے، کیونکہ تجھ میں ان سب کا حق ہے۔ میں نے عزم کر لیا ہے کہ میں تیرے پاس عنقریب ایک ایسا شخص بھیجنے والا ہوں جو تیری پیشانی کے بال جو بدترین ہیں کاٹ دے گا کیونکہ میرے علم کے مطابق وہ تیری عظیم ترین مصیبت کا ذریعہ ہیں۔''

(سیرۃ ابن جوزی:۱۱۴، صفتہ الصفوۃ ۵۹/۲:۲، البیان والتبیین:۲۳/۳)

عنبسہ بن سعید بن العاص بنوامیہ کے اشراف میں سے تھا اور نہایت کثرت سے خلفاء کے پاس اس کی مجالس ہوتی تھیں۔ وہ اتنا مالدار تھا کہ اس کو مزید مال کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن حریص ہونے کے ناطے وہ خلفاء سے مانگتا ہی رہتا تھا پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔ ''کوزۂ چشم حریصاں پر نہ شد'' کی زندہ مثال تھا۔ سلیمان نے مرنے سے قبل اس کو بیس ہزار دینار عطیہ دیے۔ وہ اس طرح کہ ایک تحریر لکھ کر دے دی کہ یہ رقم بیت المال سے لے لی جائے۔ عنبسہ اس تحریر سے بہت خوش ہوا لیکن قبل اس کے کہ وہ یہ رقم بیت المال سے لیتا، سلیمان کا انتقال ہو گیا اور بیت المال مقفل کر دیا گیا۔ لہٰذا یہ تحریر نئے خلیفہ کے حکم پر موقوف رکھی گئی۔ لیکن عنبسہ کی بدقسمتی سے نئے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ہو گئے۔ عنبسہ ناامید نہ تھا کیونکہ عمر رحمہ اللہ اس کے گہرے دوست تھے۔ ایک روز عنبسہ عمر رحمہ اللہ کے پاس گیا۔ دیکھا کہ ان کے دروازے پر بنوامیہ کے لوگ کھڑے ہیں۔ ان لوگوں نے عنبسہ کو دیکھا تو کہا کہ اس کو واپس آنے دو اور دیکھو کہ اس کا کام بنتا ہے یا نہیں۔ عنبسہ عمر رحمہ اللہ کے پاس گئے اور کہا: ''امیر المومنین! ہماری آپ سے رشتہ داری ہے اور آپ کی قوم آپ کے دروازے پر کھڑی ہے اور آپ سے ملتجی ہے کہ آپ سے پہلے کے خلفاء جو کچھ انھیں دیا کرتے تھے وہ آپ بھی انھیں دیں۔ آپ نے فرمایا: ''عنبسہ! میرے مال میں تمھارے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ باقی رہا سرکاری بیت المال سو اس میں تمھارا اور دوسرے تمام مسلمانوں کا برابر کا حق ہے۔ کسی مسلمان کے عزیز اور رشتہ دار ہونے کی وجہ سے اس کا یہ حق روکا نہیں جا سکتا۔ اگر خلافت کے کاموں میں سب لوگوں کی تم جیسی رائے ہو جائے تو یقیناً تم پر اللہ کا عذاب نازل ہو جائے۔

امیر المومنین کا جواب سن کر عنبسہ نے کہا: ''امیر المومنین! سلیمان بن عبدالملک نے مجھے ایک عطیہ دیا تھا۔ لیکن عطیہ حاصل کرنے سے قبل سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ براہ کرم اب آپ یہ عطیہ مجھے دلوا دیں۔ میرے آپ کے ساتھ جس قدر گہرے تعلقات ہیں اس قدر سلیمان سے بھی نہ تھے۔ عمر رحمہ اللہ نے پوچھا: یہ عطیہ کتنی رقم

Marfat.com

کا ہے؟ وہ بولا: بیس ہزار دینار کا۔ اس قدر بھاری رقم سن کر عمر رحمہ اللہ نے چیخ ماری اور فرمایا: بیس ہزار دینار تو مسلمانوں کے چار ہزار گھرانوں کے کام آسکتے ہیں اور میں اس قدر گراں قدر رقم ایک شخص کو دے دوں، بخدا! میں ایسا نہیں کر سکتا۔ عنبسہ نے کہا: پھر تو آپ مجھے بھی اجازت دے دیں کہ میں آپ کی قوم کے ساتھ کسی دوسری جگہ چلا جاؤں۔ فرمایا: میں نے تمھیں بھی اجازت دے دی۔ عنبسہ کا بیان ہے کہ میں آخر کار آپ کے پاس سے نکل آیا۔ جب دروازے پر پہنچا تو آپ نے مجھے آواز دے کر بلایا: ابو خالد، میں لوٹ کر گیا اور خیال کیا کہ شاید آپ نے اپنی رائے بدل لی ہو۔ لیکن آپ نے مجھے فرمایا: کثرت سے موت کو یاد کیا کرو۔ اگر تم پر تنگی ہے تو موت کی یاد تمھاری تنگی دور کر دے گی اور اگر فراخی ہے تو اس سے دنیا ہیچ نظر آئے گی۔

آپ کی یہ بات سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ اب میں پھر باہر آنے کے لیے آگے بڑھا تو آپ نے مجھے پھر آواز دی۔ اب کی بار آپ نے مجھ پر ترس کھایا اور میرے تعلقات کا احترام کیا۔ فرمایا: عنبسہ! میرے خیال میں تم کو کہیں جانا نہیں چاہیے کیونکہ تم ایک مالدار اور متمول شخص ہو۔ میں سلیمان کا ترکہ فروخت کرنے والا ہوں۔ تم اسے خرید لو۔ انشاء اللہ تلافی مافات ہو جائے گی۔ عنبسہ کہتے ہیں کہ میں آپ کی رائے کو باعث برکت سمجھتے ہوئے ٹھہرا رہا اور میں نے ایک لاکھ میں سلیمان کا ترکہ خرید لیا پھر میں اسے عراق لے گیا اور وہاں دو لاکھ میں فروخت کر دیا۔

(سیرۃ ابن جوزی: ۱۱۴، ۱۱۷، سیرۃ ابن عبدالحکم: ۵۶، ۵۷، ۱۶۱)

مختصر یہ کہ امراء نے عمر رحمہ اللہ کی رائے تبدیل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی لیکن ان کی سب کوششیں رائیگاں گئیں اور عمر رحمہ اللہ نے بھی کوئی ایسی تدبیر نہ چھوڑی جس سے وہ بنو امیہ کو ان کے خیالات سے باز رکھ سکے حتیٰ کہ عمر رحمہ اللہ ان سے اور وہ عمر رحمہ اللہ سے مایوس ہو گئے۔ آپ بعض امراء کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے: ''میں کچھ ایسی گردنیں دیکھتا ہوں جو عنقریب گردنوں والوں کی طرف لوٹا دی جائیں گی۔''

(العقد الفرید: ۴/ ۴۳۷)

آخر کار تمام امراء اس بات پر متفق و متحد ہو گئے۔ اور اپنی یہ متفقہ رائے بھی عمر رحمہ اللہ کے سامنے پیش کر دی کہ عمر رحمہ اللہ اپنے ماتحت مال میں اپنی رائے اور اپنا فیصلہ بے شک نافذ کر لیں لیکن آپ سے قبل جو اموال امراء کو دے دیا گیا ہے اس میں دخل نہ دیں۔ کیونکہ جو شے گزر گئی خواہ وہ غلط تھی یا صحیح وہ اب حق بن گئی ہے۔ اگر یہ گناہ کا کام تھا تو اس کا مواخذہ عمر کو نہ ہوگا بلکہ دینے والوں کو ہوگا۔ یہی رائے ہشام بن عبدالملک نے ان سب امراء کی طرف سے آپ کو پیش کی، لیکن آپ کا ایک ہی جواب تھا اور اس جواب پر وہ آخر تک کاربند رہے کہ ''میں اللہ کی کتاب کے مطابق عمل درآمد کراؤں گا خواہ وہ مال میرے ماتحت ہو یا مجھ سے پہلے خلفاء کا دیا ہوا ہو۔ امراء نے کئی ہنگامے کیے لیکن آپ اپنے موقف پر قائم رہے۔ آخر کار جب امراء کو آپ کے عزم کی پختگی معلوم ہوئی اور یہ بھی کہ جب آپ کسی کام کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اسے کیے بغیر نہیں چھوڑتے،

Marfat.com

توہنگاموں سے باز آ گئے۔

اسی سلسلہ میں روح بن ولید کا ایک واقعہ کتابوں میں منقول ہے کہ ولید کا بیٹا روح ظالم اور ستم گر تھا۔ لوگ اس سے خوف زدہ تھے۔ اس کے باپ ولید نے حمص میں کچھ دکانیں اس کے نام کر دی تھیں اور ان کی دستاویز بھی لکھ کر دی تھی۔ حمص والے اس بات کی شکایت لے کر عمر رحمہ اللہ کے پاس آئے۔ ان کی شکایت سن کر آپ نے روح سے کہا کہ ان لوگوں کی دکانیں چھوڑ دو لیکن روح کا موقف تھا کہ ولید کی دستاویزات کی رو سے یہ دکانیں میری ہیں حالانکہ اس بات کا ثبوت مل چکا تھا کہ دکانیں حمص والوں کی ہیں۔ آخر کار روح بن ولید اور اہل حمص اٹھ کر چلے گئے۔ راستہ میں روح نے حمص والوں کو ڈرایا دھمکایا۔ وہ عمر رحمہ اللہ کے پاس شکایت لے کر آئے۔ عمر رحمہ اللہ کی رگ فاروقی پھڑکی۔ آپ نے ایک پہرے دار کعب بن حامد کو بلا کر کہا: روح بن ولید کے پاس جا، اگر وہ اہل حمص کی دکانیں واپس کر دے تو خیر ورنہ اس کا سر لے آ۔ کعب بن حامد ننگی تلوار لے کر روح کے پیچھے گیا۔ روح نے جب جلاد کو تلوار سونتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کا دل دھڑکنے لگا اور اس نے ذلیل و مغلوب ہو کر وہ دکانیں اہل حمص کو لوٹا دیں۔ (سیرۃ ابن الحکم:۵۹)

آپ نے امراء کے تمام اعتراضات کے جوابات دیئے، لیکن بنو امیہ کے بڑے بڑے لوگ جن سے جاگیریں اور اموال مغصوبہ چھین کر اصل مالکان کو واپس کیے گئے تھے، آپ کے جوابات سے مطمئن نہ ہوئے۔ اس وجہ سے ایک روزہ وہ آپ کے دروازے پر اکٹھے ہوئے۔ آپ اندر تشریف فرما تھے۔ انھوں نے آپ کے صاحبزادے عبدالملک سے کہا کہ یا تو ہم لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دلواؤ یا پھر اپنے ابا کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ ''ان سے پہلے جو خلفاء تھے وہ ہم کو لیتے دیتے تھے، ہمارے مراتب و درجات کا لحاظ رکھتے تھے، لیکن تمھارے ابا نے ہمیں ہر قسم کی مراعات سے محروم کر دیا۔'' عبدالملک نے اندر جا کر سیدنا عمر کو لوگوں کا یہ پیغام سنا دیا۔ آپ نے فرمایا: ''ان لوگوں کو جا کر کہہ دو کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں تو قیامت کے عذاب سے مجھے سخت خوف آتا ہے، لہٰذا میں آپ لوگوں کو کوئی بھی ناجائز مراعات نہیں دے سکتا۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز:۱۱۷)

یہ شکایت نہ صرف آل مروان کو آپ سے تھی بلکہ خود آپ کے گھر والوں کو بھی آپ سے یہ شکایت تھی چنانچہ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے جب اپنے گھر والوں کے گزارہ الاؤنس بند کر دیئے تو عنبسہ بن سعد نے آپ سے شکایت کی کہ امیر المومنین! ہم لوگوں کا آپ پر حق قرابت ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے ذاتی مال میں تم لوگوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور بیت المال کے مال میں تم لوگوں کا اس سے زیادہ حق نہیں ہے جتنا برک غماد کے آخری حدود کے رہنے والے کا۔ خدا کی قسم! اگر ساری دنیا تمھاری ہم نوا ہو جائے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ :۱۱۴، ۱۱۵، البدایہ والنہایہ:۹)

Marfat.com

عمر رحمہ اللہ کی اس ساری جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے وہ تمام زمینیں واپس لوٹا دیں جو ولید نے غصب کی تھیں، وہ بھی لوٹا دیں جو عرب کے گنواروں سے چھینی تھیں اور ابراہیم بن طلحہ کو اس کا گھر بھی واپس کرا دیا جو غصب کرلیا گیا تھا اور پہلے عبدالملک نے اسے لے لیا تھا۔ پھر سلیمان سے عمر رحمہ اللہ نے اسے واپس لوٹایا۔ (سیرۃ ابن جوزی: ۱۰۴، النجوم الزاہرہ: ۱/۲۴۰) اس طرح عمر رحمہ اللہ نے جس جائیداد پر ناجائز قبضہ دیکھا اس کو ایسے پختہ عزم کے ساتھ لوٹایا جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے اور اس کام میں اس بات کی بھی پروا نہ کی کہ رشتہ داروں سے تعلقات منقطع یا مخدوش ہو جائیں گے۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات کتابوں میں ملتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل خاندان اور عمائدین سلطنت کی طرف سے آپ پر بہت دباؤ ڈالا گیا۔ آپ کی ان مالی پالیسیوں پر ہر قسم کا احتجاج کیا گیا لیکن کسی قسم کا کوئی احتجاج اور کوئی دھمکی آپ کو اپنی ان پالیسیوں کو بروئے کار لانے سے نہ روک سکی اور اس بارہ میں آپ نے جو کرنا تھا وہ کر گزرے۔

ظالم افسروں کا تدارک:

دنیا کا یہ عام دستور ہے کہ ظالم حکمران اپنی ظالمانہ پالیسیوں کو بروئے کار لانے کے لیے ظالم عہدیداروں کو متعین کرتا ہے جو ہر معاملہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کی جور و استبداد پر مبنی پالیسیوں کو نافذ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اموال مغصوبہ کی واپسی کے بعد آپ نے دوسرا سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ایسے گورنروں اور افسروں کے ظلم و جور کا تدارک کیا جس کے وہ کئی سالوں سے خوگر ہو چکے تھے۔ اگرچہ آپ کے مشورہ سے سلیمان بن عبدالملک کے عہد خلافت ہی سے بڑی حد تک ایسے لوگوں کا تدارک ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی کچھ ابھی باقی تھے جن کا تدارک کرنا ضروری تھا۔ حجاج بن یوسف کی پالیسیوں سے آپ کو سخت اختلاف تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے خاندان والے اور کچھ عہدہ دار بھی ایسے تھے جو حجاج کی پالیسیوں پر عمل پیرا تھے۔ آپ نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی حجاج بن یوسف کے پورے خاندان کو یمن کی طرف جلاوطن کر دیا اور وہاں کے گورنر کو لکھا کہ میں تمھارے پاس آل عقیل کو بھیج رہا ہوں اس کو اپنی حکومت اور عمل داری میں ادھر ادھر منتشر کر دو تاکہ وہ کسی ایک جگہ اکٹھے ہو کر سلطنت کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکیں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز: ۹۰) جو لوگ حجاج کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے۔ ان کا تدارک اس طرح کیا کہ ان کو ہر قسم کے ملکی اختیارات اور حقوق سے یک قلم محروم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام ان جابر عہدہ داروں کے ظلم و استبداد سے محفوظ و مصئون ہو گئے۔ ابن جوزی رحمہ اللہ نے سیرۃ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ میں لکھا ہے کہ عمر رحمہ اللہ نے سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب سے حکام کے بارہ میں مشورہ کیا انھوں نے فرمایا کہ آپ کو حکام کو برطرف کرنے سے یہ بات آڑے نہ آئے کہ آپ کو کام کرنے کے لیے کوئی صحیح آدمی نہیں ملتا، اس وجہ سے فلاں جابر شخص کو اس کے عہدہ پر رکھا ہوا

Marfat.com

ہے۔ فرمایا: آپ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے بدکار حاکموں اور افسروں کو برطرف کردیں گے تو اللہ تعالیٰ صحیح اور مناسب آدمی آپ کو مہیا فرما دیں گے۔ جب کسی انسان کی نیت صحیح ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی پوری پوری مدد کی جاتی ہے۔ (سیرۃ ابن جوزی ۱۴۰) عمر رحمہ اللہ نے اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ظالم و جابر افسروں کو تیزی سے معزول کرنا شروع کردیا۔ آپ نے ہر اس افسر اور حکمران کو معزول کردیا جس نے مسلمانوں کا خون بہایا تھا اگرچہ وہ آپ کا عزیز ہی کیوں نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے اسامہ بن زید کو خراج مصر کے عہدہ سے برطرف کردیا اور یزید بن مہلب اور سالم بن عبدالرحمٰن کو عراق سے معزول فرما دیا اور حارث بن عبدالرحمٰن ثقفی کو اندلس سے اور محمد بن یزید بن مسلم کو افریقہ سے ان کے عہدوں سے معزول کردیا۔ اور حجاج بن یوسف ثقفی کے گھر والوں کو یمن کی طرف جلاوطن کردیا تاکہ لوگ ان کے شر سے محفوظ رہیں اور اس خاندان میں سے کسی کو نہ عافیت کی حالت میں حاکم بنایا اور نہ ہی جنگ کی حالت میں اور ہر اس شخص کو جس میں شر پسندی کے جراثیم تھے۔ جلاوطن کردیا۔ خالد بن ریان جس کی تلوار نے کئی بے گناہوں کا خون چاٹا تھا اس سے تلوار لے کر اسے وابق سے واپس بھیج دیا اور اس کا وظیفہ دو ہزار سے کم کر کے صرف تیس کردیا اور اس جیسے اور بھی جتنے لوگ تھے ان سب کو ان کے عہدوں سے معزول کردیا۔

عمر رحمہ اللہ غلطی کرنے والے افسروں کو پہلی سزا یہ دیتے کہ اس کو سخت زجر و توبیخ کرتے۔ اگر وہ اس کے باوجود بھی عقل سے کام نہ لیتا تو اسے معزول کردیتے۔ چنانچہ حاکم کوفہ عدی بن ارطاۃ کے ساتھ یہی کچھ کیا۔ سفیروں کیساتھ بھی آپ کا وہی سلوک تھا جو عاملوں اور قاضیوں کے ساتھ تھا۔ آپ سفراء کے پیچھے بھی جاسوس لگا دیتے تھے جو ان کو ان کے تمام احوال کی اطلاع دیتے تھے۔ چنانچہ جب آپ نے عبداللہ بن عبدالاعلیٰ کو شام روم کی طرف بھیجا تو اس کے ساتھ بھی ایک جاسوس لگا دیا جو قبیلہ عبس سے تعلق رکھتا تھا۔ جب دونوں واپس لوٹے تو آپ نے عبسی سے خلوت میں تمام حالات معلوم کیے۔ (الکامل للمبرد جلد: ۱/۳۰۶، سیرۃ ابن جوزی: ۸۸)

ظلم و جور کا انسداد:

ایک ظالم و جابر حکمران کو ہمیشہ ایک خلش رہتی ہے کہ اس کی غلط اور غیر عادلانہ پالیسیوں کے خلاف صدائے احتجاج نہ اٹھے۔ چنانچہ وہ اس کے تدارک کے لیے بدگمانی اور سوئے ظن پر مختلف لوگوں پر ظلم و جور کے پہاڑ توڑتا رہتا ہے اور معمولی معمولی جرائم بلکہ بدگمانی اور سوئے ظن پر دار و گیر اور سزا دیتا رہتا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس کو بالکل بند کردیا۔ موصل میں چوری اور نقب زنی کی اکثر وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہاں کے گورنر یحییٰ غسانی نے امیر المومنین کو لکھا کہ جب تک لوگوں کو شبہ میں نہ پکڑا جائے گا اور انھیں سزا نہ دی جائے گی یا ان پر تشدد نہ کیا جائے گا اس وقت تک چوری اور نقب زنی کی یہ وارداتیں بند نہ ہوں گی۔ لیکن آپ نے اس کے جواب میں اسے لکھا کہ صرف شرعی ثبوت پر مواخذہ کیا جائے۔ اگر حق ان کی اصلاح نہیں کرسکتا تو

Marfat.com

خدا ان کی اصلاح نہ کرے۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی: ۲۳۸)

اسی طرح خراسان کے گورنر جراح بن عبداللہ بن حکمی نے آپ کو لکھا کہ اہل خراسان کی روش اور طور و اطور نہایت خراب ہیں۔ ان کو کوڑے اور تلوار کے علاوہ اور کوئی شے درست نہیں کر سکتی اور وہ اسٹیٹ کے لیے ایک مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ اگر امیر المومنین مناسب سمجھیں تو ان دونوں (کوڑا اور تلوار کے استعمال) کی اجازت فرما دیں تو معاملہ درست ہو سکتا ہے۔ آپ نے جواب میں لکھا:

''خط تمھارا پہنچا۔ تمھارا یہ لکھنا کہ اہل خراسان کو کوڑے اور تلوار کے سوا اور کوئی شے درست نہیں کر سکتی، میں اس کو درست نہیں سمجھتا۔ ان کو عدل و انصاف اور حق و راستی سے درست کرو اور اسی کو عام کرو۔'' (تاریخ الخلفاء: ۲۴۳)

آپ کے خلیفہ بننے سے پہلے ملک میں عام دستور یہ تھا کہ اسٹیٹ کے مختلف عہدیدار اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے رعایا کے مالوں کو کم قیمت پر خرید لیتے تھے اور پھر ان کو مہنگے داموں فروخت کرتے۔ یہ بھی ایک ظلم تھا۔ اس کے انسداد کے لیے آپ نے تمام گورنروں اور عہدیداران حکومت کو لکھا کہ کوئی سرکاری افسر رعایا کے کسی مال کو کم قیمت پر خرید نہیں سکتا۔ چنانچہ آپ نے عدی بن ارطاط گورنر فارس کو لکھا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تمھارے علاقہ کے سرکاری افسر پھلوں کا تخمینہ کر کے عام نرخ سے کم قیمت لگا کر لوگوں سے خریدتے ہیں۔ اور کردوں کے قبائل مسافر سے عشر وصول کرتے ہیں۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سب کچھ تمھارے ایما سے ہوتا ہے یا تم اسے پسند کرتے ہو یا تمھارا اس میں تھوڑا سا بھی عمل دخل ہے تو میں تمھیں کوئی مہلت نہ دوں گا۔ میں بشر بن صفوان، عبداللہ بن عجلان اور خالد بن سالم کو اس معاملہ کی تحقیقات کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اگر وہ اس خبر کو درست اور صحیح پائیں گے تو پھلوں کو ان کے مالکوں کو واپس کر دیں گے۔ اس کے علاوہ اور جن جن باتوں کی مجھے اطلاع موصول ہوئی وہ ان سب کی تحقیقات کریں گے۔ تحقیقات کے سلسلہ میں تم ان لوگوں سے کوئی مزاحمت نہ کرنا تا کہ یہ صحیح طور پر تحقیقات کر سکیں۔ (طبقات ابن سعد: ۲۸۹/۵، ۲۹۰)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے تاجروں پر یہ پابندی لگا دی تھی کہ وہ زیادہ منافع نہ لیں لیکن آپ نے اس پر کوئی سزا مقرر نہ کی اور آپ زیادہ منافع سے نفرت تو کرتے تھے لیکن سزا نہ دیتے، آپ نے جب اسامہ بن زید تنوخی کو مصر کا افسر خراج بنایا۔ اس زمانہ میں اس نے موسیٰ بن مروان سے بیس ہزار دینار کی مرچیں خریدیں اور اسامہ بن زید نے انھیں ایک گودام میں محفوظ کر دیا۔ اسامہ نے یہ مرچیں ولید بن عبدالملک کے لیے خریدی تھیں تا کہ انھیں ہدیہ کے طور پر شاہ روم کے پاس بھیجے لیکن جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہو گئے تو موسیٰ بن مروان نے ان مرچوں کی قیمت کا مطالبہ کیا۔ موسیٰ بن مروان نے ایک روز عمر رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ آپ حیان بن شریح کو لکھ دیں کہ وہ بیس ہزار دینار مجھے دے دیں جو مرچوں کی قیمت ہے۔ عمر رحمہ اللہ نے پوچھا کہ یہ بیس ہزار دینار کس کے ہیں؟ اس نے کہا: میرے ہیں۔ پوچھا: تمھارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟ موسیٰ نے کہا:

Marfat.com

میں تاجر ہوں۔ آپ نے اسے ایک چھڑی سے مار کر کہا: تاجر فاجر ہوتا ہے اور فاجر جہنمی ہے۔ پھر فرمایا کہ حیان کو لکھ دو کہ اس کی رقم دے دے۔ موسیٰ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں آپ کے پاس نہیں گیا اور آپ نے اپنے دربان کو حکم دیا کہ وہ میرے پاس نہ آئے۔ (فتوح اوخبار مصر: ۹۹)

خلافت راشدہ کے دور کے مقابلہ میں یہ ایک انارکی اور افراتفری کا دور تھا۔ لوگوں کے اموال اور ان کی عزت و آبرو خطرہ میں تھی۔ اگرچہ آج کل کے مقابلہ میں وہ نہایت امن و آشتی کا دور تھا۔ آج کل کے زمانہ میں تو حکومت ہر قسم کے ٹیکس لیتی ہے لیکن پورے ملک میں کسی شخص کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں۔ دن دیہاڑے لوگ قتل ہو رہے ہیں اور بالآخر حکومت نے یہ کہہ دیا ہے کہ ہر شخص اپنی جان اور اپنے مال کی خود حفاظت کرے۔ مسجدوں کے باہر پرائیویٹ گارڈ کھڑے ہیں، لیکن اس زمانہ میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ حکومت لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اپنا فرض منصبی سمجھتی تھی۔ اس وجہ سے امیر المومنین سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ وقتاً فوقتاً اپنے گورنروں کو عدل و انصاف کے قیام اور مظالم کے انسداد کے لیے احکامات بھیجتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک گشتی فرمان (Circular) اپنے تمام گورنروں اور امراء کے نام بھیجا کہ لوگ برے افسران اور عمال کی وجہ سے جنھوں نے برے دستور قائم کیے اور کبھی عدل و انصاف، نرمی و بردباری اور احسان وشفقت کا ارادہ نہیں کیا، احکام الٰہی میں سخت مصیبت، سختی اور ظلم و جور میں مبتلا ہو گئے ہیں۔" (یعقوبی: ۳۶۲/۲) گویا حکام اعلیٰ کو یہ باور کرایا کہ لوگوں کی ساری خرابیاں تمھاری وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر تم لوگوں پر ظلم و جور نہ کرتے بلکہ عدل و انصاف سے کام لیتے، سختی نہ کرتے بلکہ نرمی و بردباری سے کام لیتے تو آج لوگوں کی یہ حالت نہ ہوتی۔ چنانچہ ایک گورنر عبدالحمید کو پہلا خط یہ لکھا کہ "وسوسہ شیطانی اور حکومت کے ظلم کے بعد انسان کی بقاء نہیں ہو سکتی لہٰذا جونہی تمھیں میرا خط موصول ہو اسی وقت ہر حق دار کو اس کا حق ادا کر دو۔ (طبقات ابن سعد: ۲۷۱/۵)

رعایا پر سب سے بڑا بوجھ ٹیکسوں کا ہوتا ہے۔ غلط قسم کے حکمران اپنی عیاشیوں کے لیے عوام پر ٹیکس لگا کر دولت اکٹھی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام ظالمانہ ٹیکسوں کے بوجھ تلے کراہتے رہتے ہیں اور حکمران طبقہ ان کے خون پسینہ کو چوس کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا رہتا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مسند نشین خلافت ہوتے ہی تمام ناجائز ٹیکس موقوف کر دیے۔ ان کے علاوہ اور بھی ظالمانہ طریقوں کا مالی بوجھ عوام پر پڑا ہوا تھا آپ نے اس کو ختم کر دیا اور عوام سکھ کا سانس لینے لگے۔ (طبقات ابن سعد: ۲۸۳/۵)

بیت المال کی اصلاح:

قومی خزانہ جس کو بیت المال کہتے ہیں صدر مملکت کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ اس میں سارا روپیہ پبلک کا ہوتا ہے اور صدر مملکت اس کا متولی اور کسٹوڈین ہوتا ہے اسلامی ریاست کے ذرائع محاصل مندرجہ ذیل ہوتے ہیں۔

Marfat.com

(۱) خراج (۲) جزیہ
(۳) فئے، غنیمت وخمس (۴) مشترکہ قومی املاک سے استفادہ
(۵) زمین کے اندر پائے جانے والے معدنی ذخائر
(۶) ریاستی کاروبار کے منافع (۷) اوقاف
(۸) لاوارث افراد یا اداروں کے ترکے

ان کے علاوہ کچھ اور مدات ہیں جن سے اسلامی ریاست کو آمدنی ہوتی ہے۔ اموی دور میں بیت المال کی یہ مدات موجود تھیں اور اس میں کافی روپیہ بیت المال میں جمع بھی ہو رہا تھا، لیکن پھر بھی بعض خلفاء نے مداخل ومخارج دونوں میں بڑی بدعنوانیاں داخل کر دی تھیں۔ جن کی وجہ سے جائز وناجائز آمدنی میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ ہر قسم کی ناجائز آمدنیوں سے خزانے کو بھرا جا رہا تھا اور پھر اسی ناجائز طریقوں سے اسے خرچ کیا جاتا تھا۔ بیت المال ایک قومی امانت تھی اور صدر مملکت اس کا کسٹوڈین ہوتا تھا، لیکن اب بیت المال ذاتی خزانہ بن گیا تھا اور اس کی آمدن کا بڑا حصہ خلفاء اور ان کے خاندان کے ذاتی مصارف میں صرف ہوتا تھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان دونوں بدعنوانیوں کا تدارک کیا اور بیت المال کو قومی امانت ڈکلیر (Declare) کیا۔ آپ نے شاہی خاندان کے تمام وظائف بند کر دیئے۔ خلافت کے شکوہ وتجمل کے تمام اخراجات یک قلم موقوف کر دیئے۔ جب آپ تخت نشین خلافت ہوئے تھے تو اس کے بعد شاہی اصطبل کے انچارج اور داروغہ نے سواریوں کے اخراجات طلب کیے تو آپ نے حکم دیا کہ ان تمام سواریوں کو فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی جائے کیونکہ مجھے ان شاہی سواریوں کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے لیے میرا خچر کافی ہے۔ (تاریخ الخلفاء ۲۳۱، سیر اعلام النبلاء: ۵/ ۱۲۵)

آج کل بھی قومی خزانہ کو ہمارے حکمران ذاتی خزانہ سمجھ کر صرف کرتے ہیں۔ غیر ملکی دوروں اور اندرون ملک دوروں کے لیے کروڑوں روپے صرف کیے جاتے ہیں۔ جیسے ان کے باپ کا خزانہ ہو۔ ان کے ٹیلی فونوں کے بل اور گاڑیوں کے پٹرول کے اخراجات ان کی تنخواہوں سے کئی گناہ زیادہ ہیں۔ دفتروں کی گاڑیاں گھروں میں بیگمات کے ذاتی کاموں میں صرف ہوتی ہیں لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کاش کہ آج بھی کوئی عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ پیدا ہو جو ان کے مداخل ومخارج کی ناجائز مدات کا تدارک کرے۔

تاریخ کی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حجاج بن یوسف ثقفی بیت المال کی آمدنی بڑھانے کے لیے نومسلموں سے بھی جزیہ لیتا تھا۔ حالانکہ جزیہ صرف غیر مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ ذمیوں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ایک ٹیکس اسلام میں وصول کیا جاتا ہے اور یہ صرف ایسے مردوں پر لگایا جاتا ہے۔ جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں اور بچے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح بوڑھے، مسکین، غریب اور وہ اندھے، لنگڑے اور اپاہج بھی اس سے مستثنیٰ ہیں جو مال نہیں رکھتے۔ نادار مذہبی پیشواؤں کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا

Marfat.com

ہے۔ یہ ٹیکس اشخاص کی حیثیت کے لحاظ سے لگایا جاتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جزیہ امان کا ٹیکس ہے یعنی انھیں امان دی گئی تو اس کے عوض انھوں نے جزیہ دیا۔ (تفسیر قرطبی: ۱۱۴/۸) اس کی تفصیل کے بارہ میں تفسیر المنار سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۳۰ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ جزیہ کی وصولی میں سختی کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب شام کے سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ تو راستے میں ان کا گزر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جو دھوپ میں کھڑے کر دیئے گئے تھے اور ان کے سروں پر تیل ڈالا جا رہا تھا۔ آپ نے پوچھا: ''یہ لوگ ادائیگی کے بارے میں کیا عذر پیش کرتے ہیں؟'' جواب دیا: ''یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ ہم جزیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔'' آپ نے فرمایا! ''پھر تم لوگ ان کو چھوڑ دو اور ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو کیونکہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:

''لوگوں کو عذاب نہ دو کیونکہ جو لوگ دنیا میں انسانوں کو عذاب دیتے ہیں۔ ان کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ عذاب دے گا۔''

چنانچہ آپ کے حکم سے ان لوگوں کو چھوڑ دیا گیا۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۵۰، کتاب الاموال: ۴۳)

جزیہ کچھ صورتوں میں ساقط بھی ہو جاتا ہے۔ جن میں ایک صورت اسلام بھی ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم مسلمان ہو جائے تو جزیہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اہل الیس میں سے دو شخص مسلمان ہو گئے۔ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے جزیہ ساقط کر دیا۔ (سنن کبریٰ بیہقی: ۱۹۹/۹) اسی طرح اہل نجران میں سے ایک شخص مسلمان ہو گیا۔ حکومت کے کارندوں نے اس سے جزیہ وصول کرنا چاہا۔ اس نے انکار کیا۔ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ تم پناہ ڈھونڈ رہے ہو؟'' اس نے کہا کہ اسلام میں پناہ ہی ہے اگر آپ دینا چاہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک اسلام ہی جائے پناہ ہے اور حکم تحریر فرمایا کہ اس سے جزیہ نہ لیا جائے۔

(مصنف عبدالرزاق: ۳۳۶/۱۰)

ماوراء النہر کے ایک دہقان زقیل نے اسلام قبول کر لیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے دو ہزار دینے کا حکم دیا اور جزیہ معاف کر دیا۔ (المحلیٰ: ۳۴۵/۷)

حجاج بن یوسف نے نومسلموں سے جزیہ لینا شروع کر دیا جو کہ ان سے لینا جائز نہیں تھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو جب پتہ چلا تو حکم جاری فرمایا کہ ''جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں ان کا جزیہ ساقط کر دیا جائے۔'' آپ کے اس حکم پر اتنے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے کہ جزیہ کی آمدن گھٹ گئی۔ حیان بن شریح نے اس سلسلہ میں شکایت لکھ کر بھیجی کہ ''اس کثرت کے ساتھ لوگ مسلمان ہوئے ہیں کہ مجھے قرض لے کر مسلمانوں کے وظائف دینے پڑے۔'' آپ نے اس کو ایک سخت اور تہدید آمیز خط لکھا کہ ''جزیہ بہرحال موقوف کرو کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، محصل خراج و جزیہ بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔''

(مقریزی: ۱۲۵/۲، سیر اعلام النبلاء: ۲۶۲/۵)

Marfat.com

بیت المال کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ خراج ہے۔ خراج اس کرایہ کا نام ہے جو اسلامی ریاست اپنی مملوکہ زمینوں پر وصول کرتی ہے۔ (الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ، ضیا الدین الریس: ۱۵۶، ۱۵۷) کرایہ دار کی حیثیت عام کرایہ داروں جیسی بھی ہوسکتی ہے اور موروثی کاشتکاروں جیسی بھی۔ جو غیر مسلم کاشتکار اپنی زمینوں کے مالک نہ ہوں بلکہ اسلامی ریاست کی مملوکہ زمین پر کرایہ دار یا موروثی کاشتکار کی حیثیت سے کاشت کررہے ہوں۔ ان سے حکومت اس زمین پر جو کرایہ وصول کرے گی اسے خراج کہتے ہیں۔ اس کرایہ کی کوئی شرح شریعت نے متعین نہیں کی بلکہ مختلف زمانوں میں زمین کی کیفیت کے لحاظ سے مختلف شرحیں رہی ہیں جو کہ کاشتکار کی ضروریات اور زمین کی کیفیت کے لحاظ سے ہوتی ہیں۔ جو غیر مسلم جنگ کے بعد اسلامی اقتدار کے تحت آئے ہوں ان کی زمینیں ان کی ملکیت نہیں رہ جاتیں بلکہ اسلامی ریاست کی ملکیت میں چلی جاتی ہیں خراج کا تعلق اصلاً ایسی ہی زمینوں سے ہے۔ (کتاب الاموال لابی عبید: ۶۸، ۲۷۹، الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ: ۱۱۱)

اسلامی ریاست کے صیغہ محاصل میں خراج کی یہ مد ایک نیا اضافہ ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں میں محاصل کی اس مد کا پتہ نہیں چلتا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے جب خیبر فتح کیا تو وہاں کے یہودیوں نے کہا کہ ہم ان زمینوں کے مالک ہیں اور ان کا جوتنا اور بونا ہم تم لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں، اس لیے ہمارے ساتھ بٹائی پر معاملہ کرلو۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی اور نصفا نصفی پر معاملہ کرلیا۔ فدک کے لوگوں کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے بھی ایسا ہی معاملہ کرنا چاہا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ان کی درخواست بھی منظور فرمالی۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ۵۰، ۵۱)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں سیدنا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ اور سیدنا حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے تمام ملک کی زمینوں کا بندوبست کرایا گیا۔ یہ دونوں حضرات عراق میں زیادہ تر رہنے کی وجہ سے اس کام سے بخوبی آشنا تھے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ انھوں نے اس تحقیق اور صحت کے ساتھ زمین کی پیمائش کی جس طرح قیمتی کپڑا ناپا جاتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پیمائش کا پیمانہ خود اپنے ہاتھ سے تیار کر کے ان حضرات کو دیا اور انھوں نے کئی ماہ تک بڑے اہتمام اور جانچ پڑتال سے پیمائش کا کام جاری رکھ کر بندوبست کا تمام حساب کتاب تیار کیا اور اس پر ایک خاص شرح سے خراج کی رقم عائد کردی جس کی تفصیل ہم نے کتاب ''سیرت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ'' میں بیان کی ہے۔

روایات میں ہے کہ خراج کی جو شرح سیدنا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے سفارش کر کے بھیجی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو نافذ فرما دیا۔ لیکن ایک روایت میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وفات سے تین یا چار روز قبل سیدنا حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اور سیدنا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے یہ فرما رہے تھے: ''شاید تم نے زمین پر اتنا بوجھ ڈال دیا ہے جسے وہ برداشت نہیں کرسکتی۔'' سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے زمین پر اتنا ہی مالیہ عائد کیا ہے جسے وہ برداشت کرسکتی ہے اور اگر میں چاہتا تو اپنی زمین پر اس سے دگنا بار ڈال سکتا تھا۔'' سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بھی کہا:

Marfat.com

''میں نے جو شرحیں عائد کی ہیں۔ انھیں یہ علاقہ برداشت کر سکتا ہے۔ اب جو فاضل بچ رہے گا وہ بہت زیادہ نہ ہوگا۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''غور کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم نے زمین پر اتنا بوجھ ڈال دیا ہو جو اس کی برداشت سے باہر ہو۔ اگر میں اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہا تو انھیں ایسے حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد محتاج نہ رہیں گی۔'' (کتاب الخراج لابی یوسف:۲۶)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اس نیک نیتی اور خلوص اور لوگوں کی بہی خواہی کا نتیجہ تھا کہ جتنا خراج ان کے زمانہ میں اکٹھا ہوا اتنا اس کے بعد پھر کبھی نہ ہوا۔ یہ ان کی عدل گستری اور رعایا پروری کا نتیجہ تھا کہ آسمان سے برکتیں نازل ہوتی تھیں۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے مسند نشین خلافت ہونے سے قبل بیت المال کی آمدنی کی اس مد میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز نہیں رہی تھی۔ بنجر اور بے آباد زمینوں پر بھی خراج عائد کر دیا گیا اور قحط زدہ علاقوں کے لوگوں سے بھی سختی کے ساتھ خراج وصول کیا جاتا۔ جو ذمی مسلمان ہو جاتے ان سے بھی خراج وصول کیا جاتا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو جب اپنے گورنروں اور دیگر سرکاری افسروں کی ان زیادتیوں کا علم ہوا تو آپ نے خراج کی اصلاح کے لیے بھی مختلف اقدامات کیے۔ چنانچہ مختلف گورنروں کے نام خطوط لکھے۔ ان میں سے ایک خط امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الخراج میں نقل کیا ہے۔ آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو خراج کی اصلاح کے بارہ میں ایک خط لکھا:

''خراج وصول کرنے سے قبل زمین کا معائنہ کرو۔ بنجر زمین کا بوجھ آباد زمین پر اور آباد زمین کا بار بنجر زمین پر ہرگز نہ ڈالو۔ بنجر زمینوں کا معائنہ کرو۔ اگر ان میں خراج وصول کرنے کی صلاحیت ہو تو ان سے بقدر گنجائش خراج لو اور ان کی اصلاح کرو تاکہ وہ آباد ہو جائیں اور ان میں پیداوار کی پوری صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جن آباد زمینوں میں کسی وجہ سے پیداوار نہیں ہوتی ان سے خراج وصول نہ کرو اور جو زمینیں قحط زدہ ہو جائیں ان کے مالکان سے نہایت نرمی سے خراج وصول کرو اگر وہ دے سکتے ہوں۔ خراج میں صرف وزن سبعہ لو جن میں سونا نہ ہو، ٹکسال اور چاندی پگھلانے والوں سے، نوروز اور مہرجان کے ہدیے، عرائض نویسی اور شادی کا ٹیکس، گھروں کا ٹیکس اور نکاح کا ٹیکس نہ لو۔ جو ذمی مسلمان ہو جائیں ان پر کوئی خراج نہیں ہے۔'' (کتاب الخراج:۴۹)

غرض اس طرح سے انھوں نے بیت المال سے نہ صرف خراج و جزیہ بلکہ ہر قسم کی ناجائز آمدنیاں بند کر دیں اور یہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔

قومی خزانہ کی حفاظت:

یہ تو قومی خزانہ اور بیت المال کے مداخل کی اصلاح تھی اور اس کی خرابیوں کا تدارک کیا گیا تھا۔ لیکن

Marfat.com

جب مختلف ذرائع کی آمدنی قومی خزانہ میں جمع ہوتی تو خزانہ کے انچارج حضرات میں امانت و دیانت کا فقدان بھی تھا۔ بعض حضرات خزانہ کی رقم میں ہیرا پھیری کرتے۔ یہ ساری خرابیاں بھی آپ کے علم میں آئیں۔ تو آپ نے ان کا تدارک بھی فرمایا۔ چنانچہ یزید بن مہلب بن ابی صفرہ گورنر خراسان کو خیانت کے جرم میں معزول کر کے قید کر دیا۔ (یعقوبی: ۲/۳۱۳)

بیت المال کی حفاظت کا آپ نے اتنا سخت انتظام کیا کہ ایک دفعہ یمن کے بیت المال سے ایک دینار گم ہوگیا جو کہ ایک معمولی شے تھے لیکن آپ نے وہاں کے افسر خزانہ کو لکھا کہ میں تمھاری امانت و دیانت کو متہم نہیں کرتا لیکن تمھاری بے پروائی کو ایک سنگین جرم قرار دیتا ہوں اور مسلمانوں کی طرف سے ان کے مال کا مدعی ہوں تم پر فرض ہے کہ تم شرعی قسم کھاؤ۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ: ۸۵)

بیت المال کے بعض مصارف و مخارج میں جو زیادتیاں اور اسراف ہو رہا تھا۔ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان کی بھی اصلاح فرمائی اور حکومت کے کارکنان کو یہ احساس دلایا کہ خزانہ کے ہم متولی ہیں مالک نہیں ہیں کہ اپنی مرضی سے جتنا چاہیں اور جہاں چاہیں خرچ کریں۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں روایت نقل کی ہے کہ ابوبکر بن حزم نے سلیمان بن عبدالملک کے عہد خلافت کے آخری ایام میں کاغذ، قلم، دوات اور روشنائی کے دفتر اخراجات کے اضافہ کے لیے لکھا تھا۔ یہ خط ابھی بارگاہ خلافت میں پہنچا ہی تھا۔ کہ خلیفہ سلیمان کا انتقال ہوگیا۔ لہٰذا وہ اس بارہ میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ خلیفہ کے انتقال کے بعد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسند خلافت پر بیٹھے تو ابوبکر بن حزم کی یہ ڈیمانڈ ان کے سامنے پیش کی گئی۔ آپ نے اس کے جواب میں ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ ''وہ دن یاد کرو جب تم اندھیری رات میں بغیر روشنی کے کیچڑ میں اپنے گھر سے مسجد نبوی جایا کرتے تھے اور آج خدا کی قسم! تمھاری حالت اس سے کہیں بہتر ہے۔ ان چیزوں کے اخراجات میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ تم قلم باریک کرلو اور سطریں قریب قریب لکھا کرو۔ اپنی اس قسم کی ضروریات میں کفایت شعاری سے کام لو۔ میں مسلمانوں کے بیت المال سے ایسی رقم صرف کرنا ہرگز پسند نہیں کرتا جس سے ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ (طبقات ابن سعد: ۵/۲۹۶، سیر اعلام النبلاء: ۵/۱۳۲) اسی طرح کی ہدایات آپ نے دوسرے گورنروں کو بھی لکھیں کہ کوئی گورنر ریاست یا کوئی کارکن بڑے کاغذ پر جلی قلم سے نہ لکھے۔ خود آپ کے اپنے فرامین بھی مختصر اور باریک قلم سے ہوتے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۵/۱۳۳، طبقات ابن سعد: ۵/۲۹۵) گویا کہ قومی خزانہ کے بارہ میں آپ نے اس قدر احتیاط فرمائی کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ اس فضول خرچی اور اسراف کی بھی روز قیامت پرسش ہوگی۔

بیت المال کے مصارف:

اسلام ایک اجتماعی دین ہے۔ زندگی کا اجتماعی مزاج اور نوع انسان کی آزمائش کا اجتماعی پہلو اس

Marfat.com

بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان ایک خاندان کی طرح رہیں اور کائنات کی جن اشیاء اور قوتوں کو اس پورے خاندان کی تحویل میں دیا گیا ہے۔ ان سے استفادہ میں سارے مسلمانوں بلکہ انسانوں کو ایک خاندان کے افراد کی طرح طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے۔

"کونوا عباداللہ اخواناً" (مسلم، باب النہی عن التحاسد والتباغض)

اللہ کے بندے اور ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہو۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

"ان کل مسلم اخ للمسلم وان المسلمین اخوۃ" (ابن ہشام: ۷۶/۳)

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔

صحیح اور صالح اجتماعیت اس وقت وجود میں آتی ہے جب ہر فرد دوسرے افراد کا پورے اجتماع کا اور طرز زندگی کا وفادار اور بہی خواہ بن کر زندگی گزارے جس میں فرد اور اجتماع دونوں کی فلاح مضمر ہو۔ چنانچہ ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"دین خیر خواہی کا نام ہے۔ بے شک دین خیر خواہی کا نام ہے۔ سن لو! دین خیر خواہی کا نام ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! کس کی خیر خواہی؟ فرمایا: اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول ﷺ کی اور مومنین کے ائمہ (یعنی اصحاب امر) کی اور عام مومنین کی۔" (ابوداؤد، باب النصیحۃ)

اسلامی شعور اور زندگی کا اسلامی مزاج ریاست کی ضرورت اور اہمیت کو اور زیادہ مستحکم کر دیتا ہے۔

اسلامی ریاست مسلمانوں کے مشترکہ مقاصد کی ضامن اور ان کے جذبہ اخوت و تعاون کی اعلیٰ ترین مظہر بن کر ابھرتی ہے۔ اسلام نے اجتماع کو قیام دین، دعوت الخیر، شہادت الناس، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو ذمہ داریاں سونپی ہیں، ریاست اس کی اولین ذمہ دار قرار پائی ہے۔ ریاست دوسرے اجتماعی اداروں کی نگرانی کرتی ہے۔ فرد کی جان و مال، عزت و آبرو، عقل و فہم اور دین و اخلاق کی محافظ بن کر رہتی ہے۔ افراد کے تزکیہ اور زندگی کے حصول میں مدد دیتی ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کی اطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا براہ راست تقاضا بلکہ اس کے ہم معنی ہے کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے امام کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔" (بخاری، کتاب الاحکام: ۲۴۰/۲)

اسلامی ریاست کے بغیر اسلامی اجتماع کا تصور دشوار ہے۔ اس حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

فرمایا:

"لااسلام الا بجماعۃ، ولاجماعۃ الا بالامارۃ، ولاامارۃ الا

Marfat.com

باطاعة"(مسند دارمی باب فی ذهاب العلم)

''اسلام بغیر جماعت کے کچھ نہیں، جماعت بغیر نظم امارت کے کچھ نہیں اور امارت بے معنی ہے اگر اس کی اطاعت نہ کی جائے۔''

جب ریاست اللہ کی فرماں بردار ہو تو پھر امیر ریاست کوئی ہو اس کی اطاعت ضروری ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تمھارے اوپر ایک چھوٹے سر والے حبشی غلام کو امیر مقرر کر دیا جائے۔''

(بخاری، باب السمع والطاعۃ للامام)

جب ریاست کا سربراہ شریعت کے خلاف کام کرے اور حکومت کی پالیسی اسلامی ہدایت سے منحرف ہو تو اس وقت حق بات کہنی چاہیے اور کسی کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن حکومت پر تنقید اس وقت سخت مشکل ہو جاتی ہے جب ملامت سے آگے بڑھ کر تنقید کی وجہ سے حکام کے ظلم و جور کا نشانہ بننے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں بھی عوام کو تنقید کی تاکید کی گئی اور اسے سب سے بڑا جہاد قرار دیا گیا۔ اسلام کی اسی تعلیم کے پیش نظر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا تھا:

''لوگو! تم میں سے میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ آدمی ہے۔ جو مجھے میرے عیوب بتلائے۔'' (طبقات ابن سعد: ۲۹۲/۳)

شریعت اسلامی ان ہدایات وضوابط کا مجموعہ ہے جو اسلام کے کلی فکر اور اس کے مجموعی مزاج سے ابھرتے ہیں۔ ''شریعت کی وضع و ترتیب کا شرعی مقصود یہ ہے کہ مکلف کو اپنی خواہشات کی بندگی سے نکالا جائے تاکہ جس طرح وہ اضطراری طور پر اللہ کا بندہ ہے اسی طرح اختیاری طور پر بھی اللہ کا بندہ بن جائے۔''

(الموافقات للشاطبی: ۱۶۸/۲)

شریعت کا مقصد اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ انسانی زندگی قائم رہے اور اس کو خوش اسلوبی اور سہولت کے ساتھ گزارا جا سکے۔ دنیا میں اس کو ایسی فلاح نصیب ہو جو آخرت کی فلاح کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ مفکرین اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ شریعت کا مقصد انسانی مفادات کا تحفظ اور اس کے مصالح کا حصول ہے کیونکہ احکام شریعت کی بنیاد حکمتوں اور مصالح پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''شریعت کی بنیاد حکمتوں پر رکھی گئی ہے۔ اس میں اصل توجہ معاش اور معاد میں انسانی مصالح کی طرف ہے۔ شریعت سراپا عدل، مجسم رحمت اور سراسر حکمت و مصلحت ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح و سعادت اس سے وابستہ ہے۔'' (اعلام الموقعین: ۱۰۱/۳)

اسی وجہ سے شریعت اسلامی کا گہرا مطالعہ کرنے والوں نے شریعت کے جملہ احکام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''وہ بندگان خدا کے مصالح کی خاطر وضع کی گئی ہے۔'' (الموافقات شاطبی: ۶/۲) وہ بنیادی مصالح

Marfat.com

کیا ہے جن کا تحفظ انسان کی اولین ضرورت ہے؟ وہ بنیادی ضروریات پانچ ہیں:

(۱) دین (۲) جان (۳) نسل (۴) مال اور (۵) عقل

(الموافقات: ۱/۳۸، الاحکام فی اصول الاحکام سیف الدین آمدی: ۳/۳۹۴)

انسان کی ان بنیادی ضروریات کے تحفظ کے لیے اقتدار کا ہونا ضروری ہے جو مفاد عامہ کے لیے کام کر کے ان ضروریات کا سختی کے ساتھ تحفظ کروائے اور اس کے لیے قانون وضع کرے۔ اسراف وتبذیر سے پرہیز، اپنے زائد از ضرورت مال سے اہل حاجت کی مدد کرنا یا سامان تجارت کو منصفانہ قیمتوں پر فروخت کرنا۔ عام حالات میں افراد کی اخلاقی ذمہ داری ہے، لیکن اگر ملک کی معیشت کو تنگ حالی کا سامنا ہو، ارباب دولت و ثروت سے اہل حاجت کی ضرورتیں پوری نہ ہو رہی ہوں اور اشیاء ضرورت کی قلت کے بغیر صرف نفع اندوزی کی خاطر عوام سے زیادہ قیمتیں وصول کی جا رہی ہوں، تو بنیادی انسانی مصالح کے تحفظ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ قانون اور قوت نافذہ کو حرکت میں لایا جائے اور ان ہدایات کی حکماً تعمیل کرائی جائے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ انسان کو مال کے ضائع کرنے کا اختیار نہ دیا جائے کیونکہ مال اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور امین کو امانت کے ضائع کرنے کا اخلاقی اور شرعی طور پر کوئی حق نہیں۔ وہ مال کو مقاصد حیات کے حصول کا ذریعہ بنائے اور جو کچھ اس منشاء کے خلاف ہوگا وہ اضاعت مال ہے جس کو قرآن حکیم ''فساد'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ (البقرۃ: ۲۰۵)

خود سرکار دوعالم ﷺ نے بھی احادیث میں ''اضاعت مال'' سے منع فرمایا۔ (فتح الباری: ۱۱/۲۶۲)

تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ جب بھی مسلمان حکمرانوں نے اسلامی ہدایات کو اپنا رہنما بنایا اور انھوں نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور اس کو ملک میں رائج کیا، کیونکہ کفالت عامہ کی ذمہ داری ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ جب سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہم نام اور عزیز سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہوئے تو آپ نے کفالت عامہ کی ذمہ داری کی گراں باری کو پوری طرح محسوس کیا اور رونے لگے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ فرماتی ہیں کہ میں ایک رات آپ کے پاس گئی۔ آپ اپنے مصلی پر تھے اور زار وقطار رو رہے تھے۔ آپ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ میں نے پوچھا: کیا کوئی نئی بات ہوگئی؟ آپ نے روتے ہوئے فرمایا:

''امت محمدیہ کی پوری ذمہ داری میرے کندھوں پر ہے۔ لہٰذا میں بھوکے فقیروں، بے سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد، غریب الدیار قیدیوں، بوڑھے اور نحیف وناتواں افراد اور ان لوگوں کے بارہ میں سوچ رہا تھا جو بکثرت اہل وعیال والے ہیں، لیکن مال دار نہیں ہیں اور مختلف علاقوں میں بسنے والے اسی قسم کے دوسرے افراد کے بارہ میں متفکر تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے روز مجھ سے ان کے بارہ میں پوچھا جائے گا اور اللہ کے حضور میرے مقابلہ میں

Marfat.com

ان لوگوں کے وکیل محمد ﷺ ہوں گے۔ (فعلمت ان ربی سیسألنی عنهم یوم القیامة وان خصمنی دونهم محمد صلی الله علیه وسلم) مجھے ڈر لگا کہ جرح میں میری بات ثابت نہ ہو سکے گی تو میں اپنی جان پر ترس کھا کر رونے لگا۔“

(ابن اثیر: ۵/۳۴، کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۰، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۱۸۹، سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم ۱۷۸)

اور تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ انھوں نے ان کی وہ سب ضرورتیں پوری کیں، لیکن اپنی ضرورتیں پوری نہ کر سکے۔ خود ان کے اپنے بچے بھوکے رہتے لیکن دوسروں کے بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ عید کے روز ان کے بچے پرانے کپڑے پہنتے تھے، لیکن دوسرے بچوں کو انھوں نے نئے کپڑے پہنائے۔

آپ کے زمانے میں ایک مرتبہ زبردست قحط پڑا تو عرب کے کچھ لوگ ایک وفد کی شکل میں آپ کے پاس آئے۔ انھوں نے آپ سے گفتگو کرنے کے لیے ایک شخص منتخب کیا۔ اس نے آپ سے کہا:

”اے امیر المومنین! ہم ایک شدید ضرورت کی وجہ سے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔ ہمارے جسم کی چمڑی سوکھ گئی ہے، کیونکہ اب ہڈیاں بھی میسر نہیں آتیں اور ہماری مشکل کا حل صرف بیت المال کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس مال کی حیثیت تین میں سے ایک ہو سکتی ہے یا تو خدا کے لیے ہے یا بندوں کے لیے یا پھر آپ کے لیے۔ خدا کو اس کی ضرورت نہیں۔ اگر بندگان خدا کے لیے ہے تو اسے انھیں دے دیجیے۔ اگر آپ کا ہے تو صدقہ کے طور پر ہمیں دے دیجیے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو جزائے خیر دے گا۔“

یہ سن کر آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور حکم دیا کہ ان لوگوں کی تمام ضروریات بیت المال سے پوری کی جائیں۔ (التبر المسبوک فی نصائح الملوک: ۶۱)

آپ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ جب بھی کوئی ضرورت مند آپ کے پاس آیا آپ نے اس کی ضرورت پوری کرنے کا اہتمام فرمایا۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی: ۵۶)

آپ کو اس کی بڑی فکر رہتی تھی کہ رعایا فقر و فاقہ سے نجات پا جائے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک شخص مدینہ طیبہ سے آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ فلاں مقام پر جو فقیر بیٹھا کرتے تھے ان کا کیا حال ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ لوگ اب وہاں نہیں بیٹھتے۔ اللہ نے ان کو وہاں بیٹھنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۷۶)

مملکت اسلامیہ کی ان گراں بار ذمہ داریوں کے بار دوش سے سبک دوش ہونے کے لیے آپ دن رات متفکر رہتے۔ اسی فکر میں ان کا انتقال ہوا اور ان کی اہلیہ محترمہ اور دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ ان کے جسم پر گوشت کے بجائے صرف ہڈیاں نظر آتی تھیں۔

Marfat.com

میں سمجھتا ہوں کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے جسم کا گوشت سکھا کر اور شبانہ روز کوشش کر کے بیت المال کو پھر مسلمانوں کی مشترکہ امانت بنا دیا۔ ان سے پہلے بیت المال کا روپیہ بڑے بڑے لوگوں کی جائز و ناجائز ضروریات پر خرچ ہوتا تھا، لیکن آپ نے اس کا کل اندوختہ پبلک کی ضرورت کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی آمدنی کا بڑا حصہ خالص رعایا کے مفاد کے کاموں میں صرف کیا جاتا تھا۔ ملک میں جتنے اپاہج اور معذور اشخاص تھے ان سب کے نام رجسٹر میں درج تھے۔ ان سب کو گزر اوقات کے لیے حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔ (الاصابہ: ۸۰/۵) جو عمال اور کارکنان حکومت اس بارہ میں ذرا بھی غفلت سے کام لیتے تھے ان کی گوش مالی کی جاتی تھی۔ لہٰذا ہر کارکن بڑے محتاط طریقے سے ان معاملات کو سرانجام دیتا تھا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ ''دمشق کے بیت المال سے ایک اپاہج شخص کے وظیفہ کے سلسلہ میں میمون ابن مہران نے کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انھیں صحیح اور تندرست آدمی کے برابر وظیفہ نہیں دیا جا سکتا۔ کسی طریقہ سے سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو اس بارہ میں اطلاع مل گئی تو انھوں نے نہایت عتاب آمیز خط لکھا جس سے اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ (طبقات ابن سعد: ۲۸۱/۵)

عمر بن عبدالعزیزؒ نے وظیفہ کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا کہ اکثر لوگوں کو نقد روپیہ کے بجائے جنس وظیفہ میں دیتے تھے۔ چنانچہ بعض لوگوں کو فی کس ساڑھے چار ارب کے حساب سے غلہ ملتا تھا۔ (ابن سعد: ۲۵۵/۵) قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کا بھی بیت المال میں ایک حصہ رکھا ہوا تھا۔ (ابن سعد: ۲۵۷/۵) علاوہ ازیں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی طرح شیر خوار بچوں کے لیے وظائف مقرر فرمائے۔ ایک عام لنگر خانہ بھی تھا جس سے فقرا اور مساکین کو کھانا بھی ملتا تھا۔ (ابن سعد: ۲۷۹/۵)

عام مستحقین کو صدقات اور خیرات کی رقم تقسیم ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کو تقسیم مال کے لیے رقعہ بھیجا۔ اس نے وہاں جانے سے عذر کیا کہ آپ مجھے ایسی جگہ بھیج رہے ہیں جہاں میں کسی کو نہیں پہچانتا۔ وہاں امیر و غریب سب ہیں۔ مجھے کیا پتہ کہ صدقات و خیرات کا مستحق کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے اسے دو۔ وہ یقیناً مستحق ہوگا۔ (زرقانی شرح موطا: ۲۲۷/۴) اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ اس زمانہ میں غیر مستحق ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا۔

ان مصارف کے علاوہ اور بھی بیت المال کے جو مفید مصارف تھے۔ آپ بے دریغ ان نیک مصارف میں قومی خزانہ صرف کرتے۔ اس فیاضانہ داد و دہش سے قومی خزانہ پر بہت بار پڑا۔ آمدن کم اور خرچ زیادہ ہو گیا۔ اس بارہ میں بعض گورنروں نے آپ کو توجہ بھی دلائی تو آپ نے فرمایا: ''جب تک ہے دیتے چلے جاؤ۔'' (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۸۵)

بیت المال کا جو تصور اسلام نے دیا ہے۔ وہ دنیا کے کسی اور مذہب نے نہیں دیا۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بیت المال کا جو تصور تھا وہ بعد کے زمانوں میں نہیں رہا۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت

Marfat.com

میں خلیفہ کا حق بیت المال پر صرف دو درہم کا تھا لیکن بعد کے زمانوں کے خلفاء سارے بیت المال کو اپنے باپ دادا کی ملکیت سمجھنے لگے اور اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہوئے اپنے آپ پر اور اپنے چہیتوں پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حکومت کو بیت المال کا صحیح اسلامی تصور دیا، چنانچہ انھوں نے بیت المال کا اپنے کو کسٹوڈین سمجھا اور بیت المال کو ہاتھ تک نہ لگایا بلکہ اس سے بالکل مستغنی رہے۔

ان کے نزدیک بیت المال میں صرف اس کے حق دار کا حصہ تھا خود امیر المومنین کا بھی اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ چنانچہ وہب بن منبہ ایک متقی پرہیز گار اور اللہ والے بزرگ تھے۔ آپ نے بیت المال کے سلسلہ میں ان کے ساتھ بھی وہ برتاؤ کیا جو ایک خلیفہ راشد کو کرنا چاہیے تھا۔ ہوا یہ کہ آپ بیت المال کے منتظم تھے اور بیت المال کی کچھ رقم کم ہوگئی۔ آپ نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو لکھا کہ بیت المال میں ایک دینار (اور دوسری روایت کے مطابق چند دینار) کم ہیں۔ عمر رحمہ اللہ نے ان کو جواب میں لکھا: میں آپ کو متہم نہیں کرتا۔ مجھ سے اس مال کے بارہ میں مسلمان جھگڑا کرنے والے ہیں۔ جتنے دینار کم ہیں براہ نوازش اتنے بیت المال میں جمع کر دیں۔ چنانچہ وہب بن منبہ نے اتنے دینار اپنی جیب سے اس میں جمع کر دیئے۔ (سیر ابن جوزی: ۸۷)

اسی طرح ایک اور واقعہ تاریخ کے اوراق میں آپ کی دیانت و امانت کے بارہ میں ملتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے بیٹے نے درخواست کی کہ بیت المال میں سے مجھے میری شادی کا خرچہ دے دیا جائے۔ آپ سے قبل خلفاء کے بیٹے اپنی شادی کا خرچہ بیت المال ہی سے کرتے تھے۔ آپ نے اپنے بیٹے کی اس عرض داشت کو مسترد کر دیا حالانکہ آپ کی واضح ہدایات تھیں کہ بیت المال سے نادار اور قلاش لوگوں کی شادیاں کروا دی جائیں۔ آپ کا وہ بیٹا نادار بھی تھا اور قلاش بھی۔ اگرچہ وہ خلیفہ کا بیٹا تھا لیکن خلیفہ خود نادار تھا۔ آپ نے بیٹے کے نادار ہونے کے باوجود اس کی درخواست مسترد کر دی کیونکہ اس کی ایک بیوی پہلے سے موجود تھی۔ عمر رحمہ اللہ نے نہ صرف اس کی درخواست کو مسترد کیا بلکہ ناراض ہو کر اسے لکھا:

''خط تمھارا موصول ہوا۔ اس میں مرقوم ہے کہ میں مسلمانوں کے مال سے سوکنوں کو جمع کر دوں حالانکہ مہاجرین کے بیٹوں میں سے کسی کے پاس ایک بیوی بھی نہیں کہ وہ اس کے ذریعہ عفیف اور پاک دامن رہے۔ خبردار! آئندہ مجھے اس قسم کی کوئی درخواست نہ کرنا۔ گھر کے برتن اور دوسرا سامان فروخت کر کے شادی کر لو۔''

ایک طرف تو اپنے بیٹے کو عمر رحمہ اللہ نے یہ لکھا اور دوسری طرف کوفہ کے گورنر کو یہ لکھا کہ تم نے لکھا ہے کہ فوجیوں کو مدد دینے کے بعد تمھارے پاس بیت المال میں رقم بچ گئی ہے، لہٰذا یہ بچی ہوئی رقم اسے دے دو جس پر واجبی قرض ہے یا پھر اس کو دے دو جس نے نکاح کر لیا ہو مگر اس کے پاس گھر کے اخراجات چلانے کے لیے نقد روپیہ نہ ہو۔ (سیرین ابن عبدالحکم: ۲۷)

یہ وہ خلیفہ تھے کہ انھوں نے اپنی اولاد کو بیت المال سے ہر قسم کا فائدہ اٹھانے اور غلاموں اور

Marfat.com

جانوروں سے انتفاع حاصل کرنے سے ایک قلم محروم رکھا۔ انھوں نے اپنے جدامجد سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی روش اور طریقہ پر چل کر اپنی ذاتی ضرورتوں کے لیے ذاتی چراغ جلایا اور جو پانی موسم سرما میں وضو کے لیے گرم کرتے تھے اور جو پھل وغیرہ وہ کبھی کھاتے تھے اس پر اتنا ذاتی پیسہ خرچ کرتے تھے یہاں تک کہ بیت المال کا عنبر جب تقسیم کیا جاتا تو اس کو کاٹتے وقت اس کی جو خوشبو پھیلتی، اس کو نہ سونگھنے کے لیے اپنا ناک بند کرلیا کرتے تھے اور اگر آپ کے پاس سرکاری سواری پر کوئی ہدیہ بھیجا جاتا تو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت سرکاری جانوروں کو چارہ کھلانے میں صرف کر دیتے تھے۔ (سیرۃ ابن جوزی:۱۱۱، سیرۃ ابن عبدالحکم ۵۲، محاسن السلوک لمحمد غنیم:۷۸) اس خلیفہ نے اپنے خواص کو بھی یہ اختیار نہ دیا تھا کہ وہ سرکاری مال یا غلام یا جانور کو اپنی ذات کے لیے استعمال کر لے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک غلام نے ایک شخص کو سرکاری گھوڑے پر آپ کی اجازت کے بغیر سوار کر دیا۔ پہلے خلفاء کے لیے یہ ایک معمولی بات تھی اور اکثر وہ سرکاری سواریوں اور غلاموں کو اپنے ذاتی کاموں میں استعمال کرتے، لیکن عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس کو بلا کر فرمایا: ''جب تک اس کا کرایہ بیت المال میں جمع نہیں کرائے گا اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا۔'' چنانچہ اس نے اس کا کرایہ بیت المال میں جمع کرا دیا۔

(کتاب الخراج ابی یوسف:۱۸۶)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نزدیک بیت المال میں سب مسلمانوں کا حق تھا اور ہر شخص اس میں سے اپنے حق کے مطابق لے سکتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ مستحق لوگ بیت المال میں سے اپنا حق جو بنتا ہے وہ پورا پورا لیں اور کوئی شخص ان کو ان کے حق سے محروم نہ کرے۔ ان کے نزدیک سرکاری مہمان خانہ بھی حکومت کے بیت المال سے چلنا چاہیے چنانچہ انھوں نے ایک سرکاری مہمان خانہ بھی قائم کیا کیونکہ آپ کے والد عبدالعزیز رحمہ اللہ نے جب وہ مصر کے گورنر تھے، ایک سرکاری مہمان خانہ قائم کیا تھا، چنانچہ عمر رحمہ اللہ نے بھی بیت المال میں مسافروں کا ایک حصہ مقرر کیا تھا۔ آپ کے نزدیک قرض داروں کے لیے بھی بیت المال میں حصہ مقرر تھا جن سے ان کے قرضوں کی ادائیگی ہوتی تھی۔ پھر ان کے نزدیک قرض دار کی جو تعریف تھی وہ دوسرے لوگوں سے مختلف تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے گورنر کو لکھا کہ قرض داروں کے قرض بیت المال سے ادا کیے جائیں۔ گورنروں نے آپ کو لکھا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کے پاس گھر، گھریلو سامان، نوکر اور گھوڑا موجود ہے، لیکن اس سب چیزوں کے باوجود اس پر قرض بھی ہے، کیا اس شخص کا قرض بھی بیت المال سے اتار دیا جائے؟ آپ نے ان کے جواب میں لکھا: ''مسلمانوں کے لیے ایک گھر کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا سر چھپا سکے اور اس کے لیے ایک خادم کا ہونا بھی ضروری ہے جو اندرون خانہ اور بیرون خانہ اس کا ہاتھ بٹا سکے اور گھوڑے کا ہونا بھی ضروری ہے جو اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکے اور گھریلو سامان کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ اچھے طریقے سے اپنے گھر کو چلا سکے۔ ان اشیاء کے باوجود اس شخص کا شمار قرض داروں میں ہے اگر اس کے ذمہ کچھ قرض ہے، اس لیے اس شخص کا قرض اتار دیا جائے۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم:۲۷۰)

Marfat.com

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نزدیک بیت المال درہم و دینار جمع کرنے کا مکان نہیں کہ درہم و دینار اور سونا چاندی اس میں جمع ہو کر ایک منجمد پہاڑ بن جائیں اور ان سے سیراب کرنے والا سیلاب جاری نہ ہو۔ آپ کے خیال میں بیت المال میں مال جمع کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ اس مال سے رعایا کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ آپ کے بیت المال کے اس نظریے اور تصور نے بیت المال کے محافظین کو پریشان کر دیا کیونکہ ان کا نظریہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ان کے ہاں بیت المال کا تصور یہ تھا کہ اس میں مال جمع کیا جائے اور وہ پھر خرچ نہ ہو بلکہ جمع ہی رہے جیسا کہ آج کے وزراء اعظم اور صدور کا نظریہ ہے۔ چنانچہ آپ اکثر و بیشتر اپنے گورنروں کو یہ لکھتے رہتے کہ بیت المال کو لوگوں کی ضروریات میں خرچ کیا جائے اور اگر کوئی گورنر آپ کو لکھتا کہ آپ نے بیت المال کو نقصان پہنچایا ہے تو عمر رحمہ اللہ اس کو جواب میں لکھتے کہ جو کچھ بیت المال میں ہے اس کو خرچ کرتے رہو پھر جب اس میں کچھ باقی نہ رہے تو اس کو کیچڑ سے بھر دو۔ (سیرۃ ابن جوزی: ۵۸)

اسلامی مملکت میں بلکہ ہر حکومت میں کچھ شہر مالدار ہوتے ہیں اور کچھ نادار۔ اس بارہ میں آپ کا نظریہ یہ تھا کہ مالدار شہر نادار شہر کی ضروریات کو پورا کرے اگرچہ مالدار شہر کے پاس کچھ باقی نہ بچے۔ چنانچہ جب آپ نے مغصوبہ جاگیریں اور جائیدادیں واپس دلوائیں تو عراق کا مال ختم ہو گیا۔ آپ نے حکم فرمایا کہ اب شام عراق کی ضروریات کو پورا کرے۔ آپ کی یہ پالیسی نہایت اچھی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانہ میں مملکت اسلامیہ ایک طاقتور اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے والی اکائی بن گئی اور اس کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جو نادار اور غریب ہو۔ اور اگر کسی شہر میں ناداری اور غریبی کا سایہ پڑ جاتا تو دوسرے مالدار شہر اس نادار شہر کی مدد کے لیے پہنچ جاتے اور اس کی ضروریات نہایت احسن طریق سے پوری کرتے۔

اس زمانے میں بیت المال ایک ٹکسال کا کام بھی کرتا یعنی اس میں درہم و دینار ڈھالے جاتے تھے اور وہ درہم و دینار واپس لے لیے جاتے جو پرانے ہو جایا کرتے تھے اور نئے ان لوگوں کو سپلائی کیے جاتے۔

(سیرۃ ابن جوزی: ۹۰، سیرۃ ابن عبدالحکم: ۱۷۱)

مختصر یہ کہ سیدنا عمر رحمہ اللہ بن عبدالعزیز نے قومی خزانہ کو قوم کے لیے وقف کر دیا اور ملت اسلامیہ کے مساکین، فقراء، ناداروں، مسافروں اور دوسرے مستحقین کے لیے بیت المال کے دروازے کھول دیے۔ ان کے وظائف جاری کیے اور بالغوں اور نابالغوں کے وظائف میں فرق رکھا۔ آپ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ پندرہ سال کا بچہ بالغ ہے اور اس سے کم عمر نابالغ کے حکم میں آتا ہے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۷۵) اور اس طریقہ سے بیت المال کے مصرف میں جس قدر خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اس کو آہستہ آہستہ ختم کیا حالانکہ آپ کے فرزند عبدالملک ان پر زور دیتے تھے کہ اصلاح کے احکام کو جلدی نافذ کریں اور آپ ان کو ایک بات کہتے تھے کہ بیٹا! جلدی نہ کرو کیونکہ خرابیاں بہت زیادہ ہیں۔ اگر ان کو جلدی سے رفع کرنے کی کوشش کی گئی تو فتنہ پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی شراب کی دو دفعہ مذمت کی اور پھر تیسری دفعہ اس

Marfat.com

کو حرام قرار دیا۔ (العقد الفرید:۴/۴۳۸، الموافقات:۲/۹۴)

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے سرکاری بیت المال کا کچھ ایسا انتظام کیا کہ بیت المال میں خود بخود مال آتا تھا اور آپ اس کو دونوں ہاتھوں سے لوگوں میں خرچ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ خوشحال ہو گئے۔ مغصوبہ جائیدادیں اور اموال واپس دلانے کے بعد جب آپ نے اپنی پوری توجہ غرباء اور مساکین میں مال تقسیم کرنے کی طرف کی تو متمول لوگوں نے زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنے میں پیش قدمی کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ بیت المال کے لیے مال جمع کرنے والے ان سے بہت سا مال اکٹھا کر کے لائے اور انھیں فقراء اور مساکین میں بانٹ دیا کیونکہ خود امیر المومنین کے حکم کے مطابق اگر حکام کو زکوٰۃ کا روپیہ تقسیم کرنے کے لیے منتظم بنایا جاتا تو انھیں اس تقسیم میں تاخیر کی اجازت نہ تھی اور اگر وہ تاخیر کرتے تو ان سے اس بارہ میں باز پرس ہوتی۔ چنانچہ وہ زکوٰۃ تقسیم کرنے میں کوئی تاخیر نہ برتتے۔ عیدالفطر کے موقع پر ایک شخص بہت سی زکوٰۃ لایا اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے مشورہ کے لیے اس نے اس کو روکے رکھا اور تقسیم نہ کیا۔ عمر رحمہ اللہ نے لکھا: بخدا! لوگوں نے مجھے اور تمھیں اپنے خیالات اور گمانوں کے مطابق نہیں پایا۔ آج تک تم نے اسے کیوں روکے رکھا؟ میرا یہ خط موصول ہوتے ہی فوراً اس کو مستحق لوگوں میں تقسیم کر دو۔

اسی طرح صدقہ فطر کے بارہ میں بھی بارگاہ خلافت سے یہی حکم تھا کہ اپنے اپنے علاقہ کے لوگوں سے صدقہ فطر وصول کرو۔ اور یہ صدقہ نہ آزاد سے معاف کیا جائے اور نہ غلام سے، نہ چھوٹے اور نہ بڑے سے، اور نہ مرد اور نہ عورت سے۔ ہر شخص سے گیہوں سے آدھا صاع اور کھجوروں کا ایک صاع وصول کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ مالداروں کے ہر قبیلے سے دو شخص ایسے چنے جاتے جو دیانت دار اور امین ہوتے تھے اور ان کو حاکم شہر منتخب کرتا تھا۔ وہ جمع کی ہوئی زکوٰۃ کو شہر لے جا کر شہریوں میں تقسیم کرتے تھے۔ دیہاتی اس سے مستغنیٰ اور بے نیاز تھے کیونکہ ان میں کوئی مفلس نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ محصل زکوٰۃ وصول کرتا اور اسی وقت ان کے فقراء اور مساکین کو جمع کر کے ان میں وہ تقسیم کر دیتا۔ اس سے ہر شخص خوش حال اور مالدار ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب آئندہ سال فقراء اور مساکین کو زکوٰۃ وصدقات لینے کے لیے بلایا جاتا تو صدقات قبول کرنے کے لیے کوئی فقیر و مسکین نہ ملتا تھا۔ چنانچہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اڑھائی سالہ دور خلافت میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ اگر ایک شخص مال کثیر لے کر آتا اور کہتا کہ یہ مال مستحق فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دو تو کوئی فقیر نہ ملتا اور مجبوراً اسے اپنا مال واپس لے کر لوٹنا پڑتا کیونکہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ مجھے صدقہ وصول کرنے کے لیے افریقہ بھیجا میں نے صدقہ وصول کر کے فقراء اور مساکین کو تلاش کیا تو مجھے وہاں کوئی بھی مستحق زکوٰۃ نہ ملا۔ آخر کار میں نے اس مال سے غلام خرید کر انھیں آزاد کر دیا اور ان کی ولاء مسلمانوں کو ملی۔

(سیرۃ ابن جوزی:۸۵، سیرۃ ابن عبدالحکم:۶۹، ۱۲۸، العقد الفرید:۴/۴۳۶)

Marfat.com

غیر مسلموں سے برتاؤ:

ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے اسی طرح سلوک کیا جاتا ہے جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ اور جس طرح ایک مسلمان کے خون کا قصاص ہے یا اس کے اعضائے بدن کے عوض اعضائے بدن کا قصاص ہے ویسا ہی ایک ذمی کے قاتل سے قصاص لیا جاتا ہے اور ایک ''مستامن'' کے قاتل سے بھی وہی قصاص لیا جائے گا۔ (مستامن وہ ہے جو غیر اسلامی ملک میں رہتا ہے لیکن امن لے کر اسلامی ریاست میں آ کر آباد ہوا اور ذمی بن گیا) بلکہ بعض لحاظ سے ایک ذمی کے حقوق ایک مسلمان سے بھی اسلامی ریاست میں زیادہ ہیں جو اموال یا اشیاء مسلمانوں کو رکھنا حرام ہیں بلکہ تلف کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ اشیاء تلف کر دی گئیں تو ان پر کوئی ضمان نہیں، لیکن اگر وہ اشیاء ایک ذمی کی ملکیت میں ہوں اور کوئی مسلمان اسے تلف اور ضائع کر دے تو اس مسلمان کے ذمہ ضمان واجب ہے۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کی شراب یا خنزیر کے گوشت کو تلف کر دے تو اس پر ضمان واجب ہے۔ (کمافی در المختار)

یہ تو ایک ذمی کی جان اور مال کا حال ہے۔ اسلام نے اس کے ننگ و ناموس کا بھی اسی طرح تحفظ کیا ہے جیسا کہ ایک مسلمان کی عزت و آبرو کا تحفظ کیا ہے، چنانچہ کسی ذمی کی آبروریزی اہانت اور تذلیل خواہ قول سے ہو یا اشارہ و کنایہ سے ہو، سامنے ہو یا اس کی غیبت میں، قطعاً حرام ہے یہاں تک کہ ذمی کی غیبت کرنا بھی حرام ہے۔ گویا کہ اسلامی ریاست میں ایک مسلمان اور ذمی کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس کو بھی وہ تمام تحفظات حاصل ہیں جو ایک مسلمان کو حاصل ہیں۔ چنانچہ شرح شرعۃ الاسلام: ۲۸/۲ میں ہے کہ:

''رعیت کے تمام انواع و اصناف میں مساوات کو ملحوظ رکھا جائے۔ کسی کو کسی پر اس کے مرتبہ یا حال کی وجہ سے تقدیم و ترجیح نہ دی جائے۔ قاضی کو چاہیے کہ مدعی اور مدعیٰ علیہ میں کسی بات کا فرق نہ کرے، نہ ان کی مجلس میں، نہ اس کی طرف دیکھنے میں اور نہ ہی گفتگو میں۔''

حقوق و معاملات کی مساوات کا یہ دائرہ صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں بلکہ غیر مسلم ذمی اور مستامن کو بھی شامل ہے۔

ایک مرتبہ شام کے ایک کاشتکار نے یہ شکایت بارگاہ خلافت میں کی کہ مسلمان فوج نے اس کی زراعت کو پامال کر دیا ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کو قومی خزانہ سے دس ہزار درہم بطور معاوضہ دلوائے اور تمام اضلاع کے حکام کو ایک گشتی مراسلہ ارسال فرمایا کہ ذمیوں پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔
(کتاب الخراج لابی یوسف: ۶۸)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو ذمیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ ان سے کیے گئے عہد کی پابندی کی جائے اور ان کا دفاع کیا جائے اور ان پر ان کی برداشت سے زیادہ

Marfat.com

بوجھ نہ ڈالا جائے۔ (کتاب الخراج:۱۲۶)

امام بخاری رحمہ اللہ نے آپ کی وصیت کو جو آپ نے بعد میں آنے والے خلیفہ کو کی تھی، ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ

''میں ان لوگوں کے حق میں وصیت کرتا ہوں جن کو خدا اور رسول ﷺ کا ذمہ دیا گیا ہے۔ (یعنی ذمی) کہ ان سے جو وعدے کیے گئے ہیں اس کو پورا کیا جائے اور ان کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔'' (بخاری:۱/۱۸۷)

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے عہد خلافت میں ذمیوں کے ساتھ نہایت عدل و انصاف کا برتاؤ کیا۔ انھوں نے جس طرح ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی اور ان کے ساتھ ہر معاملہ میں نرمی برتی اس کی مثال عہد فاروقی کے علاوہ اور کسی دور میں شاید ہی ملے۔ مسلمانوں کی طرح ان کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کی اور ان کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ جزیہ کی وصولی میں ان کے ساتھ وہی نرمی اور آسانی برتی جو سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ نے برتی تھی اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے عہد خلافت میں سیدنا سالم بن عبداللہ بن عمر رحمہ اللہ کو خط لکھا تھا کہ مجھے صدقات وغیرہ کے بارہ میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا طریقہ لکھ کر ارسال فرمائیں۔ انھوں نے صدقات اور حکومت کے بارہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل تو انھیں لکھ دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اگر آپ اپنے اس زمانہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی حکومت کی طرح حکمرانی کے فرائض انجام دے دیں تو آپ ان سے بڑھ جائیں گے۔ کیونکہ نہ آپ کا زمانہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح ہے اور نہ ہی آپ کے زمانے کے لوگ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کے لوگوں کی طرح ہیں۔ (تاریخ الخلفاء:۲۳۱)
آپ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرح اپنے زمانے کے مختلف گورنروں اور کارکنان حکومت کو لکھا کہ کوئی شخص ذمیوں پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہ کرے اور ان کے حقوق کا اسی طرح تحفظ کرے جس طرح مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ذمی کے خون کی وہی قیمت قرار دی جو مسلمانوں کے خون کی تھی۔ ایک دفعہ حیرہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ آپ کو پتہ چلا تو آپ نے وہاں کے گورنر کو لکھا کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ چاہیں قتل کریں چاہیں معاف کر دیں۔ گورنر نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا اور ذمیوں نے اسے قصاص میں قتل کر دیا۔ (نصب الرایہ:۳/۳۶۰) یہ ایک اسلامی ریاست کا خاصا ہے ورنہ اور کسی ریاست میں ایسا نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ عدی بن ارطاط کو لکھا کہ ذمیوں کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا برتاؤ کرو۔ ان میں جو بوڑھا یا نادار ہو جائے اس کی کفالت عامہ کے تحت اس کی گزران دو اور اگر اس کا کوئی رشتہ دار ہو تو اسے اس کی کفالت کا حکم دو جس طرح تمھارا کوئی غلام بوڑھا ہو جائے یا بڑھاپے نے اسے معذور کر دیا ہو تو اسے آزاد کرنا پڑے گا یا مرتے دم تک اس کی کفالت کرنی پڑے گی۔ (طبقات ابن سعد:۵/۲۸۰)

Marfat.com

شاہی خاندان سے جب آپ نے مسلمانوں کی غصب شدہ املاک چھین کر انھیں اصل مالکوں کو واپس کیں تو اس وقت ذمیوں کی مغصوبہ زمینیں بھی واپس دلائیں۔ اس سلسلہ میں ایک ذمی نے دعویٰ دائر کیا کہ عباس بن ولید نے جو شاہی خاندان کا چشم و چراغ تھا، میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے عباس سے جواب دعویٰ کے لیے کہا۔ اس نے کہا: یہ زمین ولید نے مجھے جاگیر میں دی ہے اور میرے پاس اس کی دستاویز موجود ہے۔ ذمی نے اپنے دعویٰ کا یہ جواب سن کر کہا: ''امیر المومنین! میں آپ سے کتاب اللہ کے مطابق اس کا فیصلہ چاہتا ہوں۔'' آپ نے فرمایا: ''کتاب اللہ ولید کی سند پر مقدم ہے''۔ چنانچہ آپ نے عباس بن ولید سے زمین چھین کر ذمی کو واپس لوٹا دی۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ: ۱۰۴، البدایہ والنہایہ: ۲۱۳/۹)

آپ کا حکم تھا کہ کوئی مسلمان کسی ذمی کے مال پر دست درازی نہ کرے۔ چنانچہ اس ہدایت کے اثرات تھے کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے مال اور زمین پر دست درازی نہیں کر سکتا تھا۔ جو ایسا کرتا اسے قرار واقعی سزا ملتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مسلمان ربیعہ شودی نے ایک سرکاری ضرورت کے تحت ایک نبطی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری کی۔ یہ ایک معمولی بات تھی۔ آپ سے پہلے بھی ایسا ہوتا تھا۔ آج بھی گھوڑے کیا عوام کی بسیں اور گاڑیاں بیگار میں پکڑ لی جاتی ہیں اور ان کو کئی کئی روز تک استعمال میں لایا جاتا ہے۔ عوام روتے ہیں اور حکومت کے کارندوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی کیونکہ عہدیداروں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے۔ کہ وہ بہرے ہوتے ہیں عوام کے رونے اور چلانے کی آواز انھیں سنائی نہیں دیتی۔ وہ ''یک چشم'' بھی ہوتے ہیں۔ کہ انھیں صرف اپنا آپ دکھائی دیتا ہے۔ عوام دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس عہدے دار کو چالیس کوڑے لگوائے تاکہ دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔ (طبقات ابن سعد: ۲۷۶/۵)

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے جزیہ، خراج اور مال گزاری کی وصولی میں ذمیوں کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دیں اور اس سلسلہ میں جتنی بدعنوانیاں گذشتہ حکمرانوں نے پیدا کر دی تھیں ان سب کا تدارک کر دیا۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے ابن اشعث کی حمایت کے الزام میں عراق کے ذمیوں کے جزیہ کی مقدار بڑھا دی تھی۔ آپ کو پتہ چلا تو آپ نے فوری طور پر اسے کم کر دیا۔ (فتوح البلدان بلاذری: ۲۷۴)

تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے عہد خلافت میں ذمیوں کے ساتھ اتنی نرمی برتی گئی کہ اس سے عام لوگوں کو کئی نقصانات اٹھانے پڑے۔ آپ کے زمانہ میں غلہ کا نرخ گراں ہو گیا۔ (ایک شخص نے آپ سے اس گرانی کا سبب پوچھا۔ فرمایا: ''پہلے خلفاء ذمیوں کو جزیہ کی وصولی میں ناقابل برداشت تکالیف دیتے تھے، اس لیے وہ جس نرخ پر بھی ہو سکتا تھا غلہ فروخت کر دیتے تھے اور میں ہر شخص کو صرف اتنی تکلیف دیتا ہوں جس کو وہ برداشت کر سکے اس لیے اب ہر ذمی جس طرح چاہتا ہے فروخت کرتا ہے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ۷۶)

عمر رحمہ اللہ کا محبت و احترام کی بنیاد پر ذمیوں پر سے سلوک کرنا اسلام کے اصولوں کے عین مطابق تھا اور آپ سے ان کے حسن سلوک کی بنیادیں محبت و احترام پر اٹھائی گئی تھیں۔ (تاریخ الشعوب الاسلامیہ: ۱۸۴/۱) آپ

Marfat.com

کو یہ بات پسند تھی کہ غیر مسلم اور ذمی ایک اسلامی حکومت میں رہ کر اپنے آپ کو بالکل محفوظ و مصئون سمجھیں۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے اہل ذمہ پر بڑی سختی کی ہوئی تھی۔ وہ ذمیوں کے غلہ کے گوداموں کو سر بمہر کروا دیتا تھا اور اس وقت تک مہر نہ کھولتا تھا جب تک وہ جزیہ ادا نہ کرتے۔ لیکن عمر رحمہ اللہ کو یہ بات ناپسند تھی۔ وہ کسی صورت نہیں چاہتے تھے کہ ذمیوں کے وقار و احترام کو ٹھیس لگے۔ (سیرۃ ابن جوزی:۸۸)

اہل ذمہ کے ساتھ اس سلوک کو دیکھ کر کئی شہروں کے کوتوال آپ کی اجازت کے بغیر ہی اہل ذمہ کے مظالم کو رفع کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز آپ نے کوتوال شہر عمرو بن مہاجر کو بلوایا لیکن وہ موجود نہ تھا۔ پھر جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس سے پوچھا: کہاں تھے؟ اس نے جواب دیا میں اہل کتاب کے مظالم رفع کرنے کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ عمر رحمہ اللہ نے اس کا یہ عذر سن کر اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم:۱۶۴)

عمر رحمہ اللہ نے اہل ذمہ کی دل جوئی کے لیے مختلف علاقوں میں عیسائیوں پر جزیہ میں تخفیف کر دی حتیٰ کہ قبرص، ایلہ اور نجران کے عیسائیوں پر بھی تخفیف جزیہ کے قانون کو نافذ کیا۔ (تاریخ الشعوب الاسلامیہ:۱/۱۸۱) عمر رحمہ اللہ نے خراج مصر کے رئیس اسامہ بن زید کو قبطیوں کی حمایت کرتے ہوئے معزول کیا تھا۔ جب زریق بن حیان مصر کی چنگی پر مقرر تھے تو عمر رحمہ اللہ نے ایک خط کے ذریعہ انھیں حکم دیا کہ نقدی اور تجارتی اموال میں چالیسواں حصہ چنگی وصول کی جائے اور اگر چالیس دینار سے کم نقدی یا مال ہو تو بیس دینار پر اسی حساب سے وصول کیا جائے اور بیس سے کم دینار پر ایک دینار اور دس دینار سے کم پر کچھ نہ لیا جائے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف:۱۳۷)

جب تک اہل ذمہ جزیہ ادا کرتے رہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے انھیں کسی قسم کی کوئی تکلیف اور تنگی نہیں دی۔ انھیں ہر قسم کی پوری پوری آزادی تھی۔ بلکہ بعض لحاظ سے ان کے حقوق مسلمانوں سے بھی زیادہ تھے۔ عمر رحمہ اللہ اپنے گورنروں کو ہر وقت یہی تلقین کرتے رہتے تھے۔ کہ ذمیوں کو تمھارے ہاتھوں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ آپ نے گورنر کوفہ زید بن عبدالرحمٰن کو حکم دیا کہ ذمیوں کو تنگ کرنے سے باز رہیں۔ آخر کار وہ رک گئے اور آپ نے عبدالرحمٰن بن نعیم کو لکھا کہ جس گرجا گھر، آتش کدہ یا عبادت خانہ پر تم سے صلح کر لی گئی ہے اس کو ہرگز منہدم نہ کرو۔ (طبری:۵/۳۶۴) اور ابن جوزی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب بنوامیہ کے امراء نے سیاحت کا ارادہ کیا تو آپ نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ ذمیوں کو نہیں ستائیں گے اور نہ قوم کے کسی شخص کو تنگ کریں گے۔ (ابن جوزی:۷۷)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ایک نہایت دین دار شخص تھے اس وجہ سے ان کی نگاہ سے یہ بات اوجھل نہ تھی کہ دنیا میں عبادت خانوں کا باقی رہنا لوگوں کے لیے باعث صلاح و فلاح ہے۔ وہ عبادت خانے خواہ کسی دین و ملت کے ہوں۔ کیونکہ کوئی مذہب بھی لوگوں کو بداخلاقی اور بدتہذیبی نہیں سکھاتا بلکہ عبادت خانوں ہی میں جا کر لوگوں کو اخلاق اور ان کی تہذیب میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا ہے اور ان کی معاشرت درست ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ دو خارجیوں نے آ کر آپ سے ذمیوں کے بارہ میں استفسار کیا کہ کیا انھیں طاقت سے زیادہ تکلیف دی

Marfat.com

جا سکتی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت کے اندر تکلیف دیتا ہے۔ تو ہم کون ہیں جو ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف دیں؟

اس نے پھر پوچھا کہ اگر اہل ذمہ کے عبادت خانے یعنی گرجے وغیرہ ڈھا دیے جائیں تو کیا حرج ہے؟ عمر رحمہ اللہ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس نے بہت اصرار کیا لیکن آپ نے اس کی یہ بات ہرگز نہیں مانی اور فرمایا یہ عبادت خانے اور گرجے میری رعایا کی صلاح اور اصلاح میں شامل ہیں۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم: ۱۷۴)

ذمی تو پھر بھی انسان اور اللہ کی مخلوق ہیں۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ تو جانوروں پر بھی شفقت اور نرمی برتتے تھے اور ان کو کسی قسم کی تکلیف سے گریز فرماتے۔ اس زمانے میں جانوروں پر بڑا ظلم وتشدد ہوتا تھا۔ گھوڑوں کو بڑی بھاری بھاری لگامیں ڈالی جاتی تھیں۔ ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا جاتا تھا۔ ان کے جسموں میں لوہے کے سوئے گھونپے جاتے تھے۔ تاکہ وہ تیز چلیں اور ریس میں اور لہو ولعب کے طور پر گھوڑوں کو دوڑایا جاتا تھا۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ نے ان تمام چیزوں کو اپنے ایک حکم کے ذریعہ ممنوع اور قابل تعزیر قرار دے دیا اور ناحق گھوڑوں کے دوڑانے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ عبدالرحمٰن بن نعیم کو ایک مرتبہ ایک خط میں کچھ ہدایات دی۔ ان میں یہ ہدایات بھی تھی کہ بکری کو ذبح خانے تک گھسیٹ کر نہ لایا جائے اور اسے تیز چھری سے ذبح کیا جائے۔ (طبری: ۳۲۴/۵) اور گورنر مصر کو لکھا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ تمھارے ہاں لوگ اونٹ پر ایک ایک ہزار رطل (ساڑھے بارہ من) بوجھ لادتے ہیں، میں حکم دیتا ہوں کہ کوئی شخص چھ سو رطل سے زیادہ اونٹ پر بوجھ نہ لادے۔ (ابن عبدالحکم: ۱۶۶)

گزشتہ خلفاء نے ذمیوں کے مذہبی حقوق بھی پامال کیے ہوئے تھے۔ آپ نے ان حقوق کو از سر نو قائم کیا۔ چنانچہ دمشق میں ایک گرجا عرصہ سے مسلمان خاندان کی جاگیر میں چلا آرہا تھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جب مسند نشین خلافت ہوئے تو عیسائیوں نے ان کے پاس اس کا دعویٰ کیا۔ آپ نے فوری طور پر اس کو واپس دلا دیا۔ ایک مسلمان نے ایک گرجے کی بابت یہ دعویٰ کیا کہ وہ اس کی ملکیت ہے۔ سیدنا عمر ثانی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اگر یہ عیسائیوں کے معاہدہ میں ہے تو تم اس کو نہیں لے سکتے، یہ ان کا رہے گا۔'' (فتوح البلدان: ۱۳۰)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ذمیوں کو نہ صرف عام مسلمانوں کے برابر سمجھتے تھے بلکہ شاہی خاندان جو اپنے کو دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں اعلیٰ وارفع تصور کرنے لگے تھے، ان کے برابر سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہشام نے غرور وتمکنت میں جو شاہی خاندان میں پیدا ہوگیا تھا، ایک عیسائی سے سخت کلامی کی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس کو ڈانٹا اور سزا دینے کی دھمکی دی یہاں تک کہ ہشام کا دماغ ٹھکانے آگیا۔

بیت المال کے محاصل میں اضافہ:

اسلام نے صرف نظام حکومت کے اچھا ہونے پر زور نہیں دیا بلکہ اسلام نے حاکم حکومت کے اچھا ہونے پر بھی بڑا زور دیا ہے۔ اگر حاکم اچھا ہے تو نہ صرف رعایا خوش حال ہوگی بلکہ حکومت کے محاصل میں بھی

Marfat.com

اضافہ ہوگا۔ لوگوں میں دیانت وامانت، صدق وراست بازی اور فرائض وحقوق کی ادائیگی کا جذبہ ابھرے گا۔
سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب انھوں نے عراق کی زمینوں کا بندوبست کیا تو دوسرے سال خراج کی مقدار آٹھ کروڑ سے دس کروڑ بیس لاکھ درہم تک پہنچ گئی اور پھر ہر سال اس میں معتدبہ اضافہ ہوتا رہا۔ مصر سے جو خراج آپ کو وصول ہوتا تھا اس کی مقدار ایک کروڑ بیس لاکھ دینار تھی اور مورخین نے لکھا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مصر سے جس قدر خراج وصول ہوا اس کے بعد والے زمانوں میں اتنا خراج کبھی وصول نہیں ہوا۔ یہ ان کی رعایا پروری اور عدل گستری کی برکت تھی۔ علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ یہ ایک کروڑ بیس لاکھ دینار کی رقم خراج کی نہیں بلکہ جزیہ کی رقم تھی۔ خراج کی رقم اس کے علاوہ تھی۔ شام سے جو خراج وصول ہوتا تھا اس کی مقدار ایک کروڑ چالیس لاکھ دینار تھی۔ اسی طرح ملک میں خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ ہر طرف برکات خداوندی کا نزول تھا۔ کھیتی باڑی اور زراعت نے بڑی ترقی کی اور رعایا خوش وخرم تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ کے گورنر محاصل کی وصولی میں نرمی برتتے۔ کسی پر سختی نہ کرتے اور لوگوں کو ادائیگی میں مہلت دیتے اور ناجائز طریقے سے اور ناجائز اشیاء کے محاصل وصول نہ کرتے۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے پہلے کے خلفاء لوگوں سے ناجائز محاصل وصول کرتے۔ وصولی میں ظلم وتعدی سے کام لیتے۔ وصول کرتے وقت سختی اور تشدد کرتے۔ آپ نے ان سب چیزوں کا سدباب کر دیا۔ اب بغیر کسی سختی اور تعدی کے ٹیکس اور خراج وجزیہ وصول ہوتا اور پھر اس کے مصارف بھی کثیر تھے۔ لیکن ان کثیر مصارف کے باوجود بیت المال کی آمدنی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ عراق کی آمدنی حجاج بن یوسف کے دور سے کہیں زیادہ تھی۔ آمدنی کے اس اضافہ کو دیکھ کر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ حجاج پر لعنت کرے، اس کو نہ دین کا سلیقہ تھا اور نہ دنیا کا۔ وہ لوگوں پر سختی کرنے اور ناجائز طریقے اختیار کرنے کے باوجود بھی قومی خزانے کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ اس کے دور میں عراق سے صرف دو کروڑ اسی لاکھ درہم وصول ہوتے تھے۔ اس نے کاشت کاروں کو بیس (۲۰) لاکھ درہم آبادکاری کے لیے قرض کے طور پر دیے تو ایک کروڑ سات لاکھ درہم کا اضافہ ہوا۔ باوجود اس ویرانی کے جب عراق میرے قبضہ میں آیا تو میں نے بارہ کروڑ چالیس لاکھ درہم وصول کیے اور اگر زندہ رہا تو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے بھی زیادہ رقم وصول کروں گا۔ حالانکہ دور فاروقی ایک سنہری دور تھا۔ (فتوح البلدان)

یہ سب کچھ ان کی نیکی کی برکات تھی۔

Marfat.com

عوامی خدمات

ایک اسلامی فلاحی مملکت کا کام لوگوں کو خوشحال بنانا اور ان کی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنا ہے، لیکن اس کے ساتھ لوگوں کو اسراف سے روکنا ہے۔ اسراف کو ایک حدیث میں ''اضاعت مال'' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

''قیل و قال کرنے، بہت زیادہ سوالات دریافت کرنے، مال کو ضائع کرنے، خود نہ دینے اور دوسروں سے مانگنے، ماں کی نافرمانی کرنے اور بچیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع فرمایا ہے۔''

(بخاری، کتاب الرقاق، الادب المفرد: ۴۵)

''کثرۃ سوال کا ایک معنی یہ بھی ہے ''زیادہ مال مانگنا''۔ (فتح الباری: ۱۱/۲۶۲)

بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ یہ روایت موطا امام مالک اور مسند دارمی میں بھی آئی ہے۔ مسلم میں یہی مضمون ایک مفصل روایت میں بھی آگیا ہے۔ اس کی شرح فرماتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اضاعت مال سے مراد غیر شرعی طور پر مال کو صرف کرنا اور بے جا تکلف کرنا ہے۔ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے کے ہم معنی ہے اور اللہ تعالیٰ فساد پیدا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ مزید براں یہ کہ جب کوئی شخص اپنا مال ضائع کر دے گا تو کسی دوسرے کے مال پر قبضہ کرنے کی فکر میں رہے گا۔'' (نووی شرح مسلم، کتاب الاقضیہ)

اضاعت مال کی بعض شکلیں غیر کاروباری اور انفرادی بھی ہیں۔ ان میں سے بعض اسراف کے تحت آتی ہیں اور بعض غیر شرعی مصارف کے تحت آتی ہیں۔ ان میں سے ایک ''تبذیر'' ہے اور دوسری ''اسراف''۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ ''اسراف'' کا اطلاق عموماً ایسے مال پر ہوتا ہے جو جائز مقصد کے لیے ہو لیکن حد اعتدال سے متجاوز ہو اور ''تبذیر'' غیر شرعی اغراض سے متعلق صرف مال اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ہم معنی ہے۔ ''تبذیر'' کرنے والے کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔ (الاسراء: ۲۵، ۲۶) اور امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ ''مبذرین'' کون ہیں۔ فرمایا:

''الذین ینفقون فی غیر حق'' (الادب المفرد: ص ۶۵)

Marfat.com

جو ناحق مصارف میں مال خرچ کریں۔

باطل نظریات و خیالات کی اشاعت یا فحش باتوں کی اشاعت حرام ہے۔ایسے کاموں کے لیے مال خرچ کرنا ''تبذیر'' کہلاتا ہے۔یہی حال دوسرے حرام کاموں کا ہے۔

جو بات مال کے سلسلہ میں کہی گئی ہے وہی اگر اشیاء استعمال کے وصفی معیار کے بارہ میں بھی سامنے رکھی جائے تو اسراف کا ایک دوسرا پہلو واضح ہوتا ہے۔ایک حاجت کی تشفی اگر ایک مخصوص معیار کے سامان سے اتنی ہی ہو سکتی ہے جتنی کہ اس سے برتر معیار سے تو اس حاجت کی تشفی کے لیے برتری معیار کے سامان کا طلب کرنا ایک مسرفانہ طلب قرار دی جا سکتی ہے۔لہٰذا اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''اسراف'' نام سے ضروریات کی تکمیل کے لیے مقدار یا معیار کے اعتبار سے زائد از ضرورت مال صرف کرنے کا۔حدیث میں اس اسراف سے بھی امت کو روکا ہوگا۔اسراف سے امت کو بچانے کے لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام گورنروں کو لکھا:

''بلند و بالا عمارتیں نہ تعمیر کرو کیونکہ یہ طرز عمل بدترین زمانے کی علامت ہے۔'' (الادب المفرد ص:۶۷)

ظاہری نگاہ میں اگرچہ ایک فرد آزاد ہے۔کہ وہ اپنے وسائل و ذرائع کو مباح اور جائز ضرورتوں اور کاموں پر جس طرح چاہے صرف کرے، مثال کے طور پر اگرچہ علاج اور علم بنیادی ضرورتیں ہیں، لیکن ایک شخص انھیں نظر انداز کر کے اپنا مال اپنے گھر کی زینت اور آرائش پر صرف کرنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔لیکن یہ طرز عمل اسلامی طریقہ زندگی سے مناسبت نہیں رکھتا۔اسلام انسانی زندگی کو ایک بامقصد کام سمجھتا ہے اور مقصدی زندگی کا خاصہ ہے کہ ضرورتوں کو زیب و زینت پر ترجیح دی جائے۔اسلامی فقہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ بنیادی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے زینت و آرائش کے امور پر مال صرف کرنا اسراف میں داخل ہے۔اسلام نے بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کو ضروری قرار دیا ہے۔(الموافقات:۲/۶،۱۷۶،۱۷۷،ص۱۸۱)

اس کے علاوہ اسلام نے لذت دنیا میں انہماک، مبالغہ کی حد تک آرام و سہولت کی طلب اور عیش و عشرت میں غرق ہو جانے والی زندگی کو از حد ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور حضور علیہ السلام نے فرمایا: ''خبردار! عیش کوشی سے اجتناب کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اچھے بندے عیش کوشی نہیں کرتے۔'' (مشکوٰۃ باب فضل الفقراء)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کفالت عامہ کے فریضہ کی انجام دہی کچھ اس طرح سے کی کہ آج عقل حیران رہ جاتی ہے۔۱۸ھ میں عام الرمادہ کے سال میں لوگوں نے دیکھا کہ صدر ریاست سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جس احساس ذمہ داری اور چستی، تن دہی اور حسن انتظام کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کیں وہ آنے والے حکمرانوں کے لیے ہمیشہ ایک نمونہ رہیں گی۔کفالت عامہ کی ذمہ داری کے بارہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا تصور اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ آپ فرماتے تھے: ''اگر دارالسلام کی حدود کے اندر کوئی جانور بھی بھوک سے مر جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور مجھے اس کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ (طبقات ابن سعد:۳/۳۰۵)

آپ کفالت عامہ کی ذمہ داری میں دوا اور علاج کو بھی داخل سمجھتے تھے۔جو حکمران جانوروں کے

Marfat.com

علاج کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہو وہ انسانوں کے علاج کو بدرجہ اولیٰ اپنی ذمہ داری میں داخل سمجھے گا۔

آپ اپنے ماتحت حکام کو بھی اس ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمائی:

''لوگوں کے گھروں میں ان کے لیے فراخی کا سامان فراہم کرو اور ان کے متعلقین کو کھلانے کا سامان کرو۔'' (سراج الملوک، طرطوشی: ۱۰۹)

عمر ثانی رحمہ اللہ نے بھی اسلام کی انہی تعلیمات کے تحت کفالت عامہ کے اس نظام کو پھر سے بحال کیا اور اپنے مختصر دور خلافت میں اس کی پوری پوری کوشش کی کہ رعایا خوش حال اور آسودہ ہو جائے۔ ان کے آنگن میں فراخی ہو اور وہ اپنی بنیادی ضروریات سے فارغ ہو کر توجہ الی اللہ کی طرف مصروف ہوں۔ چنانچہ آپ نے مظالم کے انسداد، ناجائز ٹیکسوں کی منسوخی اور عام داد دہش سے رعایا کو آسودہ حال بنا دیا اور لوگوں نے دیکھا کہ ملک کے طول وعرض میں غریبی اور افلاس کا نام ونشان باقی نہ رہا اور حالت یہ ہوگئی کہ لوگ صدقہ وخیرات تقسیم کرنے کے لیے لے جاتے تو کوئی انھیں قبول کرنے والا نہ ہوتا اور بعض روایات میں ہے کہ لوگ صدقہ و خیرات تقسیم کرتے تھے اور ایک سال کے بعد وہ لوگ جو پہلے صدقہ لیتے تھے خود دوسروں کو صدقہ دینے لگتے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۲۵۶/۵) اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے لوگوں کو اس قدر مالا مال کر دیا تھا کہ پورے ملک میں کوئی صدقہ لینے والا اور حاجت مند باقی نہ رہ گیا تھا۔

(فتح الباری: ۴۵۱/۶)

آپ کے زمانہ میں خوش حالی اور آسودگی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ لوگوں کا دولت کے نشہ میں کبر ونخوت میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ عدی بن ارطاط نے آپ کو لکھا کہ اہل بصرہ اس قدر دولت مند اور خوش حال ہو گئے ہیں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ دولت میں منہمک ہو کر فخر وغرور نہ کرنے لگیں۔ آپ نے اسے جواب میں لکھا کہ اللہ تعالیٰ جب اہل جنت کو جنت میں داخل کریں گے تو ان کے لیے الحمد للہ کہنا پسند کیا اس لیے تم بھی لوگوں کو حکم دو کہ وہ اس نعمت پر خدا کا شکر بجالائیں۔ یہی ان کے لیے بہتر ہے۔

(طبقات ابن سعد: ۲۸۲/۵)

رفاہ عام کے کام:

اسلام صرف نماز روزہ کا مذہب نہیں ہے بلکہ اس نے رفاہ عام کے کاموں کی بھی ترغیب دی ہے اور ان کاموں کے کرنے کو بھی اسی طرح باعث اجر وثواب قرار دیا ہے۔ جس طرح نماز روزہ باعث اجر وثواب ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں رفاہ عامہ کے اتنے کام کیے کہ تاریخ انگشت بدنداں ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہر حکومت میں یہ محکمہ موجود ہے جس کو پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ (P.W.D) کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن

Marfat.com

یہ محکمہ اسلام میں سب سے پہلے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قائم کیا۔ اس محکمہ کے ذمہ سرکاری عمارات کی تعمیر و مرمت، سڑکیں بنانا، ہسپتال بنانا اور نہریں کھودنا تھا۔ آج کل عرب دنیا میں اس کو "نظارت عامہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ہسپتال قائم نہیں ہوئے تھے، لیکن اور سب چیزیں اس محکمہ میں موجود تھیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف سرکاری عمارتیں بھی بنوائیں، سڑکیں بھی تعمیر کرائیں اور نہریں بھی کھدوائیں۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بھی رفاہ عامہ کے کاموں کی طرف پوری پوری توجہ دی۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جس قدر اصلاحات کیں وہ بھی دراصل رفاہ عامہ ہی کے کام تھے۔ آپ نے تمام ملک میں کثرت کے ساتھ سرائیں بنوائیں۔ چنانچہ آپ نے سلیمان بن ابی السری گورنر سمرقند کو لکھا کہ وہاں کے تمام راستوں میں کثرت سے سرائیں بنوائی جائیں تاکہ اندرون ملک سفر کرنے والے لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اور نہ صرف سمرقند میں بلکہ اپنے علاقہ کے تمام شہروں میں سرائیں تعمیر کرائیں اور جو مسلمان ادھر سے گزریں ان کی ایک دن رات کی مہمان نوازی اور کھانا پینا مفت مہیا کیا جائے۔ ان کی سواریوں کی حفاظت کی جائے اور جو مسافر سفر کے دوران مریض ہو جائیں ان کو دو دن اور دو رات اپنے ہاں ٹھہراؤ اور ان کا علاج معالجہ بھی کیا جائے۔ اگر کسی مسافر کے پاس گھر تک پہنچنے کا سامان نہ ہو تو اسے گھر تک پہنچنے کا سامان بھی مہیا کیا جائے۔ خراسان کے گورنر کو لکھا کہ وہاں بھی مسافروں کے قیام کے لیے سرائیں بنوائی جائیں۔ (طبقات ابن سعد: ۲۵۴/۵) علاوہ ازیں ایک عام لنگر خانہ قائم کیا جس میں فقراء اور مساکین کو دونوں وقت کا کھانا ملتا تھا۔ دنیا آج اتنی ترقی کرنے کے باوجود ابھی تک وہ رفاہ عامہ کے کام نہیں کر سکی جو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے اپنے زمانوں میں کیے۔

جن چیزوں کے بارہ میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو یقین ہو جاتا کہ وہ لوگوں کے لیے مفید ہیں آپ ان کے کرنے کا فوری حکم صادر فرما دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عدی بن فضیل نے آکر آپ سے عذبہ میں کنواں کھودنے کی اجازت مانگی۔ آپ نے عدی سے پوچھا کہ عذبہ کہاں ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ بصرہ سے دو روز کی مسافت پر۔ عمر رحمہ اللہ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ایسی جگہ پر پانی نہیں ہے۔ پھر آپ نے انھیں کنواں کھودنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ کہ سب مسافر اس پانی کے حق دار ہیں۔ (الکامل للمبرد: ۹۱/۱) چنانچہ وہاں کنواں کھودا گیا اور تمام لوگ اس کے پانی سے مستفید ہوئے۔

زمین کی کاشت بھی لوگوں کے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ لوگ اس کی پیداوار سے نفع حاصل کر سکیں۔ چنانچہ آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو خراج کے بارہ میں جو کچھ لکھا اس میں ایک بات یہ بھی تحریر فرمائی: "غیر آباد زمینوں پر پوری پوری توجہ دو۔ اگر اس میں اصلاح کی معمولی سی بھی گنجائش ہو تو اس کو درست کرا دو تاکہ لوگ اس میں کاشت کر سکیں اور ان کو فائدہ ہو۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ۸۶)

Marfat.com

دینی خدمات

ویسے تو سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نظام حکومت میں ہر اصلاح دراصل دینی خدمت کی روح اپنے اندر سموئے ہوئے تھی، کیونکہ یہ ایک دینی جذبہ ہی تھا جو اموی خاندان کی مخالفت کے باوجود ان سے یہ ساری اصلاحات کروار ہا تھا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلامی حکومت کی مردہ رگوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی کیونکہ ایک اسلامی حکومت کا مقصد وحید ہی دنیا میں اسلام اور اس کی اقدار کی نشر واشاعت ہے۔ اس کام کا بیڑا سب سے پہلے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اٹھایا اور یہ ان کی حکومت کی خصوصیات میں سے ہے کہ انھوں نے دور دور تک لوگوں کے دلوں میں اسلام کو اتار دیا۔ آپ کا مقصد اسلام کو تلوار کے زور پر پھیلانا نہیں تھا جیسا کہ بعض مستشرقین یہ الزام لگاتے ہیں۔ اسلام اپنے ذاتی محاسن کی وجہ سے پھیلا اور اس نے جس سرعت کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا اس کی نظیر کسی مذہب میں نہیں ملتی۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اموی خلفاء کے زمانہ میں جو جو کچھ جادۂ شریعت سے ہٹ گیا تھا آپ نے اس کو شریعت اسلامیہ کے مطابق کر دیا۔ گورنروں کے نام آپ کے جو فرامین جاتے تھے ان سب میں اسلام اور اس کی اقدار کی نشر واشاعت، شریعت کا احیاء اور بدعت کے استیصال کی تاکید ہوتی تھی۔ (طبقات ابن سعد: ۲۵۲/۵) عدی بن عدی کو ایک فرمان لکھا کہ ''ایمان چند فرائض، چند احکام اور چند سنن کا نام ہے۔ جس نے ان اجزاء کی تکمیل کر لی اس نے ایمان کو مکمل کر لیا اور جس نے اس کی تکمیل نہیں کی اس نے ایمان کو مکمل نہیں کیا۔ اگر میں زندہ رہا تو ان تمام اجزاء کو تمھارے سامنے واضح کر دوں گا تا کہ تم لوگ اس پر عمل کرو اور اگر مر گیا تو مجھے تمھارے ساتھ رہنے کی کوئی تمنا بھی نہیں ہے۔'' (بخاری: ا رباب بنی الاسلام علیٰ خمس)

انہی دینی اصلاحات کے باعث آپ کے عہد خلافت میں ہر کام میں دینی روح آپ کی ایک امتیازی خصوصیت بن گئی تھی۔ چنانچہ طبری وغیرہ مورخین نے لکھا ہے کہ ''ولید بن عبدالملک عمارتوں کا دلدادہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے زمانہ میں لوگوں کو عمارتیں بنانے کا شوق پیدا ہو گیا۔ سلیمان بن عبدالملک کو عورتوں اور نکاح کا شوق تھا لہٰذا اس کے زمانہ میں لوگ لونڈیوں اور شادیوں کے شوقین ہو گئے تھے۔ اب جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مسند خلافت پر قدم رکھا تو لوگوں کا مذاق بدل گیا۔ اب نہ تو عمارتوں کا شوق تھا اور نہ زیادہ

Marfat.com

شادیوں کا رواج بلکہ اب لوگوں میں دین اور اس کی اشاعت اور عبادت کا شوق پیدا ہو گیا۔

ہر قوم کی ترقی کا پہلا زینہ علم ہے۔ اس وجہ سے آپ نے شریعت کے احیاء کے لیے دینی تعلیم کی اشاعت کا خاص اہتمام فرمایا۔ آپ نے قاضی ابوبکر بن حزم رحمۃ اللہ کو لکھا کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ علم کی بکثرت اشاعت کریں۔ تعلیم کے لیے حلقہ درس میں بیٹھیں تاکہ نہ جاننے والے جان لیں اور جاہل علم سے آشنا ہوں۔ ایک اور گورنر کو لکھا کہ لوگوں کو حکم دو کہ وہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں کیونکہ سنت رسول ﷺ مردہ ہو چکی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ زندہ ہو۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز:۴)

جب تک علماء فکر معاش سے فارغ البال نہ ہوں وہ توجہ سے علم کی اشاعت نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے آپ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ جو علماء علم کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں انھیں فکر معاش سے مطمئن کر دیا جائے تاکہ وہ پوری توجہ سے یہ فریضہ انجام دے سکیں۔ حمص کے گورنر کو لکھا کہ ''جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر اپنے آپ کو فقہ کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا ہے، بیت المال سے ان کا سو سو دینار وظیفہ مقرر کر دیا جائے تاکہ وہ فقہ کی تعلیم و تدریس احسن طریقہ سے انجام دے سکیں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز:۹۵) علماء کے علاوہ طلباء کے وظائف بھی مقرر فرمائے تاکہ وہ دل جمعی سے علم حاصل کر سکیں۔ (جامع بیان العلم لابن عبدالبر ص:۸۸)

دور افتادہ شہروں میں دینی تعلیم کی اشاعت کے لیے مختلف علماء کو سرکاری طور پر بھیجا۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام سیدنا نافع رحمۃ اللہ کو جن کو علم حدیث میں ایک نہایت بلند مقام حاصل تھا اور جن کا نام آج بھی سند میں سلسلۃ الذہب کی حیثیت رکھتا ہے، تعلیم حدیث کے لیے مصر بھیجا۔ (حسن المحاضرۃ للسیوطی:۱/۱۹۹) قاری جعثل بن عاہان کو قرأت کی تعلیم کے لیے مصر و مغرب بھیجا۔ (حسن المحاضرۃ:۱/۱۱۹) یزید بن ابی مالک دمشقی کو اور حارث یحمد الاشعری کو بدوؤں کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا۔ ان کے علاوہ جہاں جہاں بھی علم کی نشر و اشاعت کے لیے اساتذہ اور علماء کی ضرورت تھی وہاں موزوں آدمیوں کو بھیجا تاکہ وہ احسن طریق سے تعلیم دے سکیں۔

مسجد دمشق، الجامع الاموی:

جس جگہ آج دمشق میں الجامع الاموی بنی ہوئی ہے، قدیم زمانے میں اس جگہ کلدانیوں کے مشہور دیوتا مشتری کا صنم کدہ بنا ہوا تھا۔ کلدانیوں کے عقیدہ کے مطابق دیوتا مشتری دیانتوں اور عبادتوں کا دیوتا تھا۔ جب وہاں عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو انھوں نے کلدانیوں کے اس صنم کدہ کو گرجا میں تبدیل کر دیا۔ پھر جب مسلمانوں نے دمشق کو فتح کیا تو یہ شہر آدھا جنگ سے فتح ہوا تھا اور آدھا صلح سے۔ شہر میں مغربی سمت سے سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ داخل ہوئے اور مشرقی جانب سے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ لڑتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ پھر یہ دونوں اسلامی لشکر گرجا کے پاس آ کر مل گئے۔ (مسالک الابصار ۱/۱۸۳) اب اسلامی قوانین کی رو سے آدھے شہر کے احکام الگ تھے اور دوسرے آدھے شہر کے احکام جو صلح سے فتح ہوا تھا الگ تھے، لیکن فصیل

Marfat.com

کے باہر کا حصہ چونکہ جنگ سے فتح ہوا تھا اس لیے اس پر جنگ سے فتح ہونے کا حکم جاری کیا گیا۔ دمشق کے مفتوحہ علاقوں میں مسلمانوں نے تمام پرانے گرجے خواہ وہ جنگ سے فتح کیے تھے یا صلح سے فتح ہوئے تھے، ان کے حال پر چھوڑ دیئے اور سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اہل دمشق کو یہ تحریر لکھ دی ''میں نے تمھاری جانوں، اولاد، اموال اور گرجوں کے بارہ میں امن دے دیا ہے۔'' اس امن نامہ پر سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ، یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور سیدنا شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے گواہیاں ثبت کیں۔ (تاریخ مدینہ دمشق: ۵۶۹) لیکن بڑے گرجے کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ صلح و جنگ کی یادگار رہے۔ اس وجہ سے آدھا گرجا عیسائیوں کے پاس رہا اور آدھا مسلمانوں کے پاس۔ مسلمانوں نے اپنے آدھے حصہ کو مسجد میں منتقل کر دیا اور دونوں فریق ساتھ ساتھ عبادت کرتے رہے۔ پھر مسلمانوں کو عیسائیوں کی عبادت سے اپنی عبادت میں خلل اندازی محسوس ہوتی تھی، اس وجہ سے ولید بن عبدالملک نے اپنے عہد خلافت میں حسن تدبیر کے ساتھ عیسائیوں کی رضامندی سے عیسائیوں کا حصہ بھی مسلمانوں کو دلوا دیا۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کے آدھے حصہ کو جو انھوں نے اپنی رضامندی سے مسلمانوں کو دے دیا تھا، گرا کر مسجد میں شامل کر لیا اور اس کے عوض میں انھیں کنیسہ مریم دے دیا گیا۔ (مسالک الابصار: ۱/۱۷۹) ولید نے یہاں ایک خوبصورت مسجد بنوائی جس کو ''الجامع الاموی'' کہا جاتا ہے۔

روایات میں ہے کہ ولید بن عبدالملک نے اس مسجد کی تعمیر کی ابتداء اس سن میں کی جس سن میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مدینہ منورہ کے گورنر مقرر کیے گئے تھے۔ اس مسجد کی تعمیر بیس سال تک جاری رہی اور اس کی تعمیر میں ۱۲ ہزار معماروں اور کاریگروں نے حصہ لیا یہ اس وقت عجائبات عالم میں شمار ہونے لگی۔ (شذرات الذہب: ۱/۹۷)

اس کی تعمیر میں دمشق اور اس کے نواح کے لوگوں نے حصہ لیا اور مصری اور عراقی فوج بھی اس کی تعمیر میں شریک رہی۔ پھر اگر کسی شامی کے پاس ایک پیسہ بھی بچتا تو وہ اسے مسجد کی تعمیر میں بطور چندہ دے دیتا۔ مختلف لوگوں نے سنگ مرمر اور طرح طرح کے پتھر اس مسجد کی تعمیر کے لیے اتنی مقدار میں جمع کر دیے تھے جن کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اس کی تعمیر کے وقت رنگا رنگ پتھر اور نقش و نگار اس کی دیواروں پر بنائے کہ لوگ دیکھ کر حیران بھی ہوتے تھے اور خوش بھی۔ لوگوں کے اس چندہ کے علاوہ ولید بن عبدالملک نے اس کی تعمیر پر چار بڑے بڑے بھرے ہوئے صندوق خرچ کیے جن کی تعداد اڑتالیس ہزار دینار بتائی جاتی ہے۔

اس کی تعمیر پر نہ صرف اندرون ملک کے کاریگر اور معمار تھے بلکہ بیرون ملک سے بھی کاریگروں کی ایک بہت بڑی کھیپ درآمد کی گئی تھی جو ولید نے شاہ روم کو حکم دے کر منگوائے تھے۔ بعض کتابوں میں بیرون ملک سے آئے ہوئے معماروں کی تعداد دو سو بتائی گئی ہے جو اپنے فن میں بہت ماہر تھے۔ (مسالک الابصار: ۱/۱۸۳)

معمار مسجد تعمیر کر رہے تھے کہ اس کا ایک گنبد گر گیا۔ ولید ان کی اس چال کو سمجھ گیا۔ ان کی یہ بددیانتی تھی۔ انھوں نے جان بوجھ کر یہ گنبد کمزور بنایا تھا تاکہ ادھر یہ دمشق چھوڑ کر جائیں ادھر یہ گنبد گر جائے۔ ولید نے خود آ کر اس گنبد کو درست کروایا اور معماروں کی نگرانی پر اپنے بھائی سلیمان بن عبدالملک کو چھوڑ گیا اور اسے

Marfat.com

تاکید کی کہ مسجد کی تکمیل تک یہیں رہنا اور ہر چھوٹے بڑے کام کو بغور دیکھنا۔ چنانچہ دوسری بار یہ گنبد نہایت مضبوط بنا اور اس کا کلس سونے کا بنوایا گیا۔ مسجد کی تعمیر پر وافر روپیہ صرف ہوتے دیکھ کر اہل دمشق نے یہ افواہ اڑا دی کہ ولید نے ملک کا سارا روپیہ مسجد کی دیواروں اور نقش ونگار پر برباد کر دیا ہے۔ ولید نے انھیں بتایا کہ تم لوگ چونکہ اپنی عمارتوں، حماموں اور دوسری چیزوں پر فخر کرتے ہو اس لیے میں نے تمھارے فخر کے لیے ایک یہ مسجد بھی فراہم کر دی ہے۔ مسجد ابھی پایہ تکمیل نہ پہنچی تھی کہ ولید فوت ہو گیا۔ بعد میں اس کے بھائی سلیمان بن عبدالملک نے اس کو مکمل کروایا۔ اس میں چھ سو زنجیریں سونے کی معلق کی گئیں جن میں قندیلیں لٹکائی گئی تھیں۔ یہ زنجیریں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانے تک قائم رہیں۔ (حیاۃ الحیوان دمیری: ۱/۶۶)

سلیمان بن عبدالملک کے انتقال کے بعد جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہوئے تو عیسائیوں نے ان کے پاس آ کر گرجا کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا: گرجا تو مسجد میں تبدیل ہو گیا ہے لیکن یاد رکھو کہ دمشق کا بیرونی حصہ جنگ سے فتح ہوا تھا، اس وجہ سے تمھارا اس گرجا پر کوئی حق نہیں۔ اگر تم لوگ اصرار کرتے ہو تو ہم تمھارا گرجا تمھیں واپس کر دیں گے مگر توما کا گرجا منہدم کرا دیں گے کیونکہ وہ حصہ بھی جنگ سے فتح ہوا اور وہاں مسجد بنوا دیں گے۔ یہ جواب سن کر عیسائی پریشان ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ ہم یہ گرجا چھوڑ دیتے ہیں آپ اس کے عوض گرجا توما سے دست بردار ہو جائیں۔ ایک روایت میں ہے کہ عیسائیوں نے اس کو منظور نہ کیا۔ آخر کار آپ نے محمد بن سوید النہری کو لکھا کہ عیسائیوں کو گرجا واپس کر دیا جائے مگر یہ کہ وہ خوشی سے چھوڑنے پر راضی ہوں۔ مسلمانوں کو عمر رحمہ اللہ کا یہ حکم سخت ناگوار گزرا۔ خود گورنر دمشق محمد بن سوید النہری نے بھی اس کو ناپسند کیا۔ چنانچہ اس نے علماء وقت سے مشورہ کیا اور انھیں بتایا کہ کیا ہم انھیں مسجد دے دیں حالانکہ ہم نے اس میں اذانیں دی ہیں، نمازیں پڑھیں ہیں؟ کیا مسجد منہدم کروا کر گرجا بنوا دی جائے گی؟

علماء میں سے ایک شخص نے کہا کہ عیسائیوں کے شہر کے اردگرد بڑے بڑے گرجے ہیں جیسے دیر مران، توما اور الراہب وغیرہ۔ اگر عیسائی اپنا یہ گرجا مانگتے ہیں تو ہم انھیں دینے کے لیے تیار ہیں لیکن شہر کے اردگرد کے تمام گرجے منہدم کرا دیئے جائیں گے۔ اگر وہ یہ گرجے نہیں گروانا چاہتے تو وہ ہمارے لیے یہ گرجا چھوڑ دیں جو مسجد میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کے عوض میں ہم ان کے تمام گرجے چھوڑ دیں گے اور اس سلسلہ میں ہم انھیں ایک دستاویز لکھ کر دے دیتے ہیں۔ جب یہ تجویز عیسائیوں کے سامنے رکھی گئی تو تین روز کے غور و فکر کے بعد انھوں نے محمد بن سوید گورنر دمشق سے کہا کہ ہمیں یہ تجویز منظور ہے۔ یہ تجویز خلیفہ عمر رحمہ اللہ کو بھی لکھ کر بھیج دی گئی۔ انھیں بھی اس تجویز سے خوشی اور مسرت ہوئی، چنانچہ آپ نے عیسائیوں کو اس بارہ میں ایک تحریر لکھ دی کہ ان کے گرجے انہدام اور رہائش سے محفوظ و مصئون رہیں اور اس تحریر پر کئی گواہوں نے بھی دستخط کیے۔ (کامل ابن اثیر: ۵/۵)

عیسائیوں کے ساتھ تنازع تو ختم ہو گیا لیکن ایک اور مسئلہ اس بارہ میں اٹھ کھڑا ہوا، وہ یہ کہ عمر رحمہ اللہ

Marfat.com

نے مسند نشین خلافت ہوتے ہی ملک میں اصلاحات کرنی شروع کر دیں۔ ان اصلاحات کا مقصد لوگوں کی معاشرتی اور معاشی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ بیت اللہ، مسجد نبوی اور دمشق کی الجامع الاموی پر سونے کے پترے، قندیلیں لٹکانے کے لیے سونے کی زنجیریں اور رنگا رنگ پتھر لگے ہوئے ہیں۔ عمر رحمہ اللہ کے نزدیک لوگوں میں عدل گستری اور ان کی معاشی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا اور شہروں کی تنظیم وغیرہ مساجد اور بیت اللہ پر سونے کے پترے چڑھانے سے بہتر تھا۔ چنانچہ آپ نے غور و فکر کے بعد فرمایا: میں نے کچھ مال ایسے دیکھے ہیں جو ناحق خرچ کیے گئے ہیں۔ ان کے خرچ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ میں انھیں تلاش کر کے واپس لینے والا ہوں۔ میں ان عمارتوں سے رنگ رنگ کے پتھر اتار کر وہاں پلستر کروا دوں گا اور سونے کے پترے اور زنجیریں اتار کر سرکاری بیت المال میں جمع کروا دوں گا اور ان کے عوض وہاں قندیلوں کو رسیوں سے لٹکا دوں گا خواہ وہ اشیاء مسجد نبوی کی ہوں یا دمشق کی مسجد کی یا کسی اور جگہ کی۔ چنانچہ عمر رحمہ اللہ نے سب سے سونے کی زنجیریں اتروائیں اور انھیں فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں جمع کرا دی اور وہاں سونے کی جگہ اور دھاتوں کی زنجیریں لٹکا دیں۔ (حیاۃ الحیوان: ۱/۶۶)

اہل دمشق کو عمر رحمہ اللہ کا یہ فعل سخت ناگوار گزرا۔ چنانچہ اشراف دمشق کا ایک وفد جس میں خالد بن عبداللہ قیسری بھی تھے، عمر رحمہ اللہ سے ملا۔ خالد بن عبداللہ نے خلیفہ عمر رحمہ اللہ سے سلسلہ کلام شروع کیا اور کہا: ''امیر المومنین! ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ فلاں فلاں کام کرنا چاہتے ہیں۔'' آپ نے فرمایا ''ہاں''۔ خالد نے کہا ''بخدا! ایسا کرنا درست نہیں اور نہ ہی آپ کی شان کے مناسب ہے۔ یہ بات سن کر عمر رحمہ اللہ غصہ میں آ گئے اور ان کی رگ فاروقی پھڑک اٹھی۔ آپ نے فرمایا ''ایسا کس کے مناسب ہے؟ کیا تیری کافرہ ماں کے لائق ہے (خالد ایک عیسائی ام ولد کے بیٹے تھے) اگرچہ یہ الفاظ کہنے عمر رحمہ اللہ کی شان کے خلاف تھے لیکن اس وقت غصہ کی حدت میں یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل گئے۔ خالد نے جواب میں کہا: ''امیر المومنین! اگر وہ کافرہ تھی تو اس نے بیٹا تو مومن جنا۔'' اس جواب نے عمر رحمہ اللہ کو بحر ندامت میں ڈبو دیا اور انھوں نے جواب دیا کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اچھا، آپ حضرات کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ بخدا واقعی ایسا میرے لائق نہ تھا۔ خالد نے کہا ''ہم شامی ہیں اور ہمارے بھائی مصری اور عراقی ہیں اور ہم سب مجاہد ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک شخص پر ضروری اور واجب ہے کہ روم سے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگی پتھروں کا ایک ایک بورا اٹھا کر لے جائے اور ایک ہاتھ مربع سنگ مرمر اٹھا کر لے جائے۔ چنانچہ اسے عراق اور حلب والے لاد کر لاتے ہیں پھر کرایہ دے کر دمشق لاتے ہیں۔ اسی طرح حلب اور شام والے بھی اپنے اطراف سے دمشق لاتے ہیں۔ میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا کہ یہ آپ کے لیے مناسب نہ تھا کہ آپ ان پتھروں کو اکھاڑ کر بازار میں فروخت کر کے ان کی رقم بیت المال میں جمع کرا دیں۔ خالد بن عبداللہ قشیری کے منہ سے یہ بات سن کر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خاموش ہو گئے۔ لیکن یہ خاموشی اس وجہ سے نہ تھی کہ عمر رحمہ اللہ اپنے ارادے سے باز آ گئے تھے بلکہ وہ بدستور اپنے ارادے پر مصر رہے اور

Marfat.com

اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے پر اتر آئے۔ آپ نے چاہا کہ سب سے پہلے مسجد دمشق کے قبہ سے سونا اتارا جائے کیونکہ یہ نمازیوں کی نماز میں خلل ڈالتا ہے۔ لوگوں نے جب امیر المومنین کے اس ارادے کو بھانپا تو عرض کیا ''امیر المومنین! اس قبہ پر مسلمانوں کا مال اور ان کی عطیات و ہدایا صرف ہوئے ہیں۔ اگر آپ اس کا سونا اتار دیں گے تو کوئی مفید نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ آپ نے مسلمانوں کے اس اعتراض پر اس کو چونے سے سفید کرنے کا ارادہ فرمایا۔ آپ سے کہا گیا: ''ایسا کرنے سے مال کا ضیاع ہوگا؟'' آپ نے پھر اس کو کنکروں سے ڈھانپنا چاہا۔ اس پر آپ سے کہا گیا: کیا آپ بیت اللہ کی نقل اتارنا چاہتے ہیں؟

آپ اسی کشمکش کی حالت میں تھے کہ آپ کے پاس ڈاک لانے والا آ گیا۔ اس نے مصر کے گورنر کا آپ کو پیغام دیا کہ روم سے ایک کشتی آئی ہے جس میں دس رومی آئے ہیں جو امیر المومنین سے ملاقات کے خواہاں ہیں۔ آپ نے ملاقات کی اجازت تو دے دی لیکن ان کے ساتھ مسلمان بطور جاسوس لگا دیا اور حکم فرمایا کہ وہاں کی تمام باتیں مجھ تک پہنچا دیں۔ وہ دس رومی دمشق پہنچ کر باب برید کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ پھر وہ اجازت لے کر مسجد دمشق میں داخل ہوئے اور اس دروازے پر پہنچے جو قبلہ رخ ہے۔ یہاں انھوں نے سر اٹھا کر جو مسجد کا گنبد دیکھا تو ان کے رئیس نے پوچھا ''اسلام کی کتنی مدت ہے؟'' دوسرے نے جواب دیا ''سو سال''۔ یہ سن کر وہ رئیس بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو اس کے ساتھیوں نے اس سے رومی زبان میں پوچھا: ''آپ بے ہوش کیوں ہو گئے تھے؟ اس نے جواب دیا میں اس عظیم الشان عمارت کو دیکھ کر خوشی اور مسرت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ عمر رحمہ اللہ کو جب اس بات کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ چونکہ دشمن نے مجھے غصہ دلا دیا ہے لہٰذا اب مسجد کے گنبد کا سونا نہیں اتاروں گا تا کہ اس کی عظمت و سطوت قائم رہے۔

(مسالک الابصار: ۱/۱۹۰-۱۹۲)

اشاعت اسلام:

ایک اسلامی حکومت کا مقصد اسلام کی نشر و اشاعت ہے لیکن بزور اور تخویف کے ذریعہ سے کسی کو مسلمان بنانے کی سخت مخالفت کی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے۔ "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نجران کے عیسائی آپ کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور آپ سے مصالحت کر کے جزیہ دینا قبول کیا تو سرکار دو عالم ﷺ نے جو عہد نامہ لکھ کر ان کو دیا اس میں مسلمانوں کی جانب سے یہ اقرار تھا کہ نجران کے عیسائیوں کو کسی صورت بھی مذہب کی تبدیلی پر مجبور نہ کیا جائے گا اور نہ ان سے عشر لیا جائے گا (فتوح البلدان) یہ ہے شریعت اسلامیہ کا حکم اور رسول اللہ ﷺ کا طرز عمل۔

جب صاحبان اقتدار اپنے عیش و عشرت کی فکر میں ہوں تو انھیں پھر اشاعت اسلام کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے سلطنت اسلامیہ کی حدود میں توسیع کے بجائے اسلام کی توسیع و اشاعت

Marfat.com

کو اپنا مقصد حکومت قرار دیا اور اس کے لیے ہر قسم کے مادی اور اخلاقی ذرائع بھی اختیار فرمائے۔ چنانچہ فوج کے امراء کو خاص طور پر یہ ہدایت دی گئی تھی کہ رومیوں کے کسی لشکر اور کسی جماعت کے ساتھ اس وقت تک جنگ نہ کی جائے جب تک کہ انھیں اسلام کی دعوت نہ دے دی جائے۔ (طبقات ابن سعد:۲۵۰/۵) اور تمام گورنروں کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ذمیوں کو اسلام کی دعوت دی جائے اور جو ذمی اسلام کو قبول کر لے اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے۔ اسلام چونکہ ایک دعوتی دین ہے اور اس کی نشر و اشاعت کا مدار دعوت پر ہے۔ اس لیے آپ کے اس دعوتی طریقہ سے اسلام کی بڑی اشاعت ہوئی۔ تنہا جراح بن عبداللہ حکمی والی خراسان کے ہاتھوں پر چار ہزار ذمی مسلمان ہوئے۔ (طبقات ابن سعد:۲۸۵/۵) اسماعیل بن عبداللہ ابی المہاجر والی مغرب کی تبلیغ سے سارے مغرب میں اسلام پھیل گیا۔ (فتوح البلدان:۳۵۷) اور مختلف شہروں اور علاقوں میں اس دعوت سے ذمی اس کثرت سے مسلمان ہوئے کہ متعدد گورنروں کو خراج اور جزیہ کی آمدنی گھٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے امیر المومنین کو اس جانب توجہ بھی دلائی لیکن سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس بات کی مطلق پروا نہ کی۔ بعض گورنروں کو انھوں نے یہ لکھا کہ ''رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ہادی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ محصل خراج بنا کر۔'' (مقریزی:۱۲۵/۱) اور بعضوں کو لکھا کہ ''میں یہ بات پسند کرتا ہوں کہ سارے ذمی مسلمان ہو جائیں اور ہماری تمھاری حیثیت، صرف ایک کاشتکار کی رہ جائے کہ ہم اپنے ہاتھوں سے روزی کما کر کھائیں۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی:۹۹)

بعض گورنروں نے آپ کو یہ تجویز پیش کی کہ ذمی چونکہ جزیہ کے خوف سے مسلمان ہوئے ہیں لہٰذا ختنہ کر کے ان کا امتحان لیا جائے کہ وہ خلوص سے مسلمان ہوئے ہیں یا صرف جزیہ معاف کرانے کے لیے۔ آپ نے ان کو لکھا کہ رسول اللہ ﷺ ہادی و رہنما تھے خاتن نہ تھے۔ (طبقات ابن سعد:۲۸۵/۵)

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دل میں یہی جذبہ ہر وقت اٹھکیلیاں لیتا رہتا کہ اسلام زمین کے کونہ کونہ میں پھیل جائے اور لوگ غلط راہ چھوڑ کر صحیح راستہ پر گامزن ہو جائیں۔ آپ نہایت زور و شور سے علماء کو لکھتے کہ ذمیوں کو اسلام کی دعوت دو۔ ذمیوں کے مسلمان ہونے کی صورت میں اگر کوئی حاکم سرکاری خزانہ کے خالی ہونے کی شکایت کرتا تو آپ اسے ڈانٹ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو لکھا: ''تم نے مجھے لکھا ہے کہ حیرہ کے بہت سے یہودی، عیسائی اور مجوسی مسلمان ہیں حالانکہ ان کے ذمہ جزیہ کی بھاری رقم واجب الادا ہے۔ تم نے مجھ سے ان سے جزیہ وصول کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خیر کی دعوت دینے والا بنا کر بھیجا جزیہ وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ اگر غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں تو ان کے مال، میں صدقہ ہے جزیہ نہیں۔ ان کی میراث ان کے اعزاء و اقرباء کے لیے ہے۔ اگر وہ ان میں سے نہ ہوں تو اس کی میراث مسلمانوں کے بیت المال میں جمع ہو گی اور اگر وہ کوئی خیانت کرے گا تو اس کی طرف سے اس مال۔ سے دیت دی جائے گی۔ (کتاب الخراج لابی یوسف:۱۳۱)

Marfat.com

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور ان کے گورنروں کی سوچ میں بڑا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ گورنروں کی سوچ مال اکٹھا کرنا تھی اور عمر رحمہ اللہ کو اسلام کی اشاعت کی فکر تھی۔ چنانچہ آپ کے زمانے میں مصر کا خراج کم ہونے لگا کیونکہ اکثر قبطی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ مصر کے گورنر نے چاہا کہ نو مسلم قبیلوں سے جزیہ وصول کیا جائے لیکن سیدنا عمر رحمہ اللہ نے صاف انکار کر دیا اور یہ لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو داعی بنا کر بھیجا تھا جزیہ وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ عدی بن ارطاط کو جب اس نے خراج کے گھٹنے کی شکایت کی، لکھا ''میں تمھارے خط کا مطلب سمجھ گیا۔ بخدا! میری تو یہ تمنا ہے کہ تمام لوگ مسلمان ہو جائیں تا کہ ہم اور تم کسان بن کر اپنے ہاتھوں سے کما کر کھائیں۔ (سیرۃ ابن جوزی: ۱۰۰، کتاب الخراج لابی یوسف: ۸۶)

افریقہ میں ایک جماعت بربر تھی جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بہت تنگ کرتی تھی۔ یہ پہلے موسیٰ بن نصیر کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئی۔ پھر جب سنہ ۱۰۰ھ میں افریقہ کے گورنر اسماعیل بن عبداللہ بن ابی مہاجر ہوئے تو چونکہ آپ جنگ، خراج اور صدقات کے رئیس تھے اور نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے اس لیے تمام بربر مسلمان ہو گئے اور کوئی بھی غیر مسلم نہ رہا۔ (فتوحات واخبار مصر: ۲۱۳، ابن الاثیر: ۱۰/۵، ظہر الاسلام: ۲۹۳/۱ احمد امین)

آپ کے جذبہ تبلیغ اسلام اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ آپ کے محاسن اخلاقی کی شہرت کے پیش نظر کچھ ممالک نے آپ کو بذات خود اسلام کے مبلغ بھیجنے کے لیے لکھا کیونکہ اسلام کی طرف ان کا میلان ہو گیا تھا۔ چنانچہ تبت سے کچھ وفود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے آپ سے مبلغ بھیجنے کی درخواست کی۔ ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے آپ نے سلیط بن عبداللہ کو تبت میں اسلام کی تبلیغ کے لیے بھیجا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ یعقوبی: ۳۶۲/۲) چنانچہ مورخین کے قول کے مطابق آپ کے زمانہ میں اسلام کی غیر معمولی نشر و اشاعت ہوئی اور ہر طرف اسلام کا شہرہ پھیل گیا۔

آپ خلافت کو شورائی بنانا چاہتے تھے:

اسلام نے خلافت کو شورائی بنایا ہے اور مسلمانوں کو ہر معاملہ میں باہمی مشورہ کا حکم دیا ہے۔ لیکن گزشتہ کئی سالوں سے خلافت نے شہنشاہیت کا روپ دھار لیا ہوا تھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلافت کو پھر اسی طریق پر لانا چاہتے تھے اور وہ شوریٰ کا طریق تھا۔ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خلافت کو جمہوری بنانا چاہتے تھے۔ آج کل چونکہ مغرب زدگی کی وجہ سے جمہوریت کا بھوت ہمارے سروں پر سوار ہے، اس وجہ سے ہمیں اب ہر جگہ جمہوریت ہی نظر آتی ہے، جیسے ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے سادہ دل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت صرف اکثریت کی حکومت کا نام ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔ بلکہ جمہوریت ایک مکمل فلسفہ حیات اور پورا نظام زندگی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ پروفیسر ڈوئی (Dowey) اپنی کتاب Ethics of Democracy میں لکھتے ہیں کہ:

Marfat.com

''یہ کہنا کہ جمہوریت صرف ایک خاص طرز حکومت کا نام ہے بالکل اسی طرح ہے جیسے یہ کہا جائے کہ مکان صرف اینٹوں کا مجموعہ ہے یا گرجا ایک ایسی عمارت کا نام ہے جو کلس اور منبر پر مشتمل ہے۔''

(صفحہ ۱۵)

جمہوریت ایک خلاف اسلام نظریہ ہے:

جو حضرات جمہوریت کو اسلامی سمجھتے ہیں یا اسلامی نظام خلافت کو جمہوری سمجھتے ہیں وہ نہ صرف جمہوریت سے ناآشنا ہیں بلکہ اسلامی نظام کی حقیقت سے بھی ناواقف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک سراسر خلاف اسلام نظریہ ہے۔ جس کے چند موٹے موٹے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(۱) جمہوریت کے خلاف اسلام ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت میں حاکمیت اعلیٰ عوام کی ہوتی ہے جب کہ اسلامی نظام حکومت میں حاکمیت اعلیٰ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ گویا جمہوریت میں عوام اللہ رب العزت کے مقابل میں ٹھہرتے ہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

(۲) جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام کی ایک فرع ہے۔ اس میں امیر لوگ، جاگیردار اور وڈیرے برسر اقتدار آتے ہیں کیونکہ جمہوریت کا مقصد وحید یہ ہے کہ اقتدار کی باگیں عوام کے منتخب نمائندوں جو کہ وڈیرے اور جاگیردار ہوتے ہیں، کے ہاتھوں میں دے دی جائیں۔ نظری طور پر اگرچہ جمہوری ریاست کے ہر فرد کو حاکمیت کے حقوق حاصل ہیں اور کار پردازان حکومت ان کے ترجمان ہوتے ہیں لیکن عملاً حکومت سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ طبقہ کی خواہشات کے مطابق ہی کی جاتی ہے اور اس طرح ریاست کے باشندوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقے کو حاکمیت سے یکسر محروم کر کے ان پر اپنی خواہشات کو مسلط کر دیتا ہے۔ وڈیروں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ اپنے اپنے ہم نوالوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کریں اور مخالفین کو جس قدر ممکن ہو نقصان پہنچائیں۔ ملک کے سارے معاشی ذرائع اس مختصر سے طبقہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ عدالتیں، پریس اور مسلح افواج اسی کے اقتدار کی محافظ اور پاسبان ہوتی ہیں۔ ان حالات میں اگر ملک کے غریب عوام اور مظلوم طبقے ظلم واستبداد کے خلاف آواز بلند کر کے اپنے حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی لانا چاہیں تو وہ سارے راستے مسدود پاتے ہیں اور اگر وہ دادرسی کے سارے آئینی راستوں کو بند پا کر غیر آئینی راستوں کو اختیار کرنے پر مجبور کر دیے جائیں تو یہ نام نہاد عوامی اور جمہوری حکومت ملوکیت سے زیادہ سفاک بن جاتی ہے۔ پھر نہ مساجد کی حرمت قائم رہتی ہے اور نہ پارلیمنٹ

Marfat.com

کی۔لوگوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے۔مساجد کے فرش عوام کے خون سے لالہ گوں ہو جاتے ہیں اور مخاطب اور غریب نمائندگان پارلیمنٹ کو فوج کی وساطت سے اسمبلیوں سے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔

اس نظام کو چلانے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو بالعموم سرمایہ داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ مسند اقتدار پر آتے ہی اس لیے ہیں کہ اپنے حقوق کی ہر طرح سے حفاظت کر سکیں، اس لیے ان کے وجود سے ان کے اپنے گروہ کے آدمی تو داد عیش دیتے ہیں، لیکن دوسرے طبقے خصوصاً بندہ مزدور اور ہاریوں کے اوقات نہایت تلخ ہو جاتے ہیں۔

(۴) جمہوریت چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک فرع ہے لہٰذا اس میں امراء کے عیش وعشرت کے لیے غربا دن رات مختلف قسم کی صنعتوں میں ڈھور ڈنگروں کی طرح کام کریں گے۔امراء کی قوت خرید زیادہ ہوگی اور غرباء کی کم۔نتیجہ یہ ہوگا کہ امراء دن بدن امیر تر اور غرباء روز بروز غریب تر ہوتے چلے جائیں گے اور امراء کو امیر تر بنانے کے لیے غرباء ذلت کے گڑھے میں گرتے چلے جائیں گے اور معاشی زبوں حالی کا شکار ہو کر بے دین، ملحد اور اشتراکی ہو جائیں گے۔کیونکہ جمہوریت کا ردعمل اشتراکیت ہے۔

امراء کا منتہائے مقصود چونکہ دنیوی فوائد ولذائذ سمیٹنا ہوتا ہے، اس وجہ سے ان کی نظروں سے حلال و حرام اور جائز وناجائز کی تمیز اوجھل ہو جاتی ہے۔انھیں اس بات کی بالکل فکر نہیں رہتی کہ ان کی آمدنی کے ذرائع کن کن طریقوں سے معاشرہ میں ظلم وستم، بے حیائی اور بدمعاشی کو ترقی دے رہے ہیں۔ دولت کے پجاری ہونے کی حیثیت سے ان کا نقطہ نظر صرف یہی رہ جاتا ہے کہ جس طرح سے بھی ممکن ہوں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لی جائے۔اگر ان کی آمدن شراب اور ہیروئن کی فروخت، رقص وسرور کی محفلیں سجانے، فحش اور اخلاق سوز لٹریچر کی اشاعت سے بڑھتی ہے تو وہ فوراً ان کاموں میں اپنا روپیہ لوٹا دیتے ہیں اور وہ اس بات کو قطعاً محسوس نہیں کرتے کہ ان کی ان حرکات سے معاشرہ کو کیا نقصان پہنچا ہے۔نوجوان نسل میں کتنی آوارگی پیدا ہوئی ہے۔نشہ آور چیزوں سے کتنے گھر برباد ہوئے ہیں۔کتنی عصمتیں لٹیں ہیں اور کتنی عفتیں برباد ہوئی ہیں۔ان کے دل خوف خدا اور آخرت کی جواب دہی سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں اور معاشرہ کے مختلف طبقات کے مصائب و آرام کو دیکھ کر ان کے اندر معمولی سا ارتعاش بھی پیدا نہیں ہوتا۔جب سرمایہ ان کاموں میں لگے گا جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تو نتیجہ میں فیکٹریاں اور بڑے بڑے کارخانے بند ہو جائیں گے کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ ان طریقوں سے زیادہ آسانی کے ساتھ روپیہ سمیٹا جا سکتا ہے۔پھر فیکٹریوں کے جھنجھٹ میں کون پڑے۔اس سے ملک میں بے روزگاری بڑھے گی اور معاشرہ میں بے شمار معاشی

Marfat.com

پیچیدگیاں اور ان گنت اخلاقی اور ذہنی بیماریاں پیدا ہوں گی۔

④ جمہوریت میں پارلیمنٹ کے اندر دو گروہوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک حزب اقتدار اور دوسرا حزب اختلاف۔ حزب اقتدار کا مقصد اپنی مرضی کے مطابق قوانین بنانا اور عوام پر ٹھونسنا ہوتا ہے جب کہ حزب اختلاف کی غرض و غایت حزب اقتدار کی ہر بات کی مخالفت ہوتی ہے، حتیٰ کہ اگر حزب اقتدار شریعت بل بھی پیش کرے تو حزب اختلاف اس کی بھی مخالفت کرے گا۔ اس کے برعکس اسلام کے نظام حکومت میں کوئی حزب اختلاف ہے اور نہ کوئی حزب اقتدار، بلکہ پارلیمنٹ کا ہر رکن حزب اقتدار میں بھی ہوتا ہے اور حزب اختلاف میں بھی ہوتا ہے۔ سربراہ مملکت اگر درست بات کرتا ہے تو پارلیمنٹ کا ہر فرد اس کی حمایت کرے گا، لیکن اگر وہ نادرست اور غلط بات کرتا ہے تو ہر فرد کا یہ حق ہے کہ اس کی مخالفت کرے۔ اس کو راہ راست پر لائے۔ اس بات کو مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ جمہوریت میں اختلاف (Agree to Differ) کے اصول کے تحت ہوتا ہے جبکہ اسلام میں اختلاف (Differ to Agree) کے اصول کے تحت ہوتا ہے۔

⑤ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جمہوریت میں عوام اور جمہور کی حکومت ہوتی ہے یہ بھی سراسر غلط ہے۔ جمہوریت بھی بالواسطہ ایک ڈکٹیٹر شپ ہوتی ہے بلکہ عام ڈکٹیٹر شپ سے زیادہ بدتر ہوتی ہے کیونکہ ڈکٹیٹر شپ میں تو پھر بھی کچھ احتجاج ہوسکتا ہے، لیکن جمہوریت کے بارہ میں عوام کو یہ فریب دیا جاتا ہے کہ حکومت تو تمھاری اپنی ہی ہے۔ تمہی نے ووٹ دے کر ہمیں اپنا نمائندے مقرر کیا تھا لہٰذا ہم کچھ نہیں کررہے۔ بلکہ تم ہی سب کچھ کررہے ہو۔ اس طریقہ سے عوام کے احتجاج کا گلہ گھونٹ دیا جاتا ہے۔ جمہوریت کس طرح ڈکٹیٹر شپ ہے اس کے تفصیل ہم نے اپنی کتاب فتنہ جمہوریت میں دی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

⑥ اسلامی نظام حکومت اور جمہوریت میں ایک واضح فرق یہ بھی ہے۔ کہ اسلامی نظام حکومت میں بندوں کو تولا جاتا ہے۔ جب کہ جمہوریت میں بندوں کو گنا جاتا ہے چنانچہ اقبال رحمہ اللہ نے کہا ہے:

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مشہور ماہر سیاسیات ڈاکٹر برکے (Burke) نے جمہوریت کی اسی خرابی کے بارہ میں لکھا ہے:

''جمہوریتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے۔ کہ جمہوریت کی یہ شرائط شاذ و نادر ہی کبھی پوری ہوئی ہیں۔ علمی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس کی ساری توجہ کمیت اور تعداد پر رہتی ہے۔ اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں انھیں تولا نہیں جاتا۔''

بہر حال جمہوریت کے بارہ میں چند دلائل تھے۔ جو ہم نے بیان کیے ہیں۔ یہ اسلام سے الگ ایک

Marfat.com

نظریہ حکومت ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں لہٰذا یہ کہنا کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جمہوری اقدار کا احیاء کرنا چاہتے تھے بالکل غلط ہے۔ آپ اسلام کے شورائی نظام کو پھر سے زندہ کرنا چاہتے۔ جس کو اموی خلفاء نے پامال کر دیا ہوا تھا۔

شورائیت کے اقدامات اور بے بسی:

اگرچہ آپ کی دلی تمنا نظام خلافت کو شورائی بنانا تھا لیکن اس کا مستقل تغیر اور تبدیلی آپ کے بس میں نہ تھی کیونکہ اب شاہی خاندان کی موروثی ملوکیت اصولی حیثیت سے مستحکم اور مسلم ہو چکی تھیں اور عام مسلمان بھی اس کے عادی اور خوگر ہو چکے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بعض مواقع پر اپنی بے بسی کا اظہار بھی فرمایا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ فرمایا کہ خلافت کا معاملہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں اپنے بعد قاسم بن عبداللہ کو خلیفہ بنا دیا۔

(طبقات ابن سعد: ۲۵۴/۵)

ایک مرتبہ بنو امیہ کے کچھ لوگوں نے اکٹھے ہو کر آپ سے کہا کہ گزشتہ خلفاء ہمارے ساتھ جو حسن سلوک اور الطاف خسروانہ کرتے تھے آپ نے ان سب میں کمی کر دی ہے جس کی وجہ سے ہمارے عیش و آرام اور گزران میں مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ اس طریقہ سے انھوں نے آپ پر نہایت برہمی کا اظہار کیا۔ آپ نے ان کی ان سب باتوں کو نہایت غور سے سنا اور دھمکی آمیز لہجے میں فرمایا: ''اگر آئندہ پھر تم نے اس قسم کی باتیں کیں تو سن لو! میں نہ صرف تمھارا شہر بلکہ عنان خلافت چھوڑ کر مدینہ طیبہ چلا جاؤں گا اور خلافت کا معاملہ شوریٰ پر چھوڑ دوں گا۔ میں اس کے اہل (قاسم بن عبداللہ) کو اچھی طرح پہچانتا ہوں (طبقات ابن سعد: ۲۵۳/۵) یہ جواب سن کر وہ اپنا سامنہ لے کر چلے گئے۔

ملوکیت کے امتیازات کا خاتمہ:

اسلام ایک نہایت سادہ دین ہے۔ اس میں کوئی تکلفات نہیں ہیں۔ اسلام کی اس سادگی کو خلفاء راشدین نے قائم رکھا اور مسند خلافت پر بیٹھنے کے باوجود اپنی زندگی نہایت سادہ اور زہد و قناعت سے گزاری، خصوصی طور پر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دنیا میں سادگی اور زہد و قناعت کی وہ مثال پیش کی کہ چشم آفتاب اس کو دوبارہ دیکھنے کے لیے آج تک ترس رہی ہے۔ سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ قدامت اسلام اور ہجرت کے لحاظ سے بہت سے لوگوں کو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن سادگی اور زہد میں وہ سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کی فوجیں ہر محاذ پر شکست کھا رہی ہیں۔ مختلف محاذوں پر جرنیلوں اور کمانڈروں کو خطوط لکھے جا رہے ہیں۔ پوری دنیا کے بادشاہوں پر آپ کی شخصیت کی ہیبت طاری ہے لیکن ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ کئی کئی پیوند لگا کر کرتہ زیب تن ہے عمامہ پھٹا ہوا، چپل بوسیدہ، بیوہ عورتوں کے گھروں میں پانی بھرنے

Marfat.com

کے لیے مشک کاندھے پر، سونے کے لیے خاک کا بستر، چشم فلک نے ایسا سربراہ کم ہی دیکھا ہوگا۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو اپنا موٹا کرتہ پیوند لگانے کے لیے دیا۔ اس نے بجائے اس پرانے کرتے کے ایک نرم وملائم کپڑے کا کرتہ پیش کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے وہ نرم وملائم کرتہ اس کو واپس کردیا اور اپنا وہی کرتہ لے کر فرمایا: ''یہی اچھا ہے کیونکہ اس میں پسینہ خوب جذب ہوتا ہے۔'' (کنز العمال:۶/۳۵۰)

بار بار دیکھا گیا کہ مدینہ سے مکہ مکرمہ حج کے لیے جارہے ہیں۔ دوران سفر خیمہ یا شامیانہ کبھی ساتھ نہیں رکھا۔ جہاں ٹھہرے وہیں کسی درخت کے نیچے چادر ڈال کر سو رہے۔ طبقات ابن سعد کی روایت ہے۔ کہ آپ کا روزانہ خانگی خرچ صرف دو درہم تھا۔ آج کل کے حساب سے اس کا حساب لگالیں۔ (منتخب الکنز:۴/۴۱۱)

غذا نہایت سادہ اور معمولی تھی۔ عموماً روٹی اور روغن زیتون دسترخوان پر ہوتا تھا۔ روٹی بغیر چھنے آٹے کی ہوتی جسے مہمانوں اور سفراء کو کھانے میں تکلیف ہوتی، کیونکہ وہ ایسی معمولی غذا کھانے کے عادی نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر قیامت کا خوف نہ ہوتا تو میں بھی تم لوگوں کی طرح دنیوی عیش وعشرت کا دلدادہ ہوتا۔'' (کنز العمال:۶/۳۴۶)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب ایلہ تشریف لائے تو آپ نے وہاں کے اسقف (پادری) کو اپنا کرتہ دیا جس میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے اور جو پیچھے سے لمبے سفر کی وجہ سے پھٹ گیا تھا۔ آپ نے پادری سے فرمایا کہ اسے دھو دو اور پیوند لگا دو۔ پادری کرتے کو لے کر گیا اور اس کو دھو کر پیوند لگایا اور اس جیسا ایک اور کرتہ سیا اور اسے لے کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پادری نے کہا: ''یہ آپ کا کرتہ ہے جس کو دھویا ہے اور پیوند لگایا ہے اور یہ دوسرا کرتہ میری طرف سے ہے۔ آپ نے اس کرتے کی طرف دیکھا اور پھر اپنا کرتہ پہن لیا اور دوسرا کرتہ پادری کو واپس لوٹا دیا اور فرمایا: ''میرا کرتہ تمھارے کرتے سے بہت اچھا ہے کیونکہ یہ پسینہ خوب جذب کرتا ہے۔''
(منتخب الکنز:۴/۴۰۲)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''خدا کی قسم! میں زندگی کی لذتوں کی پروانہیں کرتا کہ میں اس بات کا حکم کروں کہ ایک چھوٹی بکری کی کھال نکالی جائے اور وہ بھونی جائے اور یہ حکم دوں کہ اعلیٰ درجے کے گیہوں سے ہمارے لیے روٹیاں بنائی جائیں اور ہمارے لیے کٹے ہوئے مشکیزوں میں نبیذ بنائی جائے اور اس کا رنگ اس طرح ہو جائے جیسے چکور کی آنکھ ہوتی ہے۔ ہم اسے کھائیں اور پئیں۔ لیکن ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ہمارا مال آخرت کے لیے باقی رہے کیوں کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

''تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے ہو اور ان کو خوب برت چکے ہو۔ آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی۔ اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔'' (الاحقاف، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم:۱/۴۹)

ایک مرتبہ اپنے عہد خلافت میں سر پر چادر ڈال کر باہر نکلے۔ ایک غلام کو دیکھا کہ گدھے پر سوار جارہا

Marfat.com

ہے۔ تھکے ہوئے تھے، لہٰذا اس سے کہا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ بیٹھا لو۔ اس نے آپ کی درخواست کے جواب میں فوراً گدھے سے اتر کر وہ گدھا سواری کے لیے آپ کو پیش کر دیا۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اپنے آرام کے لیے تمھیں تکلیف نہیں دے سکتا۔ تم جس طرح سوار تھے اسی طرح سوار رہو۔ میں تمھارے پیچھے بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ آپ اس غلام کے پیچھے گدھے پر سوار ہو کر مدینہ طیبہ کی گلیوں میں داخل ہوئے اور لوگوں کو امیر المومنین کو ایک غلام کے پیچھے بیٹھا دیکھ کر نہایت تعجب ہوا۔ (کنز العمال: ۶/۳۵۳)

ایک مرتبہ سیدنا احنف بن قیس رضی اللہ عنہ رؤسائے عرب کے ساتھ آپ سے ملنے کے لیے گئے۔ دیکھا کہ آپ آستینیں چڑھائے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ آپ نے احنف رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا: ''تم بھی میرا ساتھ دو کیونکہ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق ہے؟'' ایک شخص نے آپ کی اس تگ و دو اور جدوجہد کو دیکھ کر کہا: ''امیر المومنین! آپ اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ کسی غلام کو حکم فرمایئے وہ اس اونٹ کو ڈھونڈ لائے۔'' آپ نے فرمایا:

"ای عبد اعبد منی"

''یعنی مجھ سے بڑھ کر اور کون غلام ہو سکتا ہے۔''

ایک مرتبہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ خطبہ کے دوران فرمایا: ''لوگو! ایک زمانہ میں، میں اس قدر نادار اور قلاش تھا کہ لوگوں کو پانی بھر کر دیا کرتا تھا اور وہ اس کے بدلہ میں مجھے کچھ چھوہارے دے دیتے تھے۔ انھیں چھوہاروں پر میری گزر بسر تھی۔'' یہ بیان کر کے منبر سے اُتر آئے۔ لوگوں کو آپ کی اس بات سے نہایت تعجب ہوا کہ یہ منبر پر کہنے کی کون سی بات تھی۔ فرمایا: میری طبیعت میں ذرا سا عجب اور غرور آ گیا تھا۔ یہ اس کی دوا تھی۔''

اس طرح کے واقعات سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی بھری پڑی ہے اور قدم قدم پر ایسے واقعات ملیں گے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اتنا پر جلال خلیفہ ہو کر جس کی ہیبت سے قیصر و کسریٰ کانپتے تھے، اتنی سادہ اور عام زندگی بسر کرتا تھا کہ ایک عام آدمی ان کی پہچان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ چنانچہ جب قادسیہ کی جنگ ہو رہی تھی۔ سارے عرب کی نگاہیں اس جنگ کے انجام پر لگی ہوئی تھیں اور اسے اپنے ملک کے ثبات و زوال کی میزان سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ فکر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو تھی۔ وہ صبح ہوتے ہی قادسیہ کے قاصد کے انتظار میں مدینہ طیبہ کے باہر تشریف لے جاتے اور جب سورج کی تمازت تیز ہو جاتی تو واپس آتے۔ ایک روز وہ واپس تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک سانڈنی سوار انھیں ملا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ قادسیہ سے آ رہا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا اللہ کے بندے! وہاں کی کوئی خیر خبر۔ اس نے جواب دیا: ''اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح اور ایرانیوں کو شکست دی ہے۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس کے ساتھ دوڑتے جا رہے تھے اور محاذ جنگ کے حالات پوچھتے جاتے تھے۔ وہ آپ کو بالکل نہیں پہچانتا تھا۔ اس وجہ سے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے ان کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ یہ سوار سعد بن عمیلہ فزاری تھا جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نام سپہ سالار لشکر سیدنا بن ابی

Marfat.com

وقاص رضی اللہ عنہ کا خط لے کر آ رہا تھا۔ جب یہ دونوں مدینہ میں داخل ہوئے اور لوگوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو امیر المومنین کہہ کر سلام کرنا شروع کیا تو سعد بن عمبلہ نے کہا: ''اللہ آپ پر رحم فرمائے، آپ نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ آپ امیر المومنین ہیں۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا! ''میرے بھائی! کوئی بات نہیں۔''

اس واقعہ سے اندازہ فرمائیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی، رہن سہن، بود و باش اور طور طریق کس قدر سادہ تھے کہ وہ سانڈنی سوار قاصد آپ کو پہچان نہیں سکا۔ لیکن جوں جوں زمانہ نبوت سے بعد ہوتا چلا گیا۔ خلفاء کی بود و باش میں تکلفات کے گھنیرے سائے پڑنے لگے یہاں تک کہ اموی خلفاء کے چونچلے اور ان کے تکلفات زندگی شہنشاہیت کے چونچلوں کی طرح ایک امتیازی حیثیت اختیار کر گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب خلافت نے شہنشاہیت کا روپ دھار لیا ہے۔ آپ خلافت کو شورائی تو نہ بنا سکتے تھے۔ کیونکہ سلیمان بن عبدالملک نے آپ کے بعد یزید بن عبدالملک کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا اور اگر آپ اس میں کوئی تغیر و تبدل کرتے تو اموی خاندان میں انقلاب و بغاوت کا خطرہ تھا، لیکن آپ نے خلافت کے ان تمام مفاسد کو یک قلم ختم کر دیا جو ان لوگوں کے طرۂ امتیاز تھے، مثلاً خلفاء کے ساتھ نقیب اور علم بردار چلتے تھے۔ آپ نے اس کو بالکل ختم کر دیا۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کے بعد جب کوتوال شہر نے پہلی مرتبہ دستور کے مطابق نیزہ لے کر آپ کے ساتھ چلنا چاہا تو آپ نے اسے روک دیا کہ میں اس امتیاز کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ میں مسلمانوں کا ایک معمولی فرد ہوں۔ یہ جملہ کہنے کی وجہ سے پھر اسے آپ کے ساتھ نیزہ لے کر چلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۵۳)

علاوہ ازیں آپ نے تمام گورنروں کو فرمان جاری کیا کہ پیشہ ور واعظ جو خلفاء پر سلام بھیجتے ہیں، اس کو فوری طور پر بند کر دیا جائے اور انھیں یہ کہو کہ وہ خلفاء پر سلام بھیجنے کی بجائے عام مسلمانوں کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حالت پر رحم فرمائے۔ (طبقات ابن سعد ۲۸۳/۵) میرے لیے کوئی دعا مخصوص نہ کرو بلکہ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے دعا کریں۔ میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں گا کیونکہ الحمدللہ میں بھی ایک مسلمان ہوں۔ (طبقات ابن سعد: ۲۷۸/۵)

ابوبکر بن محمد کو لکھا کہ شاہی خاندان کے کسی فرد کو صرف اس لیے کسی بات پر ترجیح نہ دو کہ اس کا تعلق شاہی خاندان سے ہے، کیونکہ میرے نزدیک ان میں اور دوسرے عام مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(طبقات ابن سعد: ۲۵/۵)

پھر اپنے اس حکم کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ وہ اس طرح کہ ایک دفعہ مسلمہ بن عبدالملک ایک فریق مقدمہ کی حیثیت سے آپ کی مجلس میں آیا اور آ کر درباری فرش پر بیٹھ گیا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ دوسرے فریق مقدمہ کی موجودگی میں آپ اس درباری فرش پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ تم عام مسلمان کے برابر بیٹھو یا کسی دوسرے کو اپنا وکیل مقرر کر دو۔ یہ الفاظ آپ نے اس شخص کو کہے جو آپ کی بیوی کا بھائی تھا۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۷۳)

شاہی خاندان کے لوگوں کے وظائف لوگوں سے زیادہ ہوتے تھے، صرف اس وجہ سے کہ ان کا تعلق

Marfat.com

شاہی خاندان سے ہے۔ آپ نے اس کے وظائف عام مسلمانوں کے برابر کر دیئے جس سے ان کے دلوں میں طوفان تو اٹھا لیکن آپ نے اس کو پرکاہ کے برابر نہ سمجھا۔ اس طریقے سے آپ نے ان تمام امتیازات کو یک قلم منسوخ کر دیا جو ان لوگوں کو صرف اس وجہ سے حاصل تھے کہ ان کا تعلق آل مروان یا دوسرے لفظوں میں شاہی خاندان سے ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے قبل خلفاء اپنی مرضی سے ہر کام کرتے تھے حالانکہ اسلام میں خلافت کا تصور شورائی ہے اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں ہر خلیفہ کی ایک مجلس شوریٰ تھی جس سے وہ اہم معاملوں میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ شوریٰ اگرچہ اموی خلفاء کے زمانہ میں بھی تھی۔ لیکن وہ ان سے مشورہ یا تو لیتے ہی نہ تھے یا بہت کم مشورہ لیتے تھے۔ عمر رحمہ اللہ جب برسر اقتدار آئے تو ایک تو آپ کی پشت پر علم و تجربہ تھا جس کی روشنی میں حکمرانی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ پھر وہ ہر معاملہ میں ژرف نگاہی سے کام لیتے تھے اور نہایت غور و فکر کے ساتھ امور مملکت سرانجام دیتے تھے۔ پھر آپ نے اپنے پاس خیر خواہ مشیروں کی ایک کثیر تعداد رکھی ہوئی تھی جو آپ کے نہایت مخلص، خیر خواہ اور ہمدرد و بہی خواہ تھے۔ آپ تمام اہم امور میں ان سے صلاح و مشورہ لیتے اور ان اہم لوگوں سے اور ہر اس شخص سے جس میں آپ خیر و صلاح دیکھتے اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے باقی ہو۔ آپ نے صلاح و مشورہ اور راہ نمائی حاصل کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۱۴)

خلافت سے قبل آپ کی زندگی نہایت مسرفانہ زندگی تھی۔ لیکن بار خلافت اٹھانے کے بعد آپ کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا اور آپ نے اپنے جسم کو تمام ذاتی کمزوریوں سے پاک صاف کر لیا اور پھر ہمہ تن کاروبار خلافت اور لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں مصروف ہو گئے اور روز و شب اسی کام میں گزرتے۔ آپ دربار خلافت میں لوگوں کی خدمت اور ان کی ضروریات پورا کرنے کے لیے بیٹھ جاتے اور رات گئے تک ان کی ضروریات کو پورا کرتے رہتے۔ جب کاروبار خلافت ختم ہو جاتا تو آپ پھر اپنا ذاتی چراغ منگوا کر جلاتے اور دو رکعت نفل ادا کر کے اکڑوں بیٹھ جاتے اور ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر جیسے کہ نہایت متفکر ہوں، رونے لگتے اور اتنا روتے کہ آنسو رخساروں پر بہنے لگتے اور صبح صادق تک روتے رہتے اور پھر نماز فجر ادا کرتے۔ کئی مرتبہ آپ کی اہلیہ محترمہ فاطمہ بنت عبدالملک نے آپ سے پوچھا کہ آپ تنہائیوں میں کیوں رو رہے تھے۔ آپ فرماتے: ''فاطمہ! میں اس امت کے ہر فرد کا خواہ وہ گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا عجمی، امام بنایا گیا ہوں تو میں قانع مسافر کا، نادار محتاج کا اور مجبوراً اسیر وغیرہ کا جو اطراف ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، تصور کر کے رونے لگتا ہوں کہ کل قیامت کے روز حق تعالیٰ شانہ مجھ سے ان تمام لوگوں کو حساب لے گا اور سرکار دو عالم ﷺ مجھ سے اس بارہ میں جھگڑا کریں گے تو میں ان کے سامنے کیا عذر پیش کروں گا اور انھیں اس بارہ میں کیا جواب دوں گا۔ بس اسی کے خوف اور ڈر سے میں ساری رات روتا رہا۔'' یہ خشیت الٰہی مفقود ہو چکی تھی۔ عمر رحمہ اللہ نے اس کو پھر زندہ کیا اور قیامت کے روز محاسبہ کا تصور زندگیوں میں اجاگر کیا۔

Marfat.com

عدالت اور قضاء

اسلام نے عدل و انصاف پر نہایت زور دیا ہے۔ خود قرآن حکیم میں ہے: "اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ" لوگو! عدل کرو عدل تقویٰ کے قریب تر ہے۔ کیونکہ کسی حکومت کا قیام عدل و انصاف کا مرہون منت ہے۔ اگر کوئی حکومت عدل و انصاف سے کام نہ لے گی تو وہ جلد تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ہر خلیفہ راشد نے اپنے دور میں عدل اور انصاف کو قائم کیا۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں عدل و انصاف کے لیے ایک مستقل محکمہ قائم کیا۔ ان کے ہاں قانون کی نگاہ میں مساوات تھی۔ وہ آزادی اور مساوات سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ آپ نے مسند نشین خلافت ہونے کے بعد اپنا سب سے پہلا خطبہ جو مسجد نبوی میں لوگوں کے سامنے دیا اس میں واضح الفاظ میں فرمایا:

"خدا کی قسم! ہر کمزور آدمی میرے نزدیک سب سے قوی ہے تا آنکہ اس کے لیے اس کا حق وصول نہ کرلوں اور تمھارا ہر طاقتور آدمی میرے نزدیک سب سے کمزور ہے تا آنکہ اس سے حق وصول نہ کرلوں۔"

یہی وجہ ہے کہ آپ کا عدل و انصاف آج تک ضرب المثل ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ اللہ اور اس کے حساب سے ڈرنے والے تھے اور لوگوں پر حکومت کرنے میں جس بے لاگ سوجھ بوجھ، باریک بینی، دور اندیشی، خوف آخرت اور محاسبہ نفس کی ضرورت ہوتی ہے، اسے خوب جانتے تھے۔ ایک دفعہ جھگڑنے والے ان کے پاس آئے تو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور فرمایا: "اے اللہ! ان کے بارہ میں مجھے روشنی عطا فرما ان میں سے ہر ایک میرا دین چاہتا ہے۔"

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے۔ کہ قضاء اور عدالت کا محکمہ سب سے پہلے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قائم فرمایا تھا۔ جیسا کہ پروفیسر ہٹی نے اپنی کتاب "ہسٹری آف دی عربز" (ص: ۱۷۳) اور علامہ شبلی رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف "الفاروق" میں یہی لکھا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ بات محل نظر ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ عہدہ خود عہد نبوت میں قائم ہو چکا تھا۔ کتب احادیث میں کتاب الاقضیہ کے عنوان سے جو باب ہے اس کی احادیث و روایات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قاضی کے فرائض، عہد کے شرائط و آداب اور شہادت

Marfat.com

کے احکام وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔ اگرچہ معاملات حکومت میں آخری فیصلہ آپ ہی کا نافذ ہوتا تھا، لیکن مملکت میں توسیع کے باعث ہر معاملہ اور ہر مقدمہ آپ خود فیصلہ نہیں فرما سکتے تھے۔ اس لیے اپنی جانب سے مختلف علاقوں میں قاضی بھی مقرر فرما دیتے تھے اور ان کو اس سلسلہ میں خاص خاص ہدایت دی تھیں۔ چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا تو انھوں نے عرض کیا کہ میں تو کم عمر ہوں اور مجھ کو قضاء کا کوئی علم نہیں ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللھم ثبت لسانہ واھد قلبہ" اے اللہ! اس کی زبان کو استواری بخش اور اس کے قلب کو راہ دکھا۔ (البدایہ والنہایہ: ۵/۱۰۷)

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نگاہ قضاء اور اس کے اصول واحکام پر بہت وسیع تھی۔ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام ان کا ایک خط ایک غیر فانی نقش ہے جس میں انھوں نے قضاء کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ یہ خط ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو عراق کے قاضی کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا، اس خط میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے بندے امیر المومنین کی طرف سے عبداللہ بن قیس کے نام! سلام علیکم، اما بعد! واضح ہو کر فصل خصومات ایک اہم فریضہ ہے۔ جس پر ہر زمانہ میں عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ جب کوئی مقدمہ تمھارے پاس آئے تو اس کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھو اور جب صحیح فیصلہ سمجھ میں آجائے تو اسے نافذ کردو کیونکہ زبانی فیصلہ بے سود ہے تاوقتیکہ اسے عملاً نافذ نہ کیا جائے۔ مدعی اور مدعا علیہ کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرو۔ کسی ایک فریق سے بات کرنے یا عدالت میں بٹھانے یا انصاف کرنے میں کوئی امتیاز نہ برتو تاکہ "بڑا آدمی" یہ توقع نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ رعایت کرو گے اور غریب اور کمزور کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ اس کے ساتھ ناانصافی سے پیش آؤ گے جو شخص دعویٰ کرے اور اس سے گواہ مانگے جائیں اور جو دعویٰ نہ مانے (یعنی مدعا علیہ) اس سے قسم لی جائے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا جائز ہے بشرطیکہ اس سے قرآن کا قانون نہ ٹوٹے۔ اگر کل تم نے کوئی فیصلہ کیا اور آج اس سے بہتر فیصلہ تمھاری عقل اور سمجھ بوجھ نے تمھیں سمجھا دیا تو اپنے پہلے فیصلے کو رد کر سکتے ہو اس لیے کہ حق ازلی ہے اور اس کی طرف رجوع کرنا غلطی پر اڑے رہنے سے بہتر ہے۔ جس مسئلہ میں شبہ ہو اور وہ تمھیں قرآن وحدیث میں نہ ملے تو اس پر غور کرو، پھر غور کرو اور اس کی امثال ونظائر کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے قیاس واجتہاد سے کام لو۔ کوئی شخص اگر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے مہلت مانگے تو اسے مہلت دو اور اگر وہ گواہ پیش کردے تو اس کا حق دلوا دو وگرنہ مقدمہ خارج کردو۔ اس سے شک مٹے گا اور ظلم وستم کی سیاہی دور ہوگی۔ ہر مسلمان ثقہ ہے سوائے ان اشخاص کے جنھیں کسی جرم میں کوڑے لگائے جا چکے ہوں یا جنھوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا ولد ونسب میں مشکوک ہوں۔ تمھاری چھپی ہوئی بداعمالیوں کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں

Marfat.com

ہے۔ دنیا میں قانونی سزا سے بچنے کے لیے اس نے گواہی اور حلف ضروری قرار دیا ہے۔ خبردار! تمھارے دل میں اہل مقدمہ سے خفگی، اکتاہٹ یا چڑچڑاپن پیدا نہ ہو کیونکہ جو شخص حق وانصاف کے موقع پر حق وانصاف قائم کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے انعام اور اچھی شہرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ جس کسی نے اپنی نیت درست رکھی اس کے اور لوگوں کے درمیان اللہ کافی ہے اور جو ان سے بناوٹی اخلاق کے ساتھ پیش آیا اس کے لیے اللہ کے رزق اور رحمت کی امید نہ رکھو۔ والسلام!

(سنن دارقطنی :۳/۵۱۳، عیون الاخبار لابن قتیبہ :۱/۶۶، البیان والتبیین :۲/۲۴، نہایۃ الارب نویری :۶/۲۵۷، اعلام الموقعین :۲/۷۱-۷۲، مبسوط سرخسی :۱۶/۶۰-۶۵، عمر بن الخطاب لابن جوزی :۱۳۵، مقدمہ ابن خلدون جلد :۱/۱۸۴، ازالۃ الخفاء :۲/۱۱۹ وغیرہ)

ایک اور روایت میں جو قاضی شریح سے مروی ہے، یہ ہے کہ انھوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ فیصلے کس طرح کیے جائیں؟ آپ نے ان کے جواب میں لکھا:

''کتاب اللہ کے مطابق...... اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اور اگر کتاب اللہ میں بھی نہ ہوا اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی نہ ہو تو پہلے اکابر امت جو فیصلے کر چکے ہیں ان کے مطابق فیصلے کرو اور اگر پہلے صالحین امت بھی اس پر کچھ فیصلے نہ کر پائے ہوں تو چاہو تو آگے بڑھو (یعنی اجتہاد کرلو) اور چاہو تو رک جاؤ (یعنی یہاں لکھ بھیجو) اور میرے خیال میں تمھارے لیے رکنا بہتر ہے۔ والسلام! (نسائی :۲/۳۰۵)

قضاء کے جو اصول سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے چودہ سو برس قبل مقرر فرمائے تھے۔ وہ اتنے پائیدار اصول ہیں کہ زمانے کی کروٹیں بھی انھیں تبدیل نہ کرسکیں۔ انہی اصولوں کو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے زمانے میں اپنایا اور عدالت وقضاء کا سارا نظام انہی اصولوں پر چلایا۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ قاضیوں کو خود چنتے تھے:

عدل کرنے کے لیے قاضی کا عادل ہونا ضروری ہے۔ قاضی اگر غیر عادل، جانب دار اور ظالم ہوگا یا امور عدل سے ناآشنا ہوگا تو وہ کبھی عدل نہیں کر سکے گا۔ اس وجہ سے عمر رحمہ اللہ قاضیوں کا انتخاب خود کرتے تھے۔ وہ اس وقت تک کسی کو قاضی نہ بناتے۔ جب تک اس کا ظاہر و باطن آزمانہ لیتے تھے۔ جب آپ کو مکمل اطمینان ہو جاتا تو پھر اس کو قاضی مقرر فرما دیتے تھے جو عدالت میں سخت اور رعایا پر نرم اور شفیق ہوتے تھے۔ کیونکہ اگر اہل آدمی کا کسی عہدہ کے لیے انتخاب نہ ہو اور اس میں اس کام کی صلاحیت نہ ہو جو کام اسے سونپا گیا ہے تو لوگوں کو اس سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا بلکہ الٹا نقصان ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

روایات میں ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے تمام گورنروں، قاضیوں

Marfat.com

اور حکام کو ڈرایا اور فرمایا:

''لوگو! اللہ تعالیٰ کی قسم، میں نے کبھی خلافت کی تمنا نہ پوشیدہ طور پر کی اور نہ ظاہری طور پر۔ اگر کوئی شخص میرے خلیفہ بننے کو ناپسند کرتا ہے۔ تو اب ظاہر کر دے۔''

یہ ایک دھمکی تھی۔ لوگ آپ کی اس دھمکی سے خوفزدہ ہو گئے کیونکہ پہلے خلفاء کا ظلم و ستم ان کے سامنے تھا اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے ان کی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ چنانچہ آپ کا یہ اعلان سن کر ایک شخص بولا: ''سبحان اللہ! خلفائے راشدین جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے یہ الفاظ تو نہیں فرمائے تھے اور عمر رحمہ اللہ یہ الفاظ فرما رہے ہیں۔'' (العقد الفرید: ۴/۴۳۳)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اس دھمکی نے لوگوں پر خصوصی طور پر اور اچھے عمال اور قاضیوں پر بڑا اثر کیا کیونکہ عمر رحمہ اللہ سے پہلے کے خلفاء ایسے قاضی اور حکام منتخب کر کے لوگوں پر مسلط کرتے تھے جو ظلم ڈھانے پر پوری قدرت رکھتے ہوں، حتیٰ کہ اسلامی دنیا ایک عظیم اخلاقی مصیبت میں پھنس گئی تھی اور اسی میں ایک زمانے تک کروٹیں لیتی اور کراہتی رہی۔ لیکن عمر رحمہ اللہ نے قاضی مقرر کرنے پر علم و معرفت کے ساتھ ایک اور لازمی شرط قرار دے دی تھی اور وہ یہ کہ قاضی کو ایک بہترین نمونہ بن کر عوام میں رہنا ہوگا یا بہترین نمونہ بننے کے لیے اور اچھی حالت کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔ چنانچہ آپ کی رائے میں قاضی کا مندرجہ ذیل پانچ خوبیاں سے متصف ہونا ضروری ہے۔

① وہ قرآن و سنت کا عالم ہو۔

② بردبار اور باوقار ہو۔

③ صابر اور منکسر المزاج ہو۔

④ پاک دامن ہو۔

⑤ اہم مسائل میں مشورہ کرنے والا ہو۔

ان پانچ خوبیوں کا حامل شخص عمر رحمہ اللہ کے نزدیک قاضی بننے کی اہلیت رکھتا تھا اور اگر ان میں سے کسی میں ایک خوبی بھی کم ہوتی تو عمر رحمہ اللہ اس میں وہ عیب سمجھتے۔ آپ انھیں لوگوں میں سے قاضی منتخب فرمایا کرتے تھے جن میں یہ پانچوں خوبیاں ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے آپ کے عہد خلافت میں قاضیوں کا طبقہ اپنی اصابت رائے اور تقویٰ کی وجہ سے ضرب المثل تھا۔ یہ لوگ امور عدالت میں ماہر ہوتے تھے اور راتوں کو جاگ کر عدالت کے طریقے محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ عمر رحمہ اللہ کسی شخص کو آزمائے بغیر اس کو قاضی مقرر نہ کرتے تھے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جب کسی کو قاضی مقرر فرماتے تو اس کے بارہ کرید کر کے ساری معلومات فراہم کرتے کہ یہ تقویٰ و طہارت میں کیسا ہے؟ علم و فقہ میں اس کا کیا مرتبہ ہے؟ اس کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق ہے کہ نہیں؟ یہ کرید آپ اس لیے کرتے کہ کہیں آپ کسی کے ظاہری حالات سے دھوکہ نہ کھا جائیں۔ جب پورا پورا

Marfat.com

اطمینان ہو جاتا تو پھر آپ اس کو قاضی یا عامل مقرر فرماتے۔ چنانچہ بلال بن ابی بردہ کو آپ نے اسی تحقیق و تفتیش سے مسترد کیا تھا۔ یہ بلال بن ابی بردہ ایک ہوشیار، ذہین، ذکی اور نہایت عقل مند شخص تھا۔ وہ بظاہر بڑا دیندار تھا لیکن اس کا باطن اتنا ہی خراب اور گندا تھا۔ یہ نہایت لالچی اور حریص تھا۔ یہ عمر رحمہ اللہ کی خدمت میں خناصرہ میں حاضر ہوا اور آپ کو ان الفاظ میں خلافت کی مبارک باد دی کہ عمر رحمہ اللہ نہایت متاثر ہوئے۔ اس نے کہا:

''امیر المومنین! اگر کسی کو خلافت سے شرف حاصل ہوا ہو تو آپ سے خلافت کو شرف حاصل ہوا ہے اور اگر کسی کو خلافت سے زینت ملی ہو تو آپ سے خلافت کو زینت ملی ہے۔''

عمر رحمہ اللہ نے ان ریمارکس پر اس کا شکریہ ادا کیا کیونکہ مبارکباد کے یہ الفاظ نہایت متاثر کن تھے۔ پھر یہ شخص مسجد میں گیا اور ایک ستون کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے علاء بن مغیرہ سے کہا کہ اگر اس کا باطن بھی ظاہر کی طرف ہے تو یہ واقعی عراق کا حاکم ہونے کا اہل ہے اور اس کی خدمات سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ علاء نے کہا: ابھی تحقیق کر کے اس کے مکمل حالات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ اسی وقت مسجد میں گئے۔ دیکھا کہ وہ مغرب اور عشاء کے مابین لگاتار نوافل پڑھ رہا ہے۔ علاء نے کہا: ''آپ جلدی سے نماز سے فارغ ہو جایئے مجھے آپ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ چنانچہ وہ جلدی سے فارغ ہو کر علاء کے پاس آیا۔ علاء نے کہا: ''آپ کو پتہ ہے کہ امیر المومنین کی نگاہ میں میرا کیا مقام ہے۔ اگر میں امیر المومنین کے سامنے عراق کی گورنری کے لیے آپ کا نام پیش کر دوں تو آپ مجھے کیا دیں گے؟ بلال نے کہا: میں اس کے بدلہ میں آپ کو ایک سال کی تنخواہ دے دوں گا جو کہ دس لاکھ بنتی ہے۔ علاء نے کہا: آپ مجھے یہ لکھ دیں۔ حریص تو وہ تھا ہی اس لیے جلدی سے گھر گیا اور ایک تحریر لکھ کر علاء کو دے دی۔ علاء عمر رحمہ اللہ کے پاس یہ تحریر لے آئے۔ جب امیر المومنین نے یہ تحریر دیکھی تو آپ نے کوفہ کے گورنر کو لکھ دیا کہ ''بلال نے اللہ کے نام پر ہمیں دھوکہ دیا ہے اور قریب تھا کہ ہم اس کے فریب میں آ جاتے، لیکن جب ہم نے اسے پگھلا کر دیکھا تو اس میں سراسر کھوٹ بھرا ہوا تھا۔ اس واقعہ سے اور اس قسم کے اور بھی کئی واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عمر رحمہ اللہ پر فریبیوں اور مکاروں کا اثر نہایت کم ہوتا تھا اور آپ کسی شخص کو کوئی عہدہ دینے سے قبل اس کی پوری طرح چھان پھٹک کر لیا کرتے تھے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ کتابوں میں ملتا ہے کہ ایک مرتبہ خراسان کا ایک شخص آپ کے پاس آیا اور آپ سے کہا: امیر المومنین! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک کہنے والا کہہ رہا ہے: جب بنی امیہ کا اشج برسر اقتدار آئے گا تو زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ جیسے وہ ظلم سے بھری ہوئی ہے۔ چنانچہ ولید بن عبدالملک برسراقتدار آیا تو میں نے اس کے بارے میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہ اشج (زخمی) نہیں ہے۔ پھر سلیمان بن عبدالملک مسند خلافت پر بیٹھا تو اس کے بارے میں بھی معلوم ہوا کہ وہ بھی اشج نہیں ہے۔ پھر زمام خلافت آپ کے ہاتھ میں آئی تو پتہ چلا کہ آپ اشج ہیں۔ عمر رحمہ اللہ نے اس شخص سے پوچھا: کیا تو قرآن پڑھا ہوا

Marfat.com

ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ فرمایا: تجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے تجھے قرآن کی یہ نعمت بخشی کیا واقعی تم نے یہ خواب دیکھا ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں۔ آپ نے اسے سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ یہ دو مہینے ٹھہرا رہا ایک روز عمر رحمہ اللہ نے انھیں بلا کر فرمایا: جانتے ہو میں نے تمھیں کیوں روکا؟ بولا نہیں۔ فرمایا: ہم نے آدمی بھیج کر تمھارے بارہ میں پوری پوری تحقیقات کرائیں۔ پتہ چلا کہ دوست اور دشمن آدمی تمھارے بارے میں سب کی ایک ہی رائے ہے۔ وہ شخص عمر رحمہ اللہ کی بات سمجھ گیا اور اپنے شہر واپس چلا گیا۔

(العقد الفرید: ۱/۴۳۶، ۴۳۷)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دل میں ایک تڑپ تھی کہ دنیا میں حقیقی عدل قائم کیا جائے، لیکن انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ایسا عدل قائم کرنا ناممکن ہے جس میں غلطی کی گنجائش نہ ہو۔ چنانچہ وہ ماہر اور تجربہ کار لوگوں سے عدل وانصاف کے بارہ میں پوچھتے رہتے تھے۔ انھوں نے عدل کو اپنے دل میں ایسا جما لیا کہ ایک لمحہ بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ابن کعب سے عدل کی تعریف کے بارہ میں پوچھا: انھوں نے عدل کا چہرہ بیان فرمایا:

''آپ چھوٹے مسلمانوں کے حق میں باپ، بڑوں کے لیے بیٹا اور برابر والوں کے لیے بھائی بن جائیں اور لوگوں کو ان کے قصوروں اور جرموں کے مطابق ان کی جسمانی حالت کے لحاظ سے سزا دیں، اور اپنے ذاتی انتقام میں کسی شخص کو ایک کوڑا بھی نہ ماریں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ کی زیادتی ہوگی اور اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو کسی صورت پسند نہیں کرتا۔'' (سیرۃ ابن جوزی: ۱۱)

پھر عدل کی بھی دو قسمیں ہیں ایک حکمی اور دوسرا عدل اجتماعی۔ عدل حکمی کا نفاذ قاضی کرتا ہے اور اجتماعی عدل کا نفاذ خلیفہ کی ڈیوٹی ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں عدلوں میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کے نزدیک عدل کا وقوع اس طرح ہوتا ہے کہ جو شخص احسان کا مستحق ہے اس کے ساتھ احسان کیا جائے اور جو شخص سزا کا مستحق ہے اس کو سزا دی جائے۔ سب مجرموں کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکا جائے بلکہ ہر قصور کی اس کی اہمیت کے مطابق سزا دی جائے۔ عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ شبہ کی وجہ سے حد ختم کر دی جائے کیونکہ اس میں ایک لچک ہے کہ لوگ ظلم سے بچ جائیں اور مجرموں پر شفقت کا بھی اعتبار رہے، اسی لیے شبہ سے حد ختم کر دینا موجب خیر ہے حتیٰ کہ اگر قاضی سے فیصلہ کرنے میں اجتہادی غلطی بھی ہو جائے پھر بھی شبہ سے حد کا ختم ہو جانا محل عدل ہے۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اپنے عمال اور قضاۃ کو لکھتے رہتے تھے کہ حدود کو شبہات سے ختم کر دیا کرو کیونکہ قاضی کا معافی میں خطا کرنا سزا میں خطا کرنے سے بہتر ہے۔ آپ نے اس مسئلہ میں اپنے نانا سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا طریقہ اختیار کیا تھا۔

یہ بھی ضروری نہیں اور نہ ہی اس کو عدل کہا جا سکتا ہے کہ دعویداروں کے دعویٰ کے مطابق ہمیشہ فیصلے کیے جائیں کیونکہ اکثر بدقماش لوگ جھوٹے دعوے بھی کر دیتے ہیں۔ ایک قاضی کا یہ اولین فرض ہے کہ جب اس

Marfat.com

کے پاس کوئی مقدمہ لایا جائے تو وہ اس کے بارہ میں مکمل چھان پھٹک کرے اور غلط اور صحیح کو معلوم کرنے کی پوری پوری کوشش کرے تا کہ غلط فیصلہ کرنے سے محفوظ و مصئون رہے۔ ایک روایت میں ہے کہ سلیمان بن عبدالملک کی وفات کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے عنبر کا ایک بڑا ٹکڑا لایا گیا۔ ایک شخص اس بات کا منتظر تھا کہ کب عنبر کا یہ ٹکڑا عمر رحمہ اللہ کے سامنے پیش ہو اور میں اس سے رقم وصول کروں۔ ہوا یہ کہ سلیمان بن عبدالملک کی وفات کے بعد عمر رحمہ اللہ کے سامنے عنبر کا ایک بہت بڑا ٹکڑا پیش کیا گیا تو ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا: امیر المومنین! یہ عنبر کا ٹکڑا میرا ہے۔ عمر رحمہ اللہ نے پوچھا: یہ قصہ کیا ہے؟ بولا: میں نے اس عنبر کو سلیمان کو سات ہزار میں فروخت کیا تھا۔ جب کہ اس کی اصل قیمت اٹھارہ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ عمر رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تجھ پر رحم فرمائے، کیا انھوں نے تجھے ڈرایا تھا؟ اس نے کہا: بالکل نہیں، فرمایا: کیا انھوں نے تجھ پر جبر کیا تھا یا یہ عنبر تجھ سے زبردستی چھینا تھا؟ بولا: بالکل نہیں۔ پوچھا: پھر کیا بات ہے؟ بولا: امیر المومنین! یہ میرا عنبر ہے۔ عمر رحمہ اللہ نے حکم دیا کہ تحقیق حال کے لیے مقدمہ کی تاریخ ڈال دی جائے۔ کیونکہ اس عنبر میں اس شخص کا حصہ معلوم نہیں ہوتا۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی نگاہ میں اس وقت تک عدالت کا کوئی فائدہ نہیں جب تک قاضی ایک ناقابل تسخیر قوت اور نہ ٹوٹنے والے غلبہ کا مالک نہ ہو، اور یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ قاضی کا فیصلہ ہر ایک پر نافذ ہو حتیٰ کہ امام اور خلیفہ پر بھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حلوان کا ایک مصری عمر رحمہ اللہ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ آپ کے والد عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مصر کی گورنری کے زمانہ میں میری جائیداد غصب کر لی تھی۔ اس نے عمر رحمہ اللہ کو ڈانٹا بھی۔ عمر رحمہ اللہ اس کی باتوں سے نرم بھی ہو گئے اور شفیق بھی اور اس بارہ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ آپ نے اس حلوانی کو سمجھایا کہ مجھ سے شریفانہ طور پر جھگڑو اور میری ذاتیات پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ اس جائیداد میں میرے ساتھ میرے بہن بھائی بھی شریک ہیں۔ اگر میں صرف تیرے کہنے پر تجھے یہ جائیداد واپس لوٹا دوں تو میرے بہن بھائی معترض ہوں گے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ تو قاضی کے پاس اپنا مقدمہ لے جا۔ چنانچہ اس نے قاضی کے ہاں مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی نے دونوں کے بیانات سن کر مصری کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ عمر رحمہ اللہ نے قاضی سے کہا کہ ہم نے جائیداد پر دس لاکھ درہم خرچ کیے ہیں۔ قاضی نے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ بقدر خرچ اس جائیداد سے آمدنی بھی ہو گئی ہے اور جائیداد واپس کر دی۔ عمر رحمہ اللہ نے قاضی کے فیصلہ کی تحسین فرمائی اور خود کھڑے ہو کر زمین مصری کو دے دی۔

پھر عمر بن عبدالعزیز کے نزدیک وہ عدل بھی کوئی عدل نہیں ہے۔ جس کا حکم نافذ نہ کرایا جا سکے اور حقوق پر قبضہ نہ دلوایا جائے، مثال کے طور پر قاضی اگر کسی حق دار کے حق میں فیصلہ کر دے لیکن اسے دلوا نہ سکے تو یہ عدل نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کے ہاتھ میں ایک شخص کا خط آیا جس میں اس نے اپنے بیٹے کے ظلم کی شکایت کی۔ آپ نے لکھا کہ اگر میں تجھے انصاف کے ساتھ تیرا حق نہ دلواؤں تو میں ظالم ہوں۔ (العقد الفرید: ۴/۲۰۹)

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نزدیک قاضی کو فیصلہ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے بلکہ جلدی کرنی

Marfat.com

چاہیے، جب اس پر واضح ہو جائے۔ قاضی کے علم ویقین کے ہوتے ہوئے دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ چنانچہ آپ نے ولید کے بیٹوں کے مقدمات کے سلسلہ میں جنھوں نے اہل حمص پر ظلم کیا تھا فوراً فیصلہ فرمایا۔

(حیاۃ الحیوان للدمیری: ۶۹/۱)

ابو الزناد فرماتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ظلم سے حاصل کی ہوئی اشیاء حق داروں کو ادنیٰ سے ثبوت کو کافی سمجھتے ہوئے لوٹا دیا کرتے تھے۔ جب آپ کسی شخص پر ظلم کیے جانے کی وجہ پہچان جاتے تھے تو اس کی چیز اس کو دلوا دیا کرتے تھے اور اسے تحقیق ثبوت پر مجبور نہیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز آپ کو عدی بن ارطاۃ نے خط لکھا کہ آپ مجھے اجازت مرحمت فرمائیں کہ میں لوگوں کو قدرے سزا دے لیا کروں تاکہ وہ جرم کا اقرار کرلیں۔ اس کے خط کے جواب میں عمر رحمہ اللہ نے انھیں لکھا:

”مجھے انتہائی حیرت اور تعجب ہے کہ تم نے مجھ سے لوگوں کو سزا دینے کے بارہ میں اجازت مانگی ہے۔ گویا میں اللہ کے عذاب سے تمھاری ڈھال ہوں اور گویا میری رضا تمھیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچا لے گی، لہٰذا غور کرو کہ جس پر ثبوت قائم ہو جائے، اسے ثبوت کی وجہ سے پکڑ لو اور جو اقرار کرلے اسے اقرار کی وجہ سے پکڑ لو اور جو انکار کرے اس سے عظمت والے اللہ کی قسم کھلواؤ، پھر اگر وہ قسم کھالے تو اسے چھوڑ دو۔ اللہ کی قسم! اگر لوگ اپنے جرائم کے ساتھ اللہ سے ملیں تو مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں ان کے خونوں کے ساتھ اللہ سے ملوں۔“ (والسلام)

(سیرۃ ابن عبدالحکم: ۱۲۹، سیرۃ ابن جوزی: ۹۷، ۸۲، العقد الفرید: ۴۳۴/۴، کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۱۹)

پھر جیسے آپ کے نزدیک علم کے وقت حکم میں جلدی ضروری اور واجب تھی اسی طرح دلیل کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی جلدی واجب تھی۔ لیکن اگر قاضی کے پاس نہ تو علم ہو اور نہ ہی دلیل ہو تو پھر اس کا فرض ہے کہ وہ مقدمہ کی چھان پھٹک اور حالات سے آشنا ہونے کے لیے پوری پوری تحقیق و تفتیش کرے یہاں تک کہ اس پر اس کے دلائل ظاہر ہو جائیں، اور اگر تحقیق و تفتیش کے بعد بھی دلائل ظاہر نہ ہوں تو پھر وہ مقدمہ عمر رحمہ اللہ کے پاس بھیج دے تاکہ آپ خود کوئی رائے قائم کرسکیں۔ یہ جلدی آپ کے نزدیک ہر مقدمہ میں ضروری تھی، جس میں قتل وغیرہ کی حد نہ ہو اور اگر حد ہو تو اس کا عدم نفاذ ضروری تھا جب تک اسے خلیفہ کے پاس بھیج کر اس سے تبادلہ خیالات نہ کرلیا جائے۔ یہی بات ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ولید بن عبدالملک کو سمجھائی لیکن اس نے نہ مانی۔ آپ نے مسند نشین خلافت ہوتے ہی اس پر عمل کیا۔ (تاریخ الامم الاسلامیہ: ۱۸۴/۲) لیکن غیر حد والے مقدمات میں آپ نے قاضیوں کو اجازت دے دی تھی کہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر ہی لوگوں کے حقوق انھیں لوٹا دیے جائیں۔

مقدمات کے جلد فیصلہ کرنے اور لوگوں کے حقوق جلد لوٹانے کا فیصلہ آپ نے اس لیے کیا تھا کیونکہ آپ کے خلیفہ بننے سے قبل یہ سال ہا سال تک نہیں لوٹائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ انھیں لوٹائے جانے کی خوشی اور مسرت ختم ہو جاتی تھی اور پھر وہ یاس و قنوط کے عالم میں مبتلا ہو جاتے۔ سابقہ خلفاء کے زمانوں میں کوئی شخص

Marfat.com

ایسا نہ تھا کہ اسے اس کا حق مل جاتا جب تک کہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز نہ ہو جاتا اور وہ عالم شباب سے عالمِ پیری میں نہ چلا جاتا۔ جب انسان کی تمام قوتیں نحیف و مضمحل ہو جاتی ہیں اور عدالت سے حق و انصاف حاصل کرنے میں ایک طویل زمانہ گزر جاتا ہے جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ بعض لوگ قبروں کی آغوش میں چلے گئے، لیکن ان کے مقدمات کا فیصلہ نہ ہوا اور نہ ان کا حق انھیں ملا اور اگر کسی عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ کر بھی دیا تو اپیلوں میں اس کو اتنا الجھایا کہ وہ پریشان ہو کر یا تو مقدمہ سے دست بردار ہو گیا یا پھر موت کی آغوش میں چلا گیا۔ جس طرح یہاں معاملہ کو نیچے سے اوپر جاتے جاتے کئی سال لگ جاتے۔ یہ دیر اور تاخیر آپ کو بہت گراں گزرتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کے ایک گورنر عبدالحمید بن عبدالرحمٰن مقدمات میں آپ سے بار بار تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ آخر کار آپ نے اسے لکھا: ''عبدالحمید! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں تمھیں لکھتا کہ کسی شخص کو ایک بکری دے دو تو تم مجھے لکھتے: بکری دے دوں یا بکرا؟ اگر میں نر یا مادہ کی تعین کر دیتا تو پھر تم لکھتے کہ کتنی عمر کا جانور دوں؟ اگر میں عمر کا بھی تعین کر دیتا تو تم مجھے لکھتے: دنبہ دوں یا بکرا؟ یہ سب تاخیری حربے ہیں جو لوگوں کو پریشان کرتے ہیں، لہٰذا جب میں تمھیں لکھوں کہ فوراً اس کی تعمیل کرو اور مجھ سے زیادہ پوچھ گچھ نہ کیا کرو۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں ہے۔ والسلام (العقد الفرید: ۴/۴۲۷)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ میں فیصلہ کرنے کے لیے کوئی خاص جگہ مقرر نہیں تھی۔ قاضی حضرات جہاں جاتے وہاں قاضی بن جاتے اور ان کے سایہ میں عدالت چلتی۔ خود امیر المومنین کا بھی یہی حال تھا کہ جہاں آپ جاتے آپ لوگوں کے شکوے اور شکایات سنتے، کبھی دارالامارۃ میں تو کبھی اپنے رہائشی گھر میں اور کبھی مسجد میں، خطبہ کے وقت بھی اور آرام کے وقت بھی۔ (البیان والتبیین: ۳/۱۷۸) پھر آپ کے زمانہ میں قاضی منفرد ہوا کرتا تھا جیسے کہ دوسرے خلفاء کے زمانوں میں ہوتا تھا۔ آپ نے قاضیوں کی کوئی ایسی جماعت مقرر نہیں کی ہوئی تھی کہ وہ سب مل کر فیصلہ کریں، لیکن آپ نے منفرد قاضی کو لغزش سے محفوظ رہنے کی تدبیر سمجھا دی تھی کہ وہ اہم مقدمات میں اہل علم سے مشورہ کر لیا کرے۔ اس وجہ سے اپنے فیصلہ میں غلطی اور لغزش سے بچ جاتا۔ اگر کوئی قاضی یا عامل جان بوجھ کر غلطی کرتا تو اس کی پہلی سزا زجر و توبیخ اور ملامت تھی، لیکن اگر وہ اس کے باوجود بھی متنبہ نہ ہوتا تو پھر عمر رحمہ اللہ کے پاس معزولی کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ عمر رحمہ اللہ نے عدی بن ارطاۃ کو کوفہ کا حاکم اور قاضی بنایا۔ ایک مرتبہ اس سے کوتاہی ہو گئی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے انھیں لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: اما بعد! تو نے مجھے اپنی سیاہ پگڑی سے علماء کی مجلس میں اٹھنے بیٹھنے سے اور اپنے پیچھے پگڑی کا شملہ چھوڑنے سے دھوکہ دیا اور تو نے میرے سامنے بھلائی ظاہر کی اور میں نے تیرے ساتھ نیک گمان کر لیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ باتیں ظاہر کر دیں جن کو تو چھپایا کرتا تھا۔ والسلام

علاوہ ازیں آپ نے قاضیوں کو راہ راست پر رکھنے کے لیے ان پر جاسوس مقرر کیے ہوئے تھے جو قاضی کے کردار اور فیصلوں میں ان کے جانب دار اور غیر جانب دار ہونے یا ہدیہ وغیرہ قبول کرنے کے بارہ میں

Marfat.com

امیر المومنین کو پوری پوری اطلاع دیتے تھے اور اگر کوئی قاضی قصور وار ثابت ہوتا تو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی۔ (سیرۃ ابن جوزی: ۸۸، الکامل للمبرد: ۱/۳۰۶) اس کے ساتھ ساتھ عاملوں اور قاضیوں سے رائے عامہ کا محاسبہ بھی ساقط نہیں فرمایا تھا۔ حج کے موسم میں عمال اور قضاۃ کے اعمال ناموں کو ان پر پیش کیا جاتا تا کہ لوگوں سے مشورہ کے بعد جسے آپ چاہیں بحال رکھیں اور جسے چاہیں معزول فرما دیں۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوتا تھا کہ حجاج کرام اس بات سے بخوبی آشنا ہو جاتے کہ عدل و انصاف کے بارہ میں آپ کی نیت پرخلوص ہے اور وہ واپسی پر اپنے اپنے علاقوں میں امیر المومنین کی عدل و انصاف اور لوگوں کو حقوق دلوانے کے بارہ میں پر خلوص نیت کا پرچار کرتے۔

قاضیوں کی رشوت سے حفاظت:

اسلام میں قاضی کو بہت زیادہ اختیارات دیے گئے ہیں یہاں تک کہ امیر المومنین بھی اس کی عدالت میں اسی طرح حاضر ہوگا جس طرح ایک عام آدمی حاضر ہوتا ہے لیکن خطرہ یہ ہوتا ہے کہ اتنے اختیارات کے ساتھ وہ رشوت کا مرتکب نہ ہو جائے، اور عدلیہ جب راشی ہو جاتی ہے تو پھر ملک میں انصاف بکتا ہے اور غریب جو انصاف خرید نہیں سکتا، ظلم و ستم کی چکی میں پس جاتا ہے اور اس کے برعکس امیر کے ظلم و ستم کرنے میں تیزی آ جاتی ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں جب چاہوں انصاف خرید سکتا ہوں اور جس ملک میں انصاف بکتا ہو وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلام نے قاضی کو نہ صرف رشوت لینے سے منع کیا بلکہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے سے بھی روکا۔ ہدیہ کا اصل مادہ ''ھدی'' ہے۔ یہ لفظ جوڑنے اور ملانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی میں کہتے ہیں: "اھدی الرجل امراته" یعنی مرد نے اپنی دلہن کو اپنے پاس بلایا اور اس سے ملا۔ اس کی جمع ''ہدایا'' آتی ہے جب کہ اہل مدینہ کی لغت میں "ھدادی" ہے۔ صحاح جوہری میں ہے کہ "مھدی" (میم پر زیر کے ساتھ) سے مراد تھالی یا طباق اسی وقت ہوگا جب کہ ہدیہ دی ہوئی شے اس کے اندر موجود ہو۔ حدیث میں ہے: "تہادوا تحابو" "ایک دوسرے کو ہدیے دیا کرو اس سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ (صحاح جوہری: ۲/۲۴۔۲۵)

عام اصطلاح میں ہے ہدیہ کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کسی شرط کے بغیر ایک آدمی دوسرے آدمی کو جو مال دیتا ہے اس کو ہدیہ کہتے ہیں۔ اس کی تعریف میں ''کسی شرط کے بغیر'' کے الفاظ قید احترازی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے رشوت خارج ہو جاتی ہے۔ (فتاویٰ ہندیہ: ۳/۱۲۲۶) نیز ان الفاظ سے بدلہ کا ہدیہ بھی خارج ہو جاتا ہے۔ یہ وہ ہدیہ ہے جس میں اسی جیسا یا اس سے کم یا زیادہ تحفہ لوٹانے کی پیشگی شرط ہوتی ہے۔

ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ ''ایک شخص پہل کر کے دوسرے کو اس کی طلب کے بغیر ہدیہ دے۔

(کشاف القناع عن متن الاقناع: ۶/۳۱۷)

ایک اور تعریف اس کی یہ کی گئی ہے کہ ''ہدیہ وہ مال ہے جو دلی محبت کے اظہار، الفت کے حصول اور

Marfat.com

ثواب کی غرض سے عزیزوں، دوستوں، علماء ومشائخ اور صالحین کو دیا جائے جن کے بارہ حسن ظن ہو۔

(السیاستہ الشرعیہ فی حقوق الراعی وسعادۃ الرعیۃ:۵۰)

علماء نے لکھا ہے کہ ہدیہ دینا اگر چہ مستحب ہے اور اس کا لین دین اس شخص کے لیے ہوگا جو مسلمان کے کسی کام کا نگران اور ذمہ دار نہ ہو۔ رہا وہ شخص جسے کسی قسم کی ذمہ داری سونپی گئی ہو جیسے قاضی (جج) سربراہ مملکت، وزیر اعظم یا وزراء اور گورنر یا دوسرے ارکان سلطنت، تو ایسے عہدیداران کے لیے ہدیہ قبول کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر کسی رکن مملکت خواہ وہ کلرک، چپڑاسی یا کوئی معمولی ملازم ہی کیوں نہ ہو، سے کام کرایا جاتا ہے جو اس ملازم پر ہدیہ لیے بغیر بھی فرض ہوتا ہے یا اگر اسی کے فرض کو یاد دلانے کے لیے اسے کوئی ہدیہ یا تحفہ دیا گیا تو وہ ایک قسم کی رشوت ہوگی۔ (المبسوط سرخسی:۱۶/۸۲) کیونکہ ہدیہ دینے والا جس کو ہدیہ پیش کرتا ہے اس کی قربت اور نزدیکی کا خواست گار ہوتا ہے، لیکن چونکہ خدا کی قربت اور نزدیکی مطلوب نہیں ہوتی اس لیے اس کے اندر کسی خیر کے پیدا ہونے کا سوال نہیں آتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہدیہ لینے والے کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو سکے۔ اس طرح اس کا دینا دلانا ایک دلی مقصد کے تحت ہوتا ہے جس کے خارج میں پائے جانے کو وہ دل سے چاہتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ہدیہ لینے والا صاحب اقتدار، ذی جاہ اور بارسوخ آدمی ہے۔ اگر اس کی خوشنودی حاصل رہی تو اسے کامیابی ہوگی۔ اس کی توجہ اس کی طرف منعطف رہی تو اس کا کام ہو جائے گا۔ دوسروں کے خلاف انہیں مدد مل جایا کرے گی یا کوئی منصب یا ملازمت حاصل ہوگی یا قاضی کوئی فیصلہ میرے حق میں کر دے گا یا ایسی ہی کوئی صورت میسر آئے گا جس سے شخصی اور ذاتی مفاد کا حصول ممکن ہوتا ہے۔

(السیاستہ الشرعیہ فی حقوق الراعی وسعادۃ الرعیۃ:۵۰)

اسی وجہ سے ابن التین فرماتے ہیں کہ گورنروں اور قاضیوں کو تحفہ دینا رشوت ہے۔ اس کو تحفہ اور ہدیہ کہا بھی نہیں جا سکتا، اس لیے کہ اگر وہ شخص گورنر یا قاضی نہ ہوتا تو کون اسے تحفہ دیتا؟ یونہی قاضی کو ہدیہ دینا سخت قبیح اور حرام ہے۔ وہ اس کا مالک بھی نہ ہوگا۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری:۱۱/۴۰۷)

اور ربیعہ کہتے ہیں کہ ہدیہ سے بچو، اس لیے کہ ہدیہ رشوت کا زینہ ہے۔ (معین الحکام:۱۷)

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گورنروں کے تحفے اول تو قبول نہیں کرتے تھے اور اگر قبول بھی فرماتے تو اسے بیت المال میں داخل فرما دیتے تھے۔ اگر ان سے کوئی کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے تھے تو آپ جواب دیتے کہ آپ کے وقت میں وہ ہدیہ ہوتا تھا، لیکن آج وہ رشوت ہے۔ (حاشیہ الرہوتی:۷/۳۱۲)

اور سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے جب یہ سوال ہوتا تو آپ فرماتے کہ آپ کے لیے وہ ہدیہ ہوتا تھا۔ لیکن ہمارے لیے رشوت ہے۔ کیونکہ آپ کو ہدیہ مقام نبوت پر فائز ہونے کی وجہ سے ملتا تھا اور ہمیں والی ہونے کی بنا پر۔ (معین الحکام:۱۷، الحلال والحرام فی الاسلام یوسف القرضاوی:۳۳۲)

کسی شاعرہ کیا اچھا کہا ہے۔

Marfat.com

فساد الدین والدنیا　　قبول الحاکم المالا

''حاکم کا مال قبول کرنا دین و دنیا کی خرابی کا باعث ہے۔''

ایک اور شاعر نے کہا ہے۔

اذا اتت الهدية دار قوم　　تطايرت الامامة من كواها

''جب ہدیہ کسی قوم کے گھر آتا ہے تو امانت اس کے روشن دانوں سے نکل کر اڑ جاتی ہے۔''

(المبسوط: ۳۱۲/۷، السیاسۃ الشرعیۃ: ۵۳)

ہدیہ دینے والا جب پہلے سے ہدیہ نہیں دیتا تھا بلکہ ابھی ابھی دینا شروع کیا تو لامحالہ اس کی اس میں کوئی غرض پنہاں ہوگی۔ اور وہ غرض اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ باطل مقاصد کے لیے اس کی آڑ لینا چاہتا ہے۔ یا اس لین دین کے ذریعے وہ کسی شے پر اپنا حق جتلانا چاہتا ہے، اور یہ تمام چیزیں کھلم کھلا حرام ہیں۔ (عون المعبود: ۴۹۸/۹)

قاضی اس شخص سے ہدیہ قبول کر سکتا ہے جس کا کوئی تنازع اس کی عدالت میں دائر نہ ہو اور منصب قضا پر فائز ہونے سے قبل بھی قرابت داری کی وجہ سے ان کے درمیان تحفہ تحائف کا تبادلہ ہوا کرتا تھا جیسے ذی رحم محرم نے تحفہ دیا ہو، اس سے تحفہ لینا اس کے لیے درست ہے کہ اس قرابت داری کے ہوتے ہوئے قاضی اس کے حق میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح دوستانہ تحفہ بھی درست ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ منصب قضا پر فائز ہونے سے پہلے اس کو جتنا ہدیہ دیتا تھا اس سے زائد نہ دینے لگا ہو۔ (فتاویٰ ہندیہ: ۲۲۶/۳، ردالمختار شامی: ۳۱۱۰/۴)

ان صورتوں میں تحفہ تحائف کا لین دین اس لیے درست ہے کہ ہدیہ دینے میں سر دست کسی تہمت کا ڈر نہیں کیونکہ ڈر اس کے میلان طبع یا دائر تنازع کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ دونوں چیزیں اس وقت مفقود ہیں۔

(کشاف القناع عن متن الاقناع: ۳۱۷/۶)

نیز اس لیے کہ پیشتر بھی ان میں ہدیہ کا لین دین جاری تھا۔ (المغنی والشرح الکبیر: ۴۳۷/۱۱)

یہ ایک رائے ہے لیکن ان سب چیزوں کے باوجود علامہ علاء الدین طرابلسی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ قاضی کو مطلق تحفہ تحائف لینے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ تحفہ قبول کرنے پر لینے والا دینے والے سے لازماً نرم روی اور سیر چشمی کا برتاؤ کرتا ہے جس کا خمیازہ قاضی کو بھگتنا پڑتا ہے اور بگاڑ سے بچنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔

(معین الحکام: ۱۷)

مذکورہ بالا افراد کے علاوہ دیگر افراد سے قاضی کو تحفہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ وہاں تہمت لگنے کا اندیشہ ہے۔

قاضی اگر رشوت لے کر کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے فیصلہ پر جرم رشوت کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اس کی تفصیل یوں ہے کہ منصب قضا پر کسی ایسے شخص کو فائز کیا جاتا ہے جس کے اندر عدل و انصاف کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو اور اس کی امتیازی شان یہ ہو کہ وہ جذبات و احساسات سے بالاتر ہو کر محض

Marfat.com

اللہ کی رضا کے لیے فیصلے کرے تاکہ مجلس قضاء میں فریقین کے درمیان حق وصداقت اور عدل وانصاف جاری و ساری ہو اب اگر رشوت درمیان میں گھس آئے تو ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں یہ عظیم صفت زائل ہو جائے گی اور اس کی جگہ فسق و فجور کا دور دورہ ہوگا اور قاضی ذاتی اور شخصی مصلحت اور خواہشات کے تحت فیصلہ کرے گا خود رشوت لے گا یا اس کا بیٹا، اس کی بیوی یا اس سے متعلق اس کا کوئی خویش وعزیز رشوت ستانی کا جرم کرے گا اور قاضی بھی اس سے فائدہ اٹھائے گا اور اسے رشوت لینے کا علم ہوگا۔ رشوت ستانی کے اس وقوعہ کے بعد یا کسی اور جرم کے ارتکاب کے بعد کیا قاضی صحیح فیصلہ دے گا؟ یا اس کا فیصلہ نافذ ہونے کے لائق ہوگا؟ یا رشوت ستانی کا اس پر نمایاں اثر ہوگا؟ اس کے بارہ میں تین مسلک ہیں جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیرت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ'' میں بیان کر دی ہے۔

یہ قاضی کی رشوت ستانی کی تفصیل جملہ معترضہ کے طور پر درمیان آ گئی۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نزدیک اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ قاضیوں میں کہیں رشوت کا چلن نہ ہو جائے۔ اس کو روکنے کے لیے آپ نے قاضیوں پر مختلف قسم کی بندشیں لگائیں اور قضاۃ کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر کیں تاکہ انھیں بالائی آمدنی کی ضرورت محسوس نہ ہو کیونکہ جب آمدنی کم ہو اور گھر کے اخراجات زیادہ ہوں تو آدمی بالائی آمدنی کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ دوسری بات اس سلسلہ میں آپ نے یہ کی کہ قاضی صرف ان لوگوں کو مقرر کیا جو دولت مند اور معاشرہ میں معزز تھے کیونکہ دولت مند ہونے کی وجہ سے وہ رشوت نہیں لے گا اور معزز ہونے کی وجہ سے وہ کسی کے دباؤ میں آ کر فیصلہ نہیں کرے گا۔ اور تیسرا اقدام رشوت وغیرہ کو روکنے کا آپ نے یہ اختیار فرمایا کہ قاضی کے لیے تجارت اور خرید وفروخت کو ممنوع قرار دے دیا۔ یہ تینوں باتیں آپ نے اپنے نانا جان سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے لیں کیونکہ انھوں نے بھی قاضیوں کے لیے یہی اصول رکھے تھے۔

مختصر یہ کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اپنی رعایا کے ہر معاملہ میں عدل چاہتے تھے۔ خواہ وہ عدل قاضیوں سے متعلق ہو یا حاکموں اور گورنروں سے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ رعایا وہی عدل چاہتی ہے جس سے اسے سعادت نصیب ہو اور فقہی معنوں میں عدل مظلوم ہی چاہتا ہے۔ لوگ عدل سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ عدل سے انھیں تونگری کی سعادت اور برکتیں ملتی ہیں۔ اگر عدل انھیں فراخی، آسانی اور تونگری کی سعادت عطا نہ کرے تو پھر انھیں عدل کی کیا ضرورت ہے؟ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ذہن میں یہ تمام باتیں تھیں۔ اس لیے آپ نے حج میں یہ اعلان فرما دیا کہ میں ہر مظلوم کی پناہ گاہ ہوں۔ مجھے چھوڑ کر کسی مظلوم کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور جو حاکم حق سے اعراض برتے اور قرآن وحدیث پر عمل پیرا نہ ہو اس کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ پھر عمر رحمہ اللہ نے ظالم حکام کے بارہ میں ایک نہایت اہم اعلان یہ فرمایا کہ میں ظالم حکام کا معاملہ رعایا کو سونپنے والا ہوں تاکہ وہ نادم اور ذلیل ہو کر حق کی طرف لوٹیں۔ اس اعلان نے حکام کے دل لرزا دیئے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ رعایا ان سے اپنے حقوق زبردستی واپس لے لے گی۔ عمر رحمہ اللہ کے اس اعلان نے رعایا کو خوش کر دیا۔

Marfat.com

بہرحال عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے عہد خلافت میں پوری اسلامی مملکت میں عدل اجتماعی اور عدل وانصاف کو ایسا رائج کیا کہ لوگوں کو خلفائے راشدین کا زمانہ یاد آنے لگا اور جب ملک میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمانوں سے بھی برکات الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ چنانچہ عمر رحمہ اللہ کے زمانے میں ہر طرف عدل وانصاف کا دور دورہ تھا۔ پورے ملک میں امن وامان تھا۔ ظالم ظلم سے مایوس اور ناامید ہو چکا تھا۔ لیکن قضاء کا بار قاضیوں پر بھاری ہو گیا تھا، اس لیے وہ اپنے عہدوں سے سبکدوش ہونے کے خواہاں تھے، کیونکہ ان میں اپنے فرائض کا احساس ہو چکا تھا اور اس بات کا بھی احساس ہو گیا تھا کہ اگر انھوں نے عدل میں ذرا سی بھی کوتاہی کی تو ان سے باز پرس ہوگی۔ اس لیے یہ عہدہ ان پر بھاری ہو گیا تھا۔ چنانچہ میمون بن مہران جو جزیرہ کے عہدہ خراج کے رئیس تھے اور وہاں کے قاضی بھی تھے۔ انھوں نے گھبرا کر اس عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور عمر رحمہ اللہ نے ان کو لکھا:

"میں آپ کو ایسی کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا جو آپ کو مصیبت میں ڈال دے۔ جو حق آپ پر منکشف ہو اس کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ کیجیے۔ اگر آپ کو کسی کام میں کسی قسم کی کوئی الجھن ہو تو اسے میرے پاس لائیں کیونکہ اگر کسی کام کے بھاری ہونے کی وجہ سے لوگ اس کام کو ترک کر دیں تو نہ دین قائم رہ سکتا ہے اور نہ ہی دنیا۔ (سیرۃ ابن الجوزی: ۹۷، کتاب الخراج لابی یوسف: ۱۱۵)

جب کوئی قاضی آپ کو اپنے بارے میں کوئی شکایت کرتا تو آپ اس کو نہایت احسن طریق سے سمجھاتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک حاکم نے اپنی بیداری اور تکلیف ومشقت کی آپ سے شکایت کی۔ آپ نے اس کو جواب میں لکھا کہ تم اہل جہنم کی بیداری یاد کرلیا کرو۔ خبردار! اس راہ سے تمھارے قدم نہ پھسلیں، اور اسی بات پر تمھاری آخری سانس ختم ہو۔ والسلام اس حاکم نے جب آپ کا خط پڑھا تو تھرا گیا۔ پھر ایک طویل سفر کر کے حاضر خدمت ہوا۔ عمر رحمہ اللہ نے آنے کی وجہ پوچھی، بولا: آپ نے اپنے خط میں میرا دل توڑ دیا ہے۔ میں مرنے تک کبھی بھی آپ کا عامل نہ بنوں گا۔" (حیاۃ الحیوان: ۱/۱۳۵)

قضاۃ کی آپ کے زمانہ میں حالت یہ ہو چکی تھی کہ وہ عہدہ قضا کو قبول نہ کرتے تھے اور ملک میں قاضیوں کی کمی ہوگئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے عدی بن ارطاط گورنر بصرہ کو لکھا کہ ایاس بن معاویہ اور قاسم بن ربیعہ جوشنی میں جو زیادہ اہلیت رکھتا ہو اس کو قاضی مقرر کر دو۔ عدی بن ارطاط نے دونوں کو بلایا۔ ہر ایک نے کہا میں اس عہدہ قضاء کے اہل نہیں ہوں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر ایک کو عہدہ قضاء سے بچنے کے لیے جھوٹی قسم کھانا پڑی۔ ایاس نے گورنر بصرہ سے کہا کہ آپ میرے بارہ میں بصرہ کے دو مشہور علماء حسن بصری اور محمد بن سیرین سے پوچھ لیں کہ میں اس عہدہ کے قابل ہوں کہ نہیں۔ قاسم ان دونوں بزرگوں کے پاس آتے جاتے تھے اور ایاس آتے جاتے نہ تھے۔ قاسم کو پتہ تھا کہ عدی بن ارطاط اگر میرے بارہ میں ان دونوں بزرگوں سے استفسار کریں گے تو یقیناً دونوں مجھے بتا دیں گے، اس لیے انھوں نے عدی سے کہا کہ آپ ان دونوں سے

Marfat.com

میرے بارے میں نہ پوچھیں۔ اس کی قسم جس کے سوا کوئی ذات عبادت کے لائق نہیں ایاس مجھ سے زیادہ فقیہ اور قضاء کے جاننے والے ہیں۔ اگر میں اس بات میں جھوٹا ہوں تو جھوٹا قاضی تو نہیں ہوسکتا اور اگر میں سچا ہوں تو آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔ اس طریقے سے قاسم نے عدی بن ارطاط پر انتخاب کے تمام دروازے بند کردیے۔ آخر کار مجبور ہوکر ایاس ہی کو قاضی بنانا پڑا لیکن ایاس نے بھی قسم کھالی کہ وہ ولایت قضا کو کسی صورت قبول نہ کرے گا۔ قاسم نے عدی سے کہا: ''عدی! آپ نے ایک شخص کو جہنم کے کنارے پر لاکر کھڑا کردیا۔ پھر اس نے جھوٹی قسم کھاکر اپنے آپ کو بچالیا۔ اللہ تعالیٰ جھوٹ پر معاف فرمائے۔ (قصص العرب:۱/۳۶۸)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے قبل قاضی حضرات حکام کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے اور ان کے مظالم سے حکام فائدہ اٹھاتے تھے اور علماء نے لکھا ہے کہ جب قاضی یا سپریم کورٹ حکمرانوں کے لیے برائی اور ظلم کا راستہ کھول دیتا ہے۔ تو اب اس کے لیے دوسرے دروازوں کا کھولنا نہایت آسان ہوجاتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مختلف علاقوں میں ایسے قاضی متعین فرمائے جنھوں نے حکام پر ہر فتنہ کا دروزاہ بند کردیا اور حاکموں کی ظالمانہ طبیعت کو رحم کی طبیعت میں تبدیل کردیا۔ ہر علاقہ میں متقی اور پرہیز گار قاضی مقرر فرمائے جنھوں نے اپنے کتاب وسنت کے مطابق فیصلوں سے لوگوں کا زندگی گزارنا آسان بنادیا۔ چنانچہ افریقہ کے شہر قیروان کے حاکم اسماعیل بن عبیداللہ انصاری لوگوں میں جاکر انھیں یہ خوش خبری سناتے تھے کہ تمھارے لیے بارگاہ خلافت سے عبداللہ بن مغیرہ قاضی بن کر آرہے ہیں۔ جو اپنے علم وفضل اور تقویٰ وپرہیز گاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اندازہ فرمائیے کہ ایک حاکم شہر ایک اچھے قاضی کے تقرر پر فخر ومباہات کررہا ہے۔ (ریاض النفوس:۱/۸۱)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے عہد خلافت میں عدل وانصاف کا اتنا پرچار کیا کہ اپنے سکوں پر بھی یہ الفاظ لکھائے۔ ''امر اللّٰہ بالعرفاء والعدل'' یعنی اللہ تعالیٰ نے وفاداری اور عدل وانصاف کا حکم فرمایا ہے۔ (سیرۃ الجوزی:۸۰)

روایات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ جب ملک میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔ قاضی حضرات عدل وانصاف سے فیصلہ کرتے ہوں۔ حکام لوگوں کو عدل کا درس دیتے ہوں اور خود بھی عدل سے کام لیتے ہوں تو اس کے اثرات ملک کی ہر شے پر مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے سنہ۹۹ھ میں دریائے نیل کا پانی ۱۹ ہاتھ چڑھ گیا تھا۔ وہ اعتدال پر آگیا۔ (النجوم الزاہرہ:۱/۵۴) مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسند نشین خلافت ہوئے تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکریاں چرانے والے چرواہوں نے پوچھا: ''کون صالح خلیفہ سریر آرائے خلافت ہوا ہے؟'' لوگوں نے ان سے پوچھا: کہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ کوئی نیا خلیفہ مسند خلافت پر بیٹھا ہے۔ بولے: جب صالح، نیک، پرہیز گار اور عدل وانصاف کرنے والا خلیفہ خلافت کی مسند پر بیٹھا ہے تو بھیڑیے اور شیر ہماری بکریوں کو نہیں چھیڑتے اور ہماری بکریاں ان کے حملوں سے محفوظ رہتی ہیں۔ (صفۃ الصفوۃ:۲/۶۷)

Marfat.com

فتوحات

صاحبان اقتدار کے دماغ حکمرانہ، سینے میں دل استبدادانہ اور ہاتھ میں تلوار چمکدار نہ ہوتی ہے، اور ان کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی حکمرانی کی حدود و ثغور میں توسیع اور اضافہ ہوتا رہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ نے حکمرانوں کی اسی کمزوری کی طرف سے اس طرح اشارہ فرمایا ہے۔

ہفت اقلیم ارنگیرد بادشاہ ہم چناں دربند اقلیمے دگر

یعنی حکمران اگر ہفت اقلیم کو بھی اپنے قبضہ میں لے لے پھر بھی اس کی سیری نہیں ہوئی اور وہ ایک اور اقلیم کی فتح کے درپے ہوتا ہے۔ یہ حکمرانوں کی ایک عام نفسیات ہے جس کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے، لیکن ایک مسلمان بادشاہ اس شے کو پسند نہیں کرتا کہ سلطنت میں وسعت ہوتی رہے اور مفتوحہ علاقوں کا انتظام نہ کیا جائے۔ سیدنا عمر فاروق رحمۃ اللہ نے دس سال چھ ماہ چار دن حکومت کی اور اس عرصہ میں تقریباً ۳۱ ہزار چھوٹے بڑے شہر فتح کیے اور اس طرح سے ایک وسیع و عریض سلطنت قائم کی لیکن جب تک مفتوح شہر کا پورا انتظام نہ کر لیا دوسرا شہر فتح نہیں کیا۔ مستشرقین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فتوحات کا اسکندر و چنگیز خان کو فتوحات سے موازنہ کرتے ہیں حالانکہ ان دونوں کی فتوحات کا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فتوحات سے کوئی مقابلہ اور جواز ہی نہیں کیونکہ ان دونوں کی فتوحات میں مفتوح ممالک کے باشندوں پر جو ظلم و ستم کیے گئے وہ سفاکیت آپ کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کی فتوحات میں بالکل نظر نہیں آئے گی، بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی حکومت میں قانون کی حکمرانی تھی۔

پھر اسکندر اور چنگیز خان نے صرف فتوحات کیں۔ وہ آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح چلے گئے۔ انھوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو کوئی نظام حکومت نہیں دیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان فاتحین کے چلے جانے کے بعد ان کی وہ حکومتیں ختم ہو گئیں۔ لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو شہر فتح ہوئے ان میں سے اکثر و بیشتر چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں اور کئی سو سال تک ان میں وہی نظام حکومت جاری و ساری رہا جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں جاری کیا تھا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ مفتوحہ شہر کی اصلاح اور اس کو نظام حکومت دینا اس کو فتح کرنے سے کئی درجے بہتر ہے۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ کا خلافت کے باب میں نقطہ نظر دوسرے تمام اموی خلفاء سے الگ تھا۔

Marfat.com

وہ یہ کہ آپ سلطنت کی توسیع کے قائل نہ تھے، بلکہ اس کی اصلاح کے قائل تھے، کیونکہ مختلف مفاسد اور خرابیوں نے ان کی سلطنت کو گھیر رکھا تھا۔ اس وجہ سے آپ کے عہد خلافت میں جو شے سب سے آخری درجہ میں نظر آتی ہے وہ فوجی اور عسکری سرگرمی ہے۔ آپ نے فتوحات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ جو علاقے ان کے زیر تسلط تھے ان کی بقاء اور تحفظ اور ان میں قیام امن کی ضرورت ان کا مقصد خلافت تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے زمانہ میں جارحانہ اقدام بہت کم کیا ہے صرف اندلس کے بعض علاقوں اور سندھ کے بعض علاقوں کی فتوحات کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر فتوحات ان کے عہد خلافت میں نہیں ہوئیں۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے شہروں اور امراء میں حرص و خواہش کا شر رینگنے لگا تھا اور سرحدوں پر اور اطراف ممالک میں اسلامی فوج نہایت منتشر اور پراگندہ حالت میں تھی۔ عمر رحمہ اللہ نے اس کا یہ علاج کیا کہ سرحدوں سے فوج واپس بلالی اور اندرون ملک حکومت کی طاقت کو مضبوط کیا۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ عمر رحمہ اللہ چونکہ فنون حرب و سیاست میں ماہر نہ تھے اور آپ خود کسی جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے، لہٰذا فتوحات کو معطل کرنا ان کی ایک سیاسی غلطی تھی۔ حالانکہ اگر وہ فوجوں کو سرحدوں سے واپس نہ بلاتے تو آپ کی فتوحات تمام یورپ میں مشرق سے مغرب تک پھیل جاتیں لیکن ہمارے خیال میں عمر رحمہ اللہ نے جو کچھ کیا نہایت درست کیا کیونکہ ان کے زمانہ میں اسلامی فوج پہلے جیسی نہ تھی اور نہ ہی وہ جرأت تھی کہ کفن سر پر باندھ کر نکلتے۔ یہ لوگ حرص و آز کے بندے تھے، کیونکہ وہ مال غنیمت غلاموں کے بجائے آقاؤں، فوجیوں کے بجائے سپہ سالاروں میں تقسیم کرتے تھے۔ عمر رحمہ اللہ کی نظر میں بگاڑ گمان سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ کیونکہ جو شہر فتح کیے جانے والے تھے، ان کا فتح کرنا آسان اور سہل نہ تھا اور اگر ان کو فتح کر بھی لیا جاتا تو وہ مسلمانوں میں فساد اور پریشانی کا باعث بنتے۔

عمر رحمہ اللہ کے نزدیک فتوحات سے مقصد مال و دولت اکٹھا کرنا نہیں تھا، بلکہ فتوحات سے اولین مقصد یہ تھا کہ اسلام کی دعوت دی جائے اور لوگوں کو مشرف با سلام کیا جائے، لیکن اب فتوحات امراء و خلفاء کی مالداری کا ذریعہ بن گئی تھیں۔ اپنی عیش و عشرت کے لیے سرکاری خزانے کو بھرا جائے اور اس کے لیے مسلمانوں سے بھی جزیہ لیا جائے۔

عمر رحمہ اللہ نے خلیفہ ہوتے ہی فی الفور اطراف ممالک سے اسلامی فوج واپس بلالی سوائے اس فوج کے جو میدان کارزار میں برسر پیکار تھی یا پھر اس سرحد پر متعین تھی جس پر دشمن کے حملہ کا خطرہ تھا۔

(آداب السلطانیہ للفخری: ۱۷۶)

مسلمہ بن عبدالملک نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ہوا تھا۔ لیکن ان کا یہ حملہ فتح سے ہم کنار نہیں ہو رہا تھا بلکہ رومیوں اور بلغاریوں کے حملوں اور کچھ موسم کی خرابی کی وجہ سے مسلمان فوج جس نے شہر کا محاصرہ کیا ہوا تھا، برابر گھٹ رہی تھی۔ چنانچہ آپ نے تمام فوج کی تباہی کے خوف سے حکم بھیجا کہ مسلمہ اپنی تمام فوج سمیت واپس

Marfat.com

لوٹ آئیں۔ مسلمہ نے اس حکم کی فوری تعمیل کی۔ پھر عمر رحمہ اللہ نے طرندہ کی فوج کو ملیطہ واپس آنے کا حکم دیا۔
(تاریخ العرب المطول: ۲۶۷)

خوارج کے فتنہ نے اول روز ہی سے مسلمانوں کی تاریخ کو رنگین کر دیا تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانوں میں انھوں نے کئی لڑائیاں لڑیں جن میں دونوں طرف سے کافی نقصان ہوا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان کے اور دوسرے فتنہ پرداز فرقوں کے خلاف بھی تلوار نہ اٹھائی، حالانکہ یہ فرقے اور خصوصی طور پر خوارج امویوں کے سخت خلاف تھے۔ آپ نے ان کو زبانی سمجھایا بجھایا بلکہ گورنر کوفہ عبدالحمید کو جو خوارج سے برسرِ پیکار تھے، ایک خط میں لکھا کہ ''جب تک یہ لوگ خون ریزی اور ملک میں فساد برپا نہ کریں، ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ ایک دور اندیش اور مستقل مزاج شخص کو میرا یہ حکم سنا کر تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیج دو۔ چنانچہ گورنر کوفہ نے محمد بن جریر بجلی کو دو ہزار فوجیوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔

اس بارہ میں آپ نے اس سے بھی زیادہ احتیاط یہ فرمائی کہ خوارج کے سردار بسطام کو خط لکھ کر اصلاح و مناظرہ کی دعوت دی اور انھیں لکھا کہ ''آؤ باہم مناظرہ کرلیں، اگر ہم حق پر ہوں تو تم دوسرے لوگوں کی طرح ہمارے حلقہ اطاعت میں داخل ہو جاؤ اور اگر تمھارا حق پر ہونا ثابت ہو گیا تو ہم تمھارے معاملہ پر غور کریں گے۔ بسطام نے اصلاح و مناظرہ کی دعوت کو قبول کر لیا۔ فریقین میں کئی مناظرے ہوئے جن کی تفصیلات طبری اور ابن اثیر وغیرہ میں موجود ہیں۔ لیکن سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اس افہام و تفہیم کی دعوت کا کوئی اثر نہ ہوا اور خوارج اپنی مفسدانہ روش سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر آپ نے گورنر کوفہ کو ان شرائط کے ساتھ ان سے جنگ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی کہ:

① عورتوں، بچوں اور قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے، بھاگنے والوں اور زخمیوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔
② فتح کے بعد جو مال غنیمت ہاتھ آئے وہ ان کے اہل و عیال کو لوٹا دیا جائے۔
③ قیدیوں کو اس وقت تک قید میں رکھا جائے جب تک وہ راہ راست پر نہ آجائیں۔

ان پابندیوں کے ساتھ گورنر کوفہ نے ان پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ آپ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے مسلمہ بن عبدالملک کو روانہ کیا جس نے جلد ہی ان پر قابو پا لیا۔ (البدایہ والنہایہ: ۹/)

Marfat.com

فاروقی خلافت کا احیاء

رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد خلافت کا جو سلسلہ چلا وہ ''خلافت علی منہاج النبوۃ'' تھی۔ ویسے تو ہر خلیفہ راشد اپنی جگہ پر نبوت کی نیابت کر رہا تھا، لیکن تمام خلفائے راشدین کا تنہا وجود ساری نظری اور عملی قوتوں اور نبوت کے تمام منصبوں کا جامع تھا۔ تلاوت آیات، تزکیہ نفس اور تعلیم کتاب وحکمت ان تینوں منصبوں میں وہ نبوت کے نائب تھے۔ وہ منصب اجتہاد وقضا اور شرع کے ساتھ قوت ارشاد وتزکیہ وتربیت بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک صاحب وحی کی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون کی منادی کرتے۔ ایک نبی کی طرح دلوں اور روحوں کو پاکیزگی بخشتے اور ایک رسول کی طرح تعلیم کتاب وحکمت اور سنت سے امت کی تربیت و پرورش کرنے والے تھے۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحب امامت وخلافت بھی تھے اور صاحب اجتہاد وقضاء بھی تھے اور صاحب سیاست و نظم احکام بلاد بھی۔ اصلاً امامت کبریٰ کا مقام اجتہاد دینی اور سیاست ملکی دونوں سے مرکب ہے۔ اس لیے ان کی خلافت میں یہ دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکٹھی تھیں۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلافت میں وہی خصوصیات پیدا کرنا چاہتے تھے جو خلفاء راشدین کے زمانہ میں تھیں، لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا اور عہد نبوت سے کافی دوری ہو چکی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور ختم ہو چکا تھا اور بنوامیہ کے بعض خلفاء نے نظام خلافت کے نظریہ کو بدل دیا تھا۔ اب خلافت شورائی ہونے کے بجائے ملوکیت کا روپ دھار چکی تھی اور اس میں اتنی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ کہ اب آپ کے بس میں یہ نہیں رہا تھا کہ وہ اس نظریہ کو بدل سکیں۔ وقتی طور پر آپ نے اس بارہ میں بہت کچھ کیا لیکن وہ وقتی تھا اور آپ کے انتقال کے بعد آنے والے خلفاء نے وہ سب کچھ بدل دیا جو آپ نے کیا تھا۔

آپ نے اس بارہ میں بہت کچھ کیا لیکن وہ وقتی تھا اور آپ کے انتقال کے بعد آنے والے خلفاء نے وہ سب کچھ بدل دیا جو آپ نے کیا تھا۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے کہ آپ نے خلافت فاروقی کو اپنا نمونہ عمل بنایا اور اس بارہ میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پوتے سیدنا سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو لکھا بھی کہ مجھے وہ تمام لائحہ عمل اور پروگرام لکھ کر بھیجیں جس کے تحت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نظام خلافت چلاتے تھے تاکہ میں بھی اس روش کے مطابق حکومت

Marfat.com

چلاؤں۔ سیدنا سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے وہ لائحہ عمل لکھ کر بھیج بھی دیا کہ لیکن ساتھ یہ لکھ کر بھیجا کہ اگر تم نے ان لوگوں کے ذریعہ اس لائحہ عمل کو چلالیا تو تم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ جاؤ گے کیونکہ تمھارے ساتھیوں اوران کے ساتھیوں میں بہت فرق ہے اور تمھاری رعایا اوران کی رعایا میں بھی اچھا خاصا فرق ہے۔

(تاریخ الخلفاء: ۲۳۱، طبقات ابن سعد: ۲۹۲/۵، البدایہ والنہایہ: ۱۹۹/۹۔۲۰۰)

شروع دن ہی سے آپ کی یہ خواہش تھی کہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلوں اور آپ نے اس کے لیے بڑی کوشش کی اور اپنے زمانہ میں وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب بھی رہے کیونکہ آپ نے اپنی خلافت کی بنیاد کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور سنت خلفاء راشدین رضی اللہ عنہ پر رکھی۔ چنانچہ آپ نے اپنی پہلی تقریر میں یہ فرمایا تھا:

''لوگو تمھارے نبی کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اور اس پر جو کتاب (قرآن حکیم) نازل ہوئی ہے اس کے بعد کوئی دوسری کتاب نازل ہونے والی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو شے حلال کردی وہ اب قیامت تک حلال رہے گی اور جو شے حرام کردی وہ قیامت تک حرام رہے گی۔ میں اپنی جانب سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ میری حیثیت احکام الٰہی کو نافذ کرنے والے کی ہے۔ میں اپنی طرف سے خود کوئی بات شروع کرنے والا نہیں ہوں بلکہ میں محض اتباع اور پیروی کرنے والا ہوں۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ میں تم سب میں سے بہتر بھی نہیں ہوں البتہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمھارے مقابلہ میں زیادہ گراں بار بنایا ہے، میں اس گراں باری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔'' (طبقات ابن سعد: ۲۵۰/۵۔۲۵۱، البدایہ والنہایہ: ۹/)

حقیقت یہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے خلافت کی گراں باری سے سبکدوش ہونے کے لیے بہت سی اصلاحات کیں لیکن وہ پھر بھی ویسی حکومت نہ چلا سکے جیسی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے چلائی تھی اس کی ایک وجہ تو ماحول کی ناہمواری تھی۔ ان کو وہ ماحول نہ ملا جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو ملا۔ ان کی رعایا صحابہ کرام رضی اللہ عنہ تھے جن کی زندگی کے نشیب وفراز سنت کی اتباع میں گزرتے تھے۔ جنھوں نے زمانے کے سرد وگرم تجربے کیے تھے۔ پھر ان کے مشیر سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ تھے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو ایسے مشیر میسر نہیں آئے تھے۔ علاوہ ازیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نظام حکومت چلانے کے لیے جو اصلاحات کیں وہ آج تک کوئی نہیں کرسکا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ملک کے نظم ونسق کو صحیح طریقہ سے چلانے کے لیے اس کو مختلف صوبوں اور ڈویژنوں میں تقسیم کیا اور پھر ان کی حدود مقرر کیں۔ جو ممالک فتح ہوئے ان میں جو تقسیم پہلے سے تھی اور جو صوبے اور ضلعے پہلے حکمرانوں نے مقرر کر رکھے تھے۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ نے گزشتہ ملکی تقسیم میں کچھ ردوبدل کیا۔ صوبوں اور ڈویژنوں اور اضلاع کی تقسیم کے بعد سب سے مقدم شے ملکی عہدیداران کا انتخاب تھا۔ کوئی سربراہ مملکت اور ملک کا وزیراعظم خواہ کیسا ہی

Marfat.com

بیدار مغز اور کوئی قانون کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہوں جب تک حکومت کے افسران قابل، لائق، راست باز، دیانت دار اور خدا سے ڈرنے والے نہ ہوں اور ان سے نہایت بیدار مغزی اور ہوشیاری سے کام نہ لیا جائے۔ صحیح نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ملک ترقی کرسکتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی سیدنا عمر فاروق رحمہ اللہ نے نہایت بیدار مغزی سے کام لیا اور حکومت کے ارکان اور ان کے افسران کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیا۔ اس زمانہ میں چار اشخاص ''دہاۃ العرب'' کہلاتے تھے۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ، سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے زیاد کے سوا تینوں کو بڑے بڑے ملکی عہدے دیئے اور انھوں نے ان عہدوں کو نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔ پھر ان تینوں کو اپنی حکمت عملی سے خود سر بھی نہ ہونے دیا اور اپنے قابو میں رکھا۔ زیاد بن ابی سفیان اس زمانہ میں سولہ سالہ نوجوان تھے۔ اس لیے انھیں کوئی بڑا عہدہ تو نہ دیا لیکن ان کی قابلیت اور استعداد عملی کی وجہ سے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ان کو ملکی معاملات اور حکومت میں اپنا مشیر کار بنائیں۔

جن حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی خاص یا اہم کام سرانجام دیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں بھی ان کے مناسب حال عہدہ دیا، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کا جواب خود اپنی طبیعت سے لکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر اس کو بہت پسند فرمایا۔ اس موقع پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ آپ نے ان کی اس قابلیت اور جواب کو ذہن میں رکھا۔ چنانچہ آپ جب خلیفہ ہوئے تو ان کو اس وجہ سے میر منشی مقرر فرمایا۔ (ابن اثیر: ۲/۲۲۰)

مختلف عہدیداران کے تقرر کے لیے کبھی مجلس شوریٰ کا اہم اجلاس بلایا جاتا اور اس میں ان عہدیداران حکومت کا انتخاب ہوتا تھا۔ چنانچہ جو شخص اس مجلس شوریٰ کے ارکان کی طرف سے منتخب کیا جاتا تھا، اس کا تقرر کر دیا جاتا۔

بعض دفعہ آپ کسی عہدے دار کا آزمائشی تقرر فرماتے اور اگر وہ اس عہدہ پر کامیاب نہ ہوتا تو اسے اس عہدہ سے معزول فرما دیتے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی طریقہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے عہد خلافت میں یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو شام کی مہم پر فوج کے ایک دستہ پر امیر بنا کر روانہ کیا تو ان کو بہت سی ہدایات دیں۔ ان ہدایات کا آغاز اس طرح کیا:

''میں نے تم کو اس لیے والی بنایا ہے کہ میں تم کو آزماؤں، تمھارا تجربہ کروں اور تم کو ٹریننگ دوں۔ اگر تم نے اچھا کام کیا تو میں عہدہ پر تم کو برقرار رکھوں گا اور ترقی دوں گا۔ اور اگر میرے معیار پر پورے نہ اترے تو میں تمھیں اس عہدہ سے الگ کردوں گا۔'' (ابن اثیر: ۲/۲۸۶)

پھر آپ نے گورنروں کے فرائض بھی مقرر فرمائے اور جب ان کا تقرر کیا جاتا تو اس تقرری کے فرمان پر ان کے اختیارات اور فرائض کا ذکر ہوتا۔ ان کے گورنر مقرر ہوتے وقت ان کے اثاثوں کے ایک

Marfat.com

فہرست تیار کی جاتی کیونکہ کل کو ان کا احتساب بھی کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ ہر گورنر کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کی ایک مکمل فہرست تیار کر کے اپنے پاس محفوظ رکھ لیتے تھے۔ اور جب دیکھتے کہ کسی عامل کی مالی حالت غیر معمولی زیادہ ہوگئی ہے تو اس کا احتساب کر کے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ (فتوح البلدان:۲۱۹) گورنر کے مال میں اضافہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کی امانت و دیانت مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ آپ ان سے پورا پورا حساب لیتے اور زائد سامان بحق سرکار ضبط کر لیتے۔ پھر اس سے فرماتے: ''ہم تمھیں گورنر بنا کر بھیجتے ہیں تاجر بنا کر نہیں بھیجتے۔'' گورنر کی اس مالی زیادتی کی ٹوہ کے لیے الگ کارخاص کے لوگ موجود ہوتے تھے اور گورنر خواہ مصر میں ہو یا شام میں اس کی ہر بات کی اطلاع امیر المومنین کو مدینہ میں ہوتی تھی۔

گورنروں کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ ہر سال حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں اکٹھے ہوں۔ آپ وہاں عوام الناس سے گورنروں کے رویہ کے بارہ میں پوچھتے۔ گورنروں سے یہ پوچھ گچھ کسی خاص مجلس میں نہ ہوتی بلکہ حج میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خود کھڑے ہو کر اعلان فرماتے تھے کہ ''اگر کسی شخص کو کسی عامل کے خلاف کوئی شکایت ہو تو پیش کرے۔'' چنانچہ اگر کوئی شکایت ہوتی تو وہ مجمع عام میں بیان کرتا اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تحقیقات کر کے مناسب کارروائی کرتے۔

گورنروں اور حکومت کے دوسرے کارندوں کی تحقیقات کا ایک محکمہ بھی تھا جس کے انچارج سیدنا محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ جس صوبے سے کسی گورنر کے خلاف کوئی شکایت موصول ہوتی تو وہ موقع پر جا کر تحقیق احوال کرتے۔ (اسد الغابہ تذکرہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں سب سے نمایاں شے عہدیداران حکومت کا احتساب تھا۔ حکومت کے نظم و نسق کو درست رکھنے کے لیے عہدیداران کا احتساب ایک نہایت ضروری چیز ہوتی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں کبھی نہیں چوکے۔ آپ کا احتساب اس قدر سخت ہوتا تھا کہ بڑے بڑے افسروں کو احتساب کا نام سن کر پسینہ آجاتا تھا۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے یہ سب کچھ کیا لیکن وہ نتائج برآمد نہ ہوئے جو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں برآمد ہوئے اور جو ہوئے بھی وہ وقتی تھے، دائمی نہ تھے۔

Marfat.com

علالت و وفات

خلیفہ ہونے سے لے کر اڑھائی سال تک آپ نے نظام خلافت کو چلانے کے لیے شبانہ روز محنت کی۔ اس کے تمام مفاسد اور خرابیوں کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی یہاں تک کہ خلافت کی گراں باری نے آپ کی کمر کو دوہرا کر دیا اور دن رات کی فکر نے آپ کے گوشت کو کھا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہو کر رہ گئے لیکن دل مضبوط اور طاقتور تھا۔ لوگ برابر آپ کی خیر و برکت سے مستفید ہو رہے تھے۔ آخر رجب ۱۰۱ھ میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر آپ اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرما گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

آپ کی وفات کی وجوہات میں تاریخ میں دو روایات ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی وفات طبعی تھی اور دوسری یہ کہ شاہی خاندان کے افراد نے جب یہ محسوس کیا کہ آپ کی خلافت کا زمانہ جوں جوں لمبا ہوتا جا رہا ہے، آپ کی حکومتی پالیسیاں سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی ہیں اور اگر آپ کا یہی طور طریقہ رہا تو جلد ہی اموی خاندان کی شاہانہ قوت ہمیشہ کے لیے دم توڑ دے گی، لہٰذا انھوں نے آپ کو راستے سے ہٹانے کی ٹھان لی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ آپ کے ایک غلام کو ایک ہزار دینار دے کر آپ کو زہر دلوا دیا۔ آپ کو اس بات کا علم ہو گیا، لیکن آپ نے غلام پر کوئی سختی نہ کی۔ صرف اس سے ایک ہزار دینار واپس لے کر ان کو بیت المال میں داخل کر لیا اور غلام کو آزاد کر دیا۔ (تاریخ الخلفاء: ۲۴۷، البدایہ والنہایہ: ۹/۲۰۹، ۲۲۰)

طبیب کو بلایا گیا اس نے بھی زہر تشخیص کیا لیکن آپ نے علاج کروانے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ غلام کا راز فاش نہ ہو اور کوئی اس پر سختی نہ کرے اور فرمایا: اگر مجھے یہ بھی یقین ہو جاتا کہ میرے کان کی لو کے پاس میری شفا ہے تو بھی میں اس کے لیے ہاتھ نہ بڑھاتا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز: ۲۷۶، البدایہ والنہایہ: ۹/۲۱۰)

کتابوں میں ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ آپ کی وفات ایک ولی اللہ کی دعا سے ہوئی۔ عبداللہ بن زکریا رحمہ اللہ اس زمانہ کے اولیاء کبار میں سے تھے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے آدمی بھیج کر ان کو بلوایا اور ان سے کہا: جانتے ہو کہ میں نے آپ کو کیوں بلوایا ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا! ایک نہایت ضروری کام کے لیے بلوایا ہے، لیکن وہ بتاؤں گا اس وقت جب آپ قسم کھائیں گے کہ وہ کام ضرور کریں گے۔ عبداللہ بن زکریا رحمہ اللہ نے کہا: آپ کام بتائیں میں ضرور تعمیل کروں گا۔ فرمایا: پہلے قسم کھاؤ انھوں نے قسم کھائی۔ فرمایا: اللہ

Marfat.com

سے دعا کرو کہ وہ مجھے اپنے پاس بلالے۔ عبداللہ نے کہا: تب تو میں مسلمانوں میں سے بدترین شخص آپ کے پاس آیا ہوں اور امت محمدیہ علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کا بدترین دشمن ہوں۔ عمر رحمۃ اللہ نے کہا: آپ نے قسم کھالی ہے۔ آخر کار عبداللہ نے اپنی قسم پوری کرتے ہوئے آپ کی موت کی دعا مانگی لیکن دعا مانگتے ہوئے بہت ہچکچائے اور بادل نخواستہ ان الفاظ میں دعا مانگی: ''اے اللہ! آپ کے بعد مجھے بھی زندہ نہ رکھ۔'' جب عبداللہ یہ دعا مانگ رہے تھے اتنے میں عمر رحمۃ اللہ کا ایک چھوٹا بچہ آ گیا۔ آپ نے عبداللہ سے کہا کہ اس کے لیے بھی دعا مانگیں کیونکہ مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ عبداللہ نے اس بچہ کے لیے بھی دعا مانگی۔ پھر یوں ہوا کہ عبداللہ بھی عمر رحمۃ اللہ کے بعد جلد ہی انتقال فرما گئے۔ پھر وہ بچہ بھی فوت ہو گیا۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم: ۱۱۵)

بہرحال سبب طبعی ہو یا زہر خورانی، آپ کو جب زندگی سے مایوسی ہو گئی تو اپنے بعد نامزد شدہ خلیفہ یزید بن عبدالملک کے لیے مندرجہ ذیل وصیت نامہ لکھوایا:

''میں تمہارے لیے یہ وصیت نامہ اس حالت میں لکھوا رہا ہوں کہ میں مرض سے نہایت لاغر ہو گیا ہوں، میرے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ تم کو معلوم ہے کہ قیامت کے روز امور خلافت کے بارہ میں مجھ سے سوال کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ مجھ سے اس کا حساب لے گا اور میں اس سے اپنا کوئی اور فعل چھپا نہ سکوں گا۔ کیونکہ حق تعالیٰ شانہ خود ہی فرمایا ہے۔

"فلنقص علیھم یعلم وما کنا غائبین"

ہم ان کو علم سے قصہ سناتے ہیں اور ہم غائب نہ تھے۔

''اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو گیا تو میں کامیاب وکامران ہوا، اور ایک طویل عذاب سے نجات پائی اور اگر وہ مجھ سے ناراض ہوا تو میرے انجام پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ میں اس اللہ سے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، نہایت عجز و نیاز سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنی رحمت سے عذاب جہنم سے نجات فرمائے اور اپنی رضا سے جنت الفردوس عطا فرمائے۔ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ تقویٰ اختیار کرنا اور رعایا کا خیال رکھنا کیونکہ میرے بعد تم صرف تھوڑے روز زندہ رہو گے۔ تم کو اس بات سے بھی سخت احتراز کرنا چاہیے کہ تم سے غفلت اور جہالت میں ایسی لغزش سرزد ہو جس کی تم تلافی نہ کر سکو۔ سلیمان بن عبدالملک اللہ کا ایک بندہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے وفات دی اور اس کے بعد اللہ سبحانہ تعالیٰ نے مجھ کو خلیفہ بنایا اور میرے بعد تم کو ولی عہد مقرر کیا۔ میں جس حالت میں تھا اگر وہ اس لیے ہوتی کہ میں بہت سی بیویوں کا انتخاب کروں اور مال و دولت اکٹھا کروں تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس سے بہتر سامان مہیا کیے تھے جو کسی بندہ کو مہیا کر سکتا ہے لیکن میں سخت اور نازک سوال سے ڈرتا ہوں سوائے اس کے اللہ تعالیٰ میری دستگیری فرمائے۔'' (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی: ۲۸۰)

مسلمہ بھی آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آپ کے اہل وعیال کے بارے میں آپ سے کہا:

Marfat.com

امیر المومنین! آپ نے اپنی اولاد کا اس مال و دولت سے ہمیشہ منہ خشک رکھا ہے اور آپ ان کو ایسی حالت میں چھوڑے جاتے ہیں کہ ان کے پاس دنیا کے مال ومتاع کا کچھ نہیں۔ آپ ان کے بارہ میں مجھے یا اپنے خاندان کے کسی اور شخص کو کچھ وصیت کر جائیں۔ یہ سن کر فرمایا: کہ ''مجھے ٹیک لگا کر بٹھا دو''۔ چنانچہ انھوں نے بٹھا دیا۔ پھر فرمایا: ''تمھارا یہ کہنا کہ اس مال سے میں نے ہمیشہ اپنی اولاد کا منہ خشک رکھا ہے، خدا کی قسم! میں نے ان کا کوئی حق تلف نہیں کیا، البتہ جو ان کا حق نہیں تھا وہ ان کو نہیں دیا۔'' اور تمھارا یہ کہنا کہ میں تمھیں یا خاندان کے کسی اور فرد کو وصیت کرتا جاؤں، تو سنو! ''اس معاملہ میں میرا وصی اور ولی اللہ تعالیٰ ہے جو صلحا کا ولی ہوتا ہے۔ میرے لڑکے اگر تقویٰ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی سبیل نکال دے گا اور اگر وہ گناہ میں مبتلا ہوں گے تو میں ان کو گناہ کے لیے قوی اور طاقتور نہ بناؤں گا۔'' اس کے بعد صاحبزادگان کو بلا کر نم ناک آنکھوں سے فرمایا:

''میری جان! میں تم پر قربان جن کو میں نے خالی ہاتھ چھوڑا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے تم کو اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ میرے بچو! تم کسی ایسے عرب اور ذمی سے نہ ملو گے جس پر تمھارا حق نہ ہو۔ عزیز بچو! دو باتوں میں سے ایک بات تمھارے باپ کے اختیار میں تھی۔ ایک یہ کہ تم متمول اور دولت مند ہو جاؤ اور تمھارا باپ جہنم میں جائے۔ دوسرے یہ کہ تم محتاج رہو اور تمھارا باپ جنت میں داخل ہو۔ ان دونوں باتوں میں اس کو یہ زیادہ پسند تھا کہ تم محتاج رہو اور وہ جنت میں جائے۔ اچھا، اب جاؤ اللہ تعالیٰ تمھیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔'' (سیرت عمر بن عبدالعزیز: ۲۸۰، البدایہ والنہایہ: ۹/...)

اس کے بعد کچھ اور لوگوں کو وصیتیں کیں۔ بعض حضرات نے عرض کیا کہ کاش کہ آپ مدینہ طیبہ منتقل ہو جاتے اور روضہ نبوی میں جو چوتھی جگہ خالی ہے وہاں رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن ہوتے۔ یہ سن کر فرمایا: ''بخدا! نار جہنم کے سوا اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہر قسم کا عذاب دے تو میں اسے بخوشی قبول کرلوں گا لیکن یہ گوارا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہو کہ میں اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن ہونے کے قابل سمجھتا ہوں۔ (طبقات ابن سعد: ۵/۲۹۸، سیر اعلام النبلاء: ۵/۱۴۱)

موت کے لیے بالکل تیار ہونے کے بعد ایک ذمی سے قبر کے لیے زمین خریدی۔ اس نے قیمت لینے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ میرے لیے یہ بڑی سعادت اور خیر و برکت کا باعث ہے کہ آپ میری زمین میں دفن ہوں، لیکن آپ نے اس کے اس عذر کو قبول نہ کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ اسے زمین کی قیمت ادا کی۔

(طبقات ابن سعد: ۵/۲۹۹، البدایہ والنہایہ: ۹/۲۱۰، سیر اعلام النبلاء: ۵/۱۴۵)

پھر تجہیز و تکفین اور دفن کے بارہ میں کچھ ضروری وصیتیں کیں اور رسول اللہ ﷺ کے ناخن اور موئے مبارک جو ایک مسلمان کا نہایت قیمتی سرمایہ ہے، انھیں اپنے کفن میں رکھنے کی ہدایت اور وصیت فرمائی۔

(طبقات ابن سعد: ۵/۳۰۰، سیر اعلام النبلاء: ۵/۱۴۳)

جب روح کے قفس عنصری سے نکلنے کا وقت آیا تو اس وقت زبان پر یہ آیت تھی:

Marfat.com

”تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا فی الارض ولا فساداً والعاقبة للمتقين“

”یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو زمین میں نہ تو برتری چاہتے ہیں اور نہ فساد اور انجام کار متقین کے لیے ہے۔“

اسی آیت کی تلاوت کرتے کرتے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ آپ کی وفات جمعہ کے روز صحیح قول کی رو سے پوری چالیس سال کی عمر میں ۲۰ یا ۲۴ رجب سنہ ۱۰۱ھ میں واقع ہوئی۔ آپ کی نماز جنازہ آپ کے بعد آنے والے خلیفہ یزید بن عبدالملک نے پڑھائی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب (العقد الفرید:۴/۴۳۲) لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے اور ہمارے نزدیک یہی درست ہے کہ ان کی موت کا سبب کثرت خوف تھا اور کثرت خوف موت کے لیے زہر سے زیادہ قوی سبب ہے۔

(طبقات الشعرانی:۱/۳۳)

علماء نے لکھا ہے کہ جب خوف خداوندی انسان کی عادت بن جائے تو یہ تصور روحانی انقلاب اور حقیقی بیماری کا سبب بن سکتا ہے اور اگر اس کے ساتھ حساب و کتاب اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑے ہونے کا تصور بھی مل جائے تو یہ لامحالہ تیزی سے موت کو اپنی طرف کھینچ لاتا ہے اور آدمی جلد ہی قبر کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

آپ کی مدت خلافت دو سال اور چند ماہ ہے۔ اس مختصر زمانے کو لوگ بڑا طویل زمانہ شمار کرتے ہیں، کیونکہ اس زمانہ میں خلافت کی برکات ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں اور عدل و انصاف کی ہمہ گیری پوری مخلوق کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ایک شخص کا بیان ہے کہ ایک شخص ہمارے پاس بہت سا مال لے کر آتا اور کہتا کہ مال مستحق فقراء میں تقسیم کر دیں۔ مگر اس مال کو لینے والا کوئی نہ ہوتا۔ (یعنی کوئی مستحق صدقہ و خیرات نہ تھا) گویا کہ عمر رحمہ اللہ نے لوگوں کو مالدار بنا دیا تھا۔ صرف صدقہ فطر ہی مسلمانوں کے تمام فقراء اور مساکین کو کافی ہوتا تھا۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم:۶۹، ۱۲۸، سیرۃ ابن الجوزی:۸۵، ۸۷، العقد الفرید:۴/۴۳۶)

یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے صدقہ وصول کرنے کے لیے افریقہ بھیجا۔ میں نے صدقہ وصول کر کے وہاں فقراء اور مساکین تلاش کیے لیکن مجھے وہاں کوئی فقیر اور مسکین نہ ملا کہ اسے صدقہ دوں کیونکہ عمر رحمہ اللہ نے لوگوں کو مالدار بنا دیا تھا۔ آخر کار میں نے اس مال سے غلام خرید کر انھیں آزاد کر دیا اور ان کی ولاء مسلمانوں کو ملی۔

روایات میں ہے کہ جب آپ کی بیماری زور پکڑ گئی اور بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو گرجا کا پادری آپ کے پاس ہدیہ کے طور پر گرجا کے درختوں کے نئے پھل لایا۔ عمر رحمہ اللہ نے یہ پھل نہایت خوشی اور مسرت سے قبول کر لیے اور حکم فرمایا کہ پادری کو اس کی قیمت ادا کر دی جائے، لیکن پادری نے ان پھلوں کی قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے اس کو سمجھا بجھا کر قیمت لینے پر راضی کر لیا، چنانچہ اس نے قیمت لے لی، پھر سیدنا عمر رحمہ اللہ

Marfat.com

نے اس پادری سے کہا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس بیماری سے صحت یاب ہونے والا نہیں۔ آپ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر پادری کو سخت صدمہ ہوا اور اس کے دل میں رقت پیدا ہوگئی اور وہ رونے لگا۔ پھر سیدنا عمر رحمہ اللہ نے اس سے فرمایا: مجھے پتہ چلا ہے کہ اس گرجا کے ساتھ جو ملحقہ زمین ہے وہ تمھاری ملکیت ہے۔ اس زمین میں سے تم مجھے ایک سال کے لیے میری قبر کے لیے جگہ دے دو۔ جب ایک سال گزر جائے تو تمھیں اس زمین پر ہل چلانے کا اختیار ہے۔ مختصر یہ کہ اس پادری سے ایک قبر کی جگہ کا سودا ہو گیا اور اس کی قیمت ادا کر دی گئی۔ قبر کی قیمت میں اختلاف ہے کتابوں میں دو دینار سے لے کر پچاس دینار تک آیا ہے۔

(مسالک الابصار: ۳۵۳/۱، معجم البلدان: ۱۴۸/۴، العقد الفرید: ۴۲۷/۴)

عمر رحمہ اللہ گرجے میں ایک جگہ دفن ہوئے جو جگہ انھوں نے خریدی تھی۔ آپ کی قبر پر مسلمہ بن عبدالملک نے کھڑے ہو کر فرمایا: "بخدا! آپ کی طبیعت میں ہمیشہ نرمی اور بردباری ہی رہی حتیٰ کہ آپ نے یہ قبر دیکھ لی۔ آپ کے دفن پر ایک سال گزر گیا اور امیر المومنین کے قول کے مطابق پادری کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ آپ کی قبر کو برابر کر کے اس زمین پر کاشت شروع کر دے لیکن اس نے آپ کی قبر کو زمین کے ساتھ برابر نہ کیا بلکہ اس کی حفاظت کی اور اس کے راستے کو شاندار بنا دیا تا کہ لوگ آپ کی قبر کی زیارت کے لیے آتے رہیں اور آپ کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہیں اور آپ کی خاک قبر کو اپنے آنسوؤں سے بھگوتے رہیں۔ چنانچہ لوگ اکثر ان کی قبر کی زیارت کے لیے جاتے بلکہ لوگ ان کی قبر کی زیارت پر فریفتہ تھے۔ ہشام بن الغاز بیان کرتے ہیں کہ ہم وابق سے واپس آتے ہوئے ایک منزل پر ٹھہرے۔ جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو مکحول ہمیں بتائے بغیر ہم سے غائب ہو گئے۔ جب ہم بہت دور نکل گئے تو ہم نے انھیں آتے دیکھا۔ ہم نے پوچھا: کہاں گئے تھے۔ جواب دیا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی قبر پر گیا تھا۔ وہ یہاں سے پانچ میل دور ہے اور آپ کے لیے دعا کر کے آیا ہوں۔ پھر فرمایا: اگر میں قسم کھاؤں تو اپنی قسم میں حانث نہیں ہوں گا کہ آپ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ اور اس زمانہ میں ان سے زیادہ اور کوئی پارسا نہ تھا۔ (سیرۃ ابن الجوزی: ۲۹، فتوح واخبار مصر ۲۵۳)

یہ قبر ایک طویل مدت تک باقی رہی اور لوگ اس پر آ کر دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ اور دوسری تمام قبروں سے زیادہ اس کا احترام کیا جاتا حتیٰ کہ عباسیہ کے دور میں بھی ان کی قبر باقی رہی جب کہ انھوں نے تمام بنو امیہ کی قبریں اکھاڑ کر ان کی لاشیں نکالیں اور پھر ان کو کوڑے مارے اور نذر آتش کر دیا۔ چنانچہ تمام مشہور قبروں کے آثار فنا ہو گئے لیکن عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی قبر ان حالات میں بھی سر افتخار بلند کر کے کھڑی رہی اور سال ہا سال تک باقی رہی۔ پھر مشرق پر جو تباہی آئی تو یہ گرجا بھی مٹ گیا اور قبر کے نشانات بھی نذر فنا ہو گئے اور اس پہ لوگوں کا آنا جانا بند ہو گیا وگرنہ اس سے پہلے ہر مقیم و مسافر ان کی قبر کی زیارت کے لیے آتا تھا۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد: ۳۷۱/۵، البدایہ والنہایہ: ۲۱۰/۹، سیر اعلام النبلاء: ۱۴۲/۵، تہذیب الکمال: ۴۴۱/۲۱، تاریخ العرب المطول: ۲۸۹، ۳۵۷، تاریخ مدینہ دمشق: ۱۵/۲ لابن عساکر وغیرہ)

Marfat.com

امام حسن بصری رحمہ اللہ کو جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو فرمایا!

"مات خير الناس"

''یعنی موجودہ زمانے کا بہترین انسان فوت ہو گیا۔'' (تہذیب الکمال: ۲۱/۴۴۳)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح ۲۹ ماہ حکومت کی۔ (ایضاً)

ازواج واولاد:

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے چار شادیاں کیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) فاطمہ بنت عبدالملک بن مروان، ان سے تین لڑکے اسحاق، یعقوب اور موسیٰ پیدا ہوئے۔

(۲) لمیس بنت علی، ان سے دو لڑکے عبداللہ، بکر اور ایک لڑکی ام عمار پیدا ہوئیں۔

(۳) ام ولید سے نو اولادیں ہوئیں، عبدالملک، ولید، عاصم، یزید، عبداللہ، عبدالعزیز، زبانہ امتہ اور ام عبداللہ پیدا ہوئے۔

(۴) ام عثمان بنت شعیب، ان سے ایک لڑکا ابراہیم پیدا ہوا۔

ان اولادوں میں سے آپ کا صاحبزادہ عبدالملک تو پہلے ہی وفات پا گیا اور عبداللہ اور عبدالعزیز عراق اور حرمین کے گورنر رہے۔ یہ سب آپس میں علاتی بھائی تھے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عبدالملک آپ کا سب سے اجل بیٹا تھا جو آپ کے عہد خلافت ہی میں انتقال کر گیا اور یہ اپنے باپ سے بھی زیادہ نیک اور زاہد و پارسا تھا۔ جب وہ انتقال کر گیا تو آپ نے اس کی وفات پر کوئی حزن و غم نہیں کیا بلکہ فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا تو میں اس بات کو کیوں ناپسند کروں۔'' (البدایہ والنہایہ: ۹/۲۰۸)

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بارہ بیٹے تھے، لیکن ان میں عبدالملک سب سے زیادہ پاک باز اور نیک تھا۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ بھی اس کی بڑی قدر کرتے تھے عبدالملک اپنے والد کے دوش بدوش سرگرم عمل رہتے تھے حتیٰ کہ مغصوبہ معاملات میں ان کی رائے کو بڑی ترجیح دی جاتی تھی۔ میمون بن مہران بیان کرتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مجھے، مکحول اور قلابہ کو بلا بھیجا اور کہا: ''تم لوگ ان مالوں کے بارہ میں جو لوگوں سے ظلماً چھینے گئے ہیں، کیا کہتے ہو؟'' مکحول نے جو رائے پیش کی اسے عمر رحمہ اللہ نے پسند نہ کیا۔ ''انھوں نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ آئندہ احتیاط برتی جائے اور سابقہ مالوں کو بحال رکھیں۔'' میں نے عرض کی: ''امیر المومنین! آپ اپنے صاحبزادے عبدالملک کو بلا لیں کیونکہ وہ بھی نہایت اہل ہیں اور ہم سے کم نہیں ہیں۔ عبدالملک حدیث وفقہ پڑھ چکے ہیں اور اب ان کا شمار فقہائے مدینہ کے صف اول کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ جب آپ آ گئے تو آپ نے ان سے بھی یہی سوال کیا۔ عبدالملک نے جواب دیا کہ میرے خیال میں تو آپ انھیں حق داروں کو واپس کر

Marfat.com

دیں۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو غاصبوں کے اس غصب میں آپ بھی شریک سمجھے جائیں گے۔

عبدالملک نے بچپن ہی میں اپنے والد سے زیادہ اپنے نفس پر قابو پالیا تھا حالانکہ عمر رحمہ اللہ خلیفہ تھے اور کہولت کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ بعض حضرات کا بیان ہے کہ ایک روز عمر رحمہ اللہ کو سخت غصہ آیا۔ پھر جب آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو آپ سے عبدالملک نے کہا: ''امیر المومنین! کیا اللہ کی رحمتوں کی اور اس کی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلند مقام عطا فرمایا ہے اور آپ کو اپنے بندوں کا امیر بنایا ہے، یہی قدرومنزلت ہے کہ آپ کو اتنا شدید غصہ آئے جو اس وقت میرے مشاہدے میں آیا ہے۔ سیدنا عمر رحمہ اللہ نے فرمایا: بیٹا! تم نے کیا کہا؟ ذرا پھر دہراؤ۔ عبدالملک نے اپنی بات دہرائی۔ عمر رحمہ اللہ نے کہا: ''عبدالملک! کیا تم کو غصہ نہیں آتا؟'' جواب دیا کہ میرا پیٹ میرے کس کام آئے گا اگر میں اس میں غصہ نہ لوٹا دوں، حتیٰ کہ ذرا سا غصہ بھی ظاہر نہ ہونے دوں''؟

حقیقت یہ ہے کہ عمر رحمہ اللہ کی پاکیزہ فطرت کی وجہ سے عدل و انصاف کی محبت نے ان کے دل میں جڑیں پھیلا دی تھیں اور یہ بات آپ کو اپنے نانا سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ورثہ میں ملی تھی۔ اس بارہ میں کچھ اور بھی محرکات تھے۔ ان سب نے آپ کو گھیر لیا تھا اور آپ کو اس راہ پر مجبور کر دیا تھا کہ آپ عدل و انصاف کے لیے وہ کارنامے انجام دیں جو آپ سے پہلے انجام نہیں دیے گئے تھے۔ ان محرکات میں جو آپ کے ماحول میں پیدا ہو کر پروان چڑھ رہے تھے۔ سب سے قوی محرک آپ کا فرزند اور صاحبزادہ عبدالملک تھا۔ عبدالملک اس وقت پیدا ہوا جب فتنوں کی آندھی تیز چل رہی تھی۔ اس لیے اسے قدرتی طور پر آندھیوں میں جم کر کھڑا ہونا پڑا۔ عبدالملک تاریخ اسلامی کا ایک عجوبہ ہے۔ اس کی عمر ابھی بیس سال بھی نہ ہوئی تھی کہ اسے فتنوں کی تیز اور تند آندھیوں سے دوچار ہونا پڑا، لیکن چونکہ بچپن ہی سے آپ کے ایمان میں پختگی اور استحکام تھا جیسے کہ ایک نبی کے حواری میں ہوتا ہے۔ یہ پارسا اور نیک دل نوجوان اپنے والد کی مجلس میں رات کو اور دوپہر کو ان کے سونے کے کمرے میں اٹھتا بیٹھتا تھا اور ہر وقت عدل و انصاف او دوسرے دینی کاموں کے لیے جھنجھوڑتا رہتا تھا۔ لوگوں کے مظالم رفع کرنے اور ان کے حقوق دلانے میں ہر وقت اپنے باپ کو ابھارتا رہتا اور ان کو موت کی یاد اور جہنم کی یاد دلاتا رہتا۔ اور سیدنا عمر رحمہ اللہ جب کبھی نرم پڑ جاتے تو عبدالملک گرم ہو جاتے اور اگر کبھی سیدنا عمر رحمہ اللہ ان کے کاموں میں سرگرم ہو جاتے تو عبدالملک اس سرگرمی میں باپ کا پورا پورا ساتھ دیتے۔ (سیرۃ ابن جوزی: ۲۵۸) بعض شامی جنھوں نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی دونوں حالتوں کو دیکھا تھا یعنی قبل از خلافت حالت کو بھی اور بعد از خلافت حالت کو بھی، کہتے ہیں کہ ہمارے خیال میں عمر رحمہ اللہ کو عبادت اور نیکی کے ان کاموں میں ان حالات ہی نے داخل کیا جو حالات انھوں نے اپنے صاحبزادے عبدالملک سے دیکھے تھے۔ (صفۃ الصفوۃ: ۲/۲: ۷، النجوم الزاہرہ: ۱/۲۴۳)

ایک روز عبدالملک نے اپنے والد کو کچھ پریشان حالت میں دیکھ کر کہا: آپ کو عدل و انصاف کو نافذ کرنے سے کیا شے مانع ہے؟ بخدا! اگر مجھے اور آپ کو ابلتی ہوئی دیگوں میں ڈال دیا جائے تو مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔ ہم حق کی خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہیں۔ بیٹے کی یہ بات سن کر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے

Marfat.com

فرمایا: جان پدر! میں سرکش اونٹ کی طرح دنیا کو قابو میں کر رہا ہوں۔ میں عدل و انصاف اور رواداری کے تمام طریقے زندہ کرنا چاہتا ہوں، لیکن یہ کام آہستہ آہستہ کر رہا ہوں تاکہ میں بھی دنیا کے طمع اور حرص سے نکل جاؤں اور مجھے دیکھ کر لوگوں کو دنیا سے نفرت ہو جائے اور انھیں اطمینان نصیب ہو۔

بعض روایات میں ہے کہ جب عمر رحمہ اللہ سلیمان کو دفن کر کے فارغ ہوئے اور تمام مغصوبہ جائیدادیں بیت المال میں جمع کر دیں اور تمام خانگی سامان وغیرہ فروخت کر چکے، لونڈیوں کو آزاد کر چکے اور تمام رات نہ سو سکے۔ پھر صبح کو ظہر تک یہی کام انجام دیتے رہے اور ظہر کی نماز پڑھ کر آرام کرنا چاہا تو آپ کے صاحبزادے عبدالملک آپ کے پاس آئے اور پوچھا: ''امیر المومنین! اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' آپ نے جواب دیا ''جان پدر! اب میں ذرا سا سو کر آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' پوچھا ''ابا جان! کیا آپ مغصوبہ جائیدادوں اور زمینوں کو واپس دلائے بغیر سونا چاہتے ہیں؟'' فرمایا: میرے پیارے بچے! کل رات میں تمھارے چچا جان کی تجہیز و تدفین کے سلسلہ میں تمام رات جاگتا رہا، اب میں تھوڑی دیر سونے کے بعد باقی کام انجام دوں گا کیونکہ اب مجھ پر نیند کا غلبہ ہے۔ عبدالملک نے کہا ''امیر المومنین! کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ سو کر اٹھیں گے؟ مستقبل میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی زندگی کا بھروسہ نہیں۔'' عمر رحمہ اللہ نے کہا ''جان پدر! ذرا میرے قریب آؤ'' عبدالملک باپ کے قریب گئے تو باپ نے انھیں گلے لگا لیا، پیشانی اور سر منہ کو چوما اور حق تعالیٰ شانہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اتنا نیک اور صالح بیٹا جوان کی دین پر اعانت کرتا ہے، عطا فرمایا ہے۔ بیٹے کی یہ بات سن کر ہی آپ باہر گئے اور بالکل آرام نہیں فرمایا اور منادی کرا دی کہ جس کسی پر کسی قسم کا کوئی ظلم ہوا ہو وہ امیر المومنین کے سامنے آ کر بیان کرے۔

اسی عبدالملک کا ایک اور واقعہ کتابوں میں منقول ہے کہ ایک روز عبدالملک اپنے والد کے پاس آئے۔ دیکھا کہ عمر رحمہ اللہ اپنے چچا زاد بھائی مسلمہ کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے والد عمر رحمہ اللہ کو تنہائی میں بلایا تاکہ کچھ کہا جا سکے۔ عمر رحمہ اللہ نے پوچھا کیا کوئی راز کی بات ہے جو تو نے مجھے تنہائی میں بلایا۔ عبدالملک نے کہا ''ہاں، مسلمہ کھڑے ہو گئے اور آپ اپنے والد کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ گئے اور کہا ''امیر المومنین! کل قیامت کے روز آپ اپنے رب کو کیا جواب دیں گے جب وہ آپ سے پوچھے گا عمر! تو نے بدعت دیکھی تھی لیکن اسے مٹانے کی کوشش نہیں کی تھی یا تو نے مردہ سنت کو زندہ کرنے کی کوئی جدوجہد نہ کی تھی''؟ ''جان پدر! کیا اس نصیحت پر تم کو کسی شے نے آمادہ کیا ہے یا تم یہ بات اپنے دل سے کہہ رہے ہو؟'' عبدالملک نے کہا ''نہیں نہیں بخدا! یہ بات میں اپنے دل سے کہہ رہا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو روز قیامت اس کے بارہ میں پوچھا جائے گا، لیکن آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ سیدنا عمر رحمہ اللہ نے فرمایا ''لخت جگر! اللہ تعالیٰ تمھیں بہترین جزائے خیر عطا فرمائے اور تم پر اپنی رحمتیں نچھاور کرے، تم نیکی اور صلاح کے لیے میرے بہترین معاون ثابت ہو گے۔ بیٹا! یاد رکھو، تمھاری قوم نے خلافت میں بے شمار گانٹھیں لگا دی ہیں اور بڑی مشکلات پیدا

Marfat.com

کردی ہیں اور ظلم کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم بنا دی ہیں اور جب میں ان کے مغصوبہ اموال اور مقبوضات واپس لینے کے لیے جھگڑتا ہوں تو مجھے ایسی پھوٹ اور تفرقہ پڑ جانے کا ڈر رہتا ہے جس سے خون خرابہ کی نوبت آ جائے ، بخدا! میرے نزدیک دنیا کا فنا ہو جانا آسان ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا ایک قطرہ خون بھی نکلے۔ کیا تم اس پر راضی نہیں کہ کبھی تیرے باپ کو وہ مبارک دن نصیب ہوگا جس روز وہ بدعت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے گا اور تمام دنیا کو سنت کے انوار سے جگمگا دے گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ شانہ فیصلہ فرمائیں اور اللہ تعالیٰ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ (صفۃ الصفوۃ:۲/۲/۷)

سیدنا عمر رحمہ اللہ کا یہ سعادت مند اور نیک و پارسا بچہ جب اپنے اردگرد غیر شرعی ماحول دیکھتا اور صاحب اقتدار لوگوں کے مظالم کو مشاہدہ کرتا تو اندر ہی اندر کڑھتا۔ اس کی یہ کڑھن اس کو دبلا کرتی رہی حتی کہ وہ انتہائی لاغر اور کمزور ہو کر مرض الموت میں مبتلا ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۱۹ سال تھی جب کہ عام بچے اس عمر میں لہو و لعب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنی اس بیماری میں بھی خوش تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو اپنے اس بچے سے بے حد محبت تھی۔ وہ ان کی عیادت کے لیے جاتے اور پوچھتے: بیٹا تمھارا کیا حال ہے؟ عبدالملک اس خیال سے کہ میرے باپ کو صدمہ نہ ہو اپنا حال چھپاتے اور کہتے الحمد للہ! میں اچھا ہوں۔ لیکن عمر رحمہ اللہ مرض کو بھی دیکھ رہے تھے کہ جان لیوا ہے اور مریض کو بھی دیکھ رہے تھے کہ موت کے کنار پر پہنچا ہوا ہے اور آپ کو یہ بھی پتہ تھا کہ بیٹا اپنی موت سے خوش ہے، اس لیے ایک روز انھوں نے کہا: بیٹا! مجھ سے اپنی طبیعت کے بارہ میں صحیح صحیح بات کرو کیونکہ تمھارے بارہ میں مجھے تمھاری موت ہی زیادہ پیاری ہے۔ اب عبدالملک نے کہا: ''ابا! میں اپنے کو موت کی آغوش میں پاتا ہوں، لہٰذا آپ آخرت کے اجر کی وجہ سے صبر سے کام لیں کیونکہ آپ کے لیے اللہ کا اجر مجھ سے بہتر ہے۔ بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سن کر باپ کا دل بیٹھ گیا۔ پھر عمر رحمہ اللہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے کہ بیٹا: بخدا! میری میزان میں تمھارا ہونا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ تمھاری میزان میں میں ہوں، اور نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ ابھی وہ نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کے غلام مزاحم نے عبدالملک کی موت کی خبر دی۔ خبر سن کر عمر رحمہ اللہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

عبدالملک کے فوت ہونے کے بعد عمر رحمہ اللہ جب اس کی تجہیز و تکفین اور دفن سے فارغ ہوئے اور قبر کو ہموار کر چکے تو آپ اس کی قبر پر قبلہ رو کھڑے ہوئے اور آپ کے چاروں طرف لوگ کھڑے تھے، اس وقت آپ نے فرمایا: ''بیٹا! تم پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نچھاور کرے تمھاری پیدائش موجب مسرت تھی اور تمھاری اٹھان نیکیوں سے بھرپور تھی، مجھے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ میں تجھے آواز دوں اور تو میری آواز پر لبیک کہے یعنی مجھے تمھاری تھوڑی سی تکلیف بھی گوارا نہ تھی۔ آج مجھے تم کو اس جگہ رکھ کر جس جگہ تم کو اللہ تعالیٰ نے لوٹا دیا ہے، بے انتہا مسرت ہے اور تمھارے اجر و ثواب سے جو مجھے صلہ ملنے والا ہے۔ اس کی مجھے بہت توقع ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھارے گناہوں کو درگزر فرمائے اور تمھاری نیکیوں کا تمھیں بہترین بدلہ عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ تمھارے لیے

Marfat.com

دعا کرنے والے پر اپنا رحم فرمائے خواہ وہ دعا کرنے والا آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، حاضر ہو یا غائب یعنی جو بھی خلوص سے تمھارے لیے دعا کرے ہم اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہیں اور اس کے حکم کے آگے سرنگوں ہیں۔'' پھر جب عمر رحمہ اللہ اس کی قبر سے واپس آئے تو لوگوں کو اس کی وفات کا بڑا صدمہ تھا۔ پھر جب آپ اپنے گھر آئے تو لوگ تعزیت کرنے کے لیے آئے۔ آپ نے ان کے سامنے صبر کی تلقین کی اور فرمایا! جو چیز عبدالملک پر اتری اسے ہم بخوبی جانتے تھے۔ اور جب وہ واقع ہوگئی تو ہمارے لیے تو یہ شے اجنبی اور انوکھی نہ تھی۔ (البیان والتبیین: ۱۸۱/۲، العقد الفرید: ۲۳۸/۴، سیرۃ ابن عبدالحکم: ۱۱۶، صفۃ الصفوۃ: ۷۳/۲)

عبدالملک کی وفات نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو مظالم کے خلاف مستعد کر دیا۔ اب انھوں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ بنی امیہ کے غصب شدہ اموال اور مقبوضات وہ واپس دلا کر رہیں گے۔ مظالم کے خلاف سب سے پہلے غصہ کی آگ لگانے والے آپ کے غلام مزاحم تھے اور اس آگ کو بھڑکانے والے آپ کے صاحبزادے عبدالملک تھے۔ آپ نے اپنی اصلاحات جاری کرنے کا عزم کرلیا یہاں تک کہ پہرے داروں کو حکم دے دیا کہ اگر میں حق سے ادھر اُدھر ہٹوں تو فوراً مجھے روک دیا جائے اور اگر میں غلط کروں تو میری رہنمائی کرو۔ آپ نے اپنے حفاظتی دستہ کے افسر عمر بن مہاجر کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب تم مجھے حق سے ہٹا ہوا دیکھو تو میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ہلا کر کہو! ''عمر کیا کر رہے ہو؟'' (صفۃ الصفوۃ: ۹۲/۲) چنانچہ عمر بن مہاجر جہاں بھی عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو حق سے ہٹا ہوا پاتے بغیر کسی رو رعایت کے وہ آپ کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے اور اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک وہ حق پر نہ آ جاتے۔

Marfat.com

صورت وسیرت

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ نہایت شکیل اور باوجاہت تھے۔ رنگ گورا چٹا، چہرہ نازک اور کتابی، چہرے کے نقش باریک، جسم بھرا ہوا اور گداز و شاداب تھا اور آپ کو دیکھنے والا ٹھٹک کر رہ جاتا اور اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ آپ کے حسین چہرے سے نگاہ ہٹائے۔ (سیرۃ ابن عبدالحکم، شذرات الذہب: ۱۱۹/۱، سیرۃ ابن الجوزی: ۱۹۶) جب آپ خوشبودار تیل لگا کر کسی راستہ سے گزرتے تو راستہ میں خوشبو کی لپٹیں بکھر جاتیں اور پتہ چل جاتا کہ اس راستہ سے عمر رحمۃ اللہ گزرے ہیں۔ خوشبو میں اکثر عنبر کا استعمال کرتے اور وہ آپ کے ہاتھوں کو لگ جایا کرتا تھا۔

(سیرۃ ابن الحکم)

لوگ دھوبی کے دروازے پر آپ کے کپڑوں کا انتظار کیا کرتے تھے۔ پھر جب دھوبی کے پاس آپ اپنے کپڑے بھیجتے تھے تو لوگ دھوبی کے پاس جاتے اور انھیں اس بات پر زیادہ پیسے دیتے کہ وہ آپ کے کپڑوں کے بعد ان کے کپڑے دھوئے تاکہ اس عنبر و مشک سے ان کے کپڑے بھی معطر ہو جائیں جو ان کے کپڑوں سے اس پانی میں آجاتی۔ (کتاب الاغانی: ۱۵۰/۸) آپ کی چال بڑی ناز و ادا والی تھی۔ ان کی رفتار مدینہ کی دوشیزاؤں اور جوان لڑکیوں کو بہت پسند تھی۔ وہ اپنی چال کو ان کی چال میں ڈھالا کرتی تھیں۔

(سیرۃ ابن عبدالحکم: ۲۱)

عمر رحمۃ اللہ پٹے رکھا کرتے تھے اور تیل اور کنگھی سے سنوارتے تھے۔ انگلی میں ایک انگوٹھی ہوتی تھی جس کا نگینہ نہایت قیمتی ہوتا تھا۔ قیمتی چادریں اور بیش قیمت تہبند استعمال کرتے حتیٰ کہ ایک تہہ بند سو سو دینار کا ہوتا تھا۔ آپ کے نزدیک لباس طویل عرصہ گزرنے پر پرانا نہیں ہوتا تھا بلکہ پہننے کے بعد جب لوگ اس کو ایک مرتبہ دیکھ لیتے تو پرانا سمجھا جاتا تھا۔ (سیرۃ ابن جوزی: ۱۴۶)

عمر رحمۃ اللہ سے بنو امیہ کا کبر و غرور اور عیش و عشرت نمایاں طور پر ٹپکتی تھی۔ آپ اپنے غلاموں اور نوکروں کے جھرمٹ میں نکلا کرتے تھے۔ اگر آپ کے قیمتی تہہ بند کا کوئی حصہ جوتے میں اٹک جاتا تو اسے کھینچ کر پھاڑ دیتے تھے اور اسے جوتے سے جھک کر نکالنا اپنی کسر شان سمجھتے تھے اور اگر قیمتی چادر کا کوئی پلو کندھے سے سرک جاتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی خادم اسے اٹھا کر آپ کے پاس لے جاتا تو اسے ڈانٹ دیا کرتے

Marfat.com

تھے اور جوتا پھینک دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ لباس کے معاملہ میں نہایت غلو سے کام لیتے تھے۔

(سیرۃ ابن جوزی: ۱۵۰، سیرۃ ابن عبدالحکم ۲۱)

ان سب چیزوں کے باوجود آپ فطرتاً صالح اور سعید تھے۔ اس وجہ سے قبل از خلافت بھی آپ کا دامن اخلاق بالکل شفاف تھا۔ کبھی کسی پر کوئی زیادتی نہیں کی اور نہ کسی اخلاقی بیماری میں مبتلا ہوئے۔

(سیر اعلام النبلاء: ۱۱۵/۵)

ابتداء ہی سے نہایت رقیق القلب اور گوشہ گیر لیکن مرد میدان تھے۔ مسند خلافت پر بیٹھنے سے قبل خود فرماتے ہیں کہ مجھے عیش پرستی، لباس، میں غلو اور عطریات کو جو شوق تھا دوسرے خاندانوں میں کسی اور کو یہ نصیب نہیں ہوا (سیرۃ ابن جوزی: ۶۶) جو چادریں وہ اوڑھتے تھے وہ آٹھ آٹھ سو درہم سے کم قیمت کی نہ ہوتی تھیں۔

غرور وفخر کا انداز روز بروز بڑھتا رہا حتیٰ کہ بہت سے لوگوں نے آپ پر مغرور ہونے کا الزام تک لگا دیا اور ایک مرتبہ اس غلو پر آپ کو سزا بھی ملی۔ ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں ان کو چار سو درہم کی قیمت کا کپڑا سخت کھردرا اور کرخت معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر چشم فلک نے وہ وقت بھی دیکھا کہ چودہ درہم کا کپڑا بھی نہایت نرم اور ملیح معلوم ہونے لگا تھا۔ (تہذیب الاسماء جلد: ۲۰/۱)

خلیفہ منصور نے عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ کہا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ وہ بولے: اپنے مشاہدات میں یا سنی سنائی باتوں میں سے۔ کہا: اپنے مشاہدات میں سے۔ بولے: عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے گیارہ بیٹے چھوڑ کر انتقال فرمایا اور سترہ دینار چھوڑے۔ پانچ دینار تو تجہیز وتکفین پر خرچ ہوگئے اور دو دینار کی قبر خریدی گئی۔ باقی صرف دس دینار بچے اور ہر بچہ کو ایک پورا دینار بھی ورثہ میں نہ ملا اور ہشام بن عبدالملک فوت ہوئے تو ان کا ترکہ ان کی اولاد میں تقسیم ہوا تو ہر ایک کو دس دس لاکھ ملے۔ میں نے عمر رحمہ اللہ کی اولاد میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے اللہ کی راہ میں ایک دن میں سو گھوڑے دیے اور اولاد ہشام میں ایک شخص کو دیکھا کہ لوگ اسے صدقہ دیا کرتے تھے۔ (سیرۃ ابن جوزی: ۲۹۶)

بعض روایات میں ہے کہ نمک کی طرح عنبر ڈاڑھی پر چھڑکتے تھے۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز: ۱۵۱) اس سے ان کی خوشبو کے استعمال کا اندازہ فرمالیں۔ رجاء بن حیوۃ کا بیان ہے کہ آپ سب لوگوں سے زیادہ خوش لباس، خوش مزاج اور خوش کلام تھے۔ سب سے زیادہ معطر اور سب سے زیادہ تبختر کی چال چلنے والے تھے۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز: ۱۵۱)

لیکن جونہی مسند خلافت پر قدم رکھا، دل کی دنیا تبدیل ہوگئی، دفعتاً زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ دنیا سے یک قلم دامن جھاڑ لیا۔ ساری املاک بیت المال کو واپس کردیں۔ لونڈی غلام، فرش فروش، لباس و عطریات اور عیش وعشرت اور جمال وتجمل کے تمام سامانوں کو فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں داخل کردی۔ (تہذیب الاسماء: ۲۱/۱) بعض روایات میں ہے کہ بیت المال سے کوئی مشاہرہ نہ لیتے تھے اور بعض

Marfat.com

روایات میں ہے کہ چار سو دینار سالانہ ان کا وظیفہ تھا جن پر ان کی اور ان کے اہل وعیال کی گزران تھی۔ لباس بقدر ستر پوشی اور غذا بقدر لا یموت سے زیادہ نہ تھی۔ گویا عیش ونعم کی گود میں پرورش پانے والے عمر بن عبدالعزیز اب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کا قالب اختیار کر چکا تھا۔

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

آپ کی اس نیکی اور صالحیت کا یہ نتیجہ تھا کہ پورے ملک میں امن وامان اور خوش حالی تھی۔ موسیٰ ابن ایمن الراعی کہتے ہیں کہ وہ محمد بن عینیہ کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور حالت یہ تھی کہ شیر اور بکری اور دوسرے تمام جنگلی جانور ایک ہی جگہ ہوتے اور کوئی کسی پر حملہ آور نہ ہوتا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ بھیڑیا ایک بکری کو اٹھا کر لے گیا۔ یہ حالت دیکھ کر میں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب پتہ چلا تو واقعی اسی رات آپ کا انتقال ہوا تھا۔ (البدایہ والنہایہ:۹/۲۰۳) کرمان اور دوسرے کئی ایک مقامات پر بھی بکریوں کے شیروں کے ساتھ چرنے کے کئی ایک واقعات کتابوں میں مرقوم ہیں۔

آپ یہ دعا اکثر فرمایا کرتے تھے:

"اللهم ان عمر ليس باهل ان تناله رحمتك، ولكن رحمتك اهل ان تنال عمر" (البدایہ والنہایہ:۹/۲۰۳)

ترجمہ: ''اے اللہ! عمر اس قابل نہیں کہ تیری رحمت اس پر نچھاور ہو، البتہ تیری رحمت اس کی اہل ہے کہ عمر (جیسے گناہگار) کو اپنے دامن میں چھپالے۔''

Marfat.com

فضل وکمال

اس زمانہ کے جس قدر علوم تھے جیسے قرآن وحدیث اور فقہ وغیرہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو ان میں ید طولیٰ حاصل تھا اور اگر انھیں سیاسی حالات مسند خلافت پر نہ بٹھا دیتے تو وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑی مسند درس کی زینت ہوتے۔ علمی اعتبار سے ان کا شمار بڑے بڑے ائمہ میں سے ہوتا ہے۔ تمام علمائے حدیث نے ان کی جلالت اور ثقاہت علمی پر اتفاق کیا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب سیر اعلام النبلاء میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

"الامام الحافظ العلامة المتجهد العابد السيد".

امام، حافظ، علامہ مجتہد، عبادت گزار اور سردار (سیر اعلام النبلاء: ۱۱۴/۵)

اور تذکرۃ الحفاظ میں لکھا:

"كان فقيها عارفاً بالسنن، ثبتاً حجة، حافظاً قانتاً لله، اواهاً منيباً"

(تذکرۃ الحفاظ: ۱۰۵/۱)

"یعنی آپ فقیہ، مجتہد، عالم سنت، کبیر الشان، ثبت، حجت، حافظ الحدیث، اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار، نرم دل اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔" اور علامہ مزی نے لکھا ہے کہ

"الامام العادل والخليفة الصالح" "وكان من ائمة العدل واهل الدين والفضل"۔ (تہذیب الکمال: ۴۳۳/۲۱)

اور امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ "ان کی جلالت علمی، وفور علم، فضیلت، صلاح، زہد و ورع، عدل، شفقت علی المسلمین، حسن سیرت، اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان تھک جدوجہد کرنے والا، سنت نبوی اور آثار کا متبع اور خلفاء راشدین کی اقتداء میں سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء: ۱۷/۱)

اسماء الرجال کی کوئی کتاب کھول کر دیکھ لیں آپ کے فضل وکمال کو انہی لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے کتابوں میں یہ بھی ہے کہ بڑے بڑے باکمال لوگ جن کو لوگ اکابر امت کہتے ہیں، آپ کے علمی کمالات کے سامنے طفل دبستان معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ میمون بن مہران رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کے معاصر

Marfat.com

علماء آپ کے سامنے شاگرد معلوم ہوتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۰۶، تہذیب الکمال: ۲۱/۴۴۰، البدایہ والنہایہ: ۹/۱۹۴) اور ایک اور روایت ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ علماء کے معلم تھے۔

(طبقات ابن سعد: ۵/۲۷۱، البدایہ والنہایہ: ۹/۱۹۴)

آپ کے وفور علم کی یہ حالت تھی کہ جو علماء آپ کو تعلیم دینے کے لیے تشریف لاتے وہ خود ان سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ مجاہد تابعی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ان کو تعلیم دینے کے لیے گئے تھے لیکن کچھ روز کے بعد ہم خود اس سے علم حاصل کرنے لگے۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۰۶) ایک ایسا شخص جس نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے صحبت اٹھائی تھی وہ بیان کرتا ہے کہ ہم نے جب بھی علم کو تلاش کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ علم کے اصول و فروع کے تمام لوگوں سے زیادہ عالم ہیں۔ (البدایہ والنہایہ: ۹/۱۹۴)

تفسیر و حدیث:

اس زمانہ میں سب سے بڑا عالم اس کو سمجھا جاتا تھا جس کی حدیث و تفسیر اور فقہ میں نظر وسیع ہو۔ مشکلات قرآنی پر اس کو پورا عبور ہو اور حدیث کی ایک معتدبہ مقدار اس کے حافظہ میں محفوظ ہو۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ان سب باتوں میں مکمل مہارت رکھتے تھے۔ جہاں تک مشکلات قرآنی کا تعلق ہے۔ بڑے بڑے علمائے تفسیر اس بارہ میں آپ کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ حجاز و شام کے بعض علماء نے آپ کے صاحبزادے عبدالملک سے کہا کہ آپ کے والد ماجد سے قرآن حکیم کی اس آیت:

﴿انی لہم التناوش من مکان بعید﴾

''وہ دور سے کیونکر پا سکتے تھے۔''

کے بارہ میں پوچھو کہ اس سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے پوچھا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ اس سے مراد وہ توبہ ہے جس کی خواہش اس وقت کی جائے جس وقت انسان اس پر قادر نہ ہو۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۲۸)

اور حدیث کے بارہ میں تو حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا جا چکا ہے کہ حدیث اور سنت کے حافظ اور عارف تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۰۵، سیر اعلام النبلاء: ۵/۱۱۴) اور امام مالک رحمہ اللہ اور ابن عیینہ رحمہ اللہ نے آپ کو حدیث کے بارہ میں امام وقت کہا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۷/۴۸۹)

نووی رحمہ اللہ اور دوسرے کئی ایک علماء نے لکھا ہے کہ جتنی مرفوع احادیث آپ کے کوزہ ذہن میں محفوظ تھیں اتنی کسی اور تابعی اور آپ کے معاصر کے حافظہ میں نہ تھیں۔ چنانچہ ایوب سختیانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں جن جن حضرات سے ملا ہوں ان میں سے کسی شخص کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کرنے والا نہیں پایا جتنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو پایا۔ (تہذیب الاسماء: ۱/۱۸)

Marfat.com

تدوین حدیث:

حدیث کے باب میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تدوین حدیث ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ حدیث کی تدوین کا مناسب بندوبست نہ کرواتے تو حدیث نبوی کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا اور آج امت دین کی کئی باتوں کی تفصیل وتشریح سے محروم ہو جاتی۔

حدیث دین میں حجت ہے اور اس کی حجیت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کو محفوظ کیا جائے، اس کے مطالب کھلے رکھے جائیں تا کہ اس سے استنباط کے چشمے پھوٹیں اور اجتہاد کی راہیں کھلیں۔ علم کی حفاظت اگرچہ یادداشت سے بھی ہوتی ہے لیکن اس کی پوری حفاظت لکھے جانے ہی سے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے قرآن حکیم کو لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ قرآن حکیم کی تحریر نے حدیث کی تحریر کی فکر بھی پیدا کر دی۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہر مرحلہ، آپ کا ہر ارشاد اور آپ کی ہر ادا حدیث تھی تاہم نزول قرآن کے زمانہ میں اس بات کا اندیشہ تھا کہ تحریر حدیث کے اہتمام سے کہیں تحریر قرآن دب کر نہ رہ جائے اور نئے نئے اسلام میں داخل ہونے والے عرب کہیں قرآن اور حدیث کی تحریرات کو آپس میں خلط ملط نہ کر دیں۔ لہٰذا مصلحت وقت کا تقاضا تھا کہ نزول قرآن کے زمانہ تک حدیث کی تحریر پر عام حلقوں میں پابندی رہے۔ صرف انہی حضرات کو اجازت ہو جو ان حدود وفروق میں محتاط رہیں۔ چنانچہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے حدیث کے قانونی طور پر حجت ہونے کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ سے اس کی تحریر کی اجازت طلب کی اور آپ ﷺ نے ان کو اس کی اجازت دی بھی۔ چنانچہ ایک انصاری صحابی نے جب بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ میں حدیث سنتا ہوں مگر بھول جاتا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: "استعن بیمینک" اپنے ہاتھ سے مدد لو یعنی لکھ لیا کرو۔ (ترمذی: ۲/۱۰۷)

اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر ایک شخص ابو شاہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب اس نے آپ ﷺ کا بیان سنا تو عرض کی کہ مجھے لکھ دیجئے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: "اکتبوہ لابی شاہ" ابوشاہ کے لیے یہ باتیں لکھ دو۔ (بخاری: ۱/۲۲، ترمذی: ۲/۱۰۷) بعض روایات میں ہے کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی احادیث لکھتے رہے بلکہ لکھ کر بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کو سناتے بھی تھے۔ چنانچہ آپ کے ایک شاگرد سعید بن ہلال رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "ہم جب سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے زیادہ روایات پوچھتے تو وہ بیاضیں نکال لیتے اور فرماتے کہ یہ روایات ہیں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنیں۔ میں نے انھیں نہ صرف لکھا بلکہ آپ ﷺ کو پڑھ کر بھی سناتا رہا۔ (مستدرک حاکم: ۲، معرفۃ الصحابہ: ۳/۵۷۴)

حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ ﷺ نے تمام امت کو تبلیغ شریعت کے لیے ایک اصولی ہدایت فرمائی "فلیبلغ الشاھد الغائب" کہ ہر شاہد ان باتوں کو غائب تک پہنچائے۔ (بخاری: ۱/۲۲، مسلم: ۲/۶۰) اور ایک روایت میں ہے کہ میری ایک بات بھی یاد ہو تو اسے آگے پہنچانا۔ یہ پہنچانا زبانی، پیغامی، تحریری اور تعمیلی جس

Marfat.com

طرح بھی ہو سکے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ذمہ داری ٹھہرا۔ ایک اور روایت میں فرمایا: "حدثوا عنی" یعنی مجھ سے حدیث آگے پہنچاؤ۔ اس حکم کا تقاضا تھا کہ علم نبوی ہر طرح سے محفوظ رہے اور آگے پہنچتا رہے۔ (مسلم: ۴۱۴/۲)

آپ نے اس حکم پر عمل کرنے والوں کو دعا بھی دی کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش و خرم رکھے جو ہم سے کوئی شے سنے تو اسے آگے پہنچائے اور اس طرح پہنچائے جیسا اس نے سنا ہے۔ (مشکوٰۃ: ۳۵ رواہ الترمذی)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت عربوں میں زبانی یادداشتوں کا بہت رواج تھا۔ ان کے حافظے بہت مضبوط تھے لیکن یادداشت کا یہ طریق آخر کب تک چل سکتا تھا۔ ایک ایسے دین میں جس کو قیامت تک قائم رہنا تھا، زبانی حفظ و روایت کی کڑیاں کب تک ساتھ دے سکتی تھیں۔ چنانچہ حفظ و فکر کے اس دور کے جلدی بعد ضروری تھا کہ حدیث باقاعدہ مرتب اور مدون ہو۔ چنانچہ تابعین کے بعد علم حدیث باقاعدہ ترتیب و تدوین کی منزل میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اسلامی تہذیب عجمی ممالک میں پھیل چکی تھی اور یہی وہ تین دور تھے جن کے بارہ میں رسول اللہ ﷺ نے خیر اور بھلا ہونے کی شہادت دی تھی۔ گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین بہترین امت تھے۔ ان میں خیر غالب تھی۔ اس کے بعد افشا کذب کا دور شروع ہوا۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ "ثم یفشوا الکذب پھر جھوٹ پھیل جائے گا۔

تدوین حدیث کی ابتدائی صورت:

تدوین حدیث کی ابتدائی صورت بطور فن نہیں تھی بلکہ بطور یادداشت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے حدیث لکھنے کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ خود بھی بعض احکام لکھوائے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی احادیث کی کچھ یادداشتوں کو محفوظ کر رکھا تھا جیسے سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا صحیفہ صادقہ، صحیفہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، صحیفہ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ، صحیفہ جابر رضی اللہ عنہ، صحیفہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ، کتاب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، کتاب ابن عباس رضی اللہ عنہ، کتاب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ یہ سب صحیفے زمانہ صحابہ کے ہیں۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے عہد خلافت میں بعض ائمہ علم کو جو حدیث کی نقل و روایت میں زیادہ معروف تھے، تدوین حدیث کی طرف توجہ دلائی کہ وہ احادیث کو تحریری طور پر جمع کریں۔ چنانچہ بخاری میں ہے:

> "سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ابوبکر بن حزم رحمہ اللہ کو لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر نظر رکھیں اور انھیں لکھ لیں کیونکہ مجھے علم کے مٹ جانے اور علماء (حدیث) کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے سوا اور کسی روایت کو قبول نہ کرنا، اور چاہیے کہ تم علم پھیلاؤ اور بیٹھو یہاں تک کہ نہ جاننے والا جان لے، اس لیے کہ علم برباد نہیں ہوتا جب تک اسے مخفی نہ رکھا جائے۔" (بخاری: ۲۸/۱)

Marfat.com

علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ابوبکر بن حزم رحمہ اللہ نے آپ کے اس حکم کی تعمیل میں مجموعہ حدیث تدوین وترتیب دے لیا تھا لیکن ابھی وہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے پاس پہنچا نہ تھا کہ آپ کا انتقال ہوگیا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے امام زہری رحمہ اللہ کو بھی اس طرح کا ایک حکم دیا تھا اوران سے احادیث لکھوائی تھیں۔ آپ کے احکام پورے عالم اسلام میں پہنچے کہ جہاں جہاں احادیث ہوں انھیں جمع کرلیا جائے جو مجموعہ ہائے حدیث دمشق میں جمع ہوئے آپ نے ان کی نقول عالم اسلام کے تمام علاقوں میں بھجوادیں۔

حافظ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ نے آپ کے حکم سے جو احادیث لکھنی شروع کی تھیں، صالح بن کیسان رحمہ اللہ بھی ان احادیث کے لکھنے میں ان کے ساتھ شریک تھے۔ فرماتے ہیں:

''میں اور زہری اکٹھے تھے۔ ہم احادیث کی تلاش کرتے رہتے اور ہمارا اتفاق ہوا کہ ہم سنن لکھیں۔ سو ہم نے ہر چیز جو رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے سنی، لکھ ڈالی۔ پھر ہم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات لکھنے کا ارادہ کیا۔ میں نے کہا:

''میں نہیں لکھتا، یہ سنت نہیں ہیں۔ زہری رحمہ اللہ نے کہا یہ بھی سنت ہیں سوانھوں نے لکھیں میں نے نہ لکھیں۔ وہ کامیاب ہوئے اور میں ضائع ہوگیا۔ (مصنف عبدالرزاق: ۱۱/۲۵۸، شرح السنۃ: ۱/۱۴۵)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام صوبوں کے گورنروں کے نام آپ نے ایک فرمان لکھ کر بھیجا کہ احادیث کو مدون ومرتب کیا جائے۔ (فتح الباری: ۱/۱۷۴) اس فرمان کی تعمیل میں کئی علماء نے کام کیا اور احادیث مرتب کیں۔ سعد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ ہم کو عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے دفتروں کے دفتر احادیث لکھیں اور انھوں نے ان کی ایک ایک نقل پورے عالم اسلام میں بھیجی۔ (جامع بیان العلم: ۳۸)

عمر رحمہ اللہ غرائب قرآن کے بھی مفسر تھے اور فقیہ بھی، لہٰذا آپ کے زمانہ میں قرآن وحدیث اور علوم فقہ اسلامی حکومت کے اقصائے مشرق اور مغرب تک پہنچ گئے۔ افریقہ کے مغربی علاقوں میں بربری مسلمانوں میں علم کی یہ ابتدائی ترقی تھی۔ عمر رحمہ اللہ کی طرح کسی اور خلیفہ نے علم الشرائع کا ایک طرح اہتمام نہیں کیا۔ آپ سے پہلے حدیث وفقہ مستقل درسوں کے حلقوں میں ترقی کررہا تھا جو خلفاء کی طرف سے قائم تھے۔ (فجر الاسلام: ۲۲۱، ۲۴۸)

عمر رحمہ اللہ کے نزدیک صحیح علم وہ ہوتا تھا جو انسان کو قناعت کا درس دے۔ آپ اکثر فرماتے تھے: علم سیکھو کیونکہ علم مال دار کے لیے زینت ہے اور نادار کے لیے غیبی امداد۔ اگر آپ کسی شخص میں بقدر ضرورت علم نہ پاتے تو اس سے فرماتے: ''اگر ہوسکے تو عالم بنو ورنہ متعلم تو ضرور بنو، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو علماء اور طلباء سے محبت ہی رکھو اور اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو کم از کم ان سے بغض تو نہ رکھو۔'' (سیرۃ ابن عبدالحکم: ۱۳۷، ۱۷۹) آپ نے علماء کو لکھ بھیجا تھا کہ اپنے اپنے حلقہ میں علم کی نشرواشاعت کرتے رہیں کیونکہ سنتیں مٹادی گئی ہیں۔ چنانچہ ایک روز آپ نے خطبہ میں فرمایا: ''لوگو! طبیب سخت امراض کے لیے ہی بلایا جاتا ہے اور جہالت سے زیادہ سخت کوئی مرض نہیں اور گناہوں سے زیادہ گندا

Marfat.com

کوئی مرض نہیں اور موت سے زیادہ سنگین کوئی خوف نہیں۔'' (سیرۃ ابن جوزی: ۹۳، ۳۰۷، ۳۳۹)

دینی علوم کے ساتھ ساتھ آپ نے دنیوی علوم کی نشر واشاعت کا اہتمام بھی فرمایا خصوصاً علم طب کا جس کی ہر شخص کو ضرورت پڑتی ہے۔ عبدالملک بن ابجر کنانی ایک ماہر طبیب تھا اور اسکندریہ میں طب کا درس دیتا تھا۔ عمر رحمہ اللہ کو اس کے ساتھ رہنے اور علاج کرانے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ عمر رحمہ اللہ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا۔ مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد عمر رحمہ اللہ نے انطاکیہ اور حران وغیرہ میں علم طب کی نشر واشاعت میں اس سے مدد حاصل کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم طب اسلامی شہروں میں منتقل ہوا۔ عمر رحمہ اللہ کے حکم سے طب میں ماہر جو یا طبیب بصری اسرائیلی نے ایک کتاب تصنیف کی اور اسے لوگوں میں پڑھایا جانے لگا۔

(فجر الاسلام: ۱۶۳، التراث الیونانی فی الحضارۃ الاسلامیہ: ۴، لعبدالرحمن بدوی، تاریخ العرب المطول: ۲۳۵)

فقہ:

حدیث کے بعد فقہ کا درجہ ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس کی بہت زیادہ اشاعت کی۔ وجہ یہ ہے کہ فقہی مسائل سے ہر شخص کو ہر روز واسطہ پڑتا ہے اور آپ کے عہد خلافت میں اسلامی ریاست کی پہنائیوں میں بے شمار اضافہ ہو چکا تھا اور مختلف علاقوں میں نئے نئے مسائل پیدا ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے ان مسائل کے حل کے لیے آپ نے قرآن وحدیث سے مسائل کے استنباط کی مختلف تدابیر کیں۔ آپ سے قبل سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارہ میں کافی تگ وتاز کی۔ لہٰذا قرآن وحدیث سے مسائل کے استنباط کو بخوبی سمجھتے تھے۔ آپ نے خود اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے ان مسائل کو حل کیا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ علی الاطلاق امت کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔ (ازالۃ الخفاء: ۳/۹۶).

علامہ مزی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نہایت ثقہ اور فقیہ کامل اور علم وتقویٰ میں یگانہ روزگار تھے اور بے شمار احادیث روایت کیں۔ (تہذیب الکمال: ۲۱/۴۳۶) اسی فقہی ذہن کی وجہ سے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق آپ کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کامل مشابہت رکھتی تھی۔

(تہذیب الکمال: ۲۱/۴۴۴)

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی بقول حافظ ذہبی فقیہ اور مجتہد تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۱۰۵) انھوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ان تمام فیصلوں کو جو انھوں نے اپنے عہد خلافت میں کیے تھے اور ان مسائل کو جو قرآن وسنت سے انھوں نے استنباط کیے یا کروائے جمع کرایا اور ملک کے مختلف حصوں میں ان کی نقول بھیجیں۔

شاعری:

قرآن، حدیث اور فقہ کے بعد عربوں کو شاعری کے ساتھ ایک خاص لگن ہوتی تھی۔ اس وجہ سے ایک

Marfat.com

عرب ہونے کے ناطے آپ کا مذاق بھی شعروشاعری کے بارہ میں نہایت ستھرا اور پاکیزہ تھا۔ زمانہ جاہلیت میں شاعری میں بہت عیوب پائے جاتے تھے خصوصی طور پر شعراء تشبیب میں اور شعروں میں شریف عورتوں کا نام اعلانیہ لاکران سے اپنی محبت کا اظہار کرتے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس بات کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ اس وجہ سے آپ نے اسے حکماً بند کر دیا تھا کیونکہ اس سے ایک شریف عورت خواہ مخواہ بدنام ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آپ نے ہجوگوئی کو بھی جرم قرار دیا۔ جو چیزیں نفس میں کمزوری کے فتنوں کو جگاتی اور شیطانی وسوسوں کے تار ہلاتی ہیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں بھی ممنوع قرار دے دیا تھا کہ وہ انفرادی اور جماعتی زندگی پر برے اثرات ڈالتی ہیں۔ عمر ثانی کے زمانہ میں اشعار میں ان تمام ممنوعات کے باوجود یہ سب چیزیں دوبارہ شعروشاعری میں پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اپنی سعید فطرت کی وجہ سے اس مروجہ اور غیر پاکیزہ شاعری کو پسند نہیں فرماتے تھے البتہ اخلاق کو بلند کرنے والے اشعار آپ کو پسند تھے۔ آپ خود بہت کم اشعار کہتے تھے لیکن کبھی کبھی کہہ بھی لیتے۔ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے آپ کی سیرت میں آپ کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں۔

خطابت:

خطابت نہ صرف اس زمانہ میں بلکہ ہر زمانہ میں انسان کی ایک بہت بڑی فضیلت تصور کی جاتی ہے کیونکہ ایک خطیب اپنی خطابت سے نہ صرف انسانوں کی زندگی میں بلکہ ملکوں میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔ اگرچہ کتابوں میں آپ کے کئی موثر اور دل پذیر خطبات موجود ہیں اور ابن جوزی اور جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں آپ کے ایک دو خطبات نقل بھی کیے ہیں جو نہایت بلیغ ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ نے ایک خطیب کی حیثیت سے کوئی شہرت نہیں پائی ہے۔

عمر رحمہ اللہ غلط گفتگو کو ناپسند فرماتے تھے اور نہ ہی سخت کلامی آپ کو پسند تھی۔ فہم کلام کے لیے ان کا ذوق حساس اور لطیف تھا کیونکہ سیاسی اور اجتماعی مسائل سے آپ کو اکثر واسطہ رہتا تھا۔ آپ نہایت خوبصورت کلام فرماتے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے لیکن مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد آپ نے شعر کہنے چھوڑ دیئے تھے۔

(العمدۃ: ۱/۳۷ لابن رشیق)

آپ ایسے قول کو کچھ نہ سمجھتے تھے جس کی تصدیق عمل سے نہ ہو۔ بلاعمل کے کلام کرنے والے کو ایسا گناہ گار سمجھتے تھے جو کثرت سے گناہوں میں ملوث رہتا ہو۔ (طبری: ۳۲۴/۵) عمر رحمہ اللہ خود جب کلام فرماتے تھے تو آپ کی نیت میں خلوص اور دل میں صداقت ہوتی تھی، اس لیے لوگوں نے آپ سے سچی باتیں سنیں جو اس سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سنی تھیں۔ آپ جب قرآن پڑھتے تو لوگوں پر گریہ طاری ہو جاتا اور پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کے ساتھ مسجد کے در و دیوار بھی مصروف گریہ ہیں۔ ایک روز آپ نے عید کا خطبہ دیا جس میں کمال سوز و گداز تھا۔ آپ کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تمام لوگ مصروف گریہ ہو گئے۔ ابھی

Marfat.com

یہ خطبہ مکمل نہ ہوا تھا کہ آپ منبر پر سے نیچے اُتر آئے۔ رجاء نے کہا: ''امیر المومنین! آج آپ نے ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جس نے لوگوں کو رلا دیا۔ پھر سخت ضرورت کے وقت آپ خاموش ہو کر منبر سے نیچے اتر آئے۔'' فرمایا: ''رجاء! مجھے فخر و مباہات پسند نہیں۔'' (سیرۃ ابن جوزی: ۱۸۵، ۱۹۳، العقد الفرید: ۶۲/۱)

عمر رحمہ اللہ کا کوئی خطبہ، کوئی خط اور کوئی کلام خواہ وہ طویل ہو یا قصیر ایسا نہ تھا جو بلاغت سے مرصع نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے جملے حکمتوں کی جگہ استعمال ہوتے تھے۔ جیسے کہ

① اس شخص کی امید کا دامن وسیع نہیں ہونا چاہیے جسے یہ معلوم نہیں کہ وہ صبح کے بعد شام تک اور شام کے بعد صبح تک زندہ بھی رہے گا یا نہیں اور شاید صبح و شام کے درمیان موت اس کو اُچک لے۔

② اپنے دشمنوں سے جہاد کرنے کی طرح اپنی خواہشات سے بھی جہاد کرو۔

③ نعمتوں کو شکر سے اور علم کو لکھ کر مقید کر لو۔

④ لوگوں سے میل جول عقلوں کے لیے پیوند ہے۔

⑤ جس میں تین خوبیاں ہوں وہ ایک کامل انسان ہے جو غصہ میں حق سے باہر نہ ہو، رضا میں باطل پر نہ ہو اور قدرت پانے پر معاف کر دے اور بدلہ لینے سے باز رہے۔

عمر رحمہ اللہ کو حسن ادا میں بڑا کمال حاصل تھا اور جو شخص آپ کی باتیں سنتا وہ ٹھہر جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کا ایک خطبہ عدی بن فضیل نے سنا۔ یہ شخص فصاحت و بلاغت کلام کا بڑا مشتاق تھا۔ عدی مسافر تھا لیکن اس نے آپ کا جمعہ کا خطبہ سننے کے لیے ٹھہر جانا پسند کیا اور برابر ایک ماہ تک ٹھہرا رہا۔ وہ صرف آپ کے جمعہ کا خطبہ سننے کے انتظار میں رہتا تھا اور ٹھہرا بھی اسی غرض سے تھا۔ (الکامل للمبرد: ۹۱/۱)

آپ کے خطبات کے لیے ملاحظہ ہو۔ (کتاب البیان والتبیین: ۱۹۴/۱، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۲۴۰)

علماء کی قدر افزائی:

سیدنا عمر بن عبدالعزیز جونہی مسند خلافت پر تشریف فرما ہوئے تو حجاز و عراق اور عرب کے دوسرے علاقوں کے شعراء جن میں نصیب، جریر، فرزدق، احوص، کثیر اور اخطل وغیرہ خاص مقام کے حامل تھے۔ دربار کے دستور کے مطابق اپنے اپنے قصیدے لے کر بارگاہ خلافت میں پہنچے، کیونکہ آپ کے قبل کے خلفاء کی بزم طرب انہی شعراء و خطباء اور ادباء سے سجتی تھی۔ چنانچہ ان حضرات نے جب اذن باریابی طلب کیا تو انھیں اجازت باریابی نہ ملی، وہ دارالخلافہ میں کچھ عرصہ ٹھہرے بھی تاکہ کسی طریقہ سے دربار خلافت میں رسائی حاصل ہو جائے لیکن عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اب وہ عمر نہیں تھے جو محفل طرب و غنا سجاتے۔ یہاں تو دل کی دنیا تبدیل ہو چکی تھی۔ دین زندگی کا مقصد اصلی بن چکا تھا لہٰذا کسی صورت اور کسی قیمت پر شعراء اور ادباء کو دربار خلافت میں آنے کی اجازت نہ دی گئی۔ چنانچہ وہ مایوس ہو کر واپس اپنے اپنے علاقوں میں چلے گئے۔ ان شعراء کے بجائے

Marfat.com

اب علماء وفقہاء اور محدثین کو بلایا جانے لگا۔ کیونکہ دین کے یہی نمائندے تھے۔ آپ نے ان کی بہت قدر دانی اور عزت افزائی کی۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ بڑے بڑے علماء اور فقہاء کی آپ کے پاس بکثرت آمد ورفت تھی اور آپ ان کا بڑا احترام کرتے تھے حالانکہ دینی علوم میں آپ ان سے کم نہ تھے کیونکہ امام، فقیہ اور مجتہد وغیرہ کے القابات تو ان کے بارے میں کتابوں میں مرقوم ہیں۔

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ شعراء اور خطباء کی بارگاہ خلافت میں یہ کس مپرسی اور تباہ حالی کی حالت دیکھ کر ایک روز اس وقت کے مشہور شاعر جریر نے ایک ممتاز فقیہ کی وساطت سے سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو یہ اشعار لکھ کر بھیجے۔

"یاایها القاری المرخی عمامته هذازمانك انی قدمضی زمنی"

''اے وہ قاری جس کے عمامہ کا شملہ لٹک رہا ہے، اب یہ تیرا زمانہ ہے، میرا زمانہ تو گزر گیا۔''

"ابلغ خلیفتنا ان کنت لاقیه انی لدی الباب کا لمصفور فی قرن"

''میرا یہ پیغام ہمارے خلیفہ کو پہنچا دے اگر تیری اس سے ملاقات ہو کہ میں دروازہ پر بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔''

عون بن محمد نے سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے مل کر کہا کہ جریر سے میری عزت و آبرو بچائیے۔ آپ نے جریر کو بارگاہ خلافت میں اذن باریابی دیا۔ اس نے ایک قصیدہ پڑھا جس میں اہل مدینہ کے مصائب و آلام اور مشکلات و معضلات کا ذکر تھا۔ سیدنا عمر ثانی نے ان کے لیے غلہ اور نقد روپیہ بھیجا اور جریر سے پوچھا: تم کس جماعت کے ہو مہاجرین سے یا انصار سے، یا ان کے اعزاء واقرباء سے یا مجاہدین سے؟ اس نے کہا: میں ان میں سے کسی سے نہیں ہوں۔ فرمایا: پھر مسلمانوں کے مال میں سے تمھارا کیا حق ہے؟ اس نے کہا: ''اگر آپ میرے حق کو نہ روکیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں میرا حق مقرر فرمایا ہے۔ میں ابن سبیل (مسافر) ہوں۔ دور دراز سے سفر کر کے آپ کے دروازہ پر آ کر ٹھہرا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اچھا، اب جب کہ تم میرے پاس آ ہی گئے ہو تو میں اپنی جیب خاص سے تمھیں بیس درہم دیتا ہوں، یہ لے لو۔ اس حقیر رقم پر تم خواہ میری تعریف کرو یا مذمت، میری مدح کرو یا ہجو۔ جریر نے اس حقیر رقم کو بھی غنیمت سمجھ کر لے لیا اور باہر آ گیا۔ دوسرے شعراء نے جو اس کو بارگاہ خلافت سے باہر نکلتے دیکھا تو دوڑ کر پوچھا: ''کہو، ابوحزرہ! کیا رہا؟'' جریر نے جواب دیا: ''اپنا راستہ ناپو، یہ شخص شعراء کو نہیں بلکہ گداگروں کو دیتا ہے۔'' (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۱۶۷۔۱۶۸)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ قومی خزانہ کو قوم کی امانت تصور کرتے تھے۔ اور اپنی مدح سرائی میں صرف کرنا ایک خیانت سمجھتے تھے۔ شعراء کو داد و دہش دینے کے مقابلہ میں آپ علماء، فقہاء، قراء اور محدثین کی نہایت قدر افزائی فرماتے تھے اور انھیں دور دراز سے بلا کر اپنے خواص میں داخل فرماتے۔

(سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ۱۶۶)

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ مسند نشین خلافت ہونے کے بعد، سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، محمد بن کعب قرظی رجاء بن حیوہ، رباح بن عبیدہ وغیرہ آپ کے مشیر خاص اور دوسرے متعدد علماء آپ کے ہم جلیس تھے اور آپ ہر معاملہ میں ان سے مفید مشورے لیتے تھے۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز:۱۵۱، تہذیب الاسماء نووی:۱/۲۰) مدینہ والوں میں آپ کے بہترین مصاحب عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ تھے۔ یہ عمر رحمہ اللہ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے لیکن پھر بھی ان کی عظیم محبت آپ کے دل میں جوش مارتی رہتی تھی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے: ''بخدا! میں عبیداللہ کی ایک رات سرکاری خزانہ سے ایک ہزار دینار میں خرید لوں گا۔'' پوچھا گیا: ''امیر المومنین! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں جب کہ آپ سرکاری خزانہ کے بارہ میں نہایت محتاط ہیں؟'' فرمایا: تمھاری عقلیں کہاں گئیں: ''بخدا! میں ان کی رائے، خیر خواہی اور ہدایت سے بیت المال میں کروڑوں جمع کر دوں گا۔'' ایک مرتبہ فرمایا: ''اگر مجھے عبید اللہ کی ایک مجلس نصیب ہو جائے تو وہ مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہے۔''

(عیون الاخبار للدینوری:۳/۷، وفیات الاعیان:۲/۳۰۰)

دوسرے مصاحب آپ کے محمد بن کعب قرظی، مدنی و کوفی تھے جو نہایت متقی اور پارسا تھے۔ جلیل القدر اور ثقہ تھے اور علم و صلاح سے آراستہ تھے۔ (شذرات الذہب:۱/۱۳۶) آپ کے ایک اور دوست اور مصاحب حسن بصری رحمہ اللہ تھے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے آپ کو پر خلوص اور موثر نصیحتوں سے گرما رکھا تھا۔

(البیان والتبیین:۳/۶۶)

مختصر یہ کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے علماء کو اپنے قریب رکھا اور دوسرے لوگوں کو اپنے پاس نہیں آنے دیا۔ پہلے خلفاء کے پاس ہر قسم کے لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ لیکن جب عمر رحمہ اللہ مسند نشین خلافت ہوئے تو یہ فالتو قسم کے لوگ منتشر ہو گئے اور عمر رحمہ اللہ نے ان کو اپنے سے دور کر دیا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے ایک ایسے شخص کے بارہ میں آپ سے پوچھا جو عمر رحمہ اللہ کا مصاحب تھا اور پھر عمر رحمہ اللہ نے اسے اپنے سے الگ کر دیا تھا۔ عمر رحمہ اللہ نے اس کے بارہ میں فرمایا: ''ہم نے اسے اس طرح چھوڑ دیا ہے جیسے مہین دبیز اور منقش ریشم کو چھوڑ دیا ہے۔'' (سیرۃ ابن جوزی:۴۷) عمر رحمہ اللہ نے ان لوگوں کو الگ کر کے نہایت اچھا کیا کیونکہ واقعات و حالات کی کروٹیں بتاتی ہیں کہ لوگوں پر اور ان کی جائیدادوں اور جاگیروں پر سلاطین اور لوگوں کی لائی ہوئی مصیبتیں اکثر مصاحبوں ہی کی طرف سے آتی ہیں، لیکن علماء کو آپ نے اپنے قریب رکھا بلکہ اگر کسی نے ان سے تعاون نہیں کیا تو اس کا شکوہ کیا۔ چنانچہ آپ ایک شامی عالم سے یوں شکوہ کرتے ہیں کہ ''خیر و صلاح میں ہاتھ بٹانے والے حضرات مفقود ہو گئے ہیں لہٰذا مجھے آپ کی رائے سے مدد کی ضرورت ہے۔'' انھوں نے آپ کو جواب میں لکھا: ''مجھے آپ کے والا نامہ سے مسائل خلافت میں آپ کی الجھنوں کا اور مخلص خیر خواہوں کے نہ ملنے کا علم ہوا۔ دیکھئے آپ ایک ایسی دنیا کے خلیفہ ہیں جو بوسیدہ ہے اور جس میں پہلوں کے مٹے ہوئے کھنڈرات باقی ہیں۔ آج علماء خاموش اور جہلاء اپنی جہالتوں پر اڑے ہوئے ہیں، لہٰذا خبردار آپ مجرموں کے معاون نہ

Marfat.com

بنیں۔ (کتاب الخراج لابی یوسف:۱۱۴)

عمر رحمہ اللہ جب علم کی قدر کرتے تھے اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے آپ نے ہر قسم کے حکومتی ذرائع استعمال کیے تو قدرتی بات ہے کہ آپ علم پڑھنے اور پڑھانے والوں یعنی علماء اور طلباء کی بھی بڑی عزت اور احترام کیا کرتے تھے۔ ان سے اپنی مجالس میں مدد لیتے۔ پھر آپ نے بہت سے علماء کو علم کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لیے مقرر کر دیا تھا اور جو علماء اور طلباء قرآن و حدیث اور فقہ پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے ان کے بڑے بڑے وظائف مقرر فرما دیے تھے اور جو حضرات مساجد کی خدمت کرتے تھے ان کے لیے بیت المال سے سو سو دینار وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ نہ صرف دار الخلافہ میں بلکہ دوسرے شہروں کے گورنروں کو لکھا کہ جو لوگ علم دین کی خدمت کر رہے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ وظائف دیئے جائیں تاکہ وہ نہایت دل جمعی سے علم دین کی نشر و اشاعت کر سکیں۔ اس سلسلہ میں حمص کے گورنر کو بھی لکھا کہ قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت میں مشغول رہنے والے علماء کو غنی اور متمول بنا دیا جائے تاکہ وہ ضروریات زندگی سے مستغنی ہو کر قرآن و حدیث کے درس و تدریس میں مصروف رہیں۔ طلباء کے لیے بھاری وظیفے مقرر فرمائے۔ آپ نے جن حضرات کو تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا ان میں ایک یزید بن حبیب بھی تھے۔ آپ نے انھیں قاضی اور معلم بنا کر مصر بھیج دیا اور دیہاتی لوگوں میں علم فقہ کی نشر و اشاعت کے لیے یزید بن ابی مالک دمشقی اور حارث بن یمجد اشعری کو مقرر فرمایا تھا اور دونوں حضرات کے بھاری وظیفے مقرر فرما دیئے۔ یزید بن ابی مالک نے تو اپنا عہدہ اور وظیفہ قبول کر لیا تھا لیکن حارث نے اس دینی کام پر وظیفہ قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا تھا۔ عمر رحمہ اللہ نے انھیں لکھا کہ یزید نے جو کچھ کیا ہم اس میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں سمجھتے اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ حارث جیسے لوگ اس امت میں فراوانی سے پیدا کر دے۔ (طبقات ابن سعد:۲/۲۱۰ تاریخ العرب المطول:۳۲۳)

عمر رحمہ اللہ نے اپنے عہد خلافت میں معلمین اور قاضیوں کے لیے فراخی اور وسعت رزق کے دروازے کھول دیے لیکن اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے رزق کے دروازے تنگ کر دیے۔ چنانچہ ایک دن ابن ابی ذکریا نے آپ سے کہا: ''مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ اپنے ہر عامل کو تین سو دینار دیتے ہیں؟'' آپ نے فرمایا ہاں۔ انھوں نے کہا: ''امیر المومنین! آپ دوسروں کے مقابلہ میں مال کے زیادہ حق دار ہیں۔'' عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے کرتے سے اپنا ہاتھ نکال کر فرمایا: ''ابن ابی ذکریا! اس کی مال فے سے پرورش ہوئی ہے۔ اب میں اس کی طرف مال فے کا ایک پیسہ بھی نہ لوٹاؤں گا۔'' آپ کی نگاہ میں قاضی اور عامل کی تنخواہ کی یہ انتہائی حد نہ تھی بلکہ آپ نے اس سے بھی زیادہ تنخواہیں مقرر کی تھیں حتی کہ بعض لوگوں کو آپ نے دس لاکھ سالانہ بھی تنخواہ دی۔

(سیرۃ ابن جوزی:۷۴،۷۵،۱۰۳، سیرۃ ابن عبدالحکم:۴۳)

تعلیم میں معلم کا ایک بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی عادات اور اس کے طریقہ گفتگو کو طالب علم غیر شعوری طور پر اخذ کرتا ہے، اس لیے آپ معلمین کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ آپ

Marfat.com

کے نزدیک عربی اور عجمی معلم میں کوئی فرق نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے کچھ پارسی دیکھے جو علم نحو کا مطالعہ کر رہے تھے۔ آپ نے انھیں دیکھ کر فرمایا: تمھیں زبان کی اصلاح کرنی چاہیے کیونکہ سب سے پہلے تمھیں نے زبان کو بگاڑا تھا۔ آپ نے ارباب علم و دانش کو منتخب کر کے ملک کے دور دراز علاقوں میں تعلیم کے لیے بھیجا۔ ان میں سے اکثر نے انہی شہروں میں مستقل رہائش اختیار کر کے اپنا وطن بنالیا اور وہیں فوت ہوئے اور پھر ان کی اولاد وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ ان معلمین کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ روزانہ بچوں کو قرآن حکیم کا کچھ حصہ پڑھائیں۔ قرآن حکیم تجوید سے پڑھائیں تا کہ بچے صحیح مخرج ادا کر سکیں۔ مدرسوں سے چھٹی ہونے کے بعد تیر کمان کی مشق کریں اور ہدف پر اپنا نشانہ درست کریں اور روزانہ کم از کم سات تیر چلایا کریں اور پھر دوپہر کو گھر پر آرام کریں۔ (سیرۃ ابن جوزی: ۲۵۷) آپ علم کو زبانی پڑھانا ضروری نہیں سمجھتے تھے بلکہ آپ کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ علم لکھ لیا جائے تا کہ ایک تو وہ مضبوط و مستحکم ہو اور دوسرے وہ ضائع نہ ہو۔ (الکامل للمبرد: ۹۶)

Marfat.com

ذاتی حالات

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ عنفوان شباب میں اس زمانہ کی ہر قسم کے عیش و تنعم سے بھرپور زندگی گزاری لیکن خلافت کی گراں بار ذمہ داری کاندھوں پر پڑی تو زندگی کا تمام نقشہ ہی بدل گیا۔ اب عیش و تنعم کے بجائے زہد و تقشّف کی زندگی گزارنی شروع کردی۔ وہ شخص جس کا لباس دیکھنے والوں کی ایک نگاہ پڑنے ہی سے پرانا ہو جاتا تھا اور پھر اس کو دوبارہ پہننے کی نوبت نہیں آتی تھی اب اس کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑوں کا رہتا تھا اور اسی کو دھو دھو کر وہ پہنا کرتا تھا۔ مرض الموت میں ایک قمیض کے علاوہ دوسری قمیض نہ تھی کہ اس کو بدل کر دوسری پہنی جا سکے۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ آپ کی اہلیہ کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک نے آپ کی اہلیہ اور اپنی بہن فاطمہ سے کہا کہ آپ کی قمیض چونکہ میلی ہوگئی ہے۔ بڑے بڑے لوگ آپ کی عیادت کے لیے آتے ہیں، لہٰذا دوسری قمیض بدل دیں۔ وہ خاموش ہوگئیں اور نمناک آنکھوں سے بھائی سے کہا: خدا کی قسم! اس قمیض کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں ہے۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز: ۱۹۷، البدایہ والنہایہ: ۹) پھر جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ بھی پیوند لگے ہوئے تھے آپ کا کوئی کپڑا بھی ایسا نہ تھا جس کو پیوند نہ لگے ہوں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز: ۸۰)

آپ کے اہل و عیال بھی اسی تنگ دستی سے زندگی گزارتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی صاحبزادی کے پاس کپڑا نہ تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ فرش پھاڑ کر کرتہ بنا دیا جائے۔ اس واقعہ کی خبر جب آپ کی بہن کو ہوئی تو انھوں نے کپڑے کا ایک تھان بھجوا دیا اور منع کر دیا کہ عمر رحمۃ اللہ سے اب کپڑا نہ مانگنا (سیرت عمر بن عبدالعزیز: ۲۷۵) اسی طرح ایک مرتبہ آپ کے ایک صاحبزادے نے کپڑے مانگے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''میرے کپڑے خیار بن رباح کے پاس پڑے ہیں، ان سے جا کر لے لو۔ وہ ان کے پاس گئے انھوں نے گاڑھے کے کپڑے نکال کر دیئے۔ عبداللہ نے کہا ''یہ کپڑے ہمارے پہننے کے لائق نہیں ہیں۔'' خیار نے کہا ''میرے پاس تو امیر المومنین نے یہی کپڑے رکھے ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی کپڑے نہیں ہیں۔'' عبداللہ نے واپس جا کر اپنے ابا عمر بن عبدالعزیز سے بھی وہی کچھ کہا جو خیار سے کہا تھا۔ آپ نے جواب دیا: ''بیٹا! میرے پاس تو یہی ہیں''۔ یہ جواب سن کر وہ مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو آپ نے واپس بلا کر کہا ''اگر کپڑوں کے لیے اپنے وظیفہ سے پیشگی رقم لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ چنانچہ اسے سو درہم پیشگی وظیفہ کے دلوا دیئے اور جب وظیفہ تقسیم ہوا تو وہ رقم کاٹ لی

Marfat.com

گئی۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز:۲۷۳)

بعض روایات میں ہے کہ آپ عید الفطر سے ایک روز قبل حکومت کا کام کر رہے تھے کہ بیوی نے آ کر کہا"صبح عید ہے اور بچے نئے کپڑوں کی ضد کر رہے ہیں اور گھر میں ان کا کوئی نیا کپڑا نہیں ہے۔اہلیہ کی بات سن کر ایک پریشانی لاحق ہوگئی۔ بیت المال کے انچارج کو ایک رقعہ لکھا کہ اگر مجھے آئندہ ماہ کی تنخواہ پیشگی دے دیں تو میں نہایت ممنون ہوں گا۔ خازن نے رقعہ کی پشت پر لکھ بھیجا کہ اگر امیر المومنین آئندہ ماہ زندہ رہنے کی ضمانت دے دیں تو میں پیشگی تنخواہ دینے کو تیار ہوں، وگرنہ معذرت خواہ ہوں۔ جواب پڑھ کر اہلیہ سے فرمایا کہ رقم کا بندوبست نہیں ہوسکا۔لہٰذا پرانے کپڑوں کو دھولو اور کل بچے وہی دھلے ہوئے کپڑے پہن کر عید کریں گے۔

یہ تو لباس کا حال تھا۔ غذا کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ غذا نہایت معمولی اور سادہ ہوتی تھی۔ روٹی اور روغن زیتون یا پھر دال روٹی کھاتے تھے۔ (طبقات ابن سعد:۲۷۴/۵) جو خوراک آپ کی تھی وہی آپ کے غلاموں کی بھی تھی۔ ایک روز ایک غلام نے کہا۔ روز روز دال روٹی؟ آپ کی اہلیہ نے جواب دیا: امیر المومنین کی یہی غذا ہے۔ (سیرت:۱۵۲) پھر یہ غذا بھی کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔آپ کے غلاموں کا بیان ہے کہ جب سے آپ نے مسند خلافت پر قدم رنجہ فرمایا اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز:۲۵۴)

جب کبھی اچھی شے کھانے کی خواہش ہوتی تو وہ خواہش دل ہی میں گھٹ کر رہ جاتی کیونکہ اس کو پورا کرنے کی مقدرت نہ تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ انگور کھانے کو جی چاہا۔ اپنی اہلیہ سے پوچھا"تمھارے پاس ایک درہم ہے؟ میرا انگور کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔" انھوں نے جل بھن کر جواب دیا۔"آپ اچھے امیر المومنین ہیں کہ جیب میں ایک درہم بھی نہیں۔" فرمایا"یہ جہنم کی ہتھکڑیوں سے میرے لیے زیادہ آسان ہے۔"

(تاریخ الخلفاء سیوطی:۳۳۵،البدایہ والنہایہ:۲۰۲/۹)

خوف آخرت:

خلافت کا بار اٹھانے کے بعد تو سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا نقطہ نظر ہی بدل گیا تھا۔ ہر وقت آخرت آنکھوں کے سامنے اپنا خوف لیے کھڑے رہتی تھی۔ حکومت اور سلطنت کے بارہ میں تو یہ معمول ہوگیا تھا کہ راتوں کو تنہائی میں بیٹھ کر رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہتے۔ اسی حالت میں آنکھ اگر لگ جاتی تو جب بھی اٹھتے رونے کا مشغلہ جاری رہتا۔ اپنے جد امجد سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی طرح ہر وقت رعایا کی فکر رہتی کہ کہیں روز قیامت ان کے بارہ میں باز پرس نہ ہو جائے۔ بعض لوگ آپ کے اس گریہ و بکا پر انھیں ملازمت کرتے۔ آپ جواب میں انھیں فرماتے تم لوگ مجھے رونے پر ملامت کرتے ہو۔ یاد رکھو اگر فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جائے تو عمر رحمہ اللہ اس کے بدلہ میں پکڑا جائے گا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز:۱۹۲)

Marfat.com

یہی بات سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کئی مرتبہ فرمائی تھی کہ

"لو مات جمل ضیاعاً علیٰ شط الفرات فخشیت ان یسئلنی اللہ عنہ" (طبقات ابن سعد: ۳/۳۰۵)

"اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ بے سہارا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارہ میں مجھ سے جواب طلب کرے گا۔"

اور یہ بات تو آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

"اگر کسی نہر کے کنارے کوئی خارشتی بکری اس حال میں چھوڑ دی جائے کہ اسے علاج کے طور پر تیل کی مالش نہ کی جا سکے تو مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے اس کے بارہ میں جواب طلب کیا جائے گا۔" (البر المسبوک: ۱۷)

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی اسی طرح خوف آخرت سے ڈرتے تھے۔ اور اسی خوف سے راتوں اور دن کے وقت تنہائیوں میں روتے رہتے تھے۔ ایک روز ان کی اہلیہ نے پوچھا کہ اس رونے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے پہلے تو اس کو ٹالا، لیکن جب اس نے اصرار کیا اور کہا کہ میں اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہتی ہوں، اس وقت آپ نے بتایا کہ میں نے اپنے بارہ میں غور کیا تو پتہ چلا کہ میں اس امت کے سیاہ و سفید جملہ امور کا ذمہ دار ہوں۔ اس لیے جب میں بے کس و بے سہارا اور محتاج و فقیر، گم شدہ اور قیدی اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کو دیکھتا ہوں جو پوری مملکت اسلامیہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کی پوری ذمہ داری مجھ ناتواں کے کندھوں پر ہے اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ان کے بارہ میں قیامت کے روز مجھ سے پوچھے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق مجھ پر دعویٰ کریں گے۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی دلیل نہ پیش کر سکا تو مجھے خوف پیدا ہو جاتا ہے اور میرے آنسو نکل آتے ہیں۔ یہی شے ہے جو مجھے ہر وقت رلاتی رہتی ہے۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز: ۱۸۸)

ایک مرتبہ فاطمہ بنت عبدالملک سے آپ کی عبادت کے بارہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب میں فرمایا:

"اللہ کی قسم! آپ کثرت سے نمازیں اور روزے نہ رکھتے تھے لیکن میں نے عمر رحمہ اللہ سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ جب آپ کو بستر پر اللہ اور آخرت کا تصور آجاتا تو شدت خوف سے مرغ بسمل کی طرح تڑپا کرتے تھے حتیٰ کہ ہمیں محسوس ہوتا کہ شاید صبح تک آپ ختم ہو جائیں گے۔" (سیرت ابن عبدالحکم: ۴۷)

یزید بن حوشب کا بیان ہے کہ میں نے حسن بصری رحمہ اللہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے زیادہ کسی شخص کو قیامت سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاید جہنم انہی کے لیے بنائی گئی ہے۔

(طبقات ابن سعد: ۵/۲۹۴)

Marfat.com

ایک مرتبہ آپ نے ایک فوجی افسر سلیمان بن ابی کریمہ کو لکھا:

''اللہ تعالیٰ کی عظمت و خشیت کا سب سے زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جس کو اس نے اس آزمائش میں ڈالا جس میں، میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجھ سے زیادہ سخت حساب دینے والا اور اگر اس کی نافرمانی کروں تو مجھ سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں ہے۔ میں اپنی حالت سے سخت دل گرفتہ ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے یہ حالات مجھے ہلاک نہ کر دیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ تم جہاد فی سبیل اللہ کے لیے جانے والے ہو تو اے میرے بھائی! جب تم میدان جہاد میں پہنچ جاؤ تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ مجھے شہادت عطا فرمائے اس لیے کہ میری حالت نہایت سخت اور میرا خطرہ نہایت عظیم ہے۔'' (طبقات ابن سعد: ۲۹۲/۵۵)

ایک روز آپ کو خلافت سے پہلے کا اطمینان و فراغت کا زمانہ یاد آ گیا۔ آپ نے اہلیہ سے کہا ''ہمارا گزشتہ زمانہ کتنا راحت بخش اور خوش آئند تھا۔'' اہلیہ نے کہا: ''آج تو آپ کو اس زمانہ سے کہیں زیادہ اقتدار و اختیار حاصل ہے۔ اس وقت آپ صرف ایک صوبے کے حاکم تھے اور آج پوری مملکت اسلامیہ آپ کے زیر اقتدار ہے۔ کوئی شخص روک ٹوک کرنے والا نہیں۔'' اہلیہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر آپ نے بڑے پُر درد لہجے میں فرمایا: ''فاطمہ! تم صرف یہ دیکھ رہی ہو کہ میں ساری سلطنت کا فرماں روا ہوں۔ ذرا اس ذمہ داری کا بھی خیال کرو جو اس فرماں روائی کی وجہ سے میرے نازک کندھوں پر آن پڑی ہے۔'' میں آخرت کے خوف سے لرزہ براندام ہوتا ہوں۔'' ''انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم'' (اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو (اس کی پاداش میں) ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں) اس جواب میں ایسا درد اور سوز تھا کہ فاطمہ بھی بے اختیار رونے لگیں کہ ''اے اللہ! ان کو جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھیو۔''

ایک دفعہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے ساتھ سفر میں تھے۔ کچھ ساتھیوں کے سامان پیچھے رہ گئے، اس وجہ سے شاہی سواری پیچھے ٹھہر گئی۔ جن کے سامان روانہ ہو چکے تھے وہ آ رہے تھے۔ جن کے سامان روانہ نہیں ہوئے تھے ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ بس اتنی سی بات پر سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو آخرت یاد آ گئی اور آپ فرط تاثر سے رو پڑے۔ عبدالملک رحمہ اللہ نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا: ''کل قیامت کے روز بھی ایسا ہوگا۔ جس نے یہاں سے کچھ بھیجا ہوگا اسے تو وہاں مل جائے گا اور جس نے نہ بھیجا ہوگا وہ محروم رہے گا۔'' بس اسی فکر نے آپ کی دنیا تبدیل کر دی اور پھر موت تک آخرت کی یاد سامنے رہی۔

موت اور قبر:

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نہ صرف آخرت سے خوف کھاتے رہتے تھے بلکہ آخرت سے قبل قبر کی یاد بھی انھیں ہر وقت ستائے رکھتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک جنازہ کے ساتھ تشریف لے گئے۔ قبرستان میں پہنچ کر ایک طرف بیٹھ گئے اور کچھ سوچنے لگے۔ کسی شخص نے عرض کی ''امیر المومنین! آپ اس جنازہ کے ولی تھے، آپ ہی

Marfat.com

علیحدہ بیٹھ گئے؟" فرمایا: "ہاں مجھے ایک قبر نے آواز دی اور مجھ سے یوں کہا اے عمر! تو مجھ سے یہ نہیں پوچھتا کہ میں ان آنے والوں کے ساتھ کیا کیا سلوک کرتی ہوں؟" میں نے کہا "بتا کہ تو ان کے ساتھ کیا کرتی ہے؟"

قبر ہر ایک کو پکارتی ہے۔ ہر ایک کو سندیسہ دیتی ہے۔ ہر ایک کو ہر روز اپنے بارے میں بتاتی ہے۔ وہ نہایت فصیح اور صاف آواز کے ساتھ یہ اعلان کرتی ہے کہ اے آدم کے بیٹے تو مجھے بھول گیا، میں تنہائی کا گھر ہوں، میں اجنبیت کا گھر ہوں، میں دہشت کا گھر ہوں، میں کیڑوں کا گھر ہوں، میں نہایت تنگی کا گھر ہوں، مگر اس شخص کے لیے نہیں جس پر اللہ تعالیٰ مجھے وسیع بنا دے۔ لیکن ہم نے اس آواز کے لیے کانوں کو بہرا بنا لیا ہوا ہے۔ دنیا کی ریل پیل نے ہمیں اس آواز کو سننے کی فرصت ہی نہیں دی۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور ان جیسے کئی بزرگ اس آواز کو سنتے ہیں۔ چنانچہ جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے قبر سے پوچھا کہ بتا تو کیا کرتی ہے۔ اس نے جواب دیا:

"میں نئے آنے والوں کے کفن پھاڑ دیتی ہوں۔ بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہوں۔ خون سارا چوس لیتی ہوں، گوشت کھا لیتی ہوں اور بتاؤں کہ آدمی کے جوڑوں کے ساتھ کیا کرتی ہوں؟ مونڈھوں کو باہوں سے جدا کر دیتی ہوں اور سرینوں سے رانوں کو جدا کر دیتی ہوں اور رانوں کو گھٹنوں سے گھٹنوں کو پنڈلیوں سے اور پنڈلیوں کو پاؤں سے جدا کر دیتی ہوں۔" (البدایہ والنہایہ: ۹/۲۰۴)

یہ فرما کر سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ رونے لگے اور فرمایا:

"دنیا کا قیام بہت ہی تھوڑا ہے اور اس کا دھوکہ بہت زیادہ ہے۔ اس میں جو عزیز ہے وہ آخرت میں ذلیل ہے۔ اس میں جو دولت والا ہے وہ آخرت میں فقیر ہے۔ اس کا جوان بہت جلد بوڑھا ہو جائے گا۔ اس کا زندہ بہت جلد مر جائے گا۔ اس کا تمھاری طرف متوجہ ہونا تم کو دھوکہ میں ڈال دے حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ کتنی جلدی منہ پھیر لیتی ہے۔ اور بے وقوف وہ ہے جو اس کے دھوکہ میں پھنس جائے۔"

کہاں گئے اس کے وہ دلدادہ جنھوں نے بڑے بڑے شہر آباد کیے۔ بڑی بڑی نہریں نکالیں۔ بڑے بڑے باغ لگائے اور بہت تھوڑے دن رہ کر سب کو چھوڑ کر چل دیے۔ وہ اپنی صحت و تندرستی سے دھوکہ میں پڑے کہ صحت کے بہتر ہونے سے ان میں نشاط پیدا ہوا اور اس سے گناہوں میں مبتلا ہوئے۔ بخدا! وہ لوگ دنیا میں مال کی کثرت سے قابل رشک تھے باوجود یکہ مال کے کھانے میں ان کو رکاوٹیں پیش آتی تھیں مگر پھر بھی خوب کماتے تھے۔ ان پر لوگ حسد کرتے تھے لیکن وہ بے فکر ہو کر مال کو جمع کرتے رہتے تھے اور اس کو جمع کرنے میں ہر قسم کی تکلیف کو خوشی سے برداشت کرتے تھے لیکن اب دیکھ لو مٹی نے ان کے بدنوں کا کیا حال کر دیا ہے اور خاک نے ان کے بدنوں کیا بنا دیا ہے؟ کیڑوں نے ان کے جوڑوں کا کیا حال بنایا ہے؟ وہ لوگ دنیا میں اونچی اونچی مسہریوں میں اونچے اونچے فرش اور نرم نرم گدوں پر نوکروں اور خادموں کے درمیان آرام کرتے

Marfat.com

تھے۔ اعزاء و اقرباء، رشتہ دار اور پڑوسی ہر وقت دل داری کو تیار رہتے تھے، لیکن اب کیا ہو رہا ہے؟ ان سے آواز دے کر پوچھ لو کہ کیا گزر رہی ہے؟ غریب اور امیر سب ایک میدان میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے مال دار سے پوچھ کہ اس کے مال نے کہاں کام دیا؟ اس کے فقر سے پوچھ کہ اس کے فقر نے کیا نقصان کیا؟ کہاں ہیں ان کے وہ خیمے اور کمرے جن میں وہ آرام کرتے تھے؟ کہاں ہیں ان کے وہ مال اور خزانے جن کو جوڑ جوڑ کر رکھتے تھے۔ ان کے خدام نے ان کو قبر میں کھانے کے لیے کوئی توشہ بھی نہ دیا اور ان کی قبر میں کوئی بستر بھی نہ بچھایا، کوئی تکیہ بھی نہ دیا۔ زمین ہی پر ڈال دیا۔ آہ! اب وہ بالکل اکیلے پڑے ہیں۔ اندھیرے میں پڑے ہیں۔ ان کے لیے اب رات دن برابر ہیں۔ دوستوں سے مل نہیں سکتے اور کسی کو اپنے پاس بلا نہیں سکتے۔ کتنے نازک اندام مرد اور نازک اندام عورتیں، آج ان کے بدن بوسیدہ ہیں، ان کے اعضاء ایک دوسرے سے جدا ہیں، آنکھیں نکل کر منہ پر آ گئی ہیں، گردن جدا ہو گئی ہے۔ منہ میں پانی اور پیپ وغیرہ بھری ہوئی ہے اور سارے بدن میں کیڑے چل رہے ہیں۔ وہ اس حال میں ہیں کہ ان کی بیویوں نے دوسرے نکاح کر لیے اور وہ مزے اڑا رہی ہیں۔ بیٹوں نے مکانوں پر قبضہ کر لیا۔ وارثوں نے مال تقسیم کر لیا۔ مگر بعض خوش نصیب ایسے بھی ہیں جو اپنی قبروں میں بھی لذتیں اڑا رہے ہیں۔ تر و تازہ چہروں کے ساتھ راحت و آرام میں ہیں۔"

"اے انسان! اس دنیا کے ساتھ آخر کس شے نے تجھے دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ تجھے امید ہے کہ یہ کم بخت دنیا تیرے ساتھ رہے گی؟ کیا تجھے یہ امید ہے کہ اس کوچ کے گھر میں تو ہمیشہ رہے گا۔ تیرے یہ وسیع و عریض مکان، تیرے باغوں کے پکے ہوئے پھل، تیرے نرم و گداز بستر، تیرے گرمی و سردی کے جوڑے، یہ سب کے سب ایک دم رکھے رہ جائیں گے۔ جب ملک الموت آ کر مسلط ہو جائے گا تو تیری کوئی شے اس کو نہ ہٹا سکے گی۔ پیشانیوں پر پسینے آنے لگیں گے۔ پیاس کی شدت بڑھ جائے گی اور ان کی سختی میں تو کروٹیں بدلتا رہ جائے گا۔"

"افسوس صد افسوس! اے وہ شخص جو باپ کی آنکھ بند کر رہا ہے۔ آج مرتے وقت اپنے بھائی کی آنکھ بند کر رہا ہے۔ اپنے بیٹے کی آنکھ بند کر رہا ہے۔ ان میں سے کسی کو نہلا رہا ہے۔ کسی کو کفن دے رہا ہے۔ کسی کے جنازے کے ساتھ جا رہا ہے اور کسی کو گڑھے میں ڈال رہا ہے۔ کل کو تجھے بھی یہ سب کچھ پیش آنا ہے۔"

کہتے ہیں کہ قبرستان کے اس واقعہ کے بعد ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا انتقال ہو گیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

چھوٹے چھوٹے سلاطین کی بزم عیش و طرب میں موت اور قبر کے ذکر اور خوف کا گزر نہیں ہوتا لیکن اسلامی حکومت کے اتنے بڑے سربراہ مملکت کی مجلس "مجلس عزا" ہوتی تھی۔ رات کو علماء اکٹھے ہو کر موت اور عذاب قبر اور قیامت کے سوال و جواب کا تذکرہ کر کے اس طرح روتے جیسے ان کے سامنے جنازہ رکھا ہوا ہے۔

(تاریخ الخلفاء: ص ۲۴۷)

Marfat.com

ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمھارے باپ ایک غلطی کی وجہ سے جنت سے نکلے اور تمھارے رب نے توبہ پر جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وجہ سے تمھیں گناہوں سے احتراز کرنا چاہیے اور اپنے رب سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ لوگو! دنیا کی ایک مقرر مدت ہے جو ختم ہو جانے والی ہے اور دنیا ایک ایسی امید ہے جس میں دن بدن نقص پیدا ہو رہا ہے اور تم کو دنیا کے علاوہ ایک دوسرے گھر میں جانا ہے اور تم ناک کی سیدھ میں موت کی طرف جا رہے ہو۔ اللہ اس پر رحم فرمائے جو اپنے معاملہ پر غور و فکر کرتا رہے اور اپنے نفس کا خیر خواہ بن جائے اور اپنے اللہ کے قانون کا پابند ہو جائے اور اپنے گناہ معاف کرا لے اور اپنا دل روشن کر لے۔'' (الکامل للمبرد: ۲/۳۱۷)

رات رات بھر جاگ کر موت پر غور کیا کرتے تھے کہ یہ کس طرح تمام لذتوں کو ختم کر دیتی ہے اور قبر کی ہولناکیوں کا ذکر کر کے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے ہم جلیس سے فرمایا کہ میں تمام رات غور و فکر میں جاگتا رہا۔ اس نے پوچھا کس شے کے بارے میں؟ فرمایا: ''قبر اور اہل قبر کے متعلق۔ اگر تم مردے کو تین روز کے بعد قبر میں دیکھو تو انس و محبت کے باوجود اس کے پاس جاتے ہوئے خوف زدہ ہو جاؤ گے۔ پیپ بہہ رہی ہو گی اور اس میں کیڑے تیر رہے ہوں گے۔ بدبو پھیلی ہو گی۔ کفن بوسیدہ ہو چکا ہو گا۔'' یہ کہہ کر روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کی اہلیہ پانی چھڑک کر ہوش میں لائیں۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جس نے موت کو اکثر یاد کیا اور تھوڑی دنیا پر راضی ہو گیا وہ کامیاب ہے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۵/۱۳۳)

روایات میں ہے کہ آپ کو بچپن ہی سے موت کا خوف دامن گیر رہتا تھا۔ کم سنی میں بھی جب آپ کو موت کا خیال آتا تو زار و قطار رو پڑتے۔ ایک روز آپ کی والدہ کو پتہ چلا کہ آپ رو رہے ہیں اس وقت آپ قرآن حکیم کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ آپ کی والدہ نے رونے کا سبب معلوم کرایا تو پتہ چلا کہ آپ موت یاد آنے سے رو رہے ہیں۔ یہ سن کر والدہ بھی رونے لگی کیونکہ ان کو بھی موت یاد آ گئی اور اس لیے بھی کہ آپ کے بیٹے کو چھٹپنے ہی میں یہ خیال آیا ہے کہ موت سر پر کھڑی ہے۔ (سیرۃ ابن الجوزی: ص ۱۹) شاید اس وجہ سے آپ کو ہر وقت موت کا خوف رہتا تھا کہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے خاندانی خلفاء عبدالملک اور ولید اور سلیمان کو قبر میں اتارا تھا۔ ان کے ناز و نعمت میں پلے ہوئے جسموں پر اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی تھی۔ آپ اکثر خلوت میں رویا کرتے تھے اور آپ کی آہوں کی آواز سنائی دیتی تھی اور آپ فرمایا کرتے تھے: ان تینوں خلفاء کے (عبدالملک، ولید اور سلیمان) بعد جن کو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے مٹی میں چھپایا ہے۔ اس دفعہ میری باری ہے۔ ان تینوں کے علاوہ آپ نے اپنے بھائی سہیل، غلام مزاحم اور اپنے صاحب زادے عبدالملک کو بھی قبر کی آغوش میں اتارا تھا۔ لیکن ان موتوں کے مصائب سے آپ شکستہ خاطر نہیں ہوئے بلکہ ان موتوں نے آپ

Marfat.com

کے دل میں موت کے متعلق ایمان میں اضافہ کر دیا تھا اور آپ کو موت سے ایک قسم کی انسیت پیدا ہو گئی تھی اور اس کے ہر وقت منتظر رہنے لگے تھے۔ (سیرۃ ابن الجوزی: ص۱۸۳، ۱۹۱) موت سے انسیت کی وجہ سے آپ نے ہوس کا گرد و غبار جھاڑ دیا تھا۔ چونکہ آپ مصائب برداشت کرنے کے عادی بن گئے تھے اس لیے آپ نے اپنی ذاتی لذتوں اور خواہشوں کو عوام کو خوش حال اور فارغ البال بنانے کے لیے اور ان کے غصب شدہ حقوق ان کو واپس دلانے کے لیے قربان کر دیا تھا۔ آپ پر سوتے جاگتے ہر وقت ایمان ہی مستولی رہتا تھا۔ آپ کی نگاہ میں گوشۂ قبر محض ایک زیارت گاہ تھا جس کے بعد مرنے والا جلد ہی اپنے اصلی گھر (جنت یا جہنم) کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ آپ کے شباب کی تازگی کو ختم کرنے والی چیز قبرستان کی زیارت سے بڑھ کر اور کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ چنانچہ میمون بن مہران فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ کے ساتھ قبرستان گیا۔ آپ قبریں دیکھ کر رونے لگے۔ پھر آپ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا: یہ میرے خاندان کے بزرگوں کی قبریں ہیں۔ گویا انھوں نے دنیا میں عیش و آرام کیا ہی نہ تھا۔ ان پر بوسیدگی نے اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں اور ان کے جسموں میں کیڑے مکوڑے تیر گئے ہیں۔ پھر آپ دیر تک روتے رہے۔

ہم بھی روز تلاوت قرآن حکیم کرتے ہیں لیکن ہم پر اس کی تلاوت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ تلاوت کرتے تو ان آیات پر جن میں قیامت کا ذکر ہے، پڑھ کر تڑپ اٹھتے۔ چنانچہ ایک بار گھر والوں نے دیکھا کہ ان کی اہلیہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہیں۔ بھائیوں نے رونے کی وجہ پوچھی۔ کہا: رات میں نے امیر المؤمنین کو بڑی دل گداز حالت میں دیکھا۔ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ جب انھوں نے یہ آیت پڑھی کہ

﴿یوم یکون الناس کالفراش المبثوت، وتکون الجبال کالعھن المنفوش﴾

''جس روز انسان پراگندہ پتنگوں کی طرح ہو جائیں گے اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔''

تو چیخے پھر اچھلے اور اچھل کر اس طرح گرے کہ معلوم ہوا کہ دم توڑ رہے ہیں۔ پھر ایسے ساکن و ساکت ہوئے، میں سمجھی کہ دم نکل گیا ہے۔ ہوش میں آئے تو پھر نعرہ مارا۔ پھر اچھلے اور تمام گھر میں پھر پھر کر کہنے لگے: ''ہائے وہ دن جس روز انسان پراگندہ پتنگوں کی طرح اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔'' پھر گرے اور ایسی حالت ہو گئی کہ میں نے سمجھا کہ کام تمام ہو گیا۔ یہاں تک کہ مؤذن نے اذان دی تو ہوش میں آئے۔ (سیرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ: ص۱۹۰)

توکل:

توکل ایک ایسا ملکہ ہے جو انسان کو ہر قسم کے خطرات سے بے پروا کر دیتا ہے۔ سیدنا عمر بن

Marfat.com

عبدالعزیز رحمۃ اللہ مجسم توکل تھے اور اس توکل اور اعتماد علی اللہ نے ان کو ہر قسم کے خطرات سے یک قلم بے پروا کر دیا تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر جب سے حملہ ہوا تھا اس وقت سے خلفاء نے اپنی حفاظت کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا اور حالات کا تقاضا بھی یہ تھا، کیونکہ مختلف فرقوں کے پیدا ہونے سے خلفاء کے خلاف دشمنی کی ایک لہر دلوں میں پیدا ہو گئی تھی اس وجہ سے خلفاء کے لیے کئی سپاہی متعین رہتے تھے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے ان تمام خطرات سے بے پروا ہو کر ان تمام سپاہیوں کو اپنی حفاظت سے فارغ کر دیا تھا اور اللہ کی رضا پر صابر و شاکر ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ کے بہی خواہوں نے آپ سے عرض کیا کہ گذشتہ خلفاء کی طرح آپ بھی دیکھ بھال کر کھانا کھایا کریں اور دشمنوں اور مخالفین کے حملہ کی حفاظت کے لیے نماز میں پہرہ کا اہتمام کیا کریں۔ آپ نے ان حضرات کا یہ مشورہ سن کر فرمایا: ''ان لوگوں نے اپنی اتنی حفاظت کی پھر بھی ان کا کیا ہوا؟ کیا وہ مرے نہیں؟'' جب لوگوں نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا: ''اے اللہ! اگر میں تیرے علم میں روز قیامت کے علاوہ اور کسی دن سے ڈروں تو تو میرے خوف کو اطمینان نہ دلا۔'' (طبقات ابن سعد: ۲۹۴/۵)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ پر کس قدر اعتماد تھا اور یوم آخرت کا کس قدر خوف۔ اس خوف نے آپ کو ہر قسم کے خوف سے بے نیاز کر دیا ہوا تھا۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ نے نقل کیا ہے کہ آپ کا روزانہ کا خرچ صرف دو درہم تھا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۳۴/۵) حالانکہ آپ اتنی بڑی سلطنت کے مالک تھے اور دنیا کا زہد اور بے رغبتی اتنی تھی کہ مالک ابن دینار کا قول ہے کہ لوگ میرے بارے میں کہتے ہیں کہ میں بڑا زاہد ہوں۔ فرمایا:

"انما الزاهد عمر بن عبدالعزيز الذى اتته الدنيا فتركها" (سیر اعلام النبلاء: ۱۳۴/۵)

''زاہد تو عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تھے کہ دنیا خود ان کے پاس آئی لیکن آپ نے اسے چھوڑ دیا۔''

دیانت و امانت:

دیانت و امانت روزمرہ کے انفرادی لین دین میں بھی ہوتی ہے اور مسند اقتدار پر بیٹھ کر بھی دیانتداری سے کام لیا جاتا ہے۔ جب یہ صفت کسی شخص سے مفقود ہو جائے تو پھر اس کے انفرادی اور اجتماعی معاملات بھی مخدوش ہو جاتے ہیں۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ کے فضائل اخلاق میں دیانت کا وصف نہایت اہم تھا۔ آپ سے پہلے خلفاء مسند اقتدار پر بیٹھ کر نظام حکومت کو دیانتداری سے نہیں چلاتے تھے اور قومی خزانہ پر اپنے آپ کو امین نہیں بلکہ مالک سمجھتے تھے۔ اس لیے قومی خزانہ کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کرتے تھے۔ آپ نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی مسلمانوں کے مال کی حفاظت میں وہی نمونہ پیش کیا جو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے پیش کیا تھا اور یہ ایسا نمونہ تھا کہ کسی قوم کی تاریخ میں ایسا نمونہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ اپنے پورے زمانہ خلافت میں آپ نے مسلمانوں کے بیت المال سے ایک حبہ کا بھی فائدہ اٹھانا گوارا

Marfat.com

نہ کیا۔ بلکہ اپنے آپ کو بیت المال کا مالک سمجھنے کے بجائے کسٹوڈین سمجھتے تھے اور اس کی پائی پائی کی حفاظت فرماتے تھے۔ روایات میں ہے کہ رات کو جب تک امور خلافت انجام دیتے تھے تو چراغ میں بیت المال کا تیل جلاتے تھے جب حکومت کا کام ختم ہو جاتا تو سرکاری چراغ گل کر کے اپنا ذاتی چراغ جلاتے تھے۔

(تاریخ الخلفاء: ص ۲۳۷، طبقات ابن سعد: ۲۹۸/۵)

بیت المال کی طرف سے فقراء اور مساکین کے لیے جو مہمان خانہ (دار الضیوف) تھا اس کے باورچی خانہ سے اپنے لیے پانی بھی گرم نہ کراتے تھے۔ ایک مرتبہ غفلت میں آپ کا ملازم ایک ماہ تک اس باورچی خانہ سے آپ کے وضو کے لیے پانی گرم کرتا رہا۔ آپ کو جب معلوم ہوا تو اتنی لکڑی خرید کر اس باورچی خانہ میں داخل کرا دی۔ (طبقات ابن سعد: ۲۹۵/۵) ایک دفعہ ایک غلام کو گوشت کا ٹکڑا بھوننے کا حکم دیا۔ وہ اسی مطبخ سے بھون لایا آپ کو پتہ چلا تو آپ نے اسے ہاتھ نہ لگایا اور غلام سے فرمایا: ''تم ہی کھا لو یہ میری قسمت کا نہ تھا۔'' (سیرت عمر بن عبدالعزیز: ص ٦)

تکبر:

علماء نے لکھا ہے کہ نفس انسانی میں اکبر الرذائل تکبر ہے جو ایک اعتبار سے کفر سے بھی اشد ہے، اس لیے کہ کفر بھی دراصل تکبر ہی سے پیدا ہوا ہے، کیونکہ شیطان بھی شیطان اس تکبر ہی کی بدولت بنا۔ "وابی واستکبر وکان من الکافرین" کبر نام ہے صفات کمال میں اپنے کو دوسرے سے بڑھ کر سمجھنا اور بقول حکیم الامت تھانوی قدس سرہ قبول حق میں سب سے بڑا مانع تکبر ہی ہے (الرفیق: ص ۸۵) اور حدیث میں اس کی بڑی مذمت آئی ہے۔ کہ رائی کے برابر بھی جس کے قلب میں تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ لیکن ترفع، تکبر، خودنمائی، خودرائی اور عدم مساوات وغیرہ امارت کے لوازمات میں سے ہیں۔ خود سیدنا عمر بن عبدالعزیز میں بھی مسند خلافت پر بیٹھنے سے قبل تمکنت تھی، خودرائی تھی اور ترفع تھا لیکن خلافت حاصل ہونے کے بعد وہ سراپا عجز وانکسار اور مساوات کا مجسمہ بن گئے تھے۔

جونہی آپ مسند خلافت پر براجمان ہوئے انھوں نے تمام شاہی امتیازات یک قلم ختم کر دیے اور فرمایا: ''میں بھی عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں۔'' آپ نے سرکاری پہرہ داروں کو تعظیم کے لیے اٹھنے کی ممانعت کر دی اور لوگوں نے دیکھا کہ وہ ان کے ساتھ برابر بیٹھتے تھے اور ان کی نشست و برخاست میں کوئی عدم مساوات کا پہلو نظر نہیں آتا تھا۔ (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: ص ٦٨) عام دستور یہ تھا کہ خلیفہ وقت کو اگر کسی جنازہ میں شرکت کرنا ہوتی تو اس کے لیے الگ چادر بچھائی جاتی تھی۔ جب پہلی مرتبہ معمول کے مطابق آپ کے لیے بھی چادر بچھائی گئی تو آپ نے اس پر بیٹھنے یا کھڑے ہونے کے بجائے اس کو اپنے پاؤں تلے سے ہٹا دیا۔

لونڈی اور غلاموں سے اس زمانہ میں وہ سلوک نہیں کیا جاتا تھا جو عام آزاد لوگوں سے کیا جاتا۔ آپ

Marfat.com

نے ان سے یہ غیر مساویانہ سلوک ختم کر دیا اور آپ ان سے اتنا مساویانہ سلوک اور برتاؤ کرتے تھے کہ کبھی خود بھی ملازمین کی خدمت کرتے تھے جس طرح کہ ملازمین ان کی خدمت کرتے۔ روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک خادمہ آپ کو پنکھا جھل رہی تھی۔ پنکھا جھلتے جھلتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ آپ نے جونہی اس کو سوتے دیکھا اس کے ہاتھ سے پنکھا لے کر اس کو جھلنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو گھبرا کر چلائی آپ نے اس کو فرمایا: کوئی بات نہیں آخر تم بھی میری طرح ایک انسان ہو۔ تم کو بھی گرمی لگتی ہے۔ جس طرح تم مجھ کو پنکھا جھل رہی تھی میں نے بھی جھلنا مناسب سمجھا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز: ص ۱۷۲، البدایہ والنہایہ: ۲۰۸/۹) آج ہے کوئی ایسا فرمانروا اس جمہوری دور میں جو اپنے ملازموں کے ساتھ یہ سلوک کرے۔

ملازمین کے آرام میں بھی خلل انداز ہونا آپ کو اچھا نہیں لگتا تھا کیونکہ ان کے لیے آرام کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا دوسروں کے لیے ضروری ہے۔ جب دیکھتے کہ کوئی ملازم سویا ہوا ہے یا آرام کر رہا ہے تو ان اوقات میں آپ اپنا کام خود کر لیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ رجاء بن حیوہ سے ملاقات کچھ طویل ہوگئی اور رات زیادہ گزر گئی اور چراغ جھلملانے لگا۔ آپ کے پاس ہی ملازم سویا ہوا تھا۔ رجاء نے کہا: ''امیر المومنین! اسے جگا دوں تاکہ یہ چراغ میں تیل ڈال دے۔'' آپ نے فرمایا: ''نہیں۔ اسے سونے دو سارے دن کا تھکا ماندہ ہے۔'' رجاء نے اب خود چراغ درست کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ نے روک دیا کہ مہمان سے کام لینا مروت اور انسانیت کے خلاف ہے، اور خود اٹھ کر زیتون کا تیل لیا اور چراغ میں ڈال کر اس کو درست کیا۔ پھر آ کر فرمایا: ''جب میں اٹھا تھا تب بھی امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز تھا اور اب بھی امیر المومنین ہوں۔ میرے اس کام کرنے سے میری شخصیت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز: ص ۱۷۳، البدایہ والنہایہ: ۲۰۳/۹)

اس تواضع اور عجز و انکسار اور جذبہ مساوات کی وجہ سے ان لوگوں کو جو خلیفہ کے جاہ و جلال اور شان و شکوہ کے عادی تھے، آپ کو پہچاننے میں دقت ہوئی تھی۔ چنانچہ حکم بن عمرو الرعینی کا بیان ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ایک حلقہ سے اٹھ کر جب دوسرے حلقہ میں بیٹھ جاتے تھے۔ تو اجنبی لوگ آپ کو پہچانتے نہ تھے۔ انھیں جب تک اشارہ یا کسی اور طریق سے بتایا نہ جاتا اس وقت تک وہ آپ کو پہچان نہ سکتے تھے۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز: ص ۱۷۳، ۱۷۴)

Marfat.com

یزید بن عبدالملک

سنہ ۱۰۱ھ تا سنہ ۱۰۵ھ/ مطابق سنہ ۷۱۹ء تا سنہ ۷۲۳ء

عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد سلیمان بن عبدالملک کی وصیت کے مطابق یزید بن عبدالملک مسند خلافت پر بیٹھا۔ اس کی ماں عاتکہ یزید بن معاویہ کی لڑکی اور سیدنا معاویہ کی پوتی تھی۔ یہ سنہ ۶۵ ھ میں پیدا ہوا۔ یہ جوان آدمی تھا اور پہلو میں جوان دل رکھتا تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ عمر بن عبدالعزیز کی پالیسیوں پر چلا جائے لیکن وہ چالیس روز سے زیادہ نہ چل سکا۔ بالآخر وہی پرانا استبداری نظام جاری کر دیا کیونکہ معاشرہ اور خاندان کے افراد کی طرف سے اس پر ایک خاص قسم کا جبر تھا۔ جبر تو سیدنا عمر بن عبدالعزیز پر بھی تھا لیکن وہ اس جبر سے متاثر نہ ہوئے۔ چنانچہ یزید نے عمر بن عبدالعزیز کے تمام گورنروں اور حکام کو معزول کر کے نئے عمال مقرر کیے جو اس کی پالیسیوں کا ساتھ دے سکیں۔

یزید بن مہلب کی بغاوت:

مہلب بن ابی صفرہ بنو امیہ کا ایک نہایت وفادار سپہ سالار تھا۔ اس نے خارجیوں کے استیصال میں عبدالملک بن مروان کا بڑا ساتھ دیا۔ اس کے ان خدمات اور کارناموں کے باعث اس کی اولاد کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ مہلب کے سب لڑکے بڑے بڑے عہدوں پر متعین رہے۔ وہ اپنے دور میں حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ جس طرح چاہتے حکومت کرتے تھے۔ کوئی ان کو پوچھنے والا اور روک ٹوک کرنے والا نہ تھا اور نہ ہی حکومت کی آمدنی کے بارے میں ان سے کوئی محاسبہ کرنے والا تھا۔ قتیبہ بن مسلم نے بھی یزید بن مہلب کے باعث بغاوت کی تھی جس میں وہ اپنی فوج کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

سلیمان کو یزید بن مہلب پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ اس کے زمانہ خراسان کا گورنر مقرر رہا جہاں اس کا باپ اور وہ خود بھی گورنر رہ چکا تھا۔ سلیمان کے عہد خلافت میں یہ وہاں کا مختار کل تھا۔ جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کی وفات سے کچھ روز قبل اس نے سلیمان کو ایک بہت بڑی آمدنی کی اطلاع دی لیکن وہ رقم مرکز میں

Marfat.com

بھیجنے کی نوبت نہ آئی کہ سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ جب عمر بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے تو آپ عمال کی خودسری اور مطلق العنانی کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، خصوصاً بیت المال کی آمدنی کے معاملہ میں کسی بھی گورنر اور حاکم کے ساتھ آپ رورعایت کو راہ نہ دیتے تھے کیونکہ وہ بیت المال کی رقم کو عوام کی امانت سمجھتے تھے اور خلیفہ وقت اس رقم کا مالک نہیں ہوتا تھا کہ اپنی ضروریات پر اس کو خرچ کرے بلکہ وہ اس کو کسٹوڈین سمجھتے تھے۔ اس لیے جب وہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور انھیں اس آمدنی کا پتہ چلا تو انھوں نے یزید سے اس رقم کا مطالبہ کیا۔ اس نے آپ کو ٹالنے کی کوشش کی۔ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے والی عراق عدی بن ارطاۃ کو لکھا کہ اس کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیجو کیونکہ یہ بیت المال کی یہ بڑی رقم نگلنا چاہتا ہے، عدی بن ارطاۃ نے امیر المومنین کے حکم کی تعمیل میں یزید بن مہلب کو پکڑ کر پا بجولاں بارگاہِ خلافت میں بھجوا دیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس سے پھر اس رقم کا مطالبہ کیا۔ یزید نے کہا کہ سلیمان بن عبدالملک میرا جس قدر لحاظ کرتے تھے، اس سے آپ بخوبی آشنا ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو مجھ سے اس رقم کا مطالبہ نہ کرتے۔ میں انھیں رقم بھیجنے کے لیے نہیں بلکہ ان کے علم میں لانے کے لیے انھیں اس رقم کی اطلاع دی تھی۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ تمھارا ذاتی مال نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کا مال ہے، اسے میں کسی صورت تمھارے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر تم نے رقم دینے سے انکار کیا تو میں تمھیں قید کرنے پر مجبور ہوں گا۔'' لیکن یزید بن مہلب نے جب اس دھمکی پر بھی وہ رقم نہ دی تو آپ نے اسے پس دیوار زنداں کر دیا۔ ابھی یہ قید ہی میں تھا کہ عمر بن عبدالعزیز مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔

یزید بن مہلب نے اپنی گورنری کے دور میں یزید بن عبدالملک کے بعض سسرالی رشتہ داروں کو سزائیں دی تھیں اور ان پر جبر و تشدد کیا تھا۔ اس وجہ سے یزید اس سے برہم تھا۔ چونکہ یزید بن عبدالملک نامزد شدہ ولی عہد تھا اس لیے یزید بن مہلب کے دل میں ہر وقت یہ اندیشہ رہتا تھا کہ یزید جونہی مسند خلافت پر متمکن ہو گا وہ اپنے ان عزیزوں کی سزاؤں کا مجھ سے ضرور انتقام لے گا۔ اس لیے وہ کسی عہدہ دار یا جیلر کو رشوت دے کر جیل سے فرار ہو گیا۔ اس دوران میں عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا اور ان کے بعد یزید بن عبدالملک سلیمان کی وصیت کے مطابق مسند خلافت پر بیٹھا۔ مہلب کا خاندان عراق میں بڑا صاحب اقتدار تھا اور عراقی ظاہری طور پر اس پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس کے فرار سے یزید کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ عراق میں بغاوت نہ کرا دے۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر عدی بن ارطاۃ والی عراق کو مہلب کے خاندان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ مہلب کے خاندان کے لوگ بالکل بے خبر تھے لہٰذا یزید بن مہلب کے تین بھائی مفضل، مروان اور حبیب کو آسانی کے ساتھ گرفتار کر کے قید کر دیا گیا اور یزید بن مہلب کی بغاوت کے خطرات کو روکنے کی تدابیر کی جانے لگیں۔ اس دوران میں یزید بن مہلب بصرہ پہنچ گیا۔ یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ اس کے بھائیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس نے عدی سے مصالحت کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔ بصرہ میں مہلب خاندان کے حامیوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ان کی مدد سے اس نے عدی بن ارطاۃ کو

Marfat.com

شکست دے کر گرفتار کر لیا اور بصرہ پر یزید بن مہلب کا قبضہ ہو گیا۔ دار الحکومت پر قبضہ ہونے کے باعث عراق کے پورے ماتحت علاقہ پر بنو امیہ کی حکومت عارضی طور پر ختم ہو گئی اور ابن مہلب نے فارس وغیرہ علاقوں پر اپنے عمال مقرر کر دیئے جو کہ بنو امیہ کے لیے ایک بہت بڑی پریشانی کا باعث تھا۔

یزید بن عبدالملک کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے اپنے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کو یزید کے مقابلہ کے لیے عراق بھیجا۔ اس وقت ابن مہلب نے یزید بن عبدالملک کی بیعت فسخ کر کے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا اور لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے نام پر بنو امیہ کے مقابلہ پر آمادہ کیا اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ان سے جہاد کرنا ترک و دیلم کے خلاف جہاد کرنے سے بہتر ہے۔

سیدنا حسن بصری نے یزید بن مہلب کے دعویٰ کی سخت مخالفت کی کیونکہ وہ اس سے قبل ابن اشعث کے فتنہ کا انجام دیکھ چکے تھے۔ آپ نے لوگوں کو اس بے نتیجہ خون ریزی سے الگ رہنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

"کل تک یہی یزید بن مہلب اہل عراق کی گردنیں کاٹ کاٹ کر بنو مروان کے پاس بھیجتا تھا اور اہل عراق کو ہلاک کر کے ان کی خوشنودی کا طالب اور خواہش مند تھا۔ آج جب اس کی بنو امیہ سے بگڑ گئی تو میدان میں ان کے خلاف جھنڈا اگاڑ کر کھڑا ہو گیا اور اہل عراق سے کہنے لگا: "میں ان سے لڑ رہا ہوں تم بھی ان سے لڑو۔ میں تمھیں سنت عمرین کی طرف دعوت دیتا ہوں حالانکہ سنت عمرین تو یہ ہے کہ اس کو بیڑیاں پنا کر جیل میں بند کر دیا جائے۔ اس کو کتاب و سنت کی دعوت دینے کا کوئی حق نہیں۔"

لیکن آپ کو لوگوں نے یہ بات کہنے سے خاموش کر دیا۔

مسلمہ کے عراق پہنچنے کے بعد یزید بن مہلب نے اپنے مقبوضات کی حفاظت کے انتظامات کیے۔ اپنے بھائی مردان کو بصرہ کی اور اپنے لڑکے معاویہ کو واسطہ کی نگرانی پر مامور کر کے خود مسلمہ کے مقابلہ کے لیے کوفہ کی طرف بڑھا۔ اس کا بھائی مقدمۃ الجیش کے ساتھ آگے تھے۔ چنانچہ پہلے اس کا عباس بن عبدالملک اموی سے مقابلہ ہوا۔ عبدالملک کو شکست ہوئی اور وہ لوٹ کر یزید بن مہلب کے ساتھ مل گیا۔ اس کے بعد انبار کے قریب مسلمہ بن عبدالملک اور یزید بن مہلب کا آمنا سامنا ہوا۔ یزید بن مہلب کے پاس ایک لاکھ فوج تھی۔ ابھی جنگ شروع نہ ہوئی تھی کہ مسلمہ کی فوج کے آدمیوں نے فرات کے پل کو آگ لگا دی۔ عراقیوں کے گزرنے کا یہی راستہ تھا۔ وہ پل سے دھواں اٹھتے دیکھ کر اتنے بدحواس ہوئے کہ ان کی بڑی تعداد نے بغیر لڑے میدان چھوڑ دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ یزید بن مہلب کے پاس ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی جس کو لے کر وہ بصرہ سے واسطہ آیا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر مسلمہ بن عبدالملک کے مقابلہ میں صف آرا ہوا۔ یزید کو شروع ہی سے اہل عراق پر بھروسہ نہ تھا، اور بھروسہ ہوتا بھی کیسے کیونکہ انھوں نے آج تک کبھی کسی سے وفا ہی نہیں کی تھی۔ یزید بن مہلب کی تو حیثیت ہی کچھ نہیں تھی انھوں نے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے بھی وفا نہ کی تھی اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو تو خود بارہ یا اٹھارہ ہزار خط لکھ کر کوفہ بلایا اور پھر انھیں خاندان سمیت میدان کربلا میں

Marfat.com

نہایت کسمپرسی کی حالت میں شہید کر دیا۔ پھر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بھی ان کی وفا کی ڈور ٹوٹی اور وہ بھی پریشان خاطر ہو کر مکہ مکرمہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی یہ ساری بے وفائیاں یزید بن مہلب کے سامنے تھیں۔ اس کو بصرہ سے چلتے وقت ہی ان کی بے وفائی کو سامنے رکھنا چاہیے تھا۔

یزید بن مہلب کو میدان جنگ میں اہل عراق پر بھروسا مخدوش ہو گیا۔ اس نے ٹڈی دل فوج پر نظر ڈالی اور کہا: ''کاش اس لشکر عظیم کے بجائے میرے ساتھ میرے گنے چنے خراسانی رشتہ دار ہوتے۔'' آخر کار وہی ہوا جس کا خطرہ تھا کہ جنگ شروع ہونے سے قبل ہی ابن مہلب کی ایک بہت بڑی تعداد نے میدان چھوڑ دیا۔ ابن مہلب نے ان کو سنبھالنے اور روکنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس ہنگامہ میں اس کا بھائی حبیب قتل ہوا۔ اس کے قتل کے بعد یزید بن مہلب اپنی مختصر جماعت کے ساتھ جان پر کھیل گیا اور بڑی بہادری سے اپنی جان دی۔ اس کا دوسرا بھائی مفضل الگ ایک دستے کے ساتھ برسر پیکار تھا۔ یزید بن مہلب نے پہلے سے اس کا انتظام کر لیا تھا کہ اگر اسے اس معرکہ میں شکست ہوئی تو وہ قندابیل (سندھ) کے حاکم جو اس کے ماتحت رہ چکا تھا، پناہ لے گا۔ وہ اپنے مفضل اور خاندان کے دوسرے افراد کو لے کر قندابیل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک اموی سردار ہلال بن اجود تمیمی کو پتہ چلا تو اس نے اس کا تعاقب کیا۔ مفضل کے تمام ساتھی مارے گئے لیکن وہ خود کسی طریقے سے جان بچا کر نکل گیا۔ جب یہ لوگ قندابیل پہنچے تو یہاں کے حاکم وداع بن حمید نے انھیں دھوکا دیا اور مفضل کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ مفضل نے بزور داخل ہونا چاہا لیکن سپاہیوں سے معمولی سی جھڑپ کے بعد مفضل، عبدالملک، زیاد اور مروان اور خاندان مہلب کے دوسرے تمام ارکان مارے گئے۔ صرف چند چھوٹے بچے بچ گئے۔ انھیں عورتوں سمیت قید کر کے مسلمہ بن عبدالملک کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس افسوس ناک طریقہ پر اس خاندان کا خاتمہ ہوا جو کسی زمانہ میں سر پر غرور کے ساتھ حکومت کرتا تھا اور لوگوں پر جبر و تشدد کر کے اموی حکومت کے لیے بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ البتہ ابو عیینہ بن مہلب اور عثمان بن مفضل کسی طریقہ سے بچ کر زنبیل چلے گئے۔ جب مسلمہ بن عبدالملک یزید بن مہلب کے فتنہ کا قلع قمع کر چکا تو یزید بن عبدالملک نے اسے عراقین (کوفہ اور بصرہ) کا گورنر مقرر کر دیا۔ مسلمہ نے اپنے داماد سعید خذینہ کو حاکم خراسان مقرر کیا۔

قصر باہلی پر ترکوں کا قبضہ:

مسلمہ بن عبدالملک نے اپنے داماد سعید بن عبدالعزیز کو خراسان کا گورنر مقرر کیا تھا۔ سعید کمزور دل اور حکومتی انتظامات سے اس قدر واقف نہ تھا۔ اس کو خراسان کا گورنر بنانا درست نہ تھا کیونکہ ترکستان کے باشندے بڑے سرکش اور جنگ جو تھے۔ وہ صرف قوت اور جبر سے دبتے تھے، ایک کمزور شخص کو وہ خود دبا لیتے تھے۔ سعید بن عبدالعزیز چونکہ نرم دل اور کمزور تھا لہٰذا ترکستان کی تمام قوتوں اور عناصر کا حوصلہ بڑھا اور خاقان چین کے اثر اور ہلاشیری سے ترکوں کا ایک دستہ اسلامی سلطنت کی حدود میں گھس آیا۔ اور قصر باہلی کے مقام کو

Marfat.com

جہاں بہت سے مسلمان آباد تھے، محاصرہ میں لے لیا۔ ان لوگوں نے عثمان بن عبداللہ والی سمرقند سے امداد طلب کی۔ اس نے میتب بن بشیر ایامی کو چار ہزار فوج دے کر فوری طور پر روانہ کر دیا۔ راستہ میں انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ معرکہ بہت سخت ہے، جسے اپنی جان عزیز ہو وہ لوٹ جائے۔ اس اعلان سے تین ہزار شخص واپس لوٹ گئے۔ میتب نے ان کے واپس لوٹنے کی کوئی پروانہ کی اور ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ ہی قصر باہلی روانہ ہو گیا۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک ترک حکمران ترکی دھقانوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ قصر باہلی کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ میتب نے فوری طور پر دو جاسوسوں کو بھیج کر محصور مسلمانوں کو کہلا بھیجا کہ وہ لوگ صبح تک صبر و استقلال سے کام لیں، ان شاء اللہ سب درست ہو جائے گا اور خود راتوں رات چل کر صبح ہوتے ہوئے قصر پہنچ گیا اور پہنچتے ہی ترکوں پر ٹوٹ پڑا اور اس بہادری کے ساتھ ان سے جنگ کی کہ ترک بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ترکوں کا اپنا ملک تھا، ان کے پلٹنے کا خطرہ تھا، لہٰذا میتب نے ان کے تعاقب سے مسلمانوں کو روک دیا اور کسی نہ کسی طرح محصور مسلمانوں کو قصر باہلی سے نکال لے گیا۔ اس کی واپسی کے بعد ترک دوبارہ پہنچے لیکن اس وقت قصر خالی ہو چکا تھا۔ لہٰذا ترک ناکام واپس لوٹ گئے۔ یہ واقعہ سنہ ۱۰۲ھ کا ہے۔

صغد کی سرزنش:

صغد مسلمانوں کے حلیف تھے لیکن قصر باہلی کے محاصرہ میں انھوں نے ترکوں کی مدد کی تھی۔ اس لیے مسلمانوں نے سعید کو اس کا انتقام لینے کے لیے آمادہ کیا۔ وہ دریائے جیحون کو عبور کر کے صغد کے علاقہ کی طرف بڑھا۔ قریب ہی ان کو صغد کا ایک جرگہ مل گیا۔ مسلمانوں نے اسے شکست دے کر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا لیکن سعید نے اپنی کمزوری کے باعث روک دیا اور کہا کہ یہ لوگ امیر المؤمنین کی کھیتی ہیں، اس لیے ان کا ویران کرنا کچھ مناسب نہیں۔ یہاں سے جب یہ لوگ واپس جا رہے تھے تو ترکوں کی ایک جماعت جو ان کی تاک میں چھپی ہوئی تھی، ان پر ٹوٹ پڑی۔ مسلمان بالکل بے خبر تھے، اس لیے شکست کھا گئے لیکن پھر دوسری فوج کے پہنچنے کے بعد ترکوں کو پسپا کر دیا گیا۔

سعید بن ہبیرہ کا تقرر:

گورنر خراسان سعید بن عبدالعزیز بھی فطرۃً ایک کمزور شخص تھا اور اس کی موجودگی میں صغد اور ترک سرکشی اور بغاوت سے باز نہیں آ سکتے تھے، اس لیے سنہ ۱۰۳ھ میں اس کو بھی معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ سعید بن ہبیرہ کو خراسان کا گورنر بنایا گیا۔ یہ بڑے رعب، دبدبہ اور شکوہ کا مالک تھا۔ اس نے آتے ہی مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کیا کہ تم لوگ کثرت تعداد کے بل پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسہ پر لڑتے ہو۔ اب اس کا نام لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ صغد کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ ڈر گئے اور فرغانہ کے حاکم سے خجندہ میں

Marfat.com

قیام کی اجازت طلب کی۔ اس نے اجازت دینے سے یک قلم انکار کر دیا البتہ ایک پرگنہ میں رہنے کی اجازت دے دی اور اس کے خالی ہونے تک عارضی طور پر ایک دوسرا مقام تجویز کر دیا، لیکن اس دوران میں ان کی حفاظت کی کوئی ذمہ داری نہ لی۔ صغد نے عارضی قیام کے لیے شعب عصام کو پسند کیا۔ سعید حرشی کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ فوراً روانہ ہو گیا اور قبل اس کے کہ صغد شعب عصام میں داخل ہوں، پہنچ گیا اور ان کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا۔ صغد نے فرغانہ کے حاکم سے مدد طلب کی۔ اس نے جواب میں کہا کہ میں نے تمھارے قیام کے مستقل انتظام سے قبل حفاظت کی ذمہ داری نہیں لی۔ اس جواب سے صغد پریشان ہو گئے اور انھوں نے مجبور ہو کر اس شرط پر صلح کر لی کہ ان کے پاس جتنے مسلمان قیدی ہیں وہ سب کو رہا کریں گے اور آئندہ اسلامی ریاست سے کوئی دھوکہ اور فریب نہیں کریں گے، اور خجندہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گے، اور اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہو تو مسلمانوں کو جنگ کرنے کا پورا پورا اختیار ہو گا۔ ابھی یہ شرائط پورے نہ ہوئے تھے کہ صغد نے ایک مسلمان عورت کو قتل کر دیا۔ سعید کو جب معلوم ہوا تو اس نے صرف قاتل کے قتل پر اکتفا کیا۔ لیکن اس بدعہدی کے بعد ایک صغد سردار کو سعید کی جانب سے اطمینان نہ رہ گیا۔ اس نے علم بغاوت بلند کر دیا اور اسلامی علاقہ پر حملہ کر کے چند مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔ یہ سردار تو کسی نہ کسی طرح قتل کر دیا گیا لیکن اس کے بعد تمام صغد باغی ہو گئے اور ڈیڑھ سو مسلمان قیدیوں کو جو ان کے قبضہ میں تھے، قتل کر دیا۔ یہ حالت دیکھ کر سعید بامر مجبوری بڑے جوش و خروش سے ان کے مقابلہ کے لیے اٹھے اور ایک پورے جرگہ کو تہ تیغ کر کے صغد کے علاقہ میں ہر طرف اپنی فوجیں پھیلا دیں اور ان کی طاقت کو سبوتاژ کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

کش اور نسف کی اطاعت:

کش اور نسف کے علاقے مسلمانوں کے پرانے باج گزار تھے، لیکن جب صغد نے بغاوت کی تو انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ان کی مدد کی تھی۔ اس لیے صغد سے نپٹنے کے بعد سعید کش پہنچے۔ اہل کش نے کسی مزاحمت کے بغیر ان سے صلح کر لی۔ کش کی طرف سے پورے اطمینان کے بعد سعید نے مسربل بن خریت کو نسف کے فرماں روا کو سمجھانے کے لیے بھیجا۔ مسربل نے اس کو جا کر سمجھایا کہ تم باغیوں کا انجام بخوبی دیکھ چکے ہو۔ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہو سکتا ہے کہ تمھارا بھی وہی انجام ہو۔ تمھاری خیر اسی میں ہے کہ تم مسلمانوں کی پیش قدمی سے قبل ان کی اطاعت قبول کر لو ورنہ تمھارا انجام بھی دوسرے باغیوں سے اچھا نہیں ہو گا۔ فرماں روا اور مسلمان سفیر مسربل میں دیرینہ تعلقات تھے۔ اس نے اس خیر خواہانہ مشورہ کو قبول کر لیا اور اپنے کو سعید کے حوالے کر دیا، لیکن سعید نے اس کی خطا معاف نہیں کی اور اسے خراسان لے جا کر قتل کر دیا۔

Marfat.com

خزر کی سرکوبی:

ترکستان کے بعد دوسرا مخدوش علاقہ خزر تھا، اس لیے ۱۰۳ھ میں اس علاقہ پر فوج کشی ہوئی۔ خزر، قبچاق اور ارمن نے متحد ہو کر مقابلہ کیا جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ اس کامیابی سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا اور انھوں نے سرحد پر بہت بڑا اجتماع کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی اس شکست کے بعد مسلمانوں کا سارا مال و اسباب بھی لوٹ لیا۔ جب یہ خبر دمشق پہنچی تو یزید بن عبدالملک نے جراح بن عبداللہ حکمی کو آذربائیجان اور آرمینیہ کا حاکم مقرر کر کے بھیجا اور اسے خزر کی گوش مالی اور سرکوبی کی ہدایت کی۔

جراح بن عبداللہ حکمی تازہ دم شامی فوج کے ساتھ ترکستان کی طرف بڑھا۔ پہلے جرزعہ پہنچ کر دم لیا۔ پھر نہر کو عبور کر کے باب الابواب پہنچا۔ خزر اسے خالی کر کے پہلے ہی آگے بڑھ چکے تھے۔ جراح بلا مقابلہ اس پر قابض ہو گیا۔ جراح یہیں مقیم تھا کہ خزر اپنے شہزادہ کی راہ نمائی میں ایک لشکر گراں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے آئے۔ نہران کے کنارے سخت لڑائی ہوئی۔ مسلمان فتح یاب ہوئے اور ترک شکست کھا کر لوٹ گئے۔

جراح یہاں سے چل کر حصن حصین پہنچا۔ اہل قلعہ نے بغیر لڑے قلعہ مسلمانوں کے سپرد کر دیا اور وہاں سے اپنا مال و اسباب لے کر نکل گئے۔ اس کے بعد جراح نے بلنجر کا رخ کیا۔ یہ ترکوں کا ایک مضبوط قلعہ تھا جہاں ان کی بڑی قوت مجتمع تھی۔ یہاں مسلمانوں اور ترکوں کے درمیان خون ریز جنگ ہوئی لیکن فتح مسلمانوں کی ہوئی۔ مسلمانوں نے بہت دور تک ترکوں کا تعاقب کیا اور ان کی بہت بڑی تعداد کو تہ تیغ کیا اور آس پاس کے تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

ایک روایت یہ ہے کہ مسلمان جب بلنجر کی طرف بڑھے تو راستہ میں شہر برغو کو مطیع کر کے بلنجر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ بڑا سنگین اور مستحکم قلعہ تھا۔ اہل شہر نے تین سو گاڑیوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر قلعہ کے چاروں طرف اس کا حصار قائم کر دیا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کو آگے بڑھنے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ چند مسلمان ہمت کر کے گاڑیوں کی طرف بڑھے تو اہل قلعہ نے تیروں کی بارش کر دی لیکن وہ جان پر کھیل کر گاڑیوں تک پہنچ گئے اور وہ رسہ جس سے وہ گاڑیاں بندھی ہوئی تھیں، کاٹ دیا۔ اس کے کٹتے ہی سب گاڑیاں لڑھک کر نیچے آ گئیں اور مسلمانوں نے آگے بڑھ کر حملہ کر دیا۔ خزر نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن انھیں شکست ہوئی اور مسلمانوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ خزر کی بے شمار دولت ان کے ہاتھ آئی۔ قلعہ پر قبضہ کے بعد قلعہ دار مسلمانوں سے مل کر ان کا جاسوس بن گیا۔ اس کے صلہ میں جراح بن عبداللہ حکمی نے قلعہ مع نقد و جنس اسے واپس کر دیا۔ بلنجر کے بعد قلعہ الوبندر کا رخ کیا۔ یہاں چالیس ہزار ترک خانوادے آباد تھے۔ ان لوگوں نے بغیر کسی مزاحمت کے صلح کر لی، لیکن ابھی جراح الوبندر ہی میں تھے کہ دوسرے ترکمانی قبائل نے مسلمانوں

Marfat.com

کی ناکہ بندی کر دی۔ بلنجر کے قلعہ دار نے فوراً اس کی اطلاع دی، اس لیے جراح بن حکمی رستاق ملی واپس چلے آئے اور دارالخلافہ سے مزید فوجیں طلب کیں۔ ابھی جراح رستاق ملی ہی میں مقیم تھے کہ یزید کا وقت آخر آ گیا اور یہ مہم ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچی۔

ان مہمات کے علاوہ یزید بن عبدالملک کے زمانہ میں بعض معمولی فتوحات بھی حاصل ہوئیں۔ سنہ ۱۰۳ھ میں روم میں عباس نے ولسہ اور سنہ ۱۰۵ھ میں مروان بن محمد نے قونیہ فتح کیا۔

خوارج کی سرکوبی:

یزید بن عبدالملک کے زمانہ خلافت میں بعض خوارج نے بھی سر اٹھایا، لیکن اس فتنہ کو بڑھنے نہ دیا گیا۔ اس سے قبل عبدالملک اور ولید کے زمانہ میں بھی اس کی سرکوبی کی گئی تھی۔ سنہ ۱۰۵ھ میں عقفان خارجی اٹھا لیکن اس کی جماعت نہایت مختصر تھی۔ جسے صرف دھمکا کر منتشر کر دیا گیا۔ اسی سنہ میں بحرین میں مسعود بن ابی زینب عبدی اٹھا اور یمامہ پر حملہ آور ہوا۔ یہاں کے والی سفیان بن عمرو عقیلی نے آسانی سے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد ہلال بن مدلج نے اس کی جگہ لی یہ بھی شکست کھا کر مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

عراق کا بندوبست:

یزید بن عبدالملک کا زمانہ حکومت عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت کی طرح نہایت مختصر تھا، اور اس مختصر زمانہ میں بھی کوئی اہم واقعات پیش نہیں آئے۔ وہ طبعاً بہت آرام طلب تھا، اس لیے اس کے دور میں تعمیری حیثیت سے عراق کے بندوبست کے علاوہ اور کوئی چیز قابل ذکر نہیں ہے۔ سیدنا عمر کے زمانہ میں عراق کا بندوبست نہیں ہوا تھا۔ یزید نے اپنے آخری زمانہ میں دوبارہ بندوبست کرایا۔ (یعقوبی: ۳۷۶/۲)

اہل بیت نبوت کا احترام:

عبدالرحمٰن بن ضحاک عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت سے حجاز کا گورنر چلا آ رہا تھا۔ وہ تین سال تک اس عہدے پر مامور رہا۔ اس کے بعد اس کے دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی نواسی سے شادی کروں۔ چنانچہ اس نے فاطمہ بنت الحسین رضی اللہ عنہا یعنی لڑکی کی ماں کے پاس پیغام بھیجا۔ انھوں نے اس رشتہ سے انکار کر دیا۔ عبدالرحمٰن بن ضحاک نے دھمکی دی کہ میں تمہارے لڑکے کو شراب خوری کے جرم میں متہم کر کے درے لگواؤں گا۔ فاطمہ بنت الحسین رضی اللہ عنہا نے یزید بن عبدالملک کے پاس شکایت کہلا کر بھجوائی۔ یزید نے جونہی یہ شکایت سنی سخت برافروختہ ہوا اور عبدالواحد بن عبداللہ قسری کو اپنے ہاتھ سے خط لکھا کہ میں نے تجھ کو مدینہ کی گورنری پر مامور کیا۔ تم اس خط کو دیکھتے ہی عبدالرحمٰن بن ضحاک کے پاس جاؤ اور اس کو معزول کر دو، اور اس

Marfat.com

سے چالیس ہزار دینار جرمانہ وصول کرو اور اس کو اس قدر اذیت دو کہ اس کی آواز مجھے سنائی دے درآں حالیکہ میں اپنے بستر استراحت پر ہوں۔ قاصد نے یہ خط لے جا کر عبدالواحد کو دیا۔ عبدالواحد نے اسی وقت مدینہ طیبہ کی گورنری کا چارج لے کر عبدالرحمٰن بن ضحاک کو طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دیں۔ لوگ عبدالرحمٰن سے کچھ خوش نہ تھے۔ اس لیے اب اس کے معزول ہونے کے بعد اس کی ہجو میں قصیدے لکھے۔ عبدالواحد کا برتاؤ اہل مدینہ سے بہت اچھا تھا۔ سب اس سے خوش رہے اور قاسم و سالم پسران عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہر کام میں اس کے مشیر تھے۔ عبدالرحمٰن کی معزولی اور عبدالواحد کی تقرری ماہ شوال سنہ ۱۰۴ھ میں وقوع پذیر ہوئی۔

ولی عہدی:

بعض روایات میں ہے کہ یزید کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے ولید کو اپنا جانشین بنائے، لیکن اس کے مشیروں نے کہا کہ ولید ابھی بہت چھوٹا ہے اور خلافت کے بار گراں سے سبک دوش ہونے کے قابل نہیں، لہٰذا یزید نے اپنے بعد ترتیب وار اپنے بھائی ہشام بن عبدالملک کو جانشین اور اپنے بیٹے ولید بن یزید کو ولی عہد سلطنت نامزد کیا۔

وفات:

۲۵ شعبان سنہ ۱۰۵ھ کو یزید بن عبدالملک نے سل کی بیماری میں بلقاء (مضافات دمشق) میں انتقال کیا۔ اس کی عمر اس وقت ۳۸ سال تھی اور چار سال ایک ماہ مسند خلافت پر متمکن رہا۔

یزید کے دس بیٹے تھے۔ ولید، یحییٰ، محمد، عمر، سلیمان، عبدالجبار، داؤد، ابو سلیمان، عوام اور ہاشم۔

Marfat.com

ہشام بن عبدالملک

سنہ ۱۰۵ھ تا سنہ ۱۲۵ھ/مطابق سنہ ۷۲۳ء تا سنہ ۷۴۴ء

ہشام بن عبدالملک سنہ ۷۲ھ میں عائشہ بنت ہشام کے بطن پیدا ہوا۔ باپ نے اس کا نام منصور رکھا کیونکہ اسی سال اس نے مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا۔ بعد میں ماں نے اپنے باپ کے نام پر اس کا نام ہشام رکھا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ یزید کے انتقال کے وقت وہ اضافہ میں مقیم تھا۔ یہیں اس کی خدمت میں شاہی عصا اور خاتم پیش کیے گئے۔ پھر دمشق پہنچ کر اس نے لوگوں سے بیعت عام لی۔ خلافت کے وقت اس کی عمر ۳۴ سال تھی۔ سنہ ۱۰۵ھ سے سنہ ۱۲۵ھ تک قریباً بیس سال وہ تخت خلافت پر متمکن رہا۔ وہ حلیم، عفیف، مدبر حوصلہ مند تھا اور وہ تمام خوبیاں اس میں موجود تھیں جو ایک صاحب اقتدار شخص میں ہونی چاہئیں۔ اس کے زمانہ میں بہت سے اندرونی حالات اور بیرونی مہمات پیش آئیں لیکن وہ سب میں کامیاب و کامران رہا۔ اس کا شمار بنوامیہ کے بہترین خلفاء میں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہشام عبدالملک بن مروان کا ثنیٰ تھا۔ اس وجہ سے اس کے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اموی حکومت میں پھر ایک حرکت اور طاقت پیدا ہوئی۔ اس کا دور اندرونی اور بیرونی مہمات کے لحاظ سے بڑا ہنگامہ خیز تھا۔

ترکستان کی مہمات:

ترکستان کی مہمات کئی سالوں سے مسلمانوں کو تنگ کر رہی تھیں۔ کیونکہ یہ لوگ طبیعت کے لحاظ سے شورش پسند اور قلب و جگر کے لحاظ سے نہایت حوصلہ مند اور بہادر تھے۔ ترکستان کا فرماں روا خاقان اگرچہ مارا گیا لیکن وسط ایشیاء کے چھوٹے چھوٹے باجگزار فرماں روا بڑے سرکش تھے۔ جب بھی ذرا مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی وہ فوری طور پر باغی ہو جاتے جیسا کہ افریقہ میں بربر ہوتے تھے۔ اس کے آزاد فرماں روا آئے روز اسلامی مقبوضات پر تاخت کرتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے ہشام نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کا زور توڑا جائے۔ اور ان کو مستقل طور پر قابو میں لایا جائے۔ جب اس نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو ترک اور تاتار وغیرہ سب

Marfat.com

تو میں مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں اور کابل و ترکستان سے لے کر ارغستان تک آگ لگ گئی، لیکن ہشام کی ہمت اور تدبر نے اس سب پر قابو پالیا۔ ہشام کی تخت نشینی کے وقت عمر بن ہبیرہ عراق کا گورنر جنرل تھا۔ ہشام نے اس کی جگہ خالد بن عبداللہ کو اس عہدے پر متمکن کیا۔ اس وقت ترکستان کے ساتھ مسلمان برسر پیکار تھے اور مسلم بن سعید والی خراسان ان سے مقابلہ کر رہا تھا۔ یہ خالد کے حکم سے فرغانہ کی طرف بڑھا۔ یہاں کے حاکم نے مسلمانوں کو ہر طرف سے گھیر لیا اور وہ ایک بہت بڑے خطرہ میں پڑ گئے لیکن مسلم اپنی ہوشیاری سے اپنی فوج کو ان کے چنگل میں نکال لایا۔

اس مہم کے بعد خالد نے مسلم کو خراسان کی گورنری سے ہٹا کر اپنے بھائی اسد بن سعید کو اس کی جگہ بھیجا اور جنید بن عبدالرحمٰن کو سندھ کی ولایت پر مقرر کیا۔ اسد بن سعید نے سنہ ۱۰۷ھ میں غور پر فوج کشی کی۔ غوری اپنا تمام مال و متاع ایک غار میں چھپا کر خود ہٹ گئے۔ اسد نے وہ تمام مال و متاع وہاں سے نکلوا کر صحیح و سالم واپس آیا۔ اس نے پھر سنہ ۱۰۸ھ میں دوبارہ غور پر حملہ کر کے غوریوں کو شکست فاش دی۔ اس میں قبائلی عصبیت زیادہ تھی جس کی وجہ سے قبائل میں جنگ کا شدید خطرہ تھا۔ اس نے قحطان کی طرف داری اور مضر کی مخالفت برملا شروع کر دی۔ اس نے نصر بن سیار، عبدالرحمٰن بن نعیم، سورہ بن حر، بختری بن ابی درہم جیسے سردارانِ مضر کو کوڑے لگوائے اور ان کے سر منڈوا کر اپنے بھائی خالد کے پاس عراق بھیج دیا۔ سنہ ۱۰۶ھ میں قحطانی اور مضری قبائل میں ایک جنگ بھی ہو چکی تھی۔ اسد کے طرز نے عصبیت کی آگ پر تیل کا کام دیا اور مسلمانوں میں جاہلیت کی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ہشام کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو اس نے سنہ ۱۰۹ھ میں اسے معزول کر کے امیر اشرس بن عبداللہ سلمی کو خراسان کا گورنر بنایا۔ یہ بڑا فاضل اور دین دار امیر تھا۔ اس نے تلوار روک کر ترکستان میں اسلام کی اشاعت شروع کی اور ربوا الصیداء کو ایک جماعت کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لیے سمرقند بھیجا۔ اس کی اس تبلیغی کوشش سے اس کثرت سے ذمی مسلمان ہوئے کہ جزیہ کی آمدنی کم ہوگئی۔ یہ عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ نہ تھا کہ جزیہ کی آمدنی گھٹنے کی اسلام کی اشاعت کے مقابلہ میں کوئی پروانہ کی جاتی۔ لہٰذا اشرس کو باز پرس کا خطرہ پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے سمرقند کے عامل کو لکھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ ذمیوں نے جزیہ سے بچنے کے لیے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا ہے، اس لیے اس وقت تک ان کا جزیہ معاف نہ کیا جائے جب تک کہ وہ ختنہ نہ کرائیں اور اسلامی فرائض ادا کر کے اپنے سچے مسلمان ہونے کا ثبوت نہ دیں۔

نومسلم اشرس کے اس حکم سے نہایت برہم ہوئے اور سات ہزار کی تعداد میں لڑنے کے لیے میدان میں آ گئے۔ بہت سے نیک نہاد مسلمانوں نے بھی اس بارے میں ان کا ساتھ دیا جن میں ابوالصیداء بھی تھے۔ اشرس نے محشر بن مزاحم کو ان کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ محشر نے ابوالصیداء اور دوسرے مسلمانوں کو جو نومسلموں کی حمایت میں اٹھے تھے، دھوکہ سے گرفتار کر کے اشرس کے پاس بھیج دیا۔ پھر نومسلم ترکوں سے بزور شمشیر جزیہ وصول کیا اور ان کے سرداروں کی توہین کی۔ محشر کے اس طرز عمل سے سمرقندی نومسلم مرتد ہو گئے۔ انھوں نے

Marfat.com

ترکوں سے امداد طلب کی۔ اس کے ساتھ ہی صغد اور بخارا میں پھر بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ترکوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور سارے ماوراء النہر میں شورش برپا ہوگئی۔

صورت حال کی نزاکت کو دیکھ کر اشرس خود مقابلہ کے لیے نکلا۔ اس کے ساتھ قطن بن قتیبہ بھی تھا۔ دریائے جیحون کو پار کر کے اہل کے قریب اشرس کا صغد اور ترک کے متحدہ لشکروں سے مقابلہ ہوا۔ مقابلہ نہایت سخت تھا اور قریب تھا کہ مسلمان شکست کھا جائیں لیکن اشرس کی ہوشیاری سے انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔

پھر اشرس نے آگے بڑھ کر باغیوں کے مرکز بیکند کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں ترکوں نے مسلمانوں کا پانی روک دیا جس کے نتیجہ میں سات سو مسلمان پیاسے مر گئے۔ آخر مسلمان محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہوگئے اور پانی کی تلاش میں نکلے۔ ترکوں نے روکنے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے انھیں شکست دے کر بالآخر پانی حاصل کر لیا۔ اور پانی سے خوب سیراب ہو کر دشمن کو ان کے مورچوں سے ہٹا دیا۔

ابھی یہ جنگ جاری ہی تھی کہ ترکستان کے فرماں روا قان نے اہل فرغانہ، رفشینہ اور نسف کو ساتھ لے کر خراسان کی اسلامی آبادی، ''کمرجہ'' کا محاصرہ کر لیا، کمرجہ کے محصور مسلمانوں نے شہر کے پھاٹک بند کر لیے، خندق کا پل توڑ دیا اور شہر بند ہو کر دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ ترکوں نے شہر کے گرد کی خندق کو گیلی لکڑیوں سے پُر کر کے راستہ نکالنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں نے اندر سے خشک لکڑیاں ڈال کر انھیں آگ لگا دی جس سے ترکوں کی سات روز کی محنت ایک گھنٹہ میں ختم ہوگئی۔ ترکوں نے مسلمانوں کو باہر نکالنے کے لیے ایک سو مسلمان قیدیوں کو فصیل کے نیچے قتل کر کے اور ان کے سر کاٹ کر شہر میں پھینک دیئے۔ مسلمانوں نے اتنی ہی تعداد میں ترک قیدیوں کے سر کاٹ کر باہر پھینک دیئے۔ غرض مٹھی بھر مسلمان مرد، عورتیں اور بچے سر بکف ہو کر دو ماہ تک ٹڈی دل دشمنوں کے دانت کھٹے کرتے رہے۔

ترکستان کے خاقان کو محاصرہ کے دوران یہ اطلاع ملی کی اسلامی فوجیں فرغانہ پہنچ گئی ہیں۔ یہ اطلاع پا کر اس نے کمرجہ کے محصور مسلمانوں کو کہلا بھیجا کہ ہماری عادت یہ نہیں کہ ہم جس شہر کا محاصرہ کریں اسے بغیر فتح کیے چھوڑ دیں۔ البتہ ہم تمھارے ساتھ اتنی رعایت کر سکتے ہیں کہ تم شہر چھوڑ کر چلے جاؤ، ہم تم سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔

مسلمانان کمرجہ نے خاقان کی اس بات کے جواب میں کہا:

''ہمارا یہ طریقہ نہیں کہ جو شہر ہمارے قبضہ میں ہو ہم اسے جیتے جی اپنے ہاتھ سے دے دیں۔'' ہمارا مذہب ہمیں ایسا شہر دشمن کے حوالے کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لیے جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو کر گزرو۔''

ان محصورین مسلمانوں کا ثبات واستقلال دیکھ کر خاقان نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ کمرجہ چھوڑ دیں تو انھیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ دشمن کثیر تعداد میں تھا اور دو ماہ سے محاصرہ جاری تھا، اس وجہ

Marfat.com

سے مسلمانوں کی قوت مدافعت کم ہو رہی تھی، اس لیے انھوں نے پورا طمینان حاصل کر کے کمرجہ خالی کر دیا۔ خاقان اپنے وعدہ پر قائم رہا اور مسلمانوں کو دبوستہ تک پہنچانے کے لیے ایک دستہ حفاظت کے لیے ساتھ کر دیا اور وہ بحفاظت دبوسہ پہنچ گئے۔

سنہ ۱۱۱ھ میں ہشام بن عبدالملک نے اشرس کو معزول کر کے اس کی جگہ جنید بن عبدالرحمٰن مضری کو خراسان کا حاکم مقرر کر دیا۔ جنید مضری نے اپنے ماتحت تمام افسر مضری مقرر کیے۔ جنید نے بھی ترکستان کی مہم کو جاری رکھا اور اس کے ترکوں کے ساتھ کئی معرکے ہوئے۔ آخری معرکہ میں ترکوں نے شکست فاش کھائی اور خاقان کا چچازاد بھائی گرفتار ہوا۔

سنہ ۱۱۲ھ میں جنید طخارستان پر حملہ آور ہونے کے ارادے سے نکلا۔ ترکوں کو جب یہ خبر ملی تو وہ ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ سمرقند کے ارادہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ سمرقند کے گورنر سورہ بن حر نے جنید کو لکھا کہ ''مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اس بڑی فوج کا مقابلہ کر سکوں، لہٰذا آپ فوری طور پر میری مدد کے لیے آیئے۔'' جنید نے اپنے بارہ ہزار فوجیوں کے ساتھ سمرقند پہنچ کر سورہ کی مدد کا ارادہ کیا۔ اس کے رفقاء اور تجربہ کار لوگوں نے اسے سمجھایا کہ پہلے امراء خراسان میں سے کسی نے بھی پچاس ہزار سے کم فوج کے ساتھ دریائے جیحون کو عبور نہیں کیا ہے۔ آپ مزید کمک کا انتظار کریں، لیکن جنید نے کہا کہ مجھے سورہ بن حر کی مدد کے لیے جلد سے جلد پہنچنا ہے اس لیے میں مزید کمک کا انتظار نہیں کر سکتا۔ جنید اپنے بارہ ہزار فوجیوں کے ساتھ دریا کو عبور کر کے ''کس'' میں مقیم ہوا اور ترکوں سے مقابلہ کی تیاری کی۔ پھر وہاں سے چل کر سمرقند کے قریب ایک گھاٹی میں خیمہ زن ہوا۔ خاقان کو خبر ہوئی تو وہ ترکوں کے مختلف قبائل کی جمعیت عظیم لے کر اندھیرے منہ مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ مسلمانوں نے قلت تعداد کے باوجود بڑی بہادری اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور ترکوں کے دانت کھٹے کر دیئے دو دن کے سخت مقابلہ کے بعد مسلمانوں نے اپنے اندر کمزوری کے آثار پائے۔ جنید نے سمرقند میں جو قریب تھا، سورہ کو حالات کی نزاکت کی اطلاع دی اور اس سے مدد طلب کی۔ سورہ بارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ سمرقند سے نکل کھڑا ہوا۔ جب جنید اور سورہ کے درمیان ایک فرسخ کا فاصلہ رہ گیا تو ترک درمیان میں حائل ہو گئے اور دریا کے کنارے کے جھاڑ جھنکاڑ میں آگ لگا دی۔ سورہ نے ترکوں کو ہٹا کر جلد از جلد جنید سے مل جانے کا عزم کیا۔ مسلمانوں نے ایسا سخت حملہ کیا کہ ترکوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ لڑائی کے گرد و غبار کی وجہ سے آگ کے شعلے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اس افراتفری کے عالم میں گورنر سمرقند سورہ بن حر گھوڑے سے گر گیا اور اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ سورہ کے زخمی ہونے کے باعث مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ ترکوں نے پلٹ کر حملہ کیا اور مسلمانوں کی پوری فوج کو تہ تیغ کر دیا۔ بارہ ہزار آدمیوں میں سے صرف دو ہزار زندہ بچے ان میں سے سات سو آدمیوں نے مرغاب میں پناہ لی۔ ایک ترک افسر غورک ان سے جان بخشی کا وعدہ کر کے انھیں خاقان کے پاس لے گیا، لیکن اس نے غورک کی

Marfat.com

امان رد کر دی اور مسلمانوں نے لڑ کر مردانہ وار اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی۔

سورہ کی فوج کی تباہی کی خبر سن کر جنید نے سمرقند سے نکلنا چاہا لیکن ایک مسلمان نے اٹھ کر اس کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ اس درمیان میں ترک بھی آ گئے۔ اس لیے جنید کے لیے اب جنگ کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ جو غلام اس جنگ میں کوئی نمایاں کام دکھائے گا وہ آزاد ہے۔'' اس اعلان پر غلام اس بہادری سے لڑے کہ ترکوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ترکوں کے پسپا ہونے کے بعد جنید سمرقند میں داخل ہوا اور ہشام میں عبدالملک کو مفصل حالات لکھ بھیجے۔ سورہ بن حر ایک بہادر جرنیل تھا۔ خلیفہ کو اس کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔ ترکوں سے انتقام لینے کے لیے اس نے بیس ہزار منتخب فوج اور سامانِ حرب سمرقند بھیجا اور جنید کو فوج کی تنخواہیں بڑھانے کا بھی اختیار دیا۔

جنید ابھی سمرقند ہی میں مقیم تھا کہ اسے بخارا کی جانب خاقان کی پیش قدمی کی خبر ملی۔ سمرقند سے بخارا کا راستہ پہاڑی، پُرخطر اور دشوار گزار تھا۔ ہر قدم پر ترکوں کے حملے کا خطرہ تھا، لیکن بخارا کے باشندوں کی امداد کے لیے پہنچنا بھی ضروری تھا۔ لیکن مسلمان پوری احتیاط اور انتظام کے ساتھ اس دشوار گزار راستہ کو طے کر گئے۔ کرمینیہ کے نزدیک خاقان کی فوج کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ ہوا۔ آگے بڑھ کر ترکوں نے اسلامی فوج کے پچھلے حصے پر چھاپا مارا۔ اس حملہ میں ترکوں کا ایک نامور افسر کام آیا، اس لیے وہ واپس لوٹ گئے اور جنید بخیرو عافیت بخارا میں داخل ہوا۔ اہل بخارا نے اس برموقع امداد پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور ہر مسلمان سپاہی کو شکرانہ کے طور پر دس درہم دیئے۔

سنہ ۱۱۶ھ میں ہشام بن عبدالملک نے جنید کو اس جرم میں معزول کر دیا کہ اس نے یزید بن مہلب کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اس کے بجائے عاصم بن عبداللہ ہلالی کو خراسان کا گورنر بنا کر بھیجا۔ ہشام بن عبدالملک نے عاصم کو یہ بھی ہدایت کی کہ وہ جنید پر قابو پالے تو اسے زندہ نہ چھوڑے، لیکن جنید استسقا کی بیماری میں مبتلا تھا عاصم کے خراسان پہنچنے سے قبل ہی وہ اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ عاصم نے جنید کے جانشین سے سخت برتاؤ کیا۔

عاصم بن عبداللہ ہلالی کو ابھی خراسان پہنچے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ایک مسلمان امیر حارث بن شریح نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس نے سیاہ لباس کو اپنا شعار بنایا اور لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ اور آزادی انتخاب خلیفہ کے نام پر بیعت کی دعوت دی۔ ہزاروں لوگوں نے اس دعوت پر اس کا ساتھ دیا اور ان کی مدد سے بلخ، جوزجان، طالقان وغیرہ بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا اور خراسان کے پایہ تخت مرو کی طرف بڑھا لیکن عاصم نے اسے شکست دے کر واپس لوٹا دیا۔ اس کے بے شمار آدمی مارے گئے، بہت سے دریا میں ڈوب کر مرے۔ حارث جان بچا کر وادئ مرو سے نکل گیا۔ عاصم نے اس کا تعاقب مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد عاصم نے ہشام بن عبدالملک کو لکھا کہ

''خراسان کا امن و امان اس امر کا مقتضی ہے کہ اسے ولایت عراق سے ملحق کر دیا جائے۔ اس

Marfat.com

صورت میں بوقت ضرورت فوجی مدد پہنچنے میں آسانی ہوگی ورنہ مرکز سے دور ہونے کے باعث بغاوت وشورش جاری رہے گی۔''

انتظامی حیثیت سے یہ تجویز اچھی تھی، اوراس سے قبل بھی خراسان کا صوبہ ہمیشہ عراق کے ماتحت رہا تھا۔ کچھ سالوں سے اسے عراق سے کسی مصلحت کے تحت الگ کر دیا گیا تھا۔ عاصم کی اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے ہشام بن عبدالملک نے خراسان کو عراق سے ملحق کر دیا لیکن اسے عاصم کے ماتحت کرنے کے بجائے خالد بن عبداللہ قسری والی عراق کے تحت رکھا اوراس کے بھائی اسد بن عبداللہ قسری کو خراسان کا والی مقرر کیا اور عاصم کو معزول کر دیا۔ عاصم کو اپنی معزولی کی خبر پہنچی تو وہ نہایت برافروختہ ہوا۔ اس نے حارث بن شریح کے پاس پیغام بھیج کر اس شرط پر صلح کر لی کہ حارث خراسان کے جس پرگنہ میں چاہے اقامت اختیار کرے اور دونوں مل کر ہشام بن عبدالملک کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیں۔

عاصم کی اس مصالحت کو امرائے لشکر نے پسند نہ کیا اور حارث سے لڑنے پر مجبور کیا۔ مجبوراً حارث کو مقابلہ میں آنا پڑا۔ حارث کو شکست ہوئی اور وہ مرو روز کی طرف چلا گیا۔ اس دوران میں اسد بن عبداللہ قسری خراسان پہنچ گیا اور اس نے عاصم کو گرفتار کرلیا اوراس سے بیت المال کے ایک لاکھ درہم کے بقایا کا مطالبہ کیا۔ اسد نے جنید کے عمال کو بھی جنھیں عاصم نے گرفتار کرلیا تھا، رہا کر دیا۔

اس شکست کے بعد بھی حارث کی قوت نہ ٹوٹی بلکہ اس کی شورش اور بڑھ گئی اور خراسان کے اور بہت سے شہروں پر اس نے قبضہ کرلیا۔ حارث اور اسد کے درمیان کئی ماہ تک معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ بڑی مشکلوں کے بعد ۱۱۸ھ میں حارث کا زور ٹوٹا اور وہ خراسان سے بھاگ خاقان سے جا کر مل گیا۔

حارث کی بغاوت ختم ہونے کے بعد اسد نے اب پھر ترکستان کی طرف توجہ کی اور ۱۱۹ھ میں ختل پر فوج کشی کی اوراس کے سب سے بڑے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ ختل کے اور بھی کئی قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ یہاں سے بہت سا مال غنیمت اور قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ اس کے بعد اسد نے ختل کی وادیوں میں اپنی فوجیں پھیلا دیں۔ ختل اپنے علاقے کو چھوڑ کر چین کی طرف نکل گئے۔ خاقان کو جب معلوم ہوا تو وہ فوراً مقابلہ کے لیے پہنچا۔ اسد اس وقت واپس لوٹ رہا تھا۔ جیحون کے پار دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ حارث بن شریح اس لڑائی میں خاقان کے ساتھ تھا۔ اسد نے خاقان کو شکست فاش دی اور تین فرسخ تک اس کا تعاقب کیا۔ بے شمار ترک قتل ہوئے اور بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اسد بخارا لوٹ آیا اور سردیوں کا موسم یہیں گزارا، اور خاقان بھی اپنے علاقے میں چلا گیا۔ خاقان نے پھر مسلمانوں سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور اس مقصد کے لیے خاقان نے پانچ ہزار خچروں سے حارث کی مدد کی۔ اسی دوران خاقان اور مشہور ترک سردار کورصول کے ساتھ چوگان کھیلنے میں خاقان کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ کہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان لڑائی ہوگئی اور کورصول نے خاقان کا ہاتھ توڑ دیا۔ خاقان اس پر بگڑ گیا اور اس نے قسم کھائی کہ وہ کورصول کا ہاتھ توڑ کر رہے

Marfat.com

گا۔ خاقان کی اس دھمکی پر کورصول خاقان کے خلاف ہو گیا اور شب خون مار کر خاقان کو قتل کر دیا۔ خاقان کے قتل سے ترکوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ان کی طاقت ٹوٹ گئی اور ان میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اسد نے ہشام بن عبدالملک کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے بارگاہ خداوندی میں سجدہ شکر ادا کیا۔ اسد نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ختل پر فوج کشی کر دی۔ ترک مقابلہ نہ کر سکے اور ختل چین چلے گئے اور پھر کچھ دنوں کے بعد انھوں نے کورصول کو اپنا قائد بنایا۔

سنہ ۱۲۰ھ میں اسد کا بلخ میں انتقال ہو گیا۔ اسی سال ہشام بن عبدالملک نے خالد بن عبداللہ کو اس کے مخالفوں کی ایک سازش کی بنا پر معزول کر دیا اور اس کے بجائے یوسف بن عمر نے عراق پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خالد اور اس کے عمال کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ یوسف نے نصر بن سیار کو خراسان کا حاکم مقرر کیا۔

نصر بن سیار ایک نہایت مدبر، عادل، شجاع اور جرأت مند افسر تھا۔ اس نے آتے ہی ہر شعبہ کو ترقی دی۔ مظالم کی تحقیقات کا محکمہ قائم کیا۔ معلوم ہوا کہ تیس ہزار مسلمان ایسے ہیں جن سے جزیہ وصول کیا جاتا ہے اور اسی ہزار غیر مسلم ایسے ہیں جن کا جزیہ معاف کر دیا گیا ہے۔ اس نے اس بدعنوانی کا ایک ہفتہ کے اندر اندر انسداد کیا۔ پھر اس نے خراج کی بدنظمی کو دور کیا۔ اندرونی اصلاحات سے فارغ ہو کر اس نے ترکوں کے علاقوں پر پے در پے فوج کشی کی۔

سنہ ۱۲۰ھ میں جب نصر تیسری مرتبہ جہاد کے لیے شاش کی طرف نکلا۔ دریائے شاش (چاچ) کے قریب کورصول نے جو خاقان کو قتل کر کے ترکوں کا قائد بنا تھا، مسلمانوں کی لشکر گاہ پر چھاپا مارا۔ اتفاق سے وہ ایک مسلمان افسر عاصم بن عمرو کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور نصر کے سامنے پیش کیا گیا۔ کورصول بڑا بہادر اور شجاع افسر تھا لیکن مسلمانوں کا بڑا خطرناک دشمن تھا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف ۷۲ لڑائیاں لڑ چکا تھا۔ نصر نے اسے قتل کرا کر اس کی لاش کو دریا کے کنارے منظر عام پر لٹکا دیا۔ کورصول کے قتل سے ترکوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ انھوں نے اس کے ماتم میں اپنے کان کاٹ لیے اور اپنے گھوڑوں کی دموں کے بال تراش دیئے اور اپنے گھروں کو آگ لگا کر نکل گئے۔

حارث بن شریح خاقان کے قتل کے بعد کورصول کے ساتھ ہو گیا تھا اور اس معرکہ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کی غدارانہ سرگرمیاں برابر جاری تھیں بلکہ روز بروز ان میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یوسف بن عمر نے نصر کو لکھا کہ وہ حارث کی ان سرگرمیوں کا تدارک کرے۔ نصر نے یحییٰ بن حصین کو حارث کے استیصال کے لیے شاش روانہ کیا۔ حارث ایک ترک سردار خرم کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلا۔ خرم (آخرم) جنگ میں قتل ہو گیا۔ خرم کی موت کے بعد شاش والوں کی ہمت جواب دے گئی۔ اسی دوران میں نصر بھی پہنچ گیا۔ شاش کے فرماں روا نے صلح کا پیام دیا۔ نصر نے اس کی صلح کو اس شرط پر منظور کیا کہ وہ حارث کو اپنے یہاں سے نکال دے۔ شاش کے حاکم نے مسلمانوں کی اس شرط کو منظور کر لیا، اور حارث شاش سے نکل کر فاراب چلا گیا اور کئی سال کی دشت

Marfat.com

نوردی اور آوارہ گردی کے بعد سنہ ۱۲۷ھ میں خراسان واپس آکر مسلمانوں سے مل گیا۔

شاش سے فراغت کے بعد نصر فرغانہ کی طرف بڑھا لیکن ابتدائی معرکوں کے بعد ہی فرغانہ کے حاکم نے صلح کی درخواست کردی۔ نصر نے اس کی اس درخواست کو منظور کرلیا اور اس نے اپنی ماں کو جو بہت مدبر اور جہاں دیدہ عورت تھی، نصر کے پاس صلح کی تکمیل کے لیے بھیجا۔

خاقان اور کورصول کے بعد اب ترکوں میں کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو ان کی قیادت کرتا۔ وہ مسلسل لڑتے لڑتے سخت پریشان ہو چکے تھے۔ ان کا شیرازہ تشتت وانتشار کا شکار ہو چکا تھا اور اب ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ وہ اپنے وطن میں امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کریں، اور وہ یہ چاہتے تھے کہ نومسلم صغد سے جو شخص اپنے مذہب میں لوٹ جائے اسے سزا نہ دی جائے۔ ان کے مذہبی امور میں مداخلت نہ کی جائے، اور ان کے پاس جو مسلمان قیدی ہیں، انھیں بغیر عادل قاضی کے فیصلہ کے بجز واپس نہ لیا جائے۔ خراسان کے سابق والی ان مطالبات کو منظور نہ کرتے تھے، لیکن نصر ایک نہایت مدبر امیر تھا، وہ ایک نہایت اندیش اور دور بین جرنیل اور گورنر تھا اس نے ان کی ان سب شرائط کو منظور کرلیا، اور ایک طویل عرصہ کے کشت وخون کے بعد صغد اور مسلمان دونوں کو سکون واطمینان حاصل ہوا۔

آرمینیہ اور آذربائیجان:

آرمینیہ اور آذربائیجان کے علاقے بھی برسوں مسلمانوں اور ترکوں کی رزم گاہ بنے ہوئے تھے۔ یہاں کا گورنر جراح بن عبداللہ حکمی تھا۔ جراح نے بلنجر تک کا علاقہ فتح کرلیا تھا۔ سنہ ۱۰۷ھ میں ہشام نے جراح کو معزول کر کے اپنے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ مسلمہ نے حارث بن عمر طائی کو اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ حارث نے ترکوں کے بہت سے شہروں کو اسلامی مملکت شامل کرلیا اور ان پر اپنی فتوحات کی دھاک بٹھا دی۔ سنہ ۱۱۰ھ میں مسلمہ بن عبدالملک بذات خود باب الدان سے ترکی کے علاقہ میں داخل ہو۔ اس کے مقابلہ کے لیے خاقان خود ایک بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلا۔ ایک ماہ تک طرفین میں لڑائی جاری رہی۔ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور خاقان بھاگ گیا۔

سنہ ۱۱۱ھ میں ہشام نے مسلمہ کو معزول کر کے پھر جراح بن عبداللہ حکمی کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ جراح نے تفلس کی طرف سے بلاد خزر پر حملہ کیا۔ مدینہ بیضاء مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا اور جراح سالم وغانم لوٹا۔ یہ شہر جراح نے بحری حملہ کر کے فتح کیا تھا۔

مسلمانوں کی واپسی کے بعد خزر نے مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی بڑے زور شور سے تیاری شروع کردی۔ لان کے علاقہ کے ترک بھی ان سے آن ملے۔ جراح نے آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ مرج وابیل میں فریقین میں ہولناک جنگ ہوئی جس میں جراح بن عبداللہ حکمی کام آئے۔ جراح کے قتل سے ترکوں کے

Marfat.com

حوصلے بڑھ گئے۔ جراح کے اہل و عیال بھی خزر کے ہاتھوں قید ہو گئے۔ اب انھوں نے اسلامی علاقہ کی طرف رخ کیا اور یورش کرتے ہوئے موصل تک پہنچ گئے۔ ترکوں کی یہ پیش قدمی مسلمانوں کے لیے بڑی خطرناک تھی کیونکہ اس سے پورا کردستان خطرہ میں پڑ گیا تھا۔

ہشام بن عبدالملک کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے سعید حرشی کو آذربائیجان بھیجا اور تمام فوجی افسروں کو ان کی مدد کرنے کا حکم نامہ جاری کیا۔ سعید مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دیتا اور انھیں ساتھ لیتا ہوا ازن آیا اور وہاں جراح کے باقی ماندہ شکست خوردہ فوج کو ساتھ لے کر خلاط پہنچا اور اسے فتح کر لیا۔ پھر وہاں سے آگے بڑھا اور راستہ میں چھوٹے چھوٹے قلعے فتح کرتا ہوا برذرعہ آیا۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ خاقان کا بیٹا ورثان کے مسلمانوں کا محاصرہ کیے ہوئے اسلامی آبادیوں کو تاخت و تاراج کر رہا ہے۔ اہل ورثان کے پاس کوئی جنگی قوت نہ تھی۔ سعید نے ورثان کے محصور مسلمانوں کو پیغام بھجوایا کہ وہ لوگ ہمت و جرأت اور صبر و استقلال سے کام لیں، ہم تم لوگوں کی مدد کو جلد پہنچ رہے ہیں۔ اتفاق سے مسلمان قاصد دشمن کے ہاتھ پکڑا گیا۔ انھوں نے جبریہ اس سے وعدہ لیا کہ وہ ان کے سامنے اہل ورثان کو اس بات کا یقین دلائے کہ انھیں باہر سے کوئی مدد نہیں مل سکتی، اس لیے وہ ورثان کا شہر ان کے حوالے کر دیں۔ قاصد نے مصلحتاً اقرار کر لیا لیکن شہر کے قریب پہنچ کر بلند آواز سے اعلان کیا کہ ”میں سعید حرشی کا قاصد ہوں اور میرا یہ نام ہے، وہ عنقریب تمھاری مدد کے لیے پہنچ رہے ہیں۔ تم لوگ دو دن صبر و استقلال سے کام لو۔ خزر نے قاصد کو تو قتل کر دیا لیکن جو پیغام وہ لے کر آیا تھا وہ اہل ورثان تک پہنچ گیا اور ان کی اس پیغام سے ہمت بڑھ گئی۔ اس درمیان میں سعید حرشی ورثان کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ خاقان کے بیٹے کو جب مسلمانوں کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ محاصرہ اٹھا کر چلتا بنا، لہٰذا حرشی کوئی مقابلہ کیے بغیر شہر میں داخل ہو گیا۔ ورثان سے سعید اردبیل آیا۔ وہاں سے باجروان پہنچ کر معلوم ہوا کہ قریب ہی دس ہزار کی تعداد میں خزر کا لشکر خیمہ زن ہے اور ان کے ساتھ پانچ ہزار مسلمان قیدی بھی ہیں۔ سعید راتوں رات چل کر پو پھٹنے سے قبل غافل خزر پر حملہ آور ہو گیا اور پورے جرگہ کو ختم کر دیا اور تمام مسلمان قیدی رہا کروا لیے۔ اس کے بعد یہ اطلاع ملی کہ قریب ہی ایک دوسرا گروہ موجود ہے اور جرأ کے اہل و عیال ان کے ساتھ قیدی ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی سعید حرشی فوری طور پر وہاں پہنچا اور دفعۃً حملہ کر کے اس گروہ کو بھی ختم کر دیا اور جراح کے اہل و عیال اور دوسرے مسلمان قیدیوں کو ان کی قید سے چھڑا لیا۔

ان دونوں گروہوں کی تباہی کے بعد خزر نے اپنی عسکری قوت کو پھر مجتمع کرنا شروع کر دیا۔ خاقان کا لڑکا بھی ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کر رہا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ ایک لشکر جرار کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلے۔ دوسری طرف سعید حرشی بھی اپنی فوج کو لے کر آگے بڑھا۔ نرند (برزند) کے قریب دونوں فوجوں کا سخت مقابلہ ہوا۔ جنگ سخت ہولناک تھی۔ خزر کا حملہ اتنا شدید تھا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر خزر کی فوج کے مسلمان قیدیوں نے نعرہ ہائے تکبیر بلند کیا۔ دوسری طرف سے سعید

Marfat.com

نے فوج کو للکارا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے پاؤں جم گئے اور دشمن پر پلٹ کر اس جوش اور جذبہ کے ساتھ خزر پر حملہ کیا کہ ان کے جمے ہوئے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے دریائے ارس تک ان کا تعاقب کیا۔ اس جنگ میں بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور ان کے پنجہ سے مسلمان قیدیوں کو چھڑا کر باجروان پہنچایا۔

اس شکست سے خاقان کا لڑکا اور زیادہ مشتعل ہو گیا اور اب خزر نے اپنی منتشر عسکری قوت کو جمع کرنا شروع کر دیا اور خاقان کے بیٹے کی سرکردگی میں مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے نکلے۔ دریائے بیلقان کے کنارے ان کا اور مسلمانوں کا مقابلہ ہوا۔ خزر اب بھی بڑی جرأت اور جانبازی سے لڑے اور ایک خون ریز جنگ کے بعد اس بدحواسی میں پسپا ہوئے کہ ان کی فوج کا ایک اچھا خاصا حصہ دریائے بیلقان میں غرق ہو گیا۔ سعید حرشی نے مال غنیمت کا خمس اور ان کامیابیوں کی اطلاع ہشام کو دی اس نے ان کامیابیوں پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔

سنہ ۱۱۲ھ میں ہشام نے سعید حرشی کو واپس بلا لیا اور اپنے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کو دوبارہ آرمینیہ اور آذر بائیجان کا گورنر مقرر کیا۔ مسلمہ نے آتے ہی خاقان کے علاقہ میں مسلمان فوجیں پھیلا دیں۔ بہت سے شہر اور قلعے فتح کیے۔ بہت سے ترک قید کیے اور ماورائے بلنجر کے تمام علاقے پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اسی دوران میں خاقان کا لڑکا مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ خزر اور دوسرے تمام قبائل جوش انتقام میں متحد ہو کر مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے میدان میں آ گئے۔ اس وقت ان کی تعداد بے اندازہ اور ان گنت تھی۔ ان کے دلوں میں انتقام کا جوش ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ تخت یا تختہ کا عندیہ لے کر میدان میں آئے تھے۔ مسلمہ بن عبدالملک اس وقت بلنجر کو پار کر چکا تھا۔ وہ تدبیر سے اپنی فوج کو خطرہ سے نکال کر بسرعت تمام باب الابواب لوٹ آیا اور ترکوں کے انتقام کا جذبہ دل ہی دل میں رہ گیا۔ اس نے جو کچھ کیا وہ درست تھا اور مصلحت اور وقت کا تقاضا بھی یہی تھا، لیکن بعض اس کے اپنے جرنیلوں نے اس کے اس فعل کو کمزوری پر محمول کیا جب کہ وہ خیمہ اور خرگاہ بھی وہیں چھوڑ آیا تھا۔ ہر جرنیل کا اپنا نقطۂ نگاہ ہوتا ہے۔ اس نے یہی سمجھا کہ اس میں اس انبوہ عظیم کی مقابلہ کی طاقت نہیں اس لیے وہ واپس باب الابواب آ گیا۔ ہشام کا چچیرا بھائی مروان بن محمد نے جوان معرکوں میں اس کے ساتھ تھا، واپس جا کر ہشام سے مسلمہ کی اس کمزوری کی شکایت کی اور خزر کے مقابلہ میں اپنی خدمات پیش کیں۔ چنانچہ سنہ ۱۱۳ھ میں ہشام نے مسلمہ کو واپس بلا لیا اور مروان بن محمد کو اس کی جگہ امیر لشکر مقرر کر دیا۔

مروان بن محمد ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر عظیم لے کر بلاد خزر میں داخل ہوا اور تمام علاقے کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک روند ڈالا۔ مروان نے طریقہ یہ اختیار کیا کہ آرمینیہ آنے کے بعد اس لان پر فوج کشی کا ارادہ کیا لیکن ساتھ ہی خزر کو صلح کا پیغام دیا۔ خزر نے اس پیغام کو منظور کر لیا اور مزید گفتگو کے لیے اپنا قاصد بھیجا۔ مروان نے اس کو چند روز تک اپنے پاس روکے رکھا، اور جنگ کی تیاری مکمل کرنے کے بعد جنگ کا پیغام

Marfat.com

دے کر قاصد کو واپس کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی خود ایک بہت بڑی فوج لے کر نہایت جلدی سے منزلیں طے کرتا ہوا خزر کے علاقہ میں داخل ہو گیا۔ خزر کے فرماں روا نے صلح کی امید پر جنگ کی کوئی تیاری نہ کی تھی، اس لیے مروان کے اس اچانک حملے کا وہ مقابلہ نہ کر سکا اور پایہ تخت کو چھوڑ کر سرحدی علاقہ کی طرف نکل گیا اور مروان بغیر کسی مزاحمت کے خزر کے علاقہ میں دور تک بڑھتا چلا گیا۔ اس مہم میں اسے بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا۔

چند دنوں تک مروان نے خزر کے علاقہ میں قیام کیا تا کہ فوج کی تھکاوٹ دور ہو جائے۔ پھر اس نے اطراف ونواح کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی طرف توجہ کی۔ سر برا وزرگراں کے رئیسوں اور لکز، قران اور شروان کے باشندوں نے صلح ہی میں اپنی خیر سمجھی۔ ان سب علاقوں کو باجگزار بنا کر مروان بن محمد نے آرمینیہ اور آذر بائیجان کے تمام علاقے میں اسلامی طاقت کی دھاک بٹھا دی۔ بحر خزر کے کنارے تمام شہر مسلمانوں کے زیر نگین ہو گئے اور خزر کا حکمران ذلت ونکبت کے ساتھ سرحدی علاقہ کی طرف بھاگ گیا۔ ان سب علاقوں کو مطیع اور زیر نگین کرنے کے بعد سالم وغانم اپنے مستقر کی طرف واپس آیا اور کئی سالوں تک اس علاقہ میں امن وسکون رہا کیونکہ اب کسی میں یہ طاقت نہ تھی کہ مسلمانوں کے خلاف اٹھ کر شورش برپا کر سکے۔ پھر سنہ ۱۱۸ھ میں خزر کے نواح کے ایک سردار درنیس پر فوج کشی کی۔ اس میں مقابلہ کی طاقت نہ تھی، اس لیے وہ شہر چھوڑ کر خزر کے علاقہ میں نکل گیا۔ مروان نے اس کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اسی درمیان میں کسی غیر معلوم شخص نے درنیس کو بھاگنے کی حالت میں قتل کر دیا اور اس کا سر قلم کر کے مروان کے پاس بھیج دیا۔ درنیس کے قتل کے بعد اہل قلعہ نے اطاعت قبول کر لی۔ ایک سال بعد سنہ ۱۱۹ھ میں مروان لان سے ہوتا ہوا خزر کے علاقہ میں داخل ہوا اور بلنجر تک بڑھتا چلا گیا۔ پھر وہ سنہ ۱۲۱ھ میں بحر خزر کے ساحلی علاقہ کی طرف بڑھا اور جزران، شروان، لکز، بیت السریر، ارز، بطران، تومان، حمزین، کیران، طبرسران اور فیلان وغیرہ ان تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور علاقوں کو جو ارمنستان سے طبرستان تک پھیلی ہوئی تھیں، مطیع ومنقاد بنایا۔ (یہ سب واقعات ابن اثیر: ۸۰/۵ اور یعقوبی: ۳۸۱/۳ سے لیے گئے ہیں)

ایشیائے کوچک کی فتوحات:

بلاد اسلامیہ کی شمالی حدود میں مسلمانوں اور رومیوں کے خلاف برابر چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی۔ چونکہ یہاں عظیم الشان رومی سلطنت سے مقابلہ تھا، اس لیے خلفائے بنوامیہ کی اس طرف خصوصی توجہ تھی۔ ''شورتی'' اور ''صوائف'' کی معرکہ آرائیوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور ان فوجوں کے سالار اور جرنیل اکثر و بیشتر نامور فوجی جرنیل اور شاہی خاندان کے ممتاز اراکین منتخب کیے جاتے تھے۔ مروان بن محمد، مسلمہ بن عبدالملک، معاویہ بن ہشام اور سلیمان بن ہشام نے اس نواح میں اسلامی جرأت وبسالت کے بے نظیر نمونے پیش کیے۔ قونیہ، خرشنہ، قیساریہ اور دوسرے بہت سے شہر اور قلعے رومیوں سے چھین کر ان کے دلوں پر مسلمانوں کی بہادری کی دھاک بٹھا دی۔

Marfat.com

عبداللہ بطال ایک نہایت بہادر اور صاحب جرأت وشجاعت جرنیل تھے۔ انھوں نے رومیوں کے خلاف متعدد معرکوں میں حصہ لیا۔ ان کی بہادری کے افسانے اس علاقے میں زبان زد عام وخاص تھے۔ خود عبداللہ بطال کا بیان ہے کہ ایک دفعہ وہ رومی علاقے میں چپکے سے کسی گاؤں میں پہنچے تو وہاں دیکھا کہ ایک ماں اپنے بچے کو یہ کہہ کر رونے سے منع کر رہی ہے کہ بچے! اگر تو روتا رہا تو میں بطال کو بلا لوں گی۔ جب بچہ رونے سے چپ نہ ہوا تو ماں نے اسے گہوارہ سے نکال کر کہا: ''اے بطال! اسے لے جا'' بطال یہ بات سن رہے تھے۔ فوراً گھر میں داخل ہوئے اور بچے کو گود میں لے لیا۔ یہ دیکھ کر ماں حیران اور ششدر رہ گئی۔

عبدالوہاب بن بخت ایک ممتاز تابعی مجاہد تھے۔ وہ رومی معرکوں میں بطال کے ساتھ رہتے تھے۔ سنہ ۱۱۳ھ میں کسی لڑائی میں بطال کے ساتھیوں نے رومیوں کے مقابلہ میں کمزوری دکھائی اور بھاگنے کا ارادہ کیا۔ عبدالوہاب اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر میدان میں پہنچ گئے۔ پھر چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا:

''بہادرو! ادھر آؤ، جنت کا راستہ یہ ہے، افسوس کہ تم جنت کے راستہ سے منہ موڑتے ہو۔''

پھر بہادری سے لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا۔ ان دونوں کی بہادری کے بارے میں بہت سے واقعات کتابوں میں منقول ہیں۔ علاوہ ازیں حکومت اسلامیہ کے بحری بیڑے بھی بحری راستہ سے حدود روم میں حملہ کرتے رہتے تھے۔ ہشام کے زمانے عبدالرحمٰن بن معاویہ بن خدیج امیر البحر تھے اور عبداللہ بن عقبہ افواج بحریہ کا ایک ممتاز افسر۔

سندھ کی مہمات:

محمد بن قاسم کے ہند وسندھ سے چلے جانے کے بعد یہاں مہموں کا سلسلہ رک گیا تھا۔ ہشام کے زمانہ میں یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا لیکن اس زور شور سے نہیں جس زور شور سے محمد بن قاسم کے زمانہ میں شروع ہوا۔ سنہ ۱۰۷ھ میں سندھ کی حکومت پر جنید بن عبدالرحمٰن کا تقرر ہوا تھا۔ اس نے سندھ آنے کے بعد دریائے سندھ کے کنارے کنارے پیش قدمی شروع کی۔ جس علاقہ میں وہ پیش قدمی کر رہا تھا وہ راجہ داہر کے لڑکے جے سنگھ کا علاقہ تھا۔ جے سنگھ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمان ہو گیا تھا، اس وجہ سے انھوں نے اس کی حکومت کو قائم اور برقرار رکھا۔ اس نے جنید کو کہلا بھیجا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور مجھے تمھارے برگزیدہ اور معزز خلیفہ نے برقرار رکھا تھا لہٰذا میرے علاقہ کی حدود میں تمھیں جارحانہ پیش قدمی نہ کرنی چاہیے۔ مجھے تمھاری اس قسم کی نقل وحرکت سے خطرہ ہے۔ جنید نے اسے اطمینان دلایا کہ اس کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا، اور فریقین نے اطمینان کے لیے ایک دوسرے کے پاس یرغمال بھجوا دیے، لیکن جے سنگھ مطمئن نہ ہوا اور دونوں میں اتنی بدگمانی بڑھی کہ دونوں نے اپنے اپنے آدمی واپس بلا لیے۔ جے سنگھ مرتد ہو گیا اور بحری بیڑہ کے ساتھ جنید کے مقابلہ میں آ گیا۔ دونوں کے درمیان دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر مقابلہ ہوا، لیکن جے سنگھ کی بدقسمتی

Marfat.com

سے اس کی کشتی دریا کے پایاب حصہ میں پھنس گئی اور وہ گرفتار ہو گیا۔ جنید نے اسے قتل کرا دیا۔ جے سنگھ کے قتل کے بعد چم اس کی شکایت کرنے کے لیے عراق روانہ ہو گیا۔ جنید کو جب پتہ چلا تو اس نے حیلے بہانوں سے اس کو واپس بلا کر قتل کر دیا۔

کیرج کا علاقہ محمد بن قاسم کے زمانہ میں فتح ہو گیا تھا لیکن اس علاقے نے پھر بغاوت کر دی جے سنگھ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد جے سنگھ سے کیرج کا محاصرہ کیا اور اس کی سنگین اور مضبوط فصیل کو قلعہ شکن آلات سے توڑ کر کیرج پر قبضہ کر لیا۔ کیرج کی فتح کے بعد مختلف جرنیلوں کو مانڈل، دنج، بھرومع، اجین اور مالوہ وغیرہ مختلف سمتوں میں روانہ کیا۔ ان سب نے اپنی اپنی مہموں کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچایا خود جنید نے بھیل مان اور گجرات کو زیر نگین کیا۔ سنہ ۱۰۷ھ تا سنہ ۱۱۱ھ جنید سندھ میں رہا۔ اس مدت میں فتوحات میں توسیع کے علاوہ اس نے انتظامی حیثیت سے سندھ کی حکومت کو بڑی ترقی دی۔

سنہ ۱۱۱ھ میں جنید کا تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ تمیم داری آیا۔ یہ شخص نہایت کمزور اور اس عہدہ کے اہل نہ تھا۔ چنانچہ جو بہترین ملکی نظام جنید نے یہاں قائم کیا تھا، اس میں اضافہ اور نظم پیدا کرنا تو بڑی بات تھی، وہ اس کو سنبھال بھی نہ سکا۔ اس کے آتے ہی سارے سندھ میں بغاوت پھیل گئی کیونکہ ہندو جاتی مسلمان حکمران کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ تمیم اس بغاوت پر قابو نہ پا سکا اور محمد بن قاسم سے لے کر اس وقت تک سندھ میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا تھا، وہ سب اس کی وجہ سے خاک میں مل گیا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ تمیم کی کمزوری اور نااہلی کے باعث اسلامی حکومت قریب قریب یہاں سے اٹھ گئی اور سندھیوں کا زور اس قدر بڑھا کہ سندھ کے متوطن مسلمانوں کو سندھ کو خیر باد کہنا پڑا۔ خود تمیم داری سندھ چھوڑ کر عراق روانہ ہو گیا لیکن راستہ ہی میں اس غریب کا انتقال ہو گیا۔ (فتوح البلدان: ص ۴۴۸، یعقوبی: ۲/۳۸۰)

تمیم داری نے اسلامی مقبوضات کو بڑا نقصان پہنچایا۔ چنانچہ اس کے سندھ چھوڑنے کے بعد ایک تجربہ کار افسر حکم بن عوانہ سندھ بھیجا گیا۔ یہ جس وقت سندھ پہنچا اس وقت مسلمانوں کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہ گئی تھی سوائے قبضہ کے۔ اس لیے حکم بن عوانہ نے دریائے سندھ کے مشرقی سمت ایک شہر ''محفوظہ'' آباد کر کے مسلمانوں کا مرکز قائم کیا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم کی یادگار عمرو بن محمد بن قاسم کی مدد سے چند روز میں باغیوں کو زیر نگین کر کے دوبارہ حکومت اسلامی قائم کی اور اس کامیابی کی یادگار کے طور پر ''منصورہ'' آباد کیا جو آئندہ چل کر سندھ کی اسلامی حکومت کا مرکز بنا۔

انتظامی لحاظ سے سندھ کا علاقہ خراسان کے گورنر کے تحت تھا اور وہی سندھ کے لیے حاکم اور جرنیل مقرر کرتا تھا۔ چنانچہ حکم بن عوانہ کا تقرر بھی خالد بن عبداللہ قسری والیٔ خراسان نے کیا تھا۔ سنہ ۱۱۳ھ میں ہشام نے خالد کو معزول کر کے یوسف بن عمرو ثقفی کا تقرر کیا۔ یہ شخص خالد بن عبداللہ کا مخالف تھا، اس لیے اس نے اس کے ماتحت حکام کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔ حکم کو اس کی جانب سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس نے

Marfat.com

اس کی رضا مندی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سندھ کے بعض غیر مفتوحہ علاقوں کو فتح کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ایک معرکہ میں کام آیا۔ حکم بن عوانہ کے بعد اس کے ماتحت حکام میں دو شخص عمرو بن محمد بن قاسم اور ابن عرار اس کی جانشینی کے امیدوار تھے۔ یوسف نے اس کا فیصلہ ہشام پر چھوڑ دیا۔ اس نے عمرو بن محمد بن قاسم کے حق میں فیصلہ کیا۔ یوسف کی خواہش اور چاہت بھی یہی تھی۔ اس لیے سندھ کی حکومت عمرو بن محمد کو مل گئی۔ اس نے ابن عرار کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور منصورہ کو مرکز حکومت بنایا۔

حکم کی موت کے بعد عمرو بن محمد بن قاسم اور ابن عرار کے اختلاف سے ایک ہندو راجہ نے فائدہ اٹھا کر منصورہ کا محاصرہ کر لیا۔ عمرو بن محمد کے پاس عسکری قوت کافی نہ تھی۔ اس نے فوری طور پر یوسف کو اطلاع دی۔ اس نے فوری طور پر چار ہزار فوج بھیج دی۔ چنانچہ فوج کے پہنچنے کے بعد راجہ محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا۔ عمرو کو اس کے محاصرہ کا بہت غصہ تھا، اس لیے اس نے اس کا تعاقب کیا اور اس کی فرودگاہ پر شبخون مار کر راجہ کی فوج کا بہت بڑا حصہ برباد کر دیا لیکن راجہ خود بچ کر نکل گیا۔ عین اس وقت ایک سردار مروان بن یزید باغی ہو گیا لیکن عمرو بن محمد نے اس کی جماعت کو منتشر کر کے اسے قتل کر دیا۔ (یعقوبی: ۲/۳۸۹) اس کے بعد بھی سندھ میں ناقابل ذکر مہمات کا سلسلہ جاری رہا۔

اندلس کی مہمات:

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں نہ صرف ترکستان اور سندھ کے محاذوں پر فتح و نصرت حاصل کی گئی بلکہ اندلس کی مہمات پر بھی کافی پیش رفت ہوئی۔ عرب مؤرخین کا عمومی خیال یہ ہے کہ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کی فتوحات کے بعد اندلس کے محاذ پر بالکل خاموشی رہی یہاں تک کہ عبدالرحمٰن الداخل نے وہاں جا کر حکومت قائم کی۔ حالانکہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ موسیٰ بن نصیر اور عبدالرحمٰن الداخل کے درمیانی عرصہ میں بھی اندلس میں بہت سے واقعات و حوادث پیش آئے لیکن عرب مؤرخین نے اپنی کتابوں میں ان کا کوئی خاص تذکرہ نہیں کیا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اندلس کی فتح کے بعد مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ خیال اٹھکیلیاں لینے لگا کہ فرانس کو بھی فتح کیا جائے کیونکہ موسیٰ بن نصیر کا یہ منصوبہ تھا کہ فرانس ہر صورت فتح ہونا چاہیے کیوں کہ حالات کے نشیب و فراز کی وجہ سے فتح کا خیال آیا لیکن ہشام کے زمانہ خلافت میں مسلمانوں نے فرانس پر ایک زبردست حملہ کیا اور وہ وسط فرانس تک حریف کی فوج کو دھکیلتے ہوئے چلے گئے۔ اندلس کی فتح کے بعد ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں مسلمان جبل البرانس کو پار کر کے فرانس کی سرزمین میں اربونہ اور حصن لوڈون تک پہنچ گئے تھے لیکن فرمان خلافت نے انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک کسی خلیفہ یا گورنر نے اس محاذ پر کوئی توجہ نہ کی۔

سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں سمح بن مالک خولانی اندلس کا گورنر مقرر ہوا۔ وہ بڑا

Marfat.com

جرأت مند، باحوصلہ، شجاع اور منتظم گورنر تھا۔ اس نے سب سے پہلے تو اندلس کے اندرونی حالات کو جو کافی عرصہ سے زیروزبر اور انتشار کا شکار تھے، درست کیا اور ان میں نظم وضبط پیدا کیا۔ اس انتظام کے بعد اس نے فرانس کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ چنانچہ سنہ ۱۰۲ھ میں اس نے بڑے اہتمام اور انتظام کے ساتھ فرانس پر فوج کشی کی اور جبل البرانس کے پار جنوبی فرانس میں ارمن کی ریاست کا محاصرہ کرلیا محاصرہ کی تاب نہ لاکر یہاں کے باشندوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرلی۔

اس زمانہ میں فرانس میں دو بڑی حکومتیں تھیں۔ جنوب میں گاتھ کی حکومت تھی جس کا فرمان روا ڈیوک آف ایکی ٹین تھا۔ اس کی حکومت کا پایہ تخت ٹولوس تھا۔ شمال میں میر دونجی خاندان برسر اقتدار تھا لیکن اس کا فرماں روا برائے نام تھا۔ اصل حکومت چارلس مائل کے ہاتھوں میں تھی۔ نارمن کی ریاست جنوبی فرانس کی حکومت کے زیر نگین تھی جس کو جرنیل سمح بن مالک خولانی نے فتح کیا۔ اب وہ شمالی فرانس کی طرف بڑھا جہاں ڈیوک آف ایکی ٹین کی حکومت تھی۔ اس کا پایہ تخت طلوشہ (ٹولوس) تھا جس کا محاصرہ کیا گیا۔ ڈیوک اس وقت پایہ تخت میں موجود نہ تھا اور اہل شہر میں مسلمانوں کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی لہٰذا انھوں نے اطاعت قبول کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس دوران میں ڈیوک کو اطلاع مل گئی کہ اس کے پایہ تخت کا محاصرہ کیا گیا ہے۔ وہ ایک بہت بڑی جمعیت لے کر پہنچ گیا اور بڑی شجاعت، جرأت اور استقلال سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ گورنر سمح بن مالک خولانی میں ایک جوش اور جذبہ تھا کہ دشمن کو شکست فاش دینی ہے۔ چنانچہ اسی جوش اور جذبہ کے تحت وہ دشمن کی صفوں میں گھستے چلے گئے اور لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا۔ ان کی شہادت سے مسلمانوں کو شکست ہوگئی۔ ان کی ایک بڑی تعداد میدان جنگ میں کام آئی۔ امیر سمح کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی کو افسر بنایا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ باقی ماندہ مسلمانوں کو دشمن کے نرغہ سے نکال لائے۔

(اخبار الاندلس: ۱/۲۷۰)

گورنر سمح بن مالک کی شہادت کے بعد عنبسہ بن سحیم کا اندلس کی گورنری پر تقرر ہوا۔ انھوں نے بھی فرانس کو فتح کرنے کا عزم کیا اور سنہ ۱۰۷ھ میں جبل البرانس کو پار کر کے قرقشونہ (کرکسون) کا محاصرہ کیا۔ اہل قرقشونہ نے جزیہ اور قرقشونہ کا نصف حصہ دے کر مصالحت کرلی اور مسلمان قیدیوں کو بھی رہا کردیا جو ان کے پاس موجود تھے، اور ساتھ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے دوست اور ان کے دشمنوں کے دشمن رہیں گے۔ ایس۔ پی اسکاٹ کا بیان ہے کہ قرقشونہ کی فتح کے ساتھ ہی سپٹی سینیا کے پورے علاقہ نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرلی۔ (اخبار الاندلس: ۱/۲۷۵، ابن اثیر: ۵/۵۰)

سپٹی سینیا کی فتح کے بعد عنبسہ فرانس کے اندرونی علاقوں کی طرف بڑھا اور دریائے رہون کی وادی کے پورے علاقہ کو تاخت کر کے لیانس فتح کیا۔ پھر یہاں سے برگنڈی کا رخ کیا اور اوٹن کے شہر کو فتح کیا۔ اس سے آگے بڑھے تھے کہ عیسائیوں کے بے ضابطہ گروہوں نے اسلامی فوج کے عقبی حصے پر چھاپے مارنا شروع کر

Marfat.com

دیئے جس سے مسلمانوں کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مقام پر دہقانیوں کے ایک گروہ سے مقابلہ ہو گیا۔ عنبسہ جوش میں آکر ان کی صفوں میں گھس گئے۔ انھوں نے ان کو اتنا زخمی کیا کہ عنبسہ جانبر نہ ہو سکے البتہ عروہ بن عبداللہ کو اپنا جانشین بنا گئے۔ عنبسہ کے بعد یحیٰ بن سلامہ کلبی، حذیفہ بن احوص قیسی اور دوسرے کئی ایک امیروں کا یہاں تقرر ہوا لیکن معلوم نہیں کس وجہ سے ان سب کا دور نہایت مختصر تھا۔ اس لیے ان کے زمانہ میں کوئی اہم اور قابل ذکر واقعہ کتابوں میں مذکور نہیں۔ البتہ ہیثم بن عبید کلامی نے مشرقی اندلس کا علاقہ مقوشہ فتح کیا تھا۔

محمد بن عبداللہ اشجعی کا بھی اندلس میں تقرر ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۱۱۳ھ میں امیر عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی کا تقرر ہوا۔ یہ امیر بڑا اولعزم، شجاع، جرأت مند، حوصلہ مند، مدبر اور منتظم تھا۔ اس نے حکومت اندلس کی تمام انتظامی اور اندرونی خرابیوں کو دور کر کے بہترین نظم و نسق قائم کیا۔ جب وہ اندلس کے اندرونی معاملات اور انتظامات سے فارغ ہوا تو اب وہ فرانس کی مہم کی تکمیل کی جانب متوجہ ہوا۔ اس سلسلہ میں اس کو امیر سمح کے ساتھ ناکامی کا ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے اس دفعہ اس نے اس مہم کو سر کرنے کے بڑے اعلیٰ پیمانہ پر انتظامات کیے تاکہ پھر ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ اس نے اندلس کے تمام صوبے داروں کو بھی حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی فوجیں لے کر اندلس اور فرانس کی سرحد پر جمع ہو جائیں۔ اس نے عام مسلمانوں کو بھی اس جہاد میں شرکت کی ترغیب دی۔ عوام نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس کی اس دعوت پر لبیک کہا اور ہر مسلمان جانی اور مالی ہر لحاظ سے امیر عبدالرحمٰن غافقی کے ساتھ تیار ہو گیا۔ ان تمام انتظامات سے فراغت کے بعد سنہ ۱۱۴ھ میں وہ پورے انتظامات کے ساتھ فرانس کی حدود کی طرف بڑھا۔ بدقسمتی سے ابھی یہ لوگ سرحد پر پہنچے تھے کہ امیر عثمان بن ابی نعسہ صوبہ دار سرحد باغی ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عثمان پہلے پورے اندلس کا امیر تھا۔ پھر اسے معزول کر کے فرانس اور اندلس کے درمیانی علاقہ کا امیر بنا دیا گیا۔ اس کا تعلق بربر لوگوں سے تھا اور بربری ہونے کے باعث یہ یوں بھی عربوں کے خلاف تھا، اب معزول ہونے کے باعث مسلمانوں کا دشمن بن گیا۔ اور مسلمانوں سے اپنی معزولی کا بدلہ لینے کے لیے ڈیوک آف اکی ٹین سے مل کر باغی ہو گیا۔ ڈیوک اور فرانس کی مرکزی حکومت کے درمیان عرصہ سے اختلافات چلے آ رہے تھے۔ دوسری طرف فرانس کی فوج کشی میں مسلمانوں کے سامنے سب سے پہلے اسی کی حکومت آتی تھی، اور دو سمتوں سے دو دشمنوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے عثمان کی بغاوت سے فائدہ اٹھا کر اس کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ عثمان کو بھی ایک مددگار کی ضرورت تھی کیونکہ اس کی طاقت مسلمانوں کے مقابلہ میں کمزور تھی، اس لیے وہ فوراً ڈیوک سے مل گیا۔ ڈیوک نے اس اتحاد کو مضبوط بنانے کے لیے اپنی لڑکی اس کے حبالۂ عقد میں دے دی اور اب یہ دونوں باہم سسر اور داماد کے رشتہ میں بندھ گئے۔

اس رشتہ داری اور باہمی اتحاد کے بعد عثمان علانیہ طور پر باغی ہو گیا، اور عبدالرحمٰن کی طلبی پر وہ فوجیں لے کر نہیں آیا اور مختلف حیلے کر کے ٹالنے کی کوشش کی۔ امیر عبدالرحمٰن کو اس کے باغی ہونے کا علم ہو گیا لہٰذا اس

Marfat.com

نے فرانس پر حملہ سے قبل اس خطرہ کو دور اور ختم کرنے کے لیے ایک افسر ابن زیان کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ عثمان بربر کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ وہ فوج کی آمد کا سن کر پہاڑی علاقہ میں بھاگ گیا۔ ابن زیان نے اس کا تعاقب کیا اور اس کو پکڑ کر قتل کر دیا۔

عثمان کا خطرہ دور ہونے کے بعد مسلمان فوجیں جبل ابرتات کو پار کر کے فرانس کے میدانی علاقہ میں داخل ہو گئیں۔ اس حملہ کے نتائج تنہا ڈیوک آف ایکی ٹین تک محدود نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی کامیابی کی صورت میں اس کا اثر پورے جنوبی فرانس پر پڑتا تھا، اس لیے یہاں کے تمام امراء ان کے مقابلہ کے لیے متحد ہو گئے۔ ڈیوک نے پہاڑ کے دامن میں مسلمانوں کا بڑی جوانمردی اور شجاعت سے مقابلہ کیا لیکن ڈیوک اور اس کے ساتھی امراء مسلمان فوج اور اس کے اس حملہ کو نہ روک سکے اور مسلمان انھیں شکست دے کر دریائے گارون کی سرسبز وادیوں کو پامال کرتے ہوئے بورڈیو کی بندرگاہ تک پہنچ گئے۔ یہاں ڈیوک کے عسکری ساز وسامان کا بہت بڑا ذخیرہ تھا اہل شہر نے شہر کی حفاظت اور اس ساز وسامان کی حفاظت کے لیے بہت کوشش کی، لیکن مسلمانوں نے معمولی جنگ کے بعد بورڈیو فتح کر کے اس تمام ساز وسامان پر قبضہ کر لیا۔ (اخبار الاندلس: ۱/۲۸۸)

بورڈیو کو فتح کرنے کے بعد مسلمان شمال کی طرف بڑھے۔ دریائے ڈاروون پر ڈیوک کی فوج نے مسلمان فوج کو پھر روکنے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے ڈیوک کی فوج کے دستہ کو ایسی شکست دی کہ پورا دستہ تباہ کر دیا اور دریا کو عبور کر کے پائٹیرس پہنچے اور یہاں سینٹ ہلادی کے مشہور گرجے کی بے شمار اور بے کراں دولت پر قبضہ کر کے شہر کی فصیل پر اسلامی جھنڈا نصب کر دیا۔ پھر یہاں سے ٹورس کا رخ کیا۔ ڈیوک نے جب دیکھا کہ اس بے کراں سیلاب کو روکنا اس کی طاقت سے باہر ہے اور کوئی وقت مسلمان فوجیں وسط فرانس تک پہنچنا چاہتی ہیں تو اس نے مجبور ہو کر اپنے حریف چارلس مائل سے مدد طلب کی۔ ڈیوک کے علاوہ فرانس کے دوسرے امراء اور سرداروں نے بھی چارلس کو غیرت دلائی کہ عربوں جیسی بے سروسامان قوم فرانسیسی قوم پر غالب آ کر ان کے ملک پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ (تمدن عرب: ص ۲۸۲)

پھر شمال کی جانب مسلمانوں کی پیش قدمی خود چارلس کے لیے بھی نہایت خطرناک تھی۔ اس لیے وہ ڈیوک سے اتحاد کرنے پر تیار ہو گیا تاکہ دونوں مل کر مسلمان فوج کے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اب ان دونوں نے مسلمانوں سے جنگ کو ایک قومی مسئلہ بنا کر ملک کے تمام جنگ آزما امراء اور سرداروں کو ان کے مقابلہ کے لیے آمادہ کر لیا۔ چنانچہ ان کی دعوت پر جرمنی، فرانس اور پرتگال کے امراء اپنی اپنی فوجیں لے کر فرانس پہنچ گئے اور چارلس ایک لشکر جرار کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے نکلا۔ اس وقت مسلمان فوجیں ٹورس کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ یہیں ایک میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔

فرانسیسیوں کی اتنی فوج جمع ہو گئی کہ اب مسلمانوں کی فوج اور ان کی فوج کے درمیان کوئی تناسب نہ تھا۔ ایک طرف یورپ کے دیو پیکر اور آہن پوش بہادروں کا لشکر جرار دوسری طرف بے سروسامان عربوں کی

Marfat.com

مختصر فوج تھی اور وہ بھی غریب الوطن اور ایک اجنبی دیس میں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کا رعب کچھ اس طرح ان کے دلوں پر طاری تھا کہ ایک ہفتہ تک چارلس کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ہمت اور جرأت نہ ہوئی۔ بالآخر ایک ہفتہ کے بعد امیر عبدالرحمٰن سے مزید انتظار نہ ہو سکا اور اس نے خود چارلس کی فوج پر حملہ کر دیا، اور صبح سے شام تک فریقین میں نہایت خون ریز جنگ ہوئی۔ پھر جب آفتاب حجلۂ مغرب میں چلا گیا اور کائنات نے تاریکی کی چادر اوڑھ لی تو جنگ کو دوسرے روز پر ملتوی کر دیا گیا۔ دوسرے روز پھر زور کا رن پڑا اور سہ پہر تک پوری شدت سے جنگ جاری رہی، اور دونوں کا پلہ برابر تھا۔ یہ جنگ اپنی پوری شدت سے ہو رہی تھی کہ ڈیوک آف ایکی ٹین نے اپنی تازہ دم فوج کے ساتھ مسلمان فوج پر اس شدت سے حملہ کیا کہ سارے دن کے تھکے ہوئے مسلمان اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور ان کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ ان کی کمزوری کو فرانسیسیوں نے بھانپ لیا اور پوری قوت سے جنگ جاری رکھی۔ امیر عبدالرحمٰن بہت بہادر جرنیل تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو سنبھالنے اور ان کو بڑھاوا دینے کے لیے دشمن کی صفوں میں گھستے چلے گئے اور جسم پر سیکڑوں زخم کھا کر لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا۔ مسلمانوں کے پاؤں پہلے ہی اکھڑ چکے تھے، امیر عبدالرحمٰن کی شہادت نے ان کی ہمت کو اور کمزور اور پست کر دیا۔ چنانچہ شام ہونے کے بعد جب دوسرے روز کے لیے جنگ ملتوی ہوئی تو مسلمانوں نے رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میدان خالی کر دیا۔ مسلمانوں کی اس پسپائی کے باوجود چارلس پر ان کی بہادری اور جرأت وشجاعت کا اتنا خوف غالب تھا کہ اس کو مسلمانوں کا تعاقب کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

یورپین مؤرخین نے اس معرکہ کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور چارلس کی اس کامیابی کو اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ تصور کیا ہے۔ اسی کارنامہ کی وجہ سے وہ اس کو مائل (ہتھوڑا) کا لقب دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اگر مسلمانوں کا یہ حملہ کامیاب ہو جاتا تو نہ صرف فرانس بلکہ پورے یورپ کی تاریخ تبدیل ہو گئی ہوتی اور شاید مسلمانوں کو آج یہ نکبت و ادبار کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

اس مہم کی ناکامی اور امیر عبدالرحمٰن کی شہادت کی خبر جب افریقہ پہنچی تو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ عبیداللہ بن حجاب سلولی والیٔ افریقہ نے امیر عبدالملک بن قطن فہری کو اندلس کا حاکم بنا کر بھیجا۔ اس نے شمالی اندلس میں بشکنش (بسکے) پر حملہ کیا اور مسلمانوں کی شکست کا انتقام لینے کے لیے پھر فرانس پر فوج کشی کی لیکن اس نے موسم کی ناسازگاری کا لحاظ نہ کیا۔ برسات کا موسم تھا۔ فرانس اور اندلس کے ندی نالے طغیانی پر تھے۔ اس وجہ سے مسلمان فوج کو قدم قدم پر دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ عیسائیوں نے الگ چھاپے مارنے شروع کر دیے جس سے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا۔ اور عبدالملک بڑی مشکل سے انھیں بچا کر واپس لا سکا۔ اس کی اس ناعاقبت اندیشی اور ظلم وجور کی وجہ سے عبیداللہ بن حجاب، نے اسے معزول کر کے سنہ ۱۱۶ھ میں عقبہ بن حجاج کو اندلس کا والی اور گورنر مقرر کیا۔ (اخبار الاندلس: ۳۰۳/۱)

امیر عقبہ بن حجاج بڑا صالح، منتظم، مدبر اور عاقل امیر تھا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حکومت

Marfat.com

اندلس کی تمام خرابیوں کو دور کر کے نئے سرے سے ملک کا بہترین نظم ونسق قائم کیا اور ہر اعتبار سے اندلس کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا۔ تمام بددیانت، ظالم اور جبر وتشدد کرنے والے حاکموں کو ایک ایک کر کے کاروبار حکومت سے فارغ کر دیا۔ شاہراؤں کے انتظام اور ان کی حفاظت ونگرانی کے لیے سوار پولیس کا ایک مستقل محکمہ قائم کیا۔ رعایا کی سہولت اور دادرسی کے لیے ہر گاؤں میں عدالتیں قائم کیں۔ ہر فرقہ کے لیے الگ الگ مدارس قائم کیے۔ جگہ جگہ مسجدیں تعمیر کرائیں اور ان سے متعلق مذہبی مکاتب قائم کیے۔ اس عامل کے حسن انتظام سے چند دنوں میں ملک میں امن وسکون بھی ہو گیا اور ترقی کے لحاظ سے بھی اندلس کی کایا پلٹ گئی۔ ان اندرونی نظم ونسق کے ساتھ ساتھ بعض غیر مفتوحہ علاقوں کو بھی فتح کیا۔ چنانچہ سرحدی صوبہ کے پایہ تخت بلبلونہ اور اس سے ملحق صوبہ البہ اور اندلس کے آخری شمال مغربی صوبے جلیقیہ فتح کیے اور فرانس میں اربونہ تک بڑھ گیا۔

گورنر بن حجاب نے اندلس کے ساتھ اپنے تمام ماتحت علاقوں میں نئے انتظامات کیے۔ عرصہ سے جو مہمات رکی ہوئی تھیں ان کا پھر نئے سرے سے آغاز کیا۔ طنجہ کی حکومت پر عمر بن عبداللہ مرادی کا تقرر ہوا لیکن ابن اثیر کا بیان ہے کہ طنجہ کا حاکم اس نے اپنے لڑکے اسماعیل کو بنایا اور عمر بن عبداللہ مرادی کو اس کا مشیر بنایا۔ حبیب بن ابی عبیدہ فہری کو مغرب کی مہم پر مامور کیا۔ اس نے سوس اقصیٰ اور سوڈان کی تمام طاقتوں کو زیر نگین کر کے ان پر اسلامی حکومت کی ہیبت اور دھاک بٹھا دی اور بہت سا مال غنیمت حاصل کیا۔

(کتاب المونس: ص ۳۸، ابن اثیر: ۵/۷۰)

اندرونی اور بیرونی خلفشار افراتفری اور بے اطمینانی کے باعث عرصہ سے بحری مہم کی مہمات رکی ہوئی تھیں۔ ابن حجاب نے جہاز سازی کے نئے کارخانے قائم کر کے بحری بیڑے کو بہت ترقی دی کیونکہ عرصہ سے جہاز سازی کے کارخانے اندرونی انتشار کے باعث یا تو بند پڑے تھے اور یا ان کی پروڈکشن میں سست روی تھی جب بحری بیڑے کو ترقی ہوئی اور جہاز سازی کے کارخانے اپنی پیداوار پوری دینے لگے تو اس نے سنہ ۱۱۷ھ میں حبیب بن ابی عبیدہ کو جزیرہ سردانیہ کی مہم پر روانہ کیا۔ حبیب اپنے حملہ میں کامیاب وکامران ہو کر واپس آیا۔

اس کے بعد سنہ ۱۲۲ھ میں حبیب بن ابی عبیدہ کو جزیرہ صقلیہ کی مہم پر روانہ کیا۔ اسلامی بحری بیڑا صقلیہ کے پایۂ تخت سرقوسہ کی جانب جو لب ساحل تھا، لنگر انداز ہوا۔ وہاں سے خشکی پر فوجوں کے اترنے کے ساتھ ہی حبیب کے نامور، بہادر اور جرأت وہمت کے مجسمہ فرزند عبدالرحمٰن بن حبیب نے رومیوں کو شکست فاش دے کر سرقوسہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہل شہر نے چند روز تک تو مدافعت کی لیکن مقابلہ کی طاقت وہمت نہ پاتے ہوئے اطاعت قبول کر لی۔ حبیب کا ارادہ تھا کہ وہ پورے جزیرہ کو فتح کر کے واپس ہو گا لیکن وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی دوران میں شمالی افریقہ میں بربریوں نے شدید قسم کی بغاوت برپا کر دی۔ شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی فوجی قوت نہ ہونے کے برابر تھی، اس لیے ابن حجاب نے حبیب کو واپس بلا لیا۔

(کتاب المونس: ص ۳۸)

Marfat.com

افریقہ میں بربروں کی بغاوت:

بربر ایک وحشی اور سرکش قومی تھے۔ ان کی اسی وحشت، بربریت اور سرکشی کے باعث ابتداء ہی سے ان میں اور عربوں میں منافرت چلی آ رہی تھی۔ بربروں کی اسی سرکشی اور بربریت کے باعث سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ''قیروان'' کا شہر آباد کر کے وہاں ایک فوجی چھاؤنی قائم کی تا کہ ان کی بغاوت کو بروقت روکا جا سکے۔ عربوں اور بربروں میں منافرت کی وجہ یہ تھی کہ عرب انھیں وحشی کہتے تھے کیونکہ ان کے اکثر و بیشتر کام وحشیانہ ہوتے تھے۔ بربر عربوں سے ایک تو اس وجہ سے دوسرے حاکم قوم ہونے کے باعث ان سے دل میں کینہ اور تعصب رکھتے تھے اور ہر وقت بغاوت کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے، لیکن مسلمانوں کی قوت کے مقابلہ میں بے بس تھے۔ چنانچہ جب کبھی انھیں موقع مل جاتا تھا، وہ باغی ہو جاتے اور قتل و غارت کرتے۔ اس منافرت کے باعث عمر بن عبداللہ مرادی والیٔ طنجہ کا طرز عمل اور سلوک و وطیرہ عام بربر کے ساتھ اچھا اور پسندیدہ نہ تھا۔ اسے نومسلم بربروں پر بھی اعتماد نہ تھا۔ چنانچہ اس نے غیر مسلم بربروں کی طرح ان سے بھی جزیہ وصول کرنے کا ارادہ کیا، اس لیے وہ بھی اس کے خلاف ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب افریقہ کی فوجیں سسلی کی مہم میں مصروف تھیں اور طنجہ بالکل خالی تھا۔ میدان خالی پا کر بربروں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔

شمالی افریقہ میں خوارج کی بھی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ بربروں کی بغاوت دیکھ کر وہ بھی اموی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ اموی حکومت نے ان کے استیصال کے لیے بہت سی جنگیں لڑی تھیں۔ بربروں نے جب خوارج کو بغاوت کرتے دیکھا تو انھوں نے میسرہ نامی ایک خارجی کو اپنا سردار بنا کر طنجہ پر حملہ کر دیا۔ عمر بن عبداللہ نے مقابلہ کیا لیکن مسلمان فوج چونکہ صقلیہ کے محاذ پر مصروف تھی، لہٰذا عسکری طاقت کمزور ہونے کے باعث وہ بربروں کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور بربروں اور خارجیوں نے طنجہ پر قبضہ کر لیا، اور نہایت بے دردی سے عربوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ طنجہ میں بغاوت کی خبر سن کر سارے شمالی افریقہ کے بربر باغی ہو گئے اور اپنے یہاں کے عرب حکام کو نکال کر شہروں پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت شمالی افریقہ مسلمان فوج سے خالی تھا جس کا بربروں اور خوارج نے بھرپور فائدہ اٹھایا، اس لیے ابن حجاب نے حبیب بن ابی عبیدہ کو صقلیہ کی مہم سے واپس بلا کر اس کے صاحب زادے خالد کو بربروں کے مقابلہ میں بھیجا۔ طنجہ کے قریب فریقین میں نہایت خون ریز جنگ ہوئی لیکن اس جنگ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور میسرہ طنجہ واپس لوٹ گیا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس معرکہ کے بعد میسرہ کا دماغ خراب ہو گیا اور اس نے بربروں کی تحقیر شروع کر دی، اس لیے انھوں نے اسے قتل کر دیا، اور ایک اور خارجی خالد بن حمید کو سردار بنایا، لیکن ابن قوطیہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخر تک بربروں کی راہ نمائی کرتا رہا۔ بعض دوسرے مؤرخین کے بیانات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

Marfat.com

اب دونوں فوجیں اپنی اپنی جگہ تیاریاں کر رہی تھیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد طنجہ ہی میں پھر دونوں فوجوں کا دوسرا مقابلہ ہوا۔ عرب کے بڑے بڑے عمائدین اور شرفاء حبیب کے ساتھ تھے۔ فریقین بڑی بہادری اور پامردی سے لڑے۔ ابھی جنگ جاری تھی کہ بربروں کی ایک تازہ دم فوج نے کمین گاہ سے نکل کر مسلمان فوج پر حملہ کر دیا۔ عربوں میں اس تازہ دم فوج کے ناگہانی حملہ کو روکنے کی طاقت اور ہمت نہ تھی، لیکن انھوں نے میدان کو چھوڑنا باعث ننگ و عار سمجھا اور بڑی ہمت اور استقلال کے ساتھ لڑ کر اپنی جانیں جان آفرین کے سپرد کر دیں۔ اس جنگ میں عرب کے بڑے بڑے شرفاء اور عمائد کام آئے تھے، اس لیے یہ جنگ ''جنگ اشراف'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

اندلس میں بغاوت:

بربر کی طنجہ میں کامیابیوں اور عربوں کی شکست کی خبریں جب اندلس پہنچیں تو یہاں کے بربروں نے بھی مسلمان حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ ہشام بن عبدالملک کو جب ان تمام حالات کی اطلاع ملی تو اس نے سنہ ۱۲۳ھ میں ابن حجاب کو معزول کر کے کلثوم بن عیاض قشیری کو تیس (۳۰) ہزار فوج کے ساتھ افریقہ کا والی بنا کر بھیجا اور انھیں ہدایت کر دی کہ اگر کلثوم قتل ہو جائے تو اس کا بھتیجا بلج بن بشر اس کا جانشین ہوگا۔ اگر یہ بھی کام آئے تو ثعلبہ بن سلامہ عاملی اس کی جگہ لے گا۔ اور شام سے لے کر شمالی افریقہ تک راستہ میں جو جو ملک پڑتے تھے، ان سب میں یہ فرامین جاری کر دیے کہ ہر جگہ کے جنگ آزما، جنگ جو اور شجاع و بہادر اس مہم میں کلثوم کا ساتھ دیں۔ چنانچہ کلثوم بن عیاض مصر وغیرہ کی فوجوں کو ساتھ لیتا ہوا قیروان پہنچا۔ یہاں شمالی افریقہ کی شکست خوردہ فوجیں بھی موجود تھیں۔ اب ان سب کی مجموعی تعداد ستر (۷۰) ہزار تک پہنچ گئی۔

بربروں کو جب شامی فوج کی آمد کی خبر پہنچی تو انھوں نے طنجہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر اپنی قوت وہاں جمع کر لی اور کلثوم قیروان سے طنجہ کی طرف بڑھا۔ بقدورہ کے مقام پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ شامیوں نے بڑی ہمت اور پامردی سے بربر فوج کا مقابلہ کیا، لیکن بربر کی ان گنت فوج کے مقابلہ میں ان کا بس نہ چل سکا اور مسلمان فوج کو شکست فاش ہوئی اور ایک تہائی میدان جنگ میں کام آئی جو کہ ایک بہت بڑا نقصان تھا۔ کلثوم بن عیاض، حبیب بن عبیدہ وغیرہ ممتاز اور بڑے افسر اور جرنیل میدان جنگ میں کام آئے۔ ایک بڑی تعداد زندہ گرفتار ہوئی۔ جو فوج بچ گئی، ان میں سے افریقہ کے عربوں نے قیروان کا راستہ لیا اور بلج بن بشر فوج کو لے کر اندلس کے ارادہ سے سبتہ چلا گیا۔ (ابن اثیر: ۷۱/۵)

مسلمان افواج کو اس شکست فاش سے بہت بڑا نقصان ہوا۔ ایک تو ایک تہائی کے قریب فوج تباہ ہو گئی۔ کچھ گرفتار ہوئے۔ بڑے بڑے شرفاء مارے گئے اور باقی ماندہ فوج اندلس کے راستہ پر ہولی۔ اس شکست سے بربروں کے حوصلوں کو بڑھاوا ملا اور اندلس کے حالات بھی سخت پریشان کن ہو گئے۔ بربر شروع میں تو

Marfat.com

حکومت اسلامی کے خلاف تھے لیکن اب انھوں نے عربوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ خاص اندلس کے باشندوں نے بھی بربروں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ اس اثناء میں یمنی اور عصری عربوں میں بھی خانہ جنگی شروع ہو گئی اور اندلس قتل و خون ریزی کی آماجگاہ بن گیا۔

امیر المؤمنین ہشام بن عبدالملک کو جب شامی فوج کی بربادی، عربوں کی خون ریزی اور اندلس کے باشندوں اور بربروں کی بغاوت اور شورش کی اطلاع ملی تو وہ جوش غضب سے تھرتھرا اٹھا، اور اس نے قسم کھائی کہ وہ اپنی پوری قوت بربروں کے استیصال کے لیے صرف کر دے گا، اور اگر ضرورت پڑی تو وہ بذات خود اور اس کی اولاد تک کو بھی میدان جنگ میں جانا پڑا تو جائے گا۔ چنانچہ حنظلہ بن صفوان کلبی کو تیس ہزار منتخب بہادروں اور جنگ جوؤں کے ساتھ افریقہ روانہ کیا، اور اس کے چچا زاد بھائی ابوالخطار کو اندلس کی حکومت کا پروانہ عطا کیا۔ جونہی حنظلہ اپنی فوج کے ساتھ قیروان پہنچا تو بربروں نے دو خارجی سرداروں عکاشہ بن ایوب فزاری اور عبدالواحد بن یزید ہواری کی قیادت میں دو مختلف سمتوں سے قیروان پر یورش کر دی۔ عکاشہ پہلے پہنچ گیا تھا، اس لیے پہلا مقابلہ اسی سے ہوا۔ حنظلہ نے اسے شکست فاش دی اور بربروں کی ایک کثیر تعداد اس جنگ میں ماری گئی۔ عکاشہ کو شکست دینے کے ساتھ ہی عبدالواحد کے لیے چالیس ہزار فوجیں روانہ کر دیں۔ قیروان سے تھوڑے فاصلہ پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ عبدالواحد کے ساتھ تین لاکھ بربری تھے۔ شامی فوج اس ٹڈی دل کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکی اور شکست کھا کر لوٹ گئی اور بربر آگے بڑھ کر قیروان سے تین میل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہو گئے۔ (ابن اثیر: ۵/۷۱)

بربر کے اس ٹڈی دل سے قیروان کے عرب بڑے خطرہ میں پڑ گئے لیکن اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ جنگ کے سوا ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ لہٰذا وہ اپنی جان پر کھیل کر بربروں کے مقابلہ کے لیے نکل آئے۔ علماء جہاد کا وعظ کہہ کر لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کرنے لگے۔ مستورات اپنی ناموس اور شکست کے بعد کی رسوائیوں کا خوف دلا کر انھیں برانگیختہ کر رہی تھیں۔ ان تمام چیزوں اور خطرات کے پیش نظر عرب اس بے جگری اور دلیری سے لڑے کہ میدان جنگ میں ان کی تلواریں ٹوٹ گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اس جانبازی، دلیری، شجاعت اور بے جگری کے باعث بربروں کے اس ٹڈی دل کو شکست فاش ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ عربوں نے ان کا دور تک تعاقب کر کے انھیں قتل کیا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس جنگ میں دو لاکھ بربر مارے گئے اور شمالی افریقہ میں ان کی قوت پاش پاش ہو کر رہ گئی۔

شمالی افریقہ کی بغاوت کو دیکھ کر اندلس کے حالات بھی دگرگوں ہو گئے تھے اور وہاں بھی انقلاب اور بغاوت برپا ہو گئی تھی اور یہاں کے والی عقبہ بن حجاج کو نکال کر سابق معزول والی عبدالملک بن قطن کو والی بنا لیا تھا۔ عبدالملک بن قطن اگرچہ خود بھی عرب تھا لیکن اسے عقبہ بن حجاج سے مخالفت تھی، اور مخالفت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ وہ عقبہ سے قبل پورے اندلس کا والی تھا پھر اس عہدہ سے تنزل کر کے اس کو عقبہ کے ماتحت کر دیا گیا تھا۔

Marfat.com

اس کے علاوہ عبدالملک مضری تھا، اس لیے وہ شامیوں سے جن میں زیادہ تعداد یمنی عربوں کی تھی، تعصب رکھتا تھا۔ اس مخالفت میں بھی اس نے بربروں کی راہ نمائی قبول کر لی تھی، لیکن اس کے علاوہ اس نے حکومت کی کوئی اور عملی موافقت یا مخالفت نہیں کی تھی۔

اندلس کے بربر شروع میں حکومت کے خلاف اٹھے تھے لیکن پھر ان کی مخالفت عربوں تک وسیع ہوگئی اور انھوں نے جلیقیہ اور استرقہ وغیرہ سے جہاں جہاں عربوں کی آبادیاں تھیں، ان کو وہاں سے نکال دیا اور ان کا قتل عام کیا۔ عرب ہر طرف سے سمٹ کر وسط اندلس میں جمع ہوئے۔ (مجموعہ اخبار فتح اندلس: ص ۳۸) اس وقت عبدالملک کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں اس کا بھی وہی انجام نہ ہو جو طنجہ کے عربوں کا ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ شامیوں سے مدد لینے پر مجبور ہوگیا۔

کلثوم بن عیاض کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا بلج بن بشر باقی ماندہ شامی فوج کو لے کر اندلس کے ارادہ سے سبتہ چلا گیا تھا، لیکن یہاں آبنائے جبل الطارق (جبرالٹر) کو عبور کرنے کا کوئی سامان نہ تھا، اس لیے وہ اندلس نہ پہنچ سکا اور بربر کے خوف سے واپس افریقہ بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ناچار سبتہ میں مقیم ہوگیا۔ اس کے ساتھ دس ہزار سپاہی تھے۔ سامان رسد جو ساتھ تھا وہ چند دنوں میں ختم ہوگیا اور یہ لوگ ایک بہت بڑی مصیبت سے دوچار ہوگئے۔ بلج نے مجبور ہو کر عبدالملک سے مدد طلب کی کہ وہ اسے اندلس پہنچنے کے لیے کشتیاں اور سامان مہیا کرے، لیکن عبدالملک شامیوں اور یمنیوں کے بارے میں نہایت تعصب اور کینہ رکھتا تھا۔ اسی تعصب کے باعث اسے خطرہ تھا کہ اگر اس نے ان کو اندلس میں آنے دیا تو وہ اس کے لیے بہت بڑے خطرہ کا باعث ہوں گے، لہٰذا اس نے آبنائے جبل الطارق کو پار کرنے میں ان کی کوئی مدد نہ کی۔ چنانچہ بلج اور اس کے دس ہزار ساتھی رسد کی قلت بلکہ نہ ہونے کا باعث باربرداری کے جانور اور گھاس پھوس کھانے پر مجبور ہوگئے، لیکن آخر کب تک؟ چنانچہ بلج نے جب دیکھا کہ کسی طرف مدد کی کوئی صورت ممکن نہیں اور سبتہ میں ہلاکت کے سوا نجات کی اور کوئی صورت نہیں ہے تو اس نے اور اس کی فوج نے چمڑے کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنا کر اور بعض تجارتی کشتیوں پر زبردستی قبضہ کر کے اپنی فوج سمیت کسی نہ کسی صورت اندلس پہنچ گیا۔ عبدالملک کو جب اس کے آبنائے جبل الطارق کے عبور کرنے کا پتہ چلا تو اس نے اس کو اندلس کے ساحل پر روکا لیکن وہ دارالحکومت قرطبہ پر قابض ہوگیا۔ عبدالملک کے ایک ماتحت حاکم امیر عبدالرحمٰن بن علقمہ لخمی حاکم باربونہ نے بلج سے عبدالملک کے قتل کا انتقام لینے کی کوشش کی۔ بلج نے مقابلہ میں اُس کی دس ہزار فوج برباد کر دی جس سے اس کی عسکری قوت نہایت کمزور ہوگئی۔ عین اس حالت میں بلج عبدالرحمٰن کے تیر کا نشانہ بن گیا۔ اس کے قتل کے بعد شامی فوج نے فوراً ثعلبہ بن سلامہ کو اپنا سردار بنایا اور اندلس کے بربروں اور عربوں میں مسلسل جنگ شروع ہو گئی۔ ابھی اس جنگ کا سلسلہ جاری تھا کہ ابوالخطار اندلس پہنچ گیا۔ لیکن مجموعہ اخبار فتح اندلس اور مقری وغیرہ کا بیان کچھ اس سے مختلف ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اندلس میں عربوں کے خلاف بربروں کی شورش اتنی بڑھی کہ

Marfat.com

خود عبدالملک کو ان سے خطرہ لاحق ہو گیا لیکن بربروں ہی نے چونکہ اس کو اندلس کا والی بنایا تھا اور انہی پر اس کی قوت کا مدار تھا، اس لیے ان کے مقابلہ کے لیے ناچار شامیوں سے مدد لینا پڑی اور اس شرط پر بلج اور اس کی فوج کو سبتہ سے اندلس بلا لیا گیا کہ وہ بربروں کی بغاوت فرو ہونے کے بعد واپس لوٹ جائیں گے اور عبدالملک انھیں نہایت حفاظت کے ساتھ افریقہ پہنچا دے گا، اور چند شامی معززین کو ضمانت میں بطور یرغمال لے لیا۔ بربر کو عبدالملک کی تدبیر کی خبر ہوئی تو جلیقیہ، ماردہ، قوریہ وغیرہ کے تمام بربر مقابلہ کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ عبدالملک نے شامی فوج کو اپنے لڑکوں قطن اور امیہ کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ طلیطلہ کے قریب دونوں میں معرکہ آرائی ہوئی۔ بربر نے شکست فاش کھائی اور ان کی ایک بہت بڑی تعداد میدان جنگ میں کام آئی اور بہت کم زندہ بچ سکے۔ بربروں کو شکست دینے کے بعد شامی فوج سارے اندلس میں پھیل گئی اور ہر جگہ بربروں کی بغاوت فرو کر کے ان کا مکمل طور پر استیصال کر دیا۔

اس بغاوت کے فرو ہونے کے بعد عبدالملک نے معاہدہ کے مطابق شامیوں کو واپس کرنا چاہا۔ انھوں نے کہا کہ ہم واپس جانے کے لیے تیار ہیں لیکن سب ایک ساتھ جائیں گے۔ عبدالملک نے عذر کیا کہ ہمارے پاس اتنی کشتیاں نہیں ہیں کہ سب کو ایک ساتھ بھیج سکیں البتہ سبتہ تک ایک ساتھ پہنچا سکتے ہیں لیکن شامیوں نے انکار کر دیا کہ ہم کو سمندر میں غرق کر دینا بربروں کے حوالے کر دینے سے بہتر ہے۔ عبدالملک کے اس طرز عمل سے شامیوں کو شبہ ہوا کہ وہ ان کے ساتھ فریب اور دغا کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے انھوں نے قصر حکومت پر قبضہ کر کے عبدالملک کو پکڑ کر بلج کے حوالے کر دیا، اور اس کی جگہ بلج کو اندلس کا والی بنا دیا۔ عبدالملک کی گرفتاری نے پھر ملک میں شورش برپا ہو گئی۔ اتفاق سے اسی دوران میں یہ ناگوار واقعہ پیش آ گیا کہ عبدالملک کے پاس جو شامی افسر بطور ضمانت تھے، ان میں سے ایک افسر منتظمین کی بدسلوکی کے باعث مر گیا۔ اس سے شامی فوج میں جس میں کثیر تعداد یمنیوں کی تھی، بڑی برہمی پیدا ہو گئی، اور انھوں نے بلج سے یہ مطالبہ کر دیا کہ اس افسر کے انتقام میں عبدالملک کو قتل کر دیا جائے۔ اس نے اس مطالبہ کو بہتیرا ٹالا لیکن اس ٹالنے کے باعث یمنیوں میں بدگمانی پیدا ہو گئی اور انھوں نے بلج پر مضر کی حمایت کا الزام لگا دیا۔ بلج نے جب یہ دیکھا کہ فوج میں شورش برپا ہونے کا خطرہ ہے تو مجبور ہو کر اس نے عبدالملک کو ان کے حوالے کر دیا اور انھوں نے اسے سولی پر لٹکا دیا۔ عبدالملک کے قتل کے بعد اس کے لڑکے قطن اور امیہ باپ کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اندلس کے بربر اور عرب مل کر عبدالملک کے ایک بہادر افسر امیر عبدالرحمٰن والی اربونہ کی قیادت میں قرطبہ کی طرف بڑھے۔ قرطبہ سے دو منزل دور شامیوں کا عبدالرحمٰن کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ شامیوں نے ابتدائی حملوں میں عبدالرحمٰن کی فوج کو کمزور کر دیا۔ یہ صورت دیکھ کر عبدالرحمٰن نے شامی کمانڈر بلج پر حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا لیکن اس کے ایک ماتحت افسر حصین بن دجین نے فوج پر اس کا کوئی اثر نہ پڑنے دیا اور عبدالرحمٰن کو شکست ہوئی، لیکن بلج زخموں کی تاب نہ لا کر موت کی آغوش میں چلا گیا۔ اس کی موت کے بعد شامیوں نے ثعلبہ بن سلامہ کو

Marfat.com

اپنا کمانڈر مقرر کر لیا۔ اس معرکہ میں اگر چہ عبدالرحمٰن کی فوج کو شکست ہوئی لیکن شورش نے اور زیادہ برگ و بار نکالے۔ چنانچہ اندلس کے عرب اور بربر مارده کے قریب اکٹھے ہوئے۔ ثعلبہ نے بڑھ کر وہیں ان کا مقابلہ کیا لیکن عربوں اور بربروں کی تعداد کے مقابلہ میں اپنی قوت کو کمزور دیکھ کر مارده میں داخل ہو گیا۔ اسی دوران میں عیدالاضحیٰ آ گئی۔ بربر عید منانے کے لیے منتشر ہو گئے۔ ثعلبہ کو موقع مل گیا اور اس نے مارده سے نکل کر حریف پر اچانک حملہ کر دیا۔ عرب اور بربر اس ناگہانی حملہ کی تاب نہ لا سکے اور اس کی ایک بہت بڑی تعداد قتل اور گرفتار ہوئی۔ صرف قیدیوں کی تعداد دس ہزار تھی۔

اندلس کا امن پسند طبقہ اس مسلسل شورش اور آئے روز کی بدامنی سے گھبرا گیا تھا۔ چنانچہ یہاں کے معززین نے افریقہ جا کر والی افریقہ سے درخواست کی کہ آئے روز کے قتل و خون ریزی نے ہم لوگوں کو ہر لحاظ سے تباہ و برباد کر دیا ہے، لہٰذا کوئی ایسا والی اندلس بھیجا جائے جو اس شورش اور اختلاف کو دور کر کے پھر سب کو ایک مرکز پر اکٹھا کر دے۔ (اخبار فتح اندلس: ص ۳۸) یہ وہ زمانہ تھا جب ہشام بن عبدالملک شمالی افریقہ اور اندلس کے انقلاب کی خبر سن کر ابوالخطار کو اندلس کی حکومت پر مقرر کر چکا تھا۔ وہ اسی دوران میں اندلس پہنچ گیا۔

خوارج کا استیصال:

ہشام بن عبدالملک کے دور خلافت میں بعض علاقوں میں خارجیوں نے بھی سر اٹھایا لیکن ان کی یہ شورش زیادہ بڑھنے نہ پائی۔ سنہ ۱۱۱ھ میں چند خوارج نے یزید بن غریف ہمدانی والی سیستان کو ان کے گھر پر برسر عام نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی آدمیوں کو ان بے رحم لوگوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چنانچہ خالد بن عبداللہ والی عراق نے اصفح بن عبداللہ کلبی کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ ان کے استیصال کے لیے بھیجا۔ سیستان کی گھاٹیوں میں ان کا مرکز تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خوارج نے ان گھاٹیوں میں انھیں گھیر کر اصفح بن عبداللہ کلبی کا پورا دستہ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر سنہ ۱۱۹ھ میں کوفہ کے قریب بہلول خارجی نے سر اٹھایا تو خالد بن عبداللہ نے فوج بھیج کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ بہلول کے قتل کے بعد اسی سنہ میں عمرو الیشکری اور بختری یکے بعد دیگرے اٹھے لیکن دونوں مارے گئے۔ اس کے بعد ایک اور خارجی نے حیرہ میں حکومت کے خلاف خروج کیا اور بہت سے مسلمانوں کو قتل اور ان کی بستیوں کو جلا ڈالا اور حیرہ کے بیت المال پر قبضہ کر لیا۔ خالد بن عبداللہ نے فوجیں بھیج کر اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے خالد کو نصیحت کی۔ وہ اس کی نصیحت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے قتل نہیں کیا اور اپنے پاس ہی اس کو قید کر دیا، اور رات کو اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کی باتیں سنتا۔ کسی شخص نے ہشام سے اس کی شکایت کر دی، اس نے فوراً حکم بھیج کر اسے قتل کرا دیا۔ اسی سنہ میں صماری بن شبیب ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ اٹھا لیکن مارا گیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن اثیر: جلد ۵)

Marfat.com

زید بن علی رضی اللہ عنہ کی شہادت:

بنو ہاشم کے حضرات شروع ہی سے اپنے کو خلافت کا حق دار سمجھتے تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانوں میں تو ان میں سے کسی نے آواز نہ اٹھائی بلکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے تو ان میں سے ہر خلیفہ کی نہایت خوش دلی کے ساتھ بیعت کی، لیکن جب زمام خلافت یزید بن معاویہ کے ہاتھ میں آئی تو ابتداء میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا، لیکن اہل کوفہ نے دھوکہ سے انھیں کوفہ بلا کر لرزہ خیز سلوک ان سے کیا۔ چنانچہ شیخ عباس قمی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے تین امور عمر بن سعد کے سامنے پیش کیے جن میں سے ایک امر یہ تھا:

یا آں کہ برود در نزد یزید دست خود را در دست او نہد تا او ہر چہ خواہد بکند۔ (منتہی الآمال: ۱/۳۳۵)

''یا یہ کہ وہ امیر یزید کے پاس جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ کو اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں، پھر جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے کرے۔''

ایسا ہی شیخ مفید نے اپنی کتاب الارشاد: ص ۲۱۲ میں، تلخیص الشافی: ۱۴۶/۴ اور ملا باقر مجلسی کی کتاب بحار الانوار: ۲۲۱/۱۰ میں لکھا ہے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت نے بنو ہاشم کو عرصہ تک مہر بلب رکھا۔ سیدنا زین العابدین جنھوں نے غیروں کی جفا کاری اور اپنوں کی غداری کے ہوش ربا مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، انھوں نے ''تخت خلافت'' کا خیال بھی کبھی اپنے دل میں نہ آنے دیا، لیکن نئی نسل کے دل میں یہ جذبہ پھر بیدار ہوا اور حصول خلافت کی آرزو دل کی گہرائیوں سے نکل کر کبھی کبھی زبانوں پر بھی آنے لگی۔ جن حضرات کی زبانوں پر یہ آرزو آنے لگی وہ شاید عراقیوں کی بے وفائی سے واقف نہ تھے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور سیدنا معصب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کی بے وفائیوں اور غداریوں کے شکار ہو کر جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ ان کی انھیں غداریوں اور بے وفائیوں کے باعث سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے سرزمین کوفہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا اور اپنے خاندان والوں کو بھی تاکید کی تھی کہ ان پر اعتبار نہ کرنا کیونکہ ان کی فطرت میں بے وفائی ہے۔

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں خانوادۂ نبوت کے ایک بزرگ زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ بھی اسی قسم کی آرزو کا اظہار کر چکے تھے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ اپنے ایک خاندانی قضیہ کے متعلق نزاع کے سلسلہ میں دمشق تشریف لے گئے۔ خلیفہ ہشام نے ان سے ان کے درجہ اور مرتبہ کے مطابق سلوک نہ کیا۔ ہشام نے انھیں ملاقات میں بالا خانہ میں بلایا۔ زید بن علی فربہ جسم کے تھے۔ ان کو اوپر چڑھنے میں کافی تکلیف ہوئی۔ ملاقات کے دوران دونوں میں کچھ ناپسندیدہ باتیں ہو گئیں جن کو مؤرخین نے بڑا بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ بہرحال اس تلخ و تیز گفتگو کے بعد زید بن علی شام سے کوفہ آئے۔ اہل کوفہ اپنی پرانی عادت کے مطابق خفیہ

Marfat.com

طور پر ان سے ملتے اور اپنی امداد و حمایت کا یقین دلا کر آپ کو خلافت کے دعوی پر ابھارتے۔ انھوں نے کوفیوں کے اس برانگیختہ کرنے کے بارے میں اپنے چچازاد بھائی ابوجعفر سے مشورہ کیا۔ ابوجعفر نے کہا: ''زید! اہل عراق کا ہرگز اعتبار نہ کریں۔ انھوں نے ہمارے باپ دادا کو دھوکہ دیا ہے۔'' مشورہ بالکل درست تھا کیونکہ کوفیوں کا ماضی اس بارے میں نہایت تاریک اور داغ دار تھا، لیکن زید آخر کار ان کے جال میں پھنس گئے۔ پندرہ ہزار کوفیوں نے خفیہ طور پر زید کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور حکومت کے خلاف خروج کرنے کے لیے ایک دن مقرر کر لیا۔

یوسف بن عمر والی عراق کو وقت سے پہلے اس سازش کی اطلاع ہو گئی۔ اس نے عامل کوفہ کو سختی سے شورش دبانے کے احکام بھیجے۔ زید کی بیعت کرنے والوں پر جب حکومت کی طرف سے سختی ہوئی تو انھوں نے امام سے ایک حیلہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ایک روایت میں ہے کہ زید بن علی جب کوفہ سے مدینہ واپس جانے لگے تو کوفیوں نے ان کے پاس جا کر کہا کہ آپ کہاں جاتے ہیں۔ کوفہ میں ایک لاکھ تلواریں آپ کی حمایت کے لیے موجود ہیں۔ عراق میں بنوامیہ کی تعداد اتنی مختصر ہے کہ ہمارا ایک قبیلہ ان کے لیے کافی ہے۔ زید نے جواب دیا کہ مجھے تم لوگوں پر کوئی اعتماد نہیں ہے۔ تم نے میرے دادا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ساری امت کو معلوم ہے۔ ان لوگوں نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ ہم آپ کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ کامیاب و کامران آپ ہی ہوں گے، اور ان شاء اللہ بنوامیہ کی بربادی اور تباہی آپ ہی کے ہاتھوں ہو گی۔ گویا کہ اہل کوفہ نے آپ کو پورا شیشے میں اتار لیا۔ آپ کے چچیرے بھائی ابوجعفر نے زید سے کہا کہ ان لوگوں کی قسموں پر بھی اعتبار نہ کرو۔ یہ بڑے دھوکے باز ہیں اور عین وقت پر دغا دے جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں آپ کے دادا شہید ہوئے۔ آپ کے بابا پر حملہ ہوا۔ ہمارے اہل بیت نبوت پر گالیاں برسائی گئیں، لیکن افسوس کہ زید بن علی کے دل میں پہلے سے خلافت کے حصول کا جذبہ موجود تھا۔ اس لیے کوفیوں کا سہارا پا کر ان کے فریب میں آ گئے اور اپنے چچازاد بھائی ابوجعفر کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

چند روز میں عراق کے دوسرے شہروں اور خراسان کو چھوڑ کر صرف کوفہ کے پندرہ ہزار افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی سیدنا زید بن علی رضی اللہ عنہ کے حامیوں میں سے تھے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ خانوادہ نبوت سے تعلق رکھتے تھے۔ جو لوگ اہل کوفہ کے ماضی پر نظر رکھتے تھے انھوں نے زید بن علی کو خروج سے باز رکھنے اور مناسب وقت کے انتظار کرنے کا مشورہ دیا، لیکن زید بن علی خلافت کے حصول کے لیے نہایت مضطرب تھے لہٰذا انھوں نے کوفہ میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ یوسف بن عمر ثقفی نے اس بغاوت کو دبانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ فریقین میں معرکہ آرائی تک نوبت پہنچی۔ کوفیوں نے جس طرح قبل ازیں سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کو دھوکہ دیا تھا اسی طرح زید بن علی رضی اللہ عنہ کو بھی دھوکہ دیا۔ جب اہل کوفہ کے تلوار چلانے اور ہمت و مردانگی دکھانے کا وقت آیا تو انھوں نے زید بن علی سے بحث شروع کر دی۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ

Marfat.com

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو تو خلیفہ راشد مانتے تھے لیکن افضلیت میں وہ اپنے جد امجد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے قائل تھے۔ اہل کوفہ نے ان سے پوچھا: پہلے آپ یہ فرمائیں کہ آپ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کیسا سمجھتے ہیں؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ میں نے اپنے خاندان میں سے کسی شخص کو ان دونوں حضرات کی نسبت برا کہتے نہیں سنا۔ کوفیوں نے کہا کہ جب خلافت کے اصل حق دار آپ ہی کے خاندان والے تھے اور ان دونوں کے خلافت پر قابض ہو جانے سے وہ ناراض نہ ہوئے، تو اب اگر بنوامیہ نے آپ کی خلافت پر قبضہ کر لیا ہے تو آپ ان کو کیوں برا کہتے ہیں اور ان سے کیوں برسرپیکار ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر اہل کوفہ نے زید کی بیعت فسخ کر دی اور زید کو چھوڑ کر گھروں کو چلے گئے۔ اس وجہ سے زید نے ان کو رافضی کا خطاب دیا۔ جب اہل کوفہ نے ان کی بیعت کو فسخ کیا تو انھوں نے کہا: "ارفضتمونی" یعنی تم لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ اس وجہ سے ان لوگوں کا نام رافضہ یا رافضی پڑ گیا۔

روایات میں ہے کہ صرف دو سو بیس (۲۲۰) آدمی زید بن علی کے ساتھ رہ گئے۔ ان مٹھی بھر آدمیوں سے زید بن علی رضی اللہ عنہ نے یوسف بن عمر ثقفی کا مقابلہ کیا۔ کوفہ کی گلیوں میں وہ مسلم بن عقیل کی طرح ایک ایک شخص کے گھر آواز دیتے اور عہد بیعت یاد دلا کر حمایت و نصرت کے لیے بلاتے تھے لیکن نہ تو ان کی بات کا کوئی جواب دیتا اور نہ ہی گھر سے باہر نکلتا۔ آخر کئی مرتبہ گورنر عراق کی فوجوں کو شکست دینے کے بعد اچانک انتقال کر گئے۔ ان کی پیشانی پر ایک تیر آ کر لگا جس کے زخم سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ زید بن علی کے صاحب زادے یحییٰ بن زید باپ کی شہادت کے بعد پہلے تو نینوا کی طرف جا کر روپوش ہو گئے۔ پھر موقع پا کر خراسان چلے گئے۔

زید بن علی کی یہ کوشش عجلت اور ناعاقبت اندیشی کے باعث ناکام رہی، لیکن اس سے عباسیوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان کو زیادہ احتیاط برتنے اور زیادہ دور اندیشی سے کام لینے کی ترغیب ہوئی اور وہ اس بات کا بھی صحیح اندازہ نہ کر سکے کہ ملک میں بنوامیہ کے اثر و اقتدار کی اب کیا کیفیت ہے۔ زید بن علی کی شہادت نے اور بھی زیادہ لوگوں کو بنوہاشم کا حامی بنا دیا یا ان کی طرف مائل کر دیا۔

زید بن علی کی شہادت کے بعد ان کے ماننے والوں کا ایک مستقل فرقہ پیدا ہو گیا جو زیدیہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ سیدنا زین العابدین کے بعد سیدنا باقر رحمہ اللہ کے بجائے زید کو امام مانتے ہیں۔ ان کی ایک مستقل فقہ ہے جس کی اہم ترین کتاب جو دستیاب ہے وہ ''کتاب البحر الزخار الجامع لمذاہب علماء الامصار'' چار جلدوں میں ہے۔ اس کے مصنف امام یحییٰ بن مرتضیٰ ہیں۔ یہ کتاب فقہاء کی آراء اور ان کے اختلافات کی جامع ہے۔ یہ فرقہ اب بھی یمن اور دوسرے مقامات پر موجود ہے۔

بنوہاشم کے ایک اہم فرد عبداللہ بن محمد حنفیہ بن علی بن ابی طالب کی سلیمان بن عبدالملک وغیرہ خلفائے بنوامیہ بہت عزت و احترام کیا کرتے تھے لیکن بنوامیہ سے ان کو بھی ہاشمی ہونے کے باعث تعصب تھا اور وہ دلی طور پر بنوامیہ کی حکومت ہٹانے اور بنوہاشم کو برسر اقتدار لانے کے خواہاں تھے۔ ان کی کوشش صرف

Marfat.com

یہیں تک محدود تھی کہ وہ اپنے معتقدوں، ساتھیوں اور دوستوں میں جس کو اہل پاتے اپنے خیالات سے آگاہ فرما دیتے تھے، اور اس قسم کے لوگ ان کو تھوڑے نہیں بہت دستیاب ہو گئے تھے جو عراق میں بھی تھے اور خراسان اور حجاز میں بھی رہتے تھے۔

عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں مختار ثقفی اور بعض شیعان علی نے سیدنا زین العابدین کے انکار کے بعد محمد بن حنفیہ کو منصب امامت پر فائز کیا تھا، اگرچہ بعد میں محمد بن حنفیہ نے عبدالملک کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی لیکن ان کے حامی ان کو برابر امام تسلیم کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے ابو ہاشم عبداللہ کو ان کا جانشین تجویز کیا گیا۔

دعوت عباسیہ:

سیدنا عباس بن عبدالمطلب سرکار دو عالم ﷺ کے عم بزرگوار تھے۔ تاہم آپ نے اور آپ کے فرزند ارجمند سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ یا کسی اور بیٹے نے کبھی خلافت کی آرزو اور تمنا نہ کی تھی۔ لیکن سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خواہش کروٹیں لے رہی تھی۔ یہ مدینہ اور دمشق کے راستہ میں حمیمہ نامی ایک گاؤں میں جو بنوامیہ کی حکومت کی جانب سے آپ کو جاگیر کے طور پر دیا گیا تھا، سکونت پذیر تھے۔ بنو عباس کی یہ دعوت سیدنا عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں شروع ہو گئی تھی۔ ہشام بن عبدالملک کے عہد میں اس نے اور زیادہ وسعت اور تنظیم اختیار کر لی۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ خلافت کے اصل دعوے دار سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فاطمی اولاد تھی یا پھر ان کے بعد غیر فاطمی اولاد تھی، لیکن سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ میں یہ منصب علویوں سے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں منتقل ہو گیا، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد شیعان علی نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے سیدنا زین العابدین کے سامنے منصب امامت پیش کیا لیکن آپ نے اپنی آنکھوں سے شیعان علی کی بے وفائی اور اپنے والد اور دوسرے افراد خاندان کو میدان کربلا میں نہایت بے کسی اور بے بسی کی حالت میں شہید ہوتے دیکھا تھا، لہٰذا آپ اتنے شکستہ دل اور دل گرفتہ ہو گئے تھے کہ آپ نے سیاسی میدان میں قدم رکھنا بالکل پسند نہ فرمایا اور ان کی اس پیش کش کو یک قلم ٹھکرا دیا۔ ان کے انکار پر شیعان علی نے ان کی غیر فاطمی فرزند سیدنا محمد بن حنفیہ کی طرف رجوع کیا۔ اقتدار اور حکومت میں بڑی کشش اور جاذبیت ہوتی ہے، لہٰذا انھوں نے اس پیش کش کو قبول کر لیا حالانکہ سلیمان بن عبدالملک اور دیگر خلفائے بنوامیہ ان کی نہایت عزت و توقیر کرتے اور ان کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ اس طریقہ سے منصب امامت فاطمی اولاد سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی غیر فاطمی اولاد میں منتقل ہو گیا۔ محمد بن حنفیہ کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے ابو ہاشم عبداللہ ان کے جانشین ہوئے اور سرزمین عجم میں ان کی خفیہ دعوت ہوتی رہی۔ سنہ ۱۰۰ھ میں یہ سلیمان بن

Marfat.com

عبدالملک سے ملنے کے لیے دمشق گئے۔ اس نے ان کی بڑی خاطر و مدارات کی اور ان کی تمام ضروریات اور بڑے ہدایا و تحائف کے ساتھ انھیں رخصت کیا۔ راستہ میں یہ بیمار ہو گئے۔ (بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ واپسی پر سلیمان نے انھیں زہر دلوا دیا۔ (یہ روایت روایتاً اور درایتہً غلط ہے) یہاں ان کے ساتھ ان کے خاندان والوں میں سے کوئی نہ تھا، لہٰذا ابو ہاشم عبداللہ ان کے پاس چلے گئے۔ سوء اتفاق سے ان کا وہیں انتقال ہو گیا۔ انھوں نے انتقال سے قبل انھیں اپنا منصب امامت تفویض کر دیا اور اپنے عراقی اور خراسانی پیرو کاروں کو ہدایت کر دی کہ ان کے بعد محمد بن علی ان کے جانشین ہوں گے، اس لیے وہ لوگ ان کی طرف رجوع کریں چنانچہ ابو ہاشم کی وفات کے بعد ان لوگوں نے محمد بن علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اس طرح امامت کا منصب علویوں سے بنو عباس میں منتقل ہو گیا۔ (ابن اثیر: ۵/۷)

اس کے بعد سنہ ۱۰۰ھ میں جب زمام خلافت عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھ میں آئی تو محمد بن علی نے اپنے کارندے عراق، خراسان، حجاز، یمن اور مصر وغیرہ میں روانہ کیے۔ عمر بن عبدالعزیز نے اگرچہ بنوامیہ کی نسبت اس عداوت اور نفرت کو جو اکثر لوگوں کے دلوں میں تھی، بہت حد تک کم کر دیا لیکن پھر بھی محمد بن علی کی تحریک برابر جاری اور مصروف عمل رہی۔ چنانچہ محمد بن علی کی طرف سے میسرہ عراق میں اور ابو صادق خراسان میں عباسیوں کی خلافت کے لیے برابر دعوت دیتے رہے۔ محمد بن علی نے مضافات بلقاء سکونت اختیار کر کے وہیں سے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔

محمد بن علی ایک مدبر اور منتظم شخص تھے۔ انھوں نے اپنی اس تحریک کا ایک نظم قائم کیا کوفہ اور خراسان اپنی تحریک کا مرکز قرار دیا۔ کوفہ اس لیے کہ وہ شیعان علی رضی اللہ عنہ کا پرانا گہوارہ اور مرکز تھا، اور خراسان اس لیے کہ شاہان عجم کے دستور کے مطابق وہاں کے لوگ خلافت میں وراثت کے اصول کو نہایت آسانی سے قبول کر سکتے تھے اور سلطنت سے محروم ہو جانے کے بعد ہر انقلاب کو اپنے لیے تقدیر آزمائی کا ایک موقع تصور کرتے تھے۔

محمد بن علی کی تحریک پہلے بے ضابطہ تھی لیکن ابو ہاشم سے منصب امامت ملنے کے بعد یہ بے ضابطہ انفرادی دعوت کے بجائے ایک باضابطہ اجتماعی دعوت کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کے اصول و قواعد بنائے گئے اور تجربہ کار داعیوں کو سلطنت اسلامیہ کے مختلف شہروں میں بھیجا گیا جو بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ بنوامیہ کے مظالم اور ان کی برائیوں کی تشہیر کے لیے بنو عباس کی خلافت کی دعوت دیتے۔ کوفہ کا قائم بالامر محمد بن علی کا خانہ زاد غلام میسرہ مقرر کیا گیا اور خراسان کا ابو محمد صادق۔ محمد بن خنیس اور رحیان عطار کو ابو محمد صادق کا مددگار تجویز کیا گیا۔ ابو محمد نے بارہ کار آزمودہ اور تجربہ کار داعیوں کو خراسان میں تحریک کا نقیب مقرر کیا اور ان کی ''مجلس خصوصی'' کے ماتحت ستره داعیوں کی ''مجلس عمومی'' مقرر کی۔ محمد بن علی نے تحریک کو ہمہ گیر، موثر اور کامیاب بنانے کے لیے اصول و قواعد وضع کیے اور وہ طریق کار تجویز کیا جس سے اس تحریک کا راز فاش نہ ہو۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ سے لے کر ہشام بن عبدالملک کے عہد تک یہ تحریک برابر خفیہ طور پر جاری رہی اور ہزاروں عراقی اور

Marfat.com

خراسانی اس میں شریک ہو گئے۔ عوام کے علاوہ بہت سے اشراف اور عمائد بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے جن میں ایک ابو مسلم خراسانی بھی تھا۔ خوش قسمتی سے انھیں عمر بن عبدالعزیز جیسے نیک، رحم دل اور پاک باز خلیفہ کا زمانہ میسر آ گیا۔ آپ کے اوصاف رحم دلی اور پاک بازی سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور آپ کے عہد میں اس تحریک نے بغیر کسی مزاحمت کے نشوونما پائی۔

سنہ ۱۰۲ھ اور دوسری روایت کے مطابق سنہ ۱۰۳ھ میں خراسان کے چند با اثر اور خاص لوگوں نے اس عباسی دعوت کو قبول کر لیا۔ ابو محمد انھیں اپنے ہمراہ لے کر محمد بن علی کے پاس آیا۔ انھیں ایام میں محمد بن علی اپنے اس لڑکے کو جس کی عمر صرف پندرہ یوم تھی، لے کر آئے اور ان لوگوں سے کہا کہ یہی تمھارا سردار ہوگا۔ (یہی لڑکا عبداللہ سفاح تھا) اس کے بعد بکیر بن ماہان جو سندھ میں جنید کے ساتھ تھا، وہاں سے کوفہ آیا اور ابو محمد صادق سے ملا۔ اس نے بکیر کو دعوت دی جو اس نے فوراً قبول کر لی۔

سنہ ۱۰۷ھ میں بکیر بن ماہان نے جو کوفہ میں محمد بن علی کی طرف سے عراق و خراسان میں عباسی دعوت کا مہتمم تھا، ابو عکرمہ، ابو محمد صادق اور عمار عبادی وغیرہ چند اشخاص کو خراسان میں خلافت عباسیہ کی دعوت کے لیے روانہ کیا۔ اس زمانہ میں خراسان میں بنو امیہ کی طرف سے اسد بن عبداللہ قسری گورنر تھا۔ اس کو اتفاقاً اس کا علم ہو گیا کہ چند لوگ خلافت عباسیہ کے لیے لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ اس نے سب کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ ان میں سے صرف ایک شخص عمار بچ کر بھاگا اور بکیر بن ماہان کو آ کر اس حادثہ کی اطلاع دی۔ بکیر نے اس کی تمام کیفیت محمد بن علی کے پاس لکھ کر بھیجی۔ محمد بن علی نے جواب میں لکھا کہ یہ تمھاری کامیابی کا زینہ ہے۔ اب تم خود کو اپنے قتل کا بھی منتظر رکھو۔ اسد بن عبداللہ قسری گورنر خراسان کے متعدد داعیوں کو قتل کرنے اور پھانسی پر لٹکانے سے کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ تحریک کے علم برداروں میں قربانی کا جذبہ ابھرا۔ یہی کسی تحریک کی کامیابی و کامرانی کا پہلا زینہ ہوتا ہے۔ چنانچہ تحریک کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔

سنہ ۱۱۸ھ میں بکیر نے عمار بن زید کو ہوا خواہان بنو عباس کا سردار بنا کر خراسان کی جانب روانہ کیا۔ اس نے وہاں جا کر اپنے آپ کو خراش کے نام سے موسوم کیا۔ خراش نے بنو عباس کی حمایت اور ہمدردی کو نماز اور روزہ پر بھی ترجیح دی اور لوگوں میں یہ پرچار کیا کہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے جدوجہد کرنا نماز روزہ سے بڑھ کر ہے۔ اس معاملہ کو رازداری اور اخفا میں رکھ کر افشا ہونے سے بچاؤ۔ محمد بن علی نے یہ حالات سن کر خراش کی نسبت ناراضی کا اظہار کیا۔ ادھر گورنر خراسان اسد بن عبداللہ قسری کو خراش کا حال معلوم ہوا تو اس نے اس کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔ محمد بن علی اہل خراسان کی اس ضعیف الاعتقادی سے ناراض ہو گئے تھے، لہٰذا خراسان سے با اثر لوگوں کا ایک وفد محمد بن علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی غلطیوں اور خطاؤں کی معافی چاہی۔

غرض ہشام کے عہد میں عباسی داعیوں کی کوششوں سے خراسان اور عراق کے بڑے حصہ میں عباسی دعوت پھیل گئی اور ہر جگہ اس کے علانیہ مظاہر نظر آنے لگے۔ اس وقت ہشام نے اس طرف توجہ کی اور ایک

Marfat.com

نامور اور تجربہ کار شخص امیر نصر بن یسار کو جو خراسان کے حالات سے پوری طرح آشنا تھا، وہاں کا والی مقرر کر کے عباسی دعوت کے استیصال پر مامور کیا لیکن اسی دوران میں ہشام کا وقت آخر آ گیا۔

سنہ ۱۲۴ھ میں محمد بن علی کا قید کی حالت میں انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت وہ اپنے بیٹے ابراہیم کو اپنا جانشین بنا گئے اور اپنے نقیبوں اور مریدوں کو وصیت کر گئے کہ میرے بعد ابراہیم کو امام تسلیم کر کے اس کی اطاعت اور فرمان برداری کریں۔ بکیر بن ماہان ابراہیم سے ہدایات لے کر خراسان کی طرف روانہ ہوا کہ وہاں جا کر لوگوں کو محمد بن علی کے فوت ہونے اور ابراہیم کے امام مقرر ہونے کی خبر سنائے۔ بکیر بن ماہان نے خراسان جا کر پوشیدہ طور پر اپنے ہم خیال لوگوں کو جمع کر کے سب کو وہ حالات سنائے جو وہ دیکھ کر گیا تھا اور انھیں ہدایات پہنچائیں جو ابراہیم نے اسے دی تھیں۔ بنو عباس کے حامیوں نے جو کچھ زر نقد ان کے پاس تھا، لا کر اکٹھا کیا اور بکیر اس رقم کو لے کر امام ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ امام ابراہیم نے اس تحریک کو پوری قوت اور ہمت سے جاری رکھا۔ ان کے عہد کے آغاز میں مشہور داعی ابو مسلم خراسانی تحریک میں شامل ہو گیا۔ ابو مسلم نے وقت کے مساعد حالات اور اپنی دماغی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس خاموش تحریک ہنگامہ خیز انقلاب میں بدل دیا۔

ولی عہدی:

یزید بن عبدالملک نے اپنے بعد اپنے بھائی ہشام اور اپنے بیٹے ولید کو علی الترتیب ولی عہد نامزد کیا تھا۔ ہشام نے ولید کو محروم کر کے اپنے بیٹے مسلمہ کو ولی عہد بنانا چاہا۔ بعض امرائے سلطنت نے اس کی سخت مخالفت کی لہٰذا ہشام کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی، البتہ ہشام اور ولید کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ولید اردن کے علاقہ میں اپنی جاگیر میں چلا گیا اور ہشام کی موت تک وہیں مقیم رہا۔

۶ ربیع الثانی سنہ ۱۲۵ھ کو ہشام نے مرض خناق میں انتقال کیا اور اپنے نئے دارالحکومت رصافۃ الشام میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۵۵ سال تھی اور مدت خلافت ۱۹ سال نو ماہ تھی۔

Marfat.com

ہشام کے عہد حکومت پر ایک نظر

بنوامیہ کے خلفاء میں جس قدر خلفاء گزرے ہیں، ہشام بن عبدالملک ان میں ممتاز ترین خلفاء میں سے ایک تھا۔ بنوامیہ کے تین ممتاز ترین خلفاء تھے۔ جنھوں نے اپنی تدبیر و سیاست، اولوالعزمی، بیدار مغزی، اوصاف جہاں بانی اور حوصلہ مندی سے تاریخ اسلام کے صفحات پر اپنے نقش چھوڑے۔ ان میں پہلے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تھے، دوسرا عبدالملک بن مروان تھا جس نے بنوامیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو دوبارہ تھام لیا، تیسرا ہشام بن عبدالملک تھا جو بڑا دقیق النظر، منتظم، کفایت شعار، امور مملکت میں بیدار مغز اور رعایا کی سیاست میں بڑا باتدبیر تھا۔ اس کی نگاہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہ ہوتی تھی۔ (کتاب التنبیہ والاشراف: ص ۳۲۲) ابن طقطقی نے شیعہ ہونے کے باوجود لکھا ہے کہ وہ بڑا عاقل، حلیم الطبع اور پاک باز تھا۔ (آداب السلطانیہ: ص ۱۷) اس میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا حلم و تدبر، عبدالملک کی سیاست و الوالعزمی دونوں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ بنوامیہ میں ان تینوں پر سیاست و تدبر کا خاتمہ ہو گیا۔ (مروج الذہب: ۲۸/۳)

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ہشام بن عبدالملک دوربین، کفایت شعار، تیز فہم اور باتدبیر خلیفہ تھا۔ سلطنت کے چھوٹے چھوٹے معاملات اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہتے تھے۔ بردباری اور تحمل اس کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ (البدایہ والنہایہ: ۳۵۱/۹) وہ بیس سال تک مسند خلافت پر متمکن رہا۔ اس مدت میں اس نے اپنی بہترین صفات سے کام لے کر اموی حکومت کے آفتاب کو نصف النہار تک پہنچا دیا۔ اس کی انتظامی قابلیت کے دشمن بھی قائل تھے۔ عبداللہ بن علی عباسی باوجود مخالف ہونے کے اس بات کا اعتراف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے بنوامیہ کے تمام خلفاء کے دفاتر کی جانچ پڑتال کی مگر ہشام کے دفاتر راعی اور رعایا کے حق میں سب سے بہتر پائے۔ ہشام کے زمانے میں نظم حکومت میں کوئی جنبش نہ ہونے پائی۔ مشرق میں ترک و تاتار کی اور مغرب میں بربر کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے رومیوں کے دلوں میں اسلامی حکومت کی اس قدر ہیبت بٹھا دی کہ انھیں حدود کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس نے افتادہ زمینوں کی طرف خاص توجہ دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے عہد حکومت میں افتادہ زمینوں کا کافی حصہ آباد ہو گیا۔ (مروج الذہب: ۲۱/۳)

اموی دور میں بیت المال میں کچھ بدعنوانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کی عمر عبدالعزیز نے کافی حد تک

Marfat.com

اصلاح کردی تھی، لیکن ان کی وفات کے بعد پھر کچھ کارکنان حکومت نے پرانی روش اختیار کر لی۔ ہشام اس قسم کی بدعنوانیوں کے سخت خلاف تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ جب تک شہادتوں سے اس بات کا پورا یقین نہ ہو جائے کہ محاصل میں ناجائز آمدنی کا کوئی حصہ شامل نہیں ہے، اس وقت تک اس کو بیت المال میں جمع نہ کیا جائے۔ چنانچہ چالیس شہادتوں کے بعد وہ آمدنی بیت المال میں داخل کی جاتی۔

عدل و انصاف ایک اچھی حکومت کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہشام نے اپنی حکومت میں عدل وانصاف کو بھی قائم کیا۔ چھوٹے بڑے، مسلم وغیر مسلم اور وابستگان حکومت سب کو عدل و انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جاتا۔ صاحبان اقتدار کسی پر دست تطاول دراز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک نصرانی نے ہشام کے لڑکے محمد کے غلام کو کسی بات پر مارا اور وہ زخمی ہو گیا۔ محمد کے آدمی نے اس کے انتقام میں نصرانی کو مارا۔ ہشام کو جب اس کا پتہ چلا تو اس نے فوری طور پر اپنے بیٹے کے اس غلام کو طلب کیا۔ اس نے محمد کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کی لیکن وہ ہشام کی سزا سے نہ بچ سکا، اور نہ صرف اس غلام کو سزا دی بلکہ اپنے لڑکے محمد کو بھی تنبیہ کی۔ (ابن اثیر: ۶۶/۵)

ہشام کے زمانہ میں فوج کے شعبہ میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ ضرورت کی جگہوں پر مستحکم اور مضبوط قلعے تعمیر کیے گئے۔ انطاکیہ جو کسی زمانے میں قیصر روم کا مشرقی دارالسلطنت تھا اور اب وہ دارالسلطنت تو ختم ہو گیا ہوا تھا البتہ اسلامی اور رومی حکومت کی نازک سرحد تھی، وہاں تین مضبوط اور مستحکم قلعے بنائے۔ علاوہ ازیں تمام سرحدی علاقوں میں مضبوط چوکیاں بنوائیں اور وہاں ہر طرح کا جنگی اور فوجی سامان جمع کیا۔ بحری بیڑے کی ترقی کے لیے شمالی افریقہ میں مزید نئے کارخانے قائم کیے جس سے ایک تو بحری بیڑے میں وسعت اور اضافہ ہوا اور دوسرے بحر روم میں کامیاب بحری مہمات کا سلسلہ شروع ہوا۔ (مروج الذہب: ۲۱/۳)

اس نے ملکی مصنوعات کی طرف بھی توجہ کی اور اس سلسلہ میں ریشمی کپڑوں کی صنعت میں بڑی ترقی ہوئی، اور جب ملک میں اس صنعت کے بڑے بڑے کارخانے لگے تو لوگوں کو روزگار ملا، اور وہ خوش حالی اور خوش گواری کی زندگی بسر کرنے لگے۔ (عروج الذہب: ۲۱/۳)

ہشام کے عہد حکومت میں کئی شہر بھی آباد ہوئے۔ شام میں قنسرین کے علاقہ میں رصافہ کا ایک خوبصورت شہر آباد کیا گیا جس کی آب و ہوا بڑی خوشگوار تھی گرمیوں کے موسم میں ہشام کا پایہ تخت یہی شہر ہوتا تھا۔ (معجم البلدان: ۱۹۵/۴)

اس کے علاوہ سندھ میں دو شہر آباد کیے گئے۔ ان میں ایک کا نام منصورہ تھا اور دوسرے کا محفوظہ۔ منصورہ سندھ کا اسلامی دارالحکومت تھا۔ (فتوح البلدان: ص ۴۴۸)

ہشام کے زمانہ میں بڑے بڑے حوادث پیش آئے مگر مشرق اور مغرب میں اسلام کا جھنڈا ہمیشہ بلند رہا۔ ترکستان اور آذربائیجان میں ترک اور تاتاری کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ سندھ میں بغاوت ہوئی تو اس کا نہایت سختی

Marfat.com

سے استیصال کیا۔ اور مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم کر کے انھیں محفوظ کر دیا گیا۔ ایشیائے کوچک میں بہت سے قلعے مسلمانوں نے رومیوں کے ہاتھ سے چھین لیے۔ شمالی افریقہ میں بربریوں نے سر اٹھایا تو انھیں کچل دیا گیا۔ اندلس میں نظم و نسق کو درست کیا گیا اور وہاں سے کئی بار فرانس پر حملے کیے گئے۔

شہروں کی اس آباد کاری کے علاوہ حاجیوں کے آرام و آسائش کے لیے مکہ کے راستہ میں پانی کے حوض اور تالاب بنوائے۔ (مروج الذحب: ۲۱/۲)

ہشام کو گھوڑوں اور گھوڑ دوڑ کا بہت شوق تھا۔ اس وجہ سے اس کے عہد میں گھوڑوں کی پرورش، پرداخت اور ان کی نسل میں بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کے پاس گھوڑ دوڑ کے چار ہزار منتخب گھوڑے تھے۔ (مروج الذہب: ۲۱/۲)

ہشام فطری طور پر ایک سنجیدہ انسان تھا۔ لہو ولعب اور عیش و عشرت سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس وجہ سے وہ رعایا کو بھی اس قسم کے مشاغل سے روکتا تھا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بوڑھا شخص اس کے سامنے پیش کیا گیا اور اسے بتایا گیا کہ یہ گانے والی عورتوں، شراب و کباب اور مزامیر سے نہایت دلچسپی رکھتا ہے۔ ہشام کو جونہی یہ بتایا گیا اس نے حکم دیا کہ طنبورہ اس کے سر پر توڑ دو اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ وہ رونے لگا۔ ہشام نے اس کی روتی صورت دیکھ کر کہا: ''بڑے میاں! صبر سے کام لو'' بوڑھے نے جواب دیا کہ میں سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے نہیں روتا ہوں بلکہ اس ناقدر شناسی پر روتا ہوں کہ اب ''بربط'' کو ''طنبور'' کہا جاتا ہے۔

(ابن اثیر: ۹۶/۵)

ہشام کو علم وفن سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے امام زہری سے چار سو احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کروایا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۹۹/۱) غیر قوموں کے علوم میں فارسی زبان کی ایک اہم کتاب کو جو ایرانیوں کے بہت سے علوم وفنون اور ان کے بادشاہوں کے حالات زندگی اور سیاسی واقعات پر مشتمل تھی، اس کا عربی زبان میں ترجمہ کروا دیا۔ کتاب التنبیہ والاشراف: ص ۱۰۶ پر اس کا تفصیلی حال لکھا ہے۔

ان کارناموں کے علاوہ اس نے دینی خدمات بھی بہت انجام دیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے اپنے زمانہ میں کوئی مذہبی فتنہ پرداز اٹھنے نہیں دیا کیونکہ وہ خود ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ اس وجہ سے وہ دین میں کوئی بدعت اور فساد پیدا ہونے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے عہد خلافت میں دین میں غلط خیالات اور عقائد میں رخنہ اندازی کرنے والوں کا نہایت سختی سے نوٹس لیا۔ رومی اور ایرانی اقوام کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے اور مفتوح قوموں سے مسلمانوں کے ملنے جلنے سے مسلمانوں کے عقائد میں پہلی سی سادگی اور پختگی رہنی مشکل تھی۔ چنانچہ جعد بن درہم نے سب سے پہلے ہشام کے زمانہ میں ''عقیدہ خلق قرآن'' کا اظہار کیا۔ ہشام نے عراق کے گورنر خالد بن عبداللہ قسری کے ذریعہ اسے عین بقر عید کے روز قتل کروا دیا۔ اسی طرح غیلان بن یونس نے سب سے پہلے عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں قدریہ خیالات کا اظہار کیا، لیکن عمر

Marfat.com

بن عبدالعزیز کے سمجھانے بجھانے پر اس نے اس عقیدہ سے توبہ کر لی۔ ہشام کے زمانہ میں اس نے پھر اپنے خیالات کا اعادہ کیا۔ ہشام نے اس کو بھی قتل کروادیا۔ (ابن اثیر: ۹۶/۵)

اپنے لڑکوں کو ہشام نماز کی پابندی کی بہت تاکید کرتا تھا اور اس بارے میں ان کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس کا ایک لڑکا نماز جمعہ میں نہ پہنچ سکا۔ ہشام کو پتہ چلا تو اس کی سخت باز پرس کی۔ اس نے عذر کیا کہ میرے پاس سواری نہ تھی۔ ہشام نے کہا کہ کیا تم پیدل نہیں جاسکتے تھے، چنانچہ سزا کے طور پر ایک سال کے لیے اس کی سواری بند کردی۔ (ابن اثیر: ۹۶/۵، البدایہ والنہایہ: ۳۵۲/۹)

مالیات کے معاملہ میں بھی اس کی پالیسی بہت سخت تھی۔ وہ مسرفانہ اخراجات کو قطعاً ناپسند کرتا تھا بلکہ جائز اخراجات میں بھی جزرسی سے کام لیتا تھا۔ اخراجات کے معاملہ میں اس تشدد اور سختی کی وجہ سے کارکنان حکومت کے ہاں وہ بخیل مشہور ہو گیا تھا، لیکن اس کی پالیسی بالکل درست تھی اور عمر بن عبدالعزیز کی بھی یہی پالیسی تھی۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ہشام کی معاشرت بہت سادہ تھی۔ وہ معمولی کپڑے پہنتا تھا اور اس کی غذا بھی معمولی تھی۔ عقال بن شبہ کہتے ہیں کہ ''جب ہشام نے مجھے خراسان کی طرف بھیجنے کے لیے بلایا تو میں نے اسے ایک سبز سوتی قبا میں ملبوس دیکھا۔ مجھے یاد آیا کہ ولی عہدی کے زمانے میں بھی میں نے اسے یہی قبا پہنے دیکھا تھا۔ ہشام میری نگاہوں کو تاڑ گیا اور کہنے لگا: ''کیا بات ہے؟ میں نے کہا ولی عہدی کے زمانہ میں بھی میں نے آپ کو ایک ایسی قبا پہنے دیکھا تھا، یہ وہی تو نہیں؟'' ہشام نے قسم کھا کر کہا: ''یہ وہی قبا ہے۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی قبا نہیں ہے۔'' (ابن اثیر: ۹۶/۵)

ہشام اخلاق و عادات کے لحاظ سے بھی نہایت سادہ مزاج تھا۔ شاہانہ غرور تمکنت اس کے پاس بھی نہ پھٹکتی تھی۔ اگر اس سے کوئی غلطی ہو جاتی اور ایک انسان سے آخر ہو ہی جاتی ہے تو وہ اس کو فوری طور پر تسلیم کر لیتا۔ ایک مرتبہ وہ کسی معزز شخص کو کچھ ناملائم الفاظ کہہ بیٹھا۔ اس شخص نے بگڑ کر کہا کہ خلیفہ وقت ہو کر آپ کو یہ الفاظ منہ سے نکالتے ہوئے کوئی حیا نہیں آئی۔ کوئی اور شخص ہوتا تو سر قلم کروا دیتا۔ اس زمانے کے سربراہان حکومت میں کچھ حیا ہوتی تھی۔ ہشام اس شخص کی بات سن کر سخت شرمندہ ہوا اور کہنے لگا کہ تم مجھ سے اس زیادتی کا بدلہ لے لو۔ اس شخص نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی تم جیسا کمینہ ہو جاؤں۔ ہشام نے کہا کہ کچھ مال لے کر مجھے معاف کر دو۔ اس شخص نے کہا کہ میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس پر ہشام نے کہا کہ خدا کے واسطے معاف کر دو۔ وہ شخص کہنے لگا کہ مجھے یہ منظور ہے۔ میں خدا کے واسطے اور تمھارے واسطے معاف کرتا ہوں۔ یہ سن کر ہشام نے اپنی گردن جھکا لی اور نہایت ندامت اور لجاجت سے کہا: ''واللہ! آئندہ ایسی حرکت نہ ہوگی۔''

(ابن اثیر: ۹۷/۵)

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ہشام کے اوصاف میں دو وصف نہایت نمایاں تھے۔ حلم اور کفایت شعاری۔

Marfat.com

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے حلم کی طرح اس کا حلم بھی مسلمات میں سے ہے۔ وہ تلخ سے تلخ باتیں سن کر پی جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے اس کے سامنے نہایت سخت کلمات کہے۔ اس کے جواب میں وہ غصہ میں نہیں آیا بلکہ صرف اتنا کہا: ''اپنے امام کو برا کہنا مناسب نہیں ہے۔'' (ابن اثیر: ۵/۹۶) اس کی زبان سے سخت سے سخت کلمہ جو تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ کسی شخص پر نہایت برہم ہوا، تو کہا: ''میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں تم کو ایک کوڑا ماروں گا۔'' اس نے اپنے اس ارادہ پر عمل نہیں کیا۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی: ص ۲۴۸)

مختصر یہ کہ ہشام کا دور خلافت ہر لحاظ سے ایک کامیاب دور تھا، لیکن افسوس کہ یہ اموی حکومت کا چراغ سحری تھا جس کا روغن آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا بلکہ آخری لپک تھی۔

Marfat.com

ولید بن یزید بن عبدالملک

سنہ ۱۲۵ھ تا سنہ ۱۲۶ھ / مطابق سنہ ۷۴۳ء تا سنہ ۷۴۴ء

ابوالعباس ولید بن یزید بن عبدالملک سنہ ۹۰ھ میں پیدا ہوا اور اس کی ماں حجاج بن یوسف ثقفی اور محمد بن یوسف ثقفی کی بیٹی تھی۔ یزید بن عبدالملک کی وفات کے وقت یہ کم عمر تھا۔ ابتداء ہی سے کچھ صحبت بد کے باعث اور کچھ ماں کے پیٹ سے چاندی کا چمچہ منہ میں لینے کی وجہ سے وہ عیش پرستی کے سبب انگشت نما تھا۔ اس لیے ہشام بن عبدالملک اس کو ولی عہدی سے ہٹانا چاہتا تھا، اس کا یہ فیصلہ کوئی نامناسب اور غلط نہ تھا، لیکن ناعاقبت اندیش سرداروں اور امیروں کی مخالفت نے ہشام کو مجبور کر دیا اور وہ اس کو ولی عہدی سے معزول کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ حسب وصیت یزید بن عبدالملک ہشام کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ ولید کا خلیفہ ہونا بنوامیہ کی تباہی اور بربادی کا دروازہ کھلنا تھا کیونکہ وہ ہر لحاظ سے امور مملکت سے غافل، خلافت کے لیے بالکل نااہل اور ہر وقت عیش و عشرت میں غرق رہتا تھا۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ ہشام نے اس کو اپنی زندگی میں سدھارنے کی بہت کوشش کی، زبانی فہمائش بھی بہت کی، بداخلاق لوگوں سے اسے الگ کر دیا، امیر حج بنا کر مکہ بھیجا، آخر میں اسے نصیحت دلانے کے لیے اس کا وظیفہ بند کر دیا، لیکن وہ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ اس کے مشاغل میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ وہ دل سے ہشام کو نفرت کرنے لگا کیونکہ جس شخص نے سنورنا نہ ہو اس کو ناصح اور اس کی نصیحت دونوں اچھی نہیں لگتیں۔ چنانچہ ہشام کی آئے روز کی فہمائش اور نصیحتوں سے تنگ آ کر وہ اردن کے قریب اپنی جاگیر میں چلا آیا۔ اس کی اصلاح سے ہشام مایوس ہو گیا۔ چنانچہ امام زہری اور دوسرے کئی ایک اکابر امت کے مشورہ سے اس نے ولید کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے لڑکے مسلمہ کو ولی عہد بنانے کی کوشش کی تھی لیکن ابھی اس کی کوشش کی تکمیل نہ ہوئی تھی کہ ہشام کا آخری وقت آ گیا۔ ہشام کی وفات کی خبر ولید کو اردن میں ملی۔ اس نے فوری طور پر عباس بن عبدالملک کو کہا کہ رصافہ پہنچ کر ہشام کی کل دولت اور متروکات کو اپنے قبضہ میں لے لو۔ (ابن اثیر: ۵/۹۷-۹۸) اس نے ہشام کے اہل و عیال کو بھی نظر بند کروا دیا، البتہ اس نے ہشام کے بیٹے مسلمہ کے ساتھ نرم برتاؤ کرنے کی ہدایت کی کیونکہ ولی عہدی کے معاملہ میں وہ

Marfat.com

اپنے باپ سے متفق نہ تھا۔ عباس بن عبدالملک کو جونہی ولید کا خط پہنچا اس نے رصافہ پہنچ کر فوری طور پر حکم کی تعمیل کی۔

ولید بن یزید نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی ان لوگوں کو جن کو وہ اپنا مخالف سمجھتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اس کے اخراج کی تجویز میں شریک تھے، ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا۔ ان لوگوں سے اس نے مختلف طریقوں سے انتقام لینا شروع کر دیا۔ کسی کا وظیفہ بند کر دیا، کسی کو پس دیوار زنداں کر دیا اور کسی کو قتل کر دیا۔ اس نے ہشام کے تمام آدمیوں پر اس قدر سختیاں کیں کہ اس کے خدام اس کی قبر پر جا کر رویا کرتے تھے۔

(ابن اثیر: ۵/۱۰۱)

ہشام کے ماموں ہشام بن اسماعیل کو مکہ کی گورنری سے معزول کر کے اور اس کے لڑکوں محمد اور ابراہیم کو کوڑوں سے پٹوا کر انھیں یوسف بن عمر گورنر عراق کے سپرد کر دیا اور اس نے ان کو اتنی سزائیں دیں کہ وہ اس کے صدمہ سے مر گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ ہشام بن اسماعیل مخزومی مدینہ کا گورنر تھا۔ اس کو تو گورنری سے معزول کر دیا اور خالد بن عبداللہ قسری سابق گورنر عراق کو پکڑ کر یوسف بن عمر و والی عراق کے سپرد کر دیا۔ اس نے ان اشراف کو نہایت سخت سزائیں دے دے کر مار ڈالا۔ سلیمان بن ہشام نے اپنے چچا زاد بھائی کو پکڑ کر کوڑوں سے پٹوایا اور داڑھی منڈوا کر اس کو شہر کے گلی کوچوں میں پھرایا۔ یزید بن ہشام اور ولید بن عبدالملک کے کئی بیٹوں کو پس دیوار زندان کر دیا۔ مختصر یہ کہ مسند خلافت پر بیٹھتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے خاندان کے اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا۔

اپنی خلافت کے پہلے ہی سال یعنی سنہ ۱۲۵ھ ولید بن یزید نے اپنے بیٹوں عثمان اور حکم کے لیے لوگوں سے ان کی ولی عہدی کی بیعت لی۔ اگر چہ ولی عہدی کی بیعت کی رسم پہلے ہی سے جاری تھی اور لوگ بھی اس طرح کی بیعت کے عادی ہو چکے تھے لیکن ان لڑکوں کی لوگوں نے مجبوری سے بیعت کی، کسی نے بھی شرح صدر کے ساتھ ان کی بیعت نہیں کی بلکہ ان کی بیعت کرتے وقت لوگوں کے دلوں میں اور بھی انقباض پیدا ہوا۔

فسق و فجور کی زندگی:

ولید کی فسق و فجور میں غلطاں زندگی اور اس کے مظالم کے باعث عوام کے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی۔ لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف بد دلی پھیل گئی۔ اس نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے اپنے خاندان، ان کے ارکان، امراء اور قبائل کو اپنا مخالف بنا لیا جن پر بنو امیہ کی قوت و سطوت کا مدار تھا۔ مضری یا نزاری اور یمنی قبائل پرانے حریف تھے اور بنو امیہ کی سطوت و قوت کا دارومدار زیادہ تر یمنی قبائل پر تھا۔ اس وجہ سے بنو امیہ کے خلفاء ان کی بڑی عزت و تکریم اور مدارات کرتے تھے۔ ولید نے اپنی حماقت اور بیوقوفی کے باعث ان کے امراء اور عمائد کی بھی تذلیل و تحقیر کی اور ان کے مقابلہ میں بنو نزار کو بڑھانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی

Marfat.com

قدیم رقابت پھر سے ابھر آئی۔ خالد بن عبداللہ قسری یمنی قبائل کا ایک نہایت مقتدر، معزز اور ممتاز سردار تھا۔ ہشام نے اپنے عہد خلافت میں اس کو اسی وجہ سے عراق کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس نے اپنی فیاضی کے باعث عراق کی آمدنی کی ایک بہت بڑی رقم اہل عراق پر صرف کر دی تھی ہشام نے اس رقم کا جب اس سے حساب مانگا تو وہ اس کو مطمئن نہ کر سکا۔ ہشام نے انتظامی حیثیت سے اسے گورنری سے معزول کر دیا لیکن اس کے مقام اور رتبہ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسے کوئی سزا نہ دی بلکہ اس کی درشت باتوں پر صبر اور بردباری کا اظہار کرتا رہا ولید نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی اس سے اس رقم کا مطالبہ کیا۔ جب خالد بن عبداللہ وہ رقم ادا نہ کر سکا تو اسے یوسف بن عمرو نزاری گورنر عراق کے جو اس کے مخالف اور اس کے لیے دل میں کینہ اور تعصب رکھتا تھا، سپرد کر دیا۔ اس نے اپنے تعصب کے باعث اس کو طرح طرح کی تکالیف اور سزائیں دے کر ہلاک کر دیا۔ ولید نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ اس کی تحقیر و تذلیل کو نہایت فخریہ انداز میں نظم کیا۔ اشعار اس زمانے میں میڈیا کا کام دیتے تھے۔ یمن کے قبائل نے جب یہ اشعار سنے تو ان کے جذبات بھڑک اٹھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ولید کی مخالفت میں یزید بن عبدالملک سے جو اپنے بھائی سلیمان کی توہین و تذلیل کے باعث ولید کے سخت خلاف ہو گیا تھا، مل گئے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

ولید بن یزید نے نہ صرف مختلف غلط کاریوں اور مظالم پر اکتفا کیا بلکہ اس نے اپنے عقائد اور آزاد روی کے اعلان و اظہار سے بھی عوام کو برافروختہ کیا۔ چنانچہ وہ برملا اپنے ناشدنی عقائد و خیالات کی اشاعت کرتا تھا۔ ان تمام واقعات کی شہرت نے صوبوں اور ولایتوں کے حاکموں کو اس سے بددل کر دیا۔ چنانچہ جب لوگوں نے بھی اس کی اطاعت کی بیعت کی تھی وہ خوف اور ڈر کی وجہ سے کی تھی، خلوص نیت، سچی ہوا خواہی اور ہمدردی سب کے دلوں سے جاتی رہی۔

یحییٰ بن زید کا خروج:

سنہ ۱۲۵ھ میں یعنی اپنی خلافت کے پہلے ہی سال میں یحییٰ بن زید کی شہادت کا واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ یحییٰ اپنے والد زید بن علی کے خروج میں ان کے ساتھ تھے۔ اپنے والد کی شہادت کے بعد وہ خراسان چلے آئے اور بلخ میں اپنے ایک متوسل حریش بن عمر کے ہاں مقیم ہو گئے۔ یوسف بن عمر گورنر عراق نے حاکم خراسان نصر بن سیار کو لکھا کہ یحییٰ کو فوری طور پر گرفتار کر لو۔ نصر نے حریش کو طلب کر کے یحییٰ کی سپردگی کا مطالبہ کیا۔ حریش نے لاعلمی ظاہر کی، مگر جب نصر نے سختی کی تو حریش کے بیٹے نے یحییٰ کا پتہ بتا دیا کہ وہ وہاں مقیم ہیں۔ چنانچہ نصر بن سیار نے انھیں گرفتار کر لیا۔ ولید کو جب یحییٰ کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو اس نے نصر کو لکھا کہ یحییٰ کو گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ انھیں خراسان سے شام بھیج دو کیونکہ یزید کا مقصد یحییٰ کو گرفتار کر کے تکالیف پہنچانا نہیں تھا بلکہ انھیں شیعوں کے دام سے الگ کرنا تھا۔

Marfat.com

نصر نے یحییٰ کو دو ہزار درہم دے کر انھیں شام جانے کی ہدایت کی۔ یحییٰ وہاں سے شام کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ بیہق ہی پہنچے تھے کہ انھیں خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ان کے ساتھ دھوکہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ شام جانے کے بجائے نیشا پور چلے گئے اور وہاں خروج کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اصل میں وہ جونہی بلخ سے باہر نکلے اور شام جانے کا ارادہ کیا تو ان کے شیعوں نے انھیں یہ کہہ کر ورغلایا کہ ہم لوگ کب تک اس قسم کی ذلت برداشت کرتے رہیں گے۔ اس وجہ سے یحییٰ شام جانے کے بجائے اپنی اس مختصر جماعت کے ساتھ نیشا پور چلے گئے۔ یہاں کے حاکم عمرو بن زرارہ کو ان کے اس ارادہ کا علم ہوا تو اس نے نصر بن سیار کو ان تمام حالات سے مطلع کیا۔ نصر نے اسے مقابلہ کا حکم دیا۔ عمرو بن زرارہ دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ یحییٰ کے مقابلہ کے لیے نکلا۔ یحییٰ بن زید نے اسے اپنے ستر ساتھیوں کے ساتھ شکست فاش دی۔ عمرو بن زرارہ لڑائی میں کام آیا۔ نصر کو اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے سالم بن احوز کو ان کے مقابلہ پر مامور کیا۔ جوز جان میں دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ سخت خون ریز جنگ ہوئی۔ اتفاقاً ایک تیر یحییٰ کی پیشانی پر آ کر لگا۔ اس سے یحییٰ بن زید شہید ہو گئے اور ان کی لاش جوز جان میں منظر عام پر لٹکا دی گئی۔ (ابن اثیر: ۹۹/۵) ان کے ساتھ ان کی پوری جماعت کام آئی۔ (یعقوبی: ۳۹۰/۲) سنہ ۱۲۶ھ کے آخر میں محمد بن علی عباسی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے صاحب زادے ابراہیم ان کے جانشین ہوئے اور ان کی وجہ سے عباسی دعوت کا سلسلہ نہ صرف بدستور جاری رہا بلکہ اس میں روز بروز تیزی آتی گئی۔

سنہ ۱۲۵ھ میں صوبہ خراسان کو عراق کے ماتحت کر کے خراسان کے حاکم نصر بن سیار کو معزول کر دیا۔ نصر کے پاس ایک طرف ولید بن یزید کا اور دوسری طرف سے گورنر عراق یوسف بن عمر کا حکم پہنچا کہ تم معزول کر دیئے گئے ہو۔ فوراً دار الخلافہ دمشق میں حاضر ہو کر اپنے صوبہ کا حساب و کتاب سمجھاؤ۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ بنو امیہ کے عہد میں پوری مملکت اسلامیہ چند صوبوں میں تقسیم تھی۔ ہر صوبہ پر ایک امیر مقرر ہوتا تھا۔ اس کو اپنے صوبے میں ہر قسم کے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ وہ خود ہی اپنی طرف سے اپنے صوبہ کی ولایتوں اور ضلعوں میں حاکم مقرر کرتا تھا۔ بڑے بڑے صوبے حجاز، عراق، آرمیدیا، شام، مصر، افریقہ، اندلس اور خراسان وغیرہ تھے۔ حجاز کے صوبہ میں مکہ، مدینہ، طائف اور یمن کے اضلاع شامل تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ یمن کو حجاز کی ماتحتی سے نکال کر ایک الگ صوبہ قرار دے دیا جاتا تھا اور وہاں کا حاکم دار الخلافہ کی طرف سے مقرر ہوتا تھا۔ شام کے صوبہ میں اردن، حمص، دمشق اور قنسرین وغیرہ کے اضلاع شامل تھے۔ مصر کے صوبہ میں کبھی افریقہ شامل ہوتا تھا اور کبھی افریقہ کو الگ صوبہ قرار دے کر اس کا گورنر دار الخلافہ یعنی مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اندلس کو کبھی الگ صوبہ قرار دیا جاتا تھا اور وہاں کا گورنر خلیفہ خود مقرر کرتا تھا اور کبھی اندلس کو قیروان کے امیر کے ماتحت کر کے صوبہ افریقہ میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ اس حالت میں قیروان کا امیر خلیفہ مقرر کرتا اور قیروان کا امیر اپنے اختیار سے اندلس میں کسی حاکم کو مقرر کرتا تھا۔ یہی کچھ کیفیت خراسان اور عراق کی تھی یعنی کبھی خراسان ایک الگ صوبہ ہوتا تھا اور وہاں کا امیر مرکزی حکومت مقرر کرتی اور کبھی خراسان

Marfat.com

کو عراق کے صوبہ میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ اس حالت میں خراسان کا حاکم عراق کے گورنر کی طرف سے مقرر ہوتا تھا۔ صوبہ کے گورنروں اور اضلاع کے حاکموں کو متعلقہ صوبوں اور اضلاع کے کامل اختیارات حاصل ہوتے تھے، لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ محکمہ مال کی افسری کے لیے دربار خلافت سے الگ کوئی اہل کار مقرر ہو جاتا تھا۔ دربار خلافت سے مقرر شدہ افسر مال اپنے آپ کو صوبے یا ضلع کے حاکم کا ماتحت نہیں سمجھتا تھا، لیکن فوج کا سپہ سالار اور صوبہ کے امن و امان کا ذمہ دار ہمیشہ اس صوبے کا امیر یا اس ضلع کا حاکم ہی ہوتا تھا۔ افسر مال کی طرح کبھی کبھی صوبے کا امیر شریعت یا قاضی بھی مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر ہو کر جاتا تھا، لیکن نمازوں کے امام ہمیشہ گورنر یا امیر ضلع ہی ہوتا تھا یعنی نمازوں کی امامت اور سپہ سالاری لازم و ملزوم تھی۔ بعد میں نمازوں کی امامت اور صوبوں کی امارت بھی الگ الگ ہونے لگی۔ تاہم جمعہ کا خطبہ حاکم صوبہ اور سپہ سالار اعظم ہی سے متعلق رہا۔ آج یہ حقیقت جاہل مسلمانوں اور مسجد کے تنخواہ دار اماموں اور خطیبوں کی سمجھ میں کہاں آ سکتی ہے؟

چنانچہ جب نصر بن سیار کے پاس معزولی کے احکام پہنچے تو اس نے پہلے تو اس کی تعمیل کا ارادہ کیا، لیکن پھر متوہم ہو کر خراسان کا قبضہ نہ چھوڑا اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

ولید بن یزید کے مظالم نے نہ صرف لوگوں کو رنجیدہ اور برافروختہ کر رکھا تھا بلکہ اس کے بنی اعمام نے جن پر ولید نے بڑے بڑے مظالم کیے تھے، اس کے خلاف کوششیں اور سازشیں شروع کر دیں۔ ولید کا چچا زاد بھائی یزید بن عبدالملک خاص طور پر ولید کے خلاف تھا۔ یزید بن ولید خاندان حکومت میں زیادہ نیک اور پاکیزہ انسان سمجھا جاتا تھا، اس نے ولید بن یزید کی خلاف شرع باتیں لوگوں سے بیان کرنا شروع کر دیں اور بہت جلد لوگ اس کے ہم نوا ہو گئے۔ اس کام میں یزید بن ولید کو نہ صرف سرداران لشکر اور امرائے سلطنت کی حمایت حاصل ہو گئی بلکہ شاہی خاندان کی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے مخفی طور پر یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور لشکر شام کا ایک بہت بڑا حصہ یزید بن ولید کے ساتھ شریک ہو گیا۔ اب یزید بن ولید نے دمشق کی سکونت ترک کر کے دمشق سے تھوڑے فاصلے پر ایک گاؤں میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں سے اپنے کارندوں کو بلاد اسلامیہ کی طرف روانہ کر دیا تاکہ وہ ولید کی بداعمالیوں اور اس کے فسق و فجور کے واقعات لوگوں کے سامنے بیان کریں اور رائے عامہ کو ولید کے خلاف کریں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بنو امیہ کے شاہی لوگوں کے درمیان تشتت و افتراق کی خلیج پیدا ہو گئی جو روز بروز پھیلتی چلی گئی یہاں تک کہ خفیہ سازشوں اور اشاعتی کارروائیوں سے کام لیا گیا۔ ان سب کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد ولید کے خلاف اور یزید کے موافق حالات پیدا ہو گئے۔ یزید بن ولید کا بھائی عباس بن ولید بھی اگرچہ ولید بن یزید سے سخت ناراض اور اذیت رسیدہ تھا، لیکن وہ اپنے بھائی یزید کو اس کام سے روکنا چاہتا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ جب یزید بن ولید نے یمنی قبائل سے خفیہ بیعت لینی شروع کر دی تو مروان بن محمد بن مروان کو جو اس وقت آرمینیا میں تھا، ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس بات کو ناپسند کیا۔ اس نے سعید بن عبدالملک کو لکھا کہ لوگوں کو فتنہ کی اس

Marfat.com

آگ میں کودنے سے روکا جائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری اس خانہ جنگی سے ہمارے دشمن فائدہ اٹھائیں گے اور زمام حکومت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔'' سعید کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی۔ اس نے مروان کے اس خط کو عباس بن ولید کے پاس بھیج دیا کہ وہ اپنے بھائی یزید بن ولید کو سمجھائے۔ عباس نے یزید کو بلا کر حالات کے نشیب و فراز سمجھائے اور خانہ جنگی سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ یزید کو اپنی کامیابی پر یقین تھا کیونکہ عوام کی اکثریت ولید سے تنگ تھی اور یزید کا ساتھ دے رہی تھی، اس لیے عباس کے کہنے سے بظاہر تو اس نے اس ارادہ سے باز آنے کا وعدہ کر لیا لیکن اندر ہی اندر اپنے کام میں مصروف رہا۔ عباس کے اختلاف سے تنگ آ کر ہی یزید نے دمشق کی سکونت کو ترک کر کے ایک الگ جگہ پر سکونت اختیار کر لی تھی۔ یزید نے ہر طرح سے اپنا اطمینان کرنے کے بعد ۲۷ جمادی الآخرۃ سنہ ۱۲۶ھ بروز جمعہ ولید کے خلاف خروج کے لیے مقرر کیا۔ چنانچہ عشاء کی نماز کے بعد دمشق میں داخل ہو کر اول کوتوال شہر کو گرفتار کیا گیا، پھر سرکاری اسلحہ خانہ پر قبضہ کیا گیا۔ ولید بن یزید ایک لاابالی شخص تھا۔ اس کو اپنے عیش و عشرت سے فراغت نہ تھی چنانچہ اسے اس سے قبل ان سازشوں اور تیاریوں کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ وہ خروج کا سن کر حیران و پریشان ہو کر رہ گیا، لیکن پانی سر سے گزر چکا تھا، لہٰذا وہ کچھ نہ کر سکا، صرف دارالامارۃ (گورنمنٹ ہاؤس) کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا۔ جونہی یزید دمشق میں داخل ہوا تو اہل دمشق اور اردگرد کے لوگوں نے آ کر یزید بن ولید کے ہاتھ پر علانیہ بیعت خلافت شروع کر دی۔ ولید بن یزید نے دمشق سے نکل کر حمص کی طرف جانا چاہا، لیکن مقام قصر نعمانی میں یزید نے ولید کا محاصرہ کر لیا۔ ولید کے ہمراہیوں نے خوب جی توڑ کر مقابلہ کیا۔ عباس بن ولید یعنی یزید کا حقیقی بھائی اپنی جماعت کو لے کر ولید کی حمایت اور یزید کی مخالفت میں مقابلہ کے لیے دمشق سے چلا لیکن راستہ میں اس کو منصور بن جمہور نے گرفتار کر کے یزید کے سامنے پیش کر دیا۔ ولید نے جب دیکھا کہ اب نجات کی کوئی اور صورت نہیں ہے تو یہ کہہ کر کہ آج میرے لیے بھی ویسا ہی دن ہے جیسا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے تھا۔ چنانچہ وہ قرآن حکیم لے کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ یزید کے آدمیوں نے قصر امارت کی دیواروں پر چڑھ کر اور قصر خلافت کے اندر داخل ہو کر ولید بن یزید کا سر کاٹ لیا اور منصور بن جمہور نے لا کر یزید بن ولید کے سامنے پیش کیا۔ یزید نے حکم دیا کہ اس کی تشہیر کرا کر ولید کے بھائی سلیمان بن یزید کو دے دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ۲۸ جمادی الآخرہ کو ولید ایک سال تین ماہ خلیفہ رہنے کے بعد قتل ہو گیا اور اسی روز یزید بن ولید بن عبدالملک مسند خلافت پر متمکن ہو گیا۔ بنو امیہ کے مابین تشتت و انتشار کی یہ جنگ اس قدر طول پکڑ گئی کہ اس کے بعد مسلسل وہ مبتلائے مصائب رہے اور پھر روز بروز ان پر تباہی اور بربادی کے سائے منڈلاتے رہے۔

ان تمام خرابیوں اور مظالم کے باوجود اس میں کچھ قابل ذکر اوصاف بھی تھے۔ اگرچہ ولید کی پوری زندگی رندی اور سرمستی میں گزری لیکن اس نے حکومت کی جانب سے محتاجوں اور معذوروں کی خدمت اور پرورش کا پورا پورا انتظام کیا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں عربی ادب کا بھی اسے ایک خاص ذوق تھا۔ شعر و سخن کا نہایت

Marfat.com

اچھا ذوق رکھتا تھا۔ خود بھی ایک خوش گو شاعر تھا خصوصاً خمریات میں اسے کمال حاصل تھا۔ ابونواس جس کو عربی زبان کا خیام تصور کیا جاتا ہے، اس نے اپنے کلام میں ولید کی خمریات سے استفادہ کیا ہے۔ وہ طبعاً بڑا فیاض تھا۔ شعرا کی قدردانی میں اس کی فیاضی اسراف کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ یزید بن منیہ نے اس کی تخت نشینی کی تبریک میں پچاس شعروں کا ایک قصیدہ پیش کیا۔ ولید نے خوش ہو کر ہر شعر کے بدلے میں ایک ایک ہزار انعام دیا۔ (ابن اثیر: ۱۰۲/۵) وہ موسیقی کا بھی بڑا شوقین تھا۔ اس کے دربار اس زمانے کے بہترین مغنی موجود تھے۔

(مروج الذھب: ۳۱/۳)

ہشام کی طرح گھوڑوں اور گھوڑ دوڑ کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس کے پاس اس زمانے کا بہترین گھوڑے تھے جو گھڑ دوڑ میں بے مثال تھے۔

اگرچہ اس میں بہت سی خرابیاں تھیں۔ وہ فسق و فجور میں ملوث تھا۔ اس کے مظالم بھی بہت شہرت رکھتے ہیں اسی وجہ سے وہ سوا سال سے زیادہ حکومت نہیں کر سکا، لیکن اس کی طرف ہمارے بعض مؤرخین نے بہت سے جھوٹے افسانے بھی منسوب کر دیئے ہیں کہ اس نے بیت اللہ کی چھت پر شراب پینے کا ارادہ کیا تھا۔ کلام اللہ کی توہین کی اور بعض اشعار میں ملحدانہ خیالات کا اظہار کیا۔ ان سب الزامات کی حیثیت زیب داستان سے زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں حافظ ذہبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ یزید کی جانب کفر و زندقہ کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ البتہ مے نوشی اور دوسرے منہیات میں ضرور مبتلا تھا۔ (تاریخ الخلفاء: ص ۲۵۲)

Marfat.com

یزید بن ولید

سنہ ۱۲۶ھ مطابق سنہ ۷۴۴ء

ولید تو قتل ہو گیا۔ اس کے قتل کے بعد رجب سنہ ۱۲۶ھ میں یزید بن ولید مسند خلافت پر متمکن ہوا۔ یزید بن ولید بن عبدالملک کی ماں شاہ آفرید، فیروز بن یزدگرد شہنشاہ ایران کی بیٹی تھی۔ ولید نے اپنے عہد خلافت میں فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا تھا، یزید نے خلیفہ بنتے ہی اس اضافہ کو ختم کر دیا۔ اس وجہ سے اس کو ''یزید ناقص'' کہنے لگے۔ یزید بڑا زاہد اور عابد اور نیک نام خلیفہ تھا۔ مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اس نے حسب ذیل تقریر کی۔

''لوگو! میں اس وقت تک نہ تو نئی عمارت بنواؤں گا اور نہ ہی کوئی نئی نہر نکلواؤں گا جب تک میں اس مقام کی سرحدوں کی حفاظت کا انتظام نہ کر لوں گا اور جب تک وہاں کے باشندوں کی ضروریات زندگی پوری نہ ہو جائیں گی، اس وقت تک وہاں کی آمدنی کسی دوسرے مقام اور شہر میں نہیں بھیجی جائے گی۔ صرف وہی مال دوسری جگہ منتقل کیا جائے گا جو مقامی ضروریات سے زائد اور فالتو ہو گا۔ میں اپنا دروازہ ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کے لیے بند نہیں کروں گا۔ ہر سال تمہارے وظیفے اور ہر ماہ تمہارا راشن تمھیں ملتا رہے گا۔ حقوق میں دور کے رہنے والے قریب کے رہنے والوں کے برابر ہوں گے۔ جو کچھ میں نے کہا میں اسے پورا کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گا تو تم پر میری اطاعت اور اعانت فرض ہے، اور اگر پورا نہ کروں تو مجھے معزول کر دو۔ تم لوگ اس بات کے گواہ رہو میں توبہ کرتا ہوں، اگر کوئی صالح شخص تمھاری نگاہ میں ہو جو ان باتوں کا وعدہ کرے جن کا میں نے وعدہ کیا ہے، اور تم اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہو تو میں سب سے پہلے اس کی بیعت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔'' (الفخری: ص ۲۱۲۱)

یزید کی مخالفت:

یزید اگرچہ پاک باز، زاہد اور شب زندہ دار تھا، لیکن جونہی وہ مسند خلافت پر بیٹھا تو اس کی مخالفت

Marfat.com

شروع ہوگئی۔ اگرچہ ولید کوئی اچھا آدمی نہ تھا اور اس کے اعمال بھی کوئی اچھے نہ تھے اور اس کے مقابلہ میں یزید ہزار درجے نیک اور دین سے محبت رکھنے والا تھا، لیکن عوام کا کہنا یہ تھا کہ کسی حکمران کے قتل کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، حکومت کے نظام پر اس کا برا اثر پڑتا ہے اور لوگوں میں حکومت کے خلاف اٹھنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو مرکز کو کمزور کر کے صوبوں کو بغاوت پر ابھارنے کا سبب بن سکتا ہے۔ پھر ولید کے قتل کرنے والوں میں سے اکثریت یمنی قبائل کی جن سے قبائلی عصبیت کی آگ کو ہوا مل گئی اور وہ بھڑک اٹھی۔ ولید کے قتل کا واقعہ جب تک پیش نہ آیا تھا ہر طبقہ خیال اس کے خلاف تھا کیونکہ وہ نہایت ظالم تھا اور اس کے اعمال نہایت خراب تھے، لیکن یمنی قبائل کے ہاتھوں اس کا قتل قبائلی عصبیت کا سوال بن گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یمن اور مضر کی پرانی عصبیت لوٹ آئی اور وہ مضری جو یزید کی زندگی اس کی عملی برائیوں کے باعث اس کے سخت خلاف تھے، اب اس کے حامی ہو گئے اور یمنیوں سے ولید کے قتل کا انتقام لینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب دونوں میں عصبیت تو پہلے ہی تھی لیکن اب اس عصبیت نے سخت مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مضری قبائل اور بنو امیہ کے ارکان کی اکثریت یزید کے خلاف ہو گئے اور شام کے مختلف علاقوں میں اس کے خلاف بغاوت برپا ہو گئی۔ چنانچہ سب سے پہلے حمص کے باشندوں نے یزید کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مروان بن عبداللہ بن عبدالملک اموی نے بھی ان کا ساتھ دیا اور پورے حمص میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ یہاں کے رہنے والوں نے اپنے حاکم عبداللہ بن شجرہ کندی اور مروان بن عبدالملک اور اس کے لڑکے کو یزید کی حمایت کے جرم میں قتل کر دیا، اور ولید کے قتل میں اعانت کے جرم میں عباس بن ولید اموی کا گھر مسمار کر دیا اور دارالخلافت دمشق پر حملہ کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھے۔ یزید کو ان کی ان کارروائیوں کی اطلاع ہوئی تو اس نے عبدالعزیز بن حجاج اور ہشام بن مصاد کو مقابلہ کے لیے بھیجا۔ انھوں نے باغیوں کو شکست دے کر واپس کر دیا۔ شکست کھانے کے بعد حمص نے مجبور ہو کر یزید کی خلافت تسلیم کر لی۔

حمص کی بغاوت کے ساتھ ہی فلسطین کے باشندوں نے بھی بغاوت کر کے اپنے حاکم سعید بن عبدالملک کو نکال دیا اور اس کے بھتیجے یزید بن سلیمان بن عبدالملک کو جو یزید کے خلاف تھا، اپنا امیر بنا لیا۔ اس کی مخالفت سے فلسطین والوں کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اور انھوں نے بھی یزید کی خلافت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ جب اس بغاوت کی خبر اردن پہنچی تو یہاں کے باشندوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور شام میں ایک عام خلفشار برپا ہو گیا۔ ان کے مقابلہ کے لیے یزید نے سلیمان بن ہشام کو ایک بہت بڑی فوج دے کر بھیجا اور دوسری تدبیر اس سلسلہ میں یہ کی کہ فلسطین کے باغیوں کے سردار سعید بن روح اور ضبعان بن روح کو حکومت اور مال کی طمع دے کر الگ کر لیا۔ چنانچہ وہ فلسطینیوں کو لے کر واپس لوٹ گئے اور اہل اردن تنہا رہ گئے۔ سلیمان بن ہشام نے تھوڑی سی فوج بھیج کر انھیں نہایت آسانی کے ساتھ زیر کر لیا اور فلسطین اور اردن دونوں مقامات میں یزید کی بیعت ہو گئی۔ بغاوت فرو ہونے کے بعد یزید نے ضبعان کو فلسطین کا اور اپنے بھائی ابراہیم کو اردن کا حاکم بنا دیا۔ (ابن اثیر: ۱۰۹/۵)

Marfat.com

یزید کے آخری زمانہ میں مروان بن محمد اموی نے جزیرہ پر مخالفانہ قبضہ کرلیا۔ ہوا یہ کہ ولید کے قتل کے باعث مروان بھی یزید کے خلاف ہوگیا تھا۔ ولید کے قتل کے ہنگامہ میں جزیرہ کا حاکم عبدہ بن ریاح غسانی جزیرہ سے شام گیا۔ مروان کا لڑکا عبدالملک قریب ہی حران میں تھا۔ میدان خالی دیکھ کر اس نے جزیرہ کو اپنے انتظام میں لے لیا اور اپنے باپ کو آرمینیہ میں اطلاع دی۔ وہ فوراً وہاں سے جزیرہ پہنچا۔ اہل جزیرہ نے اس کی کوئی مخالفت نہیں کی بلکہ جزیرہ کے بیس ہزار آدمی اس کی حمایت کے لیے تیار ہوگئے۔ ان کی امداد سے اس نے یزید کے مقابلہ کا ارادہ کرلیا۔ یزید کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے جزیرہ، آرمینیہ، موصل اور آذربائیجان کی حکومت دے کر اس کی مخالفت روک دی اور مروان نے یزید کی بیعت کرلی۔

عراق اور خراسان کی شورش:

یہ تو شام کی حالت تھی۔ دوسری طرف عراق اور خراسان کی فضا میں بھی فتنہ وفساد کی گھنگور گھٹائیں امنڈی ہوئی تھیں۔ یزید نے یوسف بن عمر کو معزول کر کے منصور بن جمہور کو عراق کی ولایت پر مامور کیا۔ منصور نے عراق پہنچ کر یوسف کے زمانہ کے انتظامات اور انتظامیہ کو تبدیل کیا اور اپنے بھائی کو خراسان کا حاکم بنا کر بھیجا۔ نصر بن سیار حاکم خراسان نے جو وہاں بہت ذی اثر تھا، اپنے منصب سے دست برداری سے انکار کردیا۔ ابھی یہ قضیہ چل ہی رہا تھا کہ یزید نے منصور کو حکومت عراق سے معزول کر کے عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کو اس کی جگہ بھیجا۔ عبداللہ بن عمر نے نصر کو حکومت خراسان پر بحال کردیا۔

اسی دوران میں خراسان میں پھر قبائلی عصبیت کا خوابیدہ فتنہ جاگ اٹھا۔ حدیع بن علی اروی کرمانی جو ایک یمنی سردار اور نصر بن سیار کا پرانا دوست تھا، کسی بات پر نصر سے بگڑ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یمنی قبائل اس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر نصری قبائل نصر کی مدد کے لیے تیار ہوگئے۔ نصر نے کسی بہانہ سے کرمانی کو قید کردیا۔ کرمانی کے حامی اس کو قید خانہ سے نکال لائے۔ کرمانی کے قید خانہ سے فرار کے بعد نصر نے اس کے ساتھ مصالحت کی کوشش کی لیکن کرمانی نے نصر بن سیار پر اعتماد نہ کیا اور نصر کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ کرمانی نے ربیعہ اور یمن کے عہد جاہلیت کے پرانے معاہدے کی تجدید کر کے قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ نصر بن سیار اور کرمانی کے ان اختلافات نے عباسی داعیوں کے لیے خراسان کی فضا موافق کردی۔ اسی سال ابراہیم بن محمد نے جو اپنے والد کے انتقال کے بعد سلسلۂ عباسیہ کے امام مقرر ہوئے تھے، ابوہاشم بکیر بن ماہان کو وصیتوں اور ہدایات کے ساتھ خراسان بھیجا۔ اس نے مرو پہنچ کر نقیبوں اور داعیوں کو اکٹھا کیا۔ محمد بن علی کے صاحب زادے نے محمد بن علی کی طرف سے بیعت لی۔ اور فرمانِ امامت انھیں سنایا۔ وابستگانِ تحریک نے نئے امام سے عقیدت کا اظہار کیا اور ایک معقول رقم ان کی خدمت میں بطور نذر پیش کرنے کے لیے بکیر کو دی۔

Marfat.com

وفات:

یزید بن ولید کوئی برا آدمی نہیں تھا، لیکن اس نے صرف پانچ ماہ بائیس روز حکومت کی اور ۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۲۶ھ کو طاعون کے مرض سے وفات پائی۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۳۵ سال تھی۔ اسے بہت کم عرصہ خلافت کا موقع ملا اور یہ مختصر مدت بھی شورشوں اور بغاوتوں میں گزری، لہٰذا اس کے عہد خلافت کا کوئی خاص واقعہ نہیں ہے۔

Marfat.com

ابراہیم بن ولید بن عبدالملک

سنہ ۱۲۶ھ تا سنہ ۱۲۷ھ/ مطابق سنہ ۷۴۴ء تا سنہ ۷۴۵ء

ابواسحاق ابراہیم بن ولید بن عبدالملک اپنے بھائی یزید کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق خلیفہ ہوا۔ ابراہیم کے ہاتھ پر عام لوگوں نے بیعت نہیں کی بلکہ بعض لوگ اس کی بیعت سے انکار ہی کرتے رہے۔ مروان بن محمد بن مروان گورنر آرمینیہ نے جب یزید کی وفات کی خبر سنی تو وہ فوج لے کر دمشق کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے پہلے قنسرین کو فتح کیا اور پھر حمص کی جانب روانہ ہوا۔ اس وقت تک حمص والوں نے ابراہیم کی بیعت نہیں کی تھی، اس لیے دمشق سے لشکر شام عبدالعزیز بن حجاج بن عبدالملک کی زیر قیادت جو ابراہیم کا بھیجا ہوا تھا، حمص کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ جب انھوں نے مروان بن محمد کے قریب پہنچنے کی خبر سنی تو عبدالعزیز محاصرہ اٹھا کر اپنے لشکر کے ساتھ دمشق کی جانب چل دیا اور مروان کے حمص پہنچنے پر اہل حمص نے بلا توقف اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ابراہیم کو جب ان حالات کی اطلاع ملی تو اس نے سلیمان بن ہشام کو ایک لاکھ بیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ مروان کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ مروان کی فوج کی تعداد اسی ہزار تھی۔ مروان نے جنگ شروع ہونے سے قبل یہ پیغام بھیجا کہ ہم ولید کے خون کا دعویٰ چھوڑ دیتے ہیں تم اس کے بیٹوں حکم اور عثمان کو جنھیں ولید نے اپنا ولی عہد بنایا تھا، چھوڑ دو۔ اصل بات یہ تھی جس کی وجہ سے مروان یزید اور ابراہیم کے خلاف تھا، اور اس نے یزید کے زمانہ ہی میں الجزیرہ پر قبضہ کر لیا تھا اور یزید کے خلاف بغاوت کرنے والا تھا، لیکن یزید نے آرمینیہ اور آذربائیجان کی حکومت دے کر اسے خاموش کر دیا تھا۔ ابراہیم یزید کا جانشین تھا اور ولید کے لڑکے حکم اور عثمان اس کی قید میں تھے۔ انھیں وہ رہا نہ کرتا تھا، اس لیے مروان کی مخالفت اس کے ساتھ قائم رہی۔ اور یزید کے مرنے کے بعد مروان نے شام پر فوج کشی کر دی۔ راستہ میں مسرور بن ولید والی قنسرین اور اس کے بھائی بشر نے روکا لیکن قبیلہ قیس کا سردار یزید بن عمرو جس پر مسرور کی فوجی قوت کا دارومدار تھا، مروان سے مل گیا اور مسرور اور بشر دونوں کو پکڑ کر مروان کے حوالے کر دیا۔ (ابن اثیر: ۱۱۹/۵) لیکن یعقوبی کا بیان ہے کہ مروان نے انھیں شکست دے کر گرفتار کیا تھا۔ (یعقوبی: ۴۰۳/۲)

Marfat.com

قنسرین کی فتح کے بعد مروان حمص پہنچا۔ یہاں سلیمان بن ہشام کی ایک لاکھ بیس ہزار فوج سے اس کا مقابلہ ہونا تھا۔ مقابلہ سے پہلے مروان نے یہ کہلا بھیجا کہ ولید کے دونوں لڑکوں عثمان اور حکم کو رہا کر دیا جائے تو وہ جنگ نہ کرے گا لیکن سلیمان نے اس کی یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا، لہٰذا صفر ۱۲۷ھ میں دونوں میں نہایت خون ریز جنگ ہوئی جس میں سلیمان کو شکست فاش ہوئی۔ سلیمان کو شکست دینے کے بعد مروان نے ولید کے لڑکوں کی غائبانہ بیعت لی اور ولید کے قاتلوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اس جنگ میں سلیمان بن ہشام کے ۱۷ ہزار آدمی قتل ہوئے۔ اب مروان دمشق کی طرف بڑھا۔

ادھر دمشق میں ابراہیم اور اس کے مشیروں نے باہم مشورہ کیا کہ جب تک حکم اور عثمان پسران ولید زندہ ہیں، مروان ان کے نام پر لڑتا رہے گا اور انھیں خلیفہ بنانے کی پوری کوشش کرے گا۔ اگر اسے اس میں کامیابی ہوگئی تو پھر ولید کے قاتلوں کی خیر نہیں۔ چنانچہ انھوں نے ولید کے دونوں بیٹوں کو قتل کر دیا۔ مروان فاتحانہ دمشق میں داخل ہوا اور ابراہیم اور سلیمان دمشق سے فرار ہو گئے۔ مروان نے حکم اور عثمان کی لاشوں کو دیکھا تو اسے بہت افسوس ہوا۔ ان کی نماز جنازہ پڑھ کر انھیں دفن کر دیا گیا۔ اب اس نے یہ سوال لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ تم کس کو خلیفہ بنانا چاہتے ہو۔ سب نے بالاتفاق مروان بن محمد بن مروان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی۔ یہ ۲۴ صفر سنہ ۱۲۷ھ کا واقعہ ہے۔ ابراہیم کو مروان نے امان دی اور وہ مروان کے حق میں نہایت خوشی سے دست بردار ہو گیا وہ صرف دو ماہ چند روز خلیفہ رہا، اور بعض مؤرخین اسے خلیفہ ہی تسلیم نہیں کرتے۔

Marfat.com

مروان بن محمد بن مروان

سنہ ۱۲۷ھ تا سنہ ۱۳۲ھ/ مطابق سنہ ۷۴۵ء تا سنہ ۷۴۹ء

ولید کے دونوں لڑکے جنھیں مروان خلیفہ بنانا چاہتا تھا وہ قتل ہو چکے تھے اور ابراہیم بن ولید تدمر فرار ہو چکا تھا، اس لیے لوگوں نے مروان کے ہاتھوں پر بیعت کر لی اور صفر سنہ ۱۲۷ھ میں وہ مسند خلافت پر متمکن ہو گیا۔ مروان کی ماں ایک کردی ام الولد تھی۔ یہ سنہ ۷۰ھ میں پیدا ہوا اور اپنے باپ کے بعد آرمینیہ کا والی مقرر ہوا۔ یہ بنوامیہ کا آخری خلیفہ ہے۔ اس کو لوگ ''مروان الحمار'' کہتے تھے۔ عرب ملکوں میں حمار صابر ہونے کے باعث مشہور ہے۔ صعوبت کش آدمی کو ''حمار'' کہہ دیا جاتا ہے، اس لیے لوگ اس خلیفہ کو بھی حمار کہنے لگے کیونکہ اس کی خلافت کا تمام زمانہ لڑائیوں اور جنگوں میں بسر ہوا اور اس نے نہایت صعوبت کش اور صابر ہونے کا ثبوت دیا۔ مروان بن محمد نے بجائے دمشق کے مقام حران میں اقامت اختیار کر لی۔ تدمر سے ابراہیم بن ولید (معزول خلیفہ) کو اپنے پاس بلا لیا اور اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ مروان اگرچہ نہایت بہادر، تجربہ کار، مستقل مزاج خلیفہ تھا لیکن اس وقت اموی حکومت کا نظام اس قدر بگڑ چکا تھا کہ مروان کیا بڑے سے بڑا تجربہ کار بھی شاید اسے نہ سنبھال سکتا۔ خود اموی خاندان کو تشتت وافتراق کے جراثیم کھا رہے تھے۔ دمشق اور شام میں جو بنوامیہ کی حکومت کا مرکز تھا، اس میں مختلف پارٹیاں جنم لے چکی تھیں۔ ان سب سے بڑھ کر نزاری اور یمنی قبائل میں جن پر فوجی حکومت کا دارومدار تھا، ان میں خانہ جنگی برپا ہو گئی تھی۔ بنوامیہ کی مخالفتوں کے علاوہ اور نزاری اور یمنی قبائل میں اختلاف کے علاوہ ان کی خطرناک حریف عباسی تحریک کو قوت اور طاقت پکڑنے کا موقع مل گیا۔ عرب قبائل اور بنوامیہ باہم خانہ جنگی میں مبتلا تھے اس وجہ سے وہ عباسی تحریک کو نہ دبا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک نے چند ہی سالوں میں اموی حکومت کو ختم کر دیا۔

شام کی بغاوت:

مروان ابھی خلافت کی مسند پر متمکن ہی ہوا تھا کہ شام میں مروان کی مخالفت شروع ہو گئی۔ اس کا

Marfat.com

سبب یہ ہوا کہ مروان نزاری قبائل کا حامی تھا اور شام میں یمنیوں کی آبادی زیادہ تھی۔ اس وجہ سے قبائلی عصبیت کے تحت شام کے مختلف حصوں میں مروان کی مخالفت شروع ہوگئی۔ حمص، فلسطین اور تدمر کے رہنے والوں نے مروان کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یکم شوال کو مروان کو خبر پہنچی کہ اہل حمص مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت اور سرکشی کی پوری تیاری کر کے خروج پر آمادہ ہیں اور اطراف و جوانب سے عرب قبائل ان کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ مروان بڑا بہادر اور مستقل مزاج آدمی تھا وہ اس خبر سے بالکل نہ گھبرایا۔ مروان اس خبر کو سنتے ہی فوری طور پر فوج لے کر ۳۰ شوال کو حمص کے قریب پہنچا۔ دیکھا کہ اہل حمص نے شہر کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ مروان نے منادی کے ذریعہ پوچھا کہ تم لوگوں نے امیرالمؤمنین کی بیعت کیوں توڑی ہے؟ شہر والوں نے جواب دیا کہ ہم نے بیعت نہیں توڑی بلکہ ہم امیرالمؤمنین کے مطیع و فرمان بردار ہیں اور اپنی بیعت پر پوری طرح قائم ہیں۔ چنانچہ انھوں نے شہر کے دروازے کھول دیئے اور مروان کی فوج اور ساتھی شہر میں داخل ہو گئے۔ ان کے شہر میں داخل ہوتے ہی اہل شہر اور مخالفین نے ان کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ حالت دیکھ کر مروان خود شہر کے دروازے پر چڑھ گیا اور مخالفین کا مقابلہ کر کے انھیں شکست دی۔ شہر پناہ بھی تین سو گز کے قریب مسمار کر کے زمین کے برابر کر دی، اور اہل شہر سے اپنی بیعت لی۔

اسی اثنا میں کوفہ میں عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر طیار ایک ہاشمی بزرگ نے خروج کیا اور کوفیوں کی ایک بہت بڑی تعداد حسب معمول ان کے ساتھ ہوگئی۔ اس زمانہ میں عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز عراق کے گورنر تھے۔ عبداللہ کے والد کی بزرگی اور خاندان بنو ہاشم میں سے ہونے کی وجہ سے لوگ ان سے محبت کرتے تھے۔ عبداللہ بن عمر نے اپنے اثر و اقتدار سے کام لے کر بغیر جنگ کے عبداللہ بن معاویہ کی طاقت کو توڑ دیا۔ کوفی ان کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے۔ عبداللہ بن معاویہ اپنی جان بخشی کرا کر عراق عجم کی طرف نکل گئے۔ اور یہاں ہمدان، رے اور اصفہان پر قبضہ کر کے کئی سال تک مقیم رہے۔

مروان ابھی حمص ہی میں تھا کہ اسے خبر ملی کہ اہل غوطہ نے یزید بن خالد قسری کو اپنا سردار بنا کر دمشق پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ بڑی پریشان کن خبر تھی لیکن مروان بالکل پریشان نہیں ہوا۔ اس نے اسی وقت اہل دمشق کی امداد کے لیے دس ہزار فوج روانہ کر دی۔ اس فوج نے باہر سے اور اہل دمشق نے اندر سے مقابلہ کیا اور اہل غوطہ کو شکست فاش ہوئی۔ یزید بن خالد مارا گیا۔ اس فتنہ کے فرو ہوتے ہی ثابت بن نعیم نے اہل فلسطین کو اکٹھا کر کے طبریہ کا محاصرہ کر لیا۔ طبریہ میں اس وقت ولید بن معاویہ بن مروان حاکم تھا۔ مروان بن محمد نے یہ خبر سن کر اپنے فوجی سردار ابوالورد کو وہاں کی بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ابوالورد کے پہنچتے ہی اہل طبریہ نے شہر سے نکل کر محاصرین کا مقابلہ کیا۔ اہل فلسطین نے شکست فاش کھائی اور ثابت بن نعیم نے ابوالورد کو گرفتار کر کے مروان کے پاس بھیج دیئے۔ مروان نے فلسطین کی حکومت پر اماحس بن عبدالعزیز کنانی کو مامور کیا۔ مروان نے اس کے اور اس کے تینوں لڑکوں کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر صلیب پر چڑھا دیا۔ ان واقعات سے فارغ ہو کر مروان نے

Marfat.com

دیر ایوب میں اپنے لڑکوں عبداللہ اور عبیداللہ کی ولی عہدی کی بیعت لی اور ہشام کی لڑکیوں سے ان کا عقد کر دیا۔

ان کاموں سے فراغت کے بعد مروان نے تدمر کی جانب فوج کشی کی کیونکہ اہل تدمر ابھی تک خود مختاری پر قائم تھے۔ مروان کی فوج کشی کے باعث اہل تدمر کو بیعت اور اطاعت کرنا پڑی۔ اس کے بعد مروان نے یزید بن ہبیرہ کو عراق کی جانب روانہ کیا تا کہ وہاں کی بغاوت اور شورش کو فرو کیا جائے۔ اور خود اس کے پیچھے امدادی فوجیں بھیجتے رہنے کا انتظام کرنے کے لیے خود قرقیسا میں مقیم ہو گیا۔

سلیمان بن ہشام کی مخالفت:

ابھی یہ بغاوتیں اور شورشیں فرو نہ ہوئی تھیں کہ دشمنوں نے ایک نیا فتنہ کھڑا کر دیا کہ سلیمان بن ہشام کو مروان کی مخالفت میں کھڑا کر دیا۔ مروان نے حمص میں جن لوگوں کو گرفتار کیا تھا ان کو فوج میں بھرتی کر لیا تھا۔ یہ سب لوگ دل سے مروان کے خلاف تھے، لیکن بے بسی کی وجہ سے مجبور تھے۔ چنانچہ موقع ملتے ہی اس سے علیحدہ ہو گئے، اور خلیفہ ہشام کے لڑکے سلیمان سے مل کر اس کو مروان کے خلاف کھڑا کر دیا۔ سلیمان بن ہشام آرام کرنے کے لیے رصافہ میں ٹھہر گیا اور مروان قرقیسا میں مقیم تھا۔ اہل شام کا ایک گروہ جس کو مروان نے یزید بن عمر بن ہبیرہ کے ساتھ عراق کی جانب روانہ کیا تھا، اس سے جدا ہو کر رصافہ میں سلیمان بن ہشام کے پاس پہنچا اور اس کو اہل شام کی مکمل حمایت کا یقین دلا کر دعوائے خلافت پر برانگیختہ کیا۔ سلیمان تیار ہو گیا اور ان لوگوں کو ساتھ لیے ہوئے قنسرین کی جانب روانہ ہوا، اور قنسرین پہنچ کر سلیمان نے اہل شام کو خطوط لکھے جن کا اثر یہ ہوا کہ اہل شام ہر طرف سے سلیمان بن ہشام کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک زبردست فوج مروان کے پاس جمع ہو گئی۔ مروان نے جب یہ خبر سنی تو یزید بن عمر بن ہبیرہ کو قیام کرنے کا حکم بھیجا خود قرقیسا سے سلیمان کی طرف روانہ ہوا۔ قنسرین کے باہر مقام حناف میں سلیمان اور مروان دونوں کی صف آرائی ہوئی اور سلیمان کو مروان نے شکست دے کر بھگا دیا۔ روایات میں ہے کہ سلیمان کی فوج ستر (۷۰) ہزار تھی جن میں تیس ہزار ماری گئی۔ سلیمان بھاگ کر حمص پہنچا۔ سلیمان کا لڑکا اور ہشام بن عبدالملک کا ماموں خالد بن ہشام میدان جنگ میں قتل ہوئے۔ سلیمان بھاگ کر جب حمص پہنچا تو یہاں اس کے بقیۃ السیف ساتھی اس سے آ ملے۔ مروان اس کے تعاقب میں حمص کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی مروان راستہ ہی میں تھا کہ سلیمان کے کچھ سرداروں نے اس پر شبخون مارا لیکن مروان نے انھیں شکست دے کر بھگا دیا۔ سلیمان کو اس شکست کا علم ہوا تو وہ حمص سے تدمر چلا گیا اور مروان نے آگے بڑھ کر حمص پر قبضہ کر لیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ جب سلیمان بھاگ کر حمص پہنچا تو اس نے دوبارہ لشکر مرتب کر کے شہر پناہ کو درست کر لیا۔ مروان یہ سن کر حمص پہنچا۔ دونوں میں نہایت خون ریز جنگ ہوئی۔ سلیمان اور اس کی فوج شہر بند ہو گئے۔ مروان نے حمص کا محاصرہ کر لیا۔ قریباً دس ماہ حمص کا محاصرہ جاری رہا۔ اسی منجنیقیں سنگ باری میں برابر مصروف تھیں۔ مجبور ہو کر اہل حمص نے امان طلب

Marfat.com

کی اور سلیمان تدمر کی طرف بھاگ گیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد مروان کوفہ کی طرف ضحاک خارجی سے جنگ کرنے کو روانہ ہوا کیونکہ سلیمان شکست کھانے کے بعد ضحاک خارجی سے جاملا جو اسی زمانہ میں حکومت کے خلاف تھا۔

یزید بن عمر بن ہبیرہ نے کوفہ کی طرف بڑھ کر ضحاک خارجی کے لشکر کو شکست دی۔ ضحاک نے دوبارہ لشکر مرتب کیا۔ یزید بن عمر نے دوبارہ اس کو شکست دی اور کوفہ میں داخل ہو گیا اور خارجیوں نے کئی مرتبہ خروج کیا لیکن ہر مرتبہ ان کو شکست ہوئی۔ یزید بن عمر بن ہبیرہ نے عراق پر قابض ہو کر اپنی طرف سے نصر بن سیار کو خراسان کی گورنری پر قائم رکھا۔ اس نے مروان بن محمد کی بیعت کر لی۔

خراسان میں حرث بن شریح موجود تھا اور اس کے گروہ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ حرث کو یہ بھی خیال ہوا کہ مجھ کو یزید بن ولید نے امان دی تھی۔ یزید بن عمر موجودہ گورنر کوفہ نے امان نہیں دی، لہٰذا حرث بن شریح نے مخالفت کا اعلان کر دیا۔ نصر بن سیار نے اس کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانا۔ آخر کار نوبت لڑائی تک پہنچی۔ خاص شہر مرو کی گلیوں میں جنگ کے شعلے بلند ہوئے۔ ادھر کرمانی بھی کرمان میں کافی قوت حاصل کر چکا تھا۔ نصر بن سیار نے کرمانی کو بلوایا لیکن اس کا دل صاف نہ ہوا اور علانیہ مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ غرض مرو میں کرمانی، نصر اور حرث تین شخص اکٹھے ہو گئے۔ تینوں کی طاقت برابر تھی لیکن تینوں اپنے الگ الگ مقاصد اور اغراض رکھتے تھے۔ کوئی کسی کا ہمدرد اور غم گسار نہ تھا۔ آخر حرث اور کرمانی دونوں نے باہم متفق ہو کر نصر بن سیار کو شکست دے کر مرو سے نکال دیا اور پھر چند روز کے بعد دونوں آپس میں لڑ پڑے۔ اس لڑائی میں حرث بن شریح مارا گیا اور کرمانی مرو پر قابض ہو گیا۔ یہ سنہ ۱۲۸ھ کا واقعہ ہے۔ جب حرث بن شریح مارا گیا تو نصر نے اپنی جمعیت فراہم کر کے کرمانی کے مقابلے پر یکے بعد دیگرے فوجیں بھیجنی شروع کیں۔ مختلف لڑائیاں ہوئیں اور قریباً ہر ایک معرکہ میں مضر سرداروں کو کرمانی کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ آخر میں نصر بن سیار خود بڑی جمعیت لے کر مرو پہنچا۔ طرفین سے مورچے قائم ہوئے اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ یہ لڑائیاں ابھی جاری تھیں اور کوئی فریق غالب یا مغلوب نہ ہوا تھا کہ ابو مسلم خراسانی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی جمعیت کو جمع کر کے ایک طرف نصر بن سیار سے خط و کتابت جاری رکھی اور دوسری طرف کرمانی سے۔ اس نے نصر کو لکھا کہ امام ابراہیم نے تمہارے متعلق مجھے کچھ ہدایات بھیجی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان سے تم کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ اسی مضمون کا خط اس نے کرمانی کو لکھا کہ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں اور امام ابراہیم نے تمہارے بارے میں مجھ کو لکھا ہے کہ ضرورت کے وقت تمہاری امداد کروں۔ یہ خطوط وہ جن قاصدوں کے ہاتھ روانہ کرتا ان کو ہدایت کرتا کہ جو قبائل نصر کے ہمدرد ہیں راستے میں ان کو نصر کے نام کا خط دکھاتے ہوئے جائیں، اور جو قبائل کرمانی کے ہمدرد ہیں ان کو کرمانی کے نام کا خط دکھاتے ہوئے جائیں۔ اس سے اس کا مقصد اور منشا یہ تھا کہ تمام قبائل کی ہمدردی حاصل ہو جائے۔ اس طرح اس نے خارجیوں کی ہمدردی اور حمایت اس قسم کی تدبیروں سے حاصل

Marfat.com

کی۔ آخر کار ابومسلم خراسانی اپنی جمعیت لے کر کرمانی اور نصر بن سیار کے مورچوں کے درمیان آ کر خیمہ زن ہو گیا اور دونوں فریق یہ اندازہ نہ کر سکے کہ یہ کس کی حمایت کرے گا اور کس کی مخالفت۔ خیمہ زن ہونے کے دوسرے روز ابومسلم خراسانی نے کرمانی کو کہلا بھیجا کہ میں تمھاری طرف سے نصر کا مقابلہ کروں گا۔ کرمانی یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ نصر نے اس خبر سے مطلع ہو کر کرمانی کو لکھ بھیجا کہ ابومسلم چالاکی سے تم کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ تم اس کے فریب میں نہ آنا۔ اس کے مقابلہ میں ہم کو اپنی مخالفت فراموش کر دینی چاہیے۔ کرمانی نے نصر کی رائے کو پسند کیا اور اگلے روز دونوں میں ملاقات کی تجویز منظور ہوئی۔ کرمانی دو سو آدمی لے کر نصر بن سیار کی ملاقات کے لیے نکلا۔ نصر کے آدمیوں نے موقع پا کر کرمانی اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ کرمانی کا بیٹا علی بھاگ کر ابومسلم خراسانی کے پاس آیا۔ کرمانی اور ابومسلم کی فوج نے مل کر ابومسلم اور علی بن کرمانی کی قیادت میں نصر بن سیار پر حملہ کیا۔ نصر بن سیار کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر کسی معمولی شخص کے مکان میں چھپ گیا اور ابومسلم نے مرو پر قبضہ کر لیا۔ علی بن کرمانی نے ابومسلم خراسانی کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہی لیکن ابومسلم نے کہا کہ تم ابھی اسی حالت میں رہو۔ امام ابراہیم کا حکم آنے پر جو مناسب ہوگا کیا جائے گا۔ نصر بن سیار نے مرو سے نکل کر پھر اپنے گرد لوگوں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ ابومسلم نے خارجیوں کے سردار شیبان خارجی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا کیونکہ نصر بن سیار خارجیوں کا سخت دشمن تھا، اور علی بن کرمانی اس لیے ابومسلم کا شریک تھا کہ وہ نصر بن سیار سے اپنے باپ کے خون کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ نصر بن سیار نے خارجیوں کے سردار شیبان کو یہ پیغام بھیج کر ابومسلم سے الگ کرنا چاہا کہ ابومسلم شیعان علی میں سے ہے۔ غرض کہ کبھی خارجی ابومسلم سے جدا ہوئے اور کبھی علی بن کرمانی الگ ہو گیا۔ یہ چاروں گروہ یعنی ابومسلم، شیبان خارجی، علی بن کرمانی اور نصر بن سیار تمام خراسان میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف اتفاق و مخالفت جلد جلد قائم ہو کر ٹوٹ جاتی تھی۔ ان چاروں میں نصر بن سیار اور ابومسلم خراسانی بہت ہوشیار اور مآل اندیش اور دور بین تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابومسلم خراسانی نے یکے بعد دیگرے مناسب موقع پا کر شیبان خارجی اور علی بن کرمانی کو سنہ ۱۳۰ھ میں قتل کر دیا اور سنہ ۱۳۱ھ میں رے کے متصل نصر بن سیار خود بیمار ہو کر انتقال کر گیا۔ اب پورے خراسان میں کوئی بھی ابومسلم کا مدمقابل نہیں تھا۔

خوارج عراق:

بنو امیہ کو باہم دست و گریبان دیکھ کر ان کے پرانے حریفوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور وہ بھی میدان میں کود پڑے۔ خوارج ضحاک میں قیس شیبانی کے زیر علم منظم ہوئے اور کوفہ پر حملہ کر دیا۔ امیر کوفہ عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز نے ان کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور کوفہ چھوڑ کر واسط چلا گیا ضحاک نے عبداللہ بن عمر کا تعاقب کیا اور واسطہ پہنچا۔ کئی مہینوں کی جنگ کے بعد عبداللہ نے ضحاک سے مصالحت کر لی اور واسط پر ضحاک کا قبضہ ہو گیا۔ اسی دوران میں سلیمان بن ہشام بھی مروان کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر ضحاک سے جا ملا۔ سلیمان

Marfat.com

کے ضحاک کے ساتھ ملنے سے ضحاک کی قوت بہت بڑھ گئی۔اس نے موصل کو بھی فتح کر لیا۔مروان اس زمانہ میں حمص میں مقیم تھا۔اسے ضحاک کی ان کامیابیوں کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے بیٹے عبداللہ بن مروان کو جو جزیرہ کا والی تھا، حکم بھیجا کہ وہ جزیرہ میں ضحاک کو داخل ہونے سے روکے۔عبداللہ بن مروان سات ہزار کی جمعیت کے ساتھ ضحاک کو روکنے کے لیے نصیبین میں مقیم ہوا۔ضحاک نے مروان کی آمد کی خبر سن کر نصیبین کا محاصرہ اٹھا لیا اور مروان کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا۔کفرتوثا کے نواحی علاقہ میں فریقین میں ہولناک جنگ ہوئی جس میں ضحاک بن قیس مارا گیا۔خوارج نے سعید بن بحدل کو امیر منتخب کر کے پھر جنگ شروع کر دی۔سعید نے مروان کی فوج کے قلب پر حملہ کر کے اسے شکست دے دی۔مروان قلب کے دستہ کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا، لیکن جب سعید خیبری مروان کی خیمہ گاہ کی طرف بڑھا تو مروان کے خدمت گاروں نے اس کے ساتھیوں کی قلت تعداد دیکھ کر اسے گھیر کر قتل کر دیا۔مروان کو لڑائی کا نقشہ بدل جانے کی خبر پہنچی تو وہ لوٹ آیا اور پھر نئے سرے سے صفیں درست کیں۔خوارج بھی بہت ڈھیٹ تھے۔انھوں نے سعید خیبری کے قتل کے بعد شیبان بن عبدالعزیز لشکری کو اپنا سردار مقرر کر لیا۔اس نے جب دیکھا کہ اس کے ساتھیوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے تو لڑائی ملتوی کر کے موصل چلا گیا۔مروان بھی اس کے تعاقب میں موصل پہنچا اور چھ ماہ تک اس سے برسرپیکار رہا۔

اسی اثنا میں مروان نے یزید بن عمر بن ہبیرہ کو عراق سے خارجیوں کا اثر زائل کرنے کے لیے بھیجا۔ ابن ہبیرہ نے پہلے کوفہ اور پھر بصرہ سے خارجیوں کو نکالا۔عراق سے مطمئن ہو کر ابن ہبیرہ نے عامر بن ضبارہ کو سات ہزار کے لشکر کے ساتھ مروان کی مدد کے لیے جو شیبان کے مقابلہ میں صف آرا تھا، موصل بھیجا۔شیبان کو عامر کی روانگی کی اطلاع ملی تو اس نے خود کو دو دشمنوں کے درمیان گھروانا مناسب نہ سمجھا اور موصل سے روانہ ہو گیا۔مروان نے عامر کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔شیبان کو شکست فاش ہوئی۔وہ بجستان کی طرف نکل گیا اور وہاں سنہ ۱۳۰ھ میں مر گیا۔ان تمام مراحل میں سلیمان بن ہشام برابر خوارج کے ساتھ رہا اور ان کی ہر قسم کی مدد کرتا رہا۔خوارج کی قوت ٹوٹ جانے کے بعد وہ اہل و عیال کے ساتھ دریائی راستہ سے سندھ چلا آیا۔انقلاب حکومت کے بعد اس نے بڑی منتوں سماجتوں کے بعد سفاح کے دربار میں حاضر ہو کر اس کی دست بوسی کی۔سفاح نے بھی اس کے ساتھ عزت و احترام کا برتاؤ کیا، لیکن عین اس موقع پر جب سفاح کی نظر عنایت اس پر مبذول تھی، سفاح کے غلام سدیف نے چند اشتعال انگیز اشعار پڑھے جس سے سفاح کے سینہ پر کینہ میں انتقام کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور اس نے سلیمان کا سر قلم کروا دیا۔

خوارج یمن و حجاز:

جس زمانہ میں ضحاک بن قیس شیبانی خارجی اور اس کے ساتھیوں نے عراق اور جزیرہ میں شورش اور بغاوت برپا کر رکھی تھی اسی زمانہ میں ایک دوسرے خارجی سردار ابوحمزہ مختار بن عوف ازدی نے حجاز کو اپنی فتنہ انگیز

Marfat.com

سرگرمیوں کا مرکز بنا رکھا تھا۔ابوحمزہ نے سنہ ۱۲۹ھ میں اپنے سات سو رفقاء کے ساتھ عین حج کے موقع پر میدان عرفات میں خروج کیا۔حاجی صاحبان ان کے سیاہ جھنڈے اور نیزوں پر سیاہ بلند عمامے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔عبدالواحد بن سلیمان والی مکہ نے ابوحمزہ سے مراسلت کر کے یہ طے کیا کہ ایام حج میں شورش برپا نہ ہوگی اور حاجیوں کو مناسک حج کی ادائیگی کا نہایت اطمینان اور سکون سے موقع دیا جائے گا۔

حج سے فراغت کے بعد عبدالواحد بن سلیمان نہایت خاموشی کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ چلا گیا اور ابوحمزہ نے بغیر کسی مزاحمت کے مکہ مکرمہ پر قبضہ کر لیا۔مدینہ منورہ پہنچ کر عبدالواحد نے اہل مدینہ کو فتنہ سے آگاہ کیا اور انھیں ان کے مقابلہ میں نکلنے کے لیے برانگیختہ کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اہل مدینہ نے عبدالعزیز بن عبداللہ کی قیادت میں ایک لشکر ابوحمزہ سے برسرپیکار ہونے کے لیے روانہ کیا۔اہل مدینہ جب مدینہ سے باہر کچھ فاصلہ پر پہنچے تو انھیں ابوحمزہ کا یہ پیغام ملا کہ ہم تم لوگوں سے لڑنا نہیں چاہتے۔ہم کو اپنے دشمن سے نمٹ لینے دو،لیکن اہل مدینہ نے اس کے اس پیغام پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔خوارج مکہ مکرمہ سے چل نکلے تھے۔قدید کے مقام پر ان کا اور اہل مدینہ کا سامنا ہوا۔خوارج جنگ میں بڑے ماہر تھے۔اہل مدینہ خوارج کے مقابلہ میں جنگ سے بالکل ناواقف تھے،اس لیے شکست فاش کھائی اور ان کے اتنے آدمی مارے گئے کہ مدینہ ماتم کدہ بن گیا۔اہل مدینہ کو شکست دینے کے بعد ابوحمزہ مدینہ پہنچا۔عبدالواحد میں اس کے مقابلہ کی بالکل طاقت نہ تھی۔اس لیے اس نے شام کا راستہ لیا اور صفر سنہ ۱۳۰ھ میں ابوحمزہ مدینہ میں داخل ہو گیا اور یہاں چند ماہ قیام کرنے کے بعد مروان کا مقابلہ کرنے کے بعد شام کا رخ کیا۔مروان نے عبدالملک بن محمد کو چار ہزار کی جمعیت کے ساتھ اس کو روکنے کے لیے بھیجا اور وادی القریٰ میں دونوں لشکروں میں جنگ ہوئی۔ابوحمزہ کو بڑی فاش شکست ہوئی اور خارجیوں کی ایک بہت بڑی تعداد میدان جنگ میں کام آئی جو بچ گئے وہ مدینہ منورہ لوٹ آئے۔عبدالملک نے ان کا تعاقب کیا اور مدینہ پہنچ کر باقی خارجیوں کو بھی تہ تیغ کیا۔ابوحمزہ بھی مارا گیا۔اس کے قتل کے بعد خارجیوں کی شورش ختم ہو گئی۔خوارج کے اس گروہ کا امیر عبداللہ بن یحییٰ (طالب حق) تھا جو صنعا (یمن) میں مقیم تھا۔ابوحمزہ اس کا داعی تھا۔مدینہ میں ایک ماہ قیام کر کے عبدالملک نے صنعاء کا رخ کیا۔عبداللہ بن یحییٰ کو عبدالملک کی آمد کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلا۔عبداللہ بن یحییٰ قتل ہوا اور عبدالملک نے اس کا سر مروان کے پاس بھیج دیا۔(ابن اثیر: ۱۴۶/۵) یہ خارجی اور دوسری مخالف جماعتیں امویوں کے لیے کوئی نئی نہ تھیں۔امویوں کو ہمیشہ ان سے سابقہ پڑا۔اس لیے صرف ان سے بنوامیہ کو کوئی اتنا بڑا نقصان نہیں ہو سکتا تھا،لیکن بنوامیہ کی بدقسمتی سے مضر،یمن اور ربیعہ قبائل کے اختلاف نے ایک مستقل جنگ کی صورت اختیار کر لی۔اس سے عباسی تحریک کو پھلنے پھولنے اور طاقت پکڑنے کا سنہری موقع مل گیا اور ابومسلم خراسانی نے سارے خراسان میں اس عباسی تحریک کو پھیلا دیا اور یہی تحریک بنوامیہ کی اصل دشمن اور حریف تھی۔

Marfat.com

قبائلی عصبیت:

اگر چہ اموی حکومت کے مختلف صوبوں میں شورشیں اور بغاوتیں برپا ہو رہی تھیں لیکن خراسان کی حالت سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ یہاں قبائلی عصبیت کا خوابیدہ فتنہ بیدار ہو چکا تھا اور نصر بن سیار والی خراسان مضری قبائل کا قائد تھا اور جدیع بن شبیب کرمانی یمنی قبائل کا راہ نما۔ ان دونوں کے زیر علم مضری اور یمنی قبائل تھے جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں تھے۔ قبائل ربیعہ جاہلیت کے معاہدے کے مطابق یمنی قبائل کے ساتھ تھے ان کا سردار شیبان بن سلمہ تھا ان کی باہمی جنگوں کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

ابومسلم خراسانی:

عین اس موقع پر جب کہ سلطنت اسلامیہ اور خصوصی طور پر خراسان میں قبائلی عصبیت کا فتنہ اپنے پورے عروج پر تھا، ابومسلم خراسانی ایک عجمی النسل اور پارسی نژاد نوجوان خراسان کی سیاست میں داخل ہوا۔ اس نے حالات کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ ابومسلم نقیب کوفہ بکیر بن ماہان کا غلام تھا۔ بکیر نے اسے ایک جوہر قابل سمجھ کر عباسی تحریک کے اصول تلقین کیے۔ پھر اسے حمیمہ میں امام ابراہیم کی خدمت میں نذر گزارا۔ سنہ ۱۲۸ھ میں ابراہیم نے ابومسلم خراسانی کو امیر جماعت خراسان بنا کر بھیجا اور اسے یہ وصیت کی:

> ''تم ہمارے اپنے بلکہ گھر کے آدمی ہو۔ میری وصیت کو اچھی طرح یاد رکھو۔ یمن کے قبیلہ کا خیال رکھنا اور انھیں ساتھ اکٹھا رکھنا اور انہی کے ساتھ رہنا سہنا۔ تم اپنے مقصد میں ان کو ساتھ ملا کر ہی کامیاب ہو سکتے ہو۔ ربیعہ پر اعتماد نہ کرنا اور نصر کو تو قریبی دشمن سمجھنا۔ پھر تم جس کسی کو شکوک میں پاؤ اس کو قتل کر دینا اور جب موقع آئے تو کسی عربی بولنے والے کو خواہ وہ مصری ہو یا یمنی یا ربعی زندہ نہ چھوڑنا۔'' (ابن اثیر: ۱۴۰/۵)

اس شخص نے ہاشمی خلافت کے تخیل کو اسلام کی تاریخ میں واقعہ کی شکل دی۔ اس کے نسب اور عباسی تحریک میں اس کی شرکت کے زمانہ میں روایات مختلف ہیں، لیکن روایات اس بات پر متفق ہیں کہ عجمی النسل اور پارسی نژاد نومسلم تھا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابومسلم خراسانی کا اصل نام ابراہیم بن عثمان بن یسار تھا۔ ایرانی النسل تھا اور مشہور ہے کہ بزرجمہر کی اولاد میں سے تھا۔ اصفہان میں پیدا ہوا تھا۔ ماں باپ نے کوفہ کے متصل ایک گاؤں میں آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس کا باپ مرتے وقت وصیت کر گیا تھا کہ عیسیٰ بن موسیٰ سراج اس کی پرورش اور تربیت کرے۔ عیسیٰ اس کو گاؤں سے کوفہ شہر میں لے آیا۔ ابومسلم جامہ دوزی کا کام عیسیٰ سے سیکھتا تھا اور اسی کے پاس کوفہ میں رہتا تھا۔ عیسیٰ بن موسیٰ اپنے زین اور چار جامے لے کر خراسان، جزیرہ اور موصل کے علاقوں

Marfat.com

میں فروخت کرنے کے لیے جاتا تھا۔ چنانچہ وہ اکثر سفر ہی میں رہتا تھا اور ہر طبقہ کے آدمیوں سے اسے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اسی کی نسبت یہ شبہ ہوا کہ وہ بھی ہاشمیوں اور علویوں کا نقیب ہے اسی طرح اس کے خاندان کے دوسرے آدمیوں پر بھی یہ شبہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف بن عمر گورنر کوفہ نے عیسیٰ بن موسیٰ اور اس کے چچا زاد بھائی ادریس بن معقل اور ان دونوں کے چچا عاصم بن یوسف عجلی کو قید کر دیا۔ اسی قید خانہ میں خالد قسری کے گرفتار شدہ عمال بھی قید تھے۔ ابومسلم قید خانہ میں عیسیٰ بن موسیٰ کی وجہ سے اکثر جایا کرتا تھا جہاں وہ تمام قیدی تھے جو واقعی بنو عباس یا بنو فاطمہ کے نقیب تھے۔ لہٰذا ان لوگوں کی باتیں سن کر ابومسلم کے دل پر بہت اثر پڑا اور وہ بھی جلد ان لوگوں کا ہمدرد بن کر ان کی نگاہ میں اپنا اعتبار قائم کر سکا۔ اتفاقاً قحطبہ بن شبیب جو امام ابراہیم کی طرف سے خراسان میں کام کرتا اور لوگوں کو خلافت عباسیہ کے لیے دعوت دیتا تھا، خراسان سے حمیمہ کی طرف جا رہا تھا، راستہ میں وہ کوفہ کے ان قیدیوں سے بھی ملا۔ یہاں اس کو معلوم ہوا کہ عیسیٰ اور عاصم وغیرہ کا خادم ابو مسلم بہت ہوشیار اور جوہر قابل ہے۔ اس نے عیسیٰ سے ابومسلم کو مانگ لیا اور اپنے ساتھ لے کر حمیمہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں اس نے امام ابراہیم کی خدمت میں ابومسلم کو پیش کیا۔ امام ابراہیم نے ابومسلم سے پوچھا: ''تمہارا نام کیا ہے؟'' ابومسلم نے جواب دیا کہ میرا نام ابراہیم بن عثمان بن یسار ہے۔'' امام ابراہیم نے کہا: ''نہیں تمہارا نام عبدالرحمٰن ہے۔'' چنانچہ اس روز سے ابومسلم کا نام عبدالرحمٰن ہو گیا۔ امام ابراہیم ہی نے اس کی کنیت ابومسلم رکھی اور قحطبہ بن شبیب سے مانگ لیا۔ چند روز تک ابومسلم امام ابراہیم کی خدمت میں رہا اور انھوں نے اچھی طرح ابومسلم کی فطرت و استعداد کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اپنے ایک مشہور نقیب ابونجم عمران بن اسماعیل کی لڑکی سے اس کا عقد کر دیا۔ ابونجم ان لوگوں میں سے تھا جو خلافت اسلامیہ کو اولاد علی میں لانا چاہتے تھے۔ اس عقد سے یہ فائدہ حاصل کرنا مقصود تھا کہ ابومسلم کو شیعان علی کی حمایت حاصل رہے اور اس کی طاقت کمزور نہ ہونے پائے۔ اس انتظام و اہتمام کے بعد امام ابراہیم نے ابومسلم کو خراسان کی طرف روانہ کیا اور تمام داعیوں اور نقیبوں کو مطلع کیا کہ ہم نے ابومسلم کو خراسان کے تمام علاقے کا مہتمم بنا کر روانہ کیا ہے، لہٰذا سب داعیوں کو دعوت بنو ہاشم کے کام میں ابومسلم کی فرمان برداری کرنا چاہیے۔ خراسان کے مشہور اور کارگزار نقباء جو محمد بن علی عباسی یعنی امام ابراہیم کے باپ کے زمانہ سے دعوت کا کام کر رہے تھے، یہ تھے: سلیمان بن کثیر، مالک بن ہثیم، زیاد بن صالح، طلحہ بن زریق اور عمر بن اعین۔ یہ پانچوں شخص قبیلہ خزاعہ کے تھے۔ قحطبہ بن شبیب بن خالد بن مجاشع، اسلم بن سلام یہ چاروں تمیمی تھے۔ ابوداؤد خالد بن ابراہیم شیبانی، ابوعلی ہروی اسی کو شبل بن طہمان بھی کہتے تھے، ابونجم عمران بن اسماعیل کی بیٹی کے ساتھ جب ابومسلم خراسان پہنچا تو سلیمان بن کثیر نے اس کو نوعمر ہونے کے باعث واپس بھیج دیا۔ یہ تمام سن رسیدہ اور پختہ عمر کے تجربہ کار بزرگ تھے۔ ایک نوعمر شخص کو اپنی خفیہ کارروائیوں اور راز داری کے مخفی کاموں کا افسر اور مہتمم بنانا اخلاف مصلحت سمجھا۔ امام ابراہیم نے ابومسلم خراسانی کو سنہ ۱۲۸ھ میں خراسان کے داعیوں کا رئیس بنا کر بھیجا اور اسے یہ وصیت کی

Marfat.com

جس کا ذکر گذشتہ صفحہ میں کیا گیا ہے۔

جس وقت ابومسلم خراسان پہنچا تھا اس وقت ابو داؤد خالد بن ابراہیم شیبانی ماوراء النہر کی طرف کسی ضرورت سے گیا ہوا تھا۔ وہ جب مرو میں واپس آیا اور امام ابراہیم کا خط اس نے پڑھا تو ابومسلم کے بارے میں پوچھا۔ اس کے دوستوں نے کہا کہ سلیمان بن کثیر نے نوعمر ہونے کی وجہ سے اسے واپس لوٹا دیا ہے کہ اس سے کوئی کام نہ ہو سکے گا۔ یہ ہم سب کو اور ان لوگوں کو بھی جن کو دعوت دی جاتی ہے، خطرات میں مبتلا کر دے گا۔ ابو داؤد نے تمام نقیبوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ سرکار دو عالم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اولین و آخرین کا علم عطا فرمایا تھا۔ آپ ﷺ کی عترت اور اہل بیت اس علم کے وارث ہیں اور آپ کے اہل بیت معدن علوم اور ورثاء رسول ﷺ ہیں۔ کیا تم لوگوں کو اس میں کوئی شک و شبہ ہے؟ حاضرین نے کہا: ''نہیں۔'' ابو داؤد نے کہا کہ پھر تم نے کیوں شک و شبہ کو دخل دیا؟ اس شخص کو امام نے کچھ سوچ سمجھ کر اور اس کی قابلیت و اہلیت کو جانچ کر ہی تمہاری طرف بھیجا ہو گا۔ ان باتوں کو سن کر سب کو ابومسلم کے واپس ہونے کا افسوس ہوا۔ اسی وقت آدمیوں کو روانہ کیا گیا۔ وہ ابومسلم کو راستہ سے لوٹا کر واپس لائے۔ سب نے اپنے تمام کاموں کا متولی اور مہتمم ابومسلم کو بنا دیا اور نہایت خوشی اور مسرت کے ساتھ اس کی اطاعت کرنے لگے۔ چونکہ سلیمان بن کثیر نے اول اس کو واپس کر دیا تھا، اس لیے ابو مسلم سلیمان کی طرف سے کچھ کبیدہ خاطر ہی رہتا تھا۔ ابومسلم نے نقباء کو ہر طرف شہروں میں پھیلا دیا اور تمام خراسان میں اس تحریک کو ترقی دینے لگا۔

سنہ ۱۲۹ھ میں امام ابراہیم نے ابومسلم کو لکھا کہ اس سال موسم حج میں مجھ سے آ کر ملو تا کہ دعوت کے پھیلانے کے بارے میں ضروری اور مناسب احکام دیئے جائیں۔ یہ بھی لکھا کہ قحطبہ بن شبیب کو بھی اپنے ہمراہ لیتے آنا، اور جس قدر مال و اسباب اس کے پاس جمع ہو گیا ہے وہ بھی لیتے آنا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان خفیہ سازشوں کے لیے ایام حج بہترین موقع تھا۔ مکہ مکرمہ میں حج بیت اللہ کے لیے دنیا بھر سے لوگ آتے تھے۔ کسی کو کسی کے آنے پر کوئی شبہ نہیں ہوتا تھا اور سازشی لوگ آسانی کے ساتھ آپس میں مل کر ہر قسم کی گفتگو کر لیتے تھے اور وہ لوگ حج کے موقع کو کبھی فوت نہ ہونے دیتے تھے۔ چنانچہ ابومسلم قحطبہ اور دوسرے نقباء کو بھی ساتھ لے کر امام سے ملنے کی غرض سے مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوا۔ جب مقام قومس پہنچا تو وہاں اسے امام ابراہیم کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ تم فوراً خراسان کی طرف واپس لوٹ آؤ، اور اگر خراسان سے روانہ نہیں ہوئے ہو تو وہیں ٹھہرے رہو اور اب اپنی دعوت کو پوشیدہ نہ رکھو بلکہ اعلانیہ دعوت دینی شروع کر دو کیونکہ حالات سازگار ہیں، اور جن لوگوں سے بیعت لے چکے ہو ان کو جمع کر کے قوت کا استعمال شروع کر دو۔ اس خط کو پڑھ کر ابومسلم تو مرو کی جانب لوٹ گیا اور قحطبہ مال و اسباب لیے ہوئے امام ابراہیم کی جانب روانہ ہو گیا۔ قحطبہ نے جرجان کا راستہ اختیار کیا۔ اطراف جرجان میں پہنچ کر خالد بن برمک اور ابوعون کو طلب کیا۔ یہ لوگ مال و اسباب کے ساتھ فوراً حاضر ہوئے۔ قحطبہ اس مال و اسباب کو بھی لے کر امام ابراہیم کی طرف چلا۔ ابومسلم نے

Marfat.com

خراسان میں جب علانیہ دعوت وتبلیغ شروع کی تو خراسان کے لوگ جوق در جوق اس کے پاس آنے لگے۔

سنہ ۱۳۰ھ کے شروع ہوتے ہی ابو مسلم نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور اہل بیت نبوت کی اطاعت وفرماں برداری پر لوگوں سے بیعت لینا شروع کر دی۔ کرمانی، شیبان خارجی اور نصر بن سیار تینوں ابو مسلم کی اس بیعت لینے اور لوگوں کو فراہم کرنے سے ناراض تھے، لیکن وہ اس طرح اپنی لڑائیوں میں مصروف تھے کہ ابو مسلم کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ کرمانی کے قتل کے بعد علی بن کرمانی اپنے باپ کی جماعت کا سردار تھا۔ دوسری طرف ابو مسلم بھی خراسان میں کافی طاقت حاصل کر چکا تھا۔ نصر بن سیار اور شیبان خارجی بھی اسی درجہ کی طاقت کے مالک تھے۔ اب خراسان میں یہی چار طاقتیں تھیں۔ ابو مسلم نے شیبان خارجی کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور ابن کرمانی کو اس کے پاس جانے کی ترغیب دی۔ علی بن کرمانی ابو مسلم کے کہنے پر شیبان خارجی کے پاس چلا گیا۔ نصر بن سیار نے شیبان خارجی سے صلح کرنا چاہی تاکہ وہ اس کے ساتھ مل کر ابو مسلم سے دو دو ہاتھ کرے، لیکن ابو مسلم نے ان دونوں کی صلح نہ ہونے دی۔ جب ان دونوں کی مصالحت نہ ہوئی تو ابو مسلم نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے نصر بن نعیم کو ایک جمعیت کے ساتھ ہرات کی طرف روانہ کر دیا۔ نصر بن نعیم نے ہرات پہنچ کر غفلت کی حالت میں ہرات پر قبضہ کر لیا اور نصر بن سیار کے عامل عیسیٰ بن عقیل بن معقل حریشی کو ہرات سے نکال دیا۔ یحییٰ بن نعیم بن ہبیرہ شیبانی یہ سن کر علی بن کرمانی کے پاس آیا اور کہا کہ تم نصر سے صلح کر لو۔ اگر تم نے صلح کر لی تو ابو مسلم فوراً نصر کے مقابلہ پر آمادہ ہو جائے گا اور تم سے تعرض نہ کرے گا، لیکن اگر تم نے نصر سے صلح نہ کی تو ابو مسلم نصر سے صلح کر کے تمہارے مقابلہ پر آ جائے گا۔ شیبانی نے فوراً نصر کو لکھا کہ ہم تم سے صلح کرنا چاہتے ہیں۔ نصر فوراً صلح پر آمادہ ہو گیا کیونکہ اس کی پہلے سے یہ خواہش تھی۔

ابو مسلم کے لیے یہ صلح خطرناک تھی لہٰذا اس نے فوراً علی بن کرمانی کو جو شیبان خارجی کا شریک تھا توجہ دلائی کہ نصر بن سیار تمہارے باپ کا قاتل ہے۔ علی بن کرمانی ایک جذباتی نوجوان تھا۔ اس نے یہ سنتے ہی نصر بن سیار سے اتحاد توڑ دیا۔ اب یہ چاروں مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ گروہ موقع اور وقت کی مناسبت سے ایک دوسرے کو اپنے ساتھ ملا کر تیسرے کو فنا کے گھاٹ اتارنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ شیعان علی بھی خراسان میں پہلے سے بکثرت موجود تھے، وہ بھی سب ابو مسلم کے ساتھ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی بن کرمانی اور ابو مسلم نے نصر بن سیار اور شیبان خارجی کو شکست دے کر مرو پر مستقل قبضہ کر لیا اور مرو کے دار الامارۃ میں جا کر لوگوں سے بیعت لی اور خطبہ دیا۔

یہ تھی مختصر سی داستان ابو مسلم خراسانی کی۔ ان سب واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ عباسی تحریک کی کامیابی میں ابو مسلم کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ابو مسلم اور عباسی تحریک کی خوش قسمتی کہ اسی زمانہ میں عرب کے مختلف قبائل جیسے مضر، یمن اور ربیعہ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس نے ابو مسلم خراسانی کے لیے راستہ صاف کر دیا اور اب اسے کھل کر کام کرنے میں کوئی مزاحمت نہ رہی۔ یہ خانہ جنگی اس کی تحریک کے لیے بہت مفید تھی اس وجہ

Marfat.com

سے اس نے اپنی حکمت عملی سے اس خانہ جنگی کی آگ کو اور بھڑکایا اور اس طریقہ سے اس نے عربوں کی قوت کو آپس میں لڑا کر پاش پاش کر دیا۔

یہی جذبہ ابومسلم خراسانی کے دل و دماغ پر بھی چھایا ہوا تھا اور ہر وقت اس کے اور اس جیسے دوسرے عجمیوں کے دل و دماغ میں عربوں سے انتقام کے جذبات پرورش پاتے تھے، اور عربی حکومت کو نقصان پہنچانے والی جو تحریک بھی شروع ہوتی تھی، یہ لوگ اس میں شریک ہوتے تھے بلکہ اس کے مبلغ بن جاتے تھے۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ عجمیوں کو عربوں سے یہ بغض اور عناد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے شروع ہوا تھا کیونکہ انھوں نے کسریٰ کی حکومت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا اور کسریٰ بے یار و مددگار کس مپرسی کی حالت میں اپنی ہی سلطنت میں جان بچانے کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر میں پناہ ڈھونڈتا پھرتا تھا اور اس کے اپنے ملک کی سرزمین اپنی وسعت کے باوجود اس پر تنگ ہوگئی تھی یہاں تک کہ وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک چکی والے کے ہاتھوں مارا گیا۔ عجمیوں کے دل و دماغ میں یہی بغض و عناد نسل در نسل چلا آرہا تھا اور اسلامی حکومت کے خلاف جتنی بھی تحریکیں چلیں وہ ساری سرزمین عجم ہی سے اٹھیں اور انھوں نے ہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے لے کر محمد بن علی تک ہر ہاشمی کے ساتھ بے وفائی کی اور خلافت کے بارے میں اہل بیت اور غیر اہل بیت اور ہاشمی اور غیر ہاشمی کے مسئلہ کو بھی انہی عجمیوں نے بڑھاوا دیا اور اسی سرزمین میں یہ نظریہ پروان چڑھا اور اسی نظریہ کے پھیلاؤ میں انھوں نے ہر ممکن طریق سے عربوں کی خالص حکومت کی مخالفت کی اور اسے توڑنے اور اس میں فتنہ و فساد برپا کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ چنانچہ شیعان اہل بیت زیادہ تر عجمی تھے۔

یہ عجمی یوں تو پوری عرب قوم کے خلاف تھے لیکن اموی حکومت سے ان کو دوہرا عناد اور کینہ تھا، کیونکہ اولاً تو وہ عرب تھے، دوسرے ان کی حکومت خالص عربی تھی۔ اس میں عجمیوں کو کوئی باریابی نہ تھی۔ اس وجہ سے ان کے دل و دماغ میں اس حکومت کے خلاف بہت کینہ اور عناد تھا۔ چنانچہ عربوں کی باہمی خانہ جنگی سے جب ان کے اتحاد کا شیرازہ بکھرا، اس وقت ابومسلم اور اہل عجم کو ان سے انتقام لینے کا موقع مل گیا اور یہ انتقام انھوں نے عباسیوں کی معرفت لیا۔ یہی وجہ ہے کہ عباسی تحریک سب سے زیادہ عجم ہی میں پھیلی۔

عربوں کی خانہ جنگی:

تشتت و افتراق خاندانوں، شہروں اور قوموں کے شیرازہ کو منتشر اور پامال کر کے رکھ دیتا ہے۔ کئی حکومتوں کا زوال صرف اس وجہ سے ہوا کہ ان کے اندر اختلافات کی دراڑیں پڑ گئی تھیں جن سے ان کے وجود کی عمارت دھڑام سے زمین بوس ہوگئی۔ اندلس میں بھی یہی ہوا کہ مسلمانوں کی باہمی چپقلش اور باہمی انتشار نے انھیں آٹھ سو سال کے بعد پھر عیسائیوں کا نہ صرف غلام بنا دیا بلکہ عیسائیوں نے ان کی قومی اور انفرادی زندگی اور اس کے تمام نشانات کو ختم کر دیا اور مسجد قرطبہ اور الحمراء آج بھی مرثیہ خواں ہیں، یہی کچھ اموی حکومت

Marfat.com

کے آخری دور میں ہوا۔ مضر، یمن اور ربیعہ کی باہمی خانہ جنگی، ابومسلم خراسانی کی کارگزاریوں، عباسی تحریک کی نشرواشاعت نے اموی حکومت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ ان کے زوال کی داستان کی ترتیب میں اگرچہ مؤرخین کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن نتیجہ یہی ہے کہ مروان اموی حکومت کا آخری خلیفہ تھا اور اس کے بعد حکومت بنو امیہ کے ہاتھ سے نکل کر بنوعباس کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

قبائل کے درمیان تفرقہ اور تشتت وانتشار نے ایک مستقل جنگ کی شکل اختیار کر لی اور نتائج سے بے خبر اور بے نیاز ہو کر یہ سب قبائل آپس میں برسرپیکار ہو گئے۔ مروان خود مضر کا حمایتی اور طرف دار اور یمنیوں کے خلاف تھا، اس کے حکام اور عمال بھی مروان کی پالیسی پر کاربند تھے۔ چنانچہ گورنر نصر بن سیار والی خراسان جو خود مضری تھا، یمنی قبائل سے نہایت تعصب اور کینہ رکھتا تھا۔ ان سے وہ کوئی کام نہ لیتا تھا بلکہ وہ یمنیوں کے حلیف قبیلہ ربیعہ کا بھی سخت مخالف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی قبیلہ ربیعہ کے سردار جدیع بن علی کرمانی میں مخالفت کی خلیج پیدا ہو گئی۔ کرمانی نے نصر بن سیار کو اس کے اس متعصبانہ طرز عمل سے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن نصر اپنی اس غیر معقول روش سے باز نہ آیا بلکہ اس نے جدیع کرمانی کے خلاف ایک محاذ بنا لیا اور اس کے خلاف پراپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا۔ اب جدیع کرمانی بھی اس کے خلاف ہو گیا۔ اس وقت نصر بن سیار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اب وہ ضد کر بیٹھا۔ کرمانی نہایت مقتدر اور بااثر امیر تھا۔ ارباب اقتدار کو ایسے لوگوں کی قدر کر کے ان کو اپنے ساتھ رکھنا ضروری ہوتا ہے، لیکن نصر بن سیار نے ایسے مقتدر شخص کی قدر نہ کی بلکہ اسے ہر جگہ نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ نصر نے کرمانی کے خلاف اس تعصب کے باعث خراسان میں بدنظمی و انتشار پھیلنے اور عباسی تحریک کو تقویت پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے نصر نے کرمانی کے ساتھ مصلحت کے بجائے اسے قید کر دیا، لیکن اس کے آدمی اسے جیل سے نکال کر لے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ربیعہ اور یمن کا قبیلہ کرمانی کی حمایت اور نصر کی مخالفت میں اکٹھا ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر مضری بھی نصر بن سیار کی امداد کے لیے جمع ہو گئے۔ (ابن اثیر: ۱۱۲/۵، اخبار الطول: ص ۳۵۱) ان نازک حالات میں شاید ان دونوں کے ذہنوں نے کام کیا یا باہر کے لوگوں نے ان دونوں کی صلح کرا دی تاکہ معاملہ کوئی خراب صورت اختیار نہ کر لے لیکن مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ صلح پائیدار ثابت نہ ہوئی کیونکہ دونوں کے دلوں میں خلوص نہ تھا، لہٰذا چند دنوں کے بعد دونوں میں لڑائی شروع ہو گئی جس سے اموی حکومت کمزور اور عباسی تحریک کو تقویت ملی۔ (ابن اثیر: ۱۳۵/۵) ابوحنیفہ الدینوری نے لکھا ہے کہ کرمانی کو جب نصر کی قید سے رہا کرا لیا گیا تو نصر بن سیار نے ان سے اپنی اس غلطی کی معذرت کر لی اور ہر ممکن طریق سے کرمانی کو منانے کی کوشش کی لیکن کرمانی نے نہ صرف صلح سے انکار کر دیا بلکہ نصر کو نہایت سخت اور توہین آمیز جواب دیا۔ ربیعہ اور یمنی قبائل کے درمیان زمانہ جاہلیت میں جو معاہدہ ہوا تھا، نصر سے انتقام لینے کے لیے دوبارہ اس کی تجدید کر کے اعلان جنگ کر دیا گیا۔ اس اعلان کے جواب میں مضر کو بھی چارو ناچار مقابلہ کے لیے باہر نکلنا پڑا اور دونوں میں جنگ کا آغاز ہو گیا۔ (اخبار الطوال: ص ۳۵۲)

Marfat.com

ان دونوں کی جنگ عباسی تحریک کے لیے نہایت مفید تھی۔ اس وجہ سے ابو مسلم خراسانی نہایت خاموشی سے اس خانہ جنگی کا تماشا دیکھتا رہا۔ ابو مسلم کی قوت اب بہت بڑھ چکی تھی۔ اس خانہ جنگی میں وہ جس فریق کا بھی ساتھ دیتا کامیابی اس کی ہم کنار ہوتی۔ یہ خانہ جنگی اس کے لیے نہایت فائدہ مند تھی لہٰذا وہ دونوں فریقوں کو اپنی حمایت اور ہمدردی کا یقین دلاتا رہتا اور چپکے چپکے عباسی دعوت کی تشہیر بھی کرتا رہا۔ یہ دونوں اس کے شر سے بالکل غافل رہے۔ وہ چپکے چپکے اس آگ کو سلگاتا رہا اور عربوں کی تباہی کی دعائیں بھی کرتا رہا۔

(یعقوبی: ۴۰۸/۲)

دینوری نے لکھا ہے کہ ایک دوراندیش اور دوربین عرب سردار عقیل بن معقل نے اس صورت حال کو دیکھ کر دونوں کے مابین صلح کرانے کی کوشش کی۔ نصر بن سیار تو مصالحت پر آمادہ ہو گیا لیکن کرمانی نے یہ شرط پیش کر دی کہ نصر اپنے عہدہ سے الگ ہو جائے اور اس کی جگہ قبیلہ ربیعہ کا کوئی شخص گورنر مقرر کیا جائے۔ یہ ایک ایسی شرط تھی جس کو نصر کسی صورت منظور نہ کر سکتا تھا۔ اس وجہ سے عقیل بن معقل کی یہ پرخلوص کوشش ناکام رہی۔

(اخبار الطوال: ص ۳۵۵)

ابو مسلم خراسانی عجمی اور پارسی نژاد ہونے کے ناطے پوری عرب قوم کا دشمن تھا، لیکن اموی حکومت میں مضر قبیلہ کی شمولیت کے باعث اس کے اصل حریف یہی تھے، لہٰذا حالات کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے اس نے مضر کی قوت کو توڑنے کا عزم کر لیا۔ چنانچہ وہ اب علانیہ کرمانی کے ساتھ ہو گیا جس سے نصر کو سخت خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے۔ نصر نے دھوکے سے کرمانی کو قتل کر دیا لیکن کرمانی کا لڑکا علی اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے ابو مسلم سے مل گیا اور نصر کا کرمانی کو قتل کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی بن کرمانی، ابو مسلم اور ربیعہ اور یمن کے قبائل کا باہمی اتحاد ہو گیا جن کا مقابلہ کرنا نصر بن سیار کے بس میں نہ تھا۔ نصر بن سیار نے مروان کو ابو مسلم کی بڑھتی ہوئی طاقت کا حال لکھا لیکن مروان اب نصر کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بنو امیہ کا نصیبہ اب سو چکا تھا اور ایسا سویا کہ پھر جاگنا اسے نصیب نہ ہوا۔ جب نصر نے مروان کو مدد کے لیے لکھا تو مروان اس وقت خوارج کے مقابلہ میں مشغول تھا اور اس کی تمام عسکری قوت وہاں صرف ہو رہی تھی اس لیے وہ کوئی مدد نہ کر سکا۔ (مروج الذہب: ۶۵/۳، ابن اثیر: ۱۳۶/۵) چند روز کے بعد نصر نے مروان کو مدد حاصل کرنے کے لیے ایک اور خط لکھا۔ مروان خود تو کچھ نہ کر سکا لیکن یزید بن ہبیرہ گورنر عراق کو بارہ ہزار فوج بھیجنے کے لیے کہا۔ اس نے جواب میں مروان کو لکھا کہ اولاً تو اتنی تعداد میں فوج میرے پاس نہیں ہے۔ دوسرے عراقیوں کے دل میں کھوٹ ہے، یہ خلیفہ کے دل سے خیر خواہ نہیں، لہٰذا یہ لوگ قابل اعتماد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میدان جنگ میں حریف سے مل جائیں۔ مسعودی کا بیان ہے کہ یزید بھی خوارج سے برسرپیکار تھا اس وجہ سے وہ نصر کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ (مسعودی: ۶۷/۳)

Marfat.com

امام ابراہیم کا قتل:

اتفاق سے اسی زمانہ میں ابومسلم خراسانی کا ایک قاصد جو امام ابراہیم کے پاس جا رہا تھا، پکڑا گیا۔ اس کو مروان کے سامنے پیش کیا گیا۔ مروان نے اس کو دس ہزار دیئے کہ وہ ابراہیم کے پاس جائے اور وہ ابومسلم کے خط کا جو جواب دیں، وہ اسے لا کر دے۔ چنانچہ جواب لا کر اس نے مروان کے حوالے کر دیا۔ اس خط میں ابومسلم خراسانی کو حریف کے استیصال کی بڑی تاکید کی گئی تھی۔ (یعقوبی:۲/۴۰۳) اور ابومسلم پر برہمی کا اظہار تھا کہ اس نے کیوں اب تک نصر اور کرمانی کو چھوڑ رکھا تھا، اور خراسان میں کوئی عربی بولنے والا زندہ نہ چھوڑا جائے۔ (مروج الذہب:۳/۶۹) یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ امام ابراہیم ابومسلم خراسانی کو لکھ رہے ہیں کہ ''خراسان میں کوئی عربی بولنے والا زندہ نہ چھوڑا جائے۔'' یہ بات نقل کرنے والا ایک مؤرخ مسعودی ہے۔ معلوم نہیں امام ابراہیم کو عربی بولنے والوں سے اتنی نفرت کیوں تھی کہ وہ ایک پارسی نژاد نومسلم کو ان کے استیصال کی ترغیب دے رہے ہیں۔

جونہی یہ خط مروان کو حاصل ہوا تو مروان نے امام ابراہیم کو جو حمیمہ میں مقیم تھے گرفتار کر لیا اور ان سے عباسی تحریک کے بارے میں استفسار کیا گیا۔ انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا حالانکہ وہ اس بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔ مروان نے ان کے ہاتھوں کا لکھا ہوا خط پیش کر دیا اور قاصد سے شہادت دلوائی۔ اس وقت ابراہیم کوئی جواب نہ دے سکے کیونکہ ثبوت حاضر تھے۔ چنانچہ مروان نے ان کو قید کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ قید کے بعد فوراً انھیں قتل کروا دیا اور بعض روایات میں ہے کہ کچھ دنوں بعد قتل کیا گیا۔ بہرحال اس پر سب متفق ہیں کہ وہ قتل کر دیئے گئے۔

عباسیوں کا خروج:

امام ابراہیم گرفتار ہو گئے بلکہ قتل بھی ہو گئے۔ ان کے دونوں بھائی ابوجعفر عبداللہ بن علی اور ابوالعباس عبداللہ بن علی حمیمہ سے کوفہ چلے آئے کیونکہ حمیمہ میں انھیں اپنی گرفتاری کا ڈر تھا۔ کوفہ میں وہ تحریک عباسی کے ایک داعی ابومسلمہ خلال کے ہاں ٹھہرے۔ ابومسلم کو ان کے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ خراسان سے کوفہ چلا آیا کیونکہ ان دنوں وہ عباسی تحریک کا ''رئیس الدعاۃ'' تھا۔ چنانچہ اس نے ابوالعباس عبداللہ بن علی کے ہاتھ پر بیعت کر کے انھیں امام ابراہیم کا جانشین بنایا۔ یہ اپنے بھائی کے قتل سے بہت متاثر تھے۔ اب انھوں نے بھی ابراہیم بن علی کی طرح عربوں کو ختم کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ انھوں نے ابومسلم خراسانی کو حکم دیا کہ ''خراسان میں جو عرب ان کی دعوت قبول نہ کریں انھیں بے دریغ قتل کر دیا جائے۔'' ابوالعباس کا یہ حکم لے کر ابومسلم خراسان واپس آ گیا اور پورے خراسان کا دورہ کر کے ایک تاریخ مقرر کر دی کہ اس تاریخ کو بیک وقت پورے خراسان کے عباسی تحریک کے سارے اراکین اور داعی اٹھ کھڑے ہوں۔ گویا یہ ایک بغاوت تھی جو بنوامیہ کے خلاف کی جا رہی تھی، اور امام

Marfat.com

ابراہیم کے قتل کے غم میں سیاہ لباس عباسیوں کا نشان قرار دیا۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقررہ تاریخ کو ہرات، مروالزور، بوشخ، طالقان، مرو، ابیورو، طوس، نیشاپور، بلخ، صغانیان، طخارستان، اختلان، کش اور نسف وغیرہ کے سیاہ پوش عباسی تحریک کے ارکان اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے تھے جن کا نام ''کافر کوبات'' رکھا تھا، اور ایک لاکھ سے زیادہ انسان ابومسلم کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ لوگوں کا یہ سیلاب دیکھ کر نصر بن سیار گورنر خراسان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس وقت ربیعہ اور یمن کے قبائل اس کے ساتھ ہو گئے تو پھر ابومسلم کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس لیے ایک مرتبہ پھر اس نے ان دونوں قبائل کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔ چنانچہ عربی شعروں میں انھیں خط لکھا۔ ان شعروں کا ترجمہ یہ ہے:

① ربیعہ اور اس کے ساتھی (یمن) کو مرو میں یہ پیام پہنچا دو کہ وہ وقت آنے سے قبل جب کہ غصہ کوئی فائدہ نہ دے، ان کو غصہ آجائے۔

② تم لوگوں کو کیا ہو گیا کہ آپس میں جنگ کرتے ہو گویا کہ کوئی عاقل وخردمند اور ذی ہوش آدمی تم میں موجود نہیں۔

③ اور اس دشمن کو تم نے چھوڑ دیا جو تم پر چھا گیا ہے اور جس کا کوئی دین اور نسب نہیں۔

④ نہ تو وہ لوگ عرب ہیں جن کو ہم جانتے ہیں اور نہ وہ اپنی نسبت میں خالص موالی ہیں۔

⑤ ان کا دین ایسا ہے کہ نہ وہ رسول سے سنا گیا ہے اور نہ اس کو کوئی کتاب الٰہی لائی ہے۔

⑥ اگر کوئی ان کے دین کی اصل حقیقت کے بارے میں سوال کرے تو ان کا دین صرف یہ ہے کہ عرب برباد ہو جائیں۔

ابومسلم خراسانی کی چالاکی:

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا ہے کہ امام ابراہیم کا خط پکڑا گیا کہ ''خراسان میں کوئی عربی بولنے والا زندہ نہ چھوڑا جائے۔'' عربوں کے قتل کے بارے میں امام ابراہیم کے اس حکم کے بعد عباسی تحریک کی روح اور اس کی عرب دشمنی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ ان اشعار نے اس کی پوری پوری تشریح اور ترجمانی کر دی۔ اس وقت بعض عاقبت اندیش اور دانش مند عربوں کو اس کا احساس ہوا کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں۔ ہم تو خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں اور اپنی قبر خود کھود رہے ہیں۔ چنانچہ ایک عرب سردار یحییٰ بن نعیم بن ہبیرہ شیبانی کی کوششوں سے ابومسلم خراسانی کے مقابلہ کے لیے مضر، ربیعہ اور یمن میں ایک سال کے لیے عارضی صلح ہو گئی جو کہ ایک اچھا شگون تھا۔ (ابن اثیر: ۵/۱۳۷)

اس صلح سے ابومسلم پریشان ہو گیا کیونکہ عربوں کی صلح سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا تھا۔ اب اس کے ذہن میں صرف ایک ہی تدبیر تھی جس کو وہ کام میں لایا کہ قبل اس کے کہ عرب اتفاق واتحاد سے سر جوڑ کر بیٹھیں

Marfat.com

ان پر فوری طور پر حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور فوری طور پر عربوں کے مقابلہ میں آ گیا۔ عرب بھی اس کے مقابلہ کے لیے نکلے۔ عین میدان جنگ میں ایک عباسی داعی سلیمان بن کثیر نے جو کرمانی کے لڑکے علی کے مقابلہ میں تھا، اس کو ابو مسلم خراسانی کی جانب سے یہ پیام دیا کہ تمھاری غیرت نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ جس نے کل تمہارے باپ کو قتل کر کے سولی پر لٹکایا آج تم نے اس سے صلح کر لی۔ سلیمان بن کثیر کا یہ افسوں کارگر ثابت ہوا۔ علی بن کرمانی کی رگ جاہلیت پھڑک اٹھی اور اس نے نصر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ چھوڑتے ہی عربوں کا اتحاد جو عرب دانشور یحییٰ بن نعیم نے بڑی مشکل سے قائم کیا تھا، ختم ہو گیا۔ اس طرح علی بن کرمانی کی جہالت اور حماقت نے عربوں کے اس اتحاد کو خواب پریشان بنا دیا جس سے دشمن کو بہت فائدہ ہوا۔ اتحاد کے اس رشتے کے ٹوٹنے کے بعد پھر دونوں ابو مسلم کے سہارے کے محتاج ہو گئے۔ چنانچہ دونوں نے اس سے ملنے کی درخواست کی۔ ابو مسلم خراسانی کے اصل حریف مضر تھے کیونکہ اسے انہی سے زیادہ خطرہ تھا، اس لیے اس نے ربیعہ اور یمن کی درخواست کو قبول کر لیا اور مضر کا وفد ناکام واپس آ گیا۔ اس کامیابی کے بعد ابو مسلم کو عربوں کی جانب سے پورا اطمینان تھا اور اس نے اعلان بھی کر دیا کہ ''اب آئندہ عرب ہمارے خلاف متحد نہیں ہو سکتے۔'' (ابن اثیر: ۱۴۱/۵)

خراسان پر قبضہ:

ابو مسلم کو پہلے پورا یقین تھا کہ عربوں کا اتحاد اس کی شکست کا باعث ہو گا۔ جب عربوں کا اتحاد ٹوٹ گیا اور ربیعہ اور یمن ابو مسلم کے ساتھ مل گئے تو اب ابو مسلم کی عسکری طاقت نصر اور مضر کے مقابلہ میں زیادہ ہو گئی اور نصر بن سیار کمزور ہو گیا۔ اب ابو مسلم کے لیے خراسان پر قبضہ کرنا بہت آسان ہو گیا۔ چنانچہ اس نے علی بن کرمانی اور شبل بن طہان کو مرو پر فوج کشی کا حکم دیا۔ انھوں نے مرو پر حملہ کر دیا۔ نصر بن سیار کے پاس اتنی فوجی قوت نہ تھی کہ وہ ان تین متحد طاقتوں کا مقابلہ کر سکے، لیکن پھر بھی اس کے فوجیوں نے انھیں روکنے کی پوری پوری کوشش کی لیکن شکست کھائی۔ ابو مسلم نے مرو پر قبضہ کر کے عباسی حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ مرو پر قبضہ کے بعد ابو مسلم نے نصر کو عباسی دعوت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ نصر اب بالکل بے بس اور لاچار ہو چکا تھا، اس لیے وہ انکار نہ کر سکا اور زبانی وعدہ کر لیا ابو مسلم نے دوبارہ اس کے پاس لاہنط بن قریظ کو بھیجا۔ گو یہ ابو مسلم کا آدمی تھا لیکن عرب تھا۔ اس لیے نصر کی بے بسی دیکھ کر اسے اس پر رحم آ گیا۔ اس نے اس کو مرو سے بھاگ جانے کا اشارہ کر دیا۔ چنانچہ ابو مسلم رات کی تاریکی میں مرو کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔ ابو مسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے فوری طور پر نصر کے تمام معتمد علیہ اور ممتاز ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور نصر کے تعاقب میں آدمی دوڑائے لیکن وہ ہاتھ نہ لگا۔ جب وہ اس کی بازیافت سے مایوس ہو گیا تو اس نے نصر کے تمام ساتھی قتل کروا دیئے اور لاہنط بن قریظ کو بھی مضر کے فرار کرانے کے جرم میں قتل کر دیا۔

Marfat.com

مرو پر قبضہ کے بعد ابومسلم کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اب اسے نہ ربیعہ کی مدد کی ضرورت رہ گئی تھی اور نہ یمن کی۔ چنانچہ اس نے جلد ہی پہلے شیبان بن سلمہ حروری کو قتل کرایا اور پھر علی بن کرمانی سے درخواست کی کہ وہ اپنے خاص خاص سرداروں کے نام بتائے تاکہ انھیں حسن خدمات کے صلہ میں انعام و اکرام سے نوازا جائے۔ علی بن کرمانی نے ان کے نام بتا دیے۔ ابومسلم نے ان سب کو اور علی کو بھی گرفتار کر کے قتل کروا دیا۔ علی بن کرمانی کی یہ سب سے بڑی غلطی تھی جو اس نے عین میدان جنگ میں عرب اتحاد کو توڑا۔ اس نے ابومسلم خراسانی پر اعتماد کیا اور اس کو اپنا خیر خواہ سمجھا حالانکہ وہ مضر، یمن اور ربیعہ تینوں کا یکساں دشمن تھا۔ وہ عرب اتحاد کو توڑنے کے لیے عارضی طور پر ربیعہ اور یمن سے مل گیا تھا تاکہ نصر کو شکست دی جا سکے۔ چنانچہ جب اس نے مرو پر قبضہ کر کے نصر بن سیار کو شکست دے دی تو وہ اب ربیعہ اور یمن سے یک قلم بے نیاز ہو گیا اب وہ ان کو اپنے راستہ کے کانٹے سمجھنے لگا اور کانٹوں کو باقی رکھنا خلاف مصلحت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے کرمانی کے دونوں بیٹوں علی اور عثمان اور اس کے تمام ممتاز ساتھیوں کو قتل کرا دیا۔

نصر بن سیار بھاگ گیا اور چند مقامات کے علاوہ پورے خراسان پر ابومسلم کا قبضہ ہو گیا اور اس کے اکثر ساتھی بے یارومددگار ہونے کے باعث ابومسلم سے مل گئے۔ صرف ایک مختصر جماعت طوس چلی گئی۔ ابومسلم نے مفتوحہ علاقوں کا از سرنو انتظام کیا، اور زنباع بن نعمان ازدی کو سمرقند کا، خالد بن ابراہیم کو طخارستان کا اور محمد بن اشعث کو نصیبین کا والی بنایا، اور قحطبہ بن شبیب کو طوس اور سوز قان بھیجا۔ قحطبہ نے طوس پہنچ کر نصر بن سیار کے آدمیوں کو نکالا۔ اس کے بعد نصر کے لڑکے تمیم کے مقابلہ کے لیے سوز قان پہنچا اور اسے شکست دے کر قتل کیا۔ نصر اس وقت نیشاپور میں تھا۔ اسے تمیم کے قتل کی خبر ملی تو نیشاپور چھوڑ کر جرجان چلا گیا اور نیشاپور بھی ابومسلم کے قبضہ میں آ گیا۔ یہاں سے قحطبہ جرجان پہنچا اور بنانہ میں حنظلہ والیٔ جرجان کو قتل کر کے جرجان پر قبضہ کر لیا۔ (ابن اثیر: ۵/۱۴۴۔۱۵۰، اخبار الطوال: ص ۳۶۲)

عراق عجم پر قبضہ:

خراسان پر مکمل قبضہ ہونے کے بعد قحطبہ نے ابومسلم خراسانی کی ہدایات کے مطابق عراق عجم کا رخ کیا۔ خراسان کی فتح سے بنوامیہ بوکھلا اٹھے تھے اور حقیقت میں ان کے پاؤں اکھڑ چکے تھے ان کی فوج کے دلوں میں ایک ہیبت سی بیٹھ چکی تھی۔ اسی لیے ہر جگہ معمولی سی مزاحمت کے سوا اس کو ہر جگہ کامیابی ہوئی اور رے، اصفہان، نہاوند وغیرہ پر معمولی جنگوں کے بعد قبضہ ہو گیا۔ اور قحطبہ عراق کے ارادہ سے حلوان پہنچا اور ابوعون عبدالملک کو عثمان بن سفیان کے مقابلہ کے لیے شہرزور بھیجا۔ اس نے عثمان کو شکست دے کر شہرزور پر قبضہ کر لیا۔ مروان اس ملکی انقلاب اور ابومسلم کی ان کارروائیوں سے غافل نہ تھا۔ اس کے سامنے اب سب سے بڑا یہی

Marfat.com

مسئلہ تھا۔ وہ اس بارے میں ہر وقت فکر مند رہتا تھا کیونکہ اس کو ہر طرف سے بری خبریں آ رہی تھیں اور اسے اپنی حکومت لخت لخت ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اس وجہ سے اس کی راتوں کی نینداور دن کا عیش و آرام ختم ہو چکا تھا۔ اسی فکر و تردد میں اس نے اپنا سارا عیش و آرام ترک کر دیا تھا، لیکن اس کے پایہ تخت جزیرہ میں خوارج کی شورش ایسی بپا تھی کہ اس کو ابومسلم کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ قحطبہ کے حلوان پہنچنے کے بعد جب یہ سیلاب مروان کے سر پر پہنچ گیا اور اس کو اس درمیان میں خوارج سے بھی فرصت مل گئی، اس وقت وہ شام اور جزیرہ کی ایک لاکھ سے زیادہ فوج لے کر قحطبہ کے مقابلہ کے لیے آیا اور دریائے زاب کے ساحل پر آ کر خیمہ زن ہو گیا۔ (مروج الذہب: ۶۵/۳، ابن اثیر: ۱۵۰/۵)

ابوحنیفہ الدینوری کا بیان ہے کہ قحطبہ نے ابومسلم خراسانی کو مروان کی اس کارروائی کی اطلاع دی۔ اس نے قحطبہ کو لکھا کہ ابوعون کو تیس ہزار فوج دے کر مروان کے مقابلہ کے لیے بھیج دو اور تم خود ابن ہبیرہ والی عراق کے مقابلہ میں رہو اور اسے جنگ میں مصروف رکھو تاکہ وہ مروان کی مدد نہ کر سکے۔ ابومسلم کی اس ہدایت کے مطابق قحطبہ نے ابوعون کو مروان کے مقابلہ کے لیے بھیج دیا۔ شہرزور میں دونوں کا مقابلہ ہوا جس میں مروان کو شکست ہوئی۔ (اخبار الطوال: ص ۳۶۳) لیکن ہمارے خیال میں دینوری کا یہ بیان درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ پہلے قحطبہ اور ابن ہبیرہ کے درمیان جنگ ہوئی اور اس نے عراق پر قبضہ کر لیا۔ مروان کا مقابلہ بالکل آخر میں ہوا جس میں اموی حکومت کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

اب شہر پر شہر فتح ہو رہے تھے۔ ابن ہبیرہ کو بھی خطرہ تھا کہ ابومسلم کے جرنیلوں کا ادھر بھی رخ ہو گا لہٰذا وہ پہلے سے مقابلہ کے لیے تیار تھا، اور اس کے حلوان کے قیام کے زمانہ میں وہ ابن حوثرہ باہلی کے ساتھ جسے مروان نے اس کی مدد کے لیے بھیجا تھا، قحطبہ کے مقابلہ کے لیے نکل چکا تھا۔ قحطبہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی کوفہ کی طرف چل پڑا۔ ابن ہبیرہ نے امیر حوثر اور محمد بن نباتہ کو اسے روکنے کے لیے آگے بھیجا۔ جباریہ کے قریب دونوں کا مقابلہ ہوا۔ حوثرہ اور ابن نباتہ کو اسے روکنے کے لیے آگے بھیجا۔ جباریہ کے قریب دونوں کا مقابلہ ہوا۔ حوثرہ اور ابن نباتہ کو شکست ہوئی اور وہ دونوں ابن ہبیرہ کے پاس لوٹ گئے۔ ان دونوں کی شکست سے ابن ہبیرہ کی ہمت کچھ ایسی ٹوٹی کہ وہ راستہ ہی سے واپس لوٹ گیا۔ یہ ابن اثیر: ۱۵۰/۵، کا بیان ہے لیکن یعقوبی کا بیان ہے کہ خود ابن ہبیرہ اور قحطبہ میں جنگ ہوئی تھی۔ (یعقوبی: ۱۱۴/۲)

اس واقعہ کی اطلاع مروان کو پہنچی کہ قحطبہ ابن ہبیرہ کو شکست دینے کے بعد خود لاپتہ ہو گیا ہے۔ ہوا یہ کہ وہ جنگ کے ہنگامہ میں نامعلوم طریقہ سے دریا میں ڈوب گیا اور بعد میں اس کی لاش ملی۔ مروان کو جب قحطبہ کے ڈوبنے اور ابن ہبیرہ کی پسپائی کی اطلاع ہوئی تو اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا جس کو یعقوبی نے نقل کیا ہے:

''یہ ادبار اور نکبت کی آخری حد ہے کہ زندہ مردہ کے مقابلہ میں پسپا ہو گیا۔'' (یعقوبی: ۱۱۲/۴)

قحطبہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا حسن بن قحطبہ اس کا جانشین مقرر کیا گیا۔

Marfat.com

امیر خالد بن عبداللہ قسری کا لڑکا جو اپنے والد کے قتل کی وجہ سے مضر اور بنی امیہ کا دشمن تھا، کوفہ میں مقیم تھا۔ ابن ہبیرہ کی شکست اور عراق میں بنو امیہ کی قوت کمزور دیکھ کر عباسی داعی بن گیا اور کوفہ سے اموی امیر زیاد بن صالح کو نکال کر حسن بن قحطبہ سے اس کی حکومت کا پروانہ حاصل کر لیا۔

ابوالعباس عبداللہ بن علی کی بیعت:

امام ابراہیم کے قتل کے بعد ان کے دونوں بھائی ابوالعباس عبداللہ بن علی اور ابوجعفر عبداللہ بن علی کوفہ میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ یہاں آ کر وہ تحریک عباسی کے داعی ابوسلمہ خلال کے ہاں اقامت پذیر تھے۔ کوفہ پر محمد بن خالد کے قبضہ کے بعد عباسی داعیوں نے ربیع الاول سنہ ۱۳۲ھ میں ابوالعباس عبداللہ بن علی کے ہاتھوں پر بیعت کر کے ان کو خلیفہ بنا دیا۔ چنانچہ اس نے عباسی خلیفہ کی حیثیت سے کوفہ کی جامع مسجد میں پہلا خطبہ دیا۔
(معارف ابن قتیبہ، یعقوبی: ۴۱۳/۲)

مروان کا قتل:

جب کوفہ کی جامع مسجد میں ابوالعباس عبداللہ بن علی اپنا پہلا خلافتی خطبہ دے رہا تھا، اس وقت اموی خلیفہ مروان دریائے زاب کے کنارے ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد میں فوج لے کر مقیم تھا۔ خلافت کی بیعت لینے کے بعد ابوالعباس نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کو اس کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ جمادی الآخرۃ سنہ ۱۳۲ھ میں عبداللہ اور مروان کے مابین دریائے زاب کے کنارے زبردست جنگ ہوئی۔ مروان کی فوج ہمت اور بہادری میں کم نہ تھی اور اس نے بڑی شجاعت اور پامردی سے مخالف فوج کا مقابلہ کیا، لیکن ایک طرف عباسیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور فاتحانہ ولولے تھے اور دوسری طرف ایک ایسی حکومت کی فوج تھی جس کی حکومت کا چراغ ''چراغ سحری'' اور ستارہ زوال پذیر اور اس کا سپہ سالار مخالف طاقتوں میں گھرا ہوا اور تھکا ہوا تھا، اس لیے اس زبردست جنگ میں اس کو زبردست شکست ہوئی اور دریائے زاب کے کنارے بنی امیہ کی قسمت کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا اور اس کی حکومت کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اموی فوج اس بدحواسی اور بے ترتیبی سے پیچھے ہٹی کہ اس کا ایک بڑا حصہ دریائے زاب میں ڈوب گیا۔ اموی خاندان کے قریباً تین سو آدمی دریا میں غرق ہوئے۔ (یعقوبی: ۴۱۵/۲، مروج الذہب: ۱۷/۳)

مروان کی قوت تو پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی کیونکہ اموی حکومت میں ایک انقلاب آ چکا تھا۔ ابومسلم خراسانی نے اموی خلافت کے خلاف وہ کام کیا جو تحریک عباسی کے سارے داعی مل کر بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ عجمی پارسی نژاد معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آباء و اجداد کا انتقام عربوں سے لے رہا تھا، اور امام ابراہیم بھی اپنی خلافت قائم کرنے کے لیے اسے یہ حکم دے رہے تھے کہ ''خراسان میں کوئی عربی بولنے والا زندہ نہ چھوڑا

Marfat.com

جائے،، معلوم نہیں انھیں عربوں سے کیا بیر تھا۔ غرض کہ اس شکست فاش نے مروان کی قوت بالکل توڑ دی اور وہ موصل لوٹ گیا۔ عبداللہ بن علی نے اس کا تعاقب کیا، اس لیے مروان موصل میں نہ ٹھہر سکا۔ وہ حران ہوتا ہوا شام چلا گیا۔ عبداللہ نے یہاں بھی اس کا تعاقب کیا اور موصل اور حران پر قبضہ کرتا ہوا شام پہنچا۔ ایسی سیاہ بختی کے موقع پر اہل شام نے بھی مروان سے بے وفائی اور غداری کی بلکہ اسے شکستہ حال دیکھ کر اہل حمص نے لوٹنے کی کوشش کی۔ اس لیے اسے شام کو بھی خیر باد کہنا پڑا اور وہ حمص، دمشق اور فلسطین سے ہوتا ہوا مصر پہنچ گیا۔

مروان کے تعاقب میں عبداللہ بن علی حمص اور فلسطین پہنچا۔ چونکہ ان لوگوں نے مروان کو پناہ نہیں دی تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اب عباسی تحریک کے حامی ہو گئے تھے لہٰذا ان دونوں شہروں پر عبداللہ بن علی نے بآسانی قبضہ کرلیا اس کے دمشق پہنچنے پر معاویہ بن ولید نے مزاحمت کی لیکن عبداللہ نے محاصرہ کر کے اس کو بھی فتح کرلیا۔ اب اس نے یہاں سے مروان کے تعاقب میں مصر کا رخ کیا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اس نے اپنے بھائی صالح اور ابوعون کو مروان کے تعاقب میں بھیج دیا اور خود واپس لوٹ آیا۔

مصر پہنچ کر مروان بوصیر کے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا کہ صالح اور ابوعون بھی پہنچ گئے۔ مروان نے اپنی مختصر جماعت کے ساتھ ان دونوں کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور مارا گیا۔ دینوری کا بیان یہ ہے کہ وہ اس جنگ میں نہیں مارا گیا تھا بلکہ نیل کو عبور کرتے ہوئے مغرب کی جانب نکل جانا چاہا کہ ابوعون کا ایک آدمی پہنچ گیا۔ مروان پر سفر کی تکان اور بے خوابی کے باعث غنودگی طاری ہوگئی تھی اس وجہ سے اس شخص نے حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا اور اس کے قتل کے بعد ذی الحجہ سنہ ۱۳۲ھ میں اموی حکومت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

(اخبار الطوال: ص ۳۶۴)

قتل کے وقت مروان کی عمر ۶۲ سال تھی۔ مدت خلافت پانچ سال اور دس ماہ۔ مروان کا پورا زمانہ خلافت شورش و انقلاب اور جنگ و جدال میں گزرا، اس لیے اس کے دور خلافت میں بنو امیہ کے زوال اور خاتمہ کی روداد کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہے۔ وہ قریباً چھ سال اپنی مخالف قوتوں ہی سے لڑتا رہا اور بالآخر خود بھی ختم ہو گیا اور اموی حکومت بھی ختم ہوگئی۔ جس زمانہ میں نصر بن سیار اور کرمانی کے مابین جنگ ہو رہی تھی۔ اس زمانہ میں ابومسلم خراسانی اپنی جمعیت کو لے کر دونوں لشکروں کے درمیان خیمہ زن ہو گیا۔ اس وقت نصر ابومسلم کی پالیسیوں کو سمجھ گیا تھا اور اس نے ان اشعار کے ذریعہ مروان کو اطلاع دی۔

ارنی بین الرماد ومیض نار ۔۔۔ واخشی ان یکون لها ضرام

مجھے راکھ میں چنگاریاں چمکتی نظر آتی ہیں اور ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ بھڑک نہ اٹھیں۔

فان النار بالعودین یذکی ۔۔۔ وان الحرب مبدأه کلام

آگ دو لکڑیوں سے سلگائی جاتی ہے اور لڑائی کی ابتداء گفتگو سے ہوتی ہے۔

فقلت من التعجب لیت شعری ۔۔۔ أأیقاظ امیته ام نیام

Marfat.com

میں نے تعجب سے کہا کاش مجھے معلوم ہوتا کہ بنوامیہ جاگ رہے ہیں یا سو رہے ہیں۔

اس وقت اگر کچھ تدارک کیا جاتا تو شاید بنوامیہ کی حکومت اور کچھ عرصہ قائم رہتی لیکن بنوامیہ اس وقت سو رہے تھے اور انھوں نے ابومسلم کے فتنہ کا کوئی تدارک نہ کیا۔

مروان بن محمد بنوامیہ کا آخری خلیفہ تھا، اس لیے عام طور پر خلافت بنوامیہ کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار اسی کو سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنوامیہ کے زوال اور اس کی بربادی کا سامان اس کے پیش روؤں کی غفلت کا نتیجہ تھا۔ مروان نے صرف پانچ سال دس ماہ حکومت کی۔ اس مدت میں ایک روز بھی اسے چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا بلکہ اس نے ساری مدت خلافت گھوڑے کی پشت پر ہی بسر کی۔ جب خلافت اس کے ہاتھ میں آئی تو وہ ناقابل علاج امراض میں مبتلا تھی۔ وہ ویسے بھی کوئی غیر معمولی عالی دماغ اور عقل مند انسان نہ تھا کہ ایک قریب الموت سلطنت میں از سر نو جان ڈال دیتا۔ اس کے عہد خلافت میں پوری مملکت اسلامیہ کے اندر ہر طرف تلواریں چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کسی متنفس کو چین نصیب نہ تھا۔ غرض کہ اموی سلطنت کا اختتام مروان کے قتل پر ہو گیا جو ۲۸ ذی الحجہ سنہ ۱۳۲ھ میں ہوا۔ اب یہی کہنا پڑتا ہے:

﴿قل اللهم مالك الملك توتى الملك من تشاء و تنزع الملك ممن تشاء
وتعز من تشاء وتذل من تشاء بيدك الخير، انك علىٰ كل شى ء قدير﴾

Marfat.com

اموی دور پر ایک نظر

خلفائے راشدین کے دور کے بعد اموی دور خلافت شروع ہوتا ہے۔ یہ دور اگرچہ خلفائے راشدین کے دور کی طرح بلند اور اعلیٰ درجہ کا نہیں تھا لیکن خلافت راشدہ کے بعد ان سے بہتر دور ابھی تک اور کوئی دور نہیں آیا۔ یہ درست ہے کہ خلفائے بنو امیہ خلفائے راشدین کے صحیح جانشین نہیں تھے کیونکہ خلافت راشدہ حقیقی معنوں میں ایک اسلامی حکومت تھی اور فاتحانہ سرگرمیوں کے ساتھ وہاں عدل و انصاف بھی تھا۔ عدل و انصاف یہاں بھی تھا لیکن اس پایہ کا نہیں جس پایہ کا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ان کی رعایا ویسی نہ تھی جیسی ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی رعایا تھی۔ دوسری وجہ زمانہ کے نشیب و فراز بھی تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نبوت کے بالکل قریب کا زمانہ تھا، جوں جوں زمانہ نبوت کے زمانہ سے دور ہوتا گیا نبوت کے انوار و تجلیات سے اتنا مستنیر نہ رہا۔ اور یہ ایک قدرتی فطری بات تھی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس قدر فتنے نہ تھے۔ وہ تن تنہا دور دور کے سفر کرتے کوئی ان کا محافظ اور باڈی گارڈ نہ ہوتا تھا، کوئی ان پر حملہ آور نہ ہوتا تھا، لیکن جونہی خوارج کا فتنہ نمودار ہوا خلفاء پر حملے ہونے شروع ہو گئے لہٰذا ان کو اپنی حفاظت کے لیے باڈی گارڈ رکھنے پڑے، ایک عام آدمی پس منظر نہ سمجھتے ہوئے یہ کہہ اٹھتا ہے کہ اموی خلفاء میں وہ سادگی نہ رہی تھی، اور دامن بے جا تمدنی تکلفات سے پاک نہ تھا۔ اگرچہ خلفائے اربعہ کے زمانہ میں فتوحات کی کثرت سے اموال کی بہت فراوانی ہوگئی اور افراط زر کے باعث مدینہ میں ایک گھوڑے کی قیمت ایک لاکھ روپے تک پہنچ گئی تھی۔ صحرائے عرب میں دولت کے گنگا جمنی دریا بہنے لگے۔ قیصرو کسریٰ کے خزانے کھنچ کھنچ کر مدینہ طیبہ کی گلیوں میں آ گئے، لیکن مسلمانوں کی سادگی میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ لیکن کچھ نہ کچھ فرق ضرور آیا جس کو دیکھ کر سیدنا ابوذر غفاری زمانۂ نبوت کو یاد کر کے روتے تھے اور آخر کار ربذہ میں جا کر اپنی زندگی کے ایام گزارے لیکن خلفاء کی اپنی زندگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ امیر المؤمنین کے جسم پر پیوند لگا کرتہ ہوتا اور غذا میں جو کی روٹی جو روغن زیتون یا پانی کے گھونٹوں سے پیٹ میں اتار لی جاتی۔ دربار کے لیے کوئی قصر اور محل نہیں تھا صرف ایک مسجد تھی جو کھجور کے ستونوں اور پتوں سے بنی ہوئی تھی اور حالت یہ تھی کہ بارش اگر کبھی ایک گھنٹہ ٹپکتی تو مسجد دو گھنٹے ٹپکتی۔ اسی مسجد میں جلیل القدر اصحاب شوریٰ کی میٹنگ ہوتی اور اسی جگہ

Marfat.com

بیٹھ کر تمام مفتوحہ علاقوں کا انتظام کیا جاتا۔ اس عہد کے خاتمہ کے بعد جو حکومت قائم ہوئی اس میں یہ سادگی مفقود تھی جس میں کچھ حالات اور وقت کے انقلاب کا بھی حصہ تھا۔ اگرچہ خلفائے بنی امیہ میں خلافت راشدہ کی طرح اسلامی روح نہ تھی لیکن پھر بھی عربوں کی تمام خصوصیات کے ضرور حامل تھے بلکہ انھوں نے اس کے تحفظ کا کلی لحاظ رکھا اور بقول علامہ ابن خلدون ان میں عربی عصبیت پوری طرح موجود تھی۔

بنوامیہ کا دارالخلافہ دمشق (شام) رومیوں کا ملک تھا۔ مسلمان اس سے متاثر ہوتے لیکن پھر بھی وہ بچے رہے۔ ان پر ان کے تمدن اور تہذیب کا غلبہ نہ ہونے پایا، بلکہ اپنا اثر ڈالا۔ اس کے برعکس بنی عباس عجمی تمدن سے بہت زیادہ اثر پذیر ہوئے۔ بنوامیہ نے عربی خصوصیات کو بڑی حد تک برقرار رکھا۔

امور حکومت کے زوال کے اسباب:

بنوامیہ کی حکومت صرف سو سال رہی۔ ایک خاندان کے لیے حکومت کا یہ عرصہ کوئی زیادہ نہیں ہے۔ اس حکومت کے اتنی جلدی زوال کے اسباب مؤرخین نے یہ لکھے ہیں:

(۱) کہتے ہیں کہ اس کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ تھا کہ اسلامی خلافت کو موروثی بنا دیا گیا۔ اس وجہ سے اس میں شخصی حکومت کی تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ اس حکومت کے بانی اگرچہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ تھے، لیکن وہ صحابی رسول ﷺ تھے، اس لیے شخصی حکومت کے قیام کے باوجود انھوں نے اس کو جادۂ شریعت پر قائم رکھنے کی پوری کوشش کی اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی رہے، لیکن ان کے جانشین اس روش کو قائم نہ رکھ سکے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور میں اس کی اصلاح وتجدید کی، لیکن ان کے انتقال کے بعد پھر وہی پرانی روش اور غیر شرعی نظام جاری ہو گیا۔ مسلمان اس نظام کے عادی نہ تھے۔ ان کے سامنے خلافت راشدہ کا نمونہ تھا۔ اس وجہ سے اموی حکومت خواص کے دلوں میں جگہ پیدا نہ کر سکی۔

ہمارے خیال میں خلافت کا موروثی ہونا اتنا بڑا سبب نہیں ہے کیونکہ بنوعباس کی خلافت کئی سو سال تک چلی۔ لہٰذا یہ بات ان کے زوال کا اہم سبب نہیں ہو سکتی۔

(۲) یزید کے زمانہ میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بھی لوگوں کے دلوں میں اموی حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی حالانکہ اس میں یزید سے زیادہ عبیداللہ بن زیاد کا دوش تھا۔ پھر اس کے بعد ان کے گورنروں کے جبر نے لوگوں کے دلوں نفرت کی تخم ریزی کی۔

(۳) شیعہ اور خارجی دونوں ہی بنوامیہ کے سخت خلاف تھے۔ اگرچہ ان دونوں کا مسلک الگ الگ تھا لیکن بنوامیہ کی مخالفت میں یہ دونوں متحد تھے۔ چنانچہ اموی حکومت کے تمام خلفاء کے زمانہ میں عراقیوں اور خوارج نے ان کو پریشان حال رکھا یہاں تک کہ آخری خلیفہ مروان بھی پانچ سال تک خوارج کے

Marfat.com

خلاف ہی لڑتا رہا اور دوسرے تمام محاذوں پر خوارج سے جنگ کی مشغولیت کے باعث وہ، اپنے جرنیلوں کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عباسی تحریک کو پوری مملکت اسلامیہ پھلنے پھولنے اور اپنے پاؤں جمانے کا موقع مل گیا۔

④ اموی حکومت کے بعض عمال نے بعض خواص امت پر کچھ سختیاں بھی کیں اور انھوں نے انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ان کی مخالفت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ان لوگوں نے بھی بعض تحریکوں میں حصہ لیا۔

⑤ شیعان علی جن کا مرکز عراق تھا انھوں نے بھی بنی امیہ کی حکومت گرانے میں بھرپور حصہ لیا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت میں حالانکہ ان کے شیعہ ہی شریک تھے، لیکن حکومت بنوامیہ کی تھی لہٰذا ان کی شہادت کے بعد اپنی بے وفائی اور غداری کے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے انھوں نے بنوامیہ کے خلاف خوب پراپیگنڈہ کیا اور توابین کا جامہ اوڑھ کر اموی حکومت کے مقابلہ میں آ گئے، اور عام مسلمانوں کے دلوں میں بنوامیہ کے خلاف جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ عجمیوں اور عراقیوں کی عرب دشمنی کے باعث سرزمین عراق میں شیعی تحریک کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ پھر اسی تحریک نے بعد میں عباسی دعوت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ انھوں نے ہر ممکن طریقہ سے اموی حکومت کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔

⑥ ولی عہدی نظام اگرچہ کسی حد تک اموی حکومت کے زوال کا سبب بنا لیکن اس ولی عہدی نظام سے زیادہ خرابی اس وجہ سے آئی کہ ایک وقت میں یکے بعد دیگرے ایک سے زیادہ ولی عہدوں کی نامزدگی کو بڑی خرابی کہتے ہیں کیونکہ پہلا ولی عہد تخت نشینی کے بعد اپنے بعد کے ولی عہد کو جو اکثر و بیشتر اس کا بھائی ہوتا تھا، محروم کر کے اپنے لڑکے کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا، اس سے ایک تو خاندان میں باہمی نفرت کی خلیج پیدا ہو جاتی اور دوسرے عمائدین حکومت میں گروہ بندی ہو جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بعد میں ہونے والا خلیفہ اپنے مخالف امراء اور عمائدین سے انتقام لیتا تھا اور اموی حکومت ان کے خاندان اور اعزاء و اقرباء سے محروم ہو جاتا تھا۔

⑥ ایک سبب مؤرخین نے یہ بتایا ہے کہ ارا کین سلطنت کی ناقدردانی اور ان کے ساتھ خلفاء کی بدسلوکی تھی جو اموی حکومت کے ستون ہوتے تھے۔ جب کسی عمارت کے ستون ہی مجروح ہو جائیں تو وہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی جیسے موسیٰ بن نصیر سلیمان بن عبدالملک کے عتاب کا شکار ہوا اور یزید بن عبدالملک نے آل مہلب کا خاتمہ کر دیا حالانکہ اس خاندان کی اموی حکومت میں بڑی خدمات تھیں۔

⑦ ہمارے خیال میں سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اموی حکومت میں عدنانی، قحطانی، مضری اور یمنی قبائل کا باہمی تعصب اور ان کی خانہ جنگی تھی۔ اموی حکومت کا دارومدار زیادہ تر یمنی قبائل پر تھا۔ اس نے

Marfat.com

اموی حکومت کے ابتدائی دور میں ان کو بڑا عروج ہوا، ان میں ایک مہلب بن ابی صفرہ والی خراسان کا گھرانا تھا۔ یہ بڑا نامور قحطانی سردار، شان وشکوہ اور بڑے دبدبہ والا امیر تھا۔ یہ گھرانا تدبر و شجاعت کے ساتھ ساتھ علم دوست اور شرفاء نواز تھا۔ سوء اتفاق سے یزید بن مہلب اور یزید بن عبدالملک کے درمیان کچھ اختلاف ہو گیا۔ اس اختلاف نے اتنی وسعت اختیار کر لی کہ یزید نے پورے گھرانے کو نہایت بے دردی سے ختم کر دیا۔ اس اختلاف میں قبائلی تعصب کا بھی بڑا تعلق تھا۔ غرض کہ قبائلی تعصب کو اموی حکومت کے زوال میں بہت دخل ہے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے عوام الناس اموی حکومت سے مرعوب اور خوف زدہ ہو گئے۔ اب ہاشمیوں کے لیے تلوار کے استعمال اور طاقت کے اظہار کا کوئی موقع باقی نہ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے جوش انتقام کے لیے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا اور ان کارروائیوں سے فائدہ اٹھایا جو وہ عبداللہ بن سباء اور اس کے اتباع اور پیروکاروں کی دیکھ چکے تھے۔ ہاشمیوں میں اس وقت صرف دو ہی گھرانے مقتدا مانے جاتے تھے۔ ایک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اولاد اور دوسرے سیدنا عباس بن عبدالمطلب کی اولاد۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ اہل بیت نبوت میں شامل ہونے کے باعث ان دونوں گھرانوں کی عظمت و سیادت سب کو تسلیم تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کو چونکہ بنو امیہ کے مقابلہ میں براہ راست مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، اس لیے عباسیوں کی نسبت علویوں میں زیادہ جوش تھا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد فاطمیوں میں زیادہ جوش ہونا چاہیے تھا کہ سیدنا زین العابدین نہایت خاموش زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اور وہ خلافت اور سیاست کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ فروع کافی اور دوسری شیعہ اور سنی کتابوں کی رو سے انھوں نے یزید بن معاویہ کی بیعت کر کے مدینہ طیبہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ علویوں میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد کو خلافت کا حق دار سمجھتے تھے اور ایک وہ جو محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ مستحق خلافت تصور کرتے تھے۔ تیسرا گروہ عباسیوں کا تھا۔ سب سے زیادہ طاقتور گروہ فاطمیوں کا تھا کیونکہ اس کے ساتھ کربلا میں شہادت کا واقعہ پیش آیا تھا، اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہونے کے ناطے عوام الناس کی ہمدردیاں زیادہ تر ان کے ساتھ تھیں۔ دوسرا گروہ محمد بن حنفیہ کا تھا۔ پھر فاطمیوں کے اندر بھی دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ کے حامی تھے اور وہ زیدی کہلاتے تھے۔ دوسرے وہ جنھوں نے اسماعیل بن جعفر صادق کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، وہ اسماعیلی کہلاتے تھے۔ لیکن عباسی اور دوسرے تمام علوی گروہ بنو امیہ کی مخالفت میں متفق تھے۔ محمد بن محمد حنفیہ کی کوششوں اور مختار کی کوفہ میں کارروائیوں کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ علویوں نے جب کبھی تھوڑا سا بھی موقعہ ملا انھوں نے خروج کرنے میں تامل نہیں کیا لیکن قریباً خروج کرنے والے ناکام ہی رہے۔ ان ناکامیوں کے باوجود ان لوگوں نے اپنی کارروائیوں اور کوششوں کو بڑی احتیاط اور مآل اندیشی کے ساتھ جاری رکھا۔ ان

Marfat.com

تینوں گروہوں کی راہ عمل یہ تھی کہ پوشیدہ طور پر لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا جائے اور مخفی طور پر لوگوں سے بیعت لی جائے تا آنکہ بنوامیہ کے مقابلے اور مقاتلے کے قابل طاقت فراہم ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مشنری اور داعی پورے ملک میں پھیلا دیئے۔ ان تینوں گروہوں کو ایک دوسرے کی سرگرمیوں کا علم تھا، اور چونکہ تینوں گروہوں کی دشمنی کا ہدف ایک تھا اس لیے ان تینوں کے اندر آپس میں کوئی رقابت نہ تھی۔ بلکہ ایک دوسرے کے رازوں کو افشا ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے داعی اور نقیب اگرچہ جدا جدا تھے لیکن تبلیغ ودعوت کے لیے ان کو ایسے الفاظ استعمال کرنے کی تاکید کی گئی تھی، جس سے دوسرے گروہ سے تصادم پیش نہ آئے، مثلاً سیدنا عباس رضی اللہ عنہ یا سیدنا محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ یا سیدنا زین العابدین کا نام لینے کے بجائے اہل بیت کا ایک عام لفظ استعمال کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ اصل خلافت کے مستحق اہل بیت ہیں۔ ان گروہوں نے بنوامیہ کی مخالفت میں خارجیوں کے ساتھ بھی اتحاد کر لیا جن کے نزدیک ساری امت کافر تھی اور ساری امت کے نزدیک وہ مغضوب اور مطعون تھے، اور جس طرح اموی خلافت کے دشمن تھے اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کے بھی مخالف تھے۔ اس خفیہ اشاعت کے کام میں علویوں سے بار بار جلد بازی کا ارتکاب ہوا اور وہ زیادہ خوبی کے ساتھ اس کام کو انجام نہ دے سکے، لہٰذا خلفائے بنوامیہ کو علویوں کی کارروائیوں اور سازشوں کا علم ہوتا رہا اور وہ ان کے خلاف انسدادی کارروائیوں کا موقع بھی پاتے رہے لیکن عباسیوں کی سازش سے خلفائے بنوامیہ آخر تک بے خبر رہے اور اسی لیے عباسیوں نے علویوں کو پیچھے چھوڑ کر کامیابی حاصل کر لی۔

عباسیوں نے اپنی دعوت کا مرکز کسی بڑے شہر کو نہیں بنایا بلکہ ایک نہایت غیر معروف گاؤں حمیمہ جو بنو امیہ کی عطا کردہ جاگیر اور دمشق اور مدینہ کے درمیان واقع تھا اور دمشق کے ارباب اقتدار کی توجہ سے محفوظ تھا، اپنی قیام گاہ اور مرکز سازش بنایا۔ علویوں کی کوششیں اور سازشیں چونکہ طشت از بام ہوتی رہیں، لہٰذا وہ بار بار قتل ہوتے رہے، لیکن بنوعباس اس قسم کے نقصانات سے محفوظ رہے، اور ان کی سازش کی رفتار ترقی معتدل رفتار سے برابر جاری رہی۔ اس رفتار ترقی میں بہت بڑی طاقت اس لیے پیدا ہو گئی کہ محمد بن حنفیہ کی جماعت تمام و کمال بنوعباس کے ساتھ شامل ہو کر ایک جماعت بن گئی یعنی ابو ہاشم بن محمد نے اپنے تمام حقوق محمد بن علی عباسی کو حمیمہ میں فوت ہوتے وقت تفویض کر دیئے اور ان لوگوں کو جو ابو ہاشم کی خلافت کے لیے کوشش کر رہے تھے، تاکیدی نصیحت کی کہ آئندہ محمد بن علی کے زیر فرمان کوشش کریں اور محمد بن علی کو اپنا پیشوا مانیں۔ علویوں کا جب ایک زبردست گروہ عباسیوں میں شامل ہو گیا تو عباسیوں نے پہلے سے زیادہ ہمت کے ساتھ باقاعدہ کوششیں شروع کر دیں اور قریباً سازش کنندوں کی سیادت عباسیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ محمد بن علی عباسی اس زبردست جماعت کے لیڈر تھے۔ جب ان کا انتقال سنہ ۱۲۴ھ میں ہوا تو ان کے بیٹے ابراہیم ان کے جانشین ہوئے۔ امام ابراہیم نے اس سازش کو پہلے سے زیادہ وسیع اور باقاعدہ اصولوں پر قائم کر کے ہر ایک علاقہ کے لیے الگ الگ موزوں داعی مقرر کیے اور نہایت نظم وترتیب کے ساتھ خراسان، عراق، فارس، شام اور حجاز وغیرہ صوبوں میں

Marfat.com

اپنی تحریک کا ایک جال بچھا دیا۔ امام ابراہیم کی خوش قسمتی سے انہیں ایک ایسا شخص مل گیا جس نے آئندہ چل کر بہت جلد اس سازش کو کامیابی تک پہنچانے کا تمام کام اپنے ذمہ لے لیا، وہ شخص ابو مسلم خراسانی تھا۔ ابو مسلم خراسانی کو عراق اور خراسان کے تمام داعیوں کا سردار بنا کر سب داعیوں کو اس کی ماتحتی میں دے دیا۔ ابو مسلم خراسانی نہایت ہوشیار اور عقل مند اور سازشی ذہن کا مالک تھا، اس نے عباسی تحریک کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دی، اور چند ہی روز میں تحریک عباسی نہایت طاقتور ہوگئی۔ امام ابراہیم کی وفات کے بعد ابو مسلم خراسانی کو خراسان میں قوت واقتدار حاصل ہونے لگا تو ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۰ھ میں عباسیوں اور علویوں کے خیر خواہوں اور ان سازشی کارروائیوں میں حصہ لینے والوں نے خاص خاص سربرآوردہ اراکین کو جب کہ وہ حج کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے، ایک مکان پر اکٹھا کیا اور یہ مسئلہ ان لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ بنوامیہ کی حکومت کی بربادی اور خلافت کو ان کے قبضہ سے نکالنے کے لیے جو تحریک کئی سالوں سے جاری تھی، وہ عنقریب کامیابی اور کامرانی سے ہم کنار ہونے والی ہے، لہٰذا یہ بات ابھی سے طے پا جانی چاہیے کہ خلیفہ کس کو بنایا جائے گا۔ اس مجلس میں ابوالعباس عبداللہ سفاح کا بھائی ابو جعفر منصور بھی موجود تھا، اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے بھی چند حضرات موجود تھے۔ ابو جعفر منصور نے بلاتوقف جواب دیا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہیے۔ تمام حاضرین مجلس نے اس بات کو پسند کیا کیونکہ حق بھی انہی کا بنتا ہے۔ انھوں نے اس کے لیے قربانیاں بھی بہت دی تھیں۔ چنانچہ مجلس کی اتفاق رائے سے عبداللہ بن حسن بن علی جو نفس ذکیہ کے لقب سے مشہور تھے، خلیفہ منتخب کیا گیا۔ یہ نہایت ہی نازک موقع تھا کیونکہ بنوامیہ کی حکومت کمزور اور مضمحل کرنے اور خراسان پر ابو مسلم کے قابض ہو جانے میں سب سے زیادہ دخل اس بات کو تھا کہ شیعان علی اور شیعان بنو عباس دونوں مل کر کام کر رہے تھے اور متفقہ طاقت کے ساتھ مصروف عمل تھے۔ اس مجلس میں اگر بنو عباس اور علویوں میں اختلاف ہو جاتا تو مکہ سے لے کر خراسان کے آخری سرے تک تمام علاقے میں اختلاف کی ایک لہر ایسی سرعت کے ساتھ دوڑ جاتی کہ پھر اس کو کوئی نہ روک سکتا اور بنوامیہ کی مردہ خلافت میں از سر نو جان پڑ جاتی، لیکن ابو جعفر منصور کی ہوشیاری اور دانشوری نے اس موقع پر ایسا کام کیا کہ شیعان علی پہلے سے زیادہ جوش اور طاقت کے ساتھ اموی خلافت کو ختم کرنے میں مصروف ہوگئے، اور ان کی یہ تمام کوششیں عباسیوں کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔

Marfat.com

اموی دور میں علمی ترقی

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اموی دور خلافت علم وفن سے خالی تھا لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اگرچہ دینی علوم کی بنیاد عہد رسالت مآب ﷺ کے زمانہ ہی میں پڑ گئی تھی۔ پھر خلافت راشدہ میں ان علوم کی ترقی ہوئی، اس کے بعد اموی دور میں بھی تابعین اور تبع تابعین نے علوم نبوت کو صبح وشام ترقی دی اور پوری مملکت اسلامیہ میں اس کو پھیلایا۔ ان علوم کو مدون بھی کیا۔ البتہ غیر قوموں کے علوم کی جانب عباسی دور میں توجہ ہوئی۔ اموی دور میں قرآن وسنت کے علوم کو نہایت ترقی دی گئی۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ اموی عہد خلافت میں مسلمانوں میں اسلام کی اصل روح باقی تھی، ان کے سارے افکار وتصورات کا محور اور مرکز دین تھا اور انھوں نے غیر دینی امور کی طرف کوئی توجہ نہ کی تھی۔ اموی خلافت میں انھیں غیر قوموں سے اختلاط اور ان کے علوم وفنون سے آشنائی اور ان کے خیالات وافکار سے اثر پذیری کا انھیں ایک عرصہ تک موقع نہ مل سکا۔ ان کے عہد خلافت میں ان کی زیادہ تر توجہ دین اور سیاست کی طرف تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کی اور بنو امیہ کو عربوں کی خصوصیات کے تحفظ میں بڑا اہتمام تھا۔ اس وجہ سے بنو امیہ نے غیر قوموں سے خلط ملط نہ ہونے دیا۔

بنو امیہ نے مفتوح اقوام کو حکومت سے بھی علیحدہ رکھا تھا۔ اس لیے مسلمان ان کے اثرات سے محفوظ رہے بلکہ عبدالملک بن مروان نے عربی کو سرکاری زبان قرار دے کر غیر قوموں کو اس کے سیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس وجہ سے غیر اقوام عربوں سے زیادہ متاثر ہوئیں۔ دینی علوم میں جن کا آغاز خلافت راشدہ ہی میں ہو گیا تھا، اموی دور میں اس میں برگ وبار پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ اکثر بڑے بڑے ائمہ تابعین اسی دور میں ہوئے، اور ساری دنیا میں ان کے حلقہ ہائے درس قائم ہو گئے، اور دینی علوم کی تدوین کی ابتداء بھی اسی دور میں ہو گئی تھی۔

تفسیر:

اموی دور میں بڑے بڑے ائمہ پیدا ہوئے جن کے ذریعہ بڑا تفسیری ذخیرہ جمع ہو گیا اور اس دور میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے تلامذہ عکرمہ، قتادہ، مجاہد بن جبیر، سعید بن جبیر اور امام حسن بصری زیادہ مشہور

Marfat.com

تھے، اور تفسیر کا زیادہ تر دارومدار انہی بزرگوں کی روایات پر ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ تفسیر کی پہلی کتاب سعید بن جبیر اسدی (م: ۹۵ھ) نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے لکھی۔ اموی دور حکومت میں حفظ قرآن کو وسعت دی گئی۔ ولید لوگوں کو ہمیشہ حفظ قرآن کی تلقین کرتا تھا اور حفاظ کو فیاضانہ عطیات دیتا تھا اور جو لوگ حفظ نہیں کرتے تھے ان کو سزا دیتا تھا۔ پھر قرآن حکیم پر اعراب بھی بنو امیہ کے عہد حکومت میں لگائے گئے۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے ابوالاسود الدوئلی سے امتیازی نقاط اور تحریری عبارتوں کے ساتھ اعراب لگوا کر مروج کیے۔

قرآن حکیم کی قرأت بھی ایک علم ہے۔ قرآن حکیم کے بعض لفظوں کا تلفظ مختلف طریقوں سے کیا جاتا تھا جس سے اگرچہ معانی پر تو کوئی اثر نہ پڑتا تھا لیکن خطرہ تھا کہ مستقبل میں اس سے شدید اختلاف امت میں پیدا نہ ہو جائے۔ بعض الفاظ ایک ہی قبیلہ میں دو طرح بولے جاتے تھے یا مختلف قبیلوں میں ان کا تلفظ جدا تھا۔ ان قرأتوں سے آشنا لوگوں کو ''قراء'' کہا جاتا تھا۔ قرآن حکیم کے مشہور قراء سبعہ یعنی سات قاری بنو امیہ کے دور میں تھے۔

حدیث:

اموی دور میں سب سے زیادہ ترقی حدیث نبوی میں ہوئی۔ اس زمانہ میں حدیث کا ایک عام ذوق لوگوں اور علمائے امت میں پیدا ہو گیا تھا۔ دنیائے اسلام کے ہر علاقہ میں درس حدیث کے حلقے قائم ہوئے۔ شائقین حدیث ایک حدیث کے سماع کے لیے دور دراز کا سفر کرتے اور ہر استاذ حدیث سے خوشہ چینی کرتے۔ حدیث کا سب سے بڑا مرکز مدینۃ الرسول تھا کیونکہ یہ سرکار دو عالم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسکن تھا۔ ابن شہاب زہری کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ نے تہذیب الاسماء: ۱/۹۱ میں لکھا ہے کہ وہ احادیث کی تلاش میں مدینہ طیبہ کی گلی کوچوں کا چکر لگاتے تھے اور یہاں کے ہر شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، استفادہ کرتے تھے۔ ابوقلابہ جرمی ایک ایک حدیث کے سماع کے لیے کئی کئی روز تک مدینہ طیبہ میں مقیم رہے۔
(مسند الدارمی: ص ۱۴۷)

مکحول کے بارے میں محدثین نے لکھا ہے کہ انھوں نے حدیث کی تلاش میں ساری دنیائے اسلام کی خاک چھانی۔ پھر ان محدثین نے ہر شخص کی حدیث کو قبول نہیں کیا بلکہ بڑی چھان پھٹک کے بعد حدیث کو قبول کرتے تھے۔ وہ حدیث اسی سے لیتے تھے جو عقل و دانش اور دین و تقویٰ کا جامع ہو کیونکہ دونوں میں سے ایک صفت کا حامل علم کی حقیقت کو نہیں پا سکتا (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۷۳) حدیث قبول کرنے کے یہی شرائط اس زمانہ دوسرے محدثین کے نزدیک بھی تھیں جیسے عامر بن شرحبیل اور محمد بن سیرین وغیرہ۔ حدیث کی قبولیت میں ان بزرگوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا۔ چنانچہ جو احادیث وہ بصرہ میں سنتے تھے مدینہ جا کر راوی اول کی زبان سے خود اس کی تصدیق کرتے تھے۔ ان حضرات نے اس حزم و احتیاط اور تلاش و جستجو سے احادیث کا یہ عظیم

Marfat.com

الشان ذخیرہ جمع کر کے بعد میں آنے والے محدثین کو پہنچایا۔ اگر یہ حضرات اس قدر جانفشانی اور حزم واحتیاط سے احادیث کو جمع نہ کرتے تو احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ برباد اور ضائع ہو جاتا۔ اس زمانہ میں سعید بن جبیر، سالم بن عبداللہ بن عمرہ، سعید بن المسیب، طاؤس بن کیسان، ابن ابی لیلیٰ، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ، مکحول شامی، مجاہد بن جبیر، محمد بن سیرین، محمد بن مسلم زہری وغیرہ بڑے محدث تھے جن کی روایات پر کتب احادیث کا دارومدار ہے۔ ان حضرات نے پوری حزم واحتیاط کے ساتھ حدیث کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اشاعت بھی کی۔ درس و تعلیم کے ذریعہ اس کو پھیلایا۔ بعض حضرات نے ان کو قلم بند بھی کیا۔ ان کے مجموعے مرتب کیے۔ حدیث کی تدوین اور اشاعت میں سب سے بڑا کارنامہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا ہے۔ آپ نے علماء سے احادیث کے مجموعے مرتب کرائے اور ان کی نقلیں ممالک محروسہ میں شائع کیں، اگرچہ یہ مجموعے دنیا سے ناپید ہو گئے لیکن ان کی احادیث ان مجموعوں میں شامل ہو گئیں جو آج ہمارے پاس موجود ہیں۔ دارمی میں ہے کہ سعید بن جبیر جو سیدنا عبداللہ بن عباس کے شاگرد تھے، انھوں نے ایک مجموعہ حدیث مدون کیا تھا۔ (مسند الدارمی: ص ۱۲۷) اور ابو عمر بن العلا جو عہد بنی امیہ میں تھے، انھوں نے فصحائے عرب کی جن چیزوں کو لکھ کر جمع کیا تھا، ان کتابوں سے چھت تک کمرہ بھرا ہوا تھا۔ (الیافعی: ۱/۲۰۷) ایسے ہی محدث ابوقلابہ کی کتب تھیں جو ایک اونٹ کا نصف بار تھیں۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۸۸) سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ سرکار دو عالم ﷺ کی احادیث کو لکھ لیجیے، مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں علم الحدیث مٹ نہ جائے اور علماء فنا نہ ہو جائیں۔ (بخاری، کتاب العلم) ابن شہاب زہری کو بھی احادیث جمع کرنے کا حکم دیا باوجودیکہ ابن شہاب زہری عبدالملک بن مروان کے زمانہ سے احادیث جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے، اور انھوں نے ایک مجموعہ حدیث ان کے لڑکے کی تعلیم کے لیے تیار کر دیا تھا۔ (تہذیب الاسماء نووی: ۱/۱۹۱) مغازی میں کتاب تالیف کی۔ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں کہ محدث سعد بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے دفتر کے دفتر لکھے۔ عمر رحمہ اللہ نے پوری مملکت اسلامیہ میں ایک ایک دفتر بھیج دیا۔ (زرقانی و فتح الباری)

ابوبکر بن حزم نے رسول اللہ ﷺ کی سنتیں جمع کر کے اس دفتر کو عمر بن عبدالعزیز کے پاس بھیجا، لیکن وہ اس وقت انتقال فرما چکے تھے۔ (فتح الباری)

ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث اور روایات کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو صرف شہاب زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں۔ جابر بن عبداللہ کی روایات کا مجموعہ وہب تابعی نے تیار کیا تھا جو اسماعیل بن عبدالکریم کے پاس تھا جب کہ روایات ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مجموعہ ہمام بن منبہ نے تیار کیا تھا جو صحیفہ ابن ہمام کے نام سے موجود ہے اور ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے اس کو ایڈٹ کر کے چھپوا بھی دیا ہے۔

Marfat.com

فقہ:

قرآن اور حدیث کے بعد دین میں فقہ کا مرتبہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام میں سے اکثر حضرات بیک وقت کئی حیثیتوں کے حامل تھے۔ وہ مفسر بھی تھے، محدث بھی تھے اور فقیہ بھی۔ تاہم تابعین میں اکثر و بیشتر لوگوں میں یہ شعبے تقسیم ہو گئے یعنی کچھ لوگ ایسے تھے جو حدیث کے ساتھ فقہ کا ذوق بھی رکھتے تھے کیونکہ ہر محدث فقیہ نہیں ہوتا تھا۔ محدث الفاظ حدیث کا حافظ ہوتا ہے اور فقیہ الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی حدیث کا حافظ بھی ہوتا ہے۔ بہر حال جو لوگ فقہ کا زیادہ ذوق رکھتے تھے، ان کو فقیہ کہا جاتا جیسے عبید اللہ بن عبداللہ بن مسعود، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد بن ابی بکر، سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار اور خارجہ بن زید وغیرہ گو ان بزرگوں کو حدیث میں بھی خاص درک تھا لیکن انھیں زیادہ ذوق فقہ کا تھا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ ہر فقیہ قرآن و حدیث کا ماہر ہوتا ہے، اگر وہ حدیث و قرآن کا ماہر نہ ہو تو وہ فقیہ نہیں ہو سکتا۔ اموی حکومت کے زمانہ میں مدینہ کے فقہائے سبعہ مشہور تھے اور زیادہ تر انہی بزرگوں کے ذریعہ فقہ کی اشاعت ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ اس زمانہ میں اور بھی بہت سے ایسے بزرگ تھے جیسے ربیعہ، ابراہیم نخعی، امام شعبی، امام جعفر صادق اور قاضی شریح وغیرہ اس زمانہ کے مشہور فقیہ تھے۔ ان میں سے بعض حضرات نے فقہ پر کتابیں بھی لکھیں جیسے عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ نے کئی کتابیں لکھیں۔ اسی طرح مکحول اور امام زہری نے بھی فقہ پر کتابیں لکھیں۔

سیرت و مغازی:

اموی دور حکومت میں تاریخ اور سیرت و مغازی کا آغاز بھی ہوا۔ اس کی ابتداء مغازی اور سیرۃ سے ہوئی۔ چنانچہ عروہ بن زبیر، شرحبیل بن سعد، وہب بن منبہ، عکرمہ، امام زہری، موسیٰ بن عقبہ اس فن کے ائمہ تھے اور تمام کتب مغازی اور سیرۃ کا ماخذ انہی کی روایات ہیں۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ مغازی اور سیرت پر سب سے پہلی کتاب عروہ بن زبیر نے لکھی۔ (۴۷۰/۳) لیکن امام سہیلی نے لکھا ہے کہ سب سے پہلی تصنیف اس فن میں امام زہری کی ہے۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اس فن کو سب سے زیادہ ترقی محمد بن اسحاق نے دی۔ انھوں نے اگرچہ بنو عباس کے ابتدائی دور سنہ ۱۵۱ھ میں وفات پائی لیکن ان کا نشو و نما اموی دور ہی میں ہوا۔ محمد بن اسحاق نے اس فن کو اتنی ترقی دی کہ پھر کوئی اس پر اضافہ نہ کر سکا۔ ان کے بعد اگرچہ بہت سے لوگوں نے سیرۃ پر کتابیں لکھیں لیکن ان کے درجہ کو کوئی نہ پہنچ سکا۔ (تاریخ بغداد: ۲۱۹/۱) یہ کتاب آج بھی موجود ہے اور سیرۃ کا سب سے معتبر اور قدیم ماخذ تصور کی جاتی ہے۔ اموی دور کے ایک اور بزرگ وہب بن منبہ نے سلاطین حمیر کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی۔ (شذرات الذہب: ۱۵۰/۱)

مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ہر روز عشا کے بعد بیٹھ کر تاریخی

Marfat.com

واقعات سنتے۔ جب رات کا تہائی حصہ گزر جاتا تو پھر سو جاتے اور پھر اٹھ کر یہی مشغلہ شروع ہو جاتا۔ متعدد حضرات تاریخی کتابیں لے کر آتے اور ان کو پڑھ کر سناتے۔ جب اس پر قناعت نہ ہوئی تو یمن سے ایک عالم عبید بن شریہ کو بلایا اور اس سے بہت سے تاریخی واقعات سنے۔ پھر ان واقعات کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کرنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ اس کتاب کا نام ''اخبار الماضیین'' رکھا گیا۔ ایک اور مؤرخ صحار العبدی نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے ''کتاب الامثال'' لکھی۔ (فہرست ابن ندیم: ص ۱۲۲) عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت میں عبید بن شریہ نے کتاب الامثال لکھی۔ ہشام کے شوق اور ایما سے عربی لٹریچر میں اور بھی مفید اور تاریخی تصنیفات کا اضافہ ہوا۔ چنانچہ جبلہ نے اس کے لیے ایران کی بعض تاریخی کتابوں کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ابن حزام نے اموی عہد میں کتاب المغازی لکھی جس کو ہارون الرشید کی خدمت میں پیش کیا۔ ہشام نے اور مترجمین کے ذریعہ سے کتاب تاریخ الملوک الفرس کا ترجمہ کرایا جس میں ایرانی سلطنت کے قوانین اور مشاہیر ایران کے حالات تھے۔ (کتاب التنبیہ والاشراف: ۱/۱۰۶)

لغت:

لغت کے فن کی بنیاد اگرچہ خلفائے راشدین کے زمانہ ہی میں پڑ چکی تھی لیکن اس کی علمی تدوین اموی دور میں شروع ہوئی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں قرآن حکیم کے معلم کے لیے لغت کا علم ہونا ضروری قرار دیا تھا۔ تابعین نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اس بات کو بڑی اہمیت دی۔ چنانچہ مجاہد اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص لغت کا عالم نہ ہونے کے باوجود قرآن حکیم کی تفسیر کرتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ اس کے لیے وبال بنا دیتا ہے۔ اموی خلفاء کو بھی عربی زبان کی تحقیق سے خاص ذوق و شوق تھا اور ان کے درباروں میں لغت پر مباحثے وغیرہ ہوتے تھے۔ عبدالملک بن مروان کو عربی زبان کی ترقی اور اشاعت سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ اسی نے عربی کو دفتری زبان بنایا تھا، اس وجہ سے وہ ادیبوں سے ادبی مباحث کرتا تھا اور ان میں خود شریک ہوتا تھا۔ جب امیر مملکت خود کسی چیز میں دلچسپی لے تو عوام اور شائقین زبان بھی اس میں خاص دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں اور اس کی تحصیل و تحقیق کے لیے بادیہ پیمائی کرتے تھے۔ اس زمانہ میں دو بڑے امام لغت تھے ایک قتادہ بن دعامہ سدوسی اور ابو عمرو بن العلاء۔ ثانی الذکر نے زبان و لغت کی تحصیل کے لیے برسوں صحرائے عرب کی خاک چھانی تھی، اور اس کے لیے بڑا تحریری ذخیرہ فراہم کیا۔ (معجم الادباء: ۴/۲۱۷) اشعار و انساب اور لغت عرب تینوں میں قتادہ کا علم نہایت وسیع تھا۔ ابو الاسود نے زیاد بن ابیہ سے اجازت لے کر نحو کے قواعد وضع کیے۔ ان سے عقبہ بن مہران اس کی تعلیم حاصل کی۔ اسی سلسلہ سے خلیل منسلک تھے۔ (ابن خلکان: ۲/۲۸۰)

اموی عہد خلافت میں عربی شاعری نے بھی بہت فروغ حاصل کیا۔ ایام جاہلیت کے کلام میں جو خوبیاں تھیں وہ تو تھیں لیکن اس عہد کے کلام میں بلند اور نازک تخیلات سے ایک عجیب قسم کی لطافت، لچک اور

Marfat.com

سلاست پیدا ہوگئی تھی۔ جریر، فرزدق اور اخطل وغیرہ نے بنوامیہ کے درباروں میں تربیت پائی تھی۔ ادب کی کتابوں میں یہ تمام ذخیرہ محفوظ ہے۔

تراجم:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا پوتا خالد بن یزید جس کی کنیت ابو ہاشم تھی، اس کو حکومت سے لگاؤ نہ تھا۔ اس نے علوم دینی حاصل کرنے میں سعی بلیغ کی۔ اس کے استاذ حدیث حضرت دحیہ تھے۔ رجاء بن حیاۃ اور شہاب زہری جیسے جلیل القدر محدث اس کے شاگرد تھے۔ ابن ندیم نے الفہرست میں لکھا ہے کہ ''خالد بن یزید بن معاویہ خطیب اور بہت بڑے شاعر تھے اور اس نے طب، نجوم اور کیمیا (کیمسٹری) کی کتابوں کا ترجمہ کیا۔'' ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ''خالد نے چند مصری علمائے طب کو بلا کر اپنے پاس رکھا۔ انھوں نے دمشق میں رہ کر علمی کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان علماء میں ایک پادری مریانوس بھی تھا جس نے خالد کو علم کیمیا کی تعلیم دی اور اصطفان نے اس فن کی کتابیں عربی میں خالد کے لیے نقل کیں۔ (ابن خلکان: ۱۶۸/۲)

اس نے ایک معمل (لیبارٹری) بھی قائم کی۔ بہت سے علماء کو ملازم رکھا۔ آثار الباقیہ میں ہے:
''خالد نے لیبارٹری قائم کی جہاں اپنے کیمیاوی تجربات کے نتائج معلوم کر کے چند رسائل میں محفوظ کر دیئے۔
(آثار الباقیہ: ص ۳۰۲)

علم طب میں اس کو کامل دست گاہ حاصل تھی۔ فن کیمسٹری کا بانی خالد بن یزید بن معاویہ کہا جاتا ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ ''خالد بن یزید پہلا شخص ہے جس نے علم الکیمیا میں کلام کیا اور اس میں کتابیں لکھیں اور کتب فلسفہ میں اسے خاص درک حاصل تھا۔ خالد بن یزید بن معاویہ پہلا شخص ہے جس نے اس علم کو شہرت دی اور کہا جاتا ہے کہ جابر بن حیان اس کے تلامذہ میں سے تھا۔'' (کشف الظنون: ص ۳۴۱) خالد کا انتقال سنہ ۸۵ھ میں ہوا تھا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یونانی علوم وفنون کے ترجمہ کی ابتداء بنوامیہ ہی کے دور حکومت میں ہوئی۔ چنانچہ ابن آثال نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے یونانی زبان سے علم طب کی ایک کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہی کتاب تھی جس کو عمر بن عبدالعزیز نے شام کے کتب خانہ میں پایا اور ممالک محروسہ میں اس کے مختلف نسخے تقسیم کیے۔

ہشام کے زمانہ میں ایرانی تاریخ کے علاوہ بعض یونانی کتابوں کا ترجمہ بھی ہوا۔ چنانچہ ابوجبلہ نے ارسطو کے ان خطوط کا ترجمہ کیا جو اس نے اسکندر کو لکھے تھے۔ غرض کہ دوسری زبانوں سے عربی زبان میں عہد بنی امیہ میں کثرت سے کتابیں منتقل ہونے لگیں تھیں۔

Marfat.com

نظام تعلیم:

مدارس کی ابتداء سلجوقیوں کے عہد حکومت میں ہوئی اور ہمارے خیال میں سب سے پہلا مدرسہ نظامیہ نیشاپور میں قائم ہوا، لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بچوں کی تعلیم کے لیے ابتدائی مکاتب تھے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ایک خادم علقمہ ایک مکتب میں ابتدائی تعلیم دیتے تھے۔

(کتاب المعارف لابن قتیبہ: ص ۱۵۸)

اموی دور خلافت میں مدارس کے بجائے علماء کے بڑے بڑے حلقہ ہائے درس تھے جن میں قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے تھے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا جس میں ہر فن کی تعلیم ہوتی تھی۔ تمام بڑے بڑے مرکزی شہروں میں علماء کے درس کے حلقے تھے جن میں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں ربیعۃ الرائے کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا جس میں طلبہ کا ہجوم ہوتا تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ، امام اوزاعی رحمہ اللہ، یحییٰ بن سعید انصاری اور شعبہ وغیرہ جیسے علماء اسی حلقہ سے فیض یافتہ تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے غلام اسلم کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا۔ عبداللہ بن ذکوان کا حلقۂ درس اپنی شان و شوکت میں بادشاہوں کے درباروں کو شرماتا تھا۔ اس میں سیکڑوں طلبہ شریک ہوتے تھے۔ ابوالزناد کے بارے میں عبد بن ربہ کا بیان ہے کہ میں نے ان کو مسجد نبوی میں اس شان سے دیکھا ہے کہ ان کے ساتھ اتنا ہجوم تھا جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ محمد بن عجلان کا حلقۂ درس مسجد نبوی میں تھا جس میں بڑے بڑے تابعین شریک ہوتے تھے قاسم بن محمد بن ابی بکر کا الگ حلقہ تھا۔ حجاز کے علاوہ کوفہ میں کئی علماء کے حلقہ ہائے درس تھے۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا حلقہ درس نہایت ممتاز تھا۔ اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم تک شریک ہوتے اور سماع حدیث کرتے۔ (تہذیب التہذیب: ۲۶۰/۶)

امام شعبی کا حلقہ درس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں قائم ہو گیا تھا غرض کہ پوری مملکت اسلامیہ میں مختلف علماء کے حلقے قائم تھے جن سے طلبہ مستفید ہوتے تھے اور صاحب علم ایک مستقل درس گاہ تھا اور اس طرح ساری دنیائے اسلام میں علمی لہر رواں دواں تھی۔

یہ تھی اموی خلافت کے زمانہ میں علمی اور تمدنی ترقی جس کی طرف سے مؤرخین چشم پوشی کرتے رہے اور انھیں عہد بنی امیہ میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

موسیو لیبان نے لکھا ہے:

”خلفائے بنو امیہ کے زمانہ میں شام کا تمدن ایک اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا تھا۔ عربوں نے اپنی رعایا کے ساتھ نہایت انصاف اور انسانیت کا برتاؤ کیا اور ان کو مذہب کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ان کے عہد میں مشرقی اور مغربی کلیسا دونوں کے رئیس اساقفہ کو اس قدر آرام ملا کہ انھیں اس وقت تک اپنی حکومت میں ہرگز نصیب نہیں ہوا تھا۔ شام کے تمام بڑے شہر بیت المقدس، صیدون، دمشق اور صور

Marfat.com

بہت ہی سرسبز ہو گئے اور حرفت اور فلاحت نے بے انتہا ترقی کی۔ فتح ہونے کے ساتھ ہی اس ملک میں اعلیٰ درجہ کی ترقی شروع ہو گئی۔ عربوں کو علوم یونان و روم کا ایسا ہی جوش پیدا ہو گیا جیسا کہ انھیں لڑنے کا جوش تھا۔ ہر طرف مدارس کثرت سے قائم ہو گئے اور چند روز میں شاگرد استادوں کا مقابلہ کرنے لگے، اور علوم و شاعری اور صنعت میں ترقی نمایاں ہونے لگی اور دمشق جو ان کا دارالسلطنت تھا، تجارت کا مرکزی شہر بن گیا۔ یہاں علمی اور حرفتی ترقی کی شہرت دور دور تک تھی۔ طبی مدرسہ اور قصور شاہی تمام عالم میں مشہور و معروف تھے۔''

Marfat.com

خلفائے بنو امیہ اور دمشق

رسول اللہ ﷺ کے عہد ہمایوں اور آپ ﷺ کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانوں میں مدینہ طیبہ ہی مسلمانوں کا مرکزی شہر اور دارالخلافہ رہا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر بیٹھے تو انھوں نے اپنا دارالخلافہ مدینہ طیبہ کے بجائے کوفہ کو بنالیا جس کی وجوہات ہم نے اپنی کتاب ''تاریخ اسلام عہد نبوی تا عہد خلفائے راشدین'' میں بیان کی ہیں۔

کوفہ کی بنیاد سنہ ۱۶ھ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ڈالی گئی تھی۔ عرق و ایران کی فتح کے بعد سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کے دارالسلطنت مدائن میں رہائش اختیار کر لی اور کسریٰ کے ''قصر ابیض'' یعنی کوشک سفید کو ''دارالامارۃ'' یعنی گورنمنٹ ہاؤس بنالیا۔ عربی سپاہ کا ایرانی پایہ تخت میں قیام کرنا سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کچھ ناگوار گزرا دور اندیش مدبر کو معلوم تھا کہ ایرانی تمدن کا اثر عربوں میں ضرور ہوگا اور وہ بہت جلد آرام طلب ہو جائیں گے۔ آب و ہوا کی ناموافقت بھی ایک بہانہ تھا۔ ریگستان کے باشندے ایسے شہروں میں طاقت و توانائی اور قدرتی ولولے برقرار نہ رکھ سکتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کا رنگ روپ متغیر ہو گیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ چھاؤنی کے لیے کوئی ایسی جگہ تلاش کرو جو دریا کے کنارے اور خشکی سے متصل ہو یعنی قصر حکومت کے درمیان کوئی دریا یا پل حائل نہ ہو۔ سلیمان بن ربیعہ الباہلی رضی اللہ عنہ اور حذیفہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے دریائے فرات کے کنارے پر وہ قطعہ زمین انتخاب کیا جو حیرہ اور فرات کے مابین واقع ہے۔

ابتداء میں کوفہ میں صرف بانسوں کی جھونپڑیاں بنائی گئیں جس کے چاروں طرف عربی سپاہ کے خیمے نظر آتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خشت خام یا پختہ عمارتوں کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ان کے تاکیدی احکام کا مضمون یہی تھا کہ پختہ اور بلند عمارتیں عیش پسند طبائع کی اختراع ہیں، اور آرام طلبی اور کاہلی کے سامان ہیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سخت رکاوٹیں ہیں۔ ایک مرتبہ ان گھاس پھوس اور بانس کی جھونپڑیوں میں آگ لگ گئی تو خشت خام کی عمارتوں کی مجبوراً اجازت دے دی لیکن اس پر بھی شرائط کی قید لگا دی کہ بلند و بالا نہ ہوں اور کوئی شخص تین کمروں سے زیادہ نہ بنائے۔

زمانہ گزر گیا۔ مسلمانوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں متمدن دنیا کو مسخر اور فتح کر لیا، اور یہ ناممکن تھا کہ

Marfat.com

ان کی طبائع پر ان کا اثر نہ ہو۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں کوفہ ایک بارونق شہر بن گیا اور اس کی آبادی میں روز بروز اضافہ اور ترقی ہوتی گئی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنے عہد خلافت میں اپنا دارالخلافہ بنایا۔ ممکن ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دارالخلافہ کے انتقال کے وقت یہی امور مدنظر ہوں، لیکن واقعات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو اہل حجاز پر اعتماد نہ تھا۔ سبائی جنھوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو گھیر رکھا تھا، وہ مدینہ میں رہ کر وہ کام سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نہیں کروا سکتے ہیں جو وہ انھیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے الگ کر کے سرزمین کوفہ میں کروا سکتے تھے۔ لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں ایسے جانثاروں کی جماعت بہم نہ کر سکے جو مدینہ میں تھے۔ اور نیز یہ وقت انتقال دارالخلافہ کے لیے موزوں نہ تھا لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ مجبور تھے۔ مدینہ اور کوفہ ایک دوسرے کے حریف شہر بن گئے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اہل حجاز میں دوری اور بُعد بڑھتا گیا۔ اس کا فائدہ دمشق کو ہوا۔ اگر کوفہ مستقل مستقر خلافت بن جاتا اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل ہو جاتی تو پھر کوئی شک نہیں کہ کوفہ، عراق، شام، ایران پر حکومت کرنے کے لیے نہایت موزوں جگہ تھی۔ عراق میں خوارج کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ تھا۔ حجاز میں عربی خودسر تھے، اس لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لیے انتقال دارالخلافہ کچھ مفید ثابت نہ ہوا۔

دمشق ایک متمدن شہر تھا۔ اس کی سرحدیں بازنطینی حکومت سے ملتی تھیں اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بیس سال سے گورنر کی حیثیت سے وہاں کام کر رہے تھے۔ بنوامیہ ان کی پشت پناہ تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بذاتہ حکومت کے قابل تھے۔ صاحب ناسخ التاریخ جو اہل بیت کی محبت کا دم بھرتا ہے، لکھتا ہے کہ ''چار آدمیوں کو عقلائے عرب سے شمار کیا گیا ہے یعنی سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور زیاد بن ابی سفیان۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت پر بیٹھے تو سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے حاضر خدمت ہو کر کہا: ''امیر المومنین! میں ایک نصیحت کرتا ہوں۔'' فرمایا: ''کہو'' کہا: امارت کوفہ طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ اور بصرہ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو دو اور حکومت شام پر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بحال رکھو۔ جب استقلال خاطر خواہ ہو گا تو اس وقت جس طرح ان میں تغیر وتبدل کرو گے، خلل واقعہ نہ ہو گا۔ سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ کی نظر نظم مملکت پر تھی، لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے مغیرہ رضی اللہ عنہ کی نصیحت کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ ایسے آدمی تھے جو بذاتہ مستحق خلافت تھے۔ کوفہ اور بصرہ کی گورنری کون سی بڑی بات تھی۔ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو حکومت شام پر بحال رکھتے تو وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ماتحت کام کرتے اور یہی سمجھا جاتا کہ یہ مملکت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ہے۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ایک مدبر اور قابل حکمران تھے۔ بیس سال تک شام میں گورنر دمشق رہے۔ اس عرصہ میں تجربہ نے ان سب باتوں کی تعلیم دی جو حکومت کے لیے لازمی ہیں۔ ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عمائدین مصر سے کہا کہ میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے قوی تر اور آہستہ تر کوئی

Marfat.com

شخص نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ وہ نشست پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور میں بھی ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ انھیں ایک خط ملا کہ قیصر روم ایک لشکر جرار کے ساتھ شام کی سرحد پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ آپ نے یہ خط پڑھ کر میری طرف پھینک دیا۔ میں خاموش رہا کہ دیکھیے کیا کہتے ہیں۔ اتنے میں ایک اور خط آ گیا کہ نائل بن قیس خوارج کے سردار نے ایک جمعیت بہم پہنچا کر ارض فلسطین کا رخ کیا ہے۔ انھوں نے اسی طرح یہ خط پڑھ کر میری طرف پھینک دیا۔ اتنے میں ایک اور خط آ گیا کہ خوارج موصل کے نزدیک ایک شہر کا زندان توڑ کر نکل گئے ہیں۔ یہ نامہ بھی آپ نے مجھے پڑھنے کے لیے دے دیا۔ ابھی میں وہاں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اور خط آ گیا کہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بے شمار سپاہیوں کے ساتھ شام پر فوج کشی کرنا چاہتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ چاروں طرف سے متوحش خبریں آ رہی ہیں اور معاویہ رضی اللہ عنہ اس طرح تکیہ سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھے ہیں کہ ان کے چہرہ پر کسی قسم کے ملال وحزن اور تفکر کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ میں نے ان سے اپنی اس کیفیت کا اظہار کیا تو کہا: ''اے عبداللہ! یہ معمولی باتیں ہیں۔ قیصر کے ہمراہ خواہ کتنی ہی فوج کیوں نہ ہو وہ شام پر حملہ کی جرأت نہیں کر سکتا اور بآسانی صلح پر مائل ہو جائے گا۔ نائل بن قیس دین کے لیے جنگ نہیں کرتا وہ اس شہر کی خواہش رکھتا ہے جو اس کے قبضہ میں ہے۔ خوارج میرے قید خانہ سے نکل گئے تو اللہ تعالیٰ کے زندان سے کہاں جا سکتے ہیں۔ البتہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے متعلق مناسب تدبیر کرنی چاہیے کیونکہ مجھے ان سے خون عثمان کا مطالبہ کرنا ہے۔ اس کے بعد تکیہ لگا کر سیدھے بیٹھ گئے اور مذکورہ بالا مہمات کے بارے میں نہایت عمدہ تدابیر بتائیں جن سے ان سب کا انجام خاطر خواہ ہو گیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے ایک کثیر تعداد تو ''خوارج'' کے نام موسوم ہو گئی اور جو باقی رہے ان میں سے کچھ تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے آ ملے اور بعض دونوں سے الگ رہے، لیکن سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں سے کوئی آدمی بھی منحرف نہ ہوا۔ اس سے بڑھ کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی ہر دل عزیزی کا کیا ثبوت ہوگا کہ خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بھائی عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ دونوں ایسے دوست تھے کہ ان کی گفتگو میں بے تکلفی کا مزہ آتا ہے۔

کوفہ ایک ایسی جگہ تھی جس کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دارالخلافہ کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس جگہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بہی خواہوں کا ایک ہجوم تھا۔ اس شہر کا انتظام کچھ آسان کام نہ تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کی حکومت زیاد کو دی۔ زیاد وہ شخص تھا جس کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فارس کا گورنر مقرر کیا تھا۔ زیاد نے نہایت قابلیت مگر سختی سے کوفہ کا انتظام کیا۔ بعض لوگوں کے قتل کا حکم صادر کیا وہ دمشق میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔ معذرت کی۔ انھوں نے معاف کر دیا۔ زیاد نے لکھا کہ ''امیر المومنین! حکومت کا نظام اس طرح نہیں چلے گا۔ جس شورہ پشت کو میں قتل کرنا چاہتا ہوں آپ اسے امان دے دیتے ہیں۔'' آپ نے جواب میں فرمایا: ''درشتی و نرمی بہم در بہ است۔'' اگر دونوں طرف سے سختی ہو تو پھر امن قائم نہیں ہو سکتا۔''

کوفہ بہت تھوڑا عرصہ دارالخلافہ رہا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر دمشق بالاستقلال پایۂ خلافت بن

Marfat.com

گیا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو سنہ ۴۱ھ میں بالاتفاق اہل اسلام اور بالاستقلال بلاشرکت غیرے دنیائے اسلام پر خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ اس لیے اس سال کا نام ''عام الجماعۃ'' رکھا گیا۔

خلافت اسلامیہ سے مسلمانوں کی ایک ایسی حیثیت دیگر اقوام میں مراد ہے جو باامن زندگی بسر کرنے کا موجب اور فرائض دین بلاخوف وخطر ادا کرنے کا باعث ہے، اور یہ حیثیت بہ سبب خلافت ہر ایک مسلمان کو حاصل ہے کیونکہ اسلام کفر کا استیصال خاطر خواہ کر چکا ہے اور کفر اس قابل ہی نہیں رہا کہ اشاعت اسلام کا مزاحم ہو۔ اسلام سے پیشتر دنیا کو یہ امن جو اسلام کی تعلیم ہے کبھی نصیب نہیں ہوا۔ اسلام خون ریزی سے سخت نفرت کرتا ہے۔ ہمارا دعویٰ بادلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ خلافت خلیفہ کی صلاحیت اور ایمان کی بین شہادت ہے، اور اس لیے خلفائے بنوامیہ اور اس کا جانشین مومن اور صالح مسلمان تھے۔ مسلمانوں کا خلیفہ فاجر و فاسق نہیں ہوسکتا اور کسی کافر کو استحقاق خلافت نہیں پہنچتا۔ خلفاء بنوامیہ بلا استثناء خلفاء کی اس باعظمت اور طویل فہرست میں شامل ہیں جس کی ابتداء سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مبارک نام سے ہوتی ہے۔

خلفائے بنوامیہ کی بدنامی کا موجب وہی جھوٹی روایات اور موضوع احادیث ہیں جن میں پولیٹیکل اغراض مخفی تھے، اور موجودہ زمانے میں ان سے مذہبی تعصب ظاہر ہے۔ بنوہاشم اور بنوامیہ دو قبائل تھے جن کے آپس میں حریفانہ نہیں بلکہ حلیفانہ تعلقات تھے۔ آپس میں رشتہ داریاں تھیں، لیکن بنوہاشم کی عزت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس نے بڑھا دی تھی۔ اگرچہ زمانہ نبوت میں اس امر کا خیال کسی فرد بشر کو نہ تھا لیکن آئندہ زمانے کے مسلمان محبت اہل بیت کا دم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات کی وجہ سے بھرتے تھے اور بھرتے ہیں، اور اس وجہ سے بنوہاشم کے حریف مورد طعن ہوئے۔ لیکن یہ تاریخی ثبوت نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ سوائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور امین بن ہارون الرشید کوئی ہاشمی خلیفہ ہاشمیہ کے بطن کا تخت خلافت پر نہیں بیٹھا۔ اگر سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور امین کی چند روزہ حکومت کا خیال نہ کیا جائے تو صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایک خالص ہاشمی خلیفہ رہ جاتے جو چار ساڑھے چار سال مسند خلافت پر براجمان رہے۔

بنوامیہ کے خلفاء کی رسوائی اور بدنامی کا باعث یہ بھی ہے کہ ان کے جانشین بنوعباس ہوئے۔ ان کے نقیبوں نے دل کھول کر خلفاء بنوامیہ کی مذمت کی کیونکہ اس کے بغیر بنوعباس کو کامیابی نہ ہوتی۔ لوگوں کو اچھی طرح بنوامیہ سے بدظن کیا گیا جیسے ابومسلم خراسانی کو تو اس بات کی امام ابراہیم کی طرف سے خاص ہدایات تھیں۔ کچھ تو ان کے آخری تاج داروں کے مظالم اور اکثر موضوع احادیث اور روایات کے ذریعہ جو فضیلت کا تذکرہ کرتی ہیں، لوگوں کو بنوہاشم کی طرف متوجہ کیا گیا۔ یہ خالص سیاسی چالیں تھیں، لیکن یہ زمانہ ایسا تھا کہ جب تک ان پر مذہبی رنگ نہ ہوتا عوام کی خوش اعتقادی پر مؤثر نہ ہوتیں۔ جب اندرونی اور بیرونی خرخشوں سے سلطنت کو امن ملتا ہے تو تمدن کی ترقی کے ساتھ طبائع میں قدرتاً خوش حال زندگی کا تقاضا ہوتا ہے۔ اگر بنوامیہ اور ان کے جانشین خلفائے عباسیہ وغیرہ کا مقابلہ کیا جائے تو موخر الذکر زیادہ قابل ملامت ثابت ہوں گے، لیکن

Marfat.com

طرف داران بنو ہاشم نے اپنے حریف قبیلہ کو ہر ایک برائی سے متہم کیا ہے اور خلفائے بنوامیہ کی عیاشی اور فسق و فجور کی ایسی خوفناک تصویر کھینچی کہ لوگ بنوامیہ سے بیزار ہو گئے۔ جھوٹی روایات صحیح تواریخی واقعات میں ملائی گئیں اور ان روایتوں کا کذب عموماً تواریخی واقعات کی صحت نے پوشیدہ رکھا، بلکہ ان کی صداقت پر مہر لگا دی۔

یزید بن معاویہ نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ وہ ایک بہادر سپاہی تھا۔ قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے طرفین کے سپاہی داد مردانگی دے رہے تھے۔ عبدالعزیز بن زرارہ الکلابی شعر پڑھتے ہوئے آگے بڑھے اور شہید ہو گئے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی شہادت کی اطلاع ہوئی تو ان کے والد سے کہا "واللہ ھلك فتی العرب" خدا کی قسم! عرب کا بہادر انتقال کر گیا۔ پوچھا: "میرا بیٹا یا تیرا بیٹا؟" جواب ملا تیرا بیٹا، اللہ تعالیٰ اس کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ میزبان رسول ﷺ بھی اسی معرکہ میں شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے یزید بن معاویہ نے ان کو دفن کیا۔ قیصر روم نے کہا کہ میں مسلمانوں کے لشکر کے جانے کے بعد اس قبر کو اکھڑوا دوں گا۔ یزید نے کہا: "قیصر روم احمق ہے، سلطنت اسلامیہ میں بے شمار گرجے اور عیسائیوں کے بزرگوں کی قبریں ہیں، میں ان سب کو منہدم کر دوں گا۔" لیکن بتایا یہ گیا کہ یزید بن معاویہ نے اس لشکر کی قیادت نہیں کی تھی بلکہ اس لشکر کے سپہ سالار سفیان بن عوف تھے، اور یزید تو اس وقت "دیروان" میں عیش عشرت میں مشغول تھا۔ اس قسم کی روایات بنا کر تاریخ میں گھسیڑ دی گئیں تاکہ خلفائے بنوامیہ کو بدنام کیا جا سکے۔

ولید بن یزید سنہ ۱۲۵ھ میں ہشام بن عبدالملک کے بعد تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس کی طرف اکثر افعال ناشائستہ اور حرکات ناپسندیدہ منسوب کی گئیں، اور اس کے فسق و فجور، خصائل ذمیمہ اور عادات رذیلہ کا تذکرہ کم و بیش ہر ایک مؤرخ نے کیا ہے، لیکن محققین نے اس کا انکار کیا ہے کیوں کہ اس کے دشمن بہت تھے اور بوجہ عداوت اسے بدنام کرنے کے لیے جھوٹی روایات اختراع کیں۔ کہتے ہیں کہ ولید نے ایک مرتبہ قرآن شریف کھولا تو آیت ﴿وخاب کل جبار عنید﴾ پر نظر پڑی۔ جھلا اٹھا اور قرآن حکیم کو چاک کر دیا اور کہا:

تھددنی بجبار عنید فھا انا ذاك جبار عنید

تو مجھے جبار عنید سے ڈراتا ہے، فی زمانہ میں جبار عنید ہوں

اذا ماجئت ربك یوم حشر فقل یا رب مزقنی الولید

بروز قیامت اپنے رب کے پاس جا کر کہہ دینا کہ مجھے ولید نے پھاڑا ہے۔

اس قسم کی روایتیں وضع کر کے لوگوں کو بنوامیہ کے خلاف برانگیختہ اور مشتعل کیا گیا۔ ایک دفعہ خلیفہ مہدی عباسی کے دربار میں ولید کا ذکر آیا۔ مہدی نے کہا "وہ تو زندیق ہے۔" ابن علانہ فقیہ نے کہا: "امیر المومنین! اللہ تعالیٰ بہت بڑا عادل ہے، وہ کبھی کسی زندیق کو خلافت، نبوت اور امامت کی حکومت عطا نہ فرمائے گا۔ مجھ سے ایک شخص نے جو ولید کا ندیم اور ہم نوالہ تھا، یہ بیان کیا ہے کہ جب نماز کا وقت آتا تو ولید شاہانہ لباس اتار کر سفید صاف ستھرے کپڑے زیب تن کرتا۔ پھر نہایت اچھی طرح سے وضو کرتا اور نہایت خشوع و خضوع سے نماز ادا

Marfat.com

کرتا۔ کیا ایک زندیق سے یہ امید کی جا سکتی ہے۔ مہدی نے کہا: ''اے ابن علانہ! اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر عطا فرمائے، اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ولید کے دشمنوں نے اس پر یہ بہتان باندھے ہیں۔ اس کے اپنے قریبی رشتہ داروں نے اسے بدنام کیا۔ بغاوت کی اور اسے قتل کیا۔

ایک دفعہ عمر بن یزید کا لڑکا یعنی ولید کے برادر زادے کا بیٹا ہارون الرشید کے پاس تنگ دستی کی حالت میں آیا۔ رشید نے اس کا حسب ونسب پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں قریشی ہوں۔ پوچھا کہ تفصیل سے بتاؤ کہ کس قبیلہ سے ہو۔ ابن عمر نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہارون الرشید نے کہا کہ جواب دو۔ میں تم کو امان دیتا ہوں خواہ تم مروان ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے بتایا کہ میں عمر بن یزید کا بیٹا ہوں۔ ہارون الرشید نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ولید پر رحم فرمائے اور یزید ناقص پر لعنت کیوں کہ اس نے ایسے خلیفہ کو قتل کیا جس پر امت کا اتفاق ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے ابن عمر کی حاجت پوری کر دی۔

یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ خلفائے بنو امیہ جو رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اور تابعین تھے، ایسے افعال کے مرتکب ہوئے جو ان کی بدنامی کا موجب ہیں۔ اب تک نبوت کا ادب تازہ تھا اور ممکن نہیں کہ اس زمانے میں ان میں وہ برائیاں موجود ہوں جو عام مسلمانوں میں بھی نہ تھیں۔ جنگ صفین اور شہادت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ایسے واقعات ہیں جن کا تعلق سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے جانشین کے عہد حکومت سے ہے اور یہ بنو امیہ کی بدنامی کی وجوہات ہیں۔ ان مسائل پر ہم گزشتہ جلدوں میں مفصل بحث کر چکے ہیں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یزید کی ولی عہدی کے بارے میں بھی ہم تفصیلی بحث گزشتہ جلد میں کر چکے ہیں۔ اس بارے میں مختلف روایات ہیں۔ شفقت پدری یا مسلمانوں میں خانہ جنگی کا خوف یا یزید کی ذاتی قابلیت یا کوئی اور خیال اس کا محرک ہو، بحث طلب امور نہیں ہیں۔ اگرچہ ہماری اپنی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک امر کم وبیش سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پیش نظر تھا، اس لیے ہر ایک مؤرخ نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس طرز انتخاب سے انحراف کیا جو ان سے پیشتر خلفاء کا دستور العمل تھا۔ اس کا جواب مختصر طور پر یہ ہے کہ اس سے پہلے انتخاب کا طریقہ بہ لحاظ ضرورت وقت مختلف رہا ہے، اور شوریٰ یا استخلاف یا وصیت میں طریقہ انتخاب مختلف ہے، اور بلحاظ واقعات اور ضرورت وقت اختلاف ہوتا رہا ہے اور ہو گا، اور صرف ضرورت وقت پر ہی انتخاب کے طریقہ کا انحصار ہے، اس لیے کسی خاص طریقہ انتخاب کو احسن نہیں کہا جا سکتا بلکہ ہر ایک انتخاب جو بہ تقاضائے ضرورت وقت عمل میں لایا جائے، اپنے موقع اور محل پر صحیح ہے۔ اس لیے اگر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس انتخاب سے انحراف کیا جس میں پیشتر ہی اختلاف موجود تھا تو کوئی قباحت نہیں کیونکہ ضرورت وقت اسی انتخاب کی مقتضی تھی۔

آیت ﴿وعداللہ الذین آمنو......﴾ میں یہ الفاظ کہ ﴿کما استخلف الذین من قبلھم﴾ صریحاً شخصی اور موروثی حکومت کو بھی وعدہ خداوندی میں شامل کرتے ہیں کیونکہ تاریخ اور مقدس کتابیں شاہد ہیں

Marfat.com

کہ مسلمانوں سے پہلے بھی یہ طرز حکومت مروج تھا اور سیدنا داؤد علیہ السلام کے بعد سیدنا سلیمان علیہ السلام اور ان کی اولاد نے مدت تک موروثی حکومت کو قائم رکھا۔ اور موروثی حکومت جائز نہ ہوتی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے سیدنا حسن کو کبھی بھی خلیفہ نہ بننے دیتے۔

سیدنا معاویہ کے انتقال کے بعد یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا اور بیعت کی تجدید کی گئی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور حسین بن علی رضی اللہ عنہ یہ چاروں بزرگ اکٹھے ہوئے اور آپس میں مشورہ کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "لا تفرقا جماعة المسلمين" یعنی مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تو سوچنے کی مہلت لے کر مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیعت عامہ کے بعد یزید کی بیعت کر لی۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ایک صاحب بصیرت شخص تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اگر انھوں نے اپنے جانشین کا فیصلہ اپنی زندگی میں نہ کیا تو امت میں اختلاف کے باعث خانہ جنگی کا آغاز ہو جائے گا، اور انھوں نے دوراندیشی کے باعث یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اس وقت بنوامیہ کسی اور قبیلہ کے رکن کی حکومت تسلیم نہیں کریں گے۔ جس وقت سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو اپنے بعد خلیفہ نامزد نہیں کیا اور لوگوں کا اجماع اور اتفاق سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت پر ہو گیا، اور مشورہ دیا کہ آپ بھی سنت رسول پر عمل کریں۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ "تم میں کوئی ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا نہیں اور مجھے اختلاف امت کا اندیشہ ہے۔" یہ جواب نہایت معقول تھا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو نامزد کر دیا اور فرمایا کہ اگر اختلاف امت کا اندیشہ نہ ہوتا تو سنت رسول پر عمل کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے اور آپ کے بعد کوئی ایسا شخص نہ تھا جو آپ کے مرتبہ کا ہوتا اور دنیائے اسلام اس کی بیعت پر متفق ہو جاتی۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: "آپ سچ کہتے ہیں، ہم میں کوئی شخص ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا نہیں ہے۔ اچھا، آپ بھی وہی طریقہ اختیار کریں جو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا۔ یعنی ایک ایسے شخص کے حق میں وصیت کی جو آپ سے نسباً بعید تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم میں کوئی عمر رضی اللہ عنہ جیسا نہیں۔ کہا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی تقلید کرو۔ آپ نے اپنے بعد چھ آدمیوں کو اہل شوریٰ مقرر کر کے انتخاب خلیفہ کا اختیار دیا۔ ان میں نہ ان کا لڑکا تھا اور نہ ان کا کوئی اور رشتہ دار۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ بن یزید بن معاویہ کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سیدنا عثمان ذوالنورین کو اپنے جانشین کے تقرر کے لیے یا اس کے متعلق کسی رائے کے ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا تھا کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت کی جائے۔ ایک روایت میں ہے کہ اشارتاً انھوں نے نصیحت کر بھی دی لیکن دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "اگر لوگ انھیں قبول کریں تو بہتر ورنہ جس شخص کو چاہو منتخب کر

Marfat.com

لو۔ معاویہ بن یزید بن معاویہ نے صرف تین ماہ اور بعض اقوال کے مطابق چالیس ماہ حکومت کی۔ ۲۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ لوگوں کو اکٹھا کر کے خطبہ دیا اور کہا:

''اے لوگو! میں تم پر حکومت کرنے سے معذور ہوں، اس لیے میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تقلید کرتا ہوں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے چھ آدمیوں کو ارباب شوریٰ مقرر کر کے انتخاب خلیفہ کا اختیار دے دیا، لیکن مجھے ایسے چھ آدمی اب نظر نہیں آتے، اس لیے میں تمھیں ارباب شوریٰ مقرر کرتا ہوں۔ جس کو مناسب سمجھو خلافت کے لیے منتخب کر لو۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بعد اہل عراق نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے منتخب کیا لیکن آپ نے ان کی بیعت پر اعتماد نہ کیا جس کی تفصیل ہم نے تاریخ اسلام جلد اول میں بیان کر دی ہے اور خلافت سے دست بردار ہو کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت پسند فرمالی۔ معاویہ بن یزید نے خلافت کا معاملہ شوریٰ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس وقت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حجاز اور عراق پر قابض ہو چکے تھے، لیکن شام اور مصر بنوامیہ کے بہی خواہ اور طرف دار تھے اور انھوں نے مروان کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی۔ اس دوران میں مروانیوں اور ضحاک بن قیس طرفدار عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے درمیان بیس (۲۰) روز تک ہنگامۂ کارزار گرم رہا۔ آخر کار محرم سنہ ۶۵ھ میں مروان بن حکم کامیاب ہو گیا لیکن چند روز میں حکومت میں کچھ ایسی خرابیاں پیدا ہو گئیں کہ اگر عبدالملک جیسا منتظم اور حجاج بن یوسف جیسا جابر شخص برسر حکومت نہ ہوتا تو شام، عراق پر، حجاز مصر پر اور خراسان سب پر حملہ آور ہوتا، اور اس بدنظمی اور بدامنی کا نتیجہ مسلمانوں اور اسلام کے حق میں سخت مضر ہوتا۔ خراسان میں عبداللہ بن حازم نے خودمختارانہ حکومت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی۔ کوفہ میں مختار ثقفی نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ سلمان بن صرد نے اہل عراق کو مشتعل کیا کہ خون حسین رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے کا صحیح وقت یہی ہے۔ نافع بن ارزق امیر خوارج نے سر اٹھایا۔ چند سال تک ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا رہا اور آخر کار بنوامیہ ہی کامیاب و کامران ہوئے، لیکن صرف معاویہ بن یزید کی ایک غلطی کا خمیازہ دنیائے اسلام کو بھگتنا پڑا اور ہزارہا مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہ گیا۔

صرف عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ آخر دم تک بیعت یزید سے انکار کرتے رہے کیوں کہ وہ خود اپنی خلافت کا اعلان کر چکے تھے اور مکہ مکرمہ کو انھوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بلکہ دارالخلافہ بھی بنا لیا تھا۔ لیکن سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ مختلف تھا۔ کوفہ پہنچنے تک تو انھوں نے یزید کی بیعت کا انکار کیا کیوں کہ کوفہ کے ارباب حل وعقد نے ابھی یزید کی بیعت نہیں کی تھی۔ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہ نیک نیتی سے یا حکمت عملی سے اس وقت تک دعویٰ خلافت نہیں کیا جب تک کہ واقعات کربلا نے ان کے لیے میدان صاف نہ کر دیا۔ اہل کوفہ سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو متواتر خط لکھے جن کی تعداد بارہ سے اٹھارہ ہزار آئی ہے۔ ان خطوط میں لکھا کہ آپ اس جگہ تشریف لائیں۔ ہم نے نعمان کے ہاتھ پر یزید کے لیے بیعت نہیں کی ہے۔ اگر آپ تشریف لائیں تو ہم اس گورنر نعمان کو اس جگہ سے نکال باہر کریں گے۔ آپ نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو اصل حالات معلوم کرنے کے لیے کوفہ کی طرف

Marfat.com

روانہ کیا۔ مسلم نے لکھا کہ اس وقت اٹھارہ ہزار اور دوسری روایت کے مطابق اسی ہزار افراد میرے ہاتھ پر آپ کی بیعت کر چکے ہیں اور روز بروز ان کی تعداد میں ترقی اور اضافہ ہو رہا ہے۔ آپ فوراً تشریف لائیں۔ اگر چہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ اور دیگر خیر خواہوں نے بہت سمجھایا لیکن سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے ان میں سے کسی کی بات کو نہ مانا اور اپنے بال بچوں سمیت کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں کربلا کا واقعہ پیش آیا۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی ذات میں اگر چہ ایک بہادر سپاہی کے جوہر موجود تھے لیکن واقعات کی رو سے اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا سیاسی معاملات میں بہت کم دخل تھا، اس لیے وہ اہل کوفہ کی باتوں میں آ گئے، اور اپنی اور اپنے حریف کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ وہ صرف اہل کوفہ کی لاف زنی پر دھوکہ کھا گئے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے ہمراہ بے شمار فوج تھی اور ان کی فوج کا جزو اعظم یہی اہل کوفہ تھا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے دور اندیشی سے نتائج پر نظر کی اور دعویٰ خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دعویٰ محبت اہل بیت صرف منہ کی باتیں تھیں جن کی حیثیت لاف زنی سے زیادہ نہ تھی۔ درحقیقت اہل کوفہ انقلاب پسند لوگ تھے، اس لیے ایک نہ ایک مدعی خلافت کو خروج پر آمادہ کرتے رہے۔ نہ خود چین سے بیٹھتے تھے اور نہ کسی کو چین لینے دیتے تھے۔ تعجب ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں پر کس طرح اعتماد کیا۔ اس بدعہد اور پیمان شکن جماعت میں سے ایک شخص نے بھی وقت پر ساتھ نہ دیا بلکہ میدان کربلا میں جب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو نام لے لے کر مخاطب کیا جنھوں نے آپ کو کئی خطوط لکھے تھے تو وہ یک قلم منکر ہو گئے کہ ہم نے تو کوئی خط نہیں لکھا۔ ان لوگوں کی لاف زنی، بزدلی اور بے وفائی کا حال سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اچھی طرح جانتے تھے کیوں کہ ان کے والد ماجد اور ان کے بڑے بھائی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی کے واقعات ان کے سامنے تھے لیکن پھر بھی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ان کے چکمے اور فریب میں آ گئے اور یزید کے دامن پر خون شہادت کا داغ رہ گیا۔

اموی حکومت کا امتیاز:

اموی حکومت کو اس زمانے میں ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ وہ یہ کہ خلافت بنو امیہ ایک خالص عربی حکومت تھی۔ ان لوگوں نے اگر چہ شام، مصر اور عراق کے سرسبز و شاداب شہروں میں سکونت اختیار کر لی تھی اور جنت دنیا دمشق میں دارالخلافہ قائم کیا تھا لیکن عرب کے ریگستانوں اور صحرائی زندگی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ خلفاء اور اشراف بنو امیہ اپنے لڑکوں کو ان ریگستانوں میں اس غرض سے بھیج دیا کرتے تھے کہ مبادا شامیوں اور غیر عربی اقوام کا اختلاط اصلی عربی زبان اور بدوی لب ولہجہ نہ بگاڑ دے، اور محکوم نسلوں سے میل ملاقات کا اثر بادیہ نشینوں کی فطری آزادی اور بہادری کے جوہر پر نہ پڑے۔ میسون بنت بحدل بن انیف کلبیہ یزید کی والدہ کا نام ہے۔

Marfat.com

قصر خضر واقع دمشق میں آسائش کے سب سامان موجود تھے لیکن وہ ہمیشہ عرب کی گرم ہواؤں کو یاد کر کے سرد آہیں بھرتی تھیں۔ قدرتی چشموں کے کنارے کھجوروں کے جھنڈ الغوطہ کے باغات سے زیادہ دل کش تھے۔ آخر اپنے بیٹے یزید کو اپنے ساتھ لے کر حجاز میں چلی آئیں۔

عبدالملک اپنے بیٹے ولید کو صرف اس لیے خلافت سے محروم رکھنے کا ارادہ کرتا تھا کہ وہ صحیح اور فصیح عربی بولنے سے عاری تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو تو اہل حجاز سے اس قدر ہمدردی تھی کہ ان کے وظائف مقرر کر دیے تھے اور ان کے نا ملائم کلمات سن کر بھی خاموش رہتے۔ یہ بھی ایک باعث تھا کہ عرب ہمیشہ ان کی خلافت کا پشت پناہ رہا، اور بنو عباس اور بنو فاطمہ کو فی الحقیقت عربیوں سے کچھ ہمدردی نہ تھی۔ ان کی نگاہ ہمیشہ عراق اور خراسان پر رہی۔ نہ عربیوں کو ان پر اور نہ ان کو عربیوں پر اعتماد تھا۔ اس لیے ابتدا میں جب کہ غیر اقوام حکومت کے لیے نا اہل تھیں بنو ہاشم کو کامیابی نہیں ہوئی، لیکن آخر میں انہی نو مسلم خراسانیوں کی امداد سے عباسی غالب آئے۔ اس وقت عربی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور بنو امیہ کے خلافت کے ساتھ عربی اقتدار بھی خاک میں مل گیا۔ برامکہ کی وزارت اور دیالمہ اور سلجوقیہ کی حکومت قائم ہو گئی۔

خلیفہ مہدی کے عہد خلافت میں داؤد بن یعقوب مدار المہام تھا۔ اس وقت اہل عرب کو معلوم ہوا کہ ان کا اقتدار بنو امیہ کے ساتھ معدوم ہو چکا ہے۔ بشار بن مرو نے ایک مرتبہ داؤد کی ہجو میں لکھا:

بنو امية هو الحال نومكم   ان الخليفة يعقوب بن داؤد

بنو امیہ تم بہت سو چکے، اب خواب غفلت سے اٹھو کیوں کہ ان دنوں یعقوب بن داؤد خلیفہ ہے۔

ضاعت خلافتكم ياقوم فالتمسوا   خلافة الله بين النائي والعود

اے قوم عرب! تمھاری خلافت ضائع ہو چکی، اگر تم کو خدا کی خلافت کی جستجو ہو تو اسے بانسری اور عود میں ڈھونڈو۔

بنو امیہ کی عظیم الشان فتوحات کی مثال ان کے جانشین خلفاء (عباسیوں) میں نہیں ملتی، ولید بن عبدالملک کے عہد میں ایک طرف دریائے سندھ اور دوسری جانب فرانس تک اس باعظمت حکومت کے حدود پھیلے ہوئے تھے۔ موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، قتیبہ بن مسلم اور امیر مہلب نے فتوحات کے سلسلے میں بعد المشرقین کو ملا دیا۔ اس کے ساتھ اگر خوارج کی بغاوتوں اور مدعیان خلافت کے خروج پر جن کے فرو کرنے میں عبیداللہ بن زیاد اور حجاج بن یوسف کا ظلم ضرب المثل ہو گیا۔ غور کیا جائے تو بنو امیہ کی فتوحات کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ اندرونی خرخشوں کے مٹانے اور سلطنت کے حدود و ثغور کی وسعت میں اضافہ کرنے میں مشغول تھے۔ بنو امیہ کے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ بزور شمشیر ملکوں کو فتح کیا اور اپنے بعد مسلمانوں کے حوالے کیا۔ قومیت کبھی محکوم نہیں ہوتی۔ زبردست طاقت اسے کچھ عرصہ کے لیے محکوم اور مغلوب کر سکتی ہے، مگر بنو امیہ کی فتوحات کا یہ بھی خاصہ ہے کہ اس نے مفتوحہ ممالک کو دارالاسلام بنا دیا۔ بنو امیہ

Marfat.com

کے جانشین (عباسی) اس تعریف کے مستحق نہیں۔ ان کی فتوحات کبھی ان حدود کو نہیں پہنچیں جو بنوامیہ نے قائم کی تھیں۔ ان کی کوششیں شام سے بنوامیہ کی بیخ کنی کے بعد مسلمانوں ہی سے لڑنے مرنے میں صرف ہوئیں۔ مؤرخین نے بنوامیہ کے عہد میں سرکاری انتظام اور غیر اقوام سے لڑائیوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ اس دور میں ان امور کی طرف سے غفلت نہایت قابل ملامت باقی تھی۔ بحری لڑائیوں کی طرح سب سے پہلے بنوامیہ کے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ڈالی اور بحری جنگی بیڑہ کے ذریعے بحیرہ روم میں بنوامیہ نے کئی جزیروں کو مسخر کیا۔

بنوامیہ نے اشاعت اسلام میں سعی بلیغ کی، اور یہ ایسا احسان ہے جس کے بارے میں موجودہ زمانے کے مسلمان سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ شام، مصر، خراسان اور افغانستان میں اسلام اسی دور میں پھیلا، اور یہی وجہ ہے کہ یہ ممالک اب تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔ بنوامیہ کا احسان تمام دنیا پر ہے جس کے اہل یورپ بھی معترف اور مداح ہیں۔ علوم و فنون کو نہایت فیاضی سے غیر اقوام میں رواج دیا، اور سچ تو یہ ہے کہ یورپ کو جہالت کی تاریکی سے انہی لوگوں نے نکالا کیوں کہ تاج داران اندلس بنوامیہ میں سے تھے۔

معاویہ بن یزید نے خلافت کو کسی جانشین کی سرپرستی میں نہیں چھوڑا۔ مکہ مکرمہ میں سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے دعویٰ خلافت کر دیا اور حجاز اور عراق سے اس کی تائید ہوئی۔ اس وقت مروان رضی اللہ عنہ والیٔ مدینہ تھے۔ انھوں نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت کا ارادہ کیا لیکن افواہاً سنا کہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ بنوامیہ کو بے دریغ تہ تیغ کر دیا جائے۔ یہ سن کر مروان رضی اللہ عنہ نے سیدھا شام کا راستہ لیا۔ عبیداللہ بن زیاد کوفہ سے بھاگ کر مروان رضی اللہ عنہ سے آملا۔ اس وقت دمشق میں دو فریق تھے۔ ایک مروان رضی اللہ عنہ اور دوسرے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا طرف دار گروہ۔ ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ نے اہل دمشق سے اس امر کی بیعت لی تھی کہ جب تک لوگوں کا اتفاق کسی امر پر نہ ہوگا اس وقت تک میں تمھاری امارت کروں گا اور درپردہ ضحاک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ہواخواہوں میں سے تھے لیکن مروان رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء جو اس وقت مقام جابیہ میں پڑے ہوئے تھے اور بے صبری سے ضحاک بن قیس کے فیصلے کے منتظر تھے۔ آخر کو ان کو پتہ چل گیا کہ ضحاک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ہواخواہ ہے، اس لیے ان لوگوں نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔ کل بنوامیہ، بنوکلب، بنوغسان، بنوسکاسک اور بنو طے نے مروان رضی اللہ عنہ کی امارت کو تسلیم کر لیا۔ اس وقت ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ مرج راہط میں ایک ہزار سواروں کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ مروان رضی اللہ عنہ پانچ ہزار کی جمعیت کے ساتھ اس طرف آئے۔ رفتہ رفتہ طرفین کی جمعیت کو تقویت ملتی گئی اور آخر میں ضحاک بن قیس کا پلہ بھاری ہو گیا۔ مروان رضی اللہ عنہ کے لشکر کی تعداد صرف تیرہ ہزار تھی جس میں اکثر پیادہ تھے، اور ضحاک رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ساٹھ ہزار آدمی تھے جن میں سے اکثر و بیشتر سوار تھے۔ بیس روز تک ہنگامۂ کارزار گرم رہا۔ یزید بن ابی انیس غسانی نے ضحاک کے عامل کو دمشق سے نکال دیا اور مروان رضی اللہ عنہ نے ضحاک رضی اللہ عنہ کو مرج راہط میں شکست دی اور دمشق پر قابض ہو گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد مصر بھی ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے قبضے سے نکل گیا۔ اس وقت بنوامیہ مصر اور شام دونوں پر قابض تھے جب کہ عبداللہ بن

Marfat.com

زبیر رضی اللہ عنہ حجاز اور عراق پر حکمران تھے۔ عراق پر ان کا بھائی مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ گورنر تھے۔ مصعب عراق سے شام کی طرف ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کی کمک کے لیے بڑھا لیکن اس سے پیشتر واقعۂ مرج راہط ضحاک کا فیصلہ کر چکا تھا۔ عمرو بن سعید بن العاصی دمشق سے اس کے استقبال کے لیے نکلا مصعب شکست خوردہ واپس ہوا۔ سنہ ۶۵ھ میں مروان رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا اور عبدالملک سریر خلافت پر متمکن ہوا۔ حجاج بن یوسف، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اور عبدالملک بذات خود مصعب کے مقابلے کے لیے نکلے۔ اہل عراق میں سے اکثر صاحب اثر و رسوخ اور سربرآوردہ اشخاص در پردہ عبدالملک کے حامی تھے۔ عبدالملک نے مصعب کو لکھا کہ باہمی خانہ جنگی اور مسلمانوں کی خون ریزی سے کچھ فائدہ نہیں۔ آؤ، امر خلافت کو شوریٰ کے سپرد کر دیں۔ مصعب نے جواب دیا کہ ہمارے مابین کوئی چیز سوائے تلوار کے فیصلہ نہیں کر سکتی۔'' آخر تلوار ہی نے فیصلہ کیا۔ عین میدان جنگ میں بعض عراقی افسر جو در پردہ عبدالملک سے ملے ہوئے تھے، کھسک گئے۔ ابن خلدون نے آخری نظارہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ''اس وقت تن تنہا مصعب اور اس کے معدودے چند ساتھی رہ گئے۔ باقی کل اہل عراق دور سے کھڑے نظارہ دیکھ رہے تھے۔ محمد بن مروان عبدالملک کے بھائی نے مصعب کے قریب پہنچ کر آواز بلند کہا: ''میں تمھارا چچا زاد بھائی محمد بن مروان ہوں تم امیرالمومنین کی امان قبول کر لو۔'' مصعب نے اس سے انکار کیا۔ اس پر محمد بن مروان نے اس کے لڑکے عیسیٰ سے پکار کر کہا: ''تم کو اور تمھارے باپ کو امان دی جاتی ہے۔'' عیسیٰ نے اپنے باپ مصعب کو کہا، مصعب نے جواب دیا: ''میرا خیال ہے کہ اہل شام تمھارے ساتھ ایفائے وعدہ کریں گے۔ بہتر ہو کہ تم امان حاصل کر لو۔'' عیسیٰ نے کہا: ''میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ کل قریش کی عورتیں کہیں گی کہ خود کو بچانے کی غرض سے میں آپ سے علیحدہ ہو گیا۔'' مصعب نے کہا کہ ''اپنے چچا کے پاس چلے جاؤ اور ان کو اہل عراق کی سازش اور بے وفائی کا حال بتانا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ جاؤ۔ میں اپنے آپ کو مقتول سمجھتا ہوں۔'' عیسیٰ نے جواب میں کہا کہ میں آپ کو چھوڑ نہیں سکتا۔ بہتر ہو کہ آپ بصرہ کی طرف چلیں یا پھر مکہ میں چچا کے پاس تشریف لے جائیں۔'' مصعب نے آہ سرد کھینچ کر کہا: ''میدان جنگ سے بھاگنا عار ہے۔ اچھا تم آگے بڑھو میں تمھاری امداد پر ہوں۔'' عیسیٰ بن مصعب نے شامیوں پر حملہ کیا اور میدان جنگ میں کام آئے۔ عبدالملک نے پھر ایک دفعہ منت سے امان قبول کرنے کو کہا لیکن مصعب انکار کرتے رہے۔ آخر نہایت مردانگی سے لڑتے ہوئے جان دی۔ عبدالملک کوفہ کے گورنر ہاؤس میں داخل ہوا تو مصعب کا سر پیش کیا گیا۔ ایک شخص نے حاضرین میں سے کہا: ''امیرالمومنین! یہ قصر نہایت منحوس ہے۔ میں نے اسی قصر میں حسین رضی اللہ عنہ کا سر عبیداللہ کے سامنے دیکھا۔ پھر عبیداللہ بن زیاد کا سر مختار ثقفی کے سامنے دیکھا۔ پھر مختار کا سر مصعب بن زبیر کے سامنے دیکھا اور آج مصعب کا سر آپ کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ خدا خیر کرے۔'' عبدالملک کے دل پر ان عجیب واقعات کا بہت اثر ہوا اور اس نے قصر کو چھوڑ دیا۔

حجاج بن یوسف نے سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو محاصرہ کیا۔ آخر وقت میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے

Marfat.com

دولڑکے حمزہ اور حبیب بھی حجاج سے آ ملے۔ ان کا بھائی عمرو بن زبیر پہلے ہی آپ کا سخت مخالف تھا۔ غرض یہ حالت تھی کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی والدہ اسماء بنت ابی بکر سے رخصت ہوئے اور دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور کام آئے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ قریش کے مشہور شہسوار تھے۔ آپ کی فصاحت کا یہ عالم تھا کہ جہاں خطبہ دیتے درودیوار بول اٹھتے۔

واقعات کربلا کے بعد اہل عراق کی انقلاب پسند طبیعت میں ایک دفعہ پھر جوش پیدا ہوا۔ وہ ایک دوسرے کو ملامت کرتے تھے کیوں کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا۔ ان لوگوں کا سردار سلیمان بن صرد تھا۔ پہلے تو یہ لوگ میدان کربلا میں آئے اور ایک جگہ گزشتہ افعال پر نادم ہو کر زاروقطار روتے رہے۔ بعد ازاں یہ جماعت تائب ہو کر ربیع الثانی ۶۵ھ میں عین الوردہ کی طرف بڑھی۔ کسی شخص نے کہا کہ ''حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل تو سب کوفہ میں موجود ہیں، شام میں جا کر کیا کرو گے۔'' سلیمان نے کہا کہ یہ لوگ تو کرایہ کے ٹٹو تھے۔ اصل قاتل تو عبیداللہ بن یزاد ہے، اسے قتل کرنا چاہیے۔ اس وقت سلیمان میں صرد اور مسیب بن بخبہ، عبداللہ بن سعد، عبداللہ بن دال اور رفا بن شداد پانچ شخص قصاص حسین رضی اللہ عنہ پر تلے ہوئے تھے اور ان کا دلی جوش دوسرے اشخاص پر اثر ڈال رہا تھا۔ عین الوردۃ کے غربی جانب ڈیرے ڈال لیے۔ عبیداللہ بن زیاد حصین بن نمیر کو مقابلہ کے لیے بھیجا۔ جماعت تائب بیس (۲۰) ہزار کے قریب تھی۔ حصین بارہ ہزار کے ساتھ مقابلہ میں آیا۔ چند روز میدان کارزار گرم رہا۔ اس عرصے میں شامیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ آخر ایک روز زور شور کی لڑائی ہوئی کہ غروب آفتاب کے بعد رفاعہ بن شداد نے توابین کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ کل افسر کام آ گئے ہیں اور گنتی کے سپاہی باقی رہ گئے ہیں۔ مجبوراً میدان جنگ چھوڑ کر کوفہ کا راستہ لیا اور چند دنوں بعد اس ہزیمت خوردہ چھوٹی سی جماعت کا شیرزاہ بکھر گیا اور ہر ایک شخص نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ یہ واقعہ سنہ ۶۵ھ کا ہے۔ اس وقت تک مروان رضی اللہ عنہ زندہ تھے۔ پھر رمضان المبارک میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مختار ثقفی محمد بن علی (ابن حنفیہ) کا نقیب تھا۔ محمد بن علی نے اس شخص کو خون حسین رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے پر مامور کیا تھا۔ اس وقت قاتلان حسین رضی اللہ عنہ کے برخلاف عراق میں آواز بلند ہو رہی تھی۔ مختار کے پاس کافی جمعیت ہو گئی، اور آخر کوفہ پر قابض ہو گیا۔ کوفہ اس وقت عجیب مصیبت میں گرفتار تھا۔ لوگ بے سروسامانی کی حالت میں بھاگ رہے تھے اور مختار کے سپاہی ان لوگوں کو چن چن کر قتل کرتے تھے۔ لاشوں کو آگ میں جلاتے، کتوں اور مردار خور جانوروں کے آگے ڈالتے۔ ان میں شمر ذی الجوشن اور عمر بن سعد بھی تھے۔ سنہ ۶۶ھ میں مختار کوفہ کی مہم اور خون ریزی سے فارغ ہوا تو عبیداللہ بن زیاد کی فکر دامن گیر ہوئی اور ابراہیم بن مالک الاشتر کی زیر قیادت ایک مہم روانہ کی۔ ایک کرسی جس پر طلائی مطمع تھا اس فوج کے درمیان تھی۔ بنی اسرائیل کے تابوت سکینہ کی طرح لوگ نہایت عزت واحترام سے اسے اٹھائے ہوئے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ کرسی سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تھی۔ سرزمین موصل پر ایک نہر کے کنارے عبیداللہ بن زیاد سے مقابلہ ہوا۔ شامیوں کے

Marfat.com

بڑے بڑے سردار اس جنگ میں کام آئے۔ عبیداللہ بن زیاد کا سر مختار کے سامنے کوفہ میں پیش کیا گیا۔ مختار کی بہادری اور الوالعزمی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ لوگ اس قتل و غارت سے اس قدر تنگ آ گئے کہ عبداللہ بن زبیر کے پاس فریاد کی۔ آپ نے اپنے بھائی مصعب کو اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا مختار کوفہ کے گورنمنٹ ہاؤس میں محصور ہو گیا اور اسی جگہ قتل کیا گیا۔ ان تمام واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد اس کی زندگی کے آخری ایام سے لے کر سنہ ۷۵ھ تک ملک میں عام بدنظمی اور انارکی کا رواج رہا جس کا خاتمہ عبدالملک بن مروان کے پرزور ہاتھوں نے کیا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شیعان علی کا ایک گروہ ان سے الگ ہو گیا جو خوارج کہلائے۔ یہ فرقہ بنو ہاشم کا بھی ایسا ہی دشمن تھا جیسا بنو امیہ کا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے جانشینوں کے عہد میں یہ لوگ وقتاً فوقتاً سر اٹھاتے رہے۔ کچھ عرصہ ادھر ادھر ملک میں لوٹ مار کرتے۔ جب ان کے مقابلے میں کوئی نامی افسر آتا تو پھر جی توڑ کر لڑتے۔ میدان جنگ سے بھاگنا عار سمجھتے یہاں تک کہ ان کی فوج کا آخری سپاہی بھی میدان جنگ ہی میں کام آتا۔ یہ ملک کی مختلف میں کام آتے کم ہو گئے لیکن پھر تھوڑے ہی عرصے میں ان کی تعداد پھر ہزاروں میں ہو جاتی اور پھر وہی ہنگامہ برپا کرتے۔ عبدالملک بن مروان کے عہد تک خوارج باہمی اختلاف سے بچے رہے، لیکن اس وقت ان کے چار فرقے ہو گئے، ان میں سے ایک ازارقہ کہلاتا تھا۔ یہ لوگ نافع بن ازراق کے مقلد تھے۔ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ سوائے ہمارے باقی سب مسلمان کافر ہیں، اس لیے ان کا قتل کرنا اور ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز ہے اور اس کا عملی ثبوت بھی ان لوگوں نے خاطر خواہ دیا۔ دوسرا فرقہ ''نجدیہ'' تھا جو نجد بن عامر بن عبداللہ بن سیار کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ یہ شخص پہلے نافع بن ازرق کے رفقاء میں سے تھا، لیکن بعد میں ابن ازرق کے عقائد سے مخالفت کی اور یمامہ کی طرف چلا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس کے ہم رکاب ہزارہا آدمی ہو گئے۔ تیسرا فرقہ ''ریاضیہ'' تھا جو عبداللہ بن ریاض مری کے پیروکار تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عام مسلمان جو غیر خوارج ہیں، منافق ہیں اور ان کے ساتھ رشتہ مناکحت جائز ہے اور ان کی وراثت بھی حرام نہیں ہے۔ چوتھا فرقہ ''صفریہ'' تھا جو ابن صفار کی طرف منسوب ہے لیکن بعض مؤرخین نے اس کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ کثرت عبادت سے ان کے چہروں کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ یہ لوگ فرقہ ریاضیہ کے اکثر عقائد میں ہم خیال تھے مگر کسی قدر نرمی اور آشتی پسند تھے۔ ان لوگوں کے اعمال پر ان کے عقائد کا بہت اثر تھا۔ ایک دفعہ نجدہ نے بحرین پر قابض ہو کر مکہ مکرمہ میں غلہ اور جنس کی مد بند کر دی تھی۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ ''رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جب ثمامہ بن آثال مسلمان ہوا تو اس نے مکہ کے لوگوں پر رسد و غلہ کی آمد روک دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تحریر فرمایا کہ اہل مکہ سے رسد کو نہ روکو۔ چنانچہ ثمامہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی، حالانکہ اہل مکہ اس وقت کفر و شرک میں مبتلا تھے۔ نہایت افسوس ہے کہ تم نے بھی رسد و غلہ کو روک دیا حالانکہ ہم لوگ مسلمان ہیں۔'' نجدہ سخت نادم ہوا اور غلہ و رسد کی ممانعت کا حکم منسوخ کر دیا۔ حجاج اور مہلب ان

Marfat.com

لوگوں کے سرکوب تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مہلب کی تو تمام عمر ہی خوارج کے مقابلہ میں بسر ہوئی۔ خوارج بھی اپنی بات کے ایسے پکے تھے کہ قتل ہو گئے لیکن اپنے عقائد سے باز نہ آئے۔ حجاج کی تیغ آب دار نے ہزار ہا کو قتل کیا لیکن چندروز کے بعد ان کا شمار پھر ابتدائی تعداد تک پہنچ گیا۔ بنوامیہ کے زوال کا باعث تو خوارج تھے مگر سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی امارت کو کمزور کرنے میں ان کا حصہ دیگر اسباب سے کم نہیں۔ افسوس ہے کہ ان لوگوں نے زہد خشک کو اس انتہا تک پہنچا دیا تھا کہ مسلمان ان کی موجودگی میں زندگی امن وعافیت سے بسر نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ان کے زہد وتقویٰ کا اثر ان کی طبائع پر اسی حد تک ہوتا کہ وعظ ونصیحت سے لوگوں کو راہ ہدایت کی طرف لاتے تو غالباً وہ ہمدردی جو اکثر اشخاص کو ان کے ساتھ تھی، زیادہ مفید ثابت ہوتی۔ ضحاک، شبیب اور ابوحمزہ نے بنوامیہ کے صد سالہ عہد کو بغاوتوں میں ختم کر دیا۔

سنہ ۷۶ھ میں صلاح بن مسرح تمیمی نے شبیب کے ساتھ خروج کیا۔ صالح اسم بامسمّٰی تھا۔ فرقہ صفریہ کے عقائد کا سختی سے پابند اور عابد وشب زندہ دار تھا۔ سرزمین موصل اور جزیرہ میں اکثر مقیم رہتا۔ اس کے شاگرد بھی کثرت سے تھے جن کو یہ قرآن وفقہ کی تعلیم دیتا تھا، اور کبھی کبھی کوفہ میں اپنے احباب اور تلامذہ کو ملنے کے لیے آجاتا تھا۔ وہ لوگ اس کی ضروریات زندگی مہیا کر دیا کرتے تھے۔ حجاج بن یوسف صالح کو قتل کرنا چاہتا تھا، مگر پیشتر اس کے کہ حجاج اپنے ارادہ میں کامیاب ہو، صالح نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ موصل کے قریب ایک خون ریز لڑائی کے بعد صالح مارا گیا۔ خوارج قلعہ میں پناہ گزین ہو گئے اور شبیب ان کا سردار مقرر ہوا۔ شبیب کی پیدائش کے متعلق یہ روایت ہے کہ سنہ ۲۵ھ میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان رضی اللہ عنہ نے شام ایک لشکر قیصر کے مقابلہ میں روانہ کیا۔ اس میں یزید بن نعیم بھی تھا۔ مال غنیمت میں ایک نوجوان یونانی عورت ہاتھ آئی۔ یزید اسے اپنے ہمراہ لایا اور اسے آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ شبیب اس کے بطن سے دسویں ذی الحجہ کو پیدا ہوا۔ اس کی والدہ نے خواب دیکھا کہ ایک شعلہ اس کے سامنے زمین سے اٹھا اور آسمان تک بلند ہو کر شش جہات میں پھیل گیا۔ بعدازاں آگ کا ایک انگارا زمین کی طرف آیا اور دریا میں گر کر بجھ گیا۔ اس خواب کی تعبیر شبیب کے کارناموں اور انجام سے واضح طور پر بیان ہوتی ہے۔ قلعہ میں محصور تھا اور دشمنوں نے رات کے وقت لکڑیوں کا انبار لگا کر چاروں طرف آگ لگا دی۔ شبیب اپنے ساتھیوں کو لیے ہوئے نکلا۔ گھوڑوں کی زین پوش کو پانی میں بھگو کر بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالتے ہوئے دشمن پر شب خون مارا اور فتح کے بعد کوفہ کا رخ کیا۔ حجاج اس وقت بصرہ میں تھا۔ جب اس کو معلوم ہوا تو دو منزلہ کرتا ہوا کوفہ کی طرف آیا لیکن اس کے آنے سے قبل شبیب کوفہ پر قابض ہو چکا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ بہت کم جمعیت تھی، اس لیے وہ کوفہ میں قیام کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ شبیب کی شہ زوری میں اس قدر مبالغہ کیا گیا کہ اس نے چلتے چلتے گورنمنٹ ہاؤس کے بڑے دروازہ کو ایک ہی ضرب گرز سے توڑ دیا۔ حجاج نے اس کے تعاقب میں یکے بعد دیگرے کئی نامی افسر روانہ کیے۔ شبیب نے ان سب کو شکست فاش دی۔ حجاج نے تنگ آ کر عبدالملک کو لکھا کہ ”عراقی کرایہ کے ٹٹو ہیں، خوارج کے

Marfat.com

مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے، مناسب یہ ہے کہ اہل شام سے ہماری امداد فرمائیں۔'' عبدالملک نے سفیان بن ابرو کے ماتحت ایک لشکر جرار روانہ کیا۔ حجاج کوفیوں سے ایسا جلا ہوا تھا کہ سب کو ایک جگہ اکٹھا کر کے تقریر کی کہ ''اے اہل کوفہ! جو شخص تمھارے بل پر عزت و غلبہ کا خواہاں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو کبھی سرخرو نہیں کرے گا اور خدا اس کی امداد نہیں کرے گا جو تمھاری مدد کا طالب ہو۔ مجھے تمھاری کچھ احتیاج نہیں۔ جہاں تمھارے سینگ سمائیں، جاؤ اور اپنی منحوس صورت مجھے نہ دکھاؤ۔ حیرہ میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ رہائش اختیار کرو۔ مسلمانوں کی ہمسائیگی تمھاری بزدلی اور بے ایمانی کی مقتضی نہیں۔

شبیب کی بیوی غزالہ نے نذر مانی تھی کہ کوفہ کی جامع مسجد میں دو رکعت نماز میں سورہ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھوں گی۔ اس نذر کو پورا کرنے کے لیے شبیب رات کے وقت غزالہ کے ہمراہ کوفہ میں داخل ہو گیا اور غزالہ نے اپنی نذر پوری کی اور صحیح و سلامت اپنے لشکر میں چلا آیا۔ حجاج کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو سخت برافروختہ اور بذات خود شبیب کے تعاقب میں چلا۔ سخیہ میں لڑائی ہوئی۔ اس جنگ میں شبیب کی عورت لڑتے ہوئے کام آئی۔ اس کی لاش حریفوں کے ہاتھ لگی لیکن شبیب نے لڑتے ہوئے چھین لی۔

آخری لڑائی اہواز پر شامی لشکر اور شبیب کے درمیان ہوئی۔ شبیب نے پل کے ذریعہ دجلہ کو عبور کیا اور متواتر بیس (۲۰) نہایت سخت حملے کیے لیکن شامی لشکر اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ شامیوں کے حملے کے سامنے خوارج ٹھہر نہ سکا اور پل کے ذریعے دوسرے کنارے پر آ گئے۔

شبیب میدان جنگ میں کھڑا تھا۔ اس وقت صرف سو آدمی اس کے گرد حلقہ باندھے ہوئے تھے۔ شامیوں کی طرف سے تیر بارش کی طرح برس رہے تھے۔ شبیب نے اپنے ساتھیوں کو مراجعت کا اشارہ کیا۔ وہ بذات خود عقب میں رہا۔ تمام سپاہی پل سے عبور کر گئے۔ شبیب ابھی تک پل کی دوسری طرف سوار تھا۔ پل پر آہستہ آہستہ گھوڑے کے قدم کے نیچے ایک پتھر آ گیا۔ گھوڑا بدک کر کشتی کے کنارے پر جا پہنچا۔ شبیب سنبھل نہ سکا اور پانی میں آ رہا۔ پہلے غوطہ کے بعد سطح پر آیا تو کہا: "كان امر الله مفعولاً" دوسرا غوطہ کھایا تو پھر ابھرا تو کہا: "ذالك تقدير العزيز العليم"۔ تیسرے غوطہ کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا۔

ابوحمزہ کا نام مختار بن عوف تھا۔ یہ بصرہ کا رہنے والا تھا۔ خوارج ''ریاضیہ'' کے عقائد کا پابند تھا۔ ہر سال موسم حج میں مکہ مکرمہ آتا تھا اور لوگوں کو مروان بن الحکم کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ سنہ ۱۲۹ھ میں عبداللہ بن یحییٰ طالب حق سردار حضرموت اس کا معتقد ہو گیا۔ دوسرے سال ابوحمزہ سات سو کی جمعیت سے اس جگہ آیا۔ اس وقت گورنر حجاز عبدالواحد بن سلیمان بن عبدالملک تھا۔ اس نے ایام حج کے اختتام اور حجاج کی واپسی تک مصالحت کی درخواست کی اور اس امر کے تصفیہ کے لیے عبیداللہ بن حسن بن حسن رضی اللہ عنہ اور محمد بن عبداللہ بن عمر بن عثمان رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ، عبیداللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن عمر خطاب رضی اللہ عنہ اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کو دوسرے بزرگوں کے ساتھ بھیجا۔ ابوحمزہ علوی عثمانی بزرگوں کے نام سے ناک بھوں

Marfat.com

چڑھانے لگا، لیکن سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اولاد کو دیکھ کر خوش ہو گیا اور کہا کہ ہم تمھارے ہی اجداد کی نیک سیرت کو شہرت دیتے ہیں اور انہی کے اقتداء کے خیال سے خروج کیا ہے۔ عبیداللہ بن حسن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''ہم اس غرض سے تمھارے پاس نہیں آئے ہیں کہ ہمارے آباء واجداد کی باہمی تفصیل بیان کرو بلکہ ہم اس غرض سے تمھارے پاس امیر کی طرف سے سفیر بن کر آئے ہیں۔'' آخر صلح ہو گئی لیکن عبدالواحد اس عہد و پیمان کو وفا نہ کر سکا۔ ابوحمزہ بے تکلف اہل مدینہ کے لشکر میں آیا، مگر ان لوگوں کو در پردہ خوارج پر حملہ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ ابوحمزہ نے یہ حال معلوم کر کے کہا کہ ''اے اہل مدینہ! تم لوگ ہم سے جنگ نہ کرو، ہم اپنے دشمن سے سمجھ لیں گے۔'' مگر اہل مدینہ نے کچھ نہ سنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خون ریز لڑائی میں قبیلہ قریش کے سات سو آدمی مارے گئے۔ عبدالواحد شام کی طرف چلا گیا، اور ۱۵ر صفر سنہ ۱۳۰ھ میں ابوحمزہ مدینہ طیبہ میں داخل ہوا۔ اس جگہ ایک تقریر کی جس کو صاحب عقد الفرید نے نقل کیا ہے۔ اس نے اہل مدینہ کو مخاطب کر کے کہا کہ ''ہم تمھیں تقویٰ اور کتاب اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر طاعت وعمل کی وصیت کرتے ہیں۔'' اس کے بعد اہل مدینہ کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ "اولکم خیر اولکم وآخر کم شر آخر کم۔" اور گزشتہ اور موجودہ حالتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا: ''تمھارے آباء واجداد اہل یقین اور دین کے معاملے میں اہل معرفت تھے اور تم اہل ضلالت اور جہالت ہو۔ اس کے بعد تمام خلفاء کو ایک ایک کر کے شمار کیا اور ان کے عیوب ونقائص بیان کیے لیکن سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تعریف میں رطب اللسان رہا۔ اس کی جادو بیانی کا یہ اثر تھا کہ جس شخص نے بھی اس کی تقریر سنی وہ کہتا تھا کہ "من زنیٰ فھو کافر و من سرق فھو کافر" یعنی جس نے زنا کیا وہ کافر ہے اور جس نے چوری کی وہ کافر ہے۔

خوارج کی ان آئے روز کی بغاوتوں نے شجر بنوامیہ کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عہد خلافت نے ان کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیا۔ اگرچہ آپ کے زمانے میں بغاوتوں کی طرف سے امن تھا لیکن آپ کا طریق عمل وہ کام کر رہا تھا جو شاید ایسی بغاوتوں سے بہت مدت بعد ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ہر ایک تعریف کے مستحق ہیں۔ آپ کا شمار خلفائے راشدین میں ہونا چاہیے لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آپ نے بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ زمانہ آپ کی خلافت کا مقتضی نہیں تھا۔ بنوامیہ اور بنوہاشم کے تعلقات خاصے کشیدہ تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے عنان حکومت ہاتھ میں لے کر پہلا کام یہ کیا کہ بنوہاشم اور بنوامیہ کو آپس میں ناملائم الفاظ کہنے سے روک دیا۔ آپ بنوہاشم کی رعایت کرتے اور ان سے نہایت عزت واحترام سے پیش آئے۔ اگر آپ کی مثل کوئی شخص بنوہاشم میں ہوتا تو غالباً خانہ جنگی کا خاتمہ ہو جاتا اور حکومت پھر خلافت راشدہ کے اصولوں پر قائم ہو جاتی۔ لیکن یہ تو نہ ہوا مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو عباس کو بھی دعویٰ خلافت کے اظہار کا موقع مل گیا، اور بنوہاشم نے آپ کی رعایتوں کا خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس نے اپنے دعاۃ کو پوری مملکت اسلامیہ میں پھیلا دیا اور خفیہ کارروائیوں میں مصروف

Marfat.com

ہو گئے۔ اس وقت آئندہ بغداد کی عظیم الشان حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ آپ کے جانشینوں میں سے ہشام بن عبدالملک کے عہد میں اور زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت نے ۱۲۳ھ میں بنو ہاشم میں ایک جوش پیدا کر دیا۔ بنوعباس نے چار مرتبہ خروج کیا۔ ولید بن یزید بن عبدالملک کے زمانے میں یحییٰ بن زید نے خروج کیا اور وہ قتل کیے گئے۔ علویوں اور فاطمیوں کے خون کا قصاص بنوعباس کے خروج کا ایک بہانہ تھا۔ یزید ناقص کے عہد میں حمص اور فلسطین میں بغاوت ہوئی۔ اہل یمامہ اور عامل خلافت کے درمیان جنگ ہوئی۔ اہل خراسان کے اختلاف نے بدامنی کو رواج دیا۔ بنوعباس نے مناسب موقع دیکھ کر علم بغاوت بلند کیا۔ یزید ناقص کہا کرتا تھا۔

انا ابن کسریٰ وابی مروان وقصر جدی و جدی خاقان

یعنی میں کسریٰ کا نواسا ہوں اور مروان کا بیٹا ہوں، میرا نانا قیصر روم اور خاقان ہے۔

اس کی والدہ کا نام شاہ فرند تھا جو فیروز بن یزدگرد بن شہریار بن کسریٰ کی لڑکی تھی۔ فیروز کی ماں شیرویہ بن کسریٰ کی بیٹی تھی اور شیرویہ کی ماں خاقان بادشاہ ترک کی بیٹی تھی۔ اور فیروز کی نانی قیصر روم کی بیٹی تھی۔ ان تعلقات نے عربی حمیت وشجاعت کو بھی معدوم کر دیا۔ یزید کی وفات پر ابراہیم بن الولید بن عبدالملک اور مروان بن محمد بن مروان نے ایک دوسرے کے خلاف فوج کشی کی۔ دار عبدالعزیز میں حجاج بن عبدالملک ابراہیم نے خلافت سے دست برداری کی اور مروان تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس کے زمانے میں عام بغاوتوں نے بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ابومسلم خراسانی نے دعاۃ عباسیہ کو دولت عباسیہ کی دعوت کے لیے چاروں طرف پھیلا دیا۔ ابومسلم امام ابراہیم کے لیے لوگوں سے بیعت لیتا تھا ابراہیم مروان کی جیل میں ہی مر گئے، اور اپنے بعد اپنے بھائی ابوالعباس عبداللہ کو اپنا جانشین بنا گئے۔ مروان کو ایک دم ان بغاوتوں جو ملک کے ہر ایک حصہ میں برپا ہو رہی تھیں۔ بنوعباس کے داعی ہر شخص کو بھڑکا اور ابھار رہے تھے۔ ان سے کئی ایک دفعہ جنگ بھی ہوئی۔ آخری لڑائی نداب کے مقام پر سنہ ۱۳۲ھ میں ہوئی۔ اس وقت عباسی فوج کا سپہ سالار عبیداللہ بن علی تھا۔ مروان شکست کھا کر موصل آیا، لیکن زمانہ بدل چکا تھا۔ گورنر موصل نے اس کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ عبداللہ بن علی اس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ مروان نے حمص کا رخ کیا۔ اہل حمص نے بھی مقابلہ کیا، اس لیے وہ دمشق میں آیا۔ چچا کے بیٹے ولید بن معاویہ بن مروان کو مخالفین سے لڑنے کی ہدایت کر کے فلسطین کا راستہ لیا۔ عبداللہ بن علی دمشق میں آیا اور فوجوں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ آپ باب شرقی پر اور صالح بن علی باب جابیہ پر، ابوعون باب کیسان پر، سیام بن ابراہیم باب صغیر پر، حمید بن قحطبہ باب توما پر، اور عبداللہ بن یحییٰ بن صفوان اور عباس بن یزید باب الفرادیس پر محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ چند روز کے محاصرے کے بعد رمضان سنہ ۱۳۲ھ میں دمشق مسخر ہو گیا اور قتل عام کا بازار گرم ہو گیا۔ دمشق کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ ولید بن معاویہ بن مروان اس ہنگامہ میں مارا گیا۔ مروان ادھر ادھر بھاگ کر جان بچاتا پھر رہا تھا۔ خود اس کے لیے اپنے ملک کی زمین اپنی وسعت کے باوجود اس پر تنگ ہو گئی۔ آخر کار وہ بھی بوجیر کے مقام پر مارا گیا۔ اس وقت یہ کیفیت تھی کہ بنوامیہ میں سے جو شخص جہاں

Marfat.com

کہیں ملا قتل کیا گیا۔ صرف ایک شخص عبدالرحمٰن وہاں سے بھاگ کر مصر آیا اور یہاں سے ہسپانیہ پہنچا اور وہاں اس نے خاندان بنو امیہ کی حکومت کی از سر نو بنیاد رکھی۔ کہتے ہیں کہ بنو امیہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا گیا۔ بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہ چھوڑا۔ بنو امیہ کے خلفا کی قبریں اکھڑوا دیں۔ ان کے مکانات کو زمین بوس کر دیا۔ ان پر اتنا ظلم کیا گیا کہ ظلم کرنے والے کا نام تاریخ کے اوراق میں ''سفاح'' (خون خوار) پڑ گیا۔ آخر کار جب اپنے خیال میں سب امیوں کو قتل کر چکے تو امن کا اعلان کیا گیا۔ ایک روز ابو العباس جو ''سفاح'' کے نام سے مشہور ہے، ہشام بن عبدالملک سے باتیں کر رہا تھا کہ سدیف بن میمون ادھر آ نکلا۔ سفاح کے پاس ہشام کو دیکھ کر جل گیا اور کہا:

''تمھارے پاس بنو عبد شمس کے مہمان آئے ہیں، تیار ہو کر اپنی سواریوں کو تکلیف دیتے ہوئے۔ اے خلیفہ! وہ دھوکہ سے آئے ہیں، ملامت کے خیال سے نہیں آئے بلکہ تلوار کے خوف سے آئے ہیں۔ تم ان لوگوں کو دیکھ کر نازاں نہ ہونا، ان کے دلوں میں تمھاری طرف سے غبار باطنی بھرا ہوا ہے۔ پس ان کو تلوار کے گھاٹ اتار دو اور چشم نمائی کا خیال چھوڑ دو تا آنکہ ان سواریوں کی پشت پر کوئی بنو امیہ کا فرد نظر نہ آئے۔''

سلمان نے کہا: کیوں چچا تم نے تو میرے قتل کا سامان مہیا کر دیا۔ سفاح نے اشارہ کیا اور سلمان کو قتل کر دیا گیا۔

عبداللہ بن علی نہر ابی فطرس کے کنارے نوے (۹۰) اشراف بنو امیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دعوت کے بہانے ان لوگوں کو بلایا گیا تھا۔ اتنے میں شبل بن عبداللہ آ گیا۔ کہا: ''جوان مردو! بنو عباس کی بدولت تم بالاستقلال بادشاہ ہو گئے۔ ایک زمانہ گزرنے اور خوف کے بعد بنو ہاشم کا بدلہ طلب کیا۔ تم ہرگز عبد شمس سے انتقام لینے میں درگزر نہ کرنا۔ ان کے ہر ایک درخت کو کاٹ ڈالو۔ ہم کو انہی ہاشمیوں سے علی الاعلان دوستی ہے اور انہی کے قتل کی وجہ سے تمھاری حجامت ہو گئی۔ بے شک صرف مجھے ہی نہیں بلکہ اور لوگوں کو بھی غصہ پیدا ہوا ہے اس لیے کہ بنو امیہ اب بھی منبر اور کرسیوں کے قریب ہیں۔ ان لوگوں کو اسی مقام اسفل میں رکھو اور دیکھو جہاں اللہ نے ان کو بدبختی کے مکان پر رکھا ہے۔ حسین رضی اللہ عنہ اور زید کے قتل کا واقعہ کرو اور اس مقتول کو جو مہر اس میں مارا گیا۔ اور اس مقتول کو بھی یاد کرو جو حران میں قتل ہوا جس کی لاش پر پرندے اس طرح آتے تھے جیسا کہ اپنے گھونسلے کو جاتے ہیں۔

ان اشعار کو سن کر بنو امیہ کے نوے اشراف کو وہیں مار کر فرش کر دیا گیا اور ان کی لاشوں پر دستر خوان بچھا کر کھانا کھایا۔ جس کی تفصیل آئندہ جلد میں آ رہی ہے۔

دمشق:

گزشتہ صفحات میں خلفائے بنو امیہ کے بارے میں اجمالی طور پر کچھ بیان کیا گیا اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیا وجوہات تھیں جن کے باعث اتنی جلدی اس خاندان سے خلافت چھین لی گئی۔ اب

Marfat.com

اس شہر کے بارے میں مختصراً بتایا جارہا ہے جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد گورنری سے بنوامیہ کا مرکز چلا آرہا تھا اور خلافت بنوامیہ میں وہ ان کا دارالخلافہ بھی رہا۔ ایک شاعر نے دمشق کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے۔

دمشق منزلنا حیث النعیم بدا مکملاً وھو فی الآفاق مختصرا

یعنی دمشق ایک ایسا مقام ہے جس میں جنت کی نعمتیں مکمل موجود ہیں لیکن جنت اور اس میں یہ فرق ہے کہ وہ ایک دور دراز راستہ ہے اور سعی و عمل وغیرہ کے بغیر اس کا حصول مشکل ہے لیکن دمشق میں ہم نہایت آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔

دولت آنست کہ بے خون دل آید بکنار
ورنہ باسعی عمل باغ جناں ایں ہمہ ہیچ

القصب راقصة والطیر صاحبة والزھر مرتفع والماء مخدر

دمشق میں کیسے دل کش منظر ہیں۔ اس کی نہریں اور باغ کیسے فرحت افزا نظارے پیش کرتے ہیں۔ درختوں کا ہوا کے جھونکوں سے لچکنا اور پرندوں کا چہچہانا محفل عیش ونشاط کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ کلیوں کا شاخوں پر بلند ہونا اور پانی کا سایہ دار درختوں کے نیچے بہنا خلد بریں کے سامان ہیں۔

وقد تجلت من اللذاتاوجھا لکنھا نطلال الدوح تستر

ہر ایک قسم کے لذائذ کے جلوے اس جگہ آشکارا ہیں لیکن درختوں کے سائے میں مستور ہیں یعنی اس جگہ زندگی کا لطف اگر اٹھانا چاہو تو درختوں کے سایے کے نیچے بیٹھو۔

وکل وادٍ بہ بہ موسیٰ یفجرہ وکل روضٍ علیٰ حافاته الخضر

دمشق کی پتھریلی زمین میں اعجاز موسوی اپنا کام کر رہا ہے کہ پتھروں سے پانی کے چشمے پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہے ہیں اور ہر ایک باغ کے کنارے پر خضر ایستادہ ہے۔

خیم بجلق بین الکاس والوتر فی جنة ھی ملاء السمع والبصر

دمشق میں خیمہ ایستادہ کر، اس جگہ بادۂ عشرت کا دور چل رہا ہے اور ہر طرف سے نغمۂ دل کش کی صدائیں کانوں سے ٹکراتی ہیں۔ دنیا ہمہ تن گوش وچشم بن کر اس جنت کے لذائذ سے محظوظ ہو رہی ہے۔

منع الطرف فی مرای لحاسة وروض الفکر بین الروض والنھر

اس کے مقامات کی خوبیاں قابل دید ہیں۔ یہ ایسے منظر ہیں کہ آنکھیں ان سے محظوظ

Marfat.com

ہوتی ہیں۔ اور غور و فکر اس کے باغ اور نہروں میں کرو کہ وہ کس طرح بہتی ہیں اور ان کے ذریعے کیا کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے جلوے نظر آتے ہیں یعنی دل و دماغ اور ظاہری اور باطنی طاقتوں کو اس مقام کے حسن پر نظر اور فکر کرنے کے لیے جمع کرنا چاہیے۔

وانظر الیٰ ذھجبیات الاصیل بھا　　واسمع الیٰ نغمات الطیر فی الشجر

بوقت غروب آفتاب کی شعائیں دمشق کے سفید مکانات اور طلائی برجوں، سنہری کلسوں اور تختہ گلزار پر جو اس جگہ بکثرت ہیں، منعکس ہو کر عالم نور کا سماں پیدا کرتی ہیں اور جو ایک قابل دید منظر ہے، اور جانوروں کا نغمہ جو درختوں میں چہچہاتے ہیں، سننے کے لائق ہے۔

وقل لمن لام فی الزاته بشراً　　دعنی فانك عندی من سوی البشر

وہ شخص انسان ہی نہیں جو کسی آدمی کو دمشق کی لذائذ پر ملامت کرتا ہے۔

دمشق کا عام نظارہ جس کا سیاحوں نے بالخصوص ذکر کیا ہے، نہایت دل کش ہے۔ جبل قاسیوں پر کھڑے ہو کر اگر چاروں طرف نگاہ کی جائے تو ایسا دل چسپ منظر نظر آتا ہے کہ مسافر آئینہ کی طرح حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ پہاڑی سلسلہ دیوار کی طرح سامنے کھینچا ہے۔ اس کے دامن میں میدان پھیلا ہوا ہے جس میں سڑکیں اور ان پر اونٹوں کی قطار اور مسافروں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ اس میدان میں نہریں بہتی ہیں جن کے کناروں پر اور دور دور تک سایہ دار درختوں کے جھنڈ نظر آتے ہیں اور ان کے آغوش میں یہ مشہور شہر اور اس کی سفید عمارتیں اٹھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ تھکا ماندہ مسافر جو ریگستانوں کو طے کرتا ہوا آ رہا ہو، جس وقت اس منظر کو دیکھتا ہے تو ایک سراب تصور کرتا ہے۔ مشہور روایت ہے کہ "باغ عدن" یہی دمشق اور اس کا میدان ہے جسے آبانہ اور فرفر قدیم الایام سے سیراب کرتے ہیں۔ اگرچہ شہادتیں موجود ہیں جو اس روایت کی تائید کرتی ہیں لیکن ہم اسے روایت سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں ایسے بہت کم مقام ہیں جو دمشق کی شادابی اور سرسبزی کا مقابلہ کر سکیں۔ اگر عربیوں نے اسے دنیا کی جنت کہا تو بالکل صحیح ہے۔

کتب مقدس میں اس شہر کو دمشق ارم ہی لکھا ہے، لیکن یا تو اس کی خوبیوں کی وجہ سے یا کسی اور باعث سے مختلف ناموں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن اس کا ابتدائی اور مشہور نام دمشق ہی ہے۔ جیرون، جلق اور فیجا اس کے مشہور لقب یا نام ہیں جو زیادہ تر اشعار میں موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

دمشق بہت پرانا شہر ہے اور اس لیے اس جگہ آثار قدیمہ کی کثرت ہونی چاہیے، مگر ہر ایک زمانے میں اس پر اس قدر تغیر واقع ہوتا رہا ہے کہ گزشتہ زمانے کی تاریخ کا پتہ اس کے آثار سے بمشکل ملتا ہے۔ موجودہ صورت گزشتہ ایام سے بہت مختلف ہے۔ ہر ایک سیاح نے دمشق اور قریوں کے تذکرہ میں اس کی مساجد، حمام اور اس کے بازاروں کا ذکر کیا ہے۔ ان مجمل حالات سے ان بازاروں اور دکانوں کا مفصل پتہ نہیں ملتا۔ قیاس

Marfat.com

ہو سکتا ہے کہ جو کچھ آج کل دمشق کی صورت ہے قدیم زمانے میں بھی یہی ہوگی۔ لیکن اگر دمشق کے ایک مکان کو دیکھو تو ظاہر و باطن میں بہت فرق ہے جس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ بنو امیہ کے زمانے میں اس شہر کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔

دمشق کے اکثر بازار مسقف اور بعض غیر مسقف ہیں۔ ان بازاروں کے نام مختلف زمانوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ کے عہد میں جامع دمشق کے قرب میں خلفاء اور اراکین سلطنت کے محلات تھے۔ چنانچہ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ باب الزیادہ سے دارالخیل کو راستہ جاتا ہے اور بائیں جانب ایک بہت بڑا بازار ہے۔ ابتدا میں اس جگہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور بنو امیہ کے مکانات تھیں۔ اس جگہ کو ''خضرۃ'' کہتے تھے۔ بنو عباس نے ان عمارتوں کو منہدم کرایا اور اس جگہ ایک بازار بن گیا۔

''ازے بلڈ'' اور ''رے'' اور دیگر یورپی سیاح یہ سمجھتے ہیں کہ ''جامع اموی'' جس کا طول ۱۶۳ گز اور عرض ۱۰۸ گز ہے، اس پرانے معبد یا گرجا کے ایک حصہ پر تعمیر ہوئی ہے۔ اس گرجا کی وسعت چھ سو مربع گز بیان کی جاتی ہے۔ یہ سیاح لکھتے ہیں کہ اس کے آثار بھی جامع دمشق کے قریب بازاروں میں ملتے ہیں۔ اصل میں اس جگہ بنو امیہ کے محلات تھے جو بنو عباس نے منہدم کر کے خاک میں ملا دیے لیکن ان عالی شان عمارتوں کے ستونوں اور دیواروں کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ناواقف یورپی سیاح غلط فہمی سے انھیں پرانے گرجا یا کنیسہ کے آثار سمجھتے ہیں۔

یاقوت چند بازاروں اور محلوں کا ذکر کرتا ہے لیکن موجودہ بازاروں اور محلوں کی فہرست میں یہ نام نہیں ملتے۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ یہ نام وقتاً فوقتاً بدلتے رہے۔ جامع مسجد کے قریب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک قصر تعمیر کروایا جس کا نام ''قصر خضراء'' تھا۔ تعمیر و تکمیل کے بعد ایک روز سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے عمارت کی حسن و خوبی کی نسبت استفسار کیا گیا۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''اگر اس کے مصارف بیت المال سے ہوئے ہیں تو آپ نے بددیانتی کی اور اگر اپنی ذاتی دولت اس پر صرف کی ہے تو اسراف کیا ہے۔'' اس جگہ ایک اور قصر ''دارالصوفیہ'' تھا۔ یاقوت حموی ابن عساکر کا حوالہ دیتا ہے کہ یہ ''جامع دمشق'' سے متصل اور ملحق تھا اور اس کی تعمیر عبدالعزیز بن مروان نے کی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اسی مکان میں سکونت پذیر تھے۔ اس کے بعد یہ عمارت فقرا اور صوفیہ کے لیے وقف کی گئی۔ اس لیے اس کا نام ''دارالصوفیہ'' مشہور ہو گیا۔

''سوق العمارۃ'' اور ''سوق المجابریہ'' دمشق کے دو بازار ہیں۔ ان کے درمیان ''سوق الغزل المعلق'' تھا۔ اس جگہ ایک مسجد ''الغزل المعلق'' اب بھی موجود ہے اور بہت پرانی مسجد ہے۔ اس جگہ ایک مدرسہ بھی تھا جسے ''امینیہ'' کہتے تھے۔ موجودہ ''سوق الزاویہ'' غالباً پرانا بازار ہے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ اس جگہ عبدالنعیم بن حسان کی دوکان تھی۔ یہ شخص شاعر، ادیب اور طبیب تھا۔ اشعار کے لفظوں کو دائروں، درختوں اور مختلف سورتوں

Marfat.com

میں لکھتا اور اشعار میں عجیب وغریب عمل کرتا۔

شہر دمشق میدان میں دامن جبل الشرق سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔میدان سطح سمندر سے دو ہزار دو سوفٹ بلند ہے اور نباتات سے بھرا ہوا ہے۔اس کے کناروں پر پہاڑی سلسلہ جبل الشیخ سے شمال مشرق کی طرف پھیلا ہوا ہے، اس کی اوسط بلندی میدان سے چھ سوفٹ ہے، لیکن شہر کے سامنے دائرہ کی صورت میں پہاڑ جبل قاسیوں پندرہ سوفٹ کی بلندی تک اٹھتا ہے۔اس کی چوٹی پر کھنڈرات پڑے ہیں جسے ''قبۃ النصر'' کہتے ہیں۔اس کے دامن میں ''صالحیہ'' واقع ہے۔ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ ''ربض الصالحیۃ'' دمشق کے شمال میں واقع ہے۔یہ ایک بڑے شہر کی طرح آباد ہے۔اس کے بازار نہایت خوش نما ہیں۔اس میں جامع مسجد، شفاخانہ، مدرسہ، سب کچھ موجود ہے۔ایک مدرسہ ''ابن عمر'' کے نام سے مشہور ہے۔سن رسیدہ لوگ جو قرآن حکیم پڑھنے کی خواہش رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ مدرسہ وقف ہے۔''صالحیہ'' میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مقلدین کی بہت بڑی تعداد ہے۔یاقوت حموی لکھتا ہے کہ ''صالحیہ'' ایک بہت بڑا قریہ ہے۔یہاں بہت سے صالحین کی قبریں اور ان کی رہائش ہے۔غالباً اس کی وجہ تسمیہ کی یہی وجہ ہے۔شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی قبر بھی اسی جگہ ہے۔ایک اور سیاح لکھتا ہے کہ باب الصالحیہ اور اس سڑک سے گزر کر جو صالحیہ کو جاتی ہے، بائیں جانب دامن جبل اور باغات کے درمیان چلتے چلتے ایسا منظر دکھائی دیتا ہے جو ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔سر شام جب کہ آفتاب غروب ہو رہا ہو اس جگہ دو نہریں مختلف بلندی اور ایک ہی کارہ پر پہاڑ کو قطع کرتی ہوئی بہتی ہیں اور دوسرے کنارے پر اسی طرح تین نہریں ہیں جو شخص ان نہروں کو دیکھتا ہے کہ کسی طرح پہاڑ کو کاٹ کر مختلف بلندی سے لائے ہیں اور کس طرح پلوں سے انھیں سہارا دیا ہے، عربی صنعت اور فن کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دمشق اسی جگہ واقع ہے کہ جہاں قدرتاً پانی کی کثرت ہے۔نہر بردی ہزار ہا سال سے اسے سیراب کر رہی ہے۔پہاڑ سے نکل کر عین مشرق کی طرف بہتی ہوئی شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔یعنی دمشق دو حصوں میں منقسم ہے۔پرانی آبادی یعنی شہر جس کے گرد دیواری بیضوی شکل میں محیط ہے، نہر بردی کے جنوبی کنارے پر واقع ہے اور اس کے اندر جامع اموی، قلعہ اور دیگر خاص خاص عمارتیں ہیں۔شمالی کنارے پر قلعے کے متصل جو شہر کا شمال مغربی کونہ ہے، صالحیہ کی وسیع آبادی اس طرف پھیلی ہوئی ہے۔شہر کے مغرب میں دوسری آبادی اسی طرح دور تک چلی گئی ہے۔اس کے بعد میدان دو میل جانب جنوب پھیلا ہوا ہے جو دمشق کے مضافات میں سب سے بڑا ہے۔میدان میں ایک کشادہ سڑک جاتی ہے جو ''بوابۃ اللہ'' پر ختم ہوتی ہے۔

الجامع:

عربوں کی عمارات تعمیر مسجد سے شروع ہوتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اسی پر ان کی صنعت کا آغاز ہوا اور اسی پر ان کا خاتمہ ہے۔تمام خوبیاں جو عمارت میں ظاہر ہو سکتی ہیں، عربوں نے اپنی مسجدوں کی تعمیر میں ان سب

Marfat.com

کو روشن کر دیا۔ تمام ذہنی قوتیں اسی میں صرف کیں اور قدرتی اشیا کے اثر کو مساجد کے در و دیوار پر نقش کر دیا جس کا عکس قلب پر مختلف کیفیات پیدا کرتا ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ عربی صنعت مساجد کی تعمیر کے علاوہ کسی اور عمارت سے واقف ہی نہ تھی یا دیگر اشیا پر مساجد کی طرح وہ اپنی خوبیوں کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ ایک شخص جو مسجد کے دروازوں کی لکڑی، عاج اور فرش کے پتھر کو طرح طرح کے نقش و نگار سے مزین کرتا ہے، عام اشیا پر بھی اسی طرح اپنی صنعت کو کام میں لا سکتا ہے۔

سب سے پہلے مسجد مدینہ منورہ میں تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد نبوی سرکار دو عالم ﷺ کے زمانے میں بنی۔ اس وقت بلکہ اس کے بعد ایک عرصے تک مسلمانوں نے میدان صنعت میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ مسجد ابتدا میں مربع شکل کی تھی اینٹوں کی دیوار نے احاطہ کیا ہوا تھا اور کچھ حصہ لکڑی کے شہتیروں سے مسقّف تھا جنھیں کھجور کے تنے سہارا دیتے تھے۔ ابتدا میں سرکار دو عالم ﷺ ایک ستون پر تکیہ لگا کر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے۔ سنہ ۸ھ میں آپ ﷺ کے لیے ایک منبر بنایا گیا۔

''جامع اموی'' کی تعمیر دمشق میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں ہوئی۔ مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ یہ آرامیوں کا ایک معبد تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے دور میں جب شاہ عصاریہ ''تلغات پلاسر'' نے دمشق میں ایک دربار منعقد کیا اور شاہ اسرائیل و یہودیہ اور آرامی بادشاہ اور دیگر چھوٹی ریاستوں کے رئیس اس جگہ اظہار اطاعت سے جمع ہوئے تھے۔ تو ایک روز شاہ یہودہ ''احاذ'' سیر کرتا ہوا اس معبد کی طرف آ نکلا۔ اس کے اندر ایک مذبح تھا۔ اس کی وضع پسند آئی۔ حکم دیا کہ ہیکل سلیمانی میں اسی نمونہ کا ایک مذبح بنایا جائے۔ آرامیوں کے اس معبد کا نام ''رامون'' تھا جس کے معنی ''انار'' ہیں۔ عربی میں ''رمان'' اسی لفظ کی اصل ہے۔ شامی دیوتاؤں میں ''رامون'' کی پرستش سب سے زیادہ ہوتی تھی، اور یہ مندر اسی دیوتا کے نام تعمیر کیا گیا تھا۔

سیدنا یحییٰ علیہ السلام کی قبر اسی معبد میں تھی جو اب بھی موجود ہے۔ قیصر قسطنطنیہ نے جب عیسائی دین کو قبول کیا تو یہ ہیکل جو اب تک یہودیوں کے قبضے میں تھا، عیسائیوں کے ہاتھ میں آ گیا اور سیدنا یحییٰ علیہ السلام کا نام اس گرجا کے ساتھ قائم رہا۔ جس وقت مسلمانوں نے دمشق کا محاصرہ کیا اور ایک دروازہ سے ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ بروئے صلح اور دوسرے دروازہ سے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بجز و قہر اس میں داخل ہوئے تو اسی گرجا کے بالمقابل دونوں کی ملاقات ہوئی۔ ان دونوں کے بعد رد و قدح کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ جس قدر حصۂ شہر بجز و قہر فتح ہوا ہے اس پر جنگی اور باقی حصے پر صلح کے قواعد پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس گرجا کو بھی انصافاً تقسیم کیا گیا۔ نصف حصہ تو مسجد میں تبدیل ہو گیا اور نصف حصہ بدستور گرجا کی شکل میں عیسائیوں کے قبضے میں رہا۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ گرجا دونوں فاتحین میں نصف نصف تقسیم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس گرجا کے ساتھ ایک اور چھوٹا سا گرجا تھا جسے سیدہ مریم علیہا السلام کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ یہ گرجا سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

Marfat.com

کے حصے میں آیا تھا اور اس جگہ انھوں نے ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ دوسرا گرجا یوحنا صحیح وسالم عیسائیوں کے پاس رہا۔ اسی برس بعد سنہ ۸۹ھ میں امیر المومنین ولید بن عبدالملک نے ارادہ کیا کہ اس گرجا کو مسمار کر کے وہاں ایک عالی شان مسجد تعمیر کی جائے۔ عیسائیوں کو کہا گیا کہ اس جگہ کے معاوضے میں جس قدر روپیہ لینا چاہو لے لو اور گرجا ہمیں دے دو۔ عیسائیوں نے صاف انکار کر دیا۔ ولید نے وہ گرجا ان سے جبراً لے لیا۔ اس عمارت کی قسم میں یہی کچھ لکھا تھا۔ اہل نینوا سے یہ جگہ مختلف اہل مذاہب میں منتقل ہوتی ہوئی آخر کار مسلمانوں کے ہاتھ آکر مسجد بنی۔ فی الحقیقت اس پر کسی کا دعویٰ نہ تھا کہ مفت کا روپیہ ہاتھ آتا تھا وہ بھی کھو بیٹھے۔ یہ سوال کہ خلیفہ ولید کی نگاہ اس گرجا پر کیوں پڑی، وہ کسی اور مقام پر نہایت عالی شان مسجد تعمیر کر سکتا تھا، قابل وقعت ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جو اس گرجا میں بات تھی وہ کسی اور جگہ پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس جگہ سیدنا یحییٰ علیہ السلام کی قبر مبارک تھی اور مسلمان اسے متبرک مقام خیال کرتے تھے۔ ارض شام میں ایسے مقدس مقامات بہت تھے اور مسلمانوں نے ان پر اپنا قبضہ کر لیا۔ ہیکل سلیمانی کا وہ حصہ جسے صخرہ کہتے ہیں اور جو داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی عبادت گاہ تھی۔ مسجد عمر کے گنبد کے نیچے ہے۔ تمام پیغمبروں کے مزار مسلمانوں کی خانقاہیں بن گئیں، لیکن سوائے اس گرجا کے اور کوئی جگہ زبردستی نہیں لی گئی۔ بہر حال عربوں سے یہ بہت بعید تھا کہ سیدنا یحییٰ علیہ السلام کی قبر کو ایسے لوگوں کے قبضے میں رہنے دیتے جو سیدنا مسیح علیہ السلام کو ''ابن اللہ'' کہتے تھے۔ عیسائیوں نے جب دیکھا کہ یہ مقدس مقام ہاتھ سے جاتا ہے تو یہ روایت مشہور کر دی کہ ہمارے بزرگوں نے لکھا ہے کہ جو شخص اسے مسمار کرے گا، وہ پاگل اور مجنون ہو جائے گا۔ خلیفہ ولید نے یہ سن کر کہا کہ ''میں پہلا شخص ہوں جو اسے مسمار کروں گا اور میں اللہ کے راستے میں مجنون ہونا پسند کرتا ہوں۔ اتنا کہا اور تیر ہاتھ میں لیے ہوئے گورنمنٹ ہاؤس سے نکلا۔ زرد قبا بدن پر تھی۔ آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کو خبر ہوئی تو وہ گرجا کی طرف دوڑے۔ دیکھا کہ خلیفہ بذات خود گرجا کی دیوار کو گرا رہا ہے۔ اس لیے ہر شخص نے خلیفہ کی تقلید کی اور اس گرجا کو مسمار کرنا کار ثواب سمجھا۔ کنیسہ یوحنا مسمار ہو گیا کہتے ہیں کہ اس اثنا میں اس عمارت کے قدیم آثار ملے اور مختلف زبانوں میں کتبے لکھے ہوئے پائے گے۔ بقول ''ازبیلا برٹن'' اس کنیسہ کے جنوبی دروازے کی طرف یونانی زبان میں ایک کتبہ لکھا ہوا اب بھی موجود ہے۔ یہ کتبے جو مسیح کی آمد ثانی اور ابدی بادشاہت کے خوش کن خیالات کا نتیجہ ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس قدیم معبد کے مشرقی اور مغربی جانب دو عالی شان محرابیں تھیں اور باب جیرون اور باب البرید تک برابر ستونوں پر قائم تھا۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جنوں نے اسے تعمیر کیا تھا۔ بعض روایات کے مطابق ''عاد ارم'' نے اسے بنایا تھا۔ کہتے ہیں کہ عاد کے دو بیٹے تھے: جیرون اور برید۔ اس جگہ دونوں بیٹوں کے قصر بنوائے۔ قصر تو معدوم ہو گئے، نام باقی رہ گیا۔

یہ بت کدہ خراب ہوا تو خانۂ خدا کی تعمیر کا کام نہایت سرگرمی سے شروع کیا گیا۔ خلیفہ ولید بن

Marfat.com

عبدالملک کی اس وقت دلی آرزو یہی تھی کہ حتی المقدور یہ کام جلدی ختم ہو۔ ایسا نہ ہو کہ موت سے فرصت نہ ملے اور یہ خواہش دل کی دل ہی میں رہے۔ وہ اکثر اوقات جائے تعمیر پر آتا اور بذات خود کام کی نگرانی کرتا۔ معماروں، سنگ تراشوں اور دیگر کاریگروں سے اس وقت اس جگہ ایک نیا شہر آباد نظر آتا۔ ان کی تعداد مختلف اوقات بارہ ہزار بیان کی جاتی ہے جن میں رومی، یونانی، شامی، مصری، عراقی، عربی اور ایرانی کاریگر شامل تھے۔ بعض مورخین نے اس موقع پر ایسی بے تکی ہانکی ہے کہ عقل باور نہیں کرتی کہ خلیفہ ولید نے قیصر روم کو لکھا کہ چونکہ مابدولت کا ارادہ کنیسہ کو مسمار کر کے مسجد تعمیر کرنے کا ہے اس لیے رومی کاریگر اور ماہرین فن عمارت کو دمشق روانہ کیا جائے۔ چنانچہ قیصر نے بارہ ہزار آدمی بھیجے جو اس جگہ کام کرتے تھے۔ عربی مورخین نے رومی لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ اس میں تمام اصلی رومی، یونانی، شامی اور مصری وغیرہ شامل ہیں اور ان اقوام میں کچھ فرق نہیں کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت ان کا مقابلہ ایک ایسی حکومت سے تھا جو رومی شہنشاہیت کی عظیم الشان شاخ تھی، اور قیصر سے لے کر عوام الناس تک اکثر لوگوں کا مذہب عیسائیت تھا۔ اس لیے اس عیسائی حکومت اور حکمرانوں اور عام عیسائیوں کو وہ ''رومی'' کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے جب کہ ان کا اکثر حصہ یونانی تھے اور خود قیصر بھی یونانی الاصل تھا۔ اس وقت شام میں بے شمار عیسائی آباد تھے اور مجموعی آبادی کا اکثر و بیشتر حصہ یہی لوگ تھے، اور خواہ وہ کسی قوم سے ہوں عربی انھیں رومی ہی کہتے تھے۔ اگر انھوں نے فرق کیا ہے تو صرف عرب ''مستنصرہ'' میں کیا ہے، اور یہ اس لیے کہ یہ لوگ ان کی اپنی قوم کے آدمی تھے۔ شام میں آباد ہوئے اور عیسائیت کو قبول کیا لیکن عربی ان کے حسب و نسب سے واقف تھے۔ یہ عیسائی قومیں جو اس وقت شام میں آباد تھیں ''جامع الاموی'' کی تعمیر میں بحیثیت مزدور اور معمار و صناع وغیرہ کام کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ دیگر اقوام کے آدمی بھی تھے جو اسی طرح کام کرتے تھے۔

بقول یاقوت خلیفہ ولید نے اس عمارت پر سات سال کا خراج حکومت صرف کر دیا۔ اس میں غالباً تمام اخراجات شامل ہیں۔ معماروں اور مزدوروں کو ان کے حوصلے سے زیادہ دیا۔ خلیفہ کے دلی شوق سے ہر ایک شخص واقف تھا، اس لیے ضرورتاً بعض اشیاء گراں قیمت پر دستیاب ہوئیں۔ اس عمارت کا مصالحہ دور دور مقامات سے بہم پہنچایا۔ خلیفہ نے عاملوں کو تاکیدی احکام نافذ کیے کہ تعمیر مسجد میں قلعی کا استعمال کیا جائے۔ تمام ممالک محروسہ سے جس قدر دستیاب ہو سکا اس کام کے لیے جمع کیا گیا لیکن معلوم ہوا کہ یہ مقدار بھی کافی نہیں۔ آخر سخت جستجو کے بعد پتہ چلا کہ ایک عورت کے پاس کچھ موجود ہے۔ اس عورت سے جب مانگا تو اس نے کہا سونے سے تول کر دوں گی۔ خلیفہ ولید کو عورت کے اس جواب سے مطلع کیا گیا تو اس نے کہا کہ ''اگر ہم وزن سونا بھی لینا قبول نہ کرے تو دگنا دیا جائے۔ اس پر عورت نے کہا کہ مجھے تو یہ دیکھنا منظور تھا کہ کیا خلیفہ نے اس عالی شان مسجد کی بنا اپنی شہرت کے لیے اٹھائی ہے اور ظلم سے اخراجات کو پورا کیا ہے، لیکن اب مجھے معلوم ہو گیا

Marfat.com

ہے اور میں اس امر کی شہادت دیتی ہوں اور تمھیں بھی گواہ ٹھہراتی ہوں کہ خلیفہ نے یہ کام محض اللہ کے لیے کیا ہے۔اس کے بعد زر معاوضہ لینے سے انکار کر دیا، اور جتنا ذخیرہ موجود تھا وہ اس نے حکومت کی نذر کر دیا۔خلیفہ نے حکم دیا کہ چھت میں جس قدر آئینے لگائے جائیں ان پر لفظ ''اللہ'' لکھا جائے۔

خلفائے بنوامیہ کو بدنام کرنے کے لیے ان کے ظلم وستم کی حکایتیں حریف قبائل کی پولیٹیکل اغراض نے وضع کیں۔اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بنوامیہ کے خلفاء خداترس اور منصف مزاج تھے۔خلیفہ ولید بن عبدالملک تو کہا کرتا تھا کہ میں نے مسجد نبوی، جامع دمشق اور مسجد اقصیٰ کی توسیع وتعمیر اور تکمیل کی۔اگر اللہ تعالیٰ کو ان میں سے کوئی فعل پسند آ گیا تو میری مغفرت کے لیے کافی ہے، اور لوگ تو اسے سیدنا داؤد علیہ السلام سے تشبیہ دیتے تھے۔

جامع دمشق کی تعمیر سے قبل محراب کسی مسجد میں نہ تھی۔سب سے پہلی محراب جامع دمشق میں بنائی گئی۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عربوں نے محرابوں کے نقشے پیدا کیے۔اس سے پیشتر محراب کی صورت صرف نصف دائرہ کی تھی اور اس دائرہ میں کسی قسم کا تغیر ممکن ہی نہ تھا۔اس لیے یونانی اور رومی صنعت کو کبھی وہ آزادی نصیب نہیں ہوئی جو عربوں کی دماغی طاقت نے پیدا کی۔عربی محراب کی بنیاد عموماً خط مستقیم پر ہے جس میں صنعت آزادانہ اپنے جوہر دکھا سکتی ہے۔جامع دمشق کی شکل مستطیل تھی۔ابن جبیر اور ابن بطوطہ نے اس کا طول تین سو ذراع اور عرض دو سو ذراع لکھا ہے یعنی ۱۶۳ گز طویل اور ۱۰۸ گز چوڑی۔یاقوت نے لکھا ہے کہ اس عالی شان مسجد کی یہ عجب خوبی ہے کہ اگر کوئی شخص سو سال تک اس کے حسن صنعت اور اختلاف پر تامل کرے تو ہر روز وہ ایک نہ ایک نئی بات دیکھے گا جو پیشتر نہ دیکھی ہو یعنی اس قدر عرصہ دراز تامل کے ساتھ دیکھنے سے بھی ناممکن ہے کہ انسان اس عمارت کی تمام مختلف خوبیوں کو معلوم کر سکے۔ایک زندہ دل کا قول ہے کہ کچھ تعجب نہیں اگر اہل دمشق میں سے کسی شخص کے دل پر جنت کا شوق غالب نہ ہو کیوں کہ اس کی آنکھوں کے سامنے مسجد دمشق کا حسن ہمیشہ رہتا ہے جو سنگ رخام کے ستونوں پر قائم ہے جس کے دو طبقے ہیں۔پائیں طبقہ کے ستون بہ نسبت اعلیٰ طبقہ کے ستونوں سے زیادہ بلند ہیں، اور ان دونوں طبقوں کے درمیان یہ صورت ہے کہ کل دنیا کا حسن صنعت اور کارخانہ قدرت کی خوبیاں جمع ہیں، اور زرنگار اور مرصع عمارت میں مختلف رنگوں کی ایسی کیفیت ہے جو دیکھنے والے کے قلب میں فرحت افزا خیالات کا ہجوم پیدا کرتی ہے۔جامع اموی جامع المحاسن اور عجوبہ روزگار ہے۔ سنگ رخام کا فرش جس میں پتھروں کو نہایت احسن ترکیب اور نظام سے پیوستہ کیا گیا ہے اور اس پر کاریگروں نے چاندی سونے کے پھول اس طرح نثار کیے ہیں کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔حیوانی صورتوں سے یہ مقدس مقام منزہ ہے البتہ قدرتی نظارے بے شمار ہیں۔بیل بوٹوں کی اس طرح کثرت ہے کہ ایک گلشن کھلا ہوا ہے، لیکن اس شگفتہ گلشن کی بہار کو کبھی خزاں کا ڈر نہیں اور وہ خرابی جو اشجار میں قدرتاً پیدا ہوتی ہے اس عمارت کی

Marfat.com

صنعت اس کی مانع ہے۔ پھول مرجھا جاتے ہیں، پتے جھڑتے ہیں، درخت گر پڑتے ہیں لیکن اس گلشن کی بہار میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انقلاب زمانہ اور تصرف دہر کا اس پر کچھ اثر نہیں۔ درخت پانی سے پرورش پاتا ہے لیکن انھیں اس کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس صنعت کا چشمۂ آب رواں در و دیوار پر لہریں مارتا ہے اور کبھی خشک نہیں ہوتا۔ یہ شاعرانہ خیالات نہیں بلکہ محسوسات کا اثر ہے جو قلب میں ایسی کیفیتیں پیدا کرتا ہے کہ الفاظ کے ذریعے اس کا اظہار مشکل ہے۔ اس کی صنعت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ عین وسط میں محراب مسجد کے سامنے ''قبۃ النسر'' ہوا میں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ دمشق اور اس کے گردونواح کا نظارہ جہاں تک نظر کام کرسکتی ہے ''قبۃ النسر'' پیش کرتا ہے، بلحاظ بلندی اور بوجہ مشابہت صورت اس قبہ کا نام ''نسر'' نہایت موزوں ہے۔ تمام شہر میں اس سے زیادہ بلند کوئی عمارت نہیں۔ بقول ابن بطوطہ یہ ایک سیسہ کا برج ہے جو چھ سنگ مرمر کے ستونوں پر قائم ہے۔ ابن جبیر اسے ''قبۃ الرصاص'' لکھتا ہے۔ ان ستونوں کی محرابوں میں ایسی دلآویز خوب صورتی ہے کہ جو بیان نہیں ہوسکتی۔ مہندسین نے اس مسجد کو اس وضع اور انداز سے بنایا ہے کہ تمام عمارت نسر طائر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ قبہ اس کا سر ہے اور دونوں جانب ''رواق'' اس کے پھیلے ہوئے بازو ہیں۔ جس طرف دیکھو یہی نظر آتا ہے کہ ''عقاب'' ہوا میں اڑ رہا ہے۔ مسجد کا صحن جس پر کاریگروں نے حسن وخوبی کو مکمل کردیا ہے، سوگز چوڑا ہے۔ اس پر سنگ رخام کے چون (۵۴) ستون کھڑے ہیں۔ ان پر عالی شان محرابیں صنعت کی خوبیوں کا اختلاف ظاہر کرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیش قیمت مختلف رنگ کے سرخ، سبز، زرد، سفید اور سیاہ پتھروں اور نگینوں سے جس سے یہ ستون اور محرابیں مرصع اور مزین ہیں، آسمان کی زینت فرش مسجد پر نازل ہوا چاہتی ہے۔ گویا کہ ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

بے شمار حسن وخوبی کے علاوہ جو عربی عمارت نے پیدا کی ایک قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ مختلف پتھروں کے اندر مختلف رنگ کی رگیں اس طرح پیدا کردی ہیں کہ بالکل قدرتی معلوم ہوتی ہیں جو کسی غیر عربی عمارتوں میں نظر نہیں آتیں۔

مرے لکھتا ہے کہ ''اس عمارت میں تین زمانوں کی مختلف وضع صاف صاف نظر آتی ہیں۔ مشرقی اور مغربی محرابیں اور دیوار کا وہ حصہ جو جنوب مغربی زاویہ پر واقع ہے اور جنوبی خوب صورت دروازہ یونانی اور رومی وضع کی عمارتیں ہیں، اور بیرونی دیوار کا کچھ حصہ اور مدور دریچے اور یونانی کتبے عیسائی صنعت کی یادگاریں ہیں، اور گنبد، مینار، رواق، سنگین فرش اور مرمری فوارے اسلامی مذاق اور اسلامی حکومت کے شاہد ہیں۔'' لیکن افسوس یہ ہے کہ ان سے وہ موزونیت جو اس اختلاف کے ساتھ موجود ہے، نظر انداز کردی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اس فن میں حصہ نہیں۔

مسجد کی چھت بلند ستونوں پر واقع ہے۔ ''قبۃ النسر'' اس کے عین وسط میں نہایت وقار سے سر اٹھائے

Marfat.com

ہوئے ہیں اور اس کی چوٹی پر ہلال بنا ہوا ہے۔ مسجد کا یہ حصہ ۴۳۱ فٹ طویل اور ۱۲۵ فٹ عریض ہے جسے ایک دیوار صحن سے جدا کرتی ہے۔ یہ دیوار ستونوں پر قائم ہے۔ اس حصۂ مسجد کو محدب ستون تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ہر ایک ۲۲ فٹ بلند ہے۔ ان پر محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ وسط میں قبۃ النسر ہے جو چھ ستونوں پر قائم ہے۔ ۱۲۰ فٹ کی بلندی پر یہ عظیم الشان گنبد واقع ہے اور مرکز میں اس کا محیط ۵۰ فٹ ہے۔ اس مسجد کے تین مینار ہیں۔ ایک مشرقی اور دوسرا غربی جانب ہے اور تیسرا شمال رویہ ہے۔

یوں تو اس مقدس مقام کی ہر ایک چیز زیارت کے قابل ہے لیکن بعض مقامات بالخصوص بزرگوں کی تربت (قبر) جائے نشست اور دیگر اسباب کے لحاظ سے متبرک ہیں۔ ان میں سے ایک سیدنا یحییٰ علیہ السلام کی قبر ہے۔ یہ قبر ہمیشہ زیارت گاہ رہی ہے۔ لوگ اس جگہ اعتکاف میں بیٹھتے تھے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ

''در جامع دمشق بر تربت یحییٰ علیہ السلام معتکف بودم'' (گلستان)

اس جگہ ایک تربت خلیفہ ولید کی لڑکی کی ہے۔ اس کے پاس ایک سرخ یاقوت تھا جسے یہ لڑکی بہت عزیز رکھتی تھی۔ قضائے الٰہی سے وہ مر گئی۔ والدہ نے کہا کہ یہ بیش قیمت جواہر بھی اس کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ ولید کے حکم سے تربت پر ایک آبگینہ بنایا گیا جس کے اندر سورۃ ﴿الھاکم التکاثر حتی زرتم المقابر......﴾ سنہری حرفوں میں نہایت خوش خط لکھوائی اور ''مقابر'' کے قاف میں اس سرخ یاقوت کو لگایا۔

اس مسجد میں بہت کچھ واقع ہو چکا ہے لیکن اس کی وضع میں کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک دفعہ خیال کیا کہ مسجد میں سونے اور چاندی کی اشیاء اس قدر بافراط موجود ہیں جن کا اس جگہ کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر یہ کہ سونے اور چاندی کی زنجیروں کے عوض اسی سے کام لیا جائے اور بیش قیمت اشیاء بیت المال میں رکھی جائیں تاکہ مسلمانوں کے کام آئیں۔ اتفاق سے قیصر روم کا سفیر دمشق میں آیا۔ وہ مسجد اموی کا شہرہ سن چکا تھا۔ دیکھنے کی اجازت مانگی جو منظور کی گئی۔ وہ دس آدمیوں کے ہمراہ باب البرید میں داخل ہوا۔ خلیفہ کی طرف سے چند آدمی ساتھ تھے جو یونانی زبان جانتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ جو کچھ سفیر اپنے رفقاء سے کہے اس کی اطلاع خلیفہ کو دی جائے۔ سفیر صحن مسجد میں آیا اور جب سر اٹھا کر اپنے سامنے وہ دل کش نظارا دیکھا تو بت کی طرح بن گیا۔ عرصہ تک اس پر حیرت طاری رہی۔ بعد ازاں اس کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے اپنے ہمراہیوں کو مخاطب کر کے کہا:

''میں نے خیال کیا تھا کہ دمشق میں اہل عرب کی عمارت کی بنا ایک قلیل عرصے کے لیے قائم ہے لیکن اب جو کچھ میں اس وقت دیکھ رہا ہوں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کے ساتھ اس مسجد کا قیام بھی ہمیشہ رہے گا۔ خلیفہ کو سفیر کی حالت اور گفتگو کی اطلاع دی گئی تو کہا کہ ''بے شک یہ مسجد کفار کے غیظ کا باعث ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور چاندی اور سونے کی قندیلیں بنوا کر مسجد میں آویزاں کروا دیں۔ بعض روایات میں ہے کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک ہی نے ایسی قندیلیں مسجد میں بے شمار موقع و محل پر لگوا دی تھیں جو رات کے وقت اس

Marfat.com

عمارت کو بقعۂ نور بنا دیتی تھیں اور مسجد کی چھت پر شب ماہتاب کا لطف پیدا کرتی تھیں۔

یاقوت لکھتا ہے کہ ۶۴۱ھ تک اس مسجد کے حسن میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا تھا لیکن اس وقت مسجد کے قریب ایک گھر کو آگ لگ گئی۔ اس کے شعلے مسجد کی دیواروں تک پہنچے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ تمام مسجد میں آگ پھیل گئی۔ اہل دمشق نے بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کا ابتدائی حسن و شباب جاتا رہا۔ جامع اموی اب بھی موجود ہے اور ایک بے نظیر عمارت ہے لیکن آہ! خلیفہ ولید ثانی کوئی نہیں ہوا جو اسے از سر نو اسی رنگ میں جلوہ دیتا جیسا کہ وہ کسی وقت تھی۔

Marfat.com

Marfat.com